



آجکل

پوسٹنگ سمٹ ۱۸۸۹
جنوری ۱۹۶۸ء
۶۰ پیسے



دھلی



شری لال بہادر شاستری

1413

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

ترتیب

سرورق : "یومِ جمہوریہ"

جلد ۲۶ نمبر ۶

پوس شک سمت ۱۸۸۹

جنوری ۱۹۶۸ء

زرِ سالانہ ہندوستان میں : ۷ سات روپے
غیر ممالک سے پاکستان میں : سات روپے (پاک)
۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ ہندوستان میں : ۶۰ پیسے
غیر ممالک سے پاکستان میں ۶۰ پیسے (پاک)
۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۶

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ملاحظات

۲۶ جنوری کا دن ہمارے لئے بڑی خوشی اور مسرت کا دن ہے اس دن ہم نے اپنے ملک کے لئے ایک جمہوری دستور نافذ کیا اور اقتدار واختیار عوام کو سونپ دیا اس طرح ہمارے ملک میں جمہوری نظام رائج ہوا جس پر ہم گزشتہ اٹھارہ برسوں سے عمل کر رہے ہیں۔

چوتھے عام انتخابات کے بعد ملک میں ایک نئی صورت پیدا ہوئی مرکز میں کانگریسی حکومت اور متعدد ریاستوں میں مخلوط پارٹیوں کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد بہت سے ذہنوں میں کئی طرح کے خدشے پیدا ہوئے تھے مگر ہمارا دستور اس کسوٹی پر بھی پورا اترا اور یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ وفاقی اور جمہوری نظام ہی ملک کے لئے نہایت موزوں ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری سیاسی پارٹیاں اپنی آئینی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور تمام افعال واعمال کو جمہوری اور دستوری حدود کے اندر رکھیں جبھی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور سارے ملک کو متحد رکھ سکتے ہیں۔

آج ملک کے بعض حصوں میں انتشار پسند اور فرقہ پرور عناصر سر اٹھا رہے ہیں جس سے ہر محبِ وطن کو تشویش ہے۔ حکومت ان عناصر کی سرکوبی کے لئے اقدامات کرتی رہتی ہے مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ملک کی رائے عامہ تشدد اور فرقہ پرستی کے خلاف پوری طرح منظم ہو جائے اور ایسے واقعات کو ناممکن بنا دے جو اتحاد، یگانگت اور

ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے الفاظ میں

"ہمارے ملک میں تشدد کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔
اگر ہمیں ترقی کرنا ہے اور آگے بڑھنا ہے تو ہمیں فرقہ پرستی
زبان اور ذات پات کے بھید بھاؤ کو مٹانا ہوگا۔"

ہمارے محبوب رہنما شری لال بہادر شاستری کو ہم سے جدا ہوئے دو سال ہو گئے ان کے متعلق ہم شریمتی شکنتلا سری واستو کے تاثرات اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔

اُردو کے مشہور شاعر جناب تلوک چند محروم کی دوسری برسی بھی جنوری ۶۸ء میں منائی جارہی ہے آپ کی زندگی کے آخری ایام سے متعلق جناب جگن ناتھ آزاد کا مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے۔

"آجکل" کے متعلق اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ کرتے رہیے تاکہ آپ کے مفید مشوروں کی روشنی میں آجکل کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

پچھلے مہینوں میں "آجکل" کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی تھی جس کے لئے ہم ناظرین سے معذرت کر چکے ہیں۔ اب حالات معمول پر آ گئے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اب آپ کو رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں مل جائے

امیر احمد خسرو

میرا وطن

مرا وطن
یہ مرا وطن جس کی نرم مٹی کی مست خوشبو
مجھے مرے قلب و جاں سے پیاری
مرا وطن جس کی وسعتوں میں
بہار کی زرنگار پریاں
حیات کے بے شمار نغمے
محبتوں کی حسین فضاؤں میں آرزوؤں کے خواب لے کر
نگر نگر
اپنے بانکپن سے
عجیب جادو جگا رہے ہیں
مرا وطن جس کی نرم مٹی سے کونپلوں کی طرح ہزاروں
کہانیاں سی ابھر رہی ہیں
وہ نل دمینتی وہ ہیر رانجھا
وہ تاج اور وہ حسیں اجنتا
وہی تقدس وہی وفائیں مثالِ حسنِ سحر ابھی تک
ہمارے ہمراہ چل رہے ہیں۔ یہی ہمارا عظیم ورثہ
نہ جانے کتنی طویل صدیاں
ہر ایک پل سے گذر رہی ہیں
پہاڑ، میدان، دشت، دریا
نئی امیدوں کا ہیں خزانہ

مرا وطن
جس کے جگمگاتے ہوئے سے ماتھے پہ ضو فشاں ہے
نئے زمانے کا تیز سورج
جو راز داں ہے، جو ہم سفر ہے
چمن چمن رنگ و بو کے طوفاں، نظر نظر زندگی کے جلوے
نشانِ منزل بنے ہوئے ہیں
حسین گنگ و جمن کی وادی میں خیمہ زن ہے نیا سویرا
زمردیں خواب کے جزیرے
بڑی عقیدت سے منتظر ہیں
کہ وقت
تعبیر بن کے آئے
مرا وطن جس کا ذرہ ذرہ ہے رشکِ صد مہر و ماہ و انجم
مرے خیالوں کی رہ گذر میں
کھڑا ہے یوں
جیسے کہہ رہا ہو
میں ایک تہذیب کی سحر ہوں
میں ایک نغمہ ہوں زندگی کا
ہر ایک دل میں دھڑک رہا ہوں
جو دستِ محنت میں ہیں لکیریں وہی مرے پیار کی صدا ہیں
عظیم ہوں میں۔ عظیم تر ہوں

شکنتلا سری واستو

لال بہادر شاستری

شری لال بہادر شاستری جی میرے خاوند سورگیہ شری ہری ہرناتھ شاستری کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ وہ کبھی کبھار کان پور آتے اور ہمارے یہاں ہی ٹھہرتے۔ ایک بار غالباً ۱۹۳۷ء میں لوک سیوک منڈل کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ تب میری ایک نظم "دھواں دھار" کے عنوان سے "ماہنامہ سدھا" (ہندی) میں شائع ہوئی تھی۔ راجہ رام جی سُدھا کا یہ شمارہ اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں لال بہادر جی کو یہ نظم دکھا کر بولے "ذرا شاستری جی سے پوچھیں کیسی نظم ہے؟" پوچھنے پر وہ بولے "میں کیا کوئی ناقد ہوں۔"

میرے شوہر کی عادت صبح بیڈ ٹی لینے کی تھی۔ کیا مجال کہ کوئی (خواہ دوست ہو یا رشتہ دار یا گھر کا آدمی) اس میں شامل ہوئے بنا رہ جائے۔ وہ صبح چھ بجے ہی لال بہادر جی کو جگا دیتے۔ ان دنوں غالباً وہ اتر پردیش میں پارلیمنٹری سیکریٹری تھے وہ رات میں دیر تک دفتر کا کام کرتے اور صبح دیر سے اُٹھتے مگر یہ کب ماننے والے تھے۔ لال بہادر جی غصہ ہو کر کہتے۔ صبح سویرے نیند خراب کر دی۔ ہمیں نہیں پینی چائے مگر ان کا اصرار انھیں بھی ماننا پڑتا۔

جب میرے شوہر قانون ساز اسمبلی کے اور ۱۹۵۲ء میں لوک سبھا کے ممبر چنے گئے۔ تب لال بہادر جی سے میرا زیادہ نزدیکی واسطہ رہا اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ لال بہادر جی اکثر ٹیلی گراف لین آتے۔ وہاں لوک سبھا کے تین ممبر رہتے تھے، راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن، لال اچنت رام، اور میرے خاوند۔

وہ اُن کے پاس صلاح مشورہ کرنے آتے (اس وقت لال بہادر جی ریل منتری تھے) زیادہ تر شام کو آتے۔ ۲۔ ٹیلی گراف لین میں کیوں کہ تین آدمی رہتے تھے اس لئے ہمارے پاس صرف دو کمرے تھے۔ ایک ہمارا دوسرا مہمانوں کا۔ جب وہ لوگ آپس میں بات کرتے ہوتے تو مجھے کمرے میں جانے میں ذرا ہچکچاہٹ سی ہوتی۔ میں دروازے سے ہی پوچھتی: "کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟ آپ لوگوں کی باتیں نہیں سنوں گی۔" "آیئے ہمیں اعتبار ہے آپ پر۔" لال بہادر جی جواب دیتے۔ میں مخالف پارٹی میں جو تھی۔

ایک مرتبہ شری چندر بھانو گپت (سابق وزیر اعلیٰ یو پی) ہمارے یہاں ٹھہرے۔ انہوں نے کہا دوپہر کا کھانا گپت جی ہمارے ہاں کھائیں گے اس لئے بڑا ضرور بنانا۔ میں نے کھانا تیار کیا۔ گپت جی کام میں مصروفیت کی وجہ سے نہ آ سکے۔ سرو شری لال بہادر جی، الگو رائے جی، اور مینشور دت اپادھیائے کھانے پر آئے۔ اسی وقت اتفاق سے ساوتری نگم بھی آگئیں۔ میں نے ان سے بھی کھانا کھانے کو کہا۔ کافی مذاق ہوتا رہا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ لال بہادر جی نے ساوتری جی کو خوب بنایا۔ چلتے وقت رات کے کھانے کے لیے انھوں نے مجھے اور انھیں مدعو کیا۔ شام کو مردوں کے ساتھ میں اکیلی تھی۔ اُن کی دونوں لڑکیاں اور بیوی کھانے میں شامل نہیں تھیں جب میں نے اس کی

شکایت کی تو لال بہادر جی نے بڑی سادگی سے کہا: "میری بیوی تو سیدھی سادی پرانے ڈھنگ کی عورت ہے۔"

میرے شوہر کے جہاز کا حادثہ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہوا اور وہ اس حادثے کا شکار ہو گئے۔ لال بہادر جی اس وقت دلی سے باہر تھے جب آئے تو میرے سامنے آنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کسی طرح آئے اور سر جھکا کر بیٹھے رہے۔ ان کا وہ غمگین چہرہ ابھی تک میری آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔

اتنی بڑی مصیبت آپڑی تھی کہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان کے کافی دوست، سہیوگی اور شاگرد تھے۔ صرف بھارت میں ہی نہیں غیر ممالک میں بھی۔ کچھ بھائی جیسے لوگوں نے کنارہ کشی کر لی۔ کچھ نے معمولی اخلاق بھی نہ نبھایا۔ مالی مشکلات تو زیادہ نہ ہوئیں کیوں کہ انٹک (آئی۔این۔ٹی۔یو۔سی) تقریباً دو سال تک ہر ماہ ضرورت کے مطابق دیتی رہی۔ لال بہادر جی اس وقت بہت دکھی تھے۔ دوست سے بچھڑنے کے غم کے علاوہ میرے مستقبل کی بھی انھیں فکر تھی۔ مرحوم گوبند بلبھ پنت (ان دنوں یوپی کے وزیر اعلیٰ) کی خواہش تھی کہ میں اپنے شوہر کی سیٹ سے لوک سبھا کا چناؤ لڑوں۔ مجھے تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے پارٹی (پرجا سوشلسٹ) چھوڑ کر کانگرس میں جانا بھی میں نہیں چاہتی تھی۔

۱۹۵۷ء کے عام چناؤ میں مجھ سے کانپور کے متعلق کہا گیا کہ اگر میں وہاں سے لوک سبھا کے لئے کھڑی ہو جاؤں تو جیت سکتی ہوں۔ لال بہادر جی مجھ سے ملنے آئے اس وقت میں دلی میں تھی میرے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ ماتم پرسی کے لئے آئے تھے۔ کچھ دیر مجھ سے بات کرنے کے بعد انہوں نے کرشن (لال اچنت رام جی کے لڑکے) سے پوچھا تم نے وہ بات پوچھی تھی۔ کرشن نے جواب دیا "ہاں"۔ "کیا جواب ملا۔ ہاں، یا نہیں" "نہیں کر دیا۔" کرشن نے جواب میں کہا میں سب سمجھ گئی۔ پر اس موقع پر اس سے متعلق میں نے یا انہوں نے کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ریلوے حادثہ ہونے پر جب لال بہادر جی نے استعفا دیدیا تو میں نے انھیں مبارک دی۔ سچ مچ انھیں گدی کا لالچ نہ تھا نہ ان میں کسی قسم کا غرور تھا۔ مبارک باد کے جواب میں بولے۔ جی ہاں اب میں اپنے آپ کو زیادہ ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔"

تقریباً ۶ سال پہلے لال بہادر جی کانپور آئے اور میرے شوہر (سورگیہ ہری ہرناتھ شاستری) کے سمارک بھون جا کر لکھنؤ چلے گئے۔ جلدی میں تھے۔ کچھ کام کی زیادتی کی وجہ سے بھی نہ مل سکے۔ مجھے پتہ چلا تو بہت محسوس ہوا۔ دلی میں لوک سیوک منڈل کی میٹنگ تھی ممبروں کے دوپہر کے کھانے کا انتظام اچنت رام جی کے یہاں تھا جوشی جی (کلرک) نے رسوئی گھر میں جا کر کہا "شاستری جی کو جلدی ہے انھیں پہلے کھانا دیدیں۔" اتنے میں وہ خود آ گئے اور مجھے دیکھ کر بولے۔ "ارے آپ کب آ گئیں۔ کانپور میں کیا بتلاؤں آپ سے نہ مل سکا جیسے ہی گنگا پل پر پہنچا (لکھنؤ جاتے ہوئے) تب خیال آیا۔"

"آپ کو کہا۔ آپ کی سمجھ میں تو میں مرگئی۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

اس کے بعد شام کو ایک آدھ بار لال بہادر جی نے بات کرنے کی کوشش کی۔ مگر میں تو ناراض تھی۔ کچھ دیر بعد کافی لوگوں کی چائے تھی اس وقت مجھ سے بولے: "ایسا بھی کیا غصہ، اب آگے ایسی غلطی نہ ہوگی۔ معاف کر دیجئے۔"

میں نے آہستہ سے جواب دیا: "آپ بڑے ہیں معافی کی کیا بات ہے۔ میں آپ کی اس لئے تھوڑی ہی عزت کرتی ہوں کہ آپ وزیر ہیں آپ میرے خاوند کے دوست اور خیر خواہ ہیں اس لئے میں آپ کی قدر کرتی ہوں جب آپ ہی بھول جائیں گے تو آپ کے بچے کیسے یاد رکھیں گے۔"

اپنی اس رکھائی کو یاد کر کے عجیب سا لگتا ہے مگر اس دن کے بعد جب بھی وہ کانپور آئے ہمارے یہاں ضرور آئے۔ وہی خلوص، پیار اور محبت جو ۳۰ سال قبل تھا۔ آخر تک رہا۔ تین سال پہلے میرے شوہر کی سالگرہ کے موقع پر جب آئے (لوک سیوا منڈل کے ممبران کے ساتھ) خود چائے بنا کر دی اور اماں جی سے (میری خوش دامن) بھی ملے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اماں جی کا انتقال ہو گیا۔ پھر تیرھویں پر بھی آئے۔

جب میں دلی آئی تو معلوم ہونے پر ضرور ملتے۔ اور کبھی کبھی کھانے کی دعوت بھی دیتے۔ بعد میں بھی (۵۳ سے ۵۷ء) اکثر چائے اور کھانے پر بلاتے۔ ہمیشہ کبنے کے لئے لوگوں کے جیسا ان کا سلوک رہا۔ آچاریہ نریندر دیو اور راج رشی پرشوتم داس کے بعد اگر کسی نے میرا خیال رکھا تو لال بہادر شاستری جی ہی تھے۔

ٹنڈن جی بہت بیمار تھے ایلوپیتھک دوائی نہیں لے رہے تھے لال بہادر جی خود ڈاکٹر کو لے کر آئے۔ مگر ٹنڈن جی کی ضد تھی کہ دوا نہیں کھائیں گے۔ انجیکشن نہیں لگوائیں گے۔ حالت نازک تھی۔ لال بہادر جی اور ڈاکٹر پس و پیش میں تھے۔ لال بہادر جی نے کہا دھوکا دے کر دوا پلانے سے پاپ لگے گا۔ میں نے اور ستیہ وتی جی (شریمتی اجنت رام) نے کہا اس پاپ کا بوجھ ہم اٹھانے کو تیار ہیں آپ دوا دلوائیے۔ بابو جی کو دوا دی گئی اور وہ مکمل طور سے تندرست ہو گئے۔

لال بہادر جی کی یہ خوبی تھی کہ وہ کسی کو ناراض نہیں کرتے تھے انہیں دو کٹر مخالفوں کا بھی اعتماد حاصل ہوتا تھا۔ ایک بار جب شری پرشوتم داس ٹنڈن اور پنڈت جواہر لال نہرو میں کافی اختلاف رائے ہو گیا تھا (ٹنڈن جی اُن دنوں کانگرس کے صدر تھے) تو لال بہادر جی دونوں رہنماؤں سے ملتے رہتے۔ ان دنوں اکثر دن میں کئی مرتبہ ٹنڈن جی کے پاس آتے اور بڑے سہج اور سو بھاوک ماحول میں بات چیت کرتے۔

جب لال بہادر وزیر اعظم ہوئے تو ملنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔ جب وہ پہلے غیر ملکی دورے پر روانہ ہوئے تو پالم ہوائی اڈے پر ملی اس کے بعد کچھ کے جھگڑے کے وقت ملنے کا وقت لیا۔ اُن کے پی اے نے کہا۔ آج کل بہت زیادہ مصروف ہیں مگر آپ کو وقت دیا ہے۔ آپ آجائیے۔" وہی سادگی اور نمرتا جو ہمیشہ تھی اب بھی موجود تھی۔ ہاں کچھ کے معاملے میں متفکر تھے۔ تفکر کا اظہار چہرے سے ہوتا تھا۔ بات ختم کر کے بولے "اندر مل لیجئے"۔

آخری بار ۲ اکتوبر کو ملی اس کے پہلے بھی ملنا چاہتی تھی مگر جھجک ہوتی تھی۔ اُن کا وقت بہت قیمتی ہے اس لئے اُن کا وقت کیوں لوں۔ یہ سوچ کر رہ گئی۔

۲ اکتوبر کو (اُن کے جنم دن کے موقع پر) دلی میں تھی صبح ایک نظم کی چند سطریں لکھیں۔ کرشن نے خوش ہو کر کہا۔

"آپ تو مبارک باد دینے جا رہی ہیں نا۔ نظم پوری کر کے چلئے۔ دے دیجئے گا۔"

ہم لوگ تین بجے اُن سے ملنے گئے۔ اس وقت بھیڑ نہیں تھی۔ اندر آئے پندرہ بیس منٹ تک بات کی۔ کیا معلوم تھا یہ آخری ملاقات ہے۔ چلتے وقت چائے بھی پلائی۔ کچھ روپیہ ڈیفنس فنڈ میں دیا تھا اسے گن کر پی اے سے بولے۔ اس کی رسید دے دیجئے گا۔ کرشن نے کہا۔ آپ پر نظم لکھی ہے۔

میں نے کہا "میں تو مخالف پارٹی میں ہوں۔ مگر آپ نے اس وقت ملک کی جو عزت بڑھائی ہے اس کا آتم وشواس جگایا ہے۔ مخالف بھی آپ کے مداح ہیں۔ صدیوں کے بعد اتنی بڑی بات ہوئی ہے۔ تاریخ میں آپ کا نام سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔"

پھر آیا ۱۱ جنوری کا منحوس دن۔ دوسرے دن جب صبح یہ منحوس خبر سنی تو بڑا صدمہ پہنچا۔ ملک کی کشتی منجدھار میں پڑی ہے۔ اور کھیویا چلا گیا۔ اس ڈیڑھ سال کے اندر جو کام لال بہادر جی نے کیا تھا اس کی کوئی مثال نہ تھی۔

امن کے قیام کے لئے اپنی قربانی دے دی۔ للتا جی کا سندر چہرہ اور بڑا ٹیکا یاد آگیا۔ جب دلی ان کے یہاں گئی تو وہ لپٹ کر رو پڑیں۔ مجھے ایسا لگا صرف للتا جی کے ہی سوبھاگیہ کا سورج غروب نہیں ہوا بلکہ سارا ملک یتیم ہو گیا۔ اب ملک کو ایسا نیتا کہاں ملے گا جو ملک کو اتنے تھوڑے عرصے میں احترام و عزت کی بلندی پر پہنچا دے۔

امرناتھ ودیالنکار

قومی یکجہتی اور تاریخ کی تعلیم

ملک میں انتشار اور علحدگی پسندی کے رجحانات سے ہر محبِ وطن کو سخت تشویش ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران میں اور اس کے فوراً بعد کے زمانے میں تفرقہ پسندی کے رجحانات کو سر اٹھانے کا موقعہ نہیں ملا تھا اور قوم پرستی کے شدید جذبے نے انھیں دبا رکھا تھا مگر اب رجحانات کئی شکلوں میں اُبھر کر سامنے آرہے ہیں۔

ہندوستان میں مختلف خیال، مذہب اور عقیدے کے لوگ رہتے ہیں اور سبھوں نے ہندوستان کے مشترکہ تمدن کو مالا مال کرنے میں حصہ لیا ہے۔ کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے اور ہندوستانی تہذیب کا پیرہن مختلف رنگوں کے دھاگوں سے بنے ہوئے نقش و نگار سے مزین ہے۔ وسعتِ نظر، جامعیت اور اعلیٰ ذہانت سے ایک ایسا تہذیبی اور سماجی ڈھانچہ تعمیر ہوا ہے جس نے صدیوں سے لوگوں کو متحد کر رکھا ہے اور ہندوستان کی طبعی اور ثقافتی وحدت کا باعث رہا ہے حالاں کہ کبھی کبھار گروہی مفاد اور فرقہ پرستی نے مکمل ہم آہنگی کی راہ میں روڑے اٹکائے اور ہمیں کمزور کیا مگر بحیثیت مجموعی قومی جذبہ غالب رہا مگر ان دنوں کچھ ایسے رجحانات اُبھرتے نظر آتے ہیں جن کی نشان دہی اور سدِ باب ضروری ہے۔

لمبی مدت تک غیر ملکی حکومت کے مضر اثرات نے متحد کرنے والے عوامل کو نقصان پہنچایا ہے۔ جس میدان میں قومی اتحاد کو بڑی چالاکی اور باضابطگی کے ساتھ نقصان پہنچایا گیا اور نفرت اور فرقہ پرستی کا بیج بویا گیا اور پروان چڑھایا گیا ہے وہ تعلیم کا نہایت اہم میدان تھا۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں ہماری کئی نسلوں کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ مرتب کیے گئے تعلیمی نظام کے تحت ایسا سبق پڑھایا گیا اور خصوصاً تاریخ کو اتنا توڑ موڑ کر پیش کیا گیا کہ ان کا ذہن ایک خاص ڈھانچے میں ڈھل گیا اور سماجی اور سیاسی اختلافات کا احساس بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا۔ نتیجے کے طور پر ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی جس میں ایک طرف قوم پرستی اور دوسری طرف فرقہ پرستی اور اس کی مختلف شکلوں کی باہمی آویزش ہماری روزانہ زندگی کی ایک خصوصیت بن گئی۔ صرف انگریزی زبان کو رابطے اور اندرونِ ملک کے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنا کے تعلیم یافتہ طبقے اور عوام کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج بنادی گئی اور انھیں دو الگ الگ طبقوں میں بانٹ دیا گیا۔ پھر اس کے بعد انھوں نے قومیت کے سرچشمے میں زہر ملانا شروع کیا اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ ہماری تاریخ میں جو سماجی اور سیاسی تنازعات تھے انھیں تاریخ کی درسی کتابوں میں نہایت توڑ موڑ کر اور مسخ کر کے پیش کیا گیا اور تہذیبی میل جول اور مشترکہ جدوجہد کے ذریعے جو کچھ وقوع

پذیر ہوا تھا اسے بہت گھٹا کر دکھایا گیا۔

عالمی تاریخ میں وسیع المنظری اور تنگ نظری، پورے ملک اور سماج کے تئیں وفاداری کے مقابلے میں اپنے فرقے، ذات، مذہب، یا لسانی گروہ کے تئیں وفاداری کی جو طویل کشمکش نظر آتی ہے اُسے ہمارے دانش مند اجداد نے ایک جامع، روادار اور مرکب نقطۂ نظر اپنا کر حل کر دیا تھا۔ انسانی تاریخ کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ صرف اختلاف نزاع اور جنگوں پر ہی مشتمل ہے صحیح نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تاریخ مشترکہ جدوجہد اور باہمی امداد کی ایک لمبی تاریخ ہے، ورنہ انسان اب تک جانوروں کی زندگی بسر کرتے ہوتے۔ انسان نے اپنی انفرادیت اور اپنی ذات کو پوری انسانیت میں مدغم کر دیا اور مشترکہ زندگی کے فائدوں سے مستفیض ہونے لگا۔ ہماری تاریخ کی کتابوں میں تمام دوسری باتوں کو اکثر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور صرف سیاسی تنازعوں اور جنگوں پر زور دیا گیا ہے۔ یہ تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرنے کی ایک صریحی کوشش ہے۔

۱۹۴۷ء میں فرقہ واریت اور بربریت کا جو مظاہرہ دیکھنے میں آیا اس کے بارے میں گاندھی جی نے ایک پرارتھنا سبھا میں کہا تھا "ہمارے ملک میں اس وقت تک دائمی فرقہ وارانہ اتحاد قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسکولوں اور کالجوں کی درسی کتابوں کے ذریعے ہماری تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے۔"

مرحوم جواہر لال نہرو نے اپنی مشہور کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں انگریز مصنفوں کی لکھی ہوئی ہندوستانی تاریخوں کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے "ہندوستان کی وہ تاریخیں جو ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کو پڑھنی پڑیں وہ بیشتر انگریزوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں عام طور سے برطانوی حکومت کی حمایت، اور مدح ہے اور برطانوی حکومت شروع ہونے سے قبل ہزاروں برسوں میں جو ہوا ہے اس کا حقارت آمیز انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی نظروں میں ہندوستان کی اصل تاریخ انگریزوں کی آمد کے بعد شروع ہوتی ہے جبکہ برطانوی دَور کو اچھا دکھانے اور انگریزوں کی خوبیوں کو اُجاگر کرنے کے لئے برطانوی دور کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔"

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت بھی تاریخ کی جو درسی کتابیں ہیں وہ زیادہ تر ان ہی پرانی درسی کتابوں پر مبنی ہیں اور ان میں زیادہ تر لڑائیوں اور جنگوں کا ذکر ہے جن میں ہندوستان کی آبادی کے مختلف طبقے مصروف تھے۔ تقریباً دو سو برسوں تک تاریخ کی ان درسی کتابوں نے نوجوانوں کے ذہنوں میں تنگ نظری، فرقہ پرستی اور علیحدگی کا زہر بھرا اور مشترکہ قومیت اور جذبۂ حب الوطنی کو پروان نہ بڑھنے دیا۔ مسخ شدہ تاریخ کی تعلیم سے ایک دوسرے پر اعتماد نہ رہا اور مختلف طبقوں، ذاتوں، مذہبوں یا لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے شہری ایک دوسرے کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے اور ان کے سامنے ایک ایسی صورت پیش کی گئی کہ ان کی حفاظت کرنے والے برطانوی ہاتھ موجود نہ رہے یا ہٹا دیئے گئے تو نہ معلوم ان کا کیا حشر ہوگا۔ تاریخ کی درسی کتابوں کے ذریعے لڑائی، جارحیت اور تشدد کے پرانے اور فراموش کردہ واقعات کو از سر نو زندہ کیا گیا اور انھیں اہمیت اور شہرت دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے تنازعے جو امتداد زمانہ کی وجہ سے بھلا دیئے گئے تھے یا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود بخود حل ہو گئے تھے، وہ دوبارہ ابھر کر سامنے آ گئے اور ہمارے روزمرّہ کے تعلقات کو کشیدہ کرنے لگے۔ الزام اور جوابی الزام کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک دوسرے کو دھمکیاں اور چیلنج دیئے جانے لگے۔ تاریخ کی تعلیم کو ہمارے عوام کے درمیان دائمی تفرقہ اور منافرت پھیلانے کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس طرح ہمارے تعلیمی اداروں میں نوجوانوں کے ذہنوں کی تربیت کی گئی۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہی توڑے مروڑے اور مسخ شدہ تاریخی اسباق اب بھی ہمارے نوجوانوں کو پڑھائے جا رہے ہیں اور فرقہ وارانہ تعصبات نئی نسل کے جوانوں کے ذہنوں کو مسموم کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم نے اپنے قومی نقطۂ نظر سے تاریخ کو از سر نو لکھنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ بہت دنوں پہلے انگریزوں نے اپنے نقطۂ نظر سے چار جلدوں میں "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" شائع

کی تھی۔ اب وہ اس کا نیا اور نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع کرنے والے ہیں۔ دوسی دوسرے نقطۂ نظر سے ہندوستان کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں جو چار جلدوں میں ہوگی اور ہر جلد میں ۸۰۰ صفحات ہوں گے۔ اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ امریکی اسکالر بھی ہندوستان کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں اور کئی جلدوں میں ایک جامع تاریخ کی اشاعت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں صرف ہم نے اپنے قومی فرض سے کوتاہی کی ہے اور اپنے طلبا اور دُنیا کو ہندوستان کی ایک مسخ شدہ تاریخ پڑھنے کی اجازت دے رکھی ہے۔

اسلام اور اسلامی دنیا سے ہمارے تعلقات کے بارے میں جو تاریخی حقائق پیش کئے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ تحریف کی گئی ہے اور واقعات کو مسخ کرنے کی ایک شعوری کوشش صاف نظر آتی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے ادوار کو سماجی، تہذیبی اور سیاسی لحاظ سے مختلف ادوار میں بانٹنے کے بجائے فرقہ وارانہ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے جیسے ہندو دور، مسلم دور اور برطانوی دَور تاکہ شروع ہی سے ہمارے بچوں کا ذہن فرقہ وارانہ خانوں میں بٹ جائے۔ یہ تقسیم کتنی شرارت آمیز۔ غیر مربوط اور سائنسی لحاظ سے غلط ہے اس کا احساس اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے مورّخ نام نہاد ہندو دور کی تاریخ وجے نگر کی سلطنت کے زوال پر ختم کرتے ہیں اور پھر طلبا کو ساتویں صدی عیسوی میں لاتے ہیں تاکہ وہ مسلم دور کی تاریخ کا آغاز کریں جو سندھ پر عربوں کے حملے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ مسلم دَور آخری مسلم فرماں رواں بہادر شاہ کی معزولی پر ختم ہوتا ہے اور پھر طلبا پیچھے جا کر ہندوستان میں پرتگیزیوں کی آمد سے متعلق واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے پس منظر کو سمجھ سکیں۔ اس غیر مربوط تقسیم کی وجہ سے دو بڑے فاتح راجندر چولا اور محمود غزنی جو ہم عصر تھے اور ہندوستان کے افق پر ایک ہی زمانے میں ابھرے تھے وہ دو مختلف ادوار میں جگہ پاتے ہیں۔ یعنی اول الذکر ہندو دور میں اور ثانی الذکر مسلم دور میں۔ آٹھویں سے سولہویں صدی عیسوی کے درمیان مختلف نام نہاد، ہندو اور مسلمان ریاستوں کی تاریخ ایک دوسرے سے یعنی ایک کل سے علحدہ نہیں کی جا سکتی۔ ایک دوسری مثال لیجئے۔ پندرھویں صدی میں اڑیسہ کی سلطنت راج محل سے ترچنا پلی تک پھیلی ہوئی تھی اور اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی سلطنت تھی جب کہ تاریخ کی کتابیں اس دور میں توجہ دہلی پر مرکوز کراتی ہیں جب کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی تاریخ کے پورے اجزائے ترکیبی کا جائزہ نہیں لیا اور نہ کبھی ان واقعات کے مجموعی تاثر کو آنکنے کی کوشش کی جن کا ایک دوسرے پر عمل اور ردِ عمل ہوتا رہا ہے۔ اُن کا مقصد ایسے ہندوستان کی غیر مربوط تصویر پیش کرتا ہے۔ جہاں مختلف فرقے اور گروہ بالکل الگ تھلگ طور پر اپنے سماجی اور تہذیبی زندگی کے نشو و نما میں لگے ہوئے تھے اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے میں مصروف تھے۔ لُطف کی بات تو یہ ہے کہ آرٹ اور سنگ تراشی کو بھی ہندو، بدھ، جین اور مسلم آرٹ کا نام دیا گیا۔ ہندوستانی آرٹ کے ماہر رائے کرشن داس نے اس تقسیم کی مجہولیت کو ثابت کر دکھایا ہے۔ انھوں نے مصوری کے مغل اسکول کے ابتدائی خدوخال اجاگر کرتے ہوئے اس کا تعلق اجنتا سے دکھایا ہے

جس ریاست کا فرماں روا مسلمان ہوتا تھا اُسے مسلم ریاست اور اس طرح ہندو فرماں روا کی رعایت سے ہندو ریاست کا نام دیا گیا۔ اس کے حکومت کی نوعیت کیا تھی، ریاست اور عوام کے تعلقات کس طرح کے تھے اور انتظامیہ کی صورت کیا تھی ان باتوں کو اہم نہیں سمجھا گیا مثلاً اگر مغلوں کے انتظام سلطنت کا بغور اور باریک بینی کے ساتھ قبل کے نام نہاد ہندو یا بعد میں شیواجی کے انتظام ریاست سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پٹھان بادشاہ شیر شاہ سوری، اور اس کے بعد اکبر اور اس کے جانشینوں نے مملکت کے انتظام و انصرام کے جو طریقے اپنائے تھے وہ اپنی ارتقائی شکل میں بنیادی طور پر وہی تھے جو ابتدائی دور میں وضع کئے گئے تھے اور

جن کو ٹلیہ اور ہندوستانی انتظام سلطنت کے دیگر مشہور ماہرین نے مرتب کیا تھا. لیکن ہندوستان کے نوجوانوں کے ذہنوں پر ایک ایسا اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت شروع ہوتے ہی اور بعد میں پٹھان اور مغل بادشاہوں کے دور میں بھی ملکی انتظام و انصرام کا ایک بالکل اسلامی اور نیا طریقہ نافذ کیا گیا جو ہندوؤں کے مزاج اور افتاد طبع کے لئے بالکل ان میل اور اجنبی تھا اور اس کی ابتدا غیر ملکی سرزمین میں ہوئی تھی اور مقامی طریقہ حکومت سے اس کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا اس طرح گویا ہندوستان کی تاریخ کا تسلسل خصوصاً سیاسی اور انتظامی اداروں کے معاملے میں محمود غزنی اور بعد میں شہاب الدین غوری کے حملے کے بعد ٹوٹ گیا ہے۔

تاریخ کی کتابوں میں ساتویں صدی کی ابتدا اور محمود غزنی کے حملے کے بیچ کے زمانے میں لگ بھگ تین سو برسوں تک عربوں اور ہندوستانیوں میں جو گہرے روابط رہے ہیں انھیں تقریباً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو عالموں اور عرب عالموں کے درمیان بڑے دوستانہ اور گہرے ذہنی اور تہذیبی تعلقات تھے اور خیالات اور نقطہ نظر کا لین دین اپنے عروج پر تھا ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس وقت ایشیا اور یوروپ میں بڑی تیزی کے ساتھ اسلام کا پھیلاؤ ہو رہا تھا اور عرب اسلامی دنیا نئے خیالات اور تازگی افکار سے معمور تھی. بہرحال اس زمانے میں ہندوستان کے ہندوؤں اور عرب کے مسلمانوں کے تعلقات میں اسلام کی نام نہاد ناروا داری کا شائبہ تک نہ تھا. لیکن برطانوی مورخوں نے ہندوستان اور دوسری جگہوں میں اسلام کو بالکل دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے۔

محمود غزنوی نے سن ۱۰۰۱ء سے ہندوستان پر حملے شروع کئے اور سنہ ۱۰۲۹ء میں اس کی موت ہو گئی. شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۲ء میں دلی فتح کی. لیکن ہندوستان کی تاریخی کتابیں اس دو سو برس کی تاریخ کے بارے میں خاموش ہیں. اس مدت میں دونوں قوموں کے درمیان جو تہذیبی تجارتی اور سیاسی تعلقات پروان چڑھ رہے تھے اور جن کا ذکر البیرونی اور دوسرے مشہور فضلا نے کیا ہے اس سے جان بوجھ کر صرف نظر کیا گیا ہے. ان کے پیچھے جو مقصد ہے اس کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے. مثلاً ان تاریخ کی کتابوں میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے جس کا انکشاف رائے بہادر کاشی ناتھ دکشت نے کیا ہے کہ محمود غزنوی نے جو نئے سکے جاری کئے تھے ان میں ایک طرف عربی میں کلمہ اور دوسری طرف سنسکرت میں اس کا ترجمہ کندہ تھا۔

وزیرستان میں ایک بڑا کتبہ ملا ہے جس میں سنسکرت اور منگولین دونوں زبانیں کندہ ہیں اس سے ظاہر ہے کہ وزیرستان کا پڑھا لکھا طبقہ چودھویں صدی کے آخر تک سنسکرت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ راجستھان کے مشہور مورخ جیمس ٹاڈ نے ہولکر کے دربار کے ریذیڈنٹ کے ایما پر اپنی مشہور کتاب Annals of Rajasthan لکھی تھی. جس میں "مسلم حکمرانوں کے خلاف راج پوتوں کی بہادری کی داستانیں بیان کی گئی ہیں یہ کام ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کیا گیا تھا تاکہ راجپوت اور مسلمانوں میں نفرت پیدا کی جائے۔ اب بھی بعض لوگ اس کتاب میں درج افسانوں کو مصدقہ تاریخ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

رانا کمبھ کو ایک عظیم جنگجو اور ہندوؤں کا محافظ کہا گیا ہے جس نے ناگور کی مسجد کو مسمار کر دیا تھا،، مگر ان مورخوں نے اس امر کا انکشاف نہیں کیا کہ اس بہادر ہندو حکمران نے چتوڑ پر فتح کی یادگار کے طور پر جو ستون تعمیر کرایا تھا. اس پر برہما، وشنو کی مورتوں کے علاوہ عربی اور ناگری رسم الخط میں "اللہ" کا نام بھی کندہ کرایا تھا۔

مرحوم ڈاکٹر سی ایچ اوجھا نے ناقابل تردید طور پر ثابت کر دکھایا ہے کہ لفظ راجپوت اور راجپوت ذات کا تصور سولہویں صدی عیسوی سے پہلے پیدا نہیں ہوا تھا. مگر اس کے باوجود بہت سی تاریخ کی درسی کتابوں میں ہندو اور مسلم ادوار کے بیچ میں ایک راجپوت دور بھی موجود ہے. میں ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں ہماری تاریخ کی درسی کتابوں میں اصلی ہندوستان کا پتہ چلانے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے. انگریزی زبان پر مکمل انحصار اور ہندوستانی ماخذ کو نظر انداز کر دینے سے بڑی عجیب و غریب غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

نابل ناڈ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کا نام "ایلا ملائی" ہے۔ انگریز مورخوں نے اس کا ترجمہ کر دیا اور اس کو Cardaman Hill کہا۔ ایک صاحب نے ہندی اٹیلس شائع کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اس پہاڑی کا اصل نام جو اس علاقے میں کافی مشہور ہے معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور انگریزی سے ترجمہ کر کے اس کا نام "الائچی کی پہاڑیاں" لکھدیا

ماؤنٹ ایورسٹ ابھی تک یورپی کوہ پیما ایورسٹ کے نام سے موسوم ہے اور کسی نے مشرقی نیپال کی دُودھ کوسی وادی میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی ہے جہاں سے دنیا کی یہ بلند ترین چوٹی دکھائی دے رہی ہے۔ گمان اغلب ہے کہ مقامی لوگوں نے اس چوٹی کو کوئی نہ کوئی نام ضرور دیا ہوگا جیسا کہ انھوں نے دوسری چوٹیوں (نندہ دیوی۔ کنچن جنگا وغیرہ) کو دیا ہے۔ شری جے چند ودیا النکار نے اس سلسلے میں تحقیق کی ہے اور انھیں اس چوٹی کا ہندوستانی نام ملا ہے۔ بمبئی کے نزدیک مشہور ایلی فینٹا کے غاروں کا اصل نام بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ وہاں کے ٹوٹے پھوٹے مجسمے اور مورتیاں ہمیں پرتگیزی بحری قزاقوں کی لوٹ مار کی یاد دلاتے ہیں۔ ان غاروں کو یہ نام ان ہی بحری قزاقوں نے دیا تھا مگر ہم نے گپتا حکمرانوں کے بنائے ہوئے ان خوبصورت غاروں کا اصلی نام اور اس کی صحیح تاریخ سے اپنے بچوں کو واقف کرانے کے لئے کچھ نہیں کیا ہے اس سلسلے میں چھان بین اور تلاش و جستجو کی بہت ضرورت ہے۔

مشہور مورخ کاشی پرشاد جیسوال مرحوم نے اس کام کے لئے لوگوں میں جوش و جذبہ پیدا کیا تھا۔ ہندوستانی اسکالروں کا تعاون حاصل کیا اور ایک پبلشر بھی اشاعت کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر راجندر پرشاد مرحوم کی صدارت میں "اتہاس پرشد" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا جس کے سیکریٹری سری جے چند ودیا النکار تھے۔ اس ادارے نے دوسرے مورخوں کے تعاون سے اس عظیم کام کو سرانجام دینے کا بیڑہ اٹھایا تھا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر حبیب نے مشورہ دیا تھا کہ دہلی کے سلطانوں کے دور کی مستند تاریخ لکھنے کے لئے سنسکرت ماخذوں کی بھی چھان بین کی جائے۔ اب تک اس دور کی تاریخ کا ماخذ صرف فارسی میں لکھی ہوئی کتابیں اور مخطوطے ہیں

نخ

جا رہا ہے

نہ ہونے

گی جب د

ہما

نسلیں آر

اصل صورت

نسلی تقسیم ند

بڑی حد تک

ہیں

ہے بلکہ خیا ... لی پیدا ہوتی ہے۔ تناسخ کے مسئلے کے اوّلین مبلغ جنوبی ہند کے فلسفی تھے۔ آج کا ہندوستانی کلچر آریائی اور دراوڑی تہذیب کا ایک حسین مرقع ہے۔ مگر ہمارے مورخوں نے اس پہلو کو پوری طرح اجاگر نہیں کیا ہے۔

علاقائی تعصب، فرقہ واریت، اور زبان پرستی کو ہمارے ملک میں اس لئے فروغ حاصل ہوا ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابوں نے حقائق کو بڑے غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ یہ بھول گیا، جنھوں نے اپنے اجداد سے جو میراث حاصل کی ہے وہ ہندوستان کا ملا جلا کلچر ہے۔ ہم لوگوں نے بعض بنیادی تصور، اور سماجی اور تہذیبی اقدار کو ورثے میں پایا ہے اور ہماری تاریخ صرف اس ملی جلی یا مشترکہ تہذیب کی تاریخ ہو سکتی ہے۔ یہ تاریخ صحیح طور پر اسی وقت لکھی جا سکتی ہے جب مورخ کا رویہ یا اس کا نقطہ نظر ہمدردانہ ہو۔

ہم میں اس وقت تک اتحاد، یک جہتی، رواداری پیدا نہ ہوگی جب تک کہ ملک کی مسخ شدہ تاریخ موجود رہے گی۔ لہٰذا اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہماری تاریخ اس ڈھنگ سے لکھی جائے کہ قومیت کے افکار اور جذبات ہماری نئی نسل کے ذہن و دماغ پر پوری طرح چھا جائیں۔

ایک مہینہ بعد

آزاد صا[illegible] ...نج حیات مرتب کر رہے ہیں اس کا ایک باب درج ذیل ہے

والد کی موت کے بعد اُن کا کمرہ ہم لوگوں کی مستقل آماجگہ بن گیا۔ رات کو ہم دیر تک [illegible] رہتے اور آپس میں باتیں کرکے اپنا اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے [illegible] ہر چیز اپنی جگہ پہ تھی۔ اُن کی دو میزیں جن پر کتابیں، بیاضیں، مسودے دوستوں کے خطوط رکھے تھے، کرسی، اوپر نیچے رکھے ہوئے بکس، کھونٹی پر لٹکے ہوئے ان کے کپڑے، الماری میں دوا کی شیشیاں اور مسودے وغیرہ، طاق پر رکھی ہوئی فائلیں جن میں نظموں کی نقول تھیں، حقہ، چھڑیاں، ارگیسٹر، اُن کا خالی پلنگ یہ سب کچھ اپنی اپنی جگہ پر موجود تھا صرف اس کمرے کی روح جاچکی تھی۔

سجا کر اپنے ہنگاموں کی محفل چھپ گیا کوئی
بھری محفل ہے اور وہ صاحبِ محفل نہیں ملتا

والد نے دونوں میزوں پر — کتابوں، بیاضوں، مسودوں وغیرہ کے اوپر میز پوش ڈال دیئے تھے۔ میں نے بہت چاہا کہ ان کتابوں اور بیاضوں وغیرہ کو دیکھوں لیکن جب بھی اُن کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمنڈ آتا تھا۔ ہمت جواب دے جاتی تھی۔ اسی عالم میں کوئی ایک مہینہ گذر گیا۔ اس ایک مہینے میں میں ہری دوار سے بھی ہو آیا تھا۔ وہاں میں اُن کے پھول گنگا کی نذر کرنے گیا تھا۔ ہری دوار سے دو ایک میل اوپر کنکھل نامی ایک مقام ہے ہنگاموں اور شور وشغب سے دور۔ گنگا کا پانی یہاں اتنا شفاف ہے کہ کئی فٹ نیچے ریت اور ہڈیاں سطحِ آب پر رکھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہاں میں نے ان کے پھول گنگا کی نذر کیے اور ساتھ ہی اپنے آنسو بھی۔

ہری دوار پہنچ کے اس موضوع پر چند اشعار موزوں ہوئے تھے۔ اس وقت وہی اشعار سفرِ ہری دوار کی یادگار کے طور پر میرے پاس ہیں۔

جس نے دیئے وطن کو ہمیشہ سخن کے پھول
آیا ہوں لے کے آج اُسی فخرِ وطن کے پھول

اے موجِ آب تیری طرح ہیں یہ پاک وصاف
یہ پھول ہیں خلوص ووفائے چمن کے پھول

یہ اس کے پھول ہیں کہ جس اہلِ کمال نے
جو لفظ بھی کہا مہک اٹھا وہ بن کے پھول

باطن میں ہیں گلاب وسمن سے بھی کچھ لطیف
ظاہر میں گو نہیں یہ گلاب وسمن کے پھول

اِن میں شمیمِ حسنِ عمل ہے بسی ہوئی
لایا ہوں چُن کے گل کدۂ فکروفن کے پھول

گنگا کی موج دامنِ دل کیوں نہ وا کرے
یہ پھول جب ہیں موجِ بہارِ سخن کے پھول

ہری دوار جانے سے قبل دسویں کی رسم ادا ہوچکی تھی۔ دسویں کی رسم جیسا کہ اس لفظ سے ظاہر ہے انتقال کے دس روز بعد منائی

جاتی ہے اُس دن ماتم کی تمام رسوم ختم کر دی جاتی ہیں اور مرنے والے کی تسکین روح کے لئے جماعتی طور پر پرارتھنا کی جاتی ہے یہ رسم ۱۵ جنوری کو منائی گئی اس رسم کی ابتدا وید پاٹھ سے ہوئی اور اختتام تلاوتِ کلام پاک پر۔ پنڈت شو دت نے وید پاٹھ کیا۔ پنڈت جودھا رام نے گیتا کا ایک ادھیائے (باب) پڑھا۔ سردار امر سنگھ نے سکھمنی پڑھ کے سنائی اور قاری نثار احمد نے قرآن مجید کی تلاوت کی۔ اس پروگرام کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ وید پاٹھ کے بعد ان تینوں حضرات نے از خود اپنے اپنے عقیدے کے مطابق مرحوم کی روح کے لئے دعا کی۔

چند روز بعد میں ایک کام کے سلسلے میں اپنے دوست ویاس دیو مصرا صاحب سے ملنے کے لئے گیا۔ وہاں سید حسین علی جعفری صاحب بھی موجود تھے۔ والد کا ذکر ہو رہا تھا دسویں کی بات چلی تو جعفری صاحب نے ہم لوگوں کو بتایا کہ جب مرحوم صاحب کی ارتھی گھر سے اٹھی تو لان کے دروازے کے قریب میں نے دیکھا کہ ارتھی کو کندھا دینے والوں میں دو ہندو ہیں ایک مسلمان ہے اور ایک سکھ ہے۔

اصل میں اُن کی ساری زندگی اسی نظریے کی روشنی سے منور تھی۔ مذاہب کی وحدت پر اُن کا پختہ ایمان تھا اور یہ قطعہ

اختلافاتِ مذاہب جملہ اوہام است و بس
یک حقیقت جلوہ گر در کفر و اسلام است و بس
از تعصب ساغرِ شیخ و برہمن شد جدا
ورنہ در میخانہ یک ساقی و یک جام است و بس

وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے۔

مذکورہ رسوم ختم ہو چکیں تو پھر میں نے اس مشکل کام کی طرف ہاتھ بڑھایا جس کی راہ میں یادیں اور آنسو ہمیشہ ایک رکاوٹ بن کے حائل رہے تھے لیکن اب کے میں نے ہمت کر کے ایک میز سے میز پوش سرکایا اور دو چار کتابیں اٹھائیں سب سے پہلی کتاب ایک ڈائری تھی نقوش ڈائری سنہ ۱۹۶۲ء۔ اسے کھولا تو رعشہ دار ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ اشعار نظر آئے ؎

سانس رکتی ہے دمِ گفتار اب
بات کرنا بھی ہوا دشوار اب



تلوک چند محروم

آخری وقت آگیا محروم کا
ایک دن آخر اسے آنا ہی تھا
جسم سے اے روح رشتہ توڑ دے
چھوڑ دے گرتا ہوا گھر چھوڑ دے

محروم تنِ ضعیف اپنا
ملبہ ہے گرے ہوئے مکاں کا
دیکھو تو کہاں اٹک رہی ہے
ملتا بھی کہیں نشاں ہے جاں کا

میں اس وقت ایسے عالم میں نہیں ہوں کہ ان اشعار پر کسی قسم کا تبصرہ پیش کروں اس وقت صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اشعار پڑھ کر میری روح کانپ اٹھی نہ جانے وہ کب سے اپنی روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔
چند صفحے اور پلٹے تو یہ قطعہ نظر پڑا۔

ٹھوکریں دل کہاں کہاں کھائے
ذاتِ حق پر اگر یقیں نہ کرے
جائے اس کی رضا جہاں لے جائے
ہو اطاعت گزیں، نہیں نہ کرے

یہ قطعہ یکم جنوری ۱۹۶۲ء کے صفحے پر لکھا ہے لیکن اس پر تاریخ ۱۸ر جولائی ۱۹۶۲ء کی درج ہے۔ اس کے بعد اس ڈائری کے متعدد اوراق خالی ہیں اور خالی اوراق کے بعد تین چار صفحات پر جو ڈائری کے مطابق ۱۵ جون سے شروع ہوتے ہیں یہ نظم درج ہے۔

وہ شاعر تھا مگر اک عام انساں کی طرح گذری
جہانِ بے بقا کی الجھنوں میں زندگی اُسکی
بہت اچھا تھا نام اس کا مگر محروم کہلایا
رہی مقبول اہلِ درد و دل میں شاعری اس کی
لڑکپن اور آغازِ جوانی میں وہ خوش دل تھا
قضا نے چھین لی دو چار جھٹکوں میں خوشی اُسکی
رہا جب تک جہاں میں مونس و ہمدم رہے اسکے
غم و اندوہ و یاس و بے دلی افسردگی اُس کی
ہوا اشعار میں ہر چند وہ گفتار کا غازی
مگر کردار میں خواہش نہ پوری ہوسکی اُسکی
"یہ عالم خود گواہِ ہستیِ خلاقِ عالم ہے"
نہ آگے بڑھ سکی اس مرحلے سے آگہی اُسکی
رہا بیگانۂ منزل حصولِ دین و دنیا میں
کہ سنگِ راہ نکلی ہر قدم پر بے بسی اُسکی
کئی اصحاب نے عالِم اُسے مانا عقیدت سے
نہ بے عیب اُس کی اُردو تھی نہ خالص فارسی اُسکی
توقع سے سوا اہلِ زباں نے داد دی اس کو
زباں دانی میں تھی گو قابلیت بس یونہی اُسکی
"محبانِ وطن" کی شان میں کہتا ہے یہ نظمیں
حکومت سے شکایت خود غرض لوگوں نے کی اُسکی
رہا محفوظ لیکن قیدِ زنداں کی عقوبت سے
مقدر ہی کچھ ایسا تھا نہ تھی یہ بزدلی اُس کی
خدا جانے کہاں سے ہو گئے یہ نیش زن پیدا
بظاہر تو کسی سے دشمنی ہرگز نہ تھی اُس کی
خوش و ناخوش سفر طے زندگانی کا ہوا اور اب
دعائے خیر کی طالب ہے روحِ ملتجی اُس کی
خدا کے فضل سے آزاد اُس کا نام لیوا ہے
کہ جس کے دم سے دُنیا میں رہی دلبستگی اُسکی
بتائیں اور کیا نام و نشاں اے پوچھنے والو
کہ جمنا میں بہائی جا چکی ہے راکھ بھی اُس کی

یہ اُن کا اپنا مرثیہ ہے جو پہلی بار اُن کے انتقال کے بعد میری نظر سے گذرا ہے۔ اس مرثیے سے قبل دو شعر اور بھی قریب قریب اسی مضمون کے درج ہیں ؎

اس کی دھڑکن سے ہیں آثارِ بغاوت پیدا
بے رُخی کرنے پہ آمادہ ہے دلِ خیر کرے
دمِ آخر ہے یہی ایک تمنا اپنی
خالقِ ارض و سما خاتمہ بالخیر کرے

ان دو اشعار کے نیچے انگریزی میں لکھا ہے ۔

۳۰-۲ دل کے مرض کا پہلا حملہ

لیکن دراصل دل کے مرض سے متعلق اُن کا خیال صحیح نہیں تھا۔ جن ڈاکٹروں اور اطبا کے وہ زیرِ علاج رہے اُن سب کی رائے یہی تھی کہ انھیں دل کی تکلیف نہیں ہے۔ اِن کا مرض ریاح کا مرض ہے۔ ولنگڈن نرسنگ ہوم میں اُن کا دو چار بار کارڈوگرام بھی ہو چکا تھا اور ڈاکٹروں کی رائے یہی تھی کہ وہ دل کی تکلیف میں نہیں ریاح کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ چند حکیموں نے بھی اُن کا علاج کیا اِن کی بھی رائے ڈاکٹروں کی رائے سے ملتی تھی۔ ایک بار آپا حمیدہ سلطان ایک حکیم صاحب کو لے کر ہمارے یہاں آئیں۔ انہوں نے والد کا معائنہ کیا اور کہا کہ آپ جسے دل کا مرض سمجھے ہیں یہ دراصل ریاح کی تکلیف ہے لیکن اِن دونوں امراض کے علامات ایک سے ہیں۔ اسی لئے آپ کو مغالطہ ہو رہا ہے۔ لیکن ان تمام حضرات کی آراء کے یکساں ہونے کے باوجود انہیں گمان یہی رہتا تھا کہ وہ دل کے مرض میں مبتلا ہیں

جہاں مذکورہ مرثیہ ختم ہوتا ہے وہاں اگلے صفحے پر ۲۳ جون کی تاریخ میں یہ شعر درج ہے۔

نخلِ تن پر ہے خزاں کی مردنی چھائی ہوئی
دست و بازو ہیں کہ یہ شاخیں ہیں مرجھائی ہوئی

لیکن ڈائری کی ان تاریخوں کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ۲۴ جون ۱۹۶۲ء کی تاریخ والے صفحہ پر یہ قطعہ درج ہے۔

دل کا روگ ہوا طولانی
بڑھتے ہیں جیسے شام کے سائے
چھوڑیں اب تدبیر کا دامن
دیکھیں جو تقدیر دکھلائے

اور اس کے نیچے تخلص کے ساتھ ۸ جولائی ۱۹۶۲ء کی تاریخ درج ہے غالباً یہاں تک انہوں نے اس ڈائری کو ڈائری کے طور پر نہیں بلکہ بیاض کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن اس تاریخ کے بعد انہوں نے ڈائری کو تاریخ وار ہی استعمال کیا ہے اور یکم جولائی سے ۲ اکتوبر تک اپنی علالت کا ذکر تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ ڈائری خاموش ہے اور اس کے علاوہ مجھے کوئی ڈائری ایسی نظر بھی نہیں آئی جو اُن کی علالت کی داستان سُناتی ہو لیکن میز پر رکھی ہوئی متعدد کتابیں اُن کے مشاغل کے بارے میں خاموش نہیں ہیں۔ ان ڈائریوں کے بعد جو سب سے پہلی کتاب میں نے اُٹھائی وہ عمر خیام کی رباعیات کا ایک نسخہ تھا۔ یہ نسخہ انہیں غالباً کسی دوست نے تحفے میں دیا تھا۔ دینے والے کا نام لکھا ہے نیاز محمد خاں جھجر ضلع روہتک اور کتاب پر ۲۸ نومبر ۱۹۲۱ء کی تاریخ پڑی ہے میں نے اس نسخہ کی ورق گردانی کی تو صفحہ ۹ پر دیباچہ میں عمر خیام کی یہ رُباعی نظر آئی۔

در دیدۂ تنگ مور نور است از تو
در پائے ضعیف پشہ زور است از تو
ذاتِ تو سزاست مر خداوندی را
ہر وصف کہ ناسزاست دور است از تو

حاشیے پر اس کا مندرجہ ذیل اردو ترجمہ نظر آیا۔

ہے دیدۂ تنگ مور میں نور ترا
اور پائے ضعیف پشہ میں زور ترا
شایاں ہے تری ذات خداوندی کے
بالا ہر ناسزا سے مذکور ترا

خیام والد کے محبوب ترین شعراء میں سے تھے۔ خیام کی متعدد رُباعیات کے اُردو رباعی میں ترجمے بھی آپ نے کئے ہیں اور یہ ترجمے رباعیاتِ محروم کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہیں لیکن اس نسخے کے حاشیے پر جو ترجمے مجھے نظر آئے ہیں یہ غیر مطبوعہ ہیں اور "رباعیاتِ محروم" کے تیسرے ایڈیشن میں بھی جو اس وقت زیرِ طبع ہے شریکِ اشاعت نہیں ہیں۔ اب یہ کوشش کروں گا کہ یہ تمام ترجمے اسی زیرِ طبع ایڈیشن میں شامل ہو جائیں۔

صفحہ نمبر ۱ پر یہ رباعی درج ہے۔

بکشائے درے کہ در کشائندہ توئی
بنمائے رہے کہ رہنمایندہ توئی
من دست بہ ہیچ دست گیرے ندہم
کایشاں ہمہ فانی اند و پایندہ توئی

اس کا یہ ترجمہ حاشیے پر درج ہے۔

در کھول کہ ایک در کشائندہ ہے تو
رستہ دکھلا کہ رہنمایندہ ہے تو
تجھ بن کوئی دستگیر میرا ہے کہاں
سب فانی ہیں اور ایک پائندہ ہے تو

اب چند اور رباعیات کے ترجمے ملاحظہ فرمائیے۔

خیام

آں بُت کہ دلم زہجر او زار شدست
او جائے دگر بہ غم گرفتار شدست
من در طلبِ علاجِ خود چوں کوشم
چوں آنکہ طبیب مات بیمار شدست

ترجمہ

وہ بُت جس کے لئے یہ دلِ زار ہوا
غم میں کسی اور کے گرفتار ہوا
اب میرے علاج کی رہی کیا صورت

خود میرا طبیب جبکہ بیمار ہُوا

خیّام

گل گفت بہ از لقائے من روئے نیست
چندیں ستم گلاب گر بارے چیست
بلبل بہ زبانِ حال با او می گفت
یک روز کہ خندید کہ سالے نگریست

ترجمہ

گل نے یہ کہا کون ہے خوش رو مجھ سا
کیوں مجھ پہ عرق ساز کا ہے ظلم اتنا
بلبل کی زبانِ حال پر یوں آیا
اک روز ہنسا کوئی تو برسوں رویا

خیّام

آں بادہ کہ لعلِ ناب می خوانندش
معمارِ دلِ خراب می خوانندش
رطلے دو سہ سنگیں بہ من آرید سبک
خیراب بود شراب می خوانندش

ترجمہ

جس چیز کو لعلِ ناب کہتے ہیں آپ
تسکینِ دلِ خراب کہتے ہیں آپ
خیراب کہو اُسے بقول خیّام
کس منہ سے اُسے شراب کہتے ہیں آپ

خیّام

روزے کہ گزشتہ است ازو یاد مکن
فردا کہ نیامدست فریاد مکن
برنامدہ و گذشتہ بنیاد منہ
حالے خوش باش و عمر برباد مکن

ترجمہ

جو دن کہ گذر گیا اُسے یاد نہ کر
کل دور ہے کل کے لئے فریاد نہ کر
مت کر فکرِ گزشتہ و آئندہ
خوش رہ فی الحال عمر برباد نہ کر

ترجموں کے علاوہ بعض رباعیات پر صا یا سا کے متعدد نشان بنے ہوئے ہیں یہ ان کی پسندیدگی کی علامات تھیں جس شعر کو بہت پسند کرتے تھے اس پر صا یا سا کے نشان لگا دیتے تھے۔

اسی طرح اور متعدد رباعیات پر اُن کی پسندیدگی کی علامات درج ہیں لیکن معلوم نہیں یہ انکے کس زمانے کا انتخاب ہے اس لئے کہ رباعیات عمر خیام کے متعدد نسخے مختلف ادوار میں اُن کے زیرِ مطالعہ رہے۔

اس نسخے میں ایک اور دلچسپ بات مجھے نظر آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں جہاں خیام کا کسی اور شاعر کے ساتھ توارد نظر آیا ہے اس کا اظہار انہوں نے حاشیے میں کر دیا ہے مثلاً اس رباعی

تا باز شناختم من ایں پائے ز دست
ایں چرخِ فرومایہ مرا دست بہ بست
افسوس کہ در حساب خواہند نہاد
عمرے کہ مرا بے مے و معشوق گذشت

کے سامنے حاشیے میں غالب کا یہ شعر درج ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں[1]

اسی طرح اس رباعی

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است
نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بہ بے خودی برآرم نفسے
مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

---

[1] جوش نے غالباً خیام کی رباعی سے یہ مضمون لیا ہے۔
اُس عمر کا بھی حساب لے گا سرِ حشر
جو عمر کے ہائے ہائے کرتے گذری

کے سامنے غالب کا یہ شعر لکھا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

اس نسخے میں جہاں کتابت کی اغلاط ہیں وہاں اُن کی تصحیح کر دی گئی ہے مثلاً
"نے لائق مسجدیم و نے خور و بہشت" کو صحیح کر کے انہوں نے اپنے ہاتھ سے "نے خور و کنشت" کر دیا ہے۔ بہشت کا قافیہ دراصل چوتھے مصرعے میں ہے "غم نے دین و نہ دنیا و نہ امید بہشت" اس طرح "درصحبت عمر بے وفائی ماندات صحبت" عمر بے وفاقی ماندات کر دیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ "دُشمن بہ غلط گفت کہ فلیفم" کو انہوں نے دشمن بہ غلط گفت من فلسفیم بنا دیا ہے۔

اصل میں اُن کا کتاب پڑھنے کا طریقہ یہی تھا۔ ہر لفظ پر گہری نظر ڈالتے تھے اور جہاں کہیں شک پڑ جاتا تھا مختلف نسخوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ کوئی نہ کوئی لغت ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے ایک بار میرے دوست سراج الدین ظفر نے فیروز سنز کی متعدد مطبوعات مجھے تحفۃً بھیجیں۔ اُن میں دو ایک لغت کی کتابیں تھیں وہ انھوں نے میرے پاس دیکھیں تو یہ کہہ کر اپنے کمرے میں لے گئے کہ اُن کی ضرورت مجھے زیادہ ہے۔

مجھے وہ لغت کی طرف رجوع کرنے کی اکثر ہدایت کیا کرتے تھے اور کئی بار انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ تمہاری فارسی اس لئے کمزور ہے کہ تم نے مصدر نامہ زبانی یاد نہیں کیا۔ میں اپنی فارسی کی مشکلات ہمیشہ اُن کے پاس لے جاتا تھا اور شعر یا لفظ کے مطلب سمجھانے کے بعد وہ یہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مصدر نامہ ایک بار سارا دیکھ ڈالو وہ مجھ سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ تمہیں ڈاکٹر اقبال، صوفی تبسم سید عابد علی، اور ڈاکٹر عبداللہ ایسے اساتذہ ملے لیکن زبان سیکھنے کے لئے تمہیں خود جو محنت کرنا چاہئے تھی وہ تم نے نہیں کی۔ شعر کے معاملے میں تمہارا حافظہ اچھا ہے اور تمہیں فارسی کے ہزاروں اشعار ازبر ہیں تمہیں اقبال کا سارا کلام زبانی یاد ہے لیکن اس کا تعلق ذوقِ شعر سے ہے زبان دانی سے نہیں۔ ذوقِ شعر تمہیں قدرت کی طرف سے مِلا ہے۔ زبان دانی کی طرف تم نے توجہ نہیں کی۔

رُباعیاتِ عمر خیام کے آخری صفحے پر "ادبی دنیا" لاہور سے نقل کی ہوئی یہ عبارت درج ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء

علامہ اقبال کے نام ——— ایک وطن پرست کا پیغام

نظم کا ایک بند

یہ نور بخش نامی سیال کوٹ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے اچھے خوش حال آدمی تھے شعر بھی اچھے خاصے کہتے تھے۔ بال جبریل کو دیکھ کر انہوں نے ایک طویل نظم کہی جو "رومان" لاہور میں شائع ہوئی اس نظم کا ایک بند درج ذیل ہے۔

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے جانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمیں سے سلوک تیرا مخاصمانہ
اسی نے پالا، اسی نے پوسا، اسی نے بخشی تجھے جوانی
تو دل کی آنکھوں سے دیکھ اُن کو یہ کارنامے ہیں مخلصانہ؟
اگر یہ جنت ہے جنتی تو، اگر یہ دوزخ ہے دوزخی تو
یہ قول ہے قولِ عاشقانہ، یہ راز ہے رازِ محرمانہ
وطن اسیر و غلام تیرا کلام ہے بے پیام تیرا
گرہ غلامی کی کون کھولے تری خموشی ہے مجرمانہ
زبان کھولے کہ چپ رہے تو جو کام ہونا ہے ہو رہے گا
وطن پرستوں میں یہ خموشی رہے گی نفرت کا تازیانہ
مثالِ فکرِ فرنگ تو نے دلوں کو درسِ ہوس دیا ہے
تجھے فقیری سے واسطہ کیا کہ روح تیری ہے قیصرانہ
وہ خون آشام تیرا شاہیں کبوتروں کی ہوس ہے جس کو
وہ خون رکھنے کا گرم جس کو ملا ہے کیا خوب اک بہانہ
بلائے قوت ہے تیری حکمت جسے تلاشِ شکار ہر دم
کبھی یہ ضربِ نپولین ہے کبھی یہ تیغِ سکندرانہ

(ادبی دنیا لاہور جنوری ۱۹۴۰ء)

معلوم نہیں انہوں نے یہ نظم کس خیال سے نقل کی ہے کیوں کہ ایک تو یہ نظم ہر اعتبار سے غیر معیاری اور معمولی ہے دوسرا علامہ اقبال کے بارے میں والد نے کبھی ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ اختلاب رائے کبھی کیا بھی تو شائستہ انداز سے۔ غالباً یہ نظم انہوں نے تفننِ طبع کے خیال سے نقل کی ہوگی۔ اب اس نظم کی کہانی کا ایک ٹکڑا ذرا مجھ سے بھی سُن لیجئے۔

۱۹۳۶ء میں "رومان" لاہور اختر شیرانی مرحوم اور ڈاکٹر عاشق بٹالوی کی مشترکہ ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر عاشق بٹالوی علامہ اقبال کے ارادتمندوں ہی میں نہ تھے بلکہ اُن کے پرائیوٹ سیکریٹری بھی تھے اختر شیرانی بھی علامہ اقبال کی شاعری کے عقیدت مند تو ہوں گے لیکن ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ اور ممکن ہے علامہ کے سیاسی افکار کے ساتھ انھیں اتفاق رائے نہ بھی ہو۔ بہر طور ڈاکٹر عاشق بٹالوی کے علم کے بغیر انہوں نے نور بخش مائل سیالکوٹی کی یہ نظم "رومان" میں شائع کر دی نظم کا شائع ہونا تھا کہ لاہور کے ادبی حلقوں میں ایک طوفان آگیا۔ عاشق بٹالوی نے یہ نظم اس وقت دیکھی جب یہ "رومان" کے اوراق میں چھپ چکی تھی۔ "رومان" میں اُن کا نام بطور مدیر شائع ہوتا تھا اور "رُومان" علامہ اقبال کو بھیجا بھی جاتا تھا نظم چھپی تو عاشق صاحب نے اختر صاحب سے گلہ کیا کہ یار یہ تم نے غضب کر دیا میں اب ڈاکٹر اقبال کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ چناں چہ ایک مدت تک عاشق بٹالوی ڈاکٹر اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ جب بہت دن گذر گئے تو علامہ نے انہیں یاد فرمایا۔ یہ ڈرتے ڈرتے گئے تو علامہ نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے معذرت ہی سے اپنا بیان شروع کیا کہ وہ نظم میرے علم کے بغیر اختر شیرانی نے شائع کر دی تھی وغیرہ وغیرہ۔ علامہ اس پر خوب ہنسے اور بولے مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں۔ نظم میری نظر سے گذری تھی لیکن میں نے تو اس کا کوئی خیال ہی نہیں کیا ایک آپ ہیں کہ مفروضے کی بنا پر رُوپوش ہوئے پھرتے ہیں۔

ہاں تو میں والد کی آخری دنوں کی زیرِ مطالعہ کتابوں کا ذکر کر رہا تھا اِس سلسلے کی دوسری کتاب جو میں نے کتابوں کے انبار میں سے اٹھائی "چہار گلزار" تھی۔ اس پر اُنھوں نے حواشی نہیں لکھے۔ صرف شروع اور آخر میں بعض شعراء کا انتخابِ کلام درج ہے۔ شروع میں علامہ اقبال کے یہ اشعار ہیں ؎

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشا
تازہ کن از نسیمِ من داغِ درونِ لالہ را

نہ دارد عشق سامانے ولیکن تیشہ دارد
خراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویزات

پھر غالب کا ایک شعر لکھا ہے۔ یوں

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ
سکہ زد در جہاں بہادر شاہ
(غالب بقول خواجہ احمد فاروقی)

اندر کے ورق پر یہ تین غزلیں درج ہیں۔

گر بہ تو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غمِ فراق نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
(قرۃ العین طاہرہ)

جوانی چہ آورد و پیری چہ برد
بُتِ خورد سال و مئے سال خورد
(روح اللہ)

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد
سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد (امیر خسرو)

کتاب کے آخر میں ایک خالی ورق ہے اُس پر قتیل کی غزل

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت
خود سوئے ما ندید و حیا را بہانہ ساخت

اور اقبال کی نظم

'جہاں را زیک آب و گل آفریدم'

درج ہے اس کے ساتھ ہی خمار بارہ بنکوی کا یہ شعر بھی لکھا ہے۔

رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
کٹ گئی عمر رات باقی ہے

اس شعر کے بارے میں مجھے اُن کے انتقال کے چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ حیدر آباد کی ایک محفل میں خمار ہی کی زبانی سنا تھا۔ مجھے اُن کے انتقال کے چند ماہ بعد حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا میرے عزیز دوست ارشاد احمد صدیقی اور اُن کی بیگم نے مجھے بتایا کہ ہمارے یہاں ایک مخصوص محفل میں مرحوم صاحب نے یہ شعر خمار کی زبانی سنا تھا اور اسے بے حد پسند کیا تھا۔ دوسرے تیسرے دن جب وہ دہلی روانہ ہونے لگے اور ہم لوگ انہیں اسٹیشن پر پہونچانے آئے تو بات چیت میں اس محفل کا ذکر آیا۔ انہوں نے محفل کی تعریف تو کی ہی لیکن خمار کے اس شعر کا ذکر خاص طور سے کیا اور اسے بات چیت کے دوران میں دو یا تین بار دہرایا۔

اس سلسلے کی تیسری کتاب دیوانِ ناصر علی ہے۔ اس میں لاتعداد اشعار پر ان کی پسندیدگی کی علامات درج ہیں۔ صفحہ ۸۴ پر ناصر علی کے اس مطلعے

تو چوں در جلوہ آئی مغزِ جاں سیماب می گردد
تجلی می کند برقے کہ آتش آب می گردد

کے سامنے حاشیے پر پنسل سے تضمین کے مصرعے درج ہیں لیکن پنسل سے لکھی ہونے کے باعث یہ تضمین اس قدر مدھم پڑ چکی ہے کہ مجھ سے پڑھی نہیں گئی جو کچھ میں پڑھ سکا ہوں وہ یہ ہے۔

دلِ ہر قطرہ از تابِ رخت گرداب می گردد
چہ خار و خس کہ خارا ہم شرار زاب می گردد
نہ تنہا دل حضورِ جلوہ ات بیتاب می گردد
تو چوں در جلوہ آئی مغزِ جاں سیماب می گردد
تجلی می کند برقے کہ آتش آب می گردد

دو صفحے بعد اس مطلعے

شمعِ رخسارِ تو تا روشن دریں کاشانہ بود
چشمِ ما پروانہ و مژگاں پرِ پروانہ بود

کی تضمین درج ہے۔

یاد ایامے کہ ظلمت پاش روزِ ما نہ بود
رشکِ لعلِ شب چراغ آں جلوۂ جانانہ بود
پرتو تابانی رویت چراغِ خانہ بود
شمعِ رخسارِ تو تا روشن دریں کاشانہ بود
چشمِ ما پروانہ و مژگاں پرِ پروانہ بود

کتاب کے آخر میں پشت پر اُن کی اپنی غزل درج ہے۔

کمالِ صنعتِ بُت ساز کرد حیرانم
مآلِ عشقِ بُتاں غیر ازیں نمی دانم

یہ سات شعر کی غزل اُن کے فارسی کلام کے مسودے میں شامل کر لی گئی ہے۔ کوشش یہ ہے کہ اُن کا یہ فارسی کلام کا مجموعہ جلد ہی شائع ہو۔

دیوانِ ناصر علی کے بعد جس کتاب پر میری نظر پڑی وہ "نغمۂ سرمد" ہے۔ "نغمۂ سرمد" سرمدؒ کی فارسی رباعیوں کا اردو رباعیوں میں ترجمہ ہے جو عرش ملسیانی نے کیا ہے۔ ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور پھر رباعی کا رباعی میں ترجمہ تو اور بھی مشکل ہے۔ عرش اس فرض سے بخوبی عہدہ برا ہوئے ہیں۔ والد نے اس کتاب میں جا بجا عرش کی قادر الکلامی اور کمالِ فن کی داد دی ہے۔ ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام "کفر و ایماں" اور سردار جعفری کا مجموعۂ کلام "ایک خواب اور" بھی انہی کتابوں میں موجود ہے اور جناب جوش ملسیانی کی کتاب "آئینۂ اصلاح" بھی۔

انگریزی کی کتاب 'Thoughts of Shakespeare بھی انہی کتابوں میں برآمد

ہوئی ہے۔ عمر خیام، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ، امیر خسرو، ناصر علی، بیدل اور غالب کی طرح شیکسپیئر بھی ان کا محبوب شاعر ہے: نکاتِ شیکسپیئر کے عنوان سے "گنجِ معانی" میں شیکسپیئر کے منظوم ترجموں پر مشتمل پورا ایک باب موجود ہے۔ شیکسپیئر کے ایک ڈرامے "ٹویلتھ نائٹ" کا انہوں نے ترجمہ بھی شروع کیا تھا جو نامکمل صورت میں موجود ہے۔

ان کی میز پر آخری کتاب جو مجھے ملی ہے وہ "منہاج السالکین" ہے۔ "منہاج السالکین" جوگ بشنشٹ کا اردو ترجمہ ہے۔ جوگ بشنشٹ[۲] بالمیک رشی کی تصنیف ہے یہ اردو ترجمہ اس فارسی ترجمے پر مبنی ہے جو داراشکوہ کے زمانے میں ہوا تھا۔ اصل میں داراشکوہ ہی نے اس ترجمے کا حکم دیا تھا۔ اردو ترجمہ مولوی ابوالحسن نے کیا ہے۔

یہ ان چند کتابوں کا ذکر تھا[۱] جو ان کے آخری ایام میں ان کی میز پر موجود رہیں۔ ورنہ جہاں تک کتابوں سے ان کے ربط کا تعلق ہے یہ ایک لامحدود ربط ہے۔ میرے کتب خانے میں چار ہزار سے کم کتابیں کیا ہونگی۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ ان کے زیرِ مطالعہ رہی اور اُن کے حواشی کی بدولت اکثر کتابوں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا رہا۔

ان کتابوں کے علاوہ ان کی بیاضیں، نظم و نثر کے مسوّدے جواب طلب خطوط کے انبار اُن کی میزوں پر، الماریوں اور فائلوں کی صورت میں بندھے ہوئے طاق پر موجود تھے۔ ان تمام تحریروں کو اب میں الگ الگ کرکے ترتیب دے رہا ہوں اور خواہش یہی ہے کہ اُن کا جس قدر بھی غیر مطبوعہ کلام بیاضوں اور مسوّدوں کی صورت میں موجود ہے کتابی صورت میں شائع ہو جائے۔

---

[۱] ان کتابوں میں میں نے گیتا کا ذکر نہیں کیا۔ گیتا کا مطالعہ وہ بالعموم ہر روز علی الصباح کیا کرتے تھے۔ [۲] یوگ واشنشٹ

غزل

منور بن محبوب کیراکتی

نمودِ حسرتِ دیدار میں یہ کیا کیا میں نے
وجود اپنا ہجومِ جلوہ میں گم کر دیا میں نے

نہ کیوں میں بے نیازِ منزلِ مقصود ہو جاؤں
کہ ذوقِ جستجو میں کھو دیا ہے مدعا میں نے

ہجومِ جلوہ رنگیں میں ہستی کھو گئی اپنی!
اُٹھایا تھا نہیں معلوم پردہ کونسا میں نے

ترے قدموں پہ سجدہ ریز ہے رنگِ چمن لیکن
مری نازک مزاجی دیکھئے ٹھکرا دیا میں نے

بڑی مشکل سے ہاتھ آئی حیاتِ جاوداں مجھ کو
تہہ خنجر پیا ہے ساغرِ آبِ بقا میں نے

کچھ اس درجہ ندامت تھی کہ روتے زندگی گذری
مگر اچھا ہوا داغِ گنہ کو دھو لیا میں نے

تری تقلید آخر کس بنا پر میں کروں ناصح
کہ رازِ عشق سے پایا تجھے ناآشنا میں نے

ہوئی ذوقِ سجودِ عشق میں ایسی کشش پیدا
وہیں کعبہ سمٹ آیا جہاں سر رکھدیا میں نے

فرشتے آج تک حیران ہیں میری جسارت پر
کہ کیسے دوش پر بارِ امانت لے لیا میں نے

بہت نادم ہوئے وہ اپنی یکتائی کے دعوئی پر
جو اُن کے روبرو آئینہ لاکر رکھ دیا میں نے

منورؔ بعدِ مُردن بھی اثر تھا داغِ سوزاں کا
لحد میں کر دیا روشن محبت کا دیا میں نے

احمد جمال پاشا

"بور" کی قسمیں

امریکا کی ایک بیس منزلہ عمارت کی لفٹ ایک دفعہ فیل ہوگئی۔ بیسویں منزل پر رہنے والے چھ دوست اوپر جانے کے لئے سستا سستا کر زینے چڑھ رہے تھے۔

جب پانچ دوست دم لینے کے لئے بیٹھ کر ہانپتے تو چھٹا دوست پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستا۔ جب اس سے ہنسنے کی وجہ پوچھی جاتی تو وہ یہ کہہ کر "اوپر پہنچ کر بتاؤں گا"۔ پھر بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیتا۔

بیسویں منزل پر پہنچ کر جب سب اپنے فلیٹ کے سامنے پہونچے تو ہنسنے والے دوست نے خوشخبری سنائی۔

"حضرات! آپ کو یہ جان کر بہت مایوسی ہوگی کہ آپ لوگ دروازے کی کنجی سب سے نیچے والی منزل پر ہی بھول آئے ہیں۔!

اس کو کہتے ہیں بور کرنا، اور جس نے بور کیا اس کو ہم "بور" کہیں گے۔ اگر آپ پوچھیں کہ "بور" کون کرتا ہے۔؟ تو ہم عرض کریں گے کہ "بور سب کو بور کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ آپ یہ بھی سمجھ لیجئے تو تھوڑے بہت بور تو سب ہی ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کے لئے اور کسی کے لئے کوئی۔ کون کس کے لئے کم یا زیادہ بور ثابت ہوا، یہ تو وہی بتا سکتا ہے جس کا کسی بور سے پالا پڑ چکا ہو مگر یہ تو سب ہی بتا دیں گے کہ ہمارا فلاں فلاں بور سے پالا پڑ چکا ہے۔ اور ہیں نے چھٹی کا دودھ اُن کو یاد دلایا ہوگا وہ بھی ہیں تقریباً اس سے ملتی جلتی بات بتائے گا اس لئے کہا نہیں جا سکتا کہ کون کس کو کب کتنا بور کر دے۔ بور کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں اُس کی بوریت کے ڈنکے پٹ رہے ہوں مگر اس غریب کو ہوا بھی نہیں لگ پاتی کہ وہ کتنا گریٹ بور ہے۔ لیکن اگر اُسے معلوم ہو جائے تو ماننا تو دور کی بات ہوئی اُسے کبھی شبہہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی کسی کو بور بھی کر سکتا ہے۔

فی زمانہ کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جو بور نہ کرتا ہو، لیڈر اپنی تقریر سے، محبوب اپنے وعدے سے، ملازم اپنی معصومیت سے، امیدوار اپنے انتخابی ہتھکنڈوں سے، ووٹر اپنی بے جا اکڑفوں سے، وکیل اپنی چرب زبانی سے، دودھ والے پانی سے بے تعلقی کا اظہار کر کے، دوکان دار اور ہوٹل والے خاک پتھر کھلا کے، مالک مکان کرایہ دار کو مجبور کر کے، ذمہ دار فائیل چلا کے، شاعر گا کے، پڑوسی مانگ کے، لاوڈ اسپیکر والے چلا کے، اور نقاد اپنی لاعلمی پر علم کا پردہ ڈال کے بغرض ایشیا کے عظیم ترین دانشور سے لے کر گلی کے کلو مہتر تک سب کو سب بور کرتے رہتے ہیں۔

اب آپ ہی بتائیے کہ بھلا اس کو کیا کہیے گا کہ آپ کو پھلجڑیاں چھڑانے میں مزا آ رہا ہو اور مخاطب سُنی ان سُنی کر کے موسم اور مہنگائی کی بھیرویں چھیڑ کر بور کر دے۔ یا آپ تو جلدی میں ہوں، گاڑی پکڑنا یا صاحب سے پہلے دفتر پہنچنا ہو، راشن کی لائین یا پکچر ہاؤس میں ایڈوانس بکنگ کرانا یا کسی مرحوم کو قبرستان پہونچانا ہو۔ مگر موصوف بلا کسی پروگرام اور ضرورت کے آپ کو اُس وقت تک گھیرے رہیں جب تک

کہ آپ کے سارے بنے بنائے کام بگڑ نہ جائیں۔ آپ لطیفوں سے مرثیوں پر نہ اتر آئیں، گاڑی یا ملازمت نہ چھوٹ جائے، بغیر کھائے یا سینما دیکھے جینے کی نوبت آجائے یا برادری حقہ پانی بند کر کے کھاٹ باہر کر دے۔

لطف کی بات یہ ہوگی کہ جہاں آپ اِن کے بے تکان جمے رہنے سے بور ہوں گے وہاں آپ کی بے جا عجلت پر موصوف کو خاصی بوریت ہوگی۔ مگر آپ میں سے ایک بھی نہ کہے گا کہ ۔

" بور کر کے آرہا ہوں"۔ بلکہ یہی ارشاد ہوگا کہ

" بور ہو کے آرہا ہوں۔!"

" آج ہمارا پالا بھی کس بور سے پڑ گیا۔!"

تعجب نہیں کہ آپ کی پُر لطف باتوں کی بوریت سے وہ اونگھنے لگے ہوں اور اُن کے بے تحاشہ ہنسنے پر آپ کو سخت تعجب ہوا ہو کہ ۔

" آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟" یا وہ لطیفہ سننے کے بعد انکوائری کریں۔

" بھیا ہمیں بھی بتا دو کہ اس میں کہاں پر اور کیوں ہنسا جائے۔؟؟"

کیا عجب کہ جو لطیفہ آج سُنکر محض اس لئے ہنسے کہ آپ ہنسے تھے اس کے دو تین دن کے بعد سمجھ میں آنے پر آپ سے زیادہ ہنسیں۔ عقلمندوں کا کہنا ہے "ایک بور کسی لطیفے پر تین بار ہنستا ہے۔ پہلی بار اس وجہ سے ہنستا ہے کہ سب ہنس رہے ہیں۔ دوسری بار اپنی حماقت یاد کر کے ہنستا ہے اور تیسری بار لطیفہ سمجھ میں آنے پر ہنستا ہے۔"

ڈبل بور ایک دم بور بہ بروف ہوتا ہے۔ یہ اندر سے بھی اتنا ہی بور ہوتا ہے جتنا کہ باہر سے بور معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کے بور بہت عام ہیں ان سے آپ بچ نہیں سکتے۔ یہ تعارف اور تعلقات کی شرط سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ اگر سینما میں یہ آپ سے ٹکرا جائیں تو آپ اِن کی رننگ کمنٹری سے عاجز آکر ادھوری فلم چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ اگر ریل یا بس میں مل جائیں تو آپ اپنے اخبار رسالے، کتاب اور جگہ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اگر درجہ میں ہوں تو لیکچر کان سے نکل جائے اور خیر سے اگر یہ آپ کے پڑوسی ہیں تو شاید گھر سے بھی آپ کو ہاتھ دھونا پڑے۔

غرض ڈبل بور سے پالا پڑنے کے بعد اس بات کا بہت کم امکان رہ جاتا ہے کہ خود آپ کسی کو بور کر سکیں۔

بور بور کو لیڈر اور شاعر کو سبوتاژ کرنے کے لئے بطور ہوٹنگ استعمال کیا جاتا ہے۔ بڑا کامیاب حربہ ہے تجربہ بتاتا ہے کہ زندہ باد اور مردہ باد کے نعروں سے کہیں زوردار اور کامیاب رہتا ہے۔ اس ایک نعرے میں بیک آواز سب نعرے سما جاتے ہیں۔

عام طور پر بور بور، کے نعرے اس کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ وہ ایک کو بور کرے جس کا بھلا نہیں ہوتا لہٰذا وہ ہزاروں کے مجمع کو بور کرنے کے لئے اسٹیج پر آتا ہے مگر لوگ بجائے بور ہونے کے خود اس کو بور کر دیتے ہیں۔ پیاری پبلک اس مجمع اکھاڑ کو پچھاڑنے کے لئے زبردست ہوٹنگ کرتی ہے پھر یہ ٹپہ تڑا کے بھاگتا ہے۔ اگر یہ نہ بھاگے تو منتظمین اُسے بھگا دیتے ہیں۔ کیوں کہ جلسہ میں فرنیچر وڈاسپیکر، گیس، دری، شامیانہ اور پبلک وغیرہ عام طور پر کرایہ کی ہوتی ہے۔ اگر منتظمین ایسا نہ کریں تو اُن کو سزا کے طور پر توڑ پھوڑ کا بھگتان بھگتنا پڑے۔

اس کی بوریت کا انعام ہوٹنگ کی شکل میں ملتا ہے لیکن اگر اس کی ہوٹنگ نہ کی جائے تو جلسے کا کیریر خطرے میں پڑ جاتا ہے جسے بچانے کے لئے اُسے فری کیریر بنا دیا جاتا ہے۔

بار کا بور ہر ذات کے ہونے کے باوجود بڑے ہی بذات ہوتے ہیں۔ یہ اپنے دوست، اُستاد، واقف کار اور رشتے دار کا مغز چاٹ چاٹ کر بور کر دیتے ہیں۔ مگر دماغ چاٹنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ دراصل یہ آپ کی ہر چیز چاٹ سکتے ہیں۔ روپیہ، پیسہ، کپڑے، جوتے چائے، ناشتہ، کھانا، وقت، عزت غرض ان سے کچھ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا حتیٰ کہ خود آپ بھی نہیں۔ اِن کا لیا ہوا اُدھار کبھی ادا نہیں

ہوتا، مانگنے کے کپڑے پھر واپس نہیں ہوتے یہ جتنی دیر بات کریں گے آپ فیصلہ نہ کرسکیں گے کہ آخر یہ کہنا کیا چاہتے ہیں اور اُن کی اس بوریت کا مقصد کیا ہے؟

بائیس بور کوئی ایک بور ہرگز نہیں ہوسکتا، خواہ وہ کتنا بڑا بور کیوں نہ ہو۔ بلکہ کئی بور مل کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے لئے یہ ٹیم بنا کر بور کرتے ہیں۔ اس قسم کے بور آپ کو کافی ہاؤس، اسکول کالج اور یونی ورسٹی میں ملیں گے۔ یہ ہر حماقت اور بوریت میں آپ کے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ بغیر پیسہ کوڑی کے شہر بھر کے ہوٹل کھلواتے، جماتے اور بند کراتے رہتے ہیں۔ یہ بغیر پڑھے لکھے اور کام لئے اسکولوں، دفتروں، اور کارخانوں میں وقت گذاری کے لئے جاتے اور کسی ہوٹل میں جام ہو جاتے ہیں۔ اِن سے ملتے وقت بوریت اور مروّت میں کشمکش ہوتی ہے اور ان کے جانے کے بعد بڑی کوفت ہوتی ہے۔

نمبری بور وہ ہوتے ہیں جو گھر میں سے کہلوا دیتے ہیں کہ:

"وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم گھر پر نہیں ہیں۔!"

آپ کا کتنا ضروری کام کیوں نہ ہو مگر یہ ٹس سے مس نہ ہوں گے اور ایسے غیر متعلق بن جائیں گے گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔ یہ آپ کو ملتے ہی ادھر ادھر کی بے سر پیر کی ہانک کے کھٹ سے بور کر دیتے ہیں۔ دورانِ گفتگو سو سو بار کا سنایا ہوا لطیفہ یا قصہ پھر سنائیں گے۔ ہر پرانی بات اُن کے نزدیک برانڈ نیو ہوتی ہے اس پر اُن کی خوشی دیکھنے والی ہوتی ہے۔

لیکن یہ نہ بھولئے کہ اگر کبھی کسی نمبری بور کا کوئی کام آپ سے پڑ گیا تو وہ اس وقت تک آپ کو گھیرے رہے گا جب تک کہ آپ کام نہ آجائیں۔!

مہابور: بوریت کی وہ قسم ہے جو میاں بیوی سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر بیوی کو مہابور کہتا ہے اور دوسروں کی بیویوں پر جان چھڑکتا ہے۔ تقریباً یہی ردِ عمل بیویوں کا بھی ہوا کرتا ہے۔

مہابور کو اپنے میاں، بیوی، بچوں، گھر، دفتر، ملک اور قوم میں دنیا کی خرابیاں اور برائیاں برابر نظر آتی رہتی ہیں۔ اُسے ہر اس چیز سے جو اغیار کی ہو پیار ہوتا ہے۔ اور اس میں اُسے ہر ہر خوبی نظر آجاتی ہے یہ زندگی بھر دوسروں کو بور کرتے اور خود گھاس کھودتے رہتے ہیں۔ اور اُن کی عقل اس گھاس کو چرتی رہتی ہے۔

کامیاب بور کا دنیا میں صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ بس کس طرح یہ جھٹ پٹ اپنا اُلّو سیدھا کرے۔ جس طرح بھی ہو گھِر گھِر کے، باتیں بنا کے، لڑ کے، اکڑ کے، خوشامد کر کے۔

یہ اپنے آپ کو جتنا چالاک سمجھتے ہیں دوسرے اُن کو اُتنا ہی زیادہ بور سمجھتے ہیں۔

اگر آپ کوّے کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں تو پھر اُن کو سمجھنے کے لئے آپ کو کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں۔

بلنڈر بور: سب سے بدنام قسم کا بور ہوتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ دور ہی سے کترانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں بلنڈر بور سے سابقہ نہ پڑ جائے۔

اس خانے میں رقیب، شاعر، ساہوکار اور انکم ٹیکس والے آتے ہیں۔

یہ راستہ روک کر جتنی دیر آپ سے صرف سلام دعا کریں گے اتنی دیر میں آپ کسی بھلے آدمی سے باقاعدہ گپ لڑا سکتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بڑے بڑوں کے رنگ فق ہو جاتے ہیں چہرے لٹک جاتے ہیں

دنیا کے ہر مسئلے پر بلنڈر بور کی ایک بے سوچی سمجھی رائے بھی ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ آپ ملک الموت سے بچ سکتے ہیں۔ مگر بلنڈر بور سے نہیں۔

بور پروف کہیں لاکھوں میں ایک ہوتا ہے۔ اگر یہ مہمل گوئی پر اُتر آئے تو شہرت میں بڑے سے بڑے شاعر کو مات دے دے۔

بور پروف اس لحاظ سے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کی آمد ہمیشہ عام دلچسپی کا سامان کر دیتی ہے۔ اور خوبی یہ کہ ایک بات اور ایک نظر میں لوگ تاڑ لیتے ہیں کہ یہ لوگ بور پروف ہے۔ (بقیہ ۳۱ پر)



وفاقی جمہوریہ جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر کرٹ جارج کیسنگر اور اُن کی اہلیہ ہندوستان کے سرکاری دورے پر تشریف لائے تھے ہوائی اڈے پر وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے آپ دونوں کا خیر مقدم کیا۔

ہندوستان اور وفاقی جمہوریہ جرمنی کی دوستی صدیوں پرانی ہے۔ یورپ میں سب سے پہلی سنسکرت قواعد ایک جرمنی عالم ہینرہن رج روتھ نے لکھی تھی سنسکرت کی دوسری یوروپی قواعد جو بانیس ایرنیسٹ ہنکسل ڈن نے لکھی تھی۔ یہ بھی جرمن تھے۔ ان دونوں عالموں نے اپنی تمام زندگی بھارتی ثقافت اور قدیم ادبیات کے مطالعے میں گذاری تھی۔

ایک عظیم جرمن مصنف میکس مولر ہندستانی ثقافت اور اس کی روایات سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے "ہمیں بھارت کیا سکھاتا ہے"، نامی مشہور کتاب لکھی۔ انھوں نے لکھا ہے: "اگر مجھے دنیا میں کسی ایسے ملک کو تلاش کرنے کے لئے کہا جائے جس کو قدرت نے ہر طرح کی دولت، طاقت اور خوبصورتی سے نوازا ہے اور جو کچھ معنوں میں دنیا میں حقیقی جنت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ تو میں اس کے لئے بھارت کا نام پیش کروں گا جرمنی نے صنعتی میدان میں ہماری نمایاں امداد کی ہے۔ روڑکیلا کا فولاد ساز کارخانہ اور کیمیاوی کھاد سے متعلق منصوبہ، دُرگاپور پاور اسٹیشن، میسور میں فولاد کے کارخانے کی توسیع، ٹیکنالوجی ادارے اور زراعتی منصوبہ میں امداد وغیرہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور اشتراک عمل کی روشن مثالیں ہیں۔



شری میگوئیل اینجل آستوریاس کو ۱۹۶۷ء کے لئے ادب کا نوبل پرائز دیا گیا ہے آپ ۶۸ سال کے ہیں اور اپنے ملک گوتے مالا کی طرف سے فرانس میں سفیر ہیں۔ آپ اٹلی کی یونی ورسٹی آف روم اور کیمبرج یونی ورسٹی کے کنگ کالج میں پڑھا چکے ہیں۔ آپ نے سات ناول لکھے ہیں جن کا دنیا کی ۳۶ زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں انھیں لینن امن انعام بھی ملا تھا۔

آپ نے اپنے ناولوں میں غریبوں اور مظلوموں کی حمایت ہے۔ آپ کے حالیہ ناول کا نام "ملاٹا" ہے جو چند ماہ ہوئے امریکہ میں شائع ہوا ہے۔

آپ نے ایک انٹرویو میں کہا: "ہم میں اپنے مسائل کو نظر انداز کرنے، انھیں رومانیت اور لوک کتھاؤں کے غلاف میں چھپانے کا رجحان بڑی مدت سے ہے میرا انتخاب کرکے اکیڈمی نے دوسرے رجحان کا اعتراف کیا ہے جو مسائل سے اُلجھنے، اُن کا سامنا کرنے اور اُن سے نبرد آزما ہونے کا ہے۔"

ھز ھائی نس کریم آغاخاں، (سفید سوٹ میں) حکومت ہند کی دعوت پر ۱۵ نومبر کو تین روزہ سرکاری دورے پر دلی تشریف لائے۔

ہوائی اڈے پر وزارت پٹرولیم کیمیکلز میں وزیر ریاست شری کے رگھو رمیّہ (دائیں طرف) صدر کے ملٹری سیکریٹری، اعلیٰ عہدیداران، اور مختلف ممالک کے سفراء نے ان کا استقبال کیا۔

ہوائی اڈے پر آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ حکومت ہند نے مجھے ہندوستان آنے کی دعوت دی ہے اس کا میں نہایت گرم جوشی اور صدق دلی سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرے پہلے تاثرات یہ ہیں کہ ۱۹۶۲ء میں میرے گذشتہ دورے کے بعد سے اب بھارت نے زبردست اقتصادی ترقی کی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اپنی روانگی سے قبل میں اس بات کا بھی اندازہ لگا سکوں گا کہ بھارت کے ترقی کے کاموں میں اسلامی فرقے کے ارکان کیا حصّہ لے رہے ہیں۔

آپ نے دہلی میں صدر جمہوریہ ہند، وزیر اعظم، نائب وزیر اعظم وزیر داخلہ اور دوسرے بہت سے لوگوں سے ملاقات کی۔ اور تاریخی اور ثقافتی دلچسپی کے مقامات کی سیر کی۔

ہندوستان میں آپ کے معتقدین کی تعداد سوا لاکھ ہے۔





نومبر میں دہلی میں کشتی کا بین الاقوامی مقابلہ ہوا تھا جس میں متعدد ملکوں کے پہلوانوں نے حصّہ لیا تھا۔
اس مقابلے میں ہندوستانی پہلوان بشمبھر سنگھ (ریلوے) "بینٹم ویٹ" میں دوسرے نمبر پر آئے انھیں طلائی تمغہ ملا۔

زکی انور

بُلندی اور پستی

رخشی باتھ روم سے باہر نکل کر کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اپنے کمرے میں گئی ہی تھی کہ ممی نے کچھ اس انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا جیسے وہ اس سے بہت جلد ملنا چاہ رہی تھی چنانچہ اندر سے رخشی کی "ون منٹ پلیز" کی آواز کے ساتھ ہی اُن کے چہرے کا رنگ کچھ ایسا ہو گیا جیسے اس ایک ایک منٹ کا ایک ایک سیکنڈ ان کے لئے سال سال بھر کا ہو۔

چند منٹوں کے بعد رخشی نے دروازہ کھولا اور ممی تقریباً بے تحاشہ اندر گھس گئیں اور پھر دیر تک ماں بیٹی میں کسی گمبھیر مسئلے پر باتیں ہوتی رہیں اور جب ممی کے ساتھ ہی رخشی بھی کمرے سے باہر نکلی تو اس کی نظر بھابی پر پڑی جو بے بی کو اسکول کے لئے تیار کرتی ہوئی رخشی کو اشارے سے اپنے پاس بُلا رہی تھیں۔

ممی باورچی خانے میں چلی گئیں اور رخشی بھابی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

باہر سے ہارن کی آواز آئی اور بے بی رخشی اور بھابی کو "ٹاٹا" کرتی ہوئی باہر بھاگ گئی اور بھابی رخشی کو اپنے ساتھ لئے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور پھر کسی طویل گفتگو کا آغاز ہو گیا جانے کب تک وہ باتیں کرتی رہتیں لیکن کچھ ہی دیر کے بعد اپنے پرائیوٹ ٹیوٹر کو رخصت کر کے شمی اپنے ریڈنگ روم سے باہر نکلی اور گھر میں "اپیّ... اپیّ... اپی ڈارلنگ" کا شور مچ گیا۔

موسم خراب ہونے کی وجہ سے رات رخشی کا جہاز بہت لیٹ پہنچا تھا اور گھر پہنچتے پہنچتے رات کا ایک بج گیا تھا۔ رخشی کچھ اس حد تک تھکی ہوئی تھی کہ بیمار سی لگ رہی تھی چنانچہ رات وہ کسی سے کچھ زیادہ باتیں نہیں کر سکی تھی اور صرف منہ ہاتھ دھو کر اس نے کافی پی تھی اور سو گئی تھی اور آج صبح ابھی رخشی جاگی بھی نہ تھی کہ شمی کا پرائیوٹ ٹیوٹر آ گیا تھا اور وہ پڑھنے لگی تھی۔ دونوں بہنوں میں ابھی کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔ اس بات کا احساس خود رخشی کو بھی تھا لہٰذا اس کی آواز پر وہ بھابی کے کمرے سے نکل آئی دونوں بہنیں ایک دوسرے سے چمٹ گئیں اور شمی اسے کھینچتی ہوئی باہر لان میں چلی گئی۔ اور بھابھی کچھ اس طرح دروازے پر کھڑی رہیں جیسے باتوں کی تشنگی باقی تھی۔ دونوں بہنوں میں بھی جانے کتنی اہم باتیں ہو رہی تھیں کہ جب ممی نے چوتھی بار اور غصے سے انھیں ناشتے کے لئے پکارا تو وہ واپس آئیں لیکن دونوں کے چہروں سے یہ بات صاف نمایاں تھی کہ ان کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

گرمیوں کی دو ماہ کی فرصت کے علاوہ مزید پندرہ دن دارجلنگ میں اپنی ایک بہت عزیز سہیلی نرملا کے ہاں گذارنے کے بعد رات رخشی واپس آئی تھی اور یہاں پہنچنے کے بعد آج صبح جو خبر سب سے پہلے اسے ملی تھی وہ یہ تھی کہ رخشی کے منگیتر اور خان بہادر کے صاحب زادے میاں معصوم ایک ہفتہ پہلے بمبئی سے واپس آ رہے تھے تو انھیں فرسٹ

کلاس کے اپنے کمپارٹمنٹ میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا ایک نوزائیدہ بچہ پڑا ہوا ملا تھا۔ خواہ مخواہ پولس کے ہنگامے میں پڑ کر اپنی اور سارے خاندان کی عزت آبرو خطرے میں پڑنے کے ڈر سے معصوم نے بچے سے متعلق پولس والوں کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی اور چپ چاپ گھر لیتا آیا تھا۔ لیکن پولس والوں کے ہنگامے سے کہیں بڑا ہنگامہ اس کے ارسٹوکریٹ گھر میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور کوئی بھی اس بات پر رضامند نہیں تھا کہ پتہ نہیں کس کے پاپ کی وہ گٹھری ایک شریف گھر میں رکھی جائے۔ دو دن تک تو کافی ہنگامہ رہا آخر بیگم صاحبہ نے ایک ترکیب سوچی اور وہ بچہ مالی کی بیوی کے حوالے کر دیا لیکن خان بہادر اب بھی مطمئن نہیں تھے جو بھی ملنے آتا بچے کے بارے میں پوچھتا اور بعض تو بچے کو دیکھنے پر بضد ہو جاتے اور کسی کی نظر بچے کو دیکھتے دیکھتے ڈرائنگ روم میں ٹنگے ہوئے معصوم کی تصویر کے فریم کی طرف اُٹھ جاتی اور خان بہادر کو ایسا لگتا جیسے کوئی اُن کے سینے میں خنجر اگھونپ رہا ہو۔ اور جب ایک دن شطرنج کی تیسری بازی ہارتے ہوئے مرزا صاحب نے کہا۔

"بھئی آپ نے میاں معصوم کا بھی کچھ نفسیاتی مطالعہ کیا؟"

تو خان بہادر کا چہرہ یک لخت لال بھبھوکا ہو گیا ایک جھٹکے کے ساتھ انھوں نے بساط اُلٹ دی اور تیر کی طرح سنسناتے ہوئے اندر گئے اور بیگم صاحبہ پر برس پڑے اور کافی دیر تک خاندان کی عظمت اور وقار کا قصیدہ پڑھنے کے بعد انہوں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"بچہ آج ہی، ابھی اور اسی وقت حویلی کی حدوں سے باہر نکال دیا جائے"۔ اور تب سے ابتک وہ بچہ معصوم کے ایک دوست کے گھر تھا۔ لیکن معصوم کا وہ دوست بھی صبح شام اس سے تقاضے کر رہا تھا کہ وہ بچے کی پرورش کا کوئی اور انتظام کرے یہی وہ اطلاع تھی جو گھر کے تین افراد کے ذریعے رخشی کو ملی تھی لیکن ابھی بھائی جان اور ڈیڈی باقی تھے بچناں چہ چائے کی میز پر جب ڈیڈی نے کافی سیریس انداز میں کہا۔

"رخشی تمہیں فرصت ہو تو ذرا میرے کمرے میں آنا"۔

تو رخشی کسی قدر لرز گئی۔ البتہ اُس کی یہ لرزش خود اس کے علاوہ اور کوئی محسوس نہیں کر سکا۔ ڈیڈی کا محض ڈیڈی ہونا کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی جو رخشی ان کے پاس جانے سے کانپ اٹھی تھی۔ وہ شہر کے مشہور ترین بیرسٹر تھے اور ان کے چکرا دینے والے سوالات سے کسی کا بھی لرز اٹھنا عین ممکن تھا جب کہ رخشی کا تو اس معاملے سے کم سے کم اس حد تک تعلق ضرور تھا کہ بچہ اس کے منگیتر کو ملا تھا جس سے عنقریب اس کی شادی ہونے والی تھی

چائے کے بعد رخشی ڈیڈی کے کمرے میں گئی اور سب سے زیادہ دیر تک اس کی باتیں ڈیڈی سے ہی ہوئیں۔ اور جب وہ اُن کے کمرے سے واپس نکلی تو کافی بشاش بشاش سی نظر آ رہی تھی۔ لیکن جب اس نے ممی، بھابی اور شمی کو بہت ہی خوش خوش یہ خبر سنائی کہ آج سے وہ بچہ اسی گھر میں پلے گا تو تینوں ہی نے بھانپ لیا کہ اس کی پلکوں میں آنسو کا ایک قطرہ پھنسا ہوا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" ممی چیخ اٹھیں "جس بچے کو خان بہادر اپنی حویلی کے احاطے میں برداشت نہیں کر سکے کیا وہ ایسے گھر سے رشتہ جوڑنا گوارا کریں گے۔ . . تمہارے ڈیڈی تو سٹھیا گئے ہیں، دو، دو جوان کنواری لڑکیاں گھر میں بیٹھی ہیں اور ایسی حالت میں . . . نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے ہرگز نہیں"، وہ کچھ اور بڑبڑاتی ہوئی ڈیڈی کے کمرے میں گھس گئیں

"ڈیڈی کا یہ فیصلہ تو سچ مچ درست نہیں" بھابی کہنے لگیں "بھلا خان بہادر جیسا قدامت پرست گھرانہ بھی ہے کوئی سارے شہر میں۔ ڈیڈی کو سوچنا چاہیئے تھا کہ آخر تمہارا کیا ہوگا، اگر خدانخواستہ انہوں نے. . . ."

رخشی کچھ اور نہیں سن سکی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"حد ہی تو ہو گئی" بھابی شمی سے مخاطب ہو کر بدستور کہتی گئیں۔ اس صدی میں ایسا بھی کوئی گھر ہوگا جہاں کی لڑکیوں نے سینما نہیں دیکھا ہو۔ انھیں تو اسی بات پر اعتراض ہے کہ رخشی کالج میں کیوں پڑھتی ہے۔ پردہ کیوں نہیں کرتی ہے۔ . . اور وہ بھلا . . . . وہ بھلا . . . حد تو یہ ہے کہ غالباً نازنیں اُن کی پہلی لڑکی ہے جو شادی سے پہلے اتنے دنوں تک باہر رہی ہو"

"وہ بھی کیا بھابی"، شمی نے لقمہ دیا "یہاں سے ایک لمبی چوڑی فوج انھیں خالہ کے گھر چھوڑنے گئی اور ہیں بھی تو اپنی خالہ کے گھر جن کے بیٹے سے نازنیں باجی کی شادی ہونے والی ہے ظاہر ہے وہاں بھی تو یہاں سے

کچھ کم پابندی نہیں ہوگی... عجب دقیانوسی لوگ ہیں... مرا تو بس چلے...
مرا تو بس چلے... اچھا ہی ہوا اگر اپنی کا رشتہ...."

لیکن کوئی بُری بات سُننے سے پہلے ہی بھابی نے شمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ دونوں ہی رخشی کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ جہاں تکیے میں منہ چھپائے رخشی سسکیاں لے رہی تھی۔

ڈیڈی نے اُسی وقت معصوم کو فون کر دیا تھا کہ وہ بچے کو لے کر آ جائے۔ اور اب معصوم کی کار کا جانا پہچانا ہارن بجنے لگا تھا۔ معصوم ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پسینے سے کچھ اس قدر تر تھا کہ ڈیڈی ہنس پڑے۔ انھوں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا پھر اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

"بیٹھ جاؤ... کیا پیدل آ رہے ہو؟"

"جی!" معصوم اٹکی اٹکی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "نہیں تو"

"پھر پسینے میں شرابور کیوں ہو۔؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"چچا جان۔ معصوم کسی قدر سنبھل کر کہنے لگا۔ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا میں چاہتا تھا کہ.... وہ بات یہ ہے کہ چچا جان.... میں نے.... میں نے.... میں.... میں... میں"

"ڈیڈی سمجھ گئے کہ وہ اپنی لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا

"سنو" انہوں نے معصوم کی بات کاٹ کر کہا: "میں میں وہ لوگ کرتے ہیں جو خود اپنے وجود، اپنی ہستی اور اپنے کردار سے مطمئن نہیں ہوتے لیکن میں میں کا شور مچا کر دوسروں پر اپنے وجود، اپنی ہستی اور اپنے کردار کی اہمیت لادنا چاہتے ہیں۔ بے کار باتیں کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو .... میں جانتا ہوں، بچہ کسی کا بھی ہو۔ اپنی پیدائش کے لیے وہ خود ہرگز ذمہ دار یا قصور وار نہیں ہو سکتا۔"

چچا جان۔ معصوم کہنے لگا: "میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کچھ لوگوں کو خواہ مخواہ یہ شک ہے کہ وہ بچہ میرا ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی زیادہ دنوں تک تو میں اپنی خالہ جان کے وہاں پونے میں رہا ہوں سمجھتا ہوں کہ پندرہ دنوں سے زیادہ میں بمبئی میں نہیں رہا، بھلا صرف پندرہ دنوں میں..."

ڈیڈی اتنی زور سے ہنسے کہ معصوم کی بات اُس کے حلق میں اٹک گئی۔

"برخوردار" وہ ہنستے ہنستے بولے: "تمہارے کہنے کا شاید یہ مطلب ہے کہ ناجائز معاشقہ اور بچہ پونا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے تو صرف بمبئی میں!"

"جی... جی..." معصوم ہکلانے لگا... "چچا جان۔ میں تو صرف تین ماہ باہر رہا... اور محض تین مہینے میں...."

ڈیڈی پھر ہنس پڑے۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی لڑکی سے تمہارے دیرینہ تعلقات ہوں اور وہ بچہ جننے کے لئے اب بمبئی گئی ہو۔ بمبئی ہی کیوں۔ کہیں بھی ممکن ہے"

"لیکن چچا جان" اب کے معصوم نے دلیری سے کہا: "اس بات کی تحقیق تو کی جا سکتی ہے کہ میں تین مہینے تک باہر رہا۔ ان تینوں مہینوں میں کہاں کہاں رہا، کس کس کے ساتھ رہا اور میری کیا مشغولیت رہی؟

تم اس قدر معصوم ہو؟ اب کے ڈیڈی نے قہقہہ لگایا کہ "کم سے کم تمہاری معصومیت تمہیں بے گناہ ثابت کر سکتی ہے... برخوردار کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ لڑکی کسی اور جگہ رکھی گئی ہو اور تم کہیں اور مقیم ہو۔ البتہ تم دونوں کا رابطہ قائم ہو"

معصوم پھر کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ ڈیڈی نے زور سے میز پر گھونسا مار کر کہا۔

"مجھے جہاں تک یاد ہے تمہارے آنے کے فوراً ہی بعد کلاک نے نو بجائے تھے"

"جی ہاں" معصوم بولا۔

"چنانچہ پورے سترہ اٹھارہ منٹوں تک تم نے میرا، اپنا اور قوم کا وقت ضائع کیا ہے۔ تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت وقت تھی جب میں تمہیں ملزم گردانتا۔ تم نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

"میں شرمندہ ہوں" معصوم نے گردن جھکا لی۔ "ارشاد!"

"وہ بچہ بہر حال آدمی کا بچہ ہے" ڈیڈی کہنے لگے: "اور جب تک اس میں خود اپنا مقدر بگاڑنے یا سنوارنے کا شعور پیدا نہیں ہوتا

ہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اُسے در در کی ٹھوکریں کھلوائیں۔ سماج میں اگر اتنی جرأت نہیں کہ اُس کے ماں باپ کو سامنے لائیں تو سماج کو اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ اس بے گناہ بچّے کو معتوب کریں ...... اپنے اس بدتمیز دوست کے ہاں سے بچّہ لے آؤ اور اپنی چچی جان کے حوالے کر دو۔"

"لیکن چچا جان" معصوم کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"لیکن کیا؟" ڈیڈی کسی قدر غصّے میں بولے: "اس لیکن میں جو بڑی سے بڑی طاقت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہاری اور رخشی کی محبّت کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو جائے۔"

"جی؟" معصوم کچھ اس طرح چونکا جیسے اُسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

"ہاں" ڈیڈی بڑے اطمینان سے بولے: "یہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خان بہادر کا شکی ذہن رخشی کو ہی بچّے کی ماں سمجھ لے ... لیکن ... لیکن ... میں حالات سے نہیں گھبراتا۔"

معصوم نے گردن جھکا لی تھی اس کے ماتھے پر پھر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اور یہ اندازہ لگا لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا کہ اُس کی سانس بہت تیز چل رہی تھی۔ اور اس گردن جھکائے جھکائے ہی کچھ عجیب انداز میں کہا "میں نہیں سمجھتا کہ ابا جان اس قدر بے رحم ہو جائیں گے۔"

"قدرت نے بچّے کو ایک عجیب و غریب چیز بنائی ہے" ڈیڈی کہنے لگے: "بچے کسی کی نفسیات کو پڑھنے کا بہت اچھا آلہ ہیں۔ اگر میرا مطالعہ غلط نہیں تو جو آدمی کسی بچّے کو پیار نہیں کر سکتا کسی کو اُس سے رحم کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔"

"لیکن چچا جان" اب کے معصوم نے گردن اُٹھائی: "میری شادی میرا ذاتی معاملہ ہے آپ مجھ پر تو بھروسہ کر ہی سکتے ہیں۔"

"حالات فلمی مکالمے سے زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں" ڈیڈی ہنس پڑے "بہر حال فی الحال تو تم جاؤ بچّے کو لا کر اپنی چچی کے حوالے کر دو۔"

معصوم نے اُٹھ کر ڈیڈی کو آداب کیا۔ اور سر جھکائے۔ بھاری بھاری قدم اُٹھاتا باہر چلا گیا۔

وہ بچّہ جسے اپنے گھر رکھنے کی روادار ممّی بھی نہیں تھیں۔ بہر حال آ گیا اور اُس کی نگہداشت رخشی نے اپنے ذمّے لے لی جس سے ممّی اور بھی فکرمند ہو گئیں۔ منہ پر قابو تھا اس لئے وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولتیں لیکن دماغ پر بس نہیں چلتا تھا۔ اور ایک ماں کا دماغ تو یہ سوچتا کہ رخشی اپنے سوت کا بچّہ پال رہی ہے اور کبھی یہ کہ اب خان بہادر رخشی کو اپنی بہو ہرگز نہیں بنا سکیں گے اور بے شک کبھی یہ سوچتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے کہ پڑوس کی بعض عورتیں اُس بچّے کی شکل رخشی سے ملانے کی خاموش کوشش کرتی ہیں۔

وہ بچّہ جس کا نام رخشی نے ابھی کچھ نہیں رکھا تھا۔ رخشی سے کافی گھل مل گیا تھا اور اُس کی گود پہچاننے لگا تھا۔ اور یہ بات ممّی کے علاوہ بھابی اور ناسمجھ شمّی کے لئے بھی کسی حد تک پریشان کن ہو گئی تھی اور بھابی نے تو کئی بار رات کو چپکے سے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ جب بچّہ روتا ہے تو رخشی کیا کرتی ہے اور فیڈنگ بوتل سے دودھ پلاتے دیکھ کر اُن کا ذہن اور بھی الجھ کر رہ جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو تسلّی دینے کے لئے سوچتیں۔ "اُف اس قدر احتیاط ... مگر کب تک؟"

اب ڈیڈی کے ساتھ خان بہادر کی شطرنج کی بازی بہت کم جمنے لگی تھی اور اگر جمتی بھی تو خان بہادر کے وہاں۔ وہ خود یہاں شاذ و نادر ہی آتے۔ اپنے نہ آنے کی تاویل وہ یہ پیش کرتے کہ کچھ روز پیشتر معصوم نے اُن کے ڈرائیور کو مار پیٹ کر نوکری سے الگ کر دیا تھا پھر کوئی معقول ڈرائیور ملا نہیں تھا اور یہ بات اُن کی وضعداری کے خلاف تھی کہ جوان بیٹے کے ساتھ وہ کہیں گھومنے جائیں یا کہ خان بہادر کا بیٹا اپنے باپ کے لئے ہی سہی۔ لیکن ڈرائیور کا کام کرے — ڈیڈی کو بخوبی علم تھا کہ یہ سب کچھ عذر لنگ ہے لیکن انہوں نے اُن کے نہ آنے کے سلسلے میں کبھی کچھ زیادہ نہیں کریدا۔

ضرورت بھی کیا تھی جب وجہ اُن کے سامنے پنگوڑے میں سویا کرتا تھا یا رخشی اُس وجہ کو سینے سے چمٹائے ناچتی کودتی پھرتی تھی۔

پھر بھی ایک ایسی بات ضرور تھی جو اُن کے دماغ میں کلبلاتی رہتی تھی وہ ہمیشہ سوچتے کہ خان بہادر سے کچھ کھل کر باتیں کریں لیکن ہمیشہ ہی کچھ سوچ کر رُک جاتے وہ بات تھی رخشی اور معصوم کی شادی کی بات۔

لیکن ایک دن ممّی کے بہت زور دینے پر خان بہادر کے فرزیں کی شہ بچاتے ہوئے ڈیڈی نے کسی قدر دبی زبان سے پوچھ لیا۔

"بھئی — میرا خیال ہے اب ہمیں میاں معصوم اور خوشی کی شادی کے بوجھ سے سبک دوش ہو ہی جانا چاہئے۔"

"قبلہ پہلے ..... یہ لیجئے ..... شہ بچئے۔" خان بہادر نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے ڈیڈی کو پھر شہ دی اور مسکرانے لگے۔

"حضور والا!" ڈیڈی ہنس پڑے: "ذرا اپنی طرف بھی دیکھئے ... اور یہ لیجئے ....."

خان بہادر بوکھلا اٹھے۔ وہ ہار چکے تھے اور اپنی ہار کی خفت کو مٹانے کے لئے، وہ تھکی ہاری سی آواز کے ساتھ بولے۔

"بھئی بیرسٹر صاحب۔ کیا عرض کروں یہ کم بخت آج کل کے نوجوان بڑے نامعقول ہوتے ہیں۔ میری آپا کے صاحبزادے میاں اسلم نے بچپن سے طے کیا ہوا رشتہ ختم کر دیا ہے اور وہ نازنین سے شادی کرنا نہیں چاہتے۔"

"انکار کی وجہ ؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"بظاہر تو وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ولایت سے واپس آنے کے بعد شادی کے بارے میں سوچیں گے،" خان بہادر کہنے لگے "پانچ سال وہ ولایت میں رہیں گے یعنی پانچ سال کے بعد اس مسئلے پر حضور غور فرمائیں گے اور اُس غور کا نتیجہ تو کچھ بھی ہو سکتا ہے حضرت اگر وہ ولایت سے واپسی پر شادی کا وعدہ کرتے پھر بھی میں انکار ہی سمجھتا کیوں کہ نازنین کی عمر اٹھارہ سال ہے اور ہمارے گھرانے میں کسی لڑکی کی شادی سولہ سترہ سے زیادہ میں نہیں ہوتی بھلا اٹھارہ اور پانچ تیئس۔ تیئس سال بھی کوئی عمر ہے شادی کی۔ ہمارے ہاں بڑھاپے میں شادی معیوب سمجھی جاتی ہے۔"

"عجیب بات ہے" ڈیڈی بولے۔ "آپ کی بہن محترمہ نے بیٹے کو کچھ نہیں سمجھایا۔"

"بہت سمجھایا،" خان بہادر کہنے لگے "لیکن یہ نئی روشنی کے ..... بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس نئی تاریکی کے چھوکرے اندھیرے میں بھٹکنے کے عادی ہوتے ہیں۔ کوئی روشنی کی طرف لے جانا چاہے تو انھیں گوارہ نہیں ہوتا — قبلہ بیرسٹر صاحب میں بتاؤں، بچپن کا یہ رشتہ دراصل کیوں ختم ہوا ہے؟ اجی حضرت! میاں اسلم نے سوچا ہوگا کہ نازنین بھی آجکل کی لڑکیوں کی طرح ان سے فلمی انداز میں باتیں کرے ..... بلکہ محبت کرے گی گانے سنائے گی اور کلب میں ہم رقص ہوگی۔ ابھی جو نازنین وہاں گئی اور عرصے تک رہی تو برخوردار کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ یقین کیجئے میری نازنین نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور سُنا ہے کہ اُن سے اُن کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ پردہ کرتی ہے۔ جی ہاں سگے خالہ زاد بھائی سے پردہ ... ایک تو ہمارا گھرانہ ہے بھی بیرسٹر صاحب کٹر قسم کا اور پھر اس نیک بخت نے تو اور بھی عجیب خصلت پائی ہے۔ مجال ہے جو کوئی کہہ دے کہ اُس نے نازنین کو نظر بھر کے دیکھا ہے۔ حد ہی تو ہے کہ نسبتی بھائیوں سے پردہ، گھر کے ملازموں سے پردہ اور بھی بیرسٹر صاحب مجھے تو کوفت ہوتی ہے مجھ سے بھی رو برو باتیں نہیں کرتی۔"

"غالباً نازنین کے لئے کوئی رشتہ مل جانے کے بعد ہی آپ معصوم اور خوشی کی شادی کی تاریخ مقرر کریں گے ؟" نازنین کے قصیدے سے اکتا کر ڈیڈی نے پوچھا۔ "ہے نا ؟"

"بالکل۔ بالکل۔" خان بہادر جلدی سے بولے۔ لیکن ڈیڈی نے صاف طور پر دیکھا کہ کچھ اور کہنے کے لئے خان بہادر کے لب ہل کر رہ گئے، اور جب ڈیڈی کی ہی کوشش سے نازنین کے لئے ایک اچھا سا رشتہ طے ہوا اور پھر پختہ ہو گیا تو ڈیڈی خان بہادر سے ملے اور بساط پر مہرے بٹھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"میرا خیال ہے آج ہم لوگ شادیوں کی کوئی مبارک تاریخ بھی طے کر ہی لیں ؟"

"آپ کا خیال درست ہے،" خان بہادر بولے: "میں آپ سے ملنے والا بھی تھا۔ لیکن ڈرائیور کی عدم موجودگی نے ہی مجھے اپاہج بنا دیا ہے۔"

"حیرت ہے کہ آپ کو ابتک ڈرائیور نہیں مل سکا" ڈیڈی مسکرائے۔

"ملتا ہے تو ضرور،" خان بہادر بولے: "لیکن میاں معصوم کو کوئی بھی پسند نہیں آتا۔ پتہ نہیں ڈرائیوروں کے لئے انھوں نے اپنے ذہن میں کیا معیار مقرر کر رکھا ہے !"

"خیر جانے دیجئے۔" ڈیڈی بولے۔ "آمدم برسر مطلب"

"بسم اللہ۔" خان بہادر نے پہلی چال چلنے کا اشارہ ڈیڈی کو کیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں،" ڈیڈی بولے: "وہ شادی کی تاریخ کی بات؟"

"ہاں — " خان بہادر نے کہا اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر جیسے

انھوں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا: "بیرسٹر صاحب! میں کچھ ایسی بات عرض کرنا چاہتا ہوں جو۔۔۔ جو۔۔۔ جو ہو سکتا ہے آپ کو کچھ ناگوار گزرے۔"

"آپ بہ شوق فرمایئے" ڈیڈی بولے: "مجھے آپ کی کوئی بھی بات ناگوار نہیں لگے گی۔"

"یہ تو محض آپ کا ظرف ہے" خان بہادر بولے "ورنہ میں جانتا ہوں کہ وہ بات جو میں ایک طویل عرصے سے کہنا چاہتا ہوں لیکن عرض کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، وہ بات۔۔۔۔"

"بھئی میرے ظرف کا ہی اندازہ لگانا ہے تو کہہ بھی چکیے" ڈیڈی مسکرانے لگے "اور اگر مجھے اجازت دیجیے تو میں ہی آپ کی طرف سے کہہ لوں پھر سن لوں، اور پھر جواب دوں۔"

"گویا آپ بھی واقعات کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں؟" خان بہادر نے پوچھا۔

"میں بھی نہیں حضرت" ڈیڈی بولے "صرف میں ہی۔ اور میں جس تہہ تک پہنچا ہوں وہاں تک آپ کی رسائی نہیں ہو سکتی۔"

"ایسی بات نہیں" خان بہادر بولے "میری رسائی بھی آخری حد تک ہو چکی ہے میں بیگم صاحبہ کی طرح جانب داری اور کوتاہ بینی کا شکار نہیں بے شک میاں معصوم بھی گناہ گار ہیں۔۔۔ لیکن بیرسٹر صاحب قبلہ لڑکوں کی بات اور ہوتی ہے، لڑکیوں کی اور۔ میاں معصوم نے ہی خاندان کی عزت پر کیا کم پانی ڈالا ہے جو اب میں۔۔۔ جو اب میں۔۔۔ معاف کیجیے گا۔۔۔ یہ دونوں مل کر تو سارے خاندان کی ناک۔۔۔"

خان بہادر کہتے جا رہے تھے اور ڈیڈی ہنستے جاتے تھے آخر جیسے اُن سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ زوردار قہقہہ لگانے لگے اور خان بہادر کچھ احمق کے سے انداز میں اُن کی طرف دیکھنے لگے۔ اور جب ڈیڈی کا قہقہہ رکا تو خان صاحب بولے۔

"میرے ایک دوست کی طرح یقیناً آپ بھی یہی سوچ کر قہقہہ لگا رہے ہیں کہ جب معصوم اور آپ کی بچی کا رشتہ طے ہی ہو چکا ہے شادی بہرحال ہونے ہی والی ہے تو ڈھکوسلے کے چند مذہبی رسوم کے پہلے اور اُن کے بعد میں فرق ہی کیا پڑتا ہے۔"

"جی نہیں" ڈیڈی کہنے لگے "مذہبی رسوم سے قبل اور بعد کی قید بھی مضحکہ خیز چیز تو ہے لیکن فی الحال میں اس بات پر نہیں ہنس رہا ہوں۔"

"تو پھر میری قدامت پرستی پر" خان بہادر بولے "مگر وہ تو رہے گی۔ بیرسٹر صاحب معاف کیجیے گا ہمارا گھرانہ۔۔۔"

"مبارک ہے آپ کی قدامت پرستی" ڈیڈی بولے "اپنا اپنا اصول ہے۔ میں کیوں نہ ہنسوں؟ قبلہ مجھے ہنسی تو اس بات پر آ رہی ہے کہ معصوم نے خاندان کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے اور رخشی اگر اس گھر میں آ گئی تو ایک قدیم اریسٹوکریٹ گھرانے کا وقار ہی ختم ہو جائے گا سارے خاندان کی ناک ہی کٹ جائے گی۔۔۔" ڈیڈی پھر ہنسنے لگے لیکن خان بہادر نے بڑے غصے سے کہا۔

"معاف کیجیے بیرسٹر صاحب، بات تو واقعتاً یہی ہے۔ ممکن ہے آپ کے لیے یہ سب کچھ کوئی بڑی بات نہ ہو لیکن میرے لیے تو۔۔۔ معاف کیجیے گا میرا خاندان۔۔۔ میرا گھرانہ۔۔۔"

"تو پھر معاف کیجیے گا قبلہ خان بہادر صاحب" ڈیڈی یک لخت سنجیدہ ہو گئے "میں تو یہ چاہتا تھا کہ مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہ ہو لیکن آپ کی معاملہ فہمی کا جب یہ عالم ہے تو اس ناچیز کو بھی عرض کرنا ہی پڑے گا۔"

"بیرسٹر صاحب" خان بہادر نے بڑی بے زاری سے کہا "رشتہ ناتا تو طرفین کی مرضی کا معاملہ ہے کوئی کسی پر زور تو نہیں ڈال سکتا۔"

"بجا فرمایا آپ نے" پھر ڈیڈی بولے "میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ نہیں کہ آپ پر خواہ مخواہ زور ڈالوں کہ آپ رخشی کو اپنی بہو بنانا منظور کر لیں۔"

"تو پھر؟" خان بہادر نے بے دلی سے پوچھا۔

"حضور والا" ڈیڈی کہنے لگے "مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ آج کل کی اور نئی روشنی کی نالائق اولاد ہوتے ہوئے بھی آپ کے معصوم اور میری رخشی نے وہ کام کیا ہے جو یقیناً ہم آپ نہیں کر سکتے حضرت ہیں ان کی پرستش کرنی چاہیے۔ یقین کیجیے حضور والا میری نظر جب بھی اپنی رخشی پر پڑتی ہے میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔"

" آپ کیا فرما رہے ہیں ؟ " خان بہادر نے کچھ عجیب نظروں سے ڈیڈی کی طرف دیکھا۔

" ذرا صاف صاف کہئے ۔"

" صاف لفظوں میں کچھ کہنے کی مجھ میں جرأت نہیں ۔" ڈیڈی بہت ہی نرمی سے بولے۔

" میں تو صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ ان معصوموں کو یقیناً اس بات کی خبر تھی کہ کل کیا ہوگا، لیکن انھوں نے نتیجہ کی پروا کئے بغیر اور جان سے بھی عزیز تر چیز اپنی محبت کو داؤ پر لگا کر آپ کے خاندان کی عزت اور آپ کے خاندانی وقار کو مجروح ہونے سے بچا لیا ہے آپ کچھ اور سننا چاہتے ہیں تو یہ بھی سنئے کہ اس عظیم کام میں آپ کی بہن محترمہ اور اُن کے صاحبزادے میاں اسلم کا بھی بڑا ہاتھ ہے یہ اور بات ہے کہ وہ اتنے اعلا ظرف نہیں ورنہ وہ آپ کی نازنین کو بہر حال قبول کر لیتے ۔"

" میں کچھ نہیں سمجھ سکا بیرسٹر صاحب ! " خان بہادر کچھ ایسے بے بس سے نظر آنے لگے تھے جیسے وہ کسی بہت ہی واضح بات کو سمجھتے ہوئے بھی چاہ رہے ہوں کہ کاش وہ جو جو کچھ سمجھ رہے ہیں غلط ہو ڈیڈی نے بڑی بے دردی سے اُن کی طرف دیکھا پھر رازدارانہ انداز میں بولے۔

" بھائی صاحب ! میاں معصوم سے پوچھئے کہ انھوں نے بچپن سے اسی گھر میں پلے ہوئے آپ کے چہیتے ڈرائیور کو کیوں گھر سے نکال دیا؟ لیکن آپ کو جو کچھ معلوم ہو اُسے اپنے ذہن کے کسی گوشے میں اس طرح دفن کر دیجئے کہ کبھی کوئی کرید نہ سکے ۔ چاہے وہ بیگم صاحبہ ہی کیوں نہ ہوں "

خاں بہادر کو جیسے سانپ سونگھ گیا ۔ وہ کچھ اس طرح خاموش ہو گئے کہ واپس جاتے ہوئے ڈیڈی نے سلام کیا تو وہ جواب بھی نہ دے سکے۔

رخشی اور معصوم کی شادی پر بہتوں کو حیرت تھی ۔ اور یہ دیکھ کر تو انھیں اور بھی حیرت تھی کہ میکے سے رخصت ہوتے ہوئے رخشی وہ بچہ بھی اپنے ساتھ لیتی گئی ، جس کا نام اب اس نے وقار رکھ دیا تھا۔

ہندوستاں

مشاطۂ حُسن ازل
شانہ بھی ہم ، گیسو بھی ہم
بادِ صبا سے پوچھئے
گلشن بھی ہم ، خوشبو بھی ہم
ہم سے حدیثِ حُسن و عشق
صحرا بھی ہم ، آہو بھی ہم
ہم سے ہے سحرِ آگہی
اعجاز بھی ، جادو بھی ہم
ہم سِکھ بھی ہیں ، عیسائی بھی
مسلِم بھی ہم ، ہندو بھی ہم
جس سے گذر جاتے ہیں ہم
وہ رہ گذر ہے کہکشاں
تہذیب جس کا نام ہے
وہ ہے ہماری داستاں
یہ ہے ہماری سرزمیں
یہ ہے ہمارا گلستاں
ہر ذرّہ اِس کا آفتاب
اس کی زمیں ہے آسماں
ہندوستاں ، رشکِ جناں
رشکِ جناں ہندوستاں

کمال احمد صدیقی



نریش کمار شاد

رُباعیات

آفات کی یورش سے نہیں ڈر سکتا
سر موت کی چوکھٹ پہ نہیں دھر سکتا
انسان کی لازوال عظمت کی قسم
مر کر بھی تو انسان نہیں مر سکتا

نیکی کا بدی میں طور دیکھا میں نے
الطاف کی تہ میں جور دیکھا میں نے
ثابت ہوا امتزاج خیر و شر کا
انسان کو جب بغور دیکھا میں نے

پگھلایا ہر ایک منجمد سنّاٹا!
ہر زہر کو تریاق سمجھ کر چاٹا
فرہاد نے کیا پہاڑ کاٹا ہوگا
ہم لوگوں نے زندگی کو جیسے کاٹا

چاکِ دلِ صد پارہ کو سینا سیکھا
امرت کی طرح زہر بھی پینا سیکھا
مجھ کو تو بس اک یہی خوشی ہے میں نے
آلام سے مرنا نہیں جینا سیکھا

جب اہلِ گلستاں کو شعور آئے گا
جب دیدۂ احساس میں نور آئے گا
پھولوں کی لطافت کا تو کہنا کیا ہے
کانٹوں کی چبھن میں بھی سرور آئے گا

جس وقت بہت اُداس ہوتا ہوں میں
کہنے کو تو بدحواس ہوتا ہوں میں
لیکن یہ حقیقت ہے انھیں لمحوں میں
آپ اپنے سے روشناس ہوتا ہوں میں

ہر جا بروسفاک سے بیزار ہوں میں
خوں خوار نہیں واقعی غم خوار ہوں میں
اقبال کے خودپسند شاہیں کا نہیں
کمزور کبوتر کا طرف دار ہوں میں

بے ذوق فضا میں دل بجھا جاتا ہے
ذہن اپنی شگفتگی پہ شرماتا ہے
خوش ذوق کا ملنا تو کہاں ہے ممکن
بد ذوق بھی مشکل سے نظر آتا ہے

الفاظ کی محکوم نہیں ہوتی ہے
شرمندۂ مفہوم نہیں ہوتی ہے
جس شاعری پہ حریفوں کو ہے فخر
وہ شاعری معلوم نہیں ہوتی ہے

یوسف سرمست

منشی سجاد حسین

ایڈیٹر "اودھ پنچ" کے ناول

سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" اردو کے ان ادیبوں میں سے ہیں جو کئی حیثیتوں سے اُردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُردو صحافت میں تو اُن کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ انہوں نے اردو صحافت کو ایک بالکل نیا موڑ دیا۔ صحافت کے ذریعہ ہندوستان میں قومی جذبے کو ابھارنے اور بیدار کرنے میں ان کی کوششیں ناقابلِ فراموش حیثیت رکھتی ہیں۔ اُن کی صحافتی خدمات، ادبی خدمات میں کچھ ایسی اور اس طرح مدغم ہو گئی ہیں کہ اِن دونوں میں حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر "اودھ پنچ" کی اہم تحریروں کو پیش نظر رکھا جائے تو ایلیٹ کا یہ کہنا بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے کہ صحافت اور ادب کا امتیاز بالکل بیکار سی بات ہے۔ "کیوں کہ ایلیٹ ہی کے کہنے کے مطابق" آپ صحافت اور ادب کے درمیان کوئی مفید امتیاز ادبی قدروں کی بنا پر نہیں کر سکتے۔"

"اودھ پنچ" کے سارے اہم لکھنے والے ایسے ادیب تھے جو صحافتی تقاضوں کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے۔ سجاد حسین کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے "اودھ پنچ" کے ذریعے ایسے ادیبوں کو اکٹھا کر لیا تھا جو صحافی ذہن" رکھتے تھے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ لکھتا ہے" ذہن کی ایک ایسی بھی قسم ہے اور مجھے اس سے پوری ہمدردی ہے جو لکھنے یا اپنی بہترین تحریر پیش کرنے کی طرف کسی واقعہ کے دباؤ کے زیرِ اثر ہی مائل ہو سکتا ہے۔ اور ذہن کی یہی وہ قسم ہے۔ جسے میں صحافی کا ذہن سمجھنے کی تجویز کرتا ہوں"۔ سجاد حسین اور "اودھ پنچ" کے سارے لکھنے والے صحافی کا ذہن رکھتے تھے۔ جن کے قلم اس زمانے کے حالات اور "اودھ پنچ" کے پیدا کردہ ماحول اور فضا میں ہی رواں ہوا کرتے تھے۔ سجاد حسین نے "اودھ پنچ" کے ذریعہ اُردو ادب کی جتنی اور جیسی خدمت کی ہے۔ اس کا نمایاں ترین پہلو اس دور کی مزاح نگاری کی صورت میں بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ "اودھ پنچ" کا دور اُردو ادب کے مزاح اور طنز میں بھی منفرد اور اچھوتا مقام رکھتا ہے۔ سجاد حسین کے یہ تمام کارنامے ایسے نمایاں اور اس قدر اہم ہیں کہ اُن کی ناول نگاری اس کی وجہ سے پسِ منظر میں پڑ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سجاد حسین کی ناوِل نگاری کا ذکر ہمیشہ بڑے سرسری انداز میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی ناوِل نگاری کی طرف اب تک سنجیدگی سے توجہ نہیں کی گئی۔ اس لئے بعض ایسی کتابیں جو نہ تو سجاد حسین کی لکھی ہوئی ہیں نہ ہی ناوِل ہیں، اُن کے نام سے منسوب کر دی جاتی ہیں اور ناوِل کہلاتی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل

یں جانے سے جو کتابیں سجاد حسین سے منسوب کی جاتی ہیں اُن کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سجاد حسین کے نام سے جن ناولوں کو منسوب کیا جاتا ہے اُن میں "حاجی بغلول"، "احمق الذین"، "طرح دار لونڈی"، "پیاری دنیا"، "میٹھی چھری"، "کایا پلٹ" اور "حیات شیخ چلی" کے نام شامل ہیں۔ چناں چہ رام بابو سکسینہ سجاد حسین کے ناولوں کے بارے میں لکھتے ہیں

"منشی صاحب ایک زبردست ناول نگار بھی تھے چناں چہ اُن کے ناول حاجی بغلول، طرح دار لونڈی۔ پیاری دنیا، احمق الذین میٹھی چھری۔ کایا پلٹ، حیات شیخ چلی مشہور ہیں۔"

رام بابو سکسینہ نے جو کچھ بھی بغیر تحقیق کے لکھ دیا تھا اس کو جوں کا توں اب تک نقل کیا جاتا ہے چناں چہ سہیل بخاری نے "اُردو ناول نگاری" میں رام بابو سکسینہ کی دی گئی فہرست بغیر کسی کمی بیشی کے نقل کر دی ہے۔

"سجاد حسین کی تصانیف میں حاجی بغلول۔ احمق الذین۔ طرح دار لونڈی۔ میٹھی چھری۔ پیاری دنیا۔ کایا پلٹ اور حیات شیخ چلی مشہور ہیں۔"

وقار عظیم بھی طرحدار لونڈی کو منشی سجاد حسین کے ناولوں میں شمار کرتے ہیں علی عباس حسینی نے "حاجی بغلول"۔ کایا پلٹ اور احمق الذین کے ساتھ پیاری دنیا کو بھی منشی سجاد حسین کا لکھا ہوا ناول قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، علی عباس حسینی کے گنائے ہوئے ناولوں کو دُہراتے ہیں۔ اس طرح سے بغیر کسی تحقیق کے اب تک ایسی کتابیں بھی جو سجاد حسین کی لکھی ہوئی نہیں ہیں یا سرے سے ناول ہی کہلانے کی مستحق نہیں ہیں سجاد حسین کے ناولوں کے نام سے پیش کی جاتی ہیں۔ سجاد حسین "اڈیٹر اودھ پنچ" سے جو کتابیں منسوب کی جاتی ہیں اُن میں سے دو تو قطعی ایسی ہیں جو سجاد حسین کی لکھی ہوئی نہیں ہیں اور نہ ہی وہ ناول کہلائی جا سکتی ہیں مری مراد "حیات شیخ چلی" اور "طرحدار لونڈی" سے ہے۔ "پیاری دنیا" سے متعلق البتہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سجاد حسین کی لکھی ہوئی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اُسے ناول کہنا قطعی صحیح نہیں ہے۔

معلوم نہیں "حیات شیخ چلی" کو سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ سے منسوب کرنے کی بدعت کا آغاز کیوں کر ہوا۔ "حیات شیخ چلی" سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ سجاد حسین انجم کسمنڈوی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد شاید اس بنا پر پڑی کہ اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کئے بغیر اسے ناول کہہ دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اسے سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کی لکھی سمجھ لیا گیا ہے اور منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ نے اپنے ذاتی مطبع شام اودھ سے اُسے چھاپا ہے۔ حالانکہ اس کتاب کے سرورق ہی پر ان تمام باتوں کی تفصیل ہے۔ راقم الحروف نے اس کتاب کا دوسرا اڈیشن دیکھا ہے۔ جس کے سرورق پر لکھا ہے۔

"حیات شیخ چلی"، مولفہ منشی محمد سجاد حسین انجم مرحوم مصنف کائنات و نشتر۔ باہتمام بندہ محمد سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ و مالک مطبع شام اودھ لکھنو طبع شد طبع ثانی ۱۹۰۵ء"

یہی نہیں بلکہ اس کی تقریظ خود سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کی لکھی ہوئی ہے جس کا عنوان ہے:۔

"تقریظ ریختہ بہ کلک ظرافت سلک منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر "اودھ پنچ"۔ اس تقریظ میں سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ نے سجاد حسین انجم کی اس طرح تعریف کی ہے۔

"اس کے لائق مصنف منشی سجاد حسین صاحب انجم واقعی عجب سہل ممتنع کیا۔ کوزے کو دریا میں بند کرنا یا شیر ببر کو کچے دھاگے سے باندھ لانا اسی کلیم سے ممکن ہے۔"

ان تمام باتوں سے بالکل صاف اور صریح طور پر ظاہر ہے کہ یہ تصنیف قطعی منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کتاب کا اب تک اڈیٹر اودھ پنچ سے منسوب کیا جانا، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے مورخین اور ادیبوں نے بغیر اس کتاب کو دیکھے اسے ناول قرار دے کر "اڈیٹر اودھ پنچ" کے نام سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ اس کتاب کو ناول قرار دینا بھی غلط ہے۔ یہ شیخ چلی

کی سوانح حیات ہے۔ اس میں تو صرف شیخ چلی کی مفروضہ شخصیت سے جو واقعات منسوب کیے جاتے ہیں ان کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح "پیاری دنیا" بھی ناول نہیں ہے۔ یہ اصل میں ایک تمثیل Allegory ہے۔ اس میں دنیوی امتیاز حاصل کرنے کے لیے ہر انسان جو جدوجہد کرتا ہے اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ گویا "گیتی بیگم" کے حاصل کرنے کے لیے "طالب (دنیا) جو کچھ کرتا ہے اس کی تفسیر ہے۔ یہ تمثیل "اودھ پنچ" میں بالاقساط ۲۸ نومبر ۱۹۰۷ء سے ۲۷ اگست ۱۹۰۸ء تک مسلسل شائع ہوتی رہی۔ آخری قسط کے ایک رنگین صفحہ پر جو گویا اس کا سرورق تھا۔ یہ عبارت لکھی ہے۔

پیاری دنیا یعنی افسانہ گیتی بیگم و طالب — جو اودھ پنچ میں ہفتہ وار ۲۸ نومبر ۱۹۰۷ء سے ۲۷ اگست ۱۹۰۸ء تک شائع ہوا اور جس کا مصنف ایک دنیا دار ہے۔ مطبع شام اودھ لکھنؤ میں باہتمام محمد سجاد حسین چھاپا گیا ۱۹۰۸ء

یہ کتاب بعد میں کتابی شکل میں مطبع شام اودھ سے ہی چھپی ہے۔ لیکن اس پر بھی اس کے مصنف کا نام ایک دنیا دار ہی لکھا ہے اس لیے اس کے تعلق سے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بھی سجاد حسین کی لکھی ہوئی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ یہاں نام کے اخفا کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ بالفرض محال یہ بھی مان لیا جائے کہ پیاری دنیا کی مناسبت سے یہاں مصنف نے اپنا نام" دنیا دار" رکھ لیا تو بھی بعض باتیں ایسی ہیں جس کی وجہ سے یہ گمان زیادہ غالب نظر آتا ہے کہ یہ بھی ان کی لکھی نہیں تھی۔ ایک تو اس لیے کہ سجاد حسین کی کتابوں کے جو اشتہار "اودھ پنچ" میں چھپتے رہے ہیں ان میں اس کتاب کا نام شامل نظر نہیں آتا۔ دوسری ایک بات بھی ہے کہ یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں چھپی جب کہ سجاد حسین پر فالج کا دوسرا حملہ ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا۔ اس حملے کے متعلق کشن پرشاد کول نے لکھا ہے:

"۱۹۰۴ء میں فالج کا دوسرا حملہ ہوا کہ جس نے تندرستی ہمیشہ کے لیے تباہ کر دی۔ اس وقت سے بولنے کی قوت قریب قریب جاتی رہی۔ گفتگو کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر چل پھر سکتے تھے اور دماغ اپنا کام برابر کرتا تھا۔[1]

گو اس کے بعد بھی "اودھ پنچ" میں سجاد حسین کے مختلف موضوعات پر مضامین چھپتے رہے لیکن مستقل اور مسلسل طور پر ہر ہفتہ لکھنا ان کے لیے مشکل رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ اب تک کوئی ایسا معتبر اور مستند ذریعہ بھی سامنے نہیں آیا ہے جس کی مدد سے یہ کہا جا سکے کہ یہ اڈیٹر "اودھ پنچ" کی لکھی ہوئی تھی۔ بہر حال یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن پھر گمان یہی ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی ان کی لکھی ہوئی نہیں تھی۔

مذکورہ بالا دو کتابوں کے علاوہ "طرحدار لونڈی" کو بھی سجاد حسین کا ناول قرار دے دیا جاتا ہے۔ حیرت ناک بات تو یہ ہے کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور اس سلسلے میں سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ حال ہی میں میمونہ بیگم نے اس کو مرتب کیا ہے اور اسے نہ صرف سجاد حسین کا لکھا ہوا قرار دیا ہے بلکہ اس کو ناول بھی فرض کر کے سجاد حسین کی ناول نگاری پر لمبی چوڑی تنقید بھی لکھ ڈالی ہے۔ بغیر تحقیق کے تنقید کرنے کی ایسی حیرت ناک مثال دینا مشکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میمونہ بیگم کو "طرحدار لونڈی" کا ایسا نسخہ مل گیا جس پر اس کے مصنف کا نام نہیں تھا اور انھوں نے پچھلے مورخین اور نقادوں کی گمراہ کن بات پر یقین کر کے سمجھ لیا کہ سجاد حسین کا لکھا ہوا ہے۔ اور چوں کہ انھوں نے اس سلسلے میں "اودھ پنچ" کے شماروں کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اس لیے انھیں یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کتاب ناول کے طور پر نہیں لکھی گئی۔ اگر میمونہ بیگم نے "اودھ پنچ" کے ابتدائی شماروں کو دیکھنے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو انھیں آسانی سے پتہ چل جاتا کہ یہ قصہ ڈرامے کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ سید محمد آزاد کے ڈرامے "نوابی دربار" کے بعد "اودھ پنچ" میں ایک دوسرا ڈرامہ "گرد کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز کریں" کے عنوان سے شروع ہوا اور یہی ڈراما بعد کو "طرحدار لونڈی" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ "اودھ پنچ" میں نوابی دربار کے ختم ہونے پر سجاد حسین نے اس کے بارے میں لکھا تھا:-

---

۱۔ گلدستہ اودھ پنچ" (لکھنؤ-1915)

"اب اسٹیج پر پردہ پڑتا ہے اور نواب صاحب مع مصاحبین
اور خاں صاحب مع زوجہ مقدسہ رخصت ہوتے ہیں۔ ہم
جانتے ہیں کہ ناظرین اگرچہ تھک گئے ہوں گے۔ مگر رخصت
کرتے وقت پژمردہ خاطر ہوں گے۔ جس طرح تھیٹر میں
اگرچہ تماشا دیکھنے والے زیادہ زیادہ رات تک جاگتے
جاگتے تھک کر کسی قدر جمائیاں لینے لگتے ہیں۔ مگر
تماشا ختم ہونے پر اور اسٹیج پر پردہ پڑنے پر سب
ساز و سامان رخصت ہونے پر تھوڑے بہت رنجیدہ
ہوجاتے ہیں اس واسطے ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں
عرض کرتے ہیں کہ انشاءاللہ عنقریب دوسرا تماشا
نئے رنگ کا پھر شروع ہوگا جو غالباً اس سے بہتر ہوگا۔" [1]

سجاد حسین نے ۱۶ جولائی کے شمارہ میں جو وعدہ کیا تھا وہ آئندہ شمارہ میں یعنی ۲۳ جولائی کو ایفا کر دیا گیا اور ایک دوسرا ڈرامہ "گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز" کے عنوان سے بالاقساط شائع ہونے لگا۔ ہر ڈرامے کی طرح یہاں بھی کرداروں کی فہرست دی گئی اور بیانیہ کے بجائے مکالموں کے ذریعے ہر چیز کو پیش کیا گیا ہے [2] اس ڈرامے کے بارے میں "نوابی دربار" کا دیباچہ لکھتے ہوئے عبدالغفار شہباز لکھتے ہیں:۔

"خود اودھ پنچ میں اس ڈرامے کے بعد ہی دوسرا ڈراما گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز، کے عنوان سے چھپا" [3]

"گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز" اصل میں طرحدار لونڈی کا ہی پہلا نام ہے۔ اِن دونوں کو ایک ہی نظر دیکھ لینے سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں لفظاً بہ لفظاً، حرف بہ حرف بالکل ایک ہیں۔

"طرحدار لونڈی" جب اودھ پنچ میں "گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز" کے عنوان سے چھپا تو اسمیں بھی جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ ڈراموں کی

[1] "اودھ پنچ" ۱۶ جولائی ۱۸۷۸ء
[2] ملاحظہ ہو اودھ پنچ ۲۳ جولائی ۱۸۷۸ء
[3] دیباچہ نوابی دربار ص۲

فہرست دی گئی ہے۔ [1] جس سے صاف ظاہر ہے کہ اُسے ڈرامے کے طور پر لکھا گیا ہے اور یہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے ڈراما ہی کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس میں عمل Action کے ذریعے کرداروں اور پلاٹ کو ابھارا گیا ہے۔ اور مکالمے کے ذریعے ہی ہر چیز پیش کی گئی ہے یعنی بیانیہ کے ذریعے کہانی، پلاٹ یا کردار یا منظر نگاری نہیں پیش کی گئی ہے یہی ڈراما کی نہ صرف سب سے اہم اور امتیازی خصوصیت ہے بلکہ یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ڈراما دوسری اصناف سے بالکل علیحدہ اور جداگانہ نوعیت رکھتا ہے اس لئے "طرحدار لونڈی" کو ناول سمجھنا اور ناول نگاری کے اصولوں کو مدِنظر رکھ کر اُس پر تنقید کرنا انتہائی بے معنی اور مضحکہ خیز بات ہے۔ البتہ اس پر ڈراما نگاری کے اصولوں کے مطابق تنقید کی جا سکتی ہے اور یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس میں اسٹیج کے مطالبوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا لیکن اسٹیج کی ضرورتوں کو پیش نظر نہ رکھنے سے کوئی ڈرامہ ناول یا افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔

میمونہ بیگم نے "طرحدار لونڈی" کو ناول ہی سمجھ کر تنقید کی ہے اس لئے ان کی اس تنقیدی مساعی کا جو کچھ حشر ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ لیکن سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ انھوں نے اس کو سجاد حسین سے منسوب کر دیا ہے۔ معلوم نہیں "اودھ پنچ" کے اس شمارے میں جس میں یہ ڈراما ختم ہوا اس کے مصنف کا نام درج ہے یا نہیں۔ کیوں کہ راقم الحروف کو اودھ پنچ کا وہ شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لئے وہ یقین سے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن قیاس غالب ہے کہ اس ڈرامے کی آخری قسط والے شمارے میں اس کے مصنف کا نام ضرور درج ہوگا جیسا کہ نوابی دربار کی آخری قسط میں اس کے مصنف کا نام دیا گیا ہے "نوابی دربار" کے دیباچہ نگار عبدالغفار شہباز نے گو "گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز" یعنی طرحدار لونڈی کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے مصنف کا نام نہیں لکھا۔ لیکن یہ ڈراما جب کتابی صورت میں شائع ہوا تو اس کے مصنف کا نام اس پر درج ہے

[1] ملاحظہ ہو "اودھ پنچ" ۲۳ جولائی ۱۸۷۸ء

یہ مرزا احمد بیگ طرار لکھنوی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۹۰۴ء میں خود سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" کے مطبع شام اودھ سے چھاپا گیا۔ راقم کو اس کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کتاب کے سرورق پر مصنف اور کتاب کے بارے میں تفصیل اس طرح درج ہے۔

" طرحدار لونڈی یا آستین کا سانپ۔
جس میں ایک دولت مند مگر غافل گھر کا ڈھنگ اور سمجھدار ہوشیار لونڈی کی چالاکیوں اور جائز و ناجائز تدابیر ترقی کا حال اور آخر کو پیشہ ور بازاری عورت بن کے اپنی حالت درست کرنے اور اس غافل گھر کے مفلس اور تباہ ہونے اور لونڈی کے ایک مقدمہ میں پھنس کے جیل جانے کا حال مرزا احمد بیگ طرار لکھنوی نے لکھنؤ کی چٹخارے دار اردو میں بیان کیا ہے۔ گویا بولتی چالتی تصویر کھینچ دی ہے۔
مطبع شام اودھ لکھنؤ میں چھپی سنہ ۱۹۰۴ء" [1]

مطبع شام اودھ سے چھپنا اس بات کا محکم ترین ثبوت ہے کہ یہ کتاب سجاد حسین کی لکھی ہوئی نہیں تھی ورنہ خود ان کی زندگی میں اس ڈرامے کا خود ان کے مطبع میں کسی اور کے نام سے چھپنا قطعی ناممکن ہے اس لئے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ ڈرامہ مرزا احمد بیگ طرار لکھنوی کا لکھا ہوا تھا اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ یہ ناول بھی نہیں کہلایا جا سکتا نہ ہی ناول کے طور پر لکھا گیا۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کو سامنے رکھ کر جب سجاد حسین کی ناول نگاری پر تنقید کی جائے گی تو ایسی تنقید نہ تو سجاد حسین کے ساتھ انصاف کر سکے گی نہ ہی ان کی ناول نگاری کے ساتھ۔ سجاد حسین کی یہ عجیب بدقسمتی رہی ہے کہ ان کی ناول نگاری پر جب کبھی کچھ تنقید ہوئی ہے وہ ایسی ہی غلط فہمیوں یا غلط بیانیوں کا شکار رہی ہے۔ اس کی اہم وجہ شاید یہی ہے کہ آج تک سجاد حسین کے تمام ناولوں کے متعلق سے کوئی تحقیق کی گئی ہے اور نہ ہی ان کو پڑھنے کی زحمت گوارا کی گئی ہے۔ سجاد حسین کی ناول نگاری کے تعلق سے کچھ کہنے سے پہلے ان کے چاروں ناولوں "حاجی بغلول" "احمق الذین" کایا پلٹ، میٹھی چھری"، کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اگر صرف ان کے مشہور ناول "حاجی بغلول" کو سامنے رکھا جائے تو بھی ان کی ناول نگاری کے متعلق کوئی صحیح رائے نہیں قائم کی جا سکتی جیسا کہ علی عباس حسینی کی تنقید سے ظاہر ہوتا ہے۔ سجاد حسین کی ناول نگاری پر ان کی تنقید پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ صرف مزاحیہ ناول لکھا کرتے تھے ڈاکٹر احسن فاروقی کی بھی تنقید ایسی ہی ہے۔ اُن کی تنقید پڑھنے سے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے بالکلیہ علی عباس حسینی کی تنقید کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی۔ انھوں نے "احمق الذین" کو شاید سرے سے پڑھا ہی نہیں۔ وہ سجاد حسین کی ناول نگاری کے تعلق سے جو اہم بات کہتے ہیں وہ یہ ہے۔

"حاجی بغلول اپنی عجیب شکل اور احمق الذین اپنی عجیب قطع کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہنساتے رہیں گے۔"

اس تنقید سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے "احمق الذین" کا مطالعہ کئے بغیر صرف علی عباس حسینی نے جو اقتباس اس ناول کا دیا ہے اسے پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کیوں کہ سجاد حسین کے ناول "حاجی بغلول" میں تو حاجی بغلول نامی مرکزی کردار ہے لیکن ان کے ناول "احمق الذین" میں اس نام کا کوئی کردار ہے ہی نہیں بلکہ اس ناول کا مرکزی کردار بھولے نواب ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خود بھولے نواب کا کردار حاجی بغلول کی طرح مزاحیہ نہیں ہے۔ بہر حال اسی طرح سجاد حسین کی ناول نگاری کے تعلق سے مشہور و معروف ادیبوں، نقادوں اور مورخوں نے جس تحقیقی و تنقیدی بے اعتدالیوں سے کام لیا ہے اس کی وجہ سے سجاد حسین کی ناول نگاری کے متعلق اب تک صحیح رائے قائم نہیں ہو سکی ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی ناول نگاری کا پوری سنجیدگی اور مکمل تحقیقی اور تنقیدی ذمہ داری کے ساتھ جائزہ لیا جائے یہاں اس مضمون میں اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کی ناول نگاری کے متعلق کسی مبسوط رائے کا اظہار کیا جا سکے۔

---

[1] یہ کتاب سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

سلام سندیلوی

منظر نگاری کی ضروری شرائط

اُردو شاعری میں منظر نگاری بڑی حد تک خام اور ناقص انداز میں ملتی ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اُردو شعراء نے زیادہ تر مناظرِ قدرت کی تخیلی اور قیاسی تصویریں پیش کی ہیں۔ دورِ قدیم سے لے کر دورِ حاضر تک کے بیشتر شعراء نے مناظرِ قدرت کو بذاتِ خود نہیں دیکھا ہے اس لئے اُن کی منظریہ شاعری میں فطرت کے اصل خط و خال نظر نہیں آتے ہیں۔ یہ خامی اُردو کے قصیدہ گو، مثنوی گو اور مرثیہ گو شعراء میں عام طور سے پائی جاتی ہے۔

اُردو کے قصیدہ گو شعراء نے زیادہ تر فارسی گو شعراء کے تتبع میں قصائد کہے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ایران کی بہار کو ہندوستان میں منتقل کر دیا۔ اسی لئے بہاریہ قصیدوں کی تشبیہ میں جو منظر نگاری ملتی ہے وہ رسمی اور مصنوعی ہے اس کی شکایت پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"عام طور پر جہاں بھی قصیدہ کی ابتدا میں اس قسم کے منظر کی تصویر اُتاری جاتی ہے۔ وہاں ذاتی مشاہدہ کی کمی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے منظر اپنی شان و شوکت کے باوجود بھی دل و دماغ پر اثر نہیں کرتے۔" [1]

تقریباً یہی حال اُردو مثنویوں کی بھی منظر نگاری کا ہے مثنوی گو شعراء نے بھی زیادہ تر باغ و بہار کے فرضی نقشے پیش کئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اکثر و بیشتر اپنے پلاٹ کے لئے دیگر ممالک کو منتخب کیا ہے اور ان ممالک کو انہوں نے کبھی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ مثنوی میں جس ملک کا پلاٹ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا وجود بھی کرۂ ارض پر نہیں ہے بلکہ وہ ملک محض شاعر کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہے۔ ایسی صورت میں مناظرِ قدرت کے نقشے فرضی نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کا خیال مثنوی نگاری کے سلسلے میں بہت درست ہے۔

"مثنوی میں مناظرِ فطرت ملتے ہیں مگر دیکھی ہوئی چیزوں کا ذکر نہیں ملتا۔ برسات کی رنگینی۔ دریا کا سکون اور اس کی روانی۔ ہندوستان کے سر بفلک کوہ اور آبشار۔ تاریک خوفناک گھاٹیاں اس قسم کی چیزوں کی تصویر بالکل نہیں ملتی۔ اگر کہیں ہے بھی تو محض رسمی۔ عموماً باغ کی تصویر کشی ہوتی ہے لیکن باغ بھی ایسا جسے فطرت نے نہیں لگایا ہے۔ ہر جگہ تصنع ہے۔ تمام بناوٹ۔ غیر فطری چیزیں دکھائی جاتی ہیں۔" [2]

---

[1] اُردو شاعری پر ایک نظر۔ حصہ اوّل صفحہ ۱۵۷

[2] اُردو شاعری پر ایک نظر۔ حصہ اوّل۔ ص ۲۱

اُردو مرثیوں کی منظر نگاری قدرے غنیمت ہے خاص طور سے میر انیس نے بعض مقامات پر فطرت کے حسین مناظر پیش کئے ہیں مگر میر انیس اور دیگر مرثیہ گو شعراء کے سامنے دقت یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر میدانِ کربلا کے مناظرِ قدرت کا نقشہ کھینچنا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے میدانِ کربلا کے مناظر کی فرضی تصویر کشی کی ان شعراء نے کہنے کو تو کربلا کے مناظر کی عکاسی کی مگر دراصل اُن کی نظر میں ہندوستان ہی کے مناظر تھے اسی لئے مرثیہ گو شعراء کی منظر نگاری بھی زیادہ تر قیاسی اور تخیلی ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی نہیں کہ بلکہ ان شعراء کی منظر نگاری میں ایک قسم کی یکسانیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد فرماتے ہیں۔

"مرثیوں میں مشاہدہ عالم کی رنگینیوں سے حسنِ کلام کی تزئین ہو سکتی تھی اور اس قسم کے کچھ بیانات ملتے ہیں اور بعض اعلیٰ پایہ کے بھی ہیں لیکن زیادہ تنوع نہیں۔" [۲۰]

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کامیاب منظر نگاری کے لئے کیا شرائط ضروری ہیں یعنی کسی شاعر کی منظر نگاری میں کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے تاکہ ہم اس کو کامیاب منظر نگاری کہہ سکیں۔ اس سلسلے میں ہم کو ایک معیار قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

منظر نگاری کے لئے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ اس میں تخیل کے بجائے محاکات سے کام لیا جائے۔ مولانا شبلی کے الفاظ میں "محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے" [۲۱]۔ حقیقت یہ ہے کہ منظر نگاری کے لئے محاکات ہی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ منظریہ شاعری میں شاعر کا اصل مقصد کسی فطری منظر کی ہوبہو تصویر کھینچنا ہوتا ہے اسی بنا پر تخیل اور محاکات کے استعمال میں فرق پیدا ہو جاتا ہے تخیل کا استعمال غیر مرئی اشیاء کے لئے کیا جاتا ہے۔ مگر مناظرِ قدرت کا تعلق مرئی اشیاء سے ہے جن کو واضح طور پر بیان کرنے کے لئے محاکات سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر مولانا شبلی کی رہنمائی ہمارے لئے مفید ثابت ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں۔

"تخیل اور محاکات اگرچہ دونوں شاعری کے عنصر ہیں لیکن بلحاظ اکثر دونوں کے استعمال کے موقعے الگ الگ ہیں۔ یہ سخت غلطی ہے کہ ایک کے بجائے دوسرے کا استعمال کیا جائے۔ مثلاً مناظرِ قدرت کا بیان محاکات میں داخل ہے یعنی مثلاً اگر بہار، خزاں، باغ، سبزہ، مرغزار، آبِ رواں کا بیان کیا جائے تو محاکات سے کام لینا چاہئے۔ یعنی اس طرح بیان کرنا چاہئے کہ ان چیزوں کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ متاخرین کی سخت غلطی جس سے اُن کی شاعری برباد ہو گئی یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخیل سے کام لیتے ہیں" [۲۲]۔

مولانا شبلی کے قول کے مطابق منظر نگاری کے لئے محاکات کی ضرورت ہے مگر محاکات کی بنیاد مشاہدہ پر قائم ہوتی ہے۔ جب تک مناظرِ قدرت کا براہِ راست مشاہدہ نہیں کیا جائے گا محاکات میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ہے شاعر ایک مصور کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح مصور مناظرِ قدرت کی تصویر بغیر اُن کے مشاہدے کے نہیں اتار سکتا ہے اس طرح شاعر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ بغیر مناظرِ قدرت کو دیکھے ہوئے ان کی صحیح عکاسی کر سکے۔ حکیم مولوی سید امداد امام اثر نے ایک مصور کے لئے مشاہدۂ عالم پر زور دیا ہے۔

"علوم خارجیہ و ذہنیہ کی واقفیت کے علاوہ مصور کو چاہئے کہ وسعت نظر کے ساتھ صحیح طور پر عالم کا مشاہدہ کئے ہو۔ ملک ملک پھرا ہو طرح طرح کے بیابان صحرا جنگل بحور و جبال اپنی آنکھوں سے دیکھے ہو۔ ہر قسم کے جانوروں کو ان کی صحرائی اور پروردہ حالتوں میں معائنہ کئے ہو اور جتنی چیزیں اس عالم میں فطرتی اور مصنوعی ہیں۔ بحدِ طاقتِ بشریہ ان سے خالی اطلاع رکھتا ہو۔ فطرتی اشیاء میں قابلِ مشاہدہ ایسی چیزیں ہیں۔ مثلاً ملک ملک کے شفق، رنگِ آسمانی۔ فصلِ بہار۔ فصلِ خزاں۔ سمندروں کے جوش، طوفان، برف باری۔ ژالہ باری۔ برق۔ باراں۔ قوسِ قزح، شفقِ شمال۔ ریگستان۔ گرد و باد بادِ سموم۔ نیستان۔ مرغزار۔ سبزہ زار۔ چراگاہیں۔ دشت۔ صحرا۔

---

۲۰ اُردو شاعری پر ایک نظر حصہ اول ص ۲۵۳ (۲۱) شعر العجم حصہ چہارم ص ۹

۲۲ شعر العجم حصہ چہارم صفحہ ۵۹ - ۶۰

کوہ آتش فشاں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں۔ دامان کوہ۔ دریاؤں کا پہاڑوں سے نکلنا۔ ان کا بلندیوں سے نشیب کی طرف جست کرنا ان کا پہاڑوں سے گزرنا۔ ان کا پہاڑوں کو پھاڑ کر بہ نکلنا۔ ان کا میدانی حصوں میں کج وکاو راہوں کا اختیار کرنا چشموں کا ابلنا۔ بڑی بڑی جھیلیں (جیسے لیک کومور وغیرہ) اور طرح طرح کے اشجار و اثمار و ازہار و طیور و دواب وغیرہ وغیرہ [1]

حکیم مولوی سید امداد امام اثر نے جس طرح ایک مصور کے لئے کائنات کا مطالعہ ضروری قرار دیا ہے۔ اسی قسم کا کائناتی مشاہدہ ایک منظرنگار شاعر کے لئے بھی ضروری ہے۔ اسی بنا پر مولانا حالی بھی فرماتے ہیں۔

"شاعر کے لئے نیچر کا خزانہ ہر وقت کھلا ہوا ہے اور قوت متخیلہ کے لئے اس کی اصلی غذا کی کچھ کمی نہیں ہے۔ پس بجائے اس کے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کاغذ کی پھول پنکھڑیاں بنائے اس کو چاہئے کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں اور خود اپنی ذات میں قدرت حق کا تماشا دیکھے۔ جہاں بھانت بھانت کے اصلی پھول اور پنکھڑیوں کے لازوال خزانے موجود ہیں" [2]

بہرحال منظر نگاری کے لئے بنیادی شرط مشاہدۂ فطرت ہے۔ اس کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مشاہدات کو محاکاتی انداز میں پیش کر دیا جائے۔ غرض کہ مناظر قدرت کی عکاسی کے لئے محاکات سے کام لینا بہتر ہے ایسے موقع پر تخیل ہماری مدد نہیں کر سکتی ہے منظر نگاری کے سلسلے میں یہ اصول بہت اہم ہے اس اصول کی اہمیت کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم کو محاکات کے مختلف پہلوؤں پر بھی غور کر لینا چاہئے۔ مولانا شبلی نے شعر العجم میں ان چیزوں سے بحث کی ہے جن سے محاکات کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں مولانا شبلی نے پہلی بات یہ بتائی ہے کہ محاکات کی تکمیل کے لئے مناسب وزن کا انتخاب ضروری ہے۔ ان کا قول ہے کہ "درد۔ غم۔ جوش۔ غیظ۔ غضب ہر ایک کے اظہار کا لہجہ اور آواز مختلف ہے۔ اس لئے جس جذبہ کی محاکات مقصود ہو۔ شعر کا وزن بھی اسی کے لئے مناسب ہونا چاہئے۔" [1] اسی اصول کی روشنی میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مختلف مناظر قدرت کی عکاسی کے لئے مناسب اوزان کے استعمال کی ضرورت ہے۔ اکبر الہ آبادی کی پانی والی مثنوی کی کامیابی کا ایک یہ بھی راز ہے کہ اس کے لئے مناسب وزن کا انتخاب کیا گیا ہے۔

مولانا شبلی نے محاکات کی تکمیل کا ایک اور راز بتایا ہے ان کا قول ہے کہ محاکات کا اصل کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو۔ یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اسی طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آ جائے۔ [2] انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اصل کی مطابقت کس صورت سے ہو سکتی ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ "جس شے کا بیان کرنا ہے اس کی جزئیات کا اس طرح استقصا کیا جائے کہ پوری شے کی تصویر نظر کے سامنے آ جائے [3]"۔

محاکات کی اسی خوبی کی طرف مولوی عبدالرحمن نے بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"جب وصف کے معنی ٹھہرے ہیں کشف و اظہار تو وصف کی خوبی یہ ہے کہ شاعر جس چیز یا جس حال کا وصف کرنے لگے اپنے سامعین کو بھی اسی عالم میں پہنچا دے جہاں خود موجود ہے تاکہ ان کا وصف سن کر انہیں یہ محسوس ہونے لگے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے یہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔" [4]

محاکات کی تکمیل کا ایک اور طریقہ ہے۔ مولانا شبلی کا قول ہے کہ "اکثر چیزیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مختلف قسم کے انواع ہوتے ہیں اور ہر نوع میں الگ خصوصیت ہوتی ہے مثلاً آواز ایک عام

---

[1] کاشف الحقائق جلد اول ص۵۵، ۵۶ (مطبوعہ اسٹار آف انڈیا پریس ۱۸۹۷ء)
[2] مقدمہ شعر و شاعری ص۹۶ (مطبوعہ رام نرائن لال۔ الہ آباد ۱۹۵۵ء)

---

[1] شعر العجم۔ جلد چہارم صفحہ ۱۵
[2] شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۵
[3] شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۶
[4] مراۃ الشعر صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۲ (مطبوعہ جدید برقی پریس دہلی ۱۹۲۶ء)

چیز ہے۔ اس کی مختلف نوعیں ہیں۔ پست، بلند، شیریں، کرخت، سریلی وغیرہ وغیرہ . . . . جو زبانیں وسیع اور لطیف ہیں اُن میں اِن دقیق فروق کی بنا پر ہر چیز کے لئے الگ الگ الفاظ پیدا ہو جاتے ہیں . . . . اب جس چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو اِن خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں۔ ساؤدمی نے ایک نظم لکھی تھی جس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اس سے اس کے کم سِن بچے نے پوچھا کہ سیلاب کیوں کر آتا ہے۔ ساودی نے اس کے جواب میں یہ نظم لکھی اور دکھایا کہ سیلاب کس طرح آہستہ آہستہ شروع شروع ہوتا ہے اور کس طرح بڑھتا جاتا ہے۔ اس نظم میں تمام الفاظ اس قسم کے آئے ہیں کہ پانی کے بہنے، گرنے، پھیلنے، بڑھنے وغیرہ وغیرہ کے وقت جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں الفاظ کے لہجے سے اُن کا اظہار ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص خوش ادائی سے اس کو پڑھے تو سننے والے کو معلوم ہوگا کہ زور و شور سے سیلاب بڑھتا ہوا چلا آتا ہے۔" [1]

دراصل منظر نگاری اور محاکات کا یہی کمال ہے کہ الفاظ کی مدد سے کسی خاص موقعے کی تصویر اس طرح سے کھینچ دی جائے کہ اصل چیز کا لطف آجائے اس کمال کو حاصل کرنے کے لیے الفاظ کا صحیح انتخاب ضروری ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی بھی مولانا شبلی سے اِس نکتہ پر متفق ہیں وہ فرماتے ہیں۔

"اس زمانہ میں مناظرِ قدرت کے دکھانے کا سب سے بڑا کمال یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے مخصوص الفاظ استعمال کیے جائیں کہ خود اُن کے ذریعہ سے کسی منظر کی تصویر کھنچ جائے۔" [2]

محاکات کی تکمیل تشبیہ کے ذریعہ بھی ہوتی ہے مولانا شبلی کا قول ہے کہ "محاکات کا ایک بڑا آلہ تشبیہ ہے۔ اکثر اوقات ایک چیز کی اصلی تصویر جس طرح تشبیہ سے دکھائی جاسکتی ہے دوسرے طریقے سے ادا نہیں ہوسکتی [3]" اس میں کوئی شک نہیں کہ تشبیہ کے ذریعہ اصل چیز اور زیادہ واضح اور روشن ہو جاتی ہے مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تشبیہات کے استعمال کی کثرت مناظرِ فطرت کو دھندلا کر دیتی ہے۔ مناظرِ قدرت کی عکاسی کے لئے یہ بہت ضروری شرط ہے کہ انھیں تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا جائے جو تصویر کشی میں مددگار ثابت ہوں چونکہ اکثر فارسی شعراء نے اس کا لحاظ نہیں رکھا اسی لیے ان کے قصائد کی بہاریہ تشبیب بہت دھندلی اور مبہم ہوگئی۔ محمد حسین آزاد نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس نکتے پر روشنی ڈالی ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ اس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پردازی اور جوش و خروش کا زور پیدا ہوگیا۔ اس کے استعاروں اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت آ گئی لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نظم و نثر سے آئے ہیں جہاں کے چمن میں باریک باریک استعاروں کی نسیم خوشبو پھیلاتی ہے اور لطیف لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے اس لئے انھیں پھولوں کا عطر اس زبان میں آیا۔ بے شک ان کی بلند پردازی اور نازک خیالی جس درجے پر ہے اس کی حد نہیں لیکن اصل مطلب کوئی ڈھونڈو تو باریکی اور تاریکی، الفاظ اور استعارات کے اندھیرے میں ایک جگنو ہے کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب [1]"

آزاد کا یہ قول اردو کے قصیدہ گو شعراء کی بہاریہ تشبیب پر پورا منطبق ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی تشبیہات اور استعارات سے اس قدر زیادہ کام لیا ہے کہ اصل مفہوم جگنو کی طرح سے کبھی نظر آتا ہے اور کبھی غائب ہو جاتا ہے۔ بہرحال محاکات کی تکمیل کے لیے تشبیہات کا استعمال مفید ثابت ہوگا۔ ان کا غلط استعمال تصویر کے رُخ کو دھندلا کر دے گا۔

اس تمام بحث، مباحثے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مناظر

---

[1] شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۸، ۱۹ [2] شعر الہند حصّہ اول صفحہ ۴۵۷ (مطبع معارف۔ اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء) [3] شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۳۰

[1] دیباچہ مجموعۂ نظم آزاد صفحہ ۲۰ (مرتبہ مولوی سید ممتاز علی دارالاشاعت پنجاب ۱۸۹۹ء)

قدرت کی عکاسی کے لئے محاکات ضروری ہے مگر کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ اگر محاکات میں تخیل کی بھی کچھ جھلک ہو تو اصل تصویر کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ یہ بات درست بھی ہے کیوں کہ "دندان تو جملہ در دہانند ، چشمان تو زیر ابروانند" شعر میں محاکات تو مکمل ہے مگر پھر بھی بے لطف ہے۔ اس لئے محاکات میں لطف پیدا کرنے کے لئے مناسب تخیل کے لئے ہلکی سی چاشنی کی ضرورت ہے چناں چہ مولانا عبدالسلام ندوی فرماتے ہیں

" شاعرانہ حیثیت سے مناظر قدرت کی خوبی صرف یہ سمجھی جاتی ہے کہ ایک چیز کی ہو بہو تصویر کھنچ جائے کہ ہمارے جذبات بھی اس سے متاثر ہوں۔ اور ہم میں رنج و غم ، انبساط و مسرت اور ولولہ و مستی کی کیفیت پیدا ہو"[1]

ہمارے جذبات کسی منظر نگاری سے اسی وقت متاثر ہوں گے جب اس میں تخیل کا جزو بھی شامل ہو اس خیال کی تائید پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب بھی کرتے ہیں۔

"منظر نگاری کا کمال بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ منظر کی لفظی تصویر اصلی منظر سے اس قدر مطابق ہو کہ تصویر سے اصل کا لطف حاصل ہو۔ لیکن حقیقت میں مناظر کی تصویروں کو بالکل اصل کے مطابق کر دکھانا شاعر کا کمال نہیں ہے۔ باکمال شاعر اپنی قوت تخیل سے قدرتی منظروں میں ایسا تغیر کر دیتا ہے کہ منظر بالکل فطری نہیں رہتا مگر خلاف فطرت بھی معلوم نہیں ہوتا اور منظر کا بیان اصل منظر سے زیادہ دلکش اور موثر ہو جاتا ہے۔"[2]

یہ درست ہے کہ منظریہ شاعری میں مناظر قدرت کا بیان بالکل اصل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس میں تخیل کی مدد سے کچھ نہ کچھ تغیر کیا جا سکتا ہے مگر یہ تغیر ایسا نہ ہو کہ لفظی تصویر اصل تصویر سے جدا ہو جائے۔

منظر نگاری کے لئے ایک اور بھی ضروری شرط ہے جب ہم کسی منظر کی تصویر کشی کریں تو ہم کو مبالغہ سے کام نہ لینا چاہئے مبالغہ آمیز بیانات سے بھی فطرت کی تصویریں دھندلی پڑ جاتی ہیں۔ کیوں کہ ایسی تصویریں اصل مناظر کے مطابق نہیں رہتی ہیں۔ مبالغہ کی مذمت مولوی محمد حسین آزاد مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

"بے شک مبالغہ کا زور تشبیہ و استعارہ کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے لیکن نمک اتنا ہی چاہئے کہ جتنا نمک نہ کہ تمام کھانا نمک۔"[3]

مولوی محمد حسین آزاد کا یہ مجموعی اصول منظریہ شاعری پر بھی منطبق ہوتا ہے مبالغہ ہی کی بنا پر فارسی اور اردو قصائد کی تشبیب کے بیشتر مناظر دھندلے پڑ گئے ہیں۔

منظر نگاری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں تصنع اور آورد نہ ہو بلکہ مناظر قدرت کے بیانات میں آمد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ منظر نگاری میں تصنع اور آورد اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی بات کو پرپیچ طرز پر بیان کیا جاتا ہے یا علمیت کا سکہ بٹھانے کے لئے غیر مانوس تراکیب کا استعمال کیا جاتا ہے منظر نگاری میں ان باتوں سے گریز کرنے کی ضرورت ہے۔

منظر نگاری کے سلسلہ میں یہ بات بھی اہم ہے کہ مناظر قدرت کے بیان کے لئے الفاظ نہایت سادہ اور سلیس استعمال کرنا چاہئے۔ ادق اور ثقیل الفاظ کا استعمال منظریہ شاعری کے لئے مضر ہے۔ منظریہ شاعری میں ایک بات اور مضر ثابت ہوتی ہے بعض اوقات قافیہ اور ردیف کی پابندی بھی بے تکلف اظہار بیان میں مانع ہوتی ہے اس لئے مناظر قدرت کا بیان غزل کے انداز میں مشکل سے کامیاب ہوگا۔ غزل کے بجائے اگر مثنوی کے انداز میں منظر نگاری کی جائے تو کامیاب ہونے کے زیادہ مواقع ہیں۔ کیوں کہ ایسی صورت میں شاعر بے جا قافیوں کے جھگڑے سے نکل آتا ہے اس کو صرف دو قافیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ہر شعر میں وہ قافیے بدل سکتا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد بھی اس قسم کی پابندی کے خلاف ہیں۔

" ہر زبان میں قافیوں کی جستجو اور ان کے چناؤ میں کافی دشواری ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ کسی طویل نظم میں اگر تمام اشعار کا ہم قافیہ

---

[1] اقبال کامل صفحہ ۱۵۰ (مطبع معارف اعظم گڑھ)

[2] روح انیس صفحہ ۳۹ (مطبوعہ کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۲ء طبع دوم)

[3] دیباچہ مجموعہ نظم آزاد صفحہ ۲۰، ۲۱

ہونا ضروری ہو تو یہ دشواری بہت بڑھ جاتی ہے۔ [1]"

انہیں قافیوں کی پابندی کی وجہ سے بہاریہ تشبیب کی منظر نگاری بعض اوقات بے لطف معلوم ہوتی ہے۔ قافیوں کے علاوہ شکل ردیف کی پابندی بھی منظر نگاری کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

بہر حال منظر نگاری کے لئے کچھ شرائط اس موقع پر پیش کی گئی ہیں ان اصولوں کی روشنی میں ہم مختلف اصناف سخن کی منظر نگاری کو پرکھ سکتے ہیں اور اُن کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کر سکتے ہیں۔

---

[1] اُردو شاعری پر ایک نظر - حصہ اوّل صفحہ ۱۵۲

"بور" کی قسمیں (بقیہ صـ۳۳ سے)

نظر میں لوگ تاڑ لیتے ہیں کہ یہ بور پروف ہے۔

یہ اس قدر معصوم ہوتا ہے کہ اس کو علم بھی نہیں ہوپاتا کہ یہ کس قدر بور ہے مگر معلوم ہوجانے پر بھی اس پر کسی قسم کا اثر یا ردِ عمل نہیں ہوتا۔ یہ دُھن کا پکا ہوتا ہے اور سیاسی لیڈروں کی طرح اڑیل ہوتا ہے۔ اس لئے آسانی سے میدان نہیں چھوڑتا مجبوراً میدان اُسے خود چھوڑ دیتا ہے۔

میدان چھوڑنے کی بات آئی تو یاد آیا کہ بور کے بارے میں کچھ بتا کر کہیں میں نے آپ کو بور تو نہیں کر دیا۔

چلتے چلتے شاید آپ بور کے لڈو کے بارے میں پوچھیں تو میں کہوں گا کہ بور کے لڈو اور آموں کے بارے میں اس وقت کچھ کہنا بے موسم کی راگنی سے کم نہ ہوگا۔

اب رہی آپ کے بور ہونے نہ ہونے کی بات تو قبل اس کے کہ آپ اس آئینے میں میرا یا اپنا عکس تلاش کرنے کی کوشش کریں کیوں نہ میں خود میدان چھوڑ کر آپ کو بور کر دوں۔

وقار خلیل

آفتاب تاشقند (سانیٹ)

وہ تیرگی تھی کہ چہرہ نظر نہ آتا تھا!
بنامِ جنگ وہ دہشت، وہ وحشتوں کا غبار
نظر نظر میں دھند لکے، نفس نفس میں شرار
چراغِ صبحِ تمنا بھی ٹمٹماتا تھا!

جو تاشقند کے مطلع پہ آفتاب اُبھرا
لرز لرز گئے نفرت کے ملگجے سائے
نویدِ امن ملی، پیار کے پیام آئے
ردائے شب سے سویروں کا قافلہ نکلا

مہک رہی ہے نگارِ وطن، زمین گلاب
چمک رہی ہے جبیں جھومتے خیالوں کی
کہ ہند و پاک ہیں دو بستیاں اُجالوں کی
مچل رہے ہیں شگوفے، اُبل رہی ہے شراب

زمین نیلم و پکھراج مسکراتی ہے
وفا کے ساز پہ لہرا کے گیت گاتی ہے

جوزف ایڈیسن
مترجم: آفاق احمد عثمانی

مرزا کا خواب

جوزف ایڈیسن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ انگریزی ادب کے بہترین انشار پردازوں میں سے ایک تھے۔ مشرقی ادب سے انکو ایک خاص لگاؤ تھا۔ مصر کے دوران قیام میں مشرقی زبانوں کے بہت سے مخطوطات ان کی نظر سے گذرے۔ غالبًا ان مخطوطات میں سے ایک نے ان پر گہرا اثر چھوڑا جس کا ترجمہ انھوں نے "وژن آف مرزا" کے نام سے کیا جو انگریزی ادب میں مقبول ہوا۔ میں نے "وژن آف مرزا" کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔]

چاند کی پانچ تاریخ کو میں طہارتِ ظاہری سے فارغ ہو کر اپنے آبا و اجداد کی روایت دیرینہ کو سینہ سے لگائے بغداد کی ایک خاص پہاڑی پر چلا گیا۔ قمری ماہ کی ہر پانچ تاریخ کسی پرسکون جگہ پر عبادت اور مراقبہ میں گذارنا میری زندگی کا جزو لاینفک ہو گیا تھا۔ پہاڑی کی بلندی پر پہنچ کر اپنی سانسوں کو ہموار کرنے کے لئے میں ایک صاف چٹان پر بیٹھ گیا۔ پہاڑی کے پرسکون ماحول نے میرے مزاج سے ساز کیا اور میں خیالات کی رَو میں بہہ گیا۔ میں زندگی کی بے ثباتی پر بہت گہرائی سے سوچ رہا تھا۔ فلسفۂ زندگی کے مختلف پہلو میرے سامنے آئے۔ عمیق فکر اور غور کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ زندگی سراب نہیں بلکہ خواب سراب ہے اور انسان ایک سایہ۔ وہ بھی ایک تیز رفتار پرندکا۔

غیر ارادی طور پر جب میری نظریں ایک طرف اُٹھیں تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص لباس شبانی زیب تن کئے اور ایک ہاتھ میں بانسری لئے کھڑا تھا۔ جب میں نے اُن کی طرف دوبارہ دیکھا تو اُس غیبی انسان نے مسکرا کر بانسری اپنے لبوں سے لگالی۔ ساری فضا میں ناقابلِ بیاں شیریں نغمات بکھر گئے۔ نغمہ کا نشتر دل میں اترتا چلا گیا۔ ایسے نغمات میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سُنے تھے مجھ پر ایک عالم بے خودی طاری ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ عالمِ اسفل سے عالمِ ارواح میں توواردِ پاک روحوں کا استقبال شاید ایسے ہی جاں نواز اور روح پرور نغمات سے ہوتا ہو گا روحیں اِن نغموں کو سُنکر جانکنی کی تکلیف بھول جاتی ہوں گی۔

مجھے یہ بات بہت پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی کہ یہ پہاڑی سحر زدہ ہے۔ اس سے پہلے بھی جو لوگ اس پہاڑی کی طرف سے گذرے، تھے۔ انہوں نے جانفزا نغمات تو سُنے تھے لیکن "نے نواز" کی زیارت کبھی نہیں کی تھی۔ میں اِن نغمات سے مسحور ہو کر ایک دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ ہنوز میں حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ اس غیبی انسان نے مجھے اشارہ سے اپنے پاس بُلایا اور میں ایک معمول، کی طرح خوف و ادب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کے نزدیک چلا گیا۔ مجھ پر اُن کی ملکوتی شخصیت نے ایسا اثر کیا کہ مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہو گئی۔ میں اُن کے قدموں پر گر گیا اور جوشِ گریہ ضبط نہ کر سکا۔ ان کے لبوں پر

ہمت افزا اور دلنواز تبسم بکھر گیا۔ ان کو متبسم دیکھ کر میرا خوف و ہراس بہت بڑی حد تک کم ہو گیا۔ انھوں نے مجھے زمین سے اٹھایا اور کہا "میں نے تمہاری خود کلامی سن لی ہے مشرق کی طرف دیکھ کر مجھے بتاؤ کہ تمہیں وہاں کیا نظر آ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے ایک بڑی اور گہری وادی نظر آتی ہے جس میں ایک تیز رو پانی کا دھارا بہہ رہا ہے"

"یہ وادی جو تم دیکھتے ہو" انہوں نے فرمایا ——

"یہ وادیٔ کلفت ہے اور پانی کا یہ دھارا ازل کا ایک حصہ ہے۔"

"کیا وجہ ہے" میں نے عرض کیا کہ دھارے کے دونوں سرے صاف نظر نہیں آتے بلکہ ہر دو سروں پر کہرے کی دبیز چادر پڑی ہوئی ہے۔

"جو تم دیکھتے ہو" انہوں نے فرمایا "یہ ازل کا وہ حصہ ہے جس کو عوام الناس 'وقت' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کو پیمانۂ امروز و فردا سے ناپا جاتا ہے اور یہ خود بھی آہستہ آہستہ سوئے منزل گامزن ہے"

انہوں نے فرمایا کہ اس ناپید اکنار بحرِ بیکراں کو غور سے دیکھو جس پر گہرے کہرے کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا نظر آتا ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے ایک بڑا پل نظر آ رہا ہے۔

انھوں نے کہا کہ یہ پل جو تم دیکھتے ہو حقیقت میں "حیاتِ انسانی" ہے۔

گہرے اور عمیق مشاہدے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ پل سو محرابوں پر مشتمل تھا جس کی ستر محرابیں پوری تھیں اور باقی تیس میں کچھ شکستہ اور کچھ بالکل صحیح حالت میں تھیں جب میں ان محرابوں کا شمار کر رہا تھا تو اس غیبی انسان نے بتایا کہ ابتدا میں اس پل میں ایک ہزار محرابیں تھیں لیکن ایک زبردست طوفان باقی محرابوں کو بہا لے گیا۔ میرے بہت غور سے دیکھنے کے باوجود مجھے پل کے دونوں سرے صاف نظر نہیں آئے۔ کیونکہ وہ گہرے سیاہ بادلوں سے چھپے ہوئے تھے۔ میں نے لاتعداد انسانوں کو اس پل پر دیکھا جو اس کو پار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان مسافروں کی ایک قابلِ توجہ تعداد پل کی پوشیدہ خلاؤں سے وقت کے تیز دھارے میں گری اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ پوشیدہ خلائیں پل کے شروع اور آخر میں کثرت سے تھیں لیکن بیچ میں بہت کم۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو پل کی شکستہ محرابوں پر افتاں و خیزاں چلے جا رہے تھے۔ شاید زندگی کا یہ طویل سفر بہت کھلنے لگا تھا اور ان میں چلنے کی مزید طاقت باقی نہیں تھی۔ لیکن شاہراہِ زندگی میں گامزن ہونے کے بعد ٹھہر جانا انسان کے اختیار کی بات نہیں میں کچھ عرصہ تک پل اور اس کے متعلقہ مناظر کے بارے میں ناقابلِ بیان جذبات اور احساسات کے ساتھ سوچتا رہا۔ اِن مناظر نے شرابِ غم مینائے دل میں انڈیل دی۔ بڑی مقدار میں اور وہ بھی مینا گداز۔ مرگِ قبل از وقت کے مناظر نے دل کی بنیادیں ہلا دیں میں نے ایسے لوگوں کو وقت کے تیز دھارے میں گرتے دیکھا کہ جن کے لبوں پر ہنوز ناتمام تبسم تھا۔ تبسم تمام نہ ہونے پایا کہ وہ تمام ہوئے۔ کچھ ایسے لوگ بھی وقت کا شکار ہوئے کہ جن کے قہقہہ کی بازگشت ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ موت کا قہقہہ فضا میں گونجا۔ کچھ بیدار مغز حضرات جو سوئے فلک کسی اجرام فلکی کے رازِ سربستہ کو حل کرنے کے لئے دیکھ رہے تھے اور جن کے لبوں پر فاتحانہ تبسم بکھرا ہوا تھا لیکن ان کے لب ابھی اپنی اصلی حالت پر بھی نہ آئے تھے کہ فرشتہ اجل ان پر مسکرا دیا۔ کچھ فلسفیوں کو دیکھا جو مسائل لاینحل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جن کی پیشانی کی شکنیں کبھی امید کی قوس و قزح معلوم ہوتی تھیں اور کبھی ناامیدی کی سیاہ لکیریں ہنوز سلسلۂ فکر جاری تھا کہ وقت کا کھولتا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں انڈیل دیا گیا۔ نہ فکر ہی رہی اور نہ مفکر۔

ایک قابلِ توجہ تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو دنیاوی مسرتوں کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ نہ تو تلخیٔ عسرت سے واقف تھے اور نہ حلاوتِ غم سے آگاہ۔

ایسے لوگوں کا انجام بھی بہت عبرت ناک تھا جب انھوں نے یہ سمجھا کہ لذاتِ دنیاوی کی کہکشاں ان کی دست رس میں ہے ادھر کہکشاں تک ان کے پرامید ہاتھ بڑھے اُدھر بڑھتے ہوئے ہاتھوں پر موت کی بجلی گری۔

ان دل دوز مناظر سے دل ٹوٹ گیا۔ ساری کائنات دھواں دھواں نظر آئی میرے جذبات کے آثار چڑھاؤ سے واقف ہو کر اس محترم ہستی نے کہا" اپنی طبیعت کو ان مناظر سے زیادہ مکدر نہ کرو دوسری طرف دیکھ کر بتاؤ کہ تمہیں نظر آرہا ہے۔"

میں نے عرض کیا" میں کچھ عجیب الخلقت پرند دیکھ رہا ہوں اور ان میں ایک خاصی تعداد گوشت خور پرندوں کی ہے جو کثرت سے بیچ کی محرابوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

یہ سنکر وہ بولے کہ حرص و ہوس۔ لذاتِ دنیاوی۔ توہم محبت نفرت حسد، رشک، اور ناامیدی ان گوشت خور پرندوں کی مانند ہیں جو عمر بھر اپنی تیز چونچ سے انسان کا گوشت نوچتے رہتے ہیں اور اسکو کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا کہ انسان ایک تخلیقِ بے معنی ہے۔ زندگی کانٹوں کی سیج بن کر اس پر گرتی ہے عمر بھر اس کے ہر بُن مو، سے جیتا جاگتا خون رستا رہتا ہے اور انجام کار فرشتہ اجل اس کو اس جہنم زار سے نجات دلاتا ہے۔

میرے ان خیالات کو سن کر شاید اس محترم ہستی کو مجھ پر رحم آگیا۔ انھوں نے کہا کہ اب تم اپنی نظر ان مناظر سے ہٹالو اور اس دہانے کی طرف دیکھو جو لاتعداد پل سے گرے ہوئے انسانوں کو بہا کر ایک بحرِ ذخار میں لےجا رہا ہے میں نے تعمیلِ حکم میں ادھر سے نظریں ہٹالیں اور دوسری طرف دیکھنے لگا لیکن کچھ عرصہ تک مجھے کہرے کی ایک دبیز چادر کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوگئیں۔ اور میں نے ایک بڑی چٹان اس بحرِ بیکراں کے وسط میں دیکھی جس نے سمندر کو دو برابر کے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس بحرِ ناپیدا کنار کا نصف حصہ دبیز بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور میں انتہائی کوشش کے باوجود کچھ بھی نہیں دیکھ سکا لیکن دوسرا حصہ بخوبی نظر آرہا تھا جو بے شمار جزائر پر مشتمل تھا۔ ان جزائر میں انواع و اقسام کے پھل دار درختوں کے علاوہ بے شمار نہریں بہہ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ عجیب سا لباس زیب تن کئے درختوں کے نیچے آرام کر رہے تھے۔ معصوم پرندوں کے گیتوں اور گرتے ہوئے پانی کے نغموں نے ایک غیر معمولی غنائی ماحول پیدا کر دیا تھا۔

ان دل ربا مناظر نے میرے غم کو خوشی میں بدل دیا میں نے اپنے دل کی گہرائی میں چاہا کہ کاش میں وہاں پہنچ سکوں۔ اسی وقت اس فرشتہ صفت انسان نے کہا کہ اس مقام محمود میں انسان صرف فرشتہ اجل کے دوش پر ہی پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ان جزائر کے علاوہ بے شمار جزائر اور بھی ہیں جو ان سے بھی اعلیٰ ہیں ان کو دیکھنا تو درکنار وہاں انسانی تخیل کا پرند بھی پر نہیں مار سکتا یہاں ہر جزیرہ ایک جنت ہے جو اعمالِ صالح کے بدلے میں انسانوں کو دیجاتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اے مرزا کیا یہ مقامات اس قابل نہیں ہیں کہ انسان ان کی خواہش کرے کیا زندگی کی عارضی تکالیف کو ان حسین مقامات کے ملنے کی امید کے سہارے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ کیا تم اب بھی حیاتِ انسانی کو بے معنی کہہ سکتے ہو جس کے لئے ایک لازوال زندگی منتظر ہے۔

میں نے اس مکرم شخصیت سے کمالِ لجاجت سے استدعا کی کہ مجھے سنگی چٹان کے پیچھے کے مناظر اور دکھا دیجیے۔ لیکن اب میری التجائی تکرار کو سننے کے لئے وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ سب ایک خواب تھا اور بغداد کی یہ ویران پہاڑی ایک حقیقت جس کے دامن میں بھیڑیں اور اونٹ پہاڑی کی بے گیاہی کا شکوہ زبانِ بے زبانی سے کر رہے تھے۔

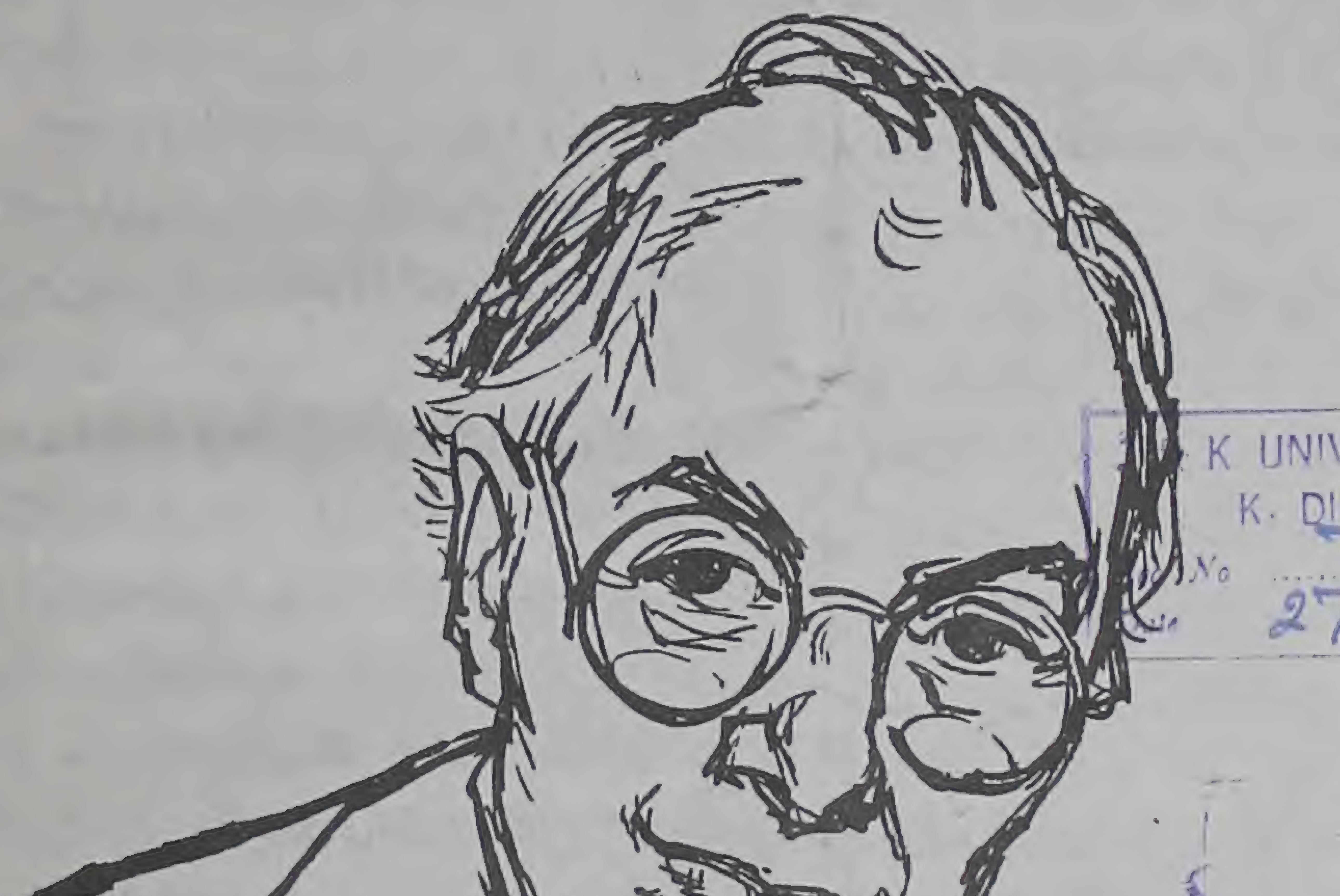
یہ ایک اسکول ماسٹر ہیں۔ انہیں ہر کوئی سراہتا ہے۔ اعلیٰ خدمات کے لئے اِنہیں سرکاری اعزاز بھی مِل چکا ہے۔ لیکن ان کی خُوشی اور مسرت کی وجہ وہ اعزاز نہیں۔ "میں خُوش ہوں، اِس لئے کہ میرے بچّے خُوش خُوش ہیں" اُنہوں نے بتایا "میری صرف دو لڑکیاں ہیں۔ ایک کالج میں پڑھاتی ہے۔ دُوسری ڈاکٹری کی تعلیم پا رہی ہے۔ بچّے کم ہوں تو اِس میں بچّوں کا ہی نہیں، ماں باپ کا اپنا بھلا بھی ہے۔ اِسی صورت میں تو بچّوں کی ساری ضرورتیں پُوری



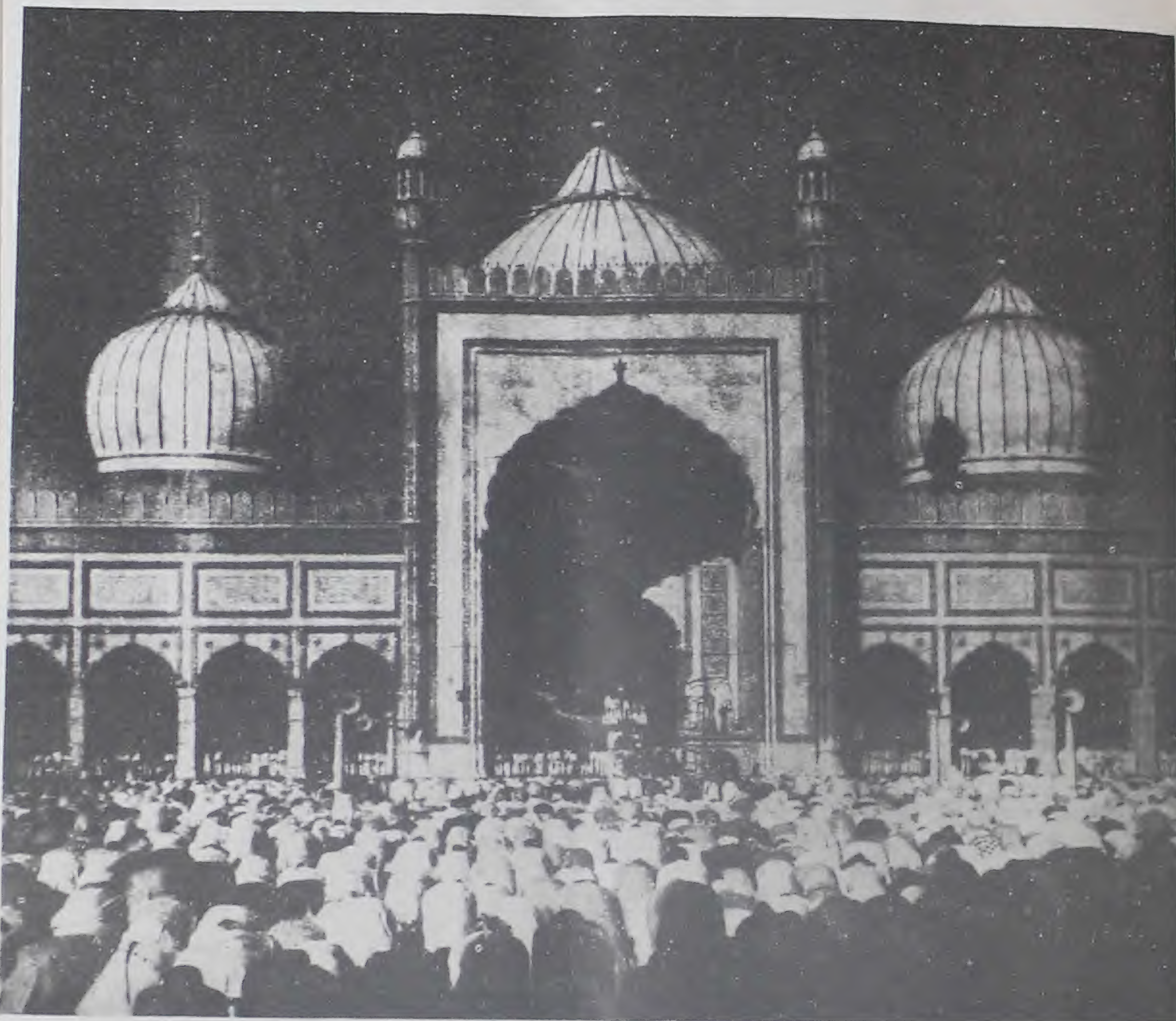
کی جا سکتی ہیں، اُنہیں کسی قابِل بنایا جا سکتا ہے۔ ہاں، یہی میری خُوشی کا راز ہے۔"

یہ خُوش ہیں —

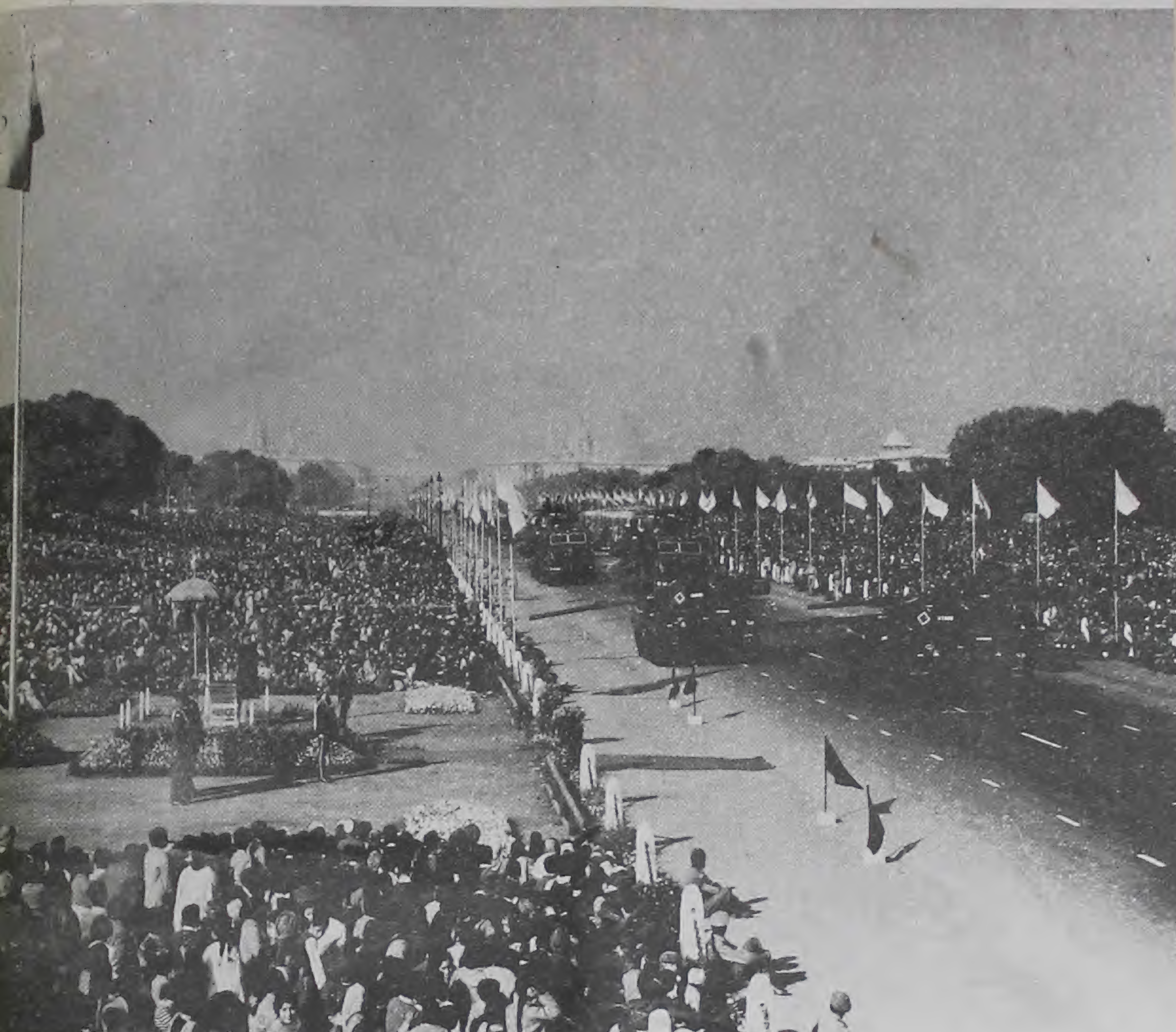
اور آپ؟



davp 67/183



جامع مسجد (دہلی) میں نمازِ عید الفطر



یوم جمہوریہ کی پریڈ کا ایک منظر

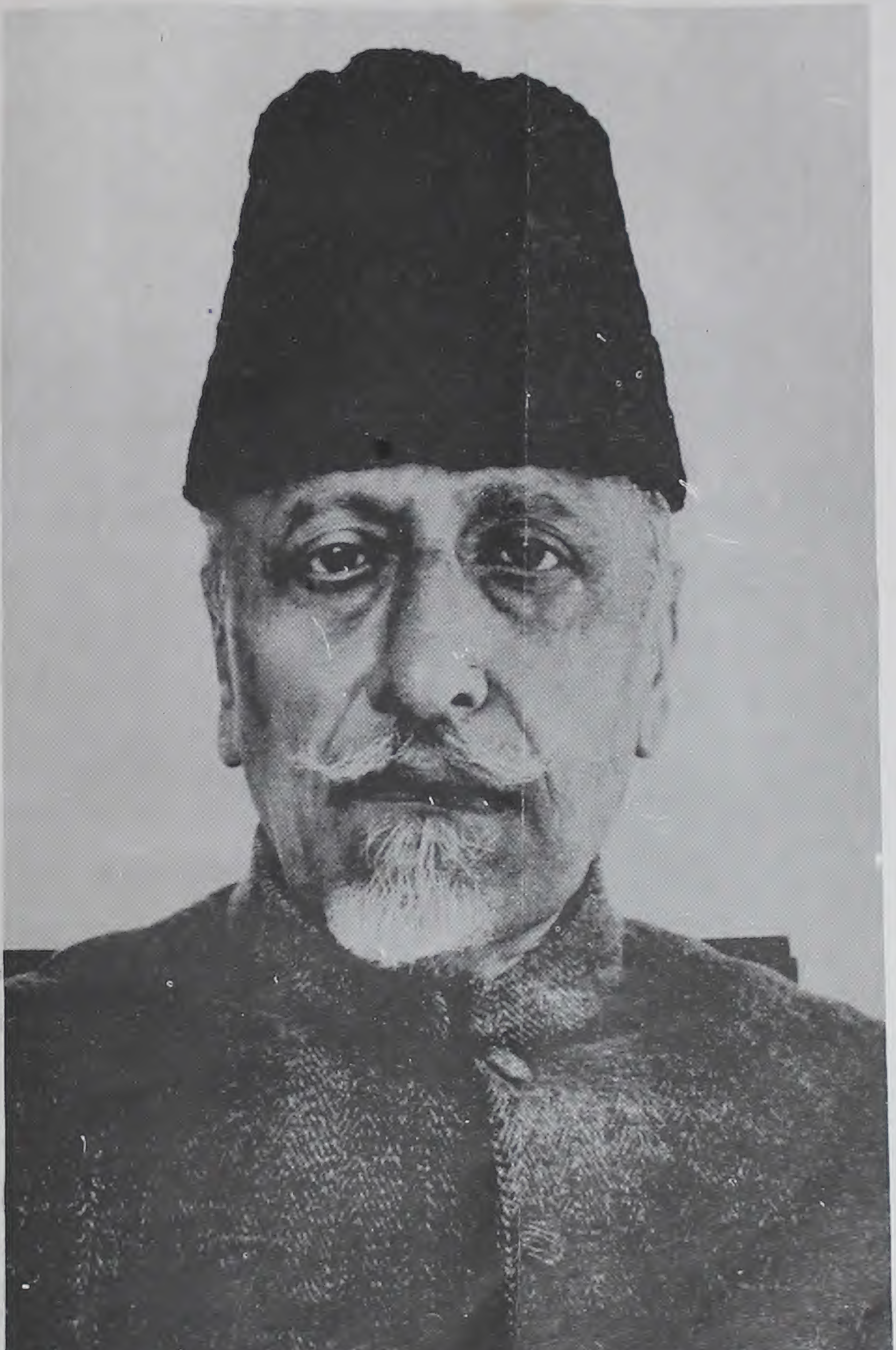
and Published by the Director, Publication Division, Old Secretariat, D
by the Asian Art Printers Private Ltd., D.B.Gupta Road, New Delhi.

Regd. No.D

آج کل



ماگھ شک ۱۸۸۹
فروری ۱۹۶۸ء
۶۰ پیسے



مولانا ابوالکلام آزاد (۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء ـــ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء)

آپ سے متعلق آچاریہ کرپلانی کا مضمون صفحہ ۳ پر ملاحظہ کیجیے

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

سالانہ چندہ ہندوستان میں سات روپے

غیر ممالک سے: پاکستان میں سات روپے (پاک)

۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ ہندوستان میں ۶۰ پیسے

غیر ممالک سے: پاکستان میں ۶۰ پیسے (پاک)

۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۶

جلد ۲۶ نمبر ۷

ماگھ شک سنہ ۱۸۸۹

فروری سنہ ۱۹۶۸ء

مضامین کے لیے خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر "آجکل" اردو اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۶

ملاحظات

"آجکل" کے بارے میں ہم نے قارئین کو اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں کچھ لوگوں نے لکھا ہے کہ آپ کے رسالے میں بڑے بوجھل اور ثقیل مضامین ہوتے ہیں اور رسالہ غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو کہانیوں کی کمی کھٹکتی ہے۔ کچھ لوگ اس بات کے شاکی ہیں کہ تنقیدی مضامین کم ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ جدید شاعری سے "آج کل" کے صفحات خالی ہیں۔ بعض حضرات نے ہماری ہمت افزائی بھی کی ہے۔

جن لوگوں نے ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا ہے ہم اُن کے شکر گذار ہیں۔ اس باب میں ہم اپنے تمام قارئین کو یقین دلاتے ہیں کہ 'آج کل' کو دلچسپ، مفید اور معیاری بنانے کی ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اور ہماری کوششیں آپ کے تعاون سے ہی کامیاب ہوں گی۔ تعمیری، صحت مند اور معیاری ادب کی سرپرستی سماج کے صالح عناصر ہی کر سکتے ہیں۔ ایسے ادب کو مقبول بنانے کی ذمہ داری اُن تمام افراد پر عائد ہوتی ہے جو ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل اور تعمیر میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح نبھائیں گے۔

۲۲ر فروری کو مولانا آزاد کی برسی منائی جاتی ہے اس شمارے میں مولانا آزاد سے متعلق آچاریہ کرپلانی کا مضمون شامل ہے

'آج کل' کی روایت یہ رہی ہے کہ فروری کے شمارے میں غالب سے متعلق مضامین ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں غالب پر تین مضامین ہیں۔ اس شمارے میں تین کہانیاں بھی شامل کی گئی ہیں آئندہ شماروں میں بھی آپ ممتاز افسانہ نگاروں کی کہانیاں پڑھیں گے

۸ر فروری ۱۹۶۸ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین ۷۱ سال کے ہو گئے۔ اس مُبارک موقع پر ہم انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نئے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم مقرر کیے گئے ہیں۔ ہم اس فیصلے کا خیرمقدم کرتے ہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے دور میں علی گڑھ یونیورسٹی ترقی کے منازل طے کرے گی اور علمی دُنیا میں مزید وقار اور ناموری حاصل کرے گی۔

اُردو کی ممتاز ادیبہ قرۃ العین حیدر اور ہندی کے مشہور مصنف امرت لال ناگر کو ساہتیہ اکادمی نے پانچ پانچ ہزار روپے کا گراں قدر انعام دیا ہے (دیکھئے صفحہ ۲۳)۔ اکادمی کا یہ فیصلہ ہر لحاظ سے مستحسن ہے۔ ادارہ ان دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

آچاریہ جے بی کرپلانی

مولانا آزاد

دنیا میں بہت کم شخصیتیں ایسی ہوں گی جن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ان کی زندگی میں لگایا جا سکا ہو۔ عام طور پر کسی عظیم شخصیت کے اُٹھ جانے کے طویل عرصے کے بعد ہی بدلے ہوئے حالات میں از سرِ نو جانچ کے بعد متعلقہ شخصیت کی وہ خوبیاں منظرِ عام پر آتی ہیں جو اس کی زندگی میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ اگرچہ مولانا آزاد کو ہم سے جدا ہوئے کوئی بہت طویل عرصہ نہیں گذرا پھر بھی اُن کی زندگی کے بارے میں معلومات کا اتنا ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے کہ اُن کی وفات کے بعد تھوڑے سے عرصے میں حالات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ہم اُن کے پس منظر میں بھی ان کی قابلیت اور قیادت کی خوبیوں اور ان کے حسنِ اخلاق پر ایک نئے انداز سے نظر ڈال سکیں۔

مولانا سے میرا غائبانہ تعارف ۱۹۱۲ء میں الہلال کی تحریروں سے ہوا۔ ان دنوں میں بہار کے ایک کالج میں تاریخ اور سیاسیات کا پروفیسر تھا۔ مولانا کی تحریر پڑھ کر میں حیران ہو گیا تھا کہ اتنی کم عمر میں کوئی شخص اور وہ بھی جسے جدید یورپی زبانوں کا علم نہ ہو، ملکی اور غیر ملکی مسائل پر اس قدر اعتماد اور پختگی کے ساتھ کیوں کر رائے زنی کر سکتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو وہ بالعموم نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد، اور بالخصوص اسلامی ملکوں میں آزادی کی جدوجہد کے پس منظر میں دیکھتے تھے اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ مغربی ملکوں اور بالخصوص برطانوی سامراج کے شکنجے میں کسے ہوئے اسلامی ملکوں کی نجات کے لئے ہندوستان کا برطانوی سامراج کے چنگل سے آزاد ہونا ضروری ہے۔ برطانوی حکمراں ہندستانی سپاہیوں کو دوسرے ملکوں کو غلام بنانے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ اس لئے مولانا ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہونا نہ صرف مادرِ وطن بلکہ اسلام کی خدمت کے نقطۂ نظر سے بھی اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔

مولانا کو الہلال کی تحریروں کی وجہ سے ۱۹۱۶ء میں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس وقت بھی میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور میں اُن کی تحریروں کے ذریعے ہی انہیں جانتا تھا۔ البتہ بعض مشترکہ دوستوں کی وجہ سے اُن کے ساتھ میرا رابطہ ضرور قائم ہو چکا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ رہا ہوئے۔ اس دوران میں گاندھی جی کی قیادت میں تحریکِ آزادی اور تحریکِ خلافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس تحریک میں حصہ لینے والے ممتاز مسلم رہنما حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا صاحب، اور علی برادران تھے۔ ان میں سے علی برادران سب سے زیادہ سرگرم اور مقبول رہنما تھے مولانا صاحب اکثر عام جلسوں اور خلافت سے متعلق اجتماعوں میں موجود ہوتے تھے۔ لیکن وہ خاموشی سے اسٹیج پر جا بیٹھتے تھے تاہم جب کبھی وہ اصرار کئے جانے پر بولتے تھے تو ان کی مدلل تقریر کو سن کر انتہائی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کرتے تھے پھر بھی اُن کے دلائل میں ہی اتنا وزن ہوتا کہ وہ جذبات کو متاثر کرتے تھے۔ ایک بار میں نے گاندھی جی سے پوچھ ہی لیا کہ وہ علی برادران کو، جن کی آواز میں جوش یقیناً زیادہ ہوتا تھا، مولانا آزاد پر جو کہ مسئلے کو زیادہ مدلل

طریقے سے پیش کرتے ہیں ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ گاندھی جی نے اس کے جواب میں کہا کہ وہ مولانا کی علمیت کے قائل ہیں۔ لیکن مولانا طبعًا پیچھے رہتے ہیں اور آگے لائے جانے کی کوششوں کی مزاحمت تک کرتے ہیں۔ اس بات کا ذکر میں نے محض مولانا کے کردار کے اس پہلو کو اُجاگر کرنے کے لئے کیا ہے کہ انھیں شہرت کی بھوک نہیں تھی۔

لیکن اگر جذباتی اپیل کے ذریعے عوام میں مقبول ہونے کی کوشش نہ کرنے کو مولانا کے کیریکٹر کی ایک کمزوری ہی سمجھ لیا جائے تو قومی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے ان کی گہری عقیدت اور اُن کا اپنے نظرئے پر پختگی سے ڈٹے رہنا، اس کمزوری کی تلافی کے لئے کافی تھا۔ ان کے کئی ساتھی مسلم رہنما برطانوی حکمرانوں کی پھوٹ ڈالنے کی پالیسی سے متاثر ہو گئے لیکن مولانا نے اپنے لئے ایک بار جو راستہ منتخب کر لیا تھا وہ اس سے کبھی ادھر اُدھر نہ ہٹے۔

۱۹۲۳ء میں انھیں دہلی میں کانگرس کے خصوصی اجلاس کا صدر چنا گیا اور یہ انھیں کی معتدل مزاجی کا نتیجہ تھا کہ کانگرس اس وقت تبدیلی کے حامی اور تبدیلی کے مخالف دو گروہوں میں بٹنے سے بچ گئی۔

جن لوگوں کو مولانا کی زندگی میں اُن کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا اُن پر مولانا کی ذات نے نمایاں اثر چھوڑا۔ اپنی جوانی کے آغاز میں ہی بعض بنیادی امور کے بارے میں غور و فکر کے بعد انھوں نے کچھ فیصلے کئے تھے۔ جن کی بنیاد پر انھوں نے اپنے لئے راہِ عمل کا انتخاب کیا۔ وہ فیصلے کیا تھے؟ یہی کہ ہندوستان کا آزاد ہونا بہت ضروری ہے۔ نہ صرف اس کی اپنی خاطر بلکہ دوسرے غلام ملکوں کی آزادی کی خاطر بھی جن میں اسلامی ملک بھی شامل تھے۔ اس طرح وہ بطور ایک ہندوستانی شہری اور بطور ایک مسلمان اپنے فرائض میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے چنانچہ جب وہ گاندھی جی کی قیادت میں آزادی کے لئے عدم تشدد کی تحریک میں شامل ہوئے تو اُن کا یہ اقدام مکمل خلوص اور پختہ یقین پر مبنی تھا۔ انھوں نے یہ بات محسوس کی کہ آزادی کا حصول تحریک آزادی میں وسیع پیمانے پر عوام کی شرکت سے ہی ممکن ہے اور پھر یہ بھی ممکن ہے جب خفیہ سرگرمیوں کی بجائے عوام عدم تشدد کی بنیادوں پر کھلم کھلا اس تحریک میں حصہ لیں مولانا کا یہ یقین اس قدر پختہ تھا کہ اس معاملے میں اُن کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ گاندھی جی کی قیادت میں بھی ان کا اعتماد ہمیشہ قائم رہا۔ یہ درست ہے کہ دوسرے کئی لوگوں کی طرح عدم تشدد میں ان کا اعتقاد اصولی نہیں تھا۔ لیکن پالیسی کے طور پر عدم تشدد میں ان کا اعتقاد قائم رہا جسے کانگرس نے گہرے غور و فکر کے بعد ایک قابل عمل راہ کے طور پر اختیار کیا تھا۔

مولانا نے ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد پُر تشدد انقلاب کے خیال کو کبھی ذہن میں جگہ نہ دی۔ اور نہ ہی انھوں نے اس خیال کے حامیوں سے کوئی واسطہ رکھا۔ لیکن دوسرے رہنماؤں خاص کر بنگال کے بعض رہنماؤں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ بعد کے حالات نے مولانا کی اصابت رائے کو ثابت کر دکھایا مولانا کی اپنی سیاسی زندگی کا اُتار چڑھاؤ۔ یا ملک کی مختلف سیاسی طاقتوں کے باہمی رشتوں میں تبدیلیاں انھیں اپنے عقیدے سے متزلزل نہ کر سکیں۔ مولانا کو غلط انداز میں پیش کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ اور نچلی سطح کے لوگوں نے اُن کی ذات پر حملے بھی کئے۔ لیکن حساس طبیعت کے مالک ہونے کے باوجود ان باتوں سے متاثر ہو کر وہ اپنے راستے سے ادھر اُدھر نہ ہوئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال پسندی اُن کا شیوہ رہا۔ لیکن جہاں تک اُن کے بنیادی عقائد کا تعلق تھا ان کی مضبوطی ایک چٹان کی مضبوطی سے کم نہ تھی۔

مولانا سے میرے ذاتی تعلقات کا آغاز ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ کانگرس کے جنرل سیکریٹری اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہونے کے ناطے ان کے ساتھ میرا تعلق قائم ہوا۔ کانگرس پارٹی کے معاملات میں میں کئی بار مولانا کی رائے سے متفق نہیں ہوتا تھا۔ لیکن قومی مسائل پر ان کے سوچنے کے ڈھنگ اور ان مسائل پر ان کی گرفت سے کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی وسیع معلومات سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ کئی برسوں تک کانگرس ورکنگ کمیٹی ایک خاندان کی طرح کام کرتی رہی۔ اور اس خاندان کے ممبران میں جب بھی کھانے یا چائے کے موقعے پر غیر رسمی بات چیت ہوتی تھی۔ مولانا کی گہری معلومات اور اعتدال پسندانہ مزاج کی بدولت ان کی بات چیت میں ایک نئی زندگی کی جھلک نظر آتی تھی۔ ایسے موقعوں پر تاریخ، جغرافیہ، بڑی شخصیتوں کے سوانح حیات

اور بالخصوص اسلامی ملکوں کے حالات سے متعلق مولانا کے برجستہ کلمات اور حکایات سے مجلس میں رونق پیدا ہوجاتی تھی۔ وہ ایسے موقعوں پر ہمیں بتایا کرتے تھے کہ کسی خاص سماجی رسم کا آغاز کیسے ہوا یا کسی خاص پھل کی کاشت ہندوستان میں کیسے شروع ہوئی۔ یا پھر کوئی خاص کھانا پکانے کا رواج ہندوستان میں کب سے ہوا۔؛

اپنی سیاسی زندگی کے آغاز سے ہی مولانا کے سوچنے کا ڈھنگ بین اقوامی تھا جس ماحول میں وہ پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور جس ڈھنگ سے انھیں تعلیم ملی ان سب باتوں نے انھیں وسیع النظر انسان بنا دیا تھا۔ اسلام کے موضوع پر معلومات کے بے پناہ ذخیرے کے باوجود مذہب کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے رجحان کے ساتھ ساتھ ایک فیاض دل بھی پایا تھا۔ نیکی اُن کی طبیعت کا جزو تھی وہ یہ بات کبھی سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ انسان کی نجات کسی خاص مذہب اور اس سے متعلق رسوم کی پابندی سے ہی ممکن ہے۔ تحریک آزادی اور تحریک خلافت میں حصہ لینے والے بعض دوسرے رہنماؤں کے برعکس وہ اس خیال کے مالک تھے کہ مذہب کا اصل تعلق اچھے اخلاق سے ہے۔ اُن کی وفات پر پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا تھا کہ مولانا آزاد کا تصور ذہن میں آتے ہی اٹھارویں صدی کے یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے زمانے کے عالموں اور انسان دوستوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ مولانا اس زمانے کے یورپی عالموں کی طرح آزاد خیال بھی تھے اور سماجی زندگی کی سرگرمیوں میں انھیں کی طرح بعض مسلمہ آداب و رسوم کے پابند بھی۔ ممکن ہے کہ مولانا مذکور یورپی عالموں اور عظیم ہنود فلاسفروں کی طرح یہ محسوس کرتے ہوں کہ ایک سکالر کو مخصوص رسوم کے پابند ایک عام انسان کے طرز بود و ماند میں خلل پیدا کرنے کا تب تک کوئی حق نہیں پہنچتا جب تک کہ متعلقہ رسوم سماجی زندگی کے لئے ضرر رساں نہ ہوں لیکن اس کے ساتھ مولانا ان لوگوں کے نقطۂ نظر کو بھی سمجھتے تھے جو جدید زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے طے شدہ سماجی رسوم سے انحراف کرتے تھے۔ مولانا کے کیرکٹر کا یہی ایک پہلو انھیں محض ایک مذہبی رہنما یا سماجی ریفارمر بننے سے روکنے کے لئے کافی تھا۔ ان کی وسیع النظری ان کے ایک ایسا راستہ اختیار کرنے میں مانع تھی جس میں اگر جنونی ہونا نہیں تو کسی حد تک ہٹ دھرم ہونا ضروری ہے۔

اُن کی آواز حقیقت میں عقل و دانش کی آواز تھی جسے اعتدال اور سمجھ داری کی آواز بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی انقلابی جدوجہد میں بھی اُن کی یہ خصوصیتیں برقرار رہیں۔ وہ ہجوم کی رہنمائی کرتے ہوئے اس کا جزو نہیں بن جاتے تھے۔ ان دنوں گاندھی جی کے زیر اثر کئی رئیس گھرانوں کے افراد میں عوام میں گھل مل جانے کی خاصیت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن مولانا کی انفرادیت قائم رہی اور وہ بلند سطح پر کھڑے ہوکر ایک اشرافی نابغہ کی حیثیت سے ہجوم کو شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔

مگر ان باتوں کے باوجود انھوں نے اس قدر حساس طبیعت پائی تھی کہ وہ انصاف کی طرف داری کئے بنا نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ حصول آزادی کے بعد انہوں نے بہت سے عوامی مسائل کی حمایت کی۔ اُن کی رائے بے لاگ اور آزاد ہوتی تھی۔ اعلا حلقوں میں جہاں کسی کو کسی معاملے پر اختلاف کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی وہاں مولانا اعتراض کر بیٹھتے تھے۔ اور رد و قدح سے کام لیتے تھے۔ اس لئے ان کی موت کے بعد عام طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ ملک کی سیاسی زندگی کی ایک ایسی آواز گم ہوگئی ہے جس میں یہ کہنے کی طاقت تھی کہ فلاں راستے پر چلنا غلط ہے۔

سب سے بالاتر تو یہ ہے کہ مولانا ایک اسکالر ایک نابغہ تھے اور اگر سب کچھ ان کی مرضی پر ہی چھوڑا جاتا تو وہ شاید سیاست میں حصہ لینے کے بجائے خاموش ادبی زندگی کو ترجیح دیتے۔ لیکن ایک غلام ملک میں ایک حساس اور ضمیر کی آواز پر چلنے والے شخص کے لئے اپنی مرضی سے راہ زندگی متعین کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انصاف اور حب وطن کا جذبہ انھیں سیاست میں گھسیٹ لایا۔ آزادی کے لئے اس سے بڑی قربانی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ کوئی شخص آزادی کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لئے اس راستے ہی کو ترک کردے جس پر چلنے کے لئے اس میں خاص صلاحیتیں موجود ہیں۔ مولانا صاحب نے یہ عظیم قربانی کی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باوجود بھی

انھوں نے دنیائے ادب کو زیادہ متمول بنایا مولانا کی تصانیف ہمیشہ یادگار رہیں گی ان میں ترجمان القرآن (قرآن پاک کی تفسیر) بھی شامل ہے ان کی خود نوشت سوانح حیات جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھی شائع ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس کا کچھ حصہ اُن کی خواہش کے مطابق ایک خاص عرصے کے بعد ہی شائع کیا جائے گا۔ اگر وہ سیاسی زندگی سے الگ تھلگ رہتے تو ان کی تصانیف گوشمار میں زیادہ تعداد میں ہوتیں لیکن ان میں عقل و دانش کی وہ چاشنی نہ ہوتی جو ایک طویل اور سخت جد وجہد سے دوچار ہونے کے بعد اُن کے حصے میں آئی۔

مختصراً یہ ہے مولانا صاحب ایک زبردست عالم دینیات، ایک عظیم اسکالر، ایک عظیم مقرر اور تحریک آزادی کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ اس لئے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ مولانا کی زندگی کے آخری چند ایام میں ان کی تشویشناک حالت کی خبر جس شخص کے کانوں میں پڑی اس کی نگاہوں میں تشویش کی جھلک نظر آئی۔ دہلی میں ان کی وفات پر جس طرح اظہار غم کیا گیا اور ملک بھر کو اُن کی وفات نے جس طرح غم کی لپیٹ میں لے لیا تھا اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ عام لوگوں کو اس امر کا پوری طرح احساس تھا کہ وہ ایک راہنما اور ایک فلسفی ہی نہیں بلکہ ایک دوست کو کھو بیٹھے ہیں۔ مولانا اپنے دور کے منتخب افراد میں سے ایک تھے۔ اور ان کی وفات پر بجا طور پر یہ کہا گیا کہ اُن کے ساتھ ہی ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت کی بعض ایسی اقدار کا ایک خاص دور ختم ہو گیا جو شاید پھر کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، نئی دہلی کے شکریے کے ساتھ)

شجاع خاور

غزل

کیا جانے کس دور میں اب میرا جنوں ہے
احساسِ فنا کربِ فنا سے بھی فزوں ہے

تم آ گئے اس واسطے مجبور ہوں ورنہ
تجدیدِ تمنا مرے پندار کا خوں ہے

دلِ نازگہِ زیست میں بہلے گا نہ جیسے؛
اُف تیری نگاہوں میں بھی کس درجہ فسوں ہے

پھر سُرخیٔ خوں حسن کو بخشش میں ملیگی
پھر آج سرِ عشق میں سودائے جنوں ہے

لو شورشِ احساس بھی رخصت ہوئی خاور
اب چین ہے، آرام ہے، راحت ہے، سکوں ہے

ظہیر احمد صدیقی



غالب و فانی

غالب کی شاعری اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے تقریباً تمام ناقدین نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے ان کو یہ مقام بخشا۔ فکر، جذبہ، واردات قلب کی مصوری، طرز بیان کی ندرت حقائق کائنات کا مطالعہ، بدلتے ہوئے سماج کا شعور، اپنے ماحول کا تجزیہ۔ یوں تو ان تمام خصوصیات کا غالب کو غالب بنانے میں کم و بیش دخل ہے مگر ہمارے نزدیک ان کی فکر کو ان سب پر تفوق حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک جاگیردارانہ نظام کے زوال آمادہ دور کی پیداوار تھے جس کا ظاہر کبھی پرسکون اور کبھی متلاطم رہتا تھا لیکن اس کے باطن میں سیکڑوں طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب سنہ ۱۸۵۷ء میں اس نظام کی بساط الٹی تو ان کو چنداں حیرت نہ ہوئی۔ اور ملال بھی ہوا تو ہندوستانیوں اور انگریزوں میں سے اپنے ذاتی دوستوں کی ہلاکت اور بربادی کا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنے سفر کلکتہ میں انگریزی طرز زندگی کی جھلک دیکھ آئے تھے جس کی تعریف میں وہ آخر تک رطب اللسان رہے مگر یہ تو مظاہر مناظر تھے جن سے تھوڑا بہت ہر شخص اپنی جگہ متاثر ہوا ہوگا۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان حقائق کا نہ صرف ادراک کیا بلکہ ان کو اپنی فکر کا جزو بنا لیا۔ ان کے عمل اور ردِ عمل سے ان کے خیال میں گہرائی اور ان کے جذبات میں توانائی آئی اور ان پر غالب کی فکر رسا کی چھاپ ہے۔ وہ ماحول کے ساتھ سوچنے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ماحول کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ جو کچھ کہتے ہیں اس لئے نہیں کہتے کہ سننے والے سنیں اور سر دھنیں، وہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی فطرت شعر کے روپ میں پراگندہ نقاب ہونا چاہتی ہے اس کے ساتھ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی فکر پر تصوف کا بھی خاصا اثر ہے بعض اصحاب کا خیال ہے کہ دہلی کے ماحول اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صحبت نے اُن کو صوفی مزاج بنا دیا۔ دوسروں کا بیان ہے کہ ان کے ذاتی مطالعے نے اُن کو اس راہ پر لگایا۔ بنیاد جو کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ شیعیت کے باوجود تصوف سے سرشار تھے وہ عملاً صوفی نہ سہی مگر ان کے یہاں تصوف دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ اعتقاداً بھی تصوف کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں تصوف کا رنگ اس حد تک رچا بسا ہے کہ کہیں پر اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہاں لاموجود الا اللہ کا بادہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام اور نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں ——— کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر ——— سوائے اللہ و اللہ ما فی الوجود۔"

تصوف اور فلسفہ کا رشتہ بہت قریب کا ہے علامہ شبلی کہتے ہیں۔

"فلسفہ جو شاعری میں آیا تصوف کی راہ سے آیا جب ہستی مطلق۔ وحدت الوجود۔ فنا۔ بقا وغیرہ مسائل اسی تصوف کی بدولت آشنا ہوئے تو چونکہ دلچسپ مسائل تھے عام طبیعتوں کو ان میں مزہ آتا تھا۔ لیکن ہر شخص صاحبِ حال نہیں ہو سکتا تھا اس لئے جو لوگ مکاشفہ اور حال کے زبان آموز تھے فلسفے کا سہارا پکڑتے تھے اور اس کے سکھائے ہوئے الفاظ بولتے تھے یہ لے بڑھتے بڑھتے پورا فلسفہ زبان میں آگیا[1]

غالب کو صاحبِ حال کہنا تو ممکن نہیں لیکن صاحبِ قال ضرور کہا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ مسئلہ کہ وہ فلسفی شاعر تھے یا نہیں۔ اس بارے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے جب ہم انہیں فلسفی کہتے ہیں تو ہماری یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ کسی خاص نظامِ فکر یا فلسفیانہ سلسلے کے بانی تھے۔ جس کے محور کے گرد ان کی تخلیقات گھومتی ہیں بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ حقائق زندگی پر سنجیدگی سے سوچنے اور ان کو سلیقے سے بیان کرنے کے خوگر تھے۔ یہ ہے غالب کی فکر کا ایک اجمالی خاکہ جس سے زیادہ کی ہمیں ان سے توقع کرنا درست نہ ہوگا جب ہم فانی کے کلام کو غور سے پڑھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اُن کی گرفت فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر زیادہ محکم اور قوی ہے بلکہ اُن کے یہاں ان مسائل کے بیان میں شعریت بھی زیادہ دلکش اور جاذب توجہ معلوم ہوتی ہے اُن کی فکر غالب سے زیادہ گہری اور پیچیدہ نظر آتی ہے۔

فانی قدرت سے ایک سوچنے والا دماغ اور ایک حساس دل لے کر آئے تھے۔ اُن کو فلسفے سے خاصی مناسبت تھی۔ اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے انھوں نے فلسفے کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ وہ نسلاً پٹھان تھے اور ان کے خاندان کا شمار شہر کے معزز خاندانوں میں تھا۔ مگر فانی کو جوانی ہی میں زندگی کے نشیب و فراز، دوستوں کی بے مہری اور محبت کی ناکامی سے کام پڑا۔ ان عوامل کا ردِ عمل عموماً انسانوں کے طبائع پر مختلف وسائل و مسائل کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ کچھ لوگ بے حس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے احساس پر واقعات و حالات تازیانے کا کام کرتے ہیں دوسرے گروہ میں بھی بعض طبعیتیں عمل کا سہارا لیتی ہیں۔ اور نتیجہ کچھ بھی ہو سعی سے کنارہ نہیں کرتیں۔

ع کار من بہ دریا در دست و پا زدن تنہا

لیکن ان کے برخلاف کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں کہ سراپا احساس ہونے کے باوجود زندگی سے صلح کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ زمانے کی بے مہری اور اہل زمانہ کی ناقدری ان کو ان کے بلند نصب العین سے تجاوز کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ فانی کا شمار اس آخری گروہ میں ہے۔ اس کے ساتھ ان میں خودداری، آزادروی، عالی ظرفی اور راست بازی کے اوصاف ایسے راسخ تھے کہ اس کی مثال ابنائے عصر میں مشکل سے ملے گی۔ یہی وہ محرکات تھے جنہوں نے ان کی سیرت کی تشکیل میں حصہ لیا یا ان کی فطرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا۔ یہی فطرت ان کی تخلیقات کا خمیر ہے کیوں کہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ ان کی زندگی اُن کی شاعری سے اور شاعری ان کی زندگی سے الگ نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھانا قطعاً بے محل ہے کہ ان کی شاعری عمل سے بیگانہ کر دیتی اور زندگی سے فرار سکھاتی ہے۔ کیوں کہ ہم فانی پر ایک شاعر کی حیثیت سے بحث کر رہے ہیں نہ کہ ایک مصلح کی حیثیت سے۔

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ فانی اور غالب کی فکر کا ایک حد تک موازنہ کیا جائے۔ اس کے لئے ایسے اشعار کو منتخب کرنا زیادہ دلچسپی کا موجب ہوگا جن میں فانی نے بالقصد غالب کے شعر کو سامنے رکھ کر یا اس سے ہٹ کر اپنے لئے راہ نکالی ہے یا غالب کے خیال پر اضافہ و ترقی کی کوشش کی ہے۔

غالب: جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تیری رہ گذر کو میں

عشق و عاشقی کا عام مضمون ہے جس میں عاشق نے رشک کے جذبے سے متاثر ہو کر تمنا کی ہے کہ کاش وہ معشوق کی گلی سے واقف ہی نہ ہوتا جس کی بدولت اس کی تلاش میں رقیب کے گھر جانا پڑا۔ اس موضوع پر مومن کا شعر ہے

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ایک طرف محبوب کے نقش پا کے احترام میں یہ مبالغہ۔ دوسری طرف اپنی ذلت کے احساس کی یہ شدت۔ اسکے برخلاف فانی کے شعر میں ایک عارفانہ

---

[1] شعر العجم جلد پنجم

غالب — اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

فانی — تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

غالب کے شعر سادہ ہیں ان کے برخلاف فانی نے:

ع بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

کہہ کر شعر میں جو حسن اور زور پیدا کر دیا ہے وہ اردو تو درکنار فارسی میں بھی مشکل سے ملے گا۔

غالب — ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

فانی — اللہ ری چشم ہوش کی کثرت پرستیاں
ذرّے ہی رہ گئے کوئی صحرا نہیں رہا

غالب کا مقصد یہ ہے کہ قطرہ و موج و حباب کوئی الگ ہستی نہیں رکھتے۔ یہ وجود بحر ہی کا دوسرا نام ہے اس جگہ بھی فانی کا انداز زیادہ دل کش اور شگفتہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کو اہل نظر کی "چشم ہوش" سے شکایت ہے کہ وہ کثرت پرستی میں مبتلا ہے اور اس کو ذرے ہی ذرے نظر آتے ہیں۔ صحرا دکھائی نہیں دیتا۔ وحدت الوجود فانی کا خاص مضمون ہے جس کے اظہار کے لئے انھوں نے نئے نئے پیرائے اختیار کئے ہیں۔

غالب:- جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

فانی: کیا کیا گلے نہ تھے کہ اِدھر دیکھتے نہیں
دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا !!

غالب — دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

فانی — عرض نازِ راز ہے کثرتِ مجاز کا
آئینے سے لگ گئے پرتو جمال میں

غالب — ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فانی — ہر جلوۂ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے میں شامل کوئی نہیں

غالب — گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

فانی — حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے
اب تو مجھے دیکھا کر اے جلوۂ جانانہ

اس میں شک نہیں کہ ایسے ہی اشعار فانی کے آیات کمال میں شمار ہونے کے قابل ہیں اور انہیں کی بدولت ان کو ہماری زبان کے غزل نگاروں میں ایک بلند مقام حاصل ہے

غالب — دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

فانی — خود تجلّی کو نہیں اذن حضوری فانی
آئنے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

غالب — دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

فانی — تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا
ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

غالب — تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا نشاں نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

فانی — نشانِ مہر ہے ہر ذرۂ ظرف مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

اب ہم یہاں فانی کے چند ایسے خیالات نقل کرنا چاہتے ہیں جن سے غالب کا کلام خالی ہے اور جن پر اول الذکر کی انفرادیت کا بجا طور پر دارومدار ہے ممکن ہے کہ بعض طبائع فانی کی دقت پسندی اور موشگافی پر چیں بہ جبیں ہوں اور اُن کے ان افکار کو عظمت کے منافی قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ افکار ہی ان کی عظمت کی روشن دلیل ہیں ایک روایتی شاعر کے یہاں ان خیالات کی جھلک بھی ملنا مشکل ہے جب تک کوئی شخص اپنی خودی میں ڈوب کر نہ ابھرے ذیل کی مثالوں سے ہمارے بیان کی خوبی

تصدیق ہو سکتی ہے۔

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا
یہ راز ہے کہ کوئی راز داں نہیں ملتا

میری نظر کی آڑ میں اُن کا ظہور تھا
اللہ اُن کے نور کا پردہ بھی نور تھا

سن کے ترا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج ترا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا :

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

راز دل سے نہیں واقف دلِ ناداں میرا
ترے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

حاصلِ علم بشر جہل کا عرفاں ہونا
عمر بھر عقل سے سیکھا کئے ناداں ہونا

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کس کو کہئے ماسوا جب تو نہیں تو کچھ نہیں
تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے۔

صحرا کا اجتہاد ہے ذرّے کی ہر نمود
ذرّے کا اعتبار ہے صحرا کہیں جسے

پڑتا نہیں اس آئینے میں عکس کوئی اور
دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے

مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں تمام دیوان مثالوں سے بھرا ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ ایسے دس پانچ اشعار بھی اگر کسی سے بن پڑیں تو اس کی شاعرانہ عظمت ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

غالب کی عظمت سے انکار نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذہنی طور پر فانی نے غالب سے بہت کچھ استفادہ کیا ہوگا غالباً اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دورِ جدید میں غالب نے دو روپ اختیار کئے ایک نے اصغر کی صورت اختیار کی اور دوسرے نے فانی کی۔ مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فانی کی شاعری کو غالب کی صدائے بازگشت ہرگز نہیں کہا جا سکتا چراغ سے چراغ جلانے کی بات دوسری ہے ورنہ فانی نے غالب کے اثر سے آزاد ہو کر جہاں کسی خیال کو پیش کیا ہے وہ فانی ہی کا حصہ ہے اور جہاں غالب کے کسی خیال کو بھی پیش کیا ہے تو اس میں اس طرح اضافہ کر دیا کہ وہ فانی کا اپنا حصہ بن گیا۔ متاخرین شعرا سے ایران و ہند میں بیدل کو چھوڑ کر دوسرے شعرائے فارسی کے یہاں یہ نزاکت خیالی مشکل سے ملے گی۔ ہم نے یہاں موازنہ کرتے وقت فانی کے اس کلام کو قصداً پیش نہیں کیا جس میں انہوں نے اپنے محبوب موضوعات (غم۔ جبر و قدر۔ گناہ و عفو) پر قلم اٹھایا ہے

کہا جاتا ہے کہ معاصرت حقیقت تک پہنچنے میں بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر ہم کسی چیز کو بالکل آنکھ سے ملا کر دیکھیں تو کسی نتیجے پر مشکل سے پہنچ سکیں گے۔ فانی کے معاملے میں بھی یہی معاصرت سنگ راہ ہوئی ہے کسی نے ان کو سوز خواں اور ہر وقت لبسورنے والا ٹھہرایا ہے کسی نے ان کی شاعری کو بے کیف اور یک رنگی کا حامل بتایا۔ در اصل بات یہ ہے: "چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند"

بعض اصحاب نے فانی کے اشعار میں کچھ فنی خامیاں ڈھونڈھ نکالیں اور خیال کیا کہ تنقید کا حق ادا کر دیا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ سب تصویر کے یک طرفہ اور ادھورے رُخ ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس باکمال شاعر کی حیات واردات اور معتقدات کے پس منظر میں اس کے افکار کا تجزیہ کیا جائے اور اس کے فن کا جائزہ لیا جائے جس سے اس کی تخلیقات کی نسبت ایک معتدل اور منصفانہ نظریہ قائم ہو سکے۔

میاؤں میاؤں

علی عباس حسینی



خواب بھی عجیب و غریب طرح کے ہوتے ہیں جسم تو پلنگ پر، مگر انسانی روح پرواز کرتی پھرتی ہے نہ جانے کہاں کہاں کی سیر، کیسے کیسے لوگوں سے ملاقات، کیسے کیسے سجیلے چہروں کی زیارت، کیسی کیسی پریوں سے راز و نیاز کی باتیں، کبھی رومان لڑ رہا ہے تو کبھی گرما گرم بحثیں ہو رہی ہیں۔ سیاست پر، مذہب پر، ادب پر، میں بھی ایک صبح ایک ملائے مسجدی پر ایک شعر کے معنی و مطلب واضح کرنے میں الجھا ہوا تھا۔ شعر یہ تھا۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

اور مولانا تھے کہ خشمگیں آنکھوں سے مجھے گھور کر لاحول بھیج رہے تھے کہ دفعتہً میری آنکھ کھل گئی، تو دیکھا صبح کاذب کے آثار ہیں۔ مرغ بول رہے تھے، مگر اب تک نہ پو پھٹی تھی اور نہ کوؤں نے قائیں قائیں کرکے ایک دوسرے کو للکارا تھا اور نہ چڑیوں نے چہچہا کر ایک دوسرے کو بیدار کیا تھا۔ نہ گرجا میں گھنٹا بجا تھا، نہ مندر میں ناقوس پھونکا گیا تھا اور نہ مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوئی تھیں۔ مشرق بھی مغرب کی طرح روسیاہ تھا۔ میں تھوڑی دیر تو پلنگ پر لیٹے لیٹے کروٹیں بدلتا رہا، پھر سگرٹ جلا کر اس بے مزہ شعر کی معنوی خوبیوں پر غور کرتے ہوئے کچھ اونگھنے سا لگا، فوراً بزرگوں کا یہ کہنا یاد آگیا کہ صبح سویرے شیطان پاؤں دبا کر اس لئے سلا دیتا ہے کہ انسان نماز صبح کی طرف سے غافل ہو کر سو جائے۔ اس لئے میں نے اپنے کو گرم و نرم بستر چھوڑنے پر مجبور کیا، اور قبل از وقت وضو کر کے جانماز پر آکر بیٹھ گیا۔ ابھی "الصلوٰۃ خیرٌ من النوم" کی صدا نہ کانوں نے سنی تھی اور نہ "حیّ علیٰ خیر العمل" کی، کہ دفعتہً مکان کے باہری دالان کی داہنی جانب جو بیل لگی ہے، اس میں پتوں اور پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہوئی اور ایک سپید کبوتر دالان کے کھمبے سے ٹکراتا ہوا آکر میری گود میں گرا۔ میں نے نماز کے بعد کی تلاوت قرآن کے لئے سو پاور والا بلب جلا رکھا تھا۔ اس لئے میں نے کبوتر کو آتے دیکھ لیا اور اس کے یوں اچانک گود میں گرنے سے میں نہ اُچکا، نہ چیخا، نہ ڈرا، اس نے گود میں پہنچتے ہی میری قمیص کے دامن میں اپنے کو چھپانا چاہا۔ سارا دھڑ تو کپڑے نے ڈھک لیا، مگر وہ اپنا سر نکالے باہر کی جانب اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وہ سارے جسم سے کانپ رہا تھا۔ چونچ کے اندر کی پتلی زبان منہ کھل جانے سے بار بار دکھائی دیتی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا وہ اور بھی سمٹ گیا۔ میں اسے آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکن کم ہوئی۔ میں سوچنے لگا میں اسے کیا کروں۔ یہ یقیناً کسی خطرے سے ڈر کر بھاگا ہے۔ پناہ لینا چاہتا ہے۔ اسے پناہ دینا میرا فرض ہے، مگر نہ میرے گھر میں کابک ہے کہ اسے اس میں بند کردوں، نہ کوئی اور اس کی حفاظت کا سامان۔ خیال آیا لاؤ اسے کسی ٹوکری یا چھابی میں بند کردوں۔ جانماز سے خود ہی اٹھنا پڑا۔

دو دو جوان لڑکے پاس والے کمرے میں سو رہے تھے۔ میں ان کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ نوجوان کو صبح کے وقت زبردستی بیدار کرنے سے

روکا گیا ہے! اذان واقامت ذرا زور سے کہہ دو مگر کسی کو جھنجھوڑ کر نہ جگاؤ کہیں وہ ایسی حالت میں نہ ہوں کہ انھیں شرمانا پڑے۔

میں نے تخت سے اتر کر باہر دالان میں قدم رکھا ہی تھا کہ چھت کی منڈیر سے "میاؤں! میاؤں!" کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس دالان کا بھی بلب روشن کر کے دیکھنا چاہا کہ یہ بلی کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ اس کی میاؤں! میاؤں میں بھی ایک قسم کی فریاد ہے۔ میں نے اس کا شکار اس کے منہ سے چھین لیا ہے۔ کیا حق ہے مجھ کو کسی کا رزق اس سے چھین لینے کا؟ بلی اسی کی تو شکایت کر رہی تھی۔ اس نے اسی زمانے میں ڈھیروں بچے دیے تھے۔ ان سب کو آنکھ کھلانے، وہ انھیں روز منہ میں دبا کر ایک نئی جگہ لے جانے کی محنت بھی کرتی تھی، پھر انھوں ہی کے لیے اپنے ہی جسم کے خون سے دودھ فراہم کرتی تھی۔ حسنِ اتفاق سے آج اسے نرم چارہ ملا تھا۔ ایک پورا کبوتر شکم سیر ہو کر کھاتی اور اپنے بچوں کا بھی دودھ سے پیٹ بھر دیتی۔ خیالات کی لڑی میں اور الجھاؤ بڑھا۔ سوچنے لگا۔ خداوندِ عالم نے ہر جاندار کو دوسرے کی غذا کیوں بنایا ہے؟ سبزہ وگل، درخت اور اس کی پتیاں اور نرم ٹہنیاں چوپائے چرتے اور کھاتے پھرتے ہیں۔ ان کا اُکش، مختلف طرح کے کیڑوں کی غذا بنتا ہے ان کیڑوں کو چڑیاں چگ لیتی ہیں۔ اِن چوپایوں، چڑیوں کو انسان بھی کھا لیتے ہیں اور حیوان بھی۔ شیر اور بھیڑیے، باز اور بحری۔ جنگل میں کچھ جانور "ویجیٹرین" ہیں۔ کچھ خالص گوشت خور۔ یہ ایک عجیب سلسلہ ہے ایک دوسرے کو کھا جانے کا کہ فردوں اور جنسوں تک محدود نہیں، بلکہ ملکوں اور سلطنتوں تک جاری ہے۔ میں اپنی جگہ کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ بلب کی روشنی چار برس کی منی کے چہرے پر پڑی، اُدھر بلی نے میرے ہاتھ میں کبوتر دیکھ کر زور زور سے میاؤں! میاؤں! کی رٹ لگائی۔ منی جاگ گئی۔ وہ مجھے اپنے پاس ہی ہاتھ میں کبوتر لیے کھڑا دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی: "پاپا! ہم تو (کو) دے دیجیے!" بی منی باوجود بقراط وقت ہونے کے اب تک ک کو ت سے بدل دیا کرتی ہیں۔ میں نے "اُسے سمجھانے" والے لہجے میں کہا "نہیں بی بی! یہ دوسرے کا مال ہے۔ میں تم کو کیسے دے دوں۔"

وہ بولی "آپ نے تو پترا (پکڑا) ہے!"

میں نے دل میں سوچا میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ پکڑا ہوا کبوتر اپنا نہیں ہو جاتا۔ وہ دوسرے ہی کا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح راستے میں پڑا ہوا پرس تمہاری جیب نہیں گرما سکتا۔ بلکہ صرف اپنے مالک ہی کی! پھر میں نے تو اس کبوتر کو پکڑا تک نہیں۔ وہ خود ہی جان بچانے کے لیے میری گود میں آکر گر پڑا۔ پناہ گزیں کی حفاظت کرنا لازمی ہے، خواہ اپنی جان کی قربانی دے کر ہی ہو۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ آٹھ برس کا سعید جو دوسرے پلنگ پر سو رہا تھا، جاگ گیا۔ اس نے ماں سے تہذیب اور اخلاق کی بہت سی باتیں سیکھ لی تھیں۔ وہ بولا "پاپا، تسلیم!"

میں نے دعا دی "جیتے رہو بیٹے!"

وہ بولا "یہ کبوتر منی کو نہ دے دیجیے گا اس کے ہاتھ میں وہ پھڑ پھڑائے گا، پھر چھوٹ کر اڑ جائے گا!"

منی نے رہانسی ہو کر کہا "تیسے (کیسے) اڑ جائے گا! میں اسے خوب زور سے پتڑے (پکڑے) رہوں گی!"

اور مجھے اس بھولی بچی کے دعوے پر فارسی کا شعر یاد آ گیا جس نے کیا نادر تشبیہ دی ہے۔

دلم مانندِ کنجشکے بہ دستِ طفلِ نادانے
کہ از جاں دوست تر دارد، ولیکن می کشد جانے

سعید نے کہا "پاپا، آپ مجھے دے دیجیے۔ میں مُلاجی کو دے آؤں گا۔ وہ بڑے کبوتر باز ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے کسی نہ کسی کا کبوتر پکڑ لیتے ہیں!"

میں نے حیرت سے پوچھا "اور اگر اس کا مالک آکر مانگتا ہے تو کبوتر واپس نہیں کرتے؟"

سعید نے کہا "کس کی ہمت کہ وہ مُلاجی کا پکڑا ہوا کبوتر اُن سے مانگے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا آ بھی گیا تو ایسی ڈانٹ بتاتے ہیں کہ وہ منہ لٹکائے چپکا چلا جانے ہی میں خیریت جانتا ہے! ہاں!"

میں جانتا تھا کہ یہ شریر سعید بڑا نقال ہے۔ اس لیے میں نے مولانا کی نقل اتارنے کے لیے اسے اکسایا۔ "کیا کہتے ہیں مُلاجی؟ ذرا سناؤ تو!"

وہ اُن کی نقل کرتے ہوئے بولا "میں اس کبوتر کو تمہارے گھر سے پکڑ کر لایا نہیں۔ اس کو تمہارے گھر کا ماحول پسند نہیں بہ ظاہر تمہارے کبوتروں

ے اس سے بنتی بھی نہیں ہے۔ وہ اُن کے غول سے نکل کر میرے کبوتروں کی ٹکڑی میں خود سے آکر مل گیا۔ بے شبہ اسے اِن کی صحبت میں زیادہ خلوص، زیادہ پیار، زیادہ پاکیزگی دکھائی دی۔ وہ ان کے ساتھ میرے گھر میں اُتر آیا۔ اس نے میرا دانہ کھایا، میرا پانی پیا، اور وہ اِس وقت میری کبوتری سے غٹرغوں غٹرغوں کر کے بیٹھا رومان لڑا رہا ہے۔ اب میں کیوں اسے ایسی جگہ جانے پر مجبور کروں، جو اسے اس قدر ناپسند ہے — یہ خلاف انسانیت فعل مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتا! بس آپ یہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے دولت کدہ واپس جائیں۔ مجھ سے اس ظلم کی توقع نہ فرمائیں!"

سعید ایک سانس میں ملّاجی کے پورے نامعقول دلائل انھیں کے انداز سے سنا گیا، تو مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں منّی کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ منّی نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر کبوتر کا سر سہلانا شروع کر دیا۔ طائر کے دل کی حرکت تیز ہو گئی، مگر جب اُسے نرم نرم انگلیوں میں بھرا ہوا پیار محسوس ہوا تو اس نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے دونوں بچوں کو ایک کہانی کے ذریعے نصیحت کرنا چاہی۔ میں نے کہا "ایک غریب بڑھیا تھی۔ اس نے مرغی کا ایک جوڑا پال رکھا تھا۔ قضائے کار ایک دن مرغ صاحب محلے کی کسی دوسری مرغی کے پیچھے دیوانہ وار دوڑے اور کسی گھر میں گھس کر پھر باہر نہ نکلے۔ شام کو بڑھیا محلہ بھر اپنا مرغ ڈھونڈھتی پھری مگر ناکامیاب گھر پلٹی تو دو ایک پڑوسنیں ازراہِ ہمدردی ساتھ چلی آئیں۔ بڑھیا نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ سفید چونڈا کھول کر بیچ آنگن میں کھڑی ہو گئی اور ہاتھ اٹھا کر گڑگڑا کر دعا مانگی "اے پاک پروردگار! بس اتنی بے کس بیوہ کی دعا سن لے کہ میرا مرغ کسی ملّا کے ہاتھ نہ لگا ہو!"

پڑوسنوں نے بڑھیا سے پوچھا "یہ تو تم نے عجیب دعا مانگی!"

وہ بولی "کسی ہمسائے نے پکڑا ہوگا، تو حشر کے دن میں اپنے مرغ کا اس سے بدلہ لے لوں گی، لیکن اگر کسی ملّا نے پکڑا ہوگا تو وہ وہاں بھی کوئی شرع کا پیچ ڈال کر حرام کو حلال کر لے گا!"

سعید زور سے ہنسا، بولا "تو ہمارے ملّاجی جو دوسروں کے کبوتر پکڑ لیتے ہیں وہ بھی گناہ ہے!" میں نے سر ہلا کر ہامی بھری۔

میں ان بچوں کو کچھ اور سمجھانا چاہتا تھا کہ بلّی نے بالکل سامنے کی منڈیر پر آکر اپنی زرد زرد خشمگیں آنکھیں کبوتر پر گڑا کر پھر "میاؤں! میاؤں!" کی صدا اس قدر متواتر لگائی کہ میں نے اذان کی آواز بھی نہیں سنی، اور صبح کی نماز بھی مجھے یاد نہ رہی۔

سعید لڑکا تھا نا، دل کا سخت، دوسروں کی اذیت سے لطف لینے والا۔ وہ بولا "میرے پاپا، اس کبوتر کو منڈیر پر رکھ دیجیے۔ دیکھیں یہ بلّی اسے پکڑ لیتی ہے یا یہ اس سے بچ کر اڑ جاتا ہے!"

منّی بولی "نا پاپا، ہاتھ جوڑتی ہوں، ایسا نہ کیجیے گا (کیجیے گا) وہ موئی اسے ضرور تھا (کھا) ڈالے گی!"

میں اسی حیص بیص میں تھا کہ آخر اس کبوتر کا کیا حشر کروں کہ اتنے میں بغل والے مکان سے تی تی اور سیٹی کی آواز آنے لگی اور ہمسایہ کے گولا کبوتر چھوٹے چھوٹے دائرے میں نیچے نیچے اڑنے لگے۔ میں جلدی سے زینہ پر چڑھ کر چھت پر پہنچا۔ بلّی واقعی بھوکی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ میں دبے ہوئے کبوتر پر حملہ کر دے گی۔ اور اس سلسلے میں مجھے بھی نوچ ڈالے گی۔ میں نے چھت پر سے ایک کنکری اٹھا کر تو اُسے مار کر قریب آنے سے روکا اور کبوتروں کا حلقہ جیسے ہی میری چھت کی طرف آیا، میں نے ہاتھ سے کبوتر کو زور سے ہوا میں پھینکا۔ وہ غول میں شامل ہو کر اُڑنے لگا اور جیسے ہی "آؤ! آؤ!" کی آواز اس نے سنی، وہ ان کے کبوتروں کے ساتھ اُن کے ہاں بیٹھ گیا۔ اب خدا جانے وہ کس کا تھا، انھیں کا یا کسی دوسرے کا۔ بہرحال، بلّی سے اس کی جان بچ گئی!

مگر اس بلّی کو کیوں کر خاموش کیا جائے، جس نے اب تک "میاؤں میاؤں!" کی رٹ لگا رکھی تھی؟ اس لیے میں اسے چمکارتا "پُسی! پُسی!" کہتا زینے سے نیچے اترنے لگا۔ اس کو شاید میری آواز کی نرمی سے محسوس ہوا کہ میں اس کے رزق کا بھی کچھ سامان کرنے والا ہوں۔ وہ میرے ساتھ تو زینے سے نہ اُتری، مگر پھر سامنے کی منڈیر پر "میاؤں، میاؤں!" کرنے لگی اور اس کی آواز میں بے پناہ شکایت تھی، بے انتہا گلہ تھا۔ ایسی فریاد جو ایک بھوکے ہی پیٹ سے نکل سکتی ہے۔

منی بولی "پاپا، اُسے رات تا (کا) دُودھ دے دیجئے۔ یہ بہت بھوتی (بھوکی) ہے۔"

سعید بولا: "واہ! اور ہم لوگ چائے کہاں سے پئیں گے!"

مُنی بولی۔ "تھوڑی دیر بعد تازہ دودھ آجائے گا! اس تی (کی) چائے پئیں گے؟" میں ابھی کچھ فیصلہ نہ کرپایا تھا کہ منی کی ماں ہماری "چاؤں چاؤں" سے جاگ پڑیں۔

"اے یہ تم لوگوں نے کیا صبح صبح ادھم مچا رکھی ہے؟" انھوں نے ڈانٹا۔

بلی بولی "میاؤں! میاؤں!"

وہ بولیں "ارے اس موئی نے ڈھیروں بچے دیئے ہیں کچھ دے دلا کر اسے دفان کرو یہاں سے!" اور کروٹ لے لی۔ اس لئے میں نے منی ہی کی بات پر عمل کیا۔ ایک گہری پلیٹ میں تقریباً آدھ پاؤ دودھ میں ایک بڑی سی روٹی مل کر بلی کو دکھا کر زینے کے پاس رکھ دی اور خود صحن میں چلا آیا۔ بلی جھپٹتی ہوئی نیچے اتری اور آناً فاناً سب کچھ چٹ کر گئی۔ منی بھی اپنے ننھے پاؤں سے یہ تماشا دیکھنے آنگن کے اس حصے تک آگئی تھی جہاں سے زینہ نظر آرہا تھا۔ مگر بلی اتنا کھانے پر بھی پھر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔

مُنی بھی جھلا اٹھی۔ بولی "موتی کا پیٹ نہیں بھاڑ ہے اجا دور ہو!"

وہ یہ کہہ ہی رہی تھی کہ دفعتاً اخبار والے نے پکار کر اس روز کا اخبار پھینکا۔ سعید لپک کر اٹھا لایا۔

بڑے بڑے موٹے موٹے حرفوں میں سرخی تھی "اسرائیل عرب کے لئے عزرائیل۔" نیچے لکھا تھا کہ "اسرائیلیوں نے شرق اُردن اور مصر پہ اچانک حملہ کر دیا۔ سینکڑوں آدمی ہلاک ہوئے۔ ہوائی تاخت سے سینکڑوں گاؤں جل بھن کر راکھ ہوگئے۔ پچاس ہزار سے زائد خانماں برباد اندرون ملک کی طرف بے سروسامان سراسیمہ جان بچانے کے لئے بھاگتے چلے آرہے ہیں۔" اور بلی نے کہا "میاؤں! میاؤں!"

اور میں سوچنے لگا کہ کیا یہ وہی عرب ہیں جو خیبر شکن، فاتح مرحب و عنتر کی نسل سے ہیں؟ کیا یہ وہی عرب ہیں جو اپنی جواں مردی، بہادری اور جوش ایمانی کے لئے مشہور تھے، جنہوں نے کیکاؤس اور کیخسرو کے ملک کو فتح کیا تھا، جنہوں نے پورے یورپ کے سورماؤں کے صلیبی جنگوں میں دانت کھٹے کر دیئے تھے، جنہوں نے سلطنت روما کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ جنھوں نے سکندر اعظم کے ملک پر حکومت کی تھی۔ کیا ہوئی ان کی بہادری؟ مگر معاً خیال آیا۔ دنیا بدل گئی۔ اب بموں کا دور ہے، راکٹوں کا دور ہے۔ ٹینکوں کا دور ہے، بمباروں کا دور ہے، آگ لگانے والے گولوں کا دور ہے۔ کیا کر سکتی ہیں وہ قومیں جو صرف تیر و تفنگ سے مسلح ہوں۔ تلواریں بے کار ہیں، نیزے بے کار ہیں، بھالے بے کار ہیں حالانکہ مفتوح نہ جسمانی قوت میں اپنے فاتحوں سے کمزور تھے، نہ بہادری میں ان سے کم۔ مگر کیا ہو رہا ہے آج دنیا میں؟ ہر قوی کمزور کو کھا رہا ہے۔ ہر توانا ضعیف کو چبا رہا ہے۔ اور پھر بلی بولی میاؤں د"

اور اب غصہ آگیا مجھے بھی: کم بخت کیا چاہتی ہے؟ کیا گھر بھر کا کھانا اسی کو دے دیا جائے! لالچی ملکوں کی طرح اس کا پیٹ بھی کبھی نہیں بھر سکتا اور پھر کہا اس نے "میاؤں!"

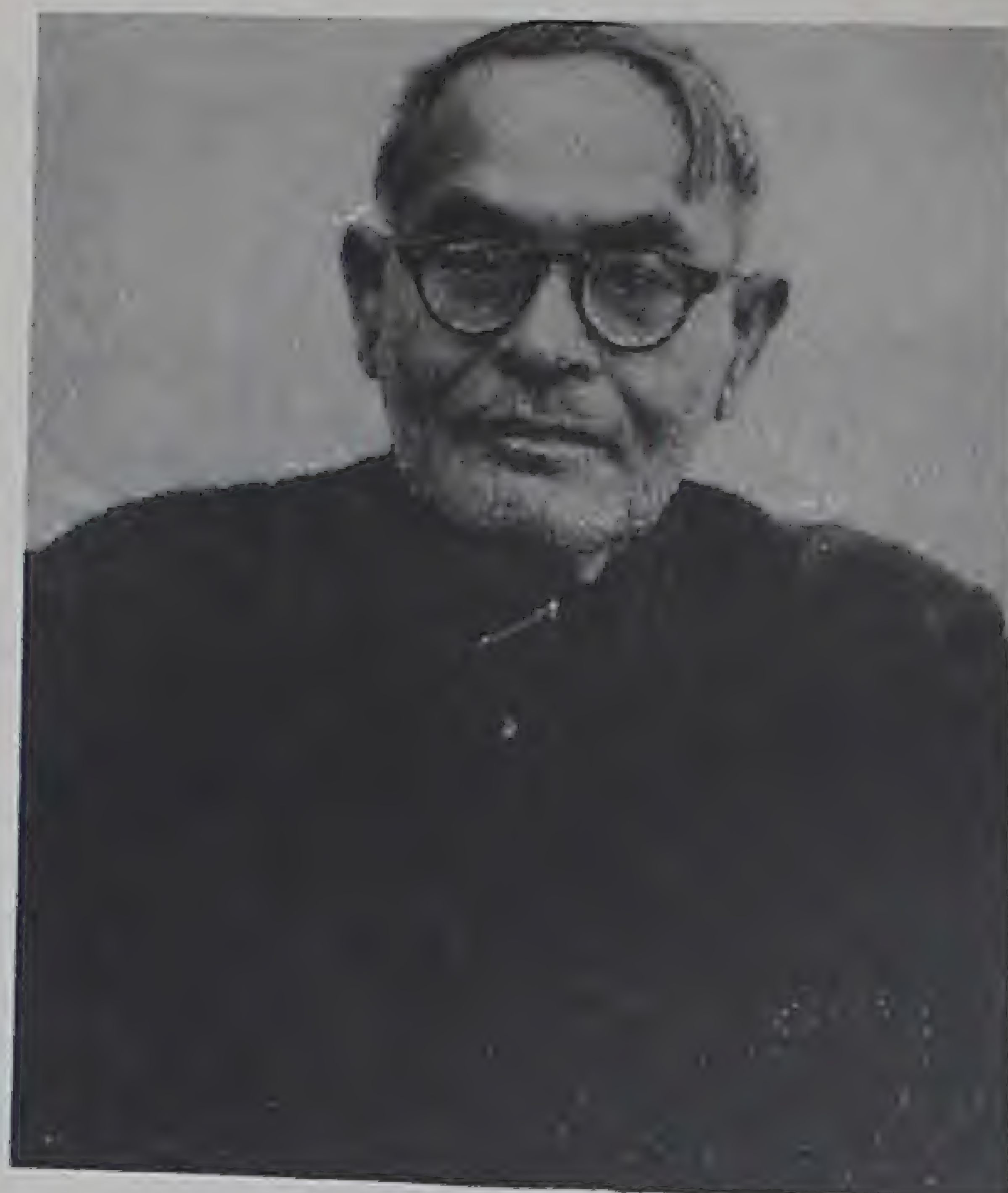
اور میں نے جھلا کر کہا "چپ بھی رہ کم بخت!"

اور دل ہی دل میں لاحول بھیجتا، پھر چلا جا نماز کی طرف۔ مگر دن نکل آیا تھا۔ اس روز صبح کی نماز اس "میاؤں! میاؤں!" کی بدولت قضا پڑھنا پڑی۔ اور بجائے خضوع و خشوع کے دورانِ نماز میں یہی سوچتا رہا کہ کیا ایک کبوتر کی جان بچا لینی عبادت الٰہی نہیں؟

بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

غزل

رونقِ فصلِ بہار دیکھیے کب تک رہے
پھول سرِ شاخسار دیکھیے کب تک رہے
چشمِ جہاں اشکبار دیکھیے کب تک رہے
خلق مری سوگوار دیکھیے کب تک رہے
سوزِ جگر برقرار دیکھیے کب تک رہے
آہ مری شعلہ بار دیکھیے کب تک رہے
صبر نہ میرا شریک، ضبط نہ میرا شریک
دل پہ مجھے اختیار دیکھیے کب تک رہے
سرمۂ چشمِ جمال بن نہ سکی آج تک
خاک میری بے وقار دیکھیے کب تک رہے
عزم و یقیں کیا کریں دل نہ اگر ساتھ دے
عہدِ جنوں پائدار دیکھیے کب تک رہے
سعدی و حافظ کے بعد مومن و غالب کے بعد
سازِ غزل نغمہ بار دیکھیے کب تک رہے
اس کی سرشت اور کچھ اُس کی سرشت اور کچھ
گُل سے ہم آہنگ خار دیکھیے کب تک رہے
ہو نہ سکا کامگار کوئی تقاضائے شوق
غیرتِ دل شرمسار دیکھیے کب تک رہے
چشمِ خطا پوش نے ساتھ تو کافی دیا
اب یہ میری پردہ دار دیکھیے کب تک رہے
جلوہ گرِ ناز میں چشمِ نظارہ طلب
فرشِ رہِ انتظار دیکھیے کب تک رہے
یوں تو منوّر مجھے عمرِ ابد ہے نصیب
شعر مری یادگار دیکھیے کب تک رہے



غزل

میں ہوں مانی تو ارژنگ — اپنا روغن اپنا رنگ
تجھ کو ہمایوں تیرے طور — مجھ کو مبارک میرے ڈھنگ
صُلح کے نام پہ کیوں پیکار — امن کے پردے میں کیوں جنگ
یہ بیتابی یہ پھیلاؤ! — اُف رے سمندر اُف رے ترنگ
سکتے میں ہے آج فلک — بھول گیا سارے نیرنگ
راہ کشادہ ہے تو کیا — رہ رووں کے دل ہیں تنگ
کس کے تیکھے تیور ہیں — پھول چمن کے شوخ و شنگ
اُن کی نظروں کے صدباب — مرے دل کی اک فرہنگ
واہ رے اے فنکار جمیل — یہ چہرہ ایک ہے لاکھوں رنگ
لغزشِ پیہم شیوۂ ناز — اور پھر اُس پر عذرِ لنگ
میرا اور تمہارا ساتھ — اُف رے ربطِ شیشہ و سنگ

سب ہیں منوّر اب مے خوار
پھر پینے میں کیوں یہ درنگ

واجدہ تبسم



باپ بیٹا

"ابا میاں۔ پلیز اب تیار ہو بھی چکئے"۔ شمیم نے بے حد پیار سے پکار کر کہا۔

"بس بیٹا ایک منٹ"۔

یہ "ایک منٹ" صبح سے اب تک بیتا ہی نہ تھا، اور اب تین بج رہے تھے، سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ گاؤں سے شہر جاتے ہوئے راستے میں ایک لمبا سا جنگل بھی پڑتا تھا شمیم چاہتا تھا کہ اندھیرا پڑنے سے پہلے ہی اپنے ٹھکانے پہنچ جائے لیکن ابا میاں تھے کہ ان کے کام ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ انہوں نے کیا کم بکھیڑے اپنے پیچھے لگا رکھے تھے۔ بھینس بکری، کتا، بلی، اور پھر چھوٹا موٹا ایک پولٹری فارم۔۔ جاتے جاتے آخر انہیں ان سبھی کا کچھ نہ کچھ بندوبست تو کرنا ہی پڑا۔

"ابا میاں رات ہو گئی تو رفی تنہائی میں گھبرائے گی، پلیز ابا میاں" شمیم نے ایک اور ہانک لگائی۔

"بس بیٹا ایک منٹ"۔۔۔ اور ابا میاں مسلسل جٹے ہی رہے مرادآبادی لوٹا، گلاس، بدھنا، حقہ، بانس کی ٹوکری اور جانے کیا کیا الم غلم ابا میاں کے آگے ڈھیر تھا۔ شمیم زیر لب مسکرائے جا رہا تھا بے چارے سوئیٹ ابا میاں۔ ابھی ان کو پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ سب سامان کس قدر غیر ضروری اور غیر اہم رہ جائے گا جب وہ اس کے شاندار بنگلے میں سیٹل ہو جائیں گے۔ اسی دم ابا میاں مڑے اور ذرا دُبدھے کے ساتھ شمیم سے بولے

"بیٹا یہ چارپائی نہ رکھ لوں؟"

حیرت سے شمیم کی آنکھیں پھیل گئیں "یہ چارپائی ابا میاں! یہ بان کی کھری چارپائی۔۔؟ ارے ابا میاں آپ بھی مذاق کرتے ہیں میں نے تو آپ کے لئے فوم ربر کا بے حد نرم اور شاندار اور ایسا خوبصورت بیڈ تیار کروایا ہے کہ آپ اس پر لیٹتے ہی خوابوں کے جزیروں میں پہنچ جائیں گے۔۔۔۔۔ وہ شاعری پر اتر آیا۔

"اچھا۔۔ وہ ذرا سوگوار سی مسکراہٹ سے بولے: تو جیسا کہے ویسا ہی کر دوں گا۔"

"ہاں ابا میاں۔ بالکل ویسا ہی جیسا میں کہوں۔ اس لئے ابا میاں کہ زندگی بھر میں نے آپ کو تکلیفیں ہی دی ہیں۔ اور سدا آپ پر بوجھ بنا رہا، میری ہی وجہ سے آپ نے زندگی میں کبھی سکھ کا سانس تک نہ لیا۔ اب اللہ نے موقع دیا ہے تو میں بھی دل بھر کر اپنے ارمان نکالوں گا۔ ابا میاں آپ کو اتنا سکھ دوں گا۔ اتنا آرام دوں گا، اتنا آرام دوں گا۔" اس نے بچوں کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا دیئے کہ "آپ زندگی بھر کی ساری کلفتیں بھول جائیں گے۔"

ابا میاں نے اپنا بچے کا سا بھولا بھالا منہ اٹھا کر اس کی باتیں سنیں اور ایک دم ان کا گلا رندھ گیا۔ "نہ بیٹا یوں نہ کہہ۔ کوئی اولاد ماں

باپ پر بوجھ نہیں ہوتی، اولاد تو بیٹا نصیبے والوں کو ہی ملتی ہے اور پھر تجھ جیسی سعادت مند اولاد ـــ" وہ آنسو پونچھنے کے بہانے مڑے ـــ "ذرا مائی خیراں کو دیکھ آؤں۔ . . .

مائی خیراں ایک کونے میں منہ دئیے رو رہی تھیں بوڑھے چہرے پر ملگجے آنسو جھریوں میں سے آڑے ترچھے ہو کر بہہ رہے تھے۔ جب سے شمیم ابا میاں کو لینے آیا تھا اُن کی آنکھ سے آنسو نہ ٹوٹا تھا۔ کوئی پچیس ۲۵ سالوں سے جب سے کہ شمیم کی اماں مری تھیں۔ مائی خیراں ہی نے شمیم کی ماں کے تمام فرائض انجام دئیے تھے ـــ پیٹ میں نو مہینے رکھنے کی ایک ذمہ داری ہی اُن سے چھوٹ گئی تھی ورنہ وہ سچ مچ ہی شمیم کی ماں ہی ہو گئی تھیں شمیم کی امی کے زمانے سے وہ روٹی ڈالنے اور برتن دھونے آتی تھیں لیکن اُن کی اچانک موت نے جیسے سارے کام ہی انکے سر لا ڈالے۔ نوکر اور مالک کا رشتہ اُن میں اور کلیم میاں میں ہمیشہ برقرار رہا ـــ میاں جی کہہ کر ہی انہوں نے سدا ابا میاں کو مخاطب کیا اور نظر جھکا کر بات بھی کی لیکن یہ صرف ابا میاں جانتے تھے کہ ان جھکی ہوئی نگاہوں کے آگے انہیں تو سر جھکا دینا چاہیے ـــ شاید وہ نہ ہوتیں تو شمیم اس مقام پر نہ ہوتا ـــ تھا ہی کیا ـــ لے دے کے دو چھوٹے چھوٹے کھیت ہی تو آمدنی کا ذریعہ تھے۔ لیکن انہوں نے خواب سدا محلوں کے دیکھے تھے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ اور اقتدار کی اعلیٰ کرسی پر براجمان دیکھیں گے ـــ گاؤں میں صرف چوتھی کلاس تک تعلیم ہو سکتی تھی۔ پانچویں سے انہوں نے شمیم کو شہر بھیجدیا۔ فصل خراب ہوتی یا اچھی، وہ کسی نہ کسی طرح اس کے اخراجات کی پابجائی کرتے رہے۔ کبھی انہوں نے شمیم کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا ہے ـــ اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے پہنائے اور ضرورتِ زندگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کا خیال رکھا ـــ جب کبھی شمیم چھٹیوں میں گھر آتا ابا میاں کے لئے جیسے بے موسم ہی بہار آجاتی ـــ مائی خیراں بھی اتنے دنوں کے لئے جیسے اپنے گھر بار کو بھول سی جاتی ـــ لیکن اب کی بار شمیم آیا تو وہ بات ہی نہ تھی ـــ بیچ میں سے اتنے سارے سال کیسے گذر گئے تھے کہ پتہ تک نہ چلا تھا ـــ انہیں ابا میاں کی زبانی سب حالات معلوم ہوتے رہتے تھے ـــ یہ بھی ابا میاں نے ہی بتایا تھا کہ شمیم درجہ بدرجہ بڑھتے بڑھتے اس مقام تک پہنچ گیا تھا جس کے صرف خواب ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ آئی۔ اے۔ ایس کے عہدے پر شمیم کیا پہنچا کہ اچھے اچھوں کی آنکھیں اس کی راہوں میں بچھ بچھ گئیں۔ اور ایک بار، ابھی تھوڑے دنوں پہلے شمیم ابا میاں کو شہر لے گیا تھا، اپنی شادی کے لئے۔ شہر کے سب سے مشہور اور امیر ترین ڈاکٹر کی اکلوتی لڑکی ناہید رفعت سے جس کا بیاہ ٹھہرا تھا جنہوں نے جہیز میں لمبی سی گاڑی کے ساتھ ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ ہر ہر چیز دی تھی۔ ابا میاں اس لئے خوش نہیں تھے کہ ان کے بیٹے کو بے حد روپیہ اور ضرورتِ زندگی کی ہر اعلیٰ سے اعلیٰ چیز بیٹھے بٹھائے ہی مل گئی تھی۔ وہ تو یوں خوش تھے کہ شمیم خوش تھا اور رفعت تھی اتنی پیاری کہ کوئی بھی شوہر اسے پاکر اپنی خوش قسمتی پر ناز کر سکتا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ بے پناہ روپے پیسے نے بھی اسے غرور کا داغ نہ لگنے دیا تھا نوکروں کی پلٹن ہونے کے باوجود وہ شمیم کا ہر کام اپنے ہاتھوں کرنے میں بڑائی سمجھتی ـــ جب شادی بیاہ کے مرحلوں سے فراغت پاکر ابا میاں گاؤں لوٹ رہے تھے تو نئی دلہن ہونے کے باوجود، شرماتے شرماتے اس نے سسر سے کہا بھی کہ ابا میاں اب تو آپ ہمارے ہی ساتھ رہیئے گا، نا ـــ وہاں اکیلے رہ کر آپ کیا کریں گے۔؟ " ـــ تو ابا میاں ہنس کر ٹال گئے تھے ـــ وہ اپنی اس معصوم سی بہو سے کیا بتاتے کہ وہاں وہ اکیلے نہیں ہیں ـــ وہاں اُن کے وہ کھیت ہیں جنہوں نے ان کا اور شمیم کا جیون بدل دیا ہے۔ وہاں اُن کے پالتو جانور ہیں۔ اُن کا آبائی چھوٹا سا گھر ہے جس کا ٹوٹا پھوٹا سامان بھی انہیں اس قدر عزیز ہے۔! پھر مائی خیراں ہے، اس کا میاں جو اُن کا عزیز دوست ہے ـــ مائی خیراں کے بچے ـــ ایک دنیا وہاں اُن کے لئے منتظر رہتی ہے ـــ اور وہ جب گاؤں لوٹ کر آئے تو ایک ایک چھوٹی سی چھوٹی بات انہوں نے خوشی خوشی سب کو بتائی۔ اور اس غم کو بھی انہوں نے نہیں چھپایا کہ شمیم نے اپنی شادی میں مائی خیراں کو نہ بلاکر انہیں کتنا دکھ دیا ہے بھلے ہی اُن کے شوہر کو نہ بھی بلاتا، لیکن مائی خیراں کے تو اُن دونوں پر کتنے احسان تھے لیکن مائی خیراں پر اس بات کا ذرہ برابر بھی ملال یا غم نہ تھا۔ وہ تو بے ح

خوش تھیں کہ چلو شمیم میاں کا گھر بار بس گیا۔ زندگی میں اسی ایک ارمان کے لئے تو لوگ کتنے دکھ سہہ جاتے ہیں۔ بس غم انہیں یہ تھا کہ شمیم میاں کی نوکری شہر میں لگی ہوئی تھی اور بڑھاپے میں بھی کیا میاں جی اولاد سے دور ہی رہیں گے؟ انسان اسی آس پر تو ہر تکلیف جھیل جاتا ہے کہ بڑھاپا سکھ سے گذرے۔ سامنے بہو بیٹے کی پیار بھری زندگی ہو۔ پوتے پوتیوں کی کلکاریاں اور معصوم لڑائی جھگڑے ہوں ـــ لیکن شاید یہ سب کچھ ابا میاں کا مقدر نہ تھا۔

لیکن یہ مائی خیراں کا اپنا بھولپن تھا جو وہ یہ سوچ بیٹھی تھیں، ادھر شمیم ایک لمحے کو بھی یہ بات نہ بھولا تھا کہ ابا میاں تنہا زندگی کیسے گذار پائیں گے۔ اس سے پہلے وہ دو بار اور بھی گاؤں آیا تھا۔ ایک بار آیا تو یہ دیکھ کر اس کا جی دکھ کر رہ گیا کہ ابا میاں نے بلا ضرورت ہی مرغیاں پال رکھی ہیں۔ اس نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"ابا میاں ـــ میرے خیال سے آپ کو روپے پیسے کی تو اب کوئی تکلیف ہی نہیں ہے۔ یہ آپ نے اپنی جان کو بکھیڑے کیوں لگا رکھے ہیں" وہ ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "ارے بیٹا خالی وقت پڑے پڑے کس طرح کاٹوں چلو مرغیاں ہی پال لیں۔"

شمیم نے بڑے غم سے انہیں دیکھا، ـــ وہ بڑبڑا سے گئے۔ "ارے بیٹا تو اس طرح اداس کیوں ہو گیا ـــ پہلے مجھے بڑی فکر لگی رہتی تھی کہ شمیم بیٹے کے لئے یہ کرنا ہے۔ شمیم بیٹے کے لئے وہ کرنا ہے۔ سارا وقت ایسے ہی گذر جاتا تھا، اب . . . . وہ چپ سے ہو گئے۔ . . وقت کاٹے نہیں کٹتا۔

"تو ابا جان آپ میرے ساتھ شہر چلئے نا ـــ مائی خیراں نے زندگی بھر ہم دونوں کے لئے جو کچھ کیا اس کا بدلہ تو خیر کسی طرح ادا ہو ہی نہیں سکتا لیکن آپ اپنے چھوٹے موٹے کھیت انہیں دے کر کسی طرح خوشی تو حاصل کر سکتے ہیں نا ـــ ؟ آپ خود سوچئے کیا مجھے اچھا لگتا ہوگا کہ زندگی بھر جس باپ کو اپنی وجہ سے تکالیف دیں، بڑھاپے میں بھی سکھ نہیں دے سکتا؟" "

"میں شہر چلا جاؤں ـ؟" ابا میاں بے حد حیرت سے بولے۔

"کیوں کیا آپ مجھ سے زیادہ کسی اور کو چاہ سکتے ہیں۔" شمیم ذرا برا مان کر بولا ـــ

"نہیں بیٹا تجھ سے زیادہ پیارا مجھے کون ہوگا ـــ لیکن مجھے یہ سوچتے بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ میں اپنے گاؤں کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔"

شمیم ایسا بھی کچھ جذبات سے عاری نہ تھا کہ ابا میاں کے احساسات کو سمجھ ہی نہ پاتا ـــ لیکن وہ چپ نہ رہ سکا ـــ اس سے اگلے چکر میں بھی وہ یہی سب دہرا گیا ـــ پھر ایک بار رقی بھی آئی ـــ ابا میاں پھر بھی راضی نہ ہوئے ـــ ادھر دل بہلانے کو انہوں نے طوطے سے لے کر بلی بکری تک سبھی کیا کیا الا بلا پال رکھا تھا ـــ اس سے پہلے چکر میں شمیم آیا تو کار دور ہی کھڑی کر کے وہ چپکے سے گھر میں چلا آیا۔ دیکھے تو سہی ابا میاں خالی وقتوں میں کرتے کیا ہیں ـــ کچھ بھی نہیں گھر کے پچھواڑے بڑے انہماک سے وہ کیاریاں بنا رہے تھے۔ اور پاس کھڑے کتے سے باتیں کئے جا رہے تھے

"اب اس میں جو ٹماٹر لگیں گے نا موتی یہ اتنے بڑے بڑے ہوں گے ـــ ایک ٹوکرے میں جمع کر کے پھر ہم شہر بھجوائیں گے شمیم بیٹا کے لئے ـــ ایں ـــ یہ ہے نا؟ اور کدو تو شمیم کھاتا ہی نہیں۔ بھلیاں البتہ اسے بہت بھاتی ہیں۔ . . . .

شمیم روہانسا ہو گیا ـــ پیچھے سے جا کر اس نے ابا میاں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "ابا میاں آپ کو میری قسم اگر آپ میرے ساتھ شہر نہ چلے . . . .

اور پھر قسم کے آگے ابا میاں کا کوئی بس نہ چلا . . .

سب سامان کار کی ڈکی میں لد چکا تھا۔ ابا میاں بڑی خالی خالی نظروں سے کھڑے گھر بار کا جائزہ لے رہے تھے ـــ شمیم نے گھر کی چابی مائی خیراں کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

"مائی اب یہ سب اپنا ہی سمجھو اور خدا کے لئے رو نہیں۔"

مائی خیران کچھ نہ بولیں ـــ روئیں بھی نہیں۔ ابا میاں اپنے گھر بار

کو بڑی بے بس نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے کہ کار دھول کا بادل اڑاتی کچی سڑک پر دوڑ گئی۔

لوگ اسی لئے تو اولاد کی آس کرتے ہیں۔ ابا میاں اب کے گاؤں سے آئے تو بھی کچھ بدلا بدلا سا پایا۔ اس سے پہلے وہ صرف مہمان کی حیثیت سے آئے تھے اب کے شمیم انہیں یوں لایا تھا کہ واپسی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اسی لئے باغ کی طرف کونے کا ہوادار کمرہ ابا میاں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ایک خدمت گار صرف ابا میاں کی خدمت کے لئے مخصوص تھا۔ گاؤں میں صبح سویرے منہ دھو کر ابا میاں خود اپنے ہاتھوں دہی بلو کر لسی کا بڑا گلاس پیتے تھے۔ یہاں صبح ہی صبح خدمتگار چائے کی ٹرے لے حاضر رہتا۔ حقہ ساتھ آیا تو تھا۔ لیکن شمیم نے ایک سے ایک بڑھیا ٹین سگرٹوں سے بھرے ہوئے ابا میاں کے لئے لا کر سجا دیئے تھے۔ ادھر ایک منٹ کی کمی بیشی کے بغیر ناشتہ، تلے ہوئے انڈے۔ سینکے ہوئے مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ کے ساتھ بل جاتا۔ کوکو۔ اولٹین، کافی الگ۔ جیسا شمیم کا عہدہ اعلیٰ تھا ویسا ہی رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ ایک بجتے ہی ڈنگ ڈونگ بل بجتی اور خدمتگار ابا میاں کو ڈائننگ ہال میں پہنچا دیتا۔ شمیم بھی "لنچ آور" میں گھر آیا ہوتا وہ باپ کے آگے بچھ بچھ جاتا۔ ابا میاں بے چاروں نے زندگی بھر لہسن کی چٹنی، کچھ پیازیں، ہری مرچیں، موٹی روٹیوں کے ساتھ لسی کے گھونٹوں سے اندر کی تھیں۔ شمیم انھیں سوپ پیش کرتا۔ ایک سے ایک مرغن کھانے، پھر چار بجے کی چائے۔ پھر ذرا ٹھنڈا وقت ہوتا تو باوردی شوفر "صاحب" کے حکم پر "بڑے صاحب" کو شہر گھمانے سیر کرانے لے جاتا۔ شمیم نے نوٹوں سے بھرا ایک پرس ابا میاں کی جیب میں رکھ دیا تھا۔ ممکن ہے شہر میں کوئی چیز پسند آجائے اور وہ پیسہ نہ ہونے کے کارن ترس کر رہ جائیں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ابا میاں کی سی بزرگ شخصیت کو کبھی اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی شرمندگی اٹھانی پڑے! رات کا کھانا بھی اسی اہتمام سے ہوتا۔ رات کو سوتے وقت دودھ اور ڈرنکنگ چاکلیٹ سے بھرا لمبا سا گلاس میز پر اُن کا منتظر ہوتا۔ آفس جاتے وقت، اور لوٹ کر آنے کے بعد، ہر بار شمیم کا معمول تھا" بے حد محبت سے آکر پوچھتا

"ابا میاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ——"؟

ابا میاں معصوم سی گول گول آنکھوں سے بیٹے کو دیکھتے اور ہڑبڑا سے جاتے —"تکلیف" —؟ ارے کاہے کی تکلیف بیٹا۔ تم نے تو مجھے بادشاہوں کا سا راج عطا کر دیا ہے۔"

شمیم کا سینہ محبت اور فخر سے پھول جاتا۔ زندگی میں اس کی بدولت ابا میاں نے جو جو تکالیف اٹھائی تھیں بالآخر اس کا ازالہ اس نے کر ہی دیا تھا۔!!

لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ شمیم کو ایک دکھ بھی تھا۔ پہلے وہ جب کبھی گاؤں جاتا تھا دیکھتا تھا کہ ابا میاں بوڑھے ہونے کے باوجود چہکتے ہنستے پھرتے ہیں۔ ہنسی، مذاق، دل لگی دل کھول کر اونچے اونچے قہقہے —— یہاں آکر جیسے وہ ہنسنا ہی بھول گئے تھے۔ ممکن ہے انھیں رتی سے کوئی شکایت ہو۔ لیکن اتنا تو وہ بھی دیکھتا تھا کہ رتی ان کا اتنا ہی خیال رکھتی تھی جتنا کوئی بیٹی اپنے باپ کا رکھ سکتی ہے۔ ایکدم شمیم کو اپنی غفلت کا احساس ہوا۔ ارے ممکن ہے ابا میاں کو کوئی بیماری ہو اور کس قدر افسوس کی بات ہے کہ میں نے آج تک اُن کا میڈیکل چیک اپ تک نہیں کروایا —— فوراً ٹیلیفون کر کے ڈاکٹر کو بلایا گیا —— زبان، آنکھیں، ناخون، ہونٹوں کی رنگت کا معائنہ ہوا، بلڈ پریشر چیک کیا گیا۔ بخار لیا گیا اور بستر کے بازو ایک چھوٹی سی ٹیبل پر دواؤں کا انبار لگ گیا۔ آتے جاتے وہ نرس کو ہدایت کرتا۔

"ابا میاں کا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو وہ دوا پینا بھول جائیں"

پندرہ روپے روزانہ کی نرس دن میں کئی کئی مرتبہ اُن کا منہ زبردستی کھول کر کڑوی، کسیلی دوائیں بھرتی —— شمیم کو بڑا دکھ تھا کہ کبھی رات کو وہ ابا میاں کے کمرے کے پاس سے گذرتا تو دیکھتا کہ اپنے انتہائی نرم آرام دہ اور فوم ربر کے بستر پر بھی وہ کچھ بے چین بے چین سے ہیں۔" اے خدا میں ابا میاں کو کس طرح آرام دوں۔" وہ بڑے

دکھ کے ساتھ سوچتا۔

اُس دن کلب میں ڈنر پارٹی تھی۔ شمیم اور رقی نرس سے ہدایت کر گئے تھے کہ ابا میاں کا پورا خیال رکھے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی اتفاقاً نرس کو کہیں سے کال آیا۔ فون ریسیو کر کے وہ قدرے گھبرائی ہوئی سی ابا میاں کے پاس آئی اور بولی۔

"میرے بچے کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے صاحب۔ اگر آپ کی طبیعت بہتر محسوس ہو رہی ہو تو میں ۱۔ ۲ گھنٹوں کے لئے گھر ہو آؤں"

ابا میاں نے بڑی محبت اور خوشی سے اُسے اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر بعد ابا میاں نے اپنے خاص خدمت گار کو بلا کر اُسے پیسے دے کر حکم دیا کہ شہر سے فلاں فلاں دوا خرید لائے —— خدمت گار کے جاتے ہی انہوں نے چوروں کے سے انداز میں ادھر اُدھر جھانکا۔ پھاٹک پر دربان پہرہ دے رہا تھا۔ کچن میں خانساماں کے گنگنا گنگنا کر پکانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پرلی طرف مالن، دھوبن اور برتن دھونے والیوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ ابا میاں نے بڑی خوشی سے یہ بات نوٹ کی کہ اتفاقاً ان کے کمرے کی جو کھڑکی باغ میں کھلتی ہے اس میں سلاخیں نہیں ہیں اور یہ کہ باغ میں کود کر جنگلا لانگ کر مزے سے فرار ہوا جا سکتا ہے —— آنکھیں بند کر کے اور اللہ کا نام لے کر انہوں نے باغ میں چھلانگ لگا دی ——

صاحب اور میم صاحب کی واپسی پر بنگلے میں کھلبلی مچ گئی —— یہاں، وہاں، ادھر اُدھر، اندر باہر، کہیں بڑے صاحب ہوتے تو ملتے! ہر ہر نوکر سے باز پرس کی گئی۔ نرس کو ڈانٹا۔ ڈپٹا گیا۔ لیکن بڑے صاحب کا کوئی پتہ نہ چلا — رقی تو روہانسی ہو رہی تھی۔

"و پولیس میں رپورٹ نہ کر دیں شمیم —"

اک دم شمیم کچھ سوچ کر بولا —" ڈرائیور گاڑی نکالو ——
اور تیزی سے پلٹ کر بولا —— آؤ رقی گاؤں چلیں۔"

گاؤں سے شہر کا فاصلہ ہی ایسا کتنا تھا۔؟ گھر سے کافی دوری پر گاڑی رکوا کر شمیم نے رقی کا ہاتھ تھاما اور آہستگی سے گھر کی جانب چلا —— دور سے شمیم نے دیکھا کہ ابا میاں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے، اونچے اونچے قہقہے لگا رہے ہیں۔ ہاتھ میں حقے کی نے تھام رکھی ہے۔ سامنے ہی تام چینی کی رکابی میں ادھ کھائی مرچیں اور پیاز کے چھلکے پڑے ہوئے ہیں۔ گویا ابھی ابھی خاصہ تناول فرمایا گیا ہو —— لسی کا گلاس اوندھا پڑا ہوا تھا۔ جس میں سے لسی کے چند قطرے زمین پر گرے پڑے ہوئے تھے۔ شمیم نے سنا

" او مائی خیراں تجھے معلوم ہے کہ دوپہر میں شمیم مجھے کیا کھلاتا تھا؟ برتنوں کی دھوون جیسا شوربہ جس کو وہ سوپ کہتا تھا۔ ہاہاہا۔ اور رات کو سوتے وقت چاکلیٹ —— جیسے میں بچہ تھا . . . اور صبح ہی صبح ملک الموت کی طرح بیرا میرے لئے چائے لے کر کھڑا رہتا تھا —— ہاہاہا . . . نہ کوئی کام نہ دھام بس پڑے رہو توبہ . . .

مائی خیراں، ان کے شوہر ان کے بچے بڑی حیرت سے ساری باتیں منہ کھولے سن رہے تھے۔ کتا، بلی ان کے قدموں میں لوٹ رہے تھے۔ مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ طوطا —"میاں جی آداب عرض ہے" کی رٹ لگائے تھا اور میاں جی ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے ——

جو مزہ کھری بان کی چارپائی میں ہے وہ جھاگ ایسے نرم گدوں میں کہاں سے آئے بھلا — کم بخت جسم ڈوب کر رہ جاتا ہے کہ کروٹ تک بدلنا نہ آئے" —— اور وہ مزے سے ہاتھ پاؤں پھیلا کر کھری بان پر لیٹ گئے ——

شمیم نے نرمی سے رقی کا ہاتھ تھاما اور کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ کچی سڑک پر دھول اُڑاتی گاڑی شہر کی طرف دوڑ گئی۔

تصحیح: نومبر ۷۰ء کے شمارے میں اظہر افسر صاحب کا ڈرامہ "سرخی اُن ہونٹوں کی" شائع ہوا ہے۔ سہواً ان کا نام درج ہونے سے رہ گیا ہے قارئین تصحیح کر لیں۔



صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین میلے
میں رکھی ہوئی کتابیں دیکھ رہے ہیں۔ ان
کے ساتھ نیشنل بک ٹرسٹ کے چیرمین ڈاکٹر
بی۔ وی کیسکر کھڑے ہیں۔

----

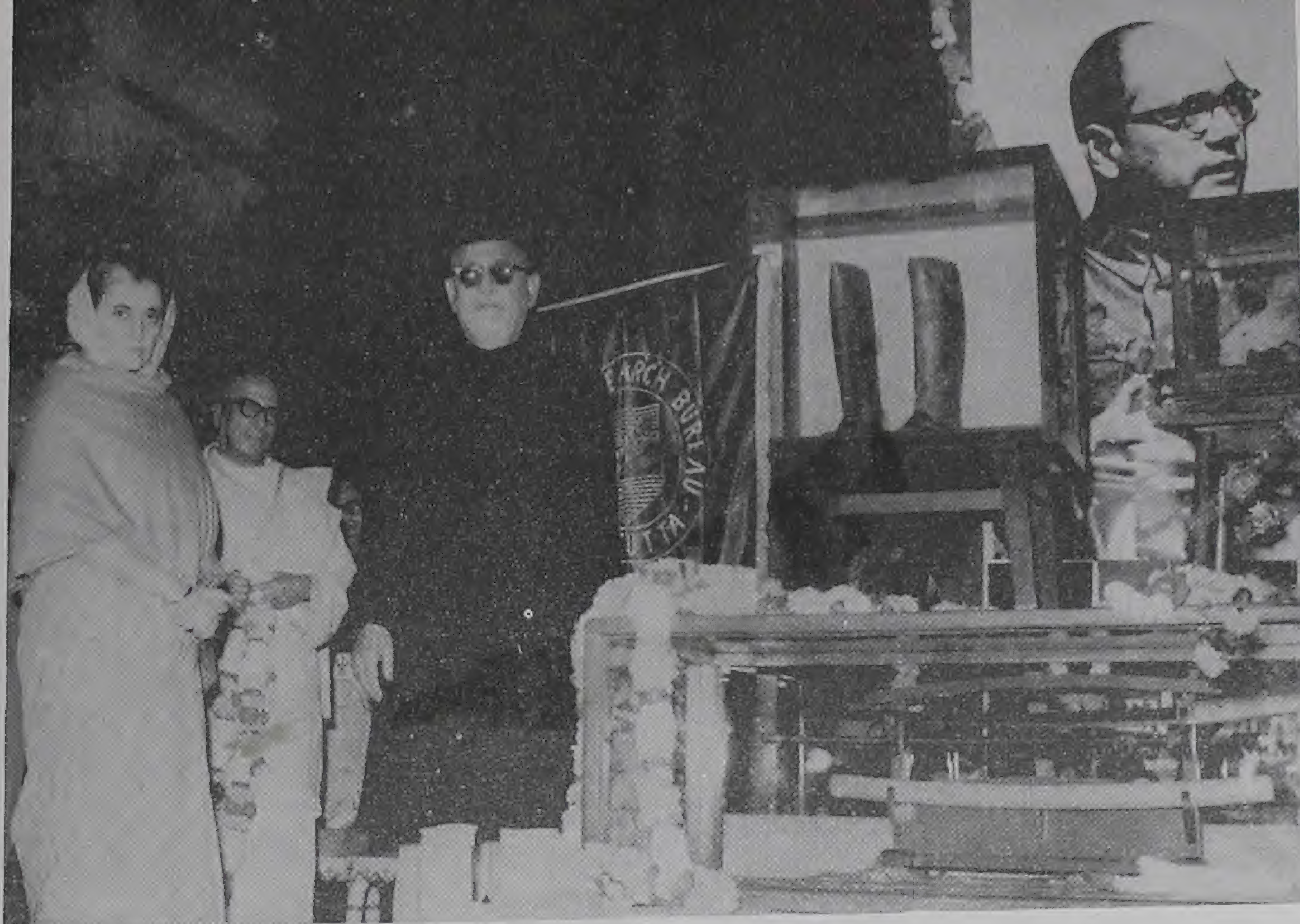
۱۷ دسمبر ۱۹۶۷ء کو صدر جمہوریہ ہند
ڈاکٹر ذاکر حسین نے قومی کتابوں کے
دوسرے میلے کا افتتاح کیا۔ اس موقع
پر تقریر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند
نے عوام سے اپیل کی کہ وہ زبان کے بیکار
اور بے معنی تنازعے کو ختم کرکے زبانوں
کی ترقی کی جانب توجہ دیں۔
اس میلے میں ملک کی دس ہزار کتابوں کی
نمائش کی گئی۔ اس میلے کا انعقاد نیشنل بک
ٹرسٹ کی طرف سے کیا گیا تھا۔



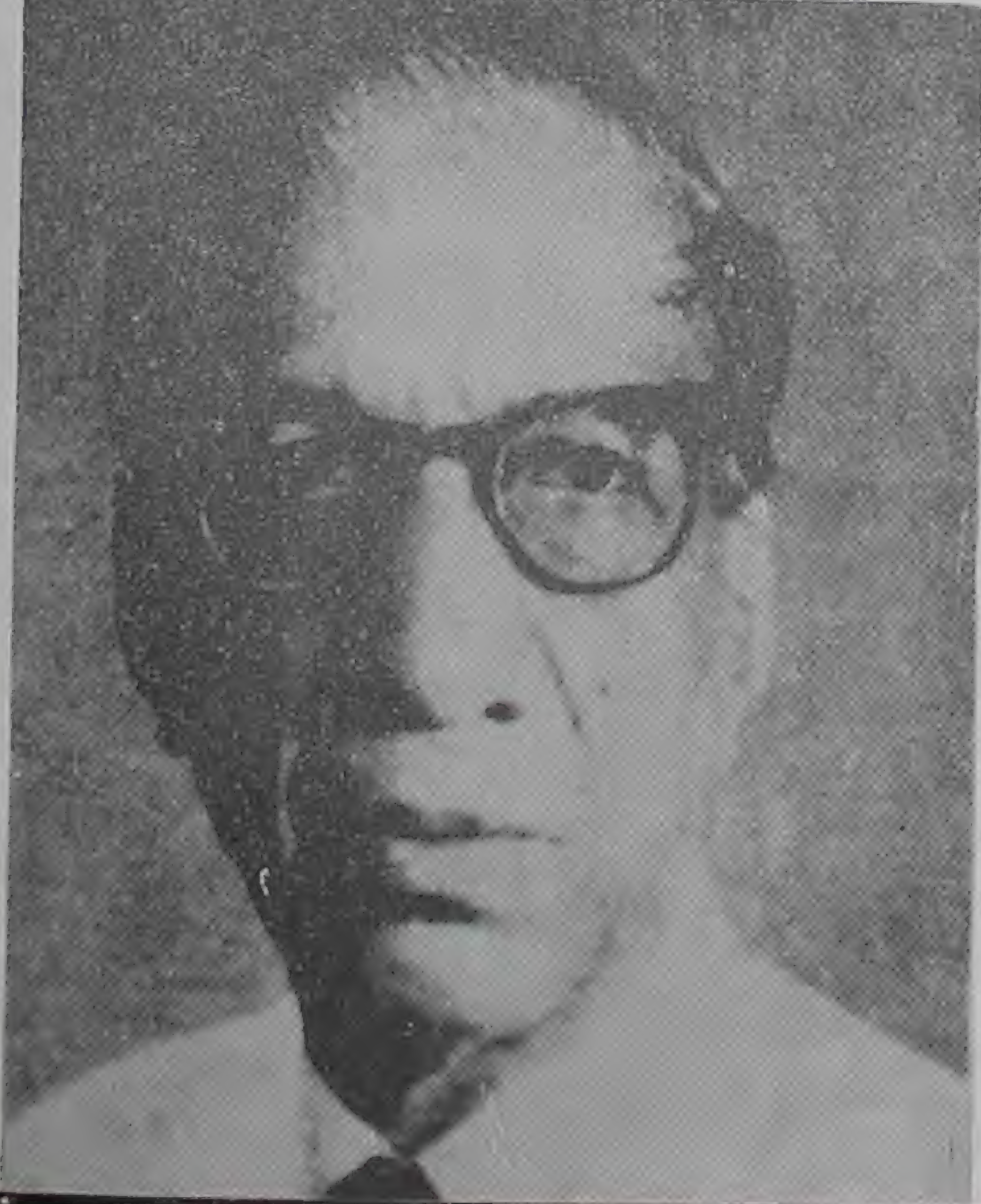
اُردو کی مشہور افسانہ نگار اور
ناول نویس قرۃ العین حیدر
اور ہندی کے مشہور ادیب اور
ناول نویس امرت لال ناگر

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے
مجموعے "پت جھڑ کی آواز"
اور امرت لال ناگر کے ناول "امرت
اور وِش" پر ساہتیہ اکادمی نے
۵ ہزار کا انعام دیا ہے۔





۱۷ دسمبر کی شام کو نیتاجی سبھاش چندر بوس کی تاریخی تلوار "شانِ ہند" دہلی لائی گئی۔ ریلوے اسٹیشن پر ہزارہا افراد نے اس عظیم یادگار کا پرجوش سواگت کیا۔ ہندوستان کے اس بہادر سپوت کی اس بیش بہا یادگار کو اُن کی ٹوپی اور بوٹوں کے ساتھ ایک شیشے کے بکس میں سجا کر لال قلعہ لایا گیا۔ جہاں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین، وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی، نائب صدر جمہوریہ شری وی وی گری اور دیگر رہنماؤں نے اس پر پھول مالائیں چڑھائیں اور ہزاروں افراد کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کیا۔



۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ کو اُردو اور ہندی کے مشہور ادیب مہاشہ سدرشن کا بمبئی کے ایک اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ آپ منشی پریم چند کے ہم عصر تھے اور اُن کی طرح آپ نے بھی ادبی زندگی کا آغاز اُردو میں کیا تھا اور بعد میں ہندی میں لکھنے لگے۔

شری سدرشن ۱۸۹۵ میں سیالکوٹ (مغربی پاکستان) میں پیدا ہوئے اوائل عمر ہی میں وہ اُردو میں مضامین لکھنے لگے تھے۔ بعد ازاں ان کا شمار صفِ اول کے کہانی لکھنے والوں میں ہونے لگا انہوں نے ہندی اور اردو میں بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ کہانیوں کے علاوہ انہوں نے ڈرامے اور گیت بھی لکھے ۱۹۳۲ سے وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اُن کی موت اُردو اور ہندی کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔

آج کل دہلی



۱۱ دسمبر ۱۹۶۷ء کو ہند کے سابق چیف جسٹس شری مہر چند مہاجن چنڈی گڑھ میں انتقال کر گئے۔ وہ ۹ دسمبر کو چنڈی گڑھ میں پنجاب یونی ورسٹی کی سنڈیکیٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے گئے تھے۔ ۱۰ دسمبر کو اچانک انہیں دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے

شری مہاجن ۲۳ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ضلع کانگڑہ کی تحصیل نور پور کے ایک گاؤں ٹکا نگروٹہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورداسپور میں وکالت شروع کی۔ اور بعد ازاں لاہور چلے گئے جہاں جلد ہی ان کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ ۱۹۴۳ء میں آپ پنجاب ہائی کورٹ کے جج مقرر کئے گئے اور ہندوستان کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں سپریم کورٹ کے جج بنا دیئے گئے بعد میں وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں آپ اس جلیل القدر عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

اُن کی موت ایک نا قابلِ تلافی نقصان ہے۔ ہندوستان ایک قابل جج، آدرش وادی انسان اور عظیم سماجی مصلح سے محروم ہوگیا ہے۔

◀ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے نامور کلاکار پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر کا ۲۹ دسمبر کو بمبئی کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ لگ بھگ تین برس سے فالج کا شکار تھے۔

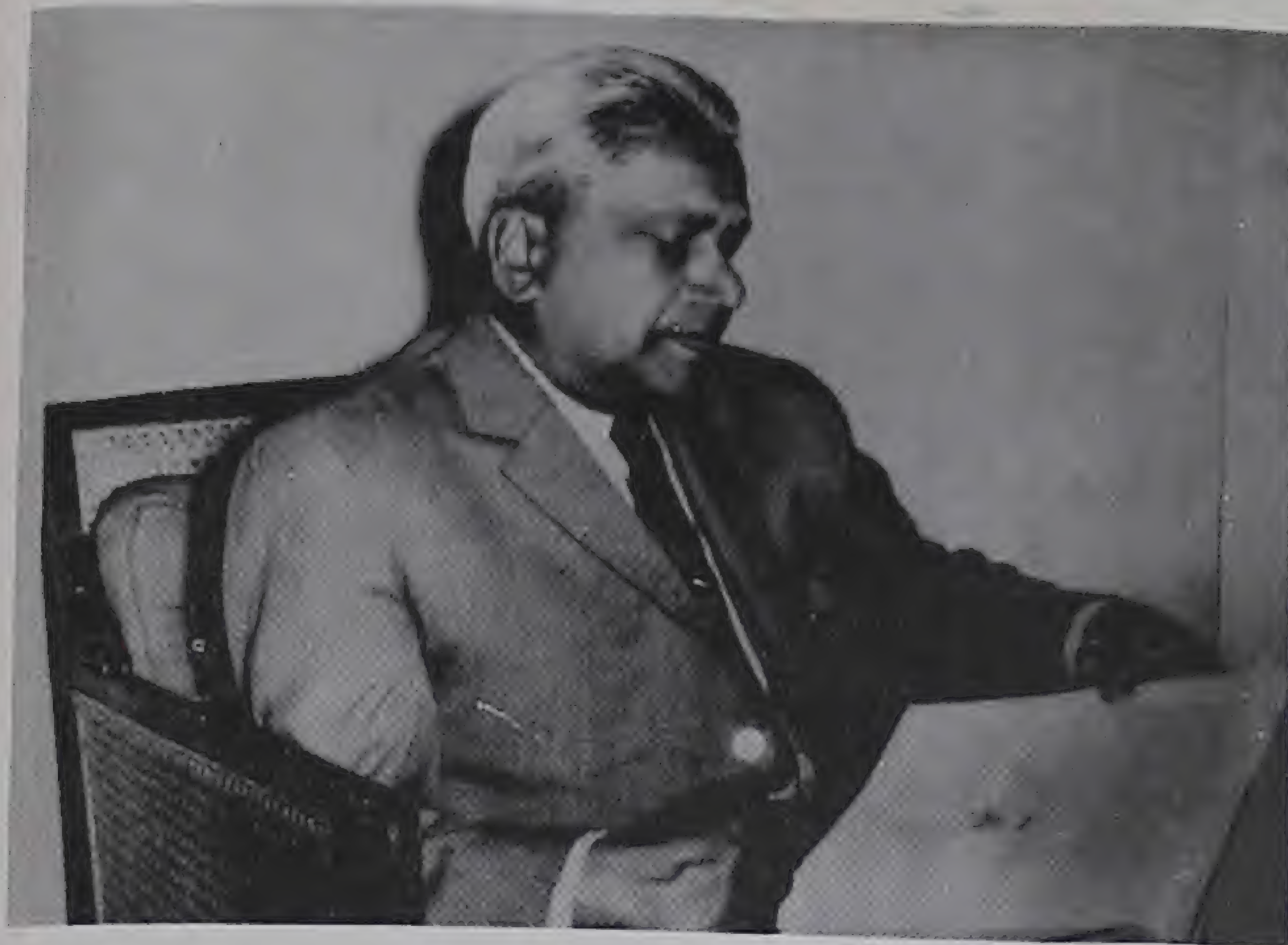
پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر دورِ جدید کے چند عظیم موسیقاروں میں سے تھے ان کی پاٹ دار آواز اور عظیم شخصیت ۵۰ برس تک موسیقی کے میدان پر چھائی رہی۔

اُن کی پیدائش سورت کے نزدیک واقع قصبہ بروچ میں ہوئی تھی وہ اوائل عمر میں ہی موسیقی میں دلچسپی لینے لگے اور مشہور موسیقار پنڈت وشنو دگمبر پلسکر کے شاگرد بن گئے۔ بہت جلد ان کا شمار چوٹی کے موسیقاروں میں ہونے لگا۔

کچھ عرصہ ہوا انہیں سنگیت ناٹک اکیڈمی کا ایوارڈ ملا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے انہیں پدم شری کا خطاب دیا تھا وہ بنارس ہندو یونی ورسٹی کے فائن آرٹس میوزک کالج کے بانی اور پہلے پرنسپل تھے۔

اُن کے انتقال سے ہندوستان ایک عظیم موسیقار سے محروم ہوگیا ہے۔

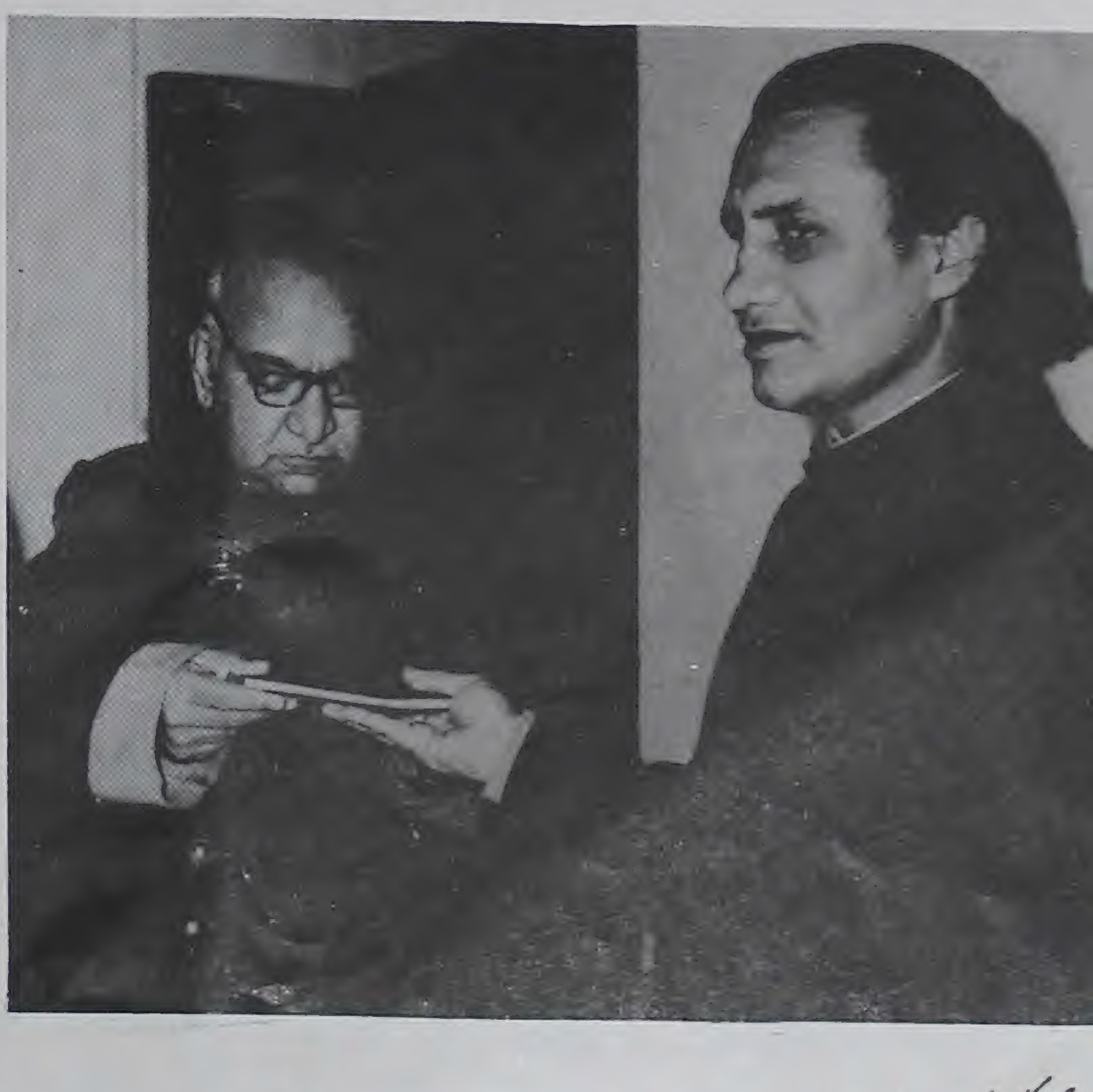




۱۳ دسمبر ۱۹۶۷ء کو مارلیشس کے وزیر اعظم سر سو ساگر رام غلام ہندوستان کے ایک ہفتے کے دورے پر نئی دہلی تشریف لائے۔ اگرچہ وہ اس سے پیشتر بھی یہاں تشریف لا چکے ہیں مگر اُن کا حالیہ دورہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ ان کا ملک آئندہ مارچ میں برطانوی اقتدار سے آزاد ہو جائے گا۔ وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے انھیں یقین دلایا ہے کہ ہندوستان مارلیشس کی تعمیر و ترقی میں ہر طرح کی امداد کرے گا۔

مارلیشس جزیرہ ہندوستان سے ۲۴۰۰ میل کی دوری پر واقع ہے اس کی اہم ترین صنعت شکر سازی ہے اس جزیرے کو ۱۲-۱۵۰۷ء کے درمیان پرتگیزیوں نے دریافت کیا تھا لیکن سب سے پہلے (۱۵۹۸ء) اس میں آباد ہونے والے ڈچ تھے۔ بعد ازاں جب ۱۷۱۵ء میں اس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کیا تو ان لوگوں نے اسے خیرباد کہہ دیا۔ —— ۱۸۱۰ء میں انگریزوں نے اس جزیرے پر قبضہ کر لیا تھا اور اب تک وہ انہیں کے زیر اقتدار ہے۔ مارلیشس جزیرے کا رقبہ ۷۲۰ مربع میل ہے اور اس کی آبادی لگ بھگ ۸ لاکھ ہے۔ اس میں سے ۷۵ فیصدی آبادی ہندوستانی نسل کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ جن کے آباؤ اجداد اپنی روزی کمانے کے لئے وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ خود وزیر اعظم رام غلام کے بزرگ بہار سے ہجرت کر کے وہاں آباد ہوئے تھے۔ ہندوستان نے اس ملک کی ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا ہے۔

••••••••••••••••••



۱۱ دسمبر ۱۹۶۷ء کو اُردو کے مقبول شاعر نریش کمار شاد کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر مجلس اشاعت ادب کی جانب سے جشنِ شاد منایا گیا اس تقریب کی صدارت اُردو کے ممتاز شاعر جناب عرش ملسیانی نے کی جشن کا افتتاح کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب نے کیا۔ اس موقع پر عرش ملسیانی نے نریش کمار شاد کو مجلس اشاعتِ ادب کی جانب سے شائع کردہ کتاب "شاد اور اس کی شاعری" کی ایک جلد پیش کی۔

وجاہت علی سندیلوی

غالب کا غیر متداول کلام

ماہنامہ "آج کل" کے فروری ۶۷ء کے شمارے میں عبدالرشید صاحب نے اپنے مضمون "دیوانِ غالب کی دو قدیم شرحیں" کے آخر میں مجھے ایک بڑا پُرخلوص اور دلچسپ مشورہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"آخر میں مصنف نشاطِ غالب کی خدمت میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ غالب کے مطبوعہ دیوان کے علاوہ اُن کے غیر متداول اشعار کی نشر و اشاعت اور اُن کی تشریح و ستائش میں اگر مزید کاوش فکر نہ فرمائیں گے تو غالب بلکہ اُردو ادب پر اُن کا احسان ہوگا۔ مرزا غالب نے اپنے ابتدائی کلام کا بیشتر حصہ جو بیدل کے طرز میں نہایت پیچیدہ اور بعید از فہم ہو گیا تھا اپنا دیوان مرتب کرتے وقت مسترد اور اپنے دیوان سے خارج کر دیا تھا۔ مطبوعہ دیوان کے دیباچہ میں مرزا نے اس غیر مطبوعہ کلام کے متعلق لکھا ہے "ہرچہ جز این است از آں بندہ نشمارند" غالب کے اس اعلان کے بعد اُن کے غیر متداول کلام کی تعریف و توصیف کرنا گویا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ غالب کو خود اپنے اچھے کلام کی خبر نہ تھی۔"

جہاں تک غالب کے غیر متداول کلام کی نشر و اشاعت اور تشریح و ستائش کا تعلق ہے اس کے لئے مجھے مخصوص طور سے موردِ الزام قرار دینا عجب ہے کہ میں نے آج تک سوائے چند منتخب غیر متداول اشعار کے مطالب بیان کرنے کی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ مجھے غیر ضروری اور غیر معمولی اہمیت دینا ہے۔ مفتی انوار الحق صاحب نے نسخۂ حمیدیہ جسے غالب کے غیر متداول کلام کا ذخیرہ کہنا چاہیے شائع کیا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے اپنی مشہور کتاب "غالبِ نامہ" میں غیر متداول کلام کا انتخاب پیش کیا۔ مالک رام صاحب نے اپنے مرتب کردہ دیوان میں غیر متداول کلام کا انتخاب شامل کیا۔ جعفر علی خاں اثر صاحب نے اپنی کتاب مطالعہ غالب میں غیر متداول اشعار کا انتخاب اور اس کے بعض اشعار کی تشریح پیش کی۔ امتیاز علی عرشی صاحب نے سارے غیر متداول کلام کو جمع کر کے دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) مرتب کیا۔ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور اور احتشام حسین صاحب نے غالب پر اپنے تنقیدی مضامین میں اکثر جا بجا اُن کے غیر متداول اشعار کے حوالے دیے ہیں۔ کہاں تک نام گناؤں دیوانِ غالب کے بیسیوں اڈیشنوں میں مختلف مرتبوں نے غیر متداول دیوان کے منتخب اشعار شائع کئے ہیں۔ عبدالباری آسی صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کے پورے غیر متداول کلام کی شرح لکھ کر بہت مدت ہوئی شائع کرا دی تھی۔ پھر جب ایسے جلیل القدر حضرات کے نام سرِ فہرست نظر آ رہے ہوں تو صرف میرے لئے کوئی حکم امتناعی جاری کرنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

اپنے خلاف ایک طرفہ فیصلہ کئے جانے کے باوجود میرا خیال ہے کہ عبدالرشید صاحب کا یہ مشورہ کہ غالب کے غیر متداول کلام کی نشر و اشاعت اور تشریح و ستائش نہ کی جانی چاہئے صرف نیک نیتی اور غالب سے خوش عقیدگی پر مبنی ہے کیوں کہ اُن کی رائے میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ غالب کو خود اپنے اچھے کلام کی خبر نہ تھی ورنہ وہ خود اس کے قابلِ ستائش جزو کو اپنے منتخب دیوان میں کیوں نہ شامل کر لیتے؟ اور اس طور سے اُن کے زاویہ نگاہ سے غالب کی سخن سنجی پر جو حرف آتا ہے وہ اس کو کسی طور سے گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

میں مودّبانہ عرض کروں گا کہ یہ مفروضہ کہ کسی شاعر یا ادیب کا خود اپنی تخلیقات کا انتخاب ہمیشہ صحیح اور درست ہوتا ہے اور اس سلسلے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کے متعلق بہت سے نقادانِ فن کے مقالے اور مقولے ہمارے پیش نظر ہیں۔ شاعر اور ادیب کی طرح ایکٹر بھی ایک فن کار ہوتا ہے جو اپنے کردار کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود اپنی ایکٹنگ کے متعلق اتنی صحیح رائے قائم کر سکے جتنی کہ اس کے ناظرین۔ آل احمد سرور صاحب غالب کے بہت بڑے مدّاح ہیں۔ انہوں نے دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) کی تقریب میں لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے۔ "غالب بڑے باشعور شاعر ہیں مگر وہ بھی اپنے بہترین اشعار کا انتخاب نہیں کر سکے ہیں جس طرح نسخۂ حمیدیہ کے سو ڈیڑھ سو اشعار دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئے اسی طرح انتخابِ غالب (رام پور) میں بھی متعدد ایسے اشعار درج نہیں ہو سکے جنھوں نے غالب کو غالب بنایا" قریب قریب یہی شکایت شیخ محمد اکرام صاحب کو بھی ہے۔ چناں چہ غالب نامہ میں اس بات پر افسوس کیا ہے کہ غیر متداول کلام کے بعض بلند پایہ اشعار منتخب دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئے۔

یہ سمجھنا کہ اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات کا صحیح انتخاب نہیں کر پاتا تو اس کی سخن سنجی پر حرف آجاتا ہے محض ایک واہمہ ہے اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کسی ادب پارے کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے لئے کوئی میکانکی اصول یا معیار تو مقرر کیا نہیں جا سکتا اس کا تعلق ذوقِ سلیم اور وجدان سے ہوتا ہے جس کے پس پشت سینکڑوں محرکات غیر شعوری طور سے کارفرما ہوتے ہیں اور وہ بہت سے انسانوں میں کیا کسی دو میں بھی بالکل یکساں نہیں ہو سکتے بلکہ کسی ایک انسان میں بھی ہمہ وقت یکساں نہیں رہ سکتے۔ پھر ایسی صورت میں اگر کوئی شخص کسی شاعر کے متعلق یہ کہہ دے کہ اس نے اپنے منتخب کلام میں اپنے کچھ اشعار چھوڑ دئے یا ان سے کم تر حیثیت کے اشعار شامل کر لئے اور اس قسم کے اشعار کی تعداد بھی بہت قلیل ہو، تو اس سے یقیناً اس کے شاعرانہ مرتبے اور حیثیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا ہے۔

مثال کے طور پر غالب کے خطوط ہی کے متعلق ملاحظہ کیجئے پہلے پہل جب اُن کے ایک قدردان نے اُن سے فرمائش کی تھی کہ آپ انھیں جمع کر کے چھپوا دیجئے تو غالب نہ صرف راضی نہیں ہوئے تھے بلکہ بُرا مان کر جواب دیا تھا کہ ان کی اشاعت سے میرے "شکوہ سخنوری" کو صدمہ پہنچنے کا احتمال ہے۔ لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے یہ نجی خطوط جو کسی خاص فکر اور توجہ کے بغیر قلم برداشتہ لکھے گئے تھے، اردو ادب پر ایک بہارِ بے خزاں بن کر چھا گئے ہیں غالب اگر ان خطوط کے علاوہ اور کچھ بھی نہ چھوڑتے تب بھی صرف ان کی وجہ سے وہ ایک قابلِ رشک ادبی حیثیت کے مالک ہوتے۔

شیخ محمد اکرام صاحب غالب کے فارسی کلام کے متعلق یوں رقمطراز ہیں "مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور نثر پر بے انتہا ناز تھا اور فارسی غزل گوئی میں بھی وہ خواجہ حافظ کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن باوجودیکہ ہم مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت مانتے ہیں۔ مرزا اسے جس قدر بلند پایہ سمجھتے تھے اس سے متفق ہونا کسی طرح ممکن نہیں اور اس کے متعلق جو کچھ مرزا کے معاصرین مثلاً نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مولانا صدرالدین آزردہ، مجروح، نیر وغیرہ کی رائے تھی وہی درست معلوم ہوتی ہے۔ مرزا کے فارسی کلام کو تو موجودہ زمانے میں بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا۔ اُن کی شاعری کو جو بلند جگہ دی جاتی ہے وہ ان کے منتخب دیوان ریختہ کی وجہ سے ہے" حالانکہ خود غالب کی نظر میں اُن کے فارسی کلام کے مقابلے میں اردو کلام کی جو اہمیت تھی وہ اُن کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

غالب نہ صرف ایک عظیم المرتبت شاعر بلکہ ایک بلند پایہ سخن فہم اور سخن سنج بھی تھے اُن کی حقیقت پسندی اور دیدہ وری ہی کا یہ تقاضا تھا کہ انہوں نے طرز بیدل پر کہے ہوئے اپنے نومشقی کے کلام کا بہت بڑا حصہ جس میں شاعری کم اور صنعت گری زیادہ تھی اپنے منتخب کلام سے نہ صرف یک قلم خارج کر دیا تھا بلکہ آئندہ کے لئے اپنے طرز سخن میں بھی اپنی ایک دوسری منفرد روش اختیار کر لی تھی ان قلم زدہ اشعار میں سے بیشتر کا کوئی پیوند غالب کے منتخب اور مقبول عام اشعار سے نہیں لگ سکتا تھا لہذا ان کا خارج کیا جانا ہی بہتر اور مناسب تھا بلکہ سچ پوچھئے تو اس خس و خاشاک کے دور ہو جانے سے غالب کے منتخب کلام کے گل و بوٹے اور بھی زیادہ نمایاں اور دیدہ زیب ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد اگر دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ ان خارج شدہ اشعار میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی حیثیت سے غالب کے منتخب کلام سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر سے بہتر ہیں تو اسے غالب کی شان میں گستاخی نہ سمجھنا چاہئے ثبوت کے طور پر منتخب کلام اور غیر متداول کلام سے صرف چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

منتخب کلام:

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

غیر مُتداول کلام

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم !!

طاؤس خاک حسن نظر باز ہے مجھے
ہر ذرہ چشمک نگہ ناز ہے مجھے

وہ تشنۂ سرشار تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بکیفیت ساغر نظر آوے

مولانا حالی سے بڑا غالب کا کون مداح ہوگا بلکہ سچ پوچھئے تو اُن کی یادگار غالبؔ کا غالب کو غالب بنانے میں سب سے زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ وہ بھی غالب کے انتخاب کلام سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے چنانچہ فرمایا ہے کہ دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی رہ گئے ہیں کہ اگر نکل جاتے تو بہت اچھا ہوتا اور اگر یہ رائے بعد از وقت نہ ہوتی اور غالب کو اس پر عمل کرنے کا موقع مل جاتا تو غالب کا دیوان بے مثل اور بے نظیر ہوتا۔ مولانا حالی کا یہ مشورہ بہت پرخلوص اور معقول تھا لیکن چونکہ حالی کے سامنے غالب کا وہ پورا کلام موجود نہ تھا جو ان کی وفات کے بعد منظر شہود پر آیا لہذا اُن کا مشورہ صرف نصف صداقت کا حامل رہ گیا ہے کچھ اشعار نکال دیے جانے کے ساتھ ہی ساتھ کچھ چنے

ہوئے غیر متداول اشعار کے شامل کیے جانے کی بھی ضرورت تھی۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی بھی کوئی قطعی حکم لگانے کا ہرگز مجاز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اب یہ بحث لاحاصل بھی ہے کہ غالب کے منتخب دیوان میں کون سے اشعار شامل ہونے چاہئیں تھے اور کون سے نہیں۔ متداول کلام کے ساتھ غیر متداول کلام بھی منظر عام پر آچکا ہے اور شائقین اپنے ذوق اور پسند کے مطابق ان اشعار کے انتخاب سے خود لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات میں اور بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ غالب نے جن اشعار کو اپنے منتخب دیوان میں شامل کرنا گوارا نہیں کیا اُن کے متعلق یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ غالب کو ناپسند تھے یا اُن کو وہ اپنے منتخب اشعار سے کم تر حیثیت کا سمجھتے تھے ایک بہت بڑی غلط فہمی ہوگی۔ انتخاب کرتے وقت غالب کے سامنے اپنی پسند کے علاوہ سب سے بڑا معیار اپنے زمانے کا مذاق شاعری بھی ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے بعض جواہر پاروں کو وہ بادلِ ناخواستہ اس وجہ سے بھی خارج کرنے پر مجبور ہوئے ہوں کہ اُن کے اس وقت خاطر خواہ پرکھنے والے نہ موجود ہوں یا وہ اس دور کے مروجہ لوازمِ شاعری سے میل نہ کھاتے ہوں یا اُن کے موضوعات کو اس عہد میں قبولیت حاصل نہیں تھی۔ کچھ اشعار غالب نے یقیناً اس خیال سے بھی قلم زد کر دئے تھے کہ وہ اُن کے مضامین کو فارسی میں بھی نظم کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ہم اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اپنے کلام کا انتخاب کرتے وقت غالب کے بعض اشعار اُن کے پیش نظر نہیں تھے۔

جہاں تک غالب کے اس مقولے کا تعلق ہے کہ میرے منتخب دیوان میں جو اشعار شامل نہیں ہیں وہ مجھ سے منسوب نہ کیے جائیں تو اس کا صحیح مفہوم ان کے کردار کے پس منظر میں آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ عمومیت سے گریزاں اور اپنا شمار عام شاعروں میں کرانے کو سخت معیوب سمجھتے۔ اُن کو اپنا جتنا کلام مل سکا تھا اس کا تو وہ انتخاب کر ہی چکے تھے اور باقی سے ہاتھ بھی دھو چکے تھے لہٰذا یہ لکھ کر کہ اب اُن کے منتخب دیوان سے باہر کوئی شعر اُن کا نہ سمجھا جائے انھوں نے بغیر اس خیال کے کہ اس طرح وہ نادانستہ اپنے بعض بہت اچھے اشعار سے بھی دست بردار ہو رہے ہیں انہوں نے محض اپنے اس اندیشے کا تدارک کرنا چاہا تھا کہ کہیں ان کے بعد ان کے بعض نادان دوست جوشِ عقیدت میں عام مذاق کے بعض ادنیٰ اشعار بھی اُن کے نام سے منسوب کرنے کی کوشش نہ کر بیٹھیں۔ اور درحقیقت غالب کا یہ اندیشہ ایک حد تک درست بھی تھا۔ کئی حضرات ایسی مذموم حرکتیں کر بھی چکے ہیں

غالب کے بارے میں مولانا حالی نے 'یادگارِ غالب' میں یہ دلچسپ بات لکھی ہے کہ مرزا رات کے وقت عالم سرخوشی میں شعر کہتے تھے جب ایک شعر کہہ لیتے تو ازاربند میں گرہ لگا لیتے۔ اس طرح نو دس شعر کی غزل مکمل ہو جاتی اور ازاربند میں اسی حساب سے گرہیں لگ جاتیں اس کے بعد مرزا سو جاتے اور صبح بیدار ہوتے ہی ازاربند کی گرہیں ایک ایک کرکے کھولتے جاتے اور رات کو کہے ہوئے شعر کاغذ پر درج کر لیتے۔

++++++++++++++++

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی۔ مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ اُن کے مکان کے آگے اندھے لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی ہوگئی تھی۔ اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔

حالی۔ یادگارِ غالب

ایٹمی بجلی گھر

ترقی اور خوش حالی کے سنگ میل

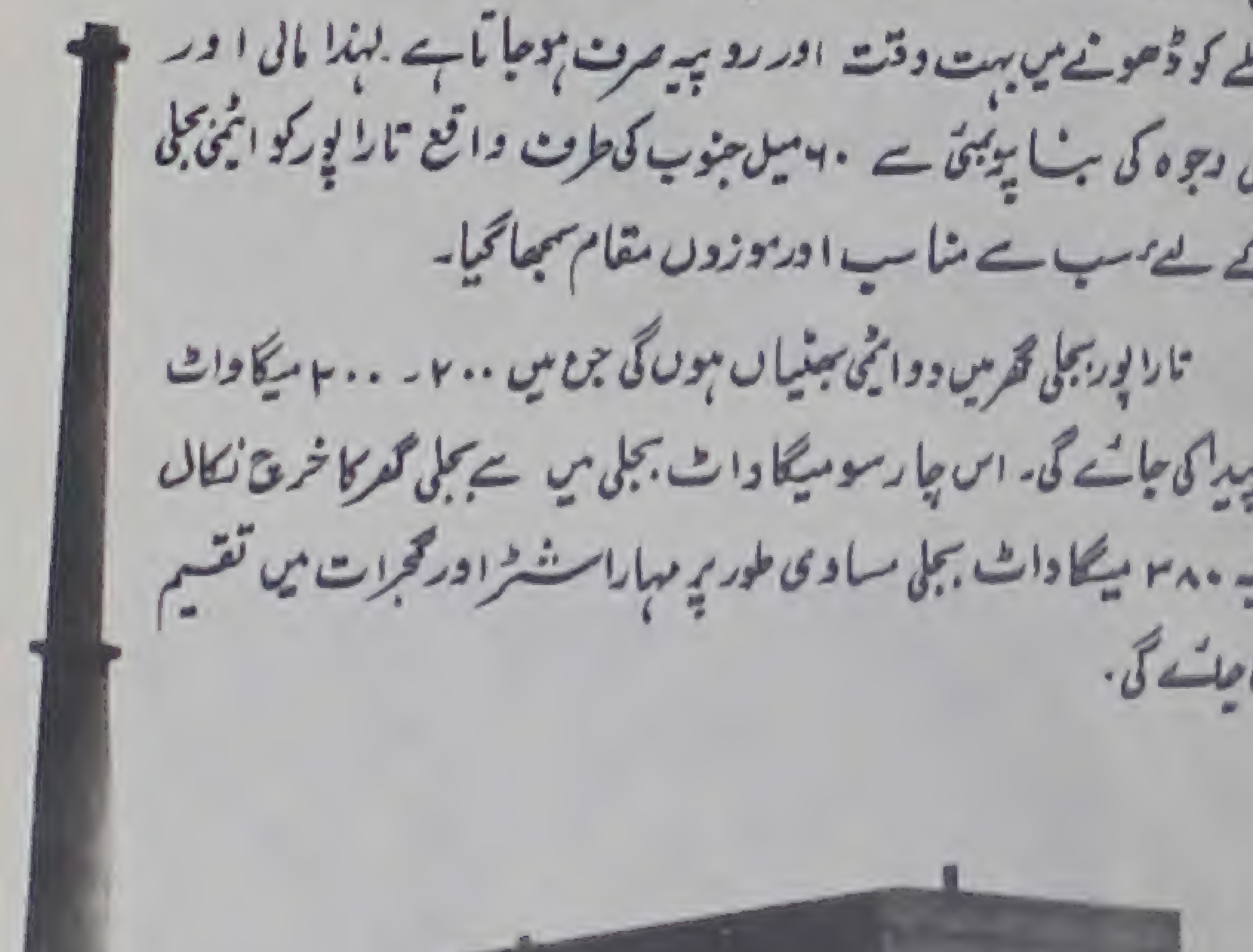
ہمارے ملک کو آزاد ہوئے صرف بیس سال کا عرصہ گذرا ہے مگر اس مدت میں ہم نے ترقی و خوشحالی کی کئی منزلیں طے کرلی ہیں چونکہ ملک کی ترقی و خوش حالی کا دارو مدار صنعتوں پہ ہے اور صنعتوں کا بجلی پر، لہٰذا بجلی کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کرنے کے لیے کئی طرح کے ذرائع سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

پہلے ہمارے ملک میں صرف کوئلے، تیل اور پانی سے ہی بجلی پیدا کی جاتی تھی مگر اب دیگر ذرائع سے بھی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اب ایٹمی بجلی گھر تعمیر کئے جا رہے ہیں تاکہ ان علاقوں میں جہاں کوئلے اور پانی سے بجلی پیدا کرنا دشوار اور مہنگا پڑتا ہے وہاں بھی سستی بجلی پیدا کی جاسکے اور صنعت و حرفت کو فروغ دیا جاسکے۔ اگرچہ ہمارے دیش میں اس کام کی ابھی ابتدا ہی ہے مگر پھر بھی تین ایٹمی بجلی گھر تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں ان میں سے ایک ایٹمی بجلی گھر تاراپور (مہاراشٹر)، دوسرا راجستھان اور تیسرا مدراس میں زیر تعمیر ہے۔

ان علاقوں میں ایٹمی بجلی گھر تعمیر کرنے کے کئی وجوہ ہیں۔ سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں بجلی گھروں کے لئے کانوں سے کوئلہ منگوانا بہت مہنگا پڑتا ہے نیز کوئلے کی نقل و حرکت ریلوے کے لیے بھی بھاری بوجھ ثابت ہوتی ہے۔ مدراس میں موسمی بارش پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا یہاں پن بجلی گھروں پر بھی انحصار نہیں کیا جاسکتا اس لئے ان دقتوں اور پریشانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان علاقوں میں ایٹمی بجلی گھر تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ہے۔ اس پہلے ایٹمی بجلی گھر کے لیے مغربی علاقے کا انتخاب اس لیے کیا گیا کیوں کہ یہاں بجلی کی مانگ بتدریج بڑھتی جا رہی ہے اور بجلی کے ذرائع محدود ہیں اور کوئلے کو ڈھونے میں بہت وقت اور روپیہ صرف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مالی اور تکنیکی وجوہ کی بنا پر بمبئی سے ۶۰ میل جنوب کی طرف واقع تاراپور کو ایٹمی بجلی گھر کے لیے سب سے مناسب اور موزوں مقام سمجھا گیا۔

تاراپور بجلی گھر میں دو ایٹمی بھٹیاں ہوں گی جن میں ۲۰۰ - ۲۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا کی جائے گی۔ اس چار سو میگاواٹ بجلی میں سے بجلی گھر کا خرچ نکال کر بقیہ ۳۸۰ میگاواٹ بجلی مساوی طور پر مہاراشٹر اور گجرات میں تقسیم کر دی جائے گی۔



تاراپور ایٹمی بجلی گھر کی عمارت

تاراپور ——— تاراپور ایٹمی بجلی گھر کی وسیع و عریض عمارت تکمیل کو پہنچ گئی

اس بجلی گھر کی تعمیر کی وجہ سے اس علاقے کا نقشہ ہی بدل گیا ہے یہاں کوئی چھ ہزار افراد روزانہ کام پر جٹے رہتے ہیں اور تعمیر کا کام بڑے زور شور سے کیا جا رہا ہے۔ اس جگہ ایک ۲۰۰ ٹن وزنی ڈیرک کرین جو اپنی طرز کا واحد کرین ہے۔ بڑے بڑے بھاری بھرکم فولادی ڈھانچوں کو اٹھا کر ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا کام انجام دیتا ہے۔ چونکہ ہماری بندرگاہوں پر بہت بھاری سازو سامان اتارنے کا انتظام نہیں ہے اس لئے تاراپور میں ہی ایک "جیٹی" تعمیر کی گئی ہے نیز سازو سامان ڈھونے کے لئے ایک خاص قسم کا جہاز کرائے پر لیا گیا ہے۔

ڈیرک کرین کی مدد سے ایٹمی بھٹی کا ۲۰۰ ٹن کا بھاری بھرکم سپیکر ایک گہرے گڑھے میں بٹھایا جا چکا ہے اس کا قطر ۷۰ فٹ اور اونچائی ایک سو فٹ ہے۔ بوتل کی شکل کے اس ڈھانچے کی جڑائی یہیں پر کی گئی ہے۔ اور اس نے ساری بھٹی کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اس کے ایک ایک انچ کا ریڈیو گراف لے کر اس کی جانچ پڑتال کر لی گئی ہے کہ اس کی جڑائی میں کوئی خامی تو نہیں اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کی جڑائی کا خرچ اس سے زیادہ نہیں آیا جتنا امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں آتا ہے۔



تاراپور ایٹمی بجلی گھر کی بھٹی

ایٹمی بجلی گھر کی تعمیر سے پیشتر تاراپور سمندری ساحل پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں زیادہ تر ماہی گیر رہتے تھے۔ اس وقت اس گاؤں تک پہنچنے کے لئے نہ تو کوئی ریل جاتی تھی۔ اور نہ ہی کوئی سڑک۔ لیکن اب وہ ایٹمی انقلاب کا اہم مرکز بن گیا ہے۔ اس کا اثر چاروں طرف دور دور تک پڑا ہے۔ ۵۵ میل کی دوری پر واقع بھوانڈی سے بجلی گھر کی تعمیر کے لئے بجلی فراہم کی جاتی ہے جو تاراپور کو ہی نہیں راستے بھر کے تمام گاؤوں کو منور کرتی ہے۔ چونکہ یہ پراجیکٹ امریکہ کے تعاون سے تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اس لئے نزدیک ترین ریلوے اسٹیشن بوئی سار اور بجلی گھر کے آس پاس امریکی عام طور دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ لمبی چوڑی بیش قیمت امریکی کاریں بھی فراٹے بھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس شاندار منصوبے نے مقامی آدمی واسیوں کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا ہے۔ اور اب وہ اپنے پرانے پیشے ماہی گیری سے ہی وابستہ نہیں رہیں گے بلکہ صنعت و حرفت کے میدان میں بھی آگے بڑھیں گے۔ اس بجلی گھر کی تکمیل کے ساتھ ان کا تعلق ایک شاندار و روشن مستقبل سے پیدا ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ایک سال کے اندر اندر یہ بجلی گھر پوری طرح سے چالو ہو جائے گا۔ اور مہاراشٹر اور گجرات کے علاقے کو فائدہ پہونچانے لگے گا۔

ایٹمی بجلی گھر میں ایٹمی بھٹی وہی کام انجام دیتی ہے جو عام بجلی گھر میں بھاپ تیار کرنے کے لئے کوئلہ، تیل یا قدرتی گیس انجام دیتے ہیں بھاپ کے ذریعے ہی بجلی پیدا کرنے والا "ٹربائن" چلتا ہے۔ اس کا باقی سارا سازو سامان عام بجلی گھر کی ہی مانند ہوتا ہے۔

تاراپور پلانٹ کی ایٹمی بھٹی ایک "کھولتے" پانی" کے حوض کی مانند ہوگی اس بھٹی میں ایندھن کے طور پر یورینیم استعمال کیا جائے گا۔ یورینیم کے خلیے جب کئی خلیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں تب اس سے گرمی پیدا ہوتی ہے جسے بھٹی سے گذرنے والا پانی جذب کر لیتا اور وہ بہت شدت سے کھولنے لگتا ہے اور اس سے بھاپ بننے لگتی ہے۔ اس بھاپ کے دباؤ سے بجلی کے انجن میں حرکت آجاتی ہے اور بجلی پیدا ہونے لگتی ہے خارج شدہ بھاپ ٹھنڈی ہو جانے پر پھر پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس سے دوبارہ بھٹی میں کام لے لیا جاتا ہے۔

اس بھٹی کو ڈھائی برس تک چالو رکھنے کے لئے لگ بھگ ۸۰ ٹن یورینیم کے ایندھن کی ضرورت ہوگی۔ بھٹی چالو کرنے کے لئے یورینیم امریکہ سے منگوایا جاچکا ہے۔ اس کے بعد یورینیم کے ایندھن کی ضرورت ہم خود پوری کرنے لگیں گے۔ بجلی گھر کے پاس ہی ایک بڑا پلانٹ نصب کیا جائے گا، جو استعمال شدہ ایندھن سے پلاٹینم اور یورینیم نکالے گا۔ اس سے مفید یورینیم کی درآمد کم کرنی پڑے گی اور پلاٹینم کو دوبارہ بھٹیوں میں استعمال کرنا ممکن ہوجائے گا۔



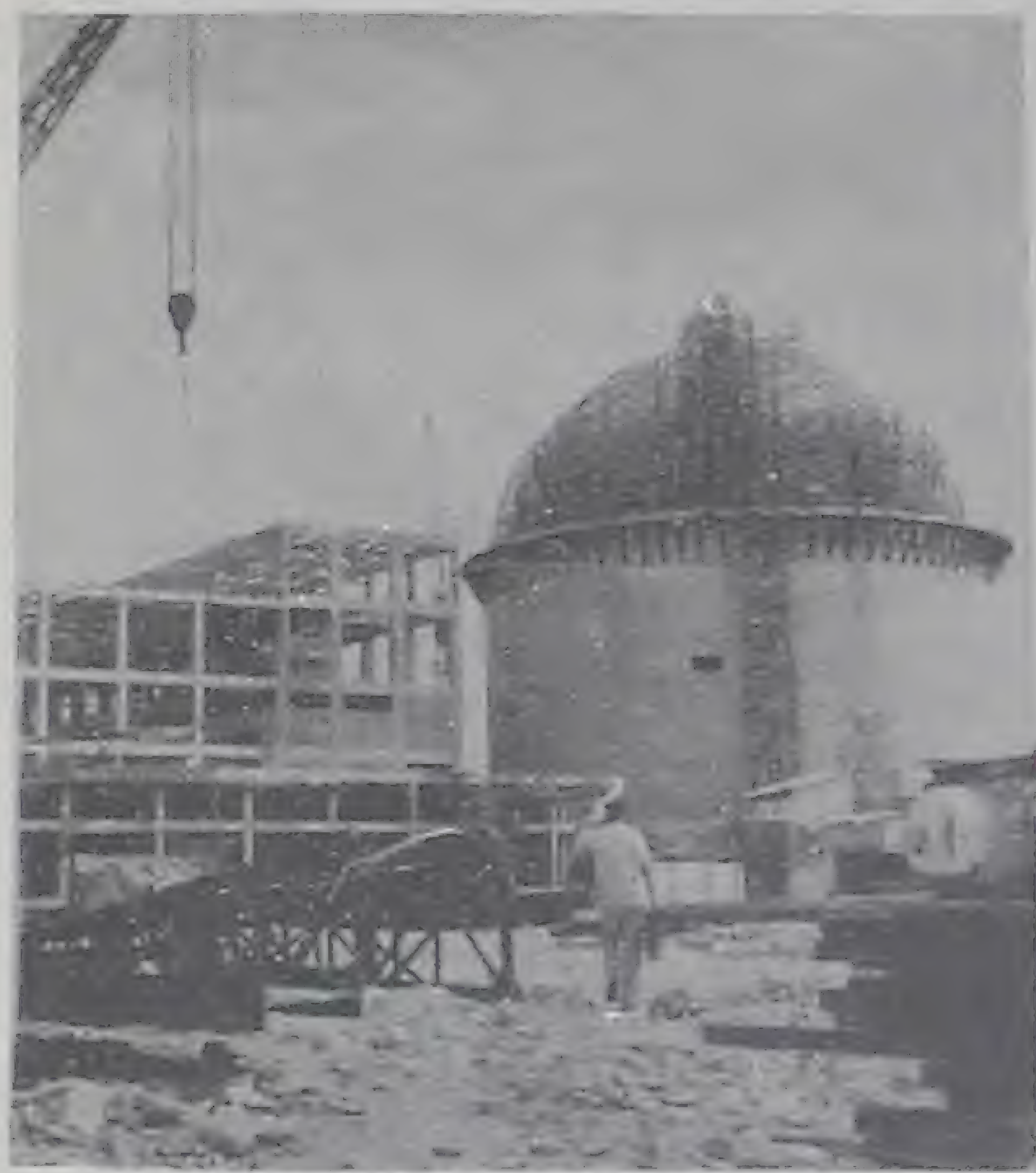
تاراپور ایٹمی بجلی گھر کی بھٹی کا ایک حصہ

اس بجلی گھر کی تعمیر میں ہمارے ہندوستانی انجینیروں نے بھی بڑا نمایاں حصہ لیا ہے اور غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں

راجستھان پراجیکٹ

دوسرا ایٹمی بجلی گھر کوٹہ سے ۴۲ میل جنوب مغرب کی جانب گاندھی ڈیم سے ۲۷ میل شمال مشرق میں پہاڑیوں کے بیچ تعمیر کیا جا رہا ہے اس بجلی گھر کے پاس ہی چمبل ندی بہتی ہے جو بجلی گھر کو پانی مہیا کرے گی۔ اس پراجیکٹ سے راجستھان کی صنعت وحرفت کو غیر معمولی فائدہ ہوگا اور اس کی تعمیر میں ہندوستانی کاریگر اور انجینیر اہم رول ادا کر رہے ہیں۔

راجستھان بجلی گھر کناڈین ڈیزائن پر تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اس میں ۲۰۰-۲۰۰ میگا واٹ صلاحیت کی کینڈو طرز کی دو ایٹمی بھٹیاں ہوں گی۔ ان میں یورینیم کو آکسائڈ گیس کی شکل میں بطور ایندھن اور بھاری پانی کو خنکی اور اعتدال لانے کی غرض سے استعمال کیا جائے گا۔ ٹرامبے میں واقع سائرس کی طرح اس جگہ استعمال ہونے والے یورینیم کے ایندھن میں سے آدھا آکسائڈ کی شکل میں کناڈا سے آئے گا اور بقیہ ہندوستان میں ہی فراہم کیا جائے گا



راجستھان ایٹمی بجلی گھر کی بھٹی

اس پراجیکٹ میں کناڈین انجینیر صرف صلاح کار کی حیثیت رکھتے ہیں اور تعمیری کام اٹامک انرجی کے محکمے کے انجینیر انجام دیتے ہیں اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس پراجیکٹ پر ۶۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ کناڈا کی سرمایہ کاری کارپوریشن جو غیر ملکوں کو قرضے دیتی ہے۔ اس کے لئے ۷ء۳ کروڑ ڈالر قرض دے رہی ہے۔

بین اقوامی تعاون سے چلنے والا یہ ایک اہم ترین پراجیکٹ ہے۔ اس کے چیف پراجیکٹ انجینیر دہی سوریہ راؤ ہیں جو اس سے پیشتر ٹرامبے (سائرس) میں بھی اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔ اُن کے ساتھ کئی اور نوجوان انجینیر بھی کام میں جٹے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کئی کئی گھنٹے فاضل کام کر کے بھی تھکن محسوس نہیں کرتے۔

ہند وکناڈا طرز کی بھٹی کا بلند وبالا گنبد دُور دور تک دکھائی پڑتا ہے۔ اس گنبد کا ڈھانچہ عمارتی لکڑی اور پلائی وڈ سے تیار ہوچکا

ہے مگر ابھی اس پر کنکریٹ کا خول چڑھانا باقی ہے۔ یہاں دن رات کام ہوتا رہتا ہے اور بڑی تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کیے جا رہے ہیں۔

ایٹمی بھٹی کی گول اور اسطوانی شکل کی عمارت کا قطر ۱۳۰ فٹ اور بلندی تہہ خانے سمیت ۱۵۸ فٹ ہے۔ اس کی دیواریں ۴ فٹ موٹی ہیں تہہ خانے کی موٹی دیواریں بھاری کنکریٹ سے تیار کی گئی ہیں۔ بہت وقت اور محنت کے بعد اسے تیار کیا گیا۔ اس تہہ خانے میں بہت سے کل پرزے اور ٹھنڈا کرنے والی نالیاں لگی ہوئی ہیں اور اس کی تعمیر میں بہت احتیاط برتنی پڑی ہے۔ کیوں کہ ذرا سی ڈھیل اور بے احتیاطی کئی مشکلات اور خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس کی تعمیر میں استعمال کی گئی کنکریٹ کا اوسط وزن ۲۴۰ مکعب پونڈ تھا۔ جب کہ عام کنکریٹ کا وزن ۱۵۰ پونڈ ہوتا ہے۔

اس تہہ خانے کے اندر ۱۸ فٹ اونچا اور ۲۰ فٹ قطر اور ۷۰ ٹن وزنی لمرہ نما ڈھانچہ رکھا جائے گا۔ اس کے اندر ۳۰۶ کیلنڈریہ نلکے لگے ہوں گے۔ جن میں قدرتی یورینیم کو آکسائڈ کی صورت میں بھرا جائے گا۔ ایٹمی بھٹی میں پیدا شدہ شدید گرمی کا ایک حصہ ہیٹ ایکس چینجر کے ذریعے پانی کو بھاپ میں تبدیل کرے گا اس کے بعد اس بھاپ کے ذریعہ ٹربائن چالو کر کے بجلی پیدا کی جائے گی۔

اس بجلی گھر نے کئی نئی اور قابلِ ذکر صنعتوں کو جنم دیا ہے۔ اس طرح کی صنعتوں میں ایک رنگ و روغن کی صنعت بھی ہے۔ ایٹمی بجلی کے چاروں طرف کی کنکریٹ کی دیوار پر خاص قسم کا ونائل، اوزا پاکسی 'روغن تیار کیا جانا تھا ایٹمی قوت کے پروجیکٹ انجینیروں کے ہدایت و مشورہ سے دو نجی فرموں نے یہ روغن تیار کر لیا۔ بعد ازاں کناڈین انجینیروں نے اس روغن کو استعمال کیا اور اسے سو فیصدی کارآمد پایا۔

کلپاکم

تیسرا ایٹمی بجلی گھر مدراس شہر سے چالیس میل کی دوری پر۔ مہابلی پورم کے ساحل مندر سے چار میل ہٹ کر۔ کلپاکم کے ساحل پر واقع ہے۔ آج کل اس پراجیکٹ کا کام بڑے زور شور سے جاری ہے۔ اس بجلی گھر کے تمام ڈیزائنوں اور تعمیر کا کام ہندوستانی انجینیر سر انجام دے رہے ہیں۔ بجلی گھر کے مقام کے علاوہ رہائشی بستی، اسکول، ہسپتال وغیرہ کے لیے



یہاں مدراس (کلپاکم) ایٹمی بجلی گھر بنایا جائے گا۔

ہی جگہیں مخصوص کی جا چکی ہیں۔ اس پراجیکٹ کے پاس ہی ۱۷ ویں صدی کا ایک ڈچ قلعہ ہے اور اس کے پس منظر میں ایستادہ تاڑ اور ناریل کے درخت اس مقام کے قدرتی حسن میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

یہاں ابھی ایٹمی بھٹی کا کام شروع نہیں کیا گیا لیکن دیگر کاموں کی رفتار میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بجلی گھر کے جائزے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ زمین کی جانچ پڑتال کے علاوہ ہوا کی رفتار اور رُخ کے بارے میں موسمیاتی مطالعہ مکمل ہو چکا ہے۔ یہ ایٹمی بھٹی ہندوستان میں اپنی طرز کی واحد بھٹی ہوگی۔ برطانیہ میں اس طرح کی ایک بھٹی ابھی زیرِ تعمیر ہے جبکہ امریکہ میں اس طرز کی دو بھٹیاں پہلے سے ہی موجود ہیں۔

مدراس پروجیکٹ کی کامیابی مزید ایٹمی بجلی گھر بنانے میں بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس بھٹی کے بن جانے کے بعد ہم اس کی تکنیک سے پوری طرح واقف ہو جائیں گے اور پھر بغیر کسی غیر ملکی امداد و تعاون کے ہم ایٹمی بھٹیاں تیار کرنے لگیں گے۔ اس بجلی گھر کی پختہ بھٹی مستقبل میں بننے والے تمام نیوکلیائی بجلی پلانٹوں کے لیے مشعل راہ ہوگی جن میں ہندوستان میں ہی حاصل ہونے والے تھوریم اور قدرتی یورینیم سے چلنے والی بھٹیوں سے بنایا گیا پلاٹینم استعمال کیا جائے گا۔

رضیہ سلطانہ

بھٹکی روح

مجھے جنگجو لوگ اچھے لگتے ہیں۔ گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں تلوار، دیوانہ وار دشمن کی صفوں میں گھس جانے والے۔ ایسی شخصیتیں مجھے اس حد تک عزیز ہیں کہ بچپن میں کہانیاں بھی ایسے بادشاہوں اور شہزادوں کی ہی اچھی لگتی تھیں جو خزانوں سے منہ موڑ کر تخت و تاج چھوڑ کر کسی مہم کے لئے نکل کھڑے ہوتے اور پھر قدم قدم پر تیروں اور تلواروں کا ہنگامہ ہوتا۔

کہانی کا انجام، بس، یہ سمجھ لیجئے۔ جھنک جھنک پایل باجے۔

یہ شوق اور پسند پروان چڑھتے رہے۔ اور اب یہ کہتی ہوں مجھے تاریخ سے دلچسپی ہے۔ لیکن تاریخی مقامات دیکھتی ہوں تو مجھے عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ غالباً یہ بھی وہی مزاج ہے کہ جب کہانیوں میں کوئی مرجاتا تھا یا کوئی تباہی آتی تو مجھے کبھی رنج نہ ہوتا۔ خوف نہ محسوس ہوتا۔ صرف یہ پوچھتی، پھر کیا ہوا؟۔ اس لئے کہ زندگی تو تعمیر و تخریب کا مجموعہ ہے۔

ابتدائے آفرینش سے آج تک زندگی مختلف ادوار سے گذری ہے ہر زمانہ اپنی ایک کشش اور حسن رکھتا ہے جب کبھی زندگی شاہی دور سے گذری تو ـــــ بنی سنوری اور نازک اندام نظر آتی ہے لیکن باہمت اور عزم کی دلدادہ بھی۔ جی چاہتا ہے، وہی زمانے لوٹ آئیں۔ وہی لوگ ہوں وہی رونقیں، وہی دلچسپیاں ہوں وہی رنگینیاں۔ دربار سجیں محفلیں سجیں، میدان جنگ میں قیامتیں برپا ہوں۔ بس ہر طرف زندگی ہو۔ زندگی۔

اس اعتبار سے ہماری تاریخ کے دامن میں ہر رنگ و بو کے پھول ہیں۔ کیوں کہ ہندوستان ایک نغمہ زار ہے اور راجستھان اس میں پایل کی آواز اور تلوار کی جھنکار کا سنگم۔ جی چاہتا ہے، اس خطے کو باہوں میں سمیٹ لوں۔ میں ہوں اور راجستھان ـــــ سفر، راجستھان کے مختلف حصوں سے گذرتی رہی۔ جے پور۔ متانت و سنجیدگی کا گہوارہ صفائی و سادگی کا پیکر، ہندوستان کا پیرس۔

اجمیر۔ جو اپنے نام کے ساتھ ہی ثقہ و پرہیزگاری کا تصور لئے ابھرتا ہے۔ عظیم خانقاہ و درگاہ اور قدیم مندروں کو پہلو میں لئے بیٹھا ہے۔ اللہ۔ اللہ۔

چتوڑ گڑھ۔ سادہ، خاموش، پُرسکون قصبہ۔ آن پر مٹنے والے راجپوتوں کے خون سے رنگین۔

اودے پور۔ جھیلوں کا شہر۔ خوبصورت، خوشنما، قدرت کی پُرکاری اور انسان کی فنکاری کا حسین منظر۔

گاڑی ریگستانوں سے، سرخی مائل مٹیالے میدانوں سے گذر رہی تھی۔ سامنے خشک بلند پہاڑ، دامن میں نخلستان جیسے کھیت؛ کہیں کہیں کچھ سبز، کچھ زرد۔ اُن کے درمیان رنگ برنگی پگڑیاں

چنریاں ۔ ریل چلتی رہی ۔ رفتار دھیمی ہوئی تو ہم چتوڑ گڑھ پہنچ رہے تھے ۔ عجیب حالت تھی ۔ سانسوں کا ربط ، تصور کا سلسلہ ، سب بے طور ہوا جا تا تھا ۔ چتوڑ گڑھ ۔ ہائے اللہ ۔

جیسے مدّتوں بعد وطن لوٹ رہی ہوں ۔

دل کی حالت نہ جانے کیسی ہوتی جا رہی تھی ۔ جیسے دل حلق میں اٹک گیا ہو ۔ سب ملیں گے ۔

کون ملے گا ؟

میرا سب کو انتظار ہوگا ۔

لیکن میں کس سے ملنے جا رہی ہوں ۔

سب سے

اپنے وطن سے ، اپنے ساتھیوں سے ، اپنے گھر سے ۔

گھر ؟ ؟ ؟

ہائے ۔

قلعے کی فصیل نظر آنے لگی ۔ بلند ، بلند تر ، بلند ترین ۔ نگاہیں اٹھتی چلی جائیں پر دیوار کو پھاند نہ سکیں ، عاجز ہو جائیں ، جھکی جائیں اور پھر تھک کر فصیل کے دامن سے الجھ کر تصورات کی دنیا بسالیں ۔

گاڑی ٹھہر گئی ۔ سرشتے رک گئے ۔

۔ دل کی دھڑکن بھی ۔

سٹیشن بہت چھوٹا تھا ۔ بہت معمولی ، سنسان ۔ قلعے کی فصیل کے قریب ، پر قلعے سے دور ۔

سٹیشن سے باہر تانگے کھڑے تھے ۔ چھوٹے چھوٹے گھوڑوں والے تانگے ، پر مجھے تو چیتک سا گھوڑا چاہیئے تھا ۔ سامنے کچی ڈگر تھی پنگھٹ کی نہیں ۔

میں گھوڑے پر سوار اسی راہ پر ہولی ۔ پھر ۔ خاک اڑی اور میرے دامن سے لپٹ گئی ، ذرّوں نے اٹھ کر منہ چوم لیا ، بالوں کو چھو لیا

میرا وطن ۔ سب سے پیارا ، سب سے نیارا ۔

ندی پار کی تو سامنے میدان کارزار تھا ۔ گھوڑا سرپٹ دوڑا جا رہا تھا میدان سے گذر کر قلعے کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ بلندیوں کی طرف ۔ آج

پھر قلعے کے عظیم الشان دروازے کو چشم براہ پایا ۔ باقی چھ دروازے ٹکٹکی لگائے میری راہ تک رہے تھے ٹاپوں کی آواز گونج اٹھی ۔ طویل راہ داری نے مجھے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی ۔ میرا دل کھل اٹھا ، نگاہیں در و دیوار کے بوسے لے رہی تھیں ۔ قلعے میں داخل ہوئی ، خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ آنسو چھلک گئے ۔ گھوڑا روک دیا ۔ دوڑ کر فصیل کے کنگوروں سے لپٹ گئی ۔ پے در پے بوسے دے رہی تھی ۔ ہر پتھر کو ہر ذرّے کو ۔

نگاہ اٹھی تو سامنے میدان جنگ تھا ۔ جہاں سے ابھی گذری تھی نہ جانے کتنی بار گذری تھی ۔ ایک بار پھر میدان جنگ کا جائزہ لیا ۔ پرتاپ و اکبر بڑھے ، افتخار و عزم کے محافظ ۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ آنکھیں چمک اٹھیں پلٹیں قلعے کی مختلف عمارتوں پر نظر ڈالی ۔ شکستہ عمارتیں ۔ محض نشان ، عمارت اور پتھر ۔ ہر طرف ویرانی ، خاموشی سناٹا ۔ اس پر بھی ہر شے چمک رہی تھی ۔ شاید خوش تھی ۔ میں جو آ گئی تھی ، ایک بار پھر ۔ جی چاہتا تھا کہ ہر دیوار سے گلے مل کر آنسو بہاؤں ۔ اس پتھر کے سینے پر سر رکھ دوں ۔ اس کھنڈر کے پاؤں چھولوں ۔ یہ سب میرے ہیں ۔ سب میرے ۔

نہ جانے کب سے میرا انتظار کر رہے ہیں ۔ صرف میرا ۔

ایک طرف بیٹھی ہوئی مختلف عمارتیں دیکھ رہی تھی ۔ اُن کو بدل دیا گیا تھا ۔ بدلا جا رہا تھا ۔ پر ۔ وہ نہیں بدلی تھیں ۔ اُن کی خوشبو ، اُن کی مسکراہٹ سب وہی تھی ۔ اُٹھی ، اُن کو چھو کر دیکھا محبت کی گرمی بھی وہی سب کچھ وہی تھا ۔ صرف ، وقت گذر گیا تھا ۔ گذر رہا تھا ۔ گذر جائے گا ۔ پر یہ وقت جاتا کہاں ہے ۔ ؟ کیوں جاتا ہے ؟ میں نے دیکھا یہ تھکا ہارا وقت میرا بائی کے محل سے سر جھکائے نکلا اور قریب ہی مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا ۔ بھجن کی آواز آ رہی تھی ۔ میرا کے پربھو ، گردھر ناگر ۔ گردھر ، گردھر اس کے لبوں پر پھیلتا چلا گیا ۔ وہ ہمہ تن گوش بنا یہ سنتا رہا ۔

آنکھیں کھلیں پلک بھی نہ جھپکی ۔ نہ جانے کس کا انتظار تھا ۔ بس یہ عالم تھا ۔ ع

آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا ۔

میں سوچتی رہی۔

میرا۔ جس نے سب کچھ چھوڑ دیا تو خود کو پالیا۔ اور جب اپنے کو کھو دیا تو کرشن کو پالیا۔

اپنے گردھر کی ہوگئی تو میرا خود ہی کرشن ہوگئی۔ میں نے اور وقت نے بھی فضاء کی سانسیں اور ہوا کی آہیں سنیں۔ نہیں۔ یہ تو مُرلی کی تانیں تھیں جو کائنات میں جاری وساری ہیں۔

بس کرشن ہی کرشن۔ من و تو کا فرق ختم ہوا تو ہر امتیاز مٹ گیا۔ اور پھر۔ ہمہ اوست۔ صرف ہمہ اوست۔

وقت کے بس کا نہیں کہ مِٹ جائے، فنا ہوجائے۔ ہاں، وہ تو انتظار کرسکتا ہے۔ تلاش کرسکتا ہے۔ گزر سکتا ہے۔ جُگ بیتے جا رہے ہیں پر وقت کی جد و جہد، اُس کی تلاش مسلسل ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش ۔ ایک چکر۔ ایک گردش۔ جہاں منزل نہیں ہوتی ۔ منزل تو ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اور رُکنا موت۔ زندگی کو موت ہے۔ پر موت امر ہے۔ حیاتِ جاوید کی مالک ۔ موت۔

دور سفید آنچل لہرایا۔

آگے بڑھی، لیکن غلام گردش سے گذرنا مشکل ہوگیا۔ ہوا سرگوشیاں کررہی تھی۔ ہنسی، قہقہے۔ سب بھولے بسرے۔ کپڑوں کی سرسراہٹ جیسے، کوئی قریب سے گذر گیا ہو۔ بار بار گذر رہا ہو ۔ تیز، چنچل، شوخ مسکراہٹیں۔ گرم سانسیں، سرد آہیں ۔

یہ سب کون ہیں ۔ کیا مجھے پہچانتے ہیں۔

تو میرے پاس کیوں نہیں آتے۔

سب مِل بیٹھیں۔ کچھ اپنی کہوں، کچھ اُن کی سنوں۔

لیکن ۔ ایک حرکت، اضطراب اور بے چینی کے سوا کچھ نہیں۔

ذرا دور پرچھائیں تھیں۔ آگ ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ راکھ اب تک موجود تھی۔ راکھ۔ بال بال موتی پروئے رانیوں کی راکھ۔ سلونے سانولے مکھڑے والی ناریوں کی راکھ ۔ ہمیشہ جلنے اور سلگنے والی ہستی کی راکھ ۔ عورت کی راکھ ۔ اس کے پیار، محبت، خلوص اور ایثار کی راکھ ۔ یہاں سے وہاں تک خاک میں ملی راکھ۔

عجیب ہے یہ قوم بھی۔

سنگھاسن پہ رانی۔

شہنشاہوں میں دلِ آرام۔

رن بھومی میں سہاگ لٹاتی، ممتا جلاتی اور پھر زندگی کی آگ سے گذرتی، موت کے شعلوں میں کھو جانے والی، جنم کرم کی داسی۔

دِلوں پر حکومت کرنے والی، پر اپنے دل کی محکوم۔ کائنات کی عظیم ہستی، قدرت کا بہترین شاہکار اور مجبورِ محض۔

مسکراہٹیں دے کر آنسو پینے والی اور پھر، مسکراتی، آنسو بہاتی جل جانے والی ہستی یہاں بھی جل گئی۔ راکھ ہوگئی۔ اچھا ہی ہوا ست کی محافظ ۔ ستی ۔ استری۔

چتاؤں کے اس وسیع میدان میں جہاں ہر طرف خاموشی تھی، کنارے کنارے سنگِ مرمر کی سمادھیاں ہیں۔ کنول سی اُجلی، پاکیزہ، سادہ، سفید۔ ساکت، پرسکون، خاموش۔ قریب قریب، چتاؤں کا یہ سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ وہاں تک، جہاں پدمنی کا محل ہے۔ جل محل۔ یہیں علاؤالدین نے جل محل کی نچلی سیڑھی پر کھڑی رانی پدمنی کی صورت آئینہ میں دیکھی تھی۔ غالباً آرسی مصحف کی رسم اسی کی یادگار ہے۔ محل کے ایک کمرے میں اب بھی آئینہ لگا ہے۔ جس کی کھڑکی سے سامنے کے جل محل کی نچلی سیڑھی نظر آتی ہے۔ لیکن ہر جگہ سے نہیں۔ صرف ایک مخصوص مقام ہے۔

بہرحال "پدماوت" کی داستانی تمثیل کو تاریخی حقیقت میں بدل دینے کی داد دینی پڑتی ہے۔

صوفی باصفا اس حسنِ مطلق کے جلوے کو آئینۂ کائنات میں دیکھے یا نہ دیکھے یہاں تو یہ داستان یونہی سامنے آئی۔

روایت، حقیقت میں بدل گئی تھی۔

یہ، حقیقت کیا ہے؟ روایت کا وجود کیوں کر ہوا؟ یہ سب داستانیں کیسے رواج پاگئیں۔؟ ۔ میں سوچتی رہی۔ سوچتی چلی گئی۔

سب چیزیں جوں کی توں تھیں۔ میں ان کے درمیان تھی۔ لیکن اپنایت اور اجنبیت کے دوراہے پر رک گئی تھی۔ یہ مقام قلعے میں آخری

منزل تھی۔

اتنا بڑا قلعہ اور چند عمارتیں۔ اللہ اللہ۔ زمانہ بھی کیا چیز ہے۔
نشان بھی باقی نہیں رہتا۔

سامنے، فتح مینار نظر آیا۔ جو آج بھی سر بلند کھڑا تھا۔ مستحکم قلعے کے سینے پر۔

فنِ تعمیر کا عجب نمونہ"۔ راج ترنگنی" کے جسم کی طرح حسین و متناسب۔

اس طرح، کہ،

پہلی منزل کے قطر سے دوسری منزل کا قطر زیادہ، تیسری منزل کا قطر زیادہ تر۔ لیکن چوتھی اور پانچویں کا مائل بہ اختصار۔

میں دور بیٹھی دیکھ رہی تھی۔

پتھروں پر، پتھروں کے قریب، پتھروں کے درمیان۔۔ ہر طرف پتھر۔

کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ "نو لکھا ہار" لے کر چلے ہوں۔ پیچھے آوازیں سنائی دی ہوں۔ انہوں نے مڑ کر دیکھ لیا ہو، اور پتھر ہو گئے۔

خیر، کچھ تو ہوا ہے۔

ارادوں کی مالک، جد و جہد کی حامل شخصیتیں پتھر ہو گئی تھیں۔

ایک بار پھر سوچا۔

کب ان سے جدا ہوئی تھی۔ کیوں جدا ہوئی تھی۔

کیا اس حال میں چھوڑ گئی تھی۔ یہ اس حال کو کیوں پہنچ گئے۔

۔ پھر بھی انہیں میرا انتظار تھا۔

میں بھی ان کے لئے بے چین تھی۔

انھیں دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔ اور انہیں پا کر۔

زندگی یونہی چلتی ہے۔

یہ سب کیا ہے ۔۔؟

ایک چکر۔

وصل و ہجر، ملاقات و جدائی، ملنا اور بچھڑنا۔ بس اسی طرح ہے۔ اور یہ اچھا ہے۔ یونہی ہونا چاہیے۔ ورنہ کون کس کا انتظار کرتا۔ کون کس کے لئے بیتاب ہوتا۔ اور پھر ان پتھروں میں اپنوں کو تلاش کر لینا بھی تو ممکن نہ تھا۔

دل خوش تھا اور جی اداس۔

اٹھی۔ ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک۔ اس کو لانگتی اس کو پھلانگتی، چلتی رہی، بڑھتی رہی "فتح مینار" تک جا پہنچی۔ نظر اٹھی اور پھسلتی ہوئی نیچے آکر رک گئی۔ جہاں، شریفے والیاں بیٹھی تھیں۔

سرخ زرد لہنگوں اور چنریوں کے ڈھیر۔

سامنے سبز شریفوں کی ٹوکریاں۔

میں بھی پاس جا بیٹھی۔ دیکھتی رہی۔

شریفوں کے گاہک آئے۔ اس لین دین میں گھونگھٹ کے پٹ کھل کھل گئے۔ اور سلونی، سانوری چھبی جھلک گئی۔ سانولا روپ، سنہری نتھ۔

قریب ہی تبسم کی برق لہرا گئی۔ ولی پکار اٹھا ؎

سلونے سانولے پیتم ترے موتی کی جھلکاں نے :: کیا عقدِ ثریا کو خراب آہستہ آہستہ

نہ جانے کیسا ماحول تھا؟

؎ ان رنگینیوں کے پس منظر میں کھنڈرات،
پہلو میں شمشان گھاٹ اور ذرا دور پر ساگر۔
پھر ہوا چلی۔ چنریاں لہرائیں۔
گھونگھٹ اڑ اڑ گئے۔ فضا میں سرگوشیاں ہوئیں
ع سب کہاں، کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں۔

شام ڈھلے میں اٹھی۔ تھکی تھکی، اداس، اداس۔ میرے گرد مسکراتے چہرے تھے اور بھیگی آنکھیں۔

سب حیران ہوئے کہ۔ پھر چلی۔

آنا تو جانے کا آغاز ہے۔

میں نے سمجھایا۔

سب الوداع کہہ رہے تھے۔

قلعے سے باہر، قلعے سے دور، حدِ نظر تک ہر شے ساتھ آئی۔ اور ایک درخت۔ سوکھا، خشک، خزاں کا مارا، تنہا۔ دور

تک جُھک جُھک کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا، اُس نے مجھے دیکھا۔ ہم دونوں دیکھتے رہے۔ دیکھتے چلے گئے۔ یہی جسم جسم کا ناتا ہے۔ تبھی تو یہ سب میرے ہیں اور میں اُن کی۔ لیکن یہ کیسا مِلن ہے جو مجسّم جُدائی — جیسے
— رادھا کرشن — میرا گِردھر —

شام کے سائے بڑھنے لگے —

اُجالے دھندلکوں سے جلملے ۔

دِن بھر کی مسافت طے کر کے جب سورج حُجلۂ مغرب میں داخل ہوا تو شفق نے مسکرا کر خیر مقدم کیا۔ دونوں وقت مِل رہے تھے۔ آپس میں چُہلیں ہوئیں اور گیندے کے پھول بکھر گئے۔ شفق نے بڑھ کر آفتاب کے چہرے پر گُلال مل دیا۔ لیکن اُس کی بے باک نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ لال ہو گئی۔

رات نے بڑھ کر تاریکی کا پردہ کھینچ دیا۔

تارے ہنس دیئے۔ چاند کھِل اُٹھا۔

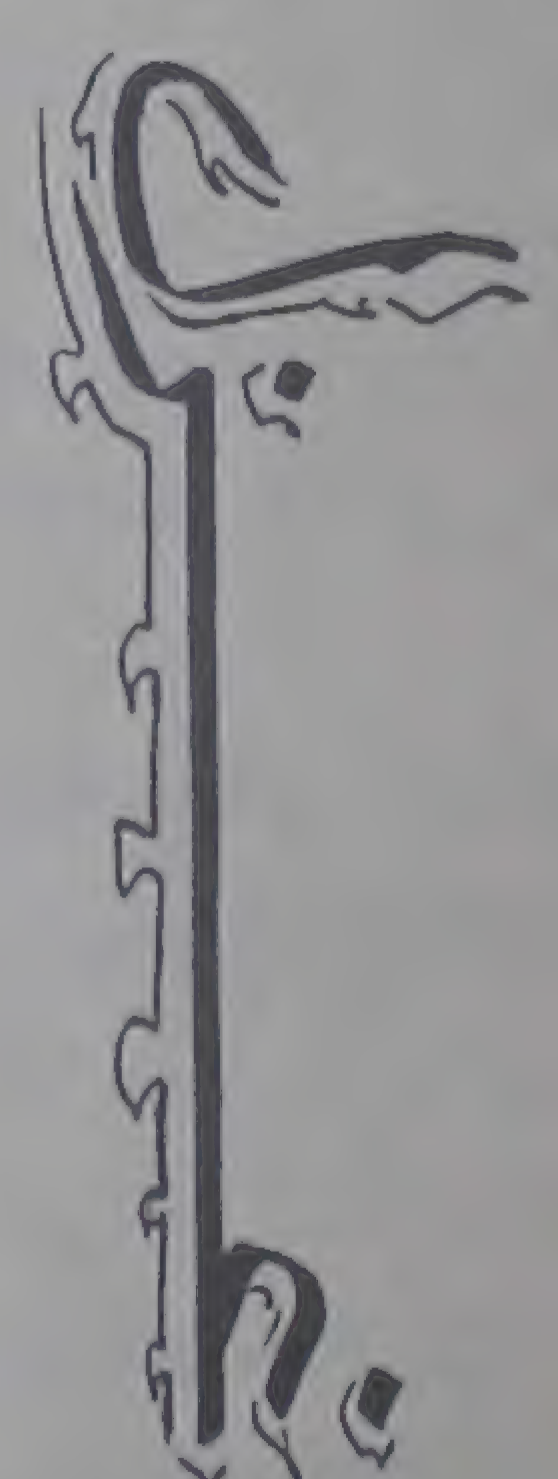
چتوڑگڑھ، سفید چاندنی کی حریری چادر اوڑھے خوابیدہ آنکھوں سے مجھے لوٹتے دیکھ رہا تھا۔

دور قلعے کی ڈھلان پر۔

میرے قدموں کے نشان۔

جگمگا اُٹھے۔

نصیر پرواز



وادیٔ درد سے یوں رُوپ بدل کر گذرے
پھول کی طرح لگے سر سے جو پتھر گذرے

آپ جس آنکھ کو رونے کی سزا دیتے ہیں
اُس سے اُمید یہ رکھتے ہیں کہ ہنس کر گذرے

یہ تذبذب کی گذرگاہ وہ تشکیک کا موڑ
زندگی کس سے بھلا آنکھ ملا کر گذرے

یونہی بے وجہ نہیں مجھ کو تڑپنے کا ملال !
آپ جب گذرے مرے سائے سے بچکر گذرے

زندگی حُسن کی تہذیب کی پروردہ ہے
دن جو گذرے ہیں سمجھتا ہوں کہ بہتر گذرے

دِل کو محسوس نہ ہوں ہاتھ جنھیں چھو، نہ سکیں
راہِ احساس میں ایسے کئی منظر گذرے

زندگی کی طرح دل بھی ہوا ہے مایوس :
بارہا ایسے بھی لمحے مرے دِل پر گذرے

آگہی سطح پہ رقصاں نہیں ہوتی پرواز :
تہہ میں ڈوبے کوئی دامن کو بھگو کر گذرے

عبدالقدوس نقوی

غالبؔ کے کلام میں تکرار

شعراء کے کلام میں توارد ایک عام بات ہے۔ اکثر ایک زبان کے شاعر ایک ہی خیال کو مختلف انداز میں باندھتے ہیں۔ کبھی کبھی خیالات کے ساتھ پیرایۂ اظہار میں بھی یکسانیت ہوجاتی ہے۔ توارد میں ایک شاعر کا انداز بیاں دوسرے شاعر کے انداز سے کہیں بہتر ہوتا ہے کہیں فروتر۔ خیالات جب یکساں ہوں تو انداز بیاں ہی شعر کی بلندی یا پستی کا معیار بنتا ہے۔ الفاظ کی بندش، روانی اور سلاست کو اس میں جانچا جاتا ہے۔

توارد کے مقابلے میں دوسری چیز تکرار ہے۔ تکرار ایک شاعر کے کلام میں ایک ہی خیال کو مختلف انداز یا الفاظ میں بیان کرنے کا نام ہے۔ یہ چیز ان شعراء کے ہاں بیشتر ملتی ہے جو ایک سے زیادہ زبانوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ہندوستان میں انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک اکثر ایسے شعراء ملتے ہیں جنہوں نے اردو فارسی یا اردو اور ہندی میں اشعار کہے ہیں۔ کیوں کہ فارسی سرکاری اور علمی زبان کی حیثیت سے رائج تھی اور اردو ایک عوامی زبان کی حیثیت سے، اس لئے دونوں ہی زبانوں میں مہارت علمیت کا معیار سمجھی جاتی تھی اور دونوں زبانوں کا شاعر ہونا ایک مابہ الامتیاز بات تھی۔ لیکن اس قسم کے شعراء کے یہاں تکرار بھی ناگزیر تھی ایک ہی خیال جس کو وہ ایک زبان کے شعر میں ادا کر چکے ہوتے تھے اسی خیال کو دوسری زبان کے شعر میں بھی بیان کرتے تھے۔

یہاں ہم غالب کے اردو اور فارسی کلام سے ایسی چند مثالیں پیش کر رہے ہیں جن میں نہ صرف خیالات کی تکرار ہے بلکہ کہیں کہیں ایک خیال کو جسے اردو یا فارسی میں پہلے ادا کیا جا چکا ہے۔ جوں کا توں دوسری زبان میں دہرا دیا گیا ہے اس میں صرف زبان کا فرق ہے یعنی پہلا خیال اردو میں ادا ہوا ہے تو بعینہ وہی خیال فارسی میں ادا کر دیا گیا ہے۔ اس تکرار میں کہیں تو اردو اور فارسی کے اشعار کے دونوں مصرعے ایک ہی خیال کے ترجمان ہیں۔ کہیں ایک خیال جو اردو یا فارسی میں ادا کیا گیا ہے اسے دوسری زبان کے شعر میں دوسرے انداز سے ادا کیا ہے۔ خیال میں تھوڑی ترمیم کے بعد یا زبان کے انداز بیان کے اختلاف کے ساتھ۔ کہیں ایک شعر کا ایک مصرع دوسرے سے مختلف ہے لیکن بنیادی خیال ایک ہے۔

پہلے ہم وہ اشعار نقل کرتے ہیں جن کے دونوں مصرعوں میں ایک ہی خیال کا تکرار ہے۔ اس تکرار میں کہیں اردو کا شعر زیادہ رواں اور بلند ہے اور کہیں فارسی کا۔

اردو کا ایک شعر ہے ؎

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

اسی خیال کو فارسی میں یوں ادا کیا ہے۔

کن ناز و ادا چندیں دلی بستاں و جانی ہم
دماغ نازکِ من برنمی تابد تقاضا را

۲۔ کعبہ میں جارہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

ؔ زمن حذر نکنی گر لباسِ دیں دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

اسی خیال کو فارسی میں دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے۔

ؔ بی گناہم پیرِ دیر از من مرنج
من بہ مستی بستہ ام احرام را

۳۔ تیری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

عہدِ وفا زسوئی تو نا استوار بود
بشکستی و ترا بہ شکستن گزند نیست

۴۔ میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

گفتم البتہ زمن شاد بہ مردن گردی
گفت دشوار کہ مردن بتو آساں شدہ است

۵۔ ہے کیا جو کس کے باندھئے مری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لے حسن اگر راست نہ رنجی سخنی ہست
ناز ایں ہمہ یعنی چہ کمر ہیچ و دہاں ہیچ

۶ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اندراں روز کہ پرسشِ رود از ہرچہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

اسی انداز کا اردو میں ایک دوسرا شعر ہے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

۷۔ دل میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غم چہ در ربود از ما اینک آنچہ بود از ما
سینۂ و اندوہی، خاطری و آزاری

۸۔ چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

بہ تن چپیدہ باذم از نم خوننابہ پیراہن
خراش سینہ سطرِ بخیہ شد چاکِ گریباں را

۹۔ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

گر پس از جور بہ انصاف گراید چہ عجب
از حیا روی بما گر ننماید چہ عجب

۱۰۔ وہ چیز جس کے لئے ہمکو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے

در مژدہ زجوئی عسل و کاخ زمرد
پہ چیزی کہ بدل بستگی ارزدمی ناب است

۱۱۔ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

غالب نخورد چرخ فریب از ہزار بار
گفتم بروزگار سخنور چو من بسی است

۱۲۔ توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

اسی خیال کو فارسی میں اسطرح ادا کیا ہے۔

۵ در بزم نشاط خستگاں را چہ نشاط
از عربدہ پای بستگاں را چہ نشاط
گر ز ابر شراب ناب بارد غالب
ما جام و سبو شکستگاں را چہ نشاط

۱۳۔ درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
منت از دل نمی تواں برداشت
شکر ایزد کہ نالہ بی اثر است

۱۴۔ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے
خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم :
تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

۱۵۔ مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم
خدایا از عزیزاں منت شیون کہ برتابد
جدا از خانماں دور از دیارم میتواں کشتن

۱۶۔ خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ہای این پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد
بود با دامن پاکت چہ قدر ہا گستاخ

اب یہاں کچھ ایسے اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں کہیں خیال تو ایک ہے مگر انداز بیان مختلف ہے یا ایک مصرع فارسی شعر کا اردو شعر کے کسی مصرع کا ہم خیال ہے۔

۱۔ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
از نالہ ام مرنج کہ آخر شد ست کار
شمع خموشم و ز سرم دود میرود

یہاں اردو شعر کا پہلا مصرع فارسی شعر کے دوسرے مصرع کا ہمخیال ہے۔

۲۔ چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
چوں بقاصد بسپرم پیغام را
رشک نگذارد کہ گویم نام را

یہاں بھی اردو کا پہلا مصرع اور فارسی شعر کا دوسرا مصرع ایک ہی خیال کے ترجمان ہیں۔

۳۔ ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم
کعبہ دیدم نقش پائی رہرواں نامیدمش

دونوں شعروں کے مصرعہای ثانی ایک ہیں اور دونوں شعروں کا بنیادی خیال بھی ایک ہے۔ یعنی تصوف کی زبان میں "منزل ماکبریاست"۔

۴۔ ستایش گر ہے زاہد جس قدر اس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

زنگہا چوں شد فراہم مصرفی دیگر نداشت !
خلد رانقش ونگار طاقِ نسیاں کردہ ایم

یہاں بھی دونوں شعروں کے مصرعہای ثانی ایک ہیں۔

۵۔ کہتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

بروز رستخیز۔ از جنبش خاکم بر آشوبی
تو و یزداں چہ سازو کس بدیں صبر آزمائیہا

یہاں مصرعہای اولیٰ ہم خیال ہیں۔ اگرچہ مصرعہای ثانی میں اندازِ بیان مختلف ہے لیکن شعر کا بنیادی خیال ایک ہے۔

۶۔ ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

بامن میا میزای پسر فرزند آذر را نگر !
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

یہاں بھی فارسی کا مصرع ثانی اُردو شعر کے مصرع اولیٰ کی بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اندازِ بیان مختلف ہے لیکن شعر کا بنیادی خیال ایک ہی ہے۔

۷۔ مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

بہار پیشہ جوانی کہ غالبش نامند
کنوں بہ میں کہ چہ خوں میچکد زہر نفسش

دونوں شعر ایک ہی تاثر کی تخلیق ہیں۔ اسی انداز کا ایک دوسرا شعر ہے ؎

اسداللہ خاں تمام ہوا ؎ اے دریغا وہ رند شاہد باز

۸۔ کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

غربتم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش
کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

دونوں شعر ایک ہی خیال اور تاثر کے ترجمان ہیں۔

۹۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

دل خستۂ غمیم بود می دوای ما
بلختگاں حدیث حلال و حرام چیست

ایک ہی بات کو دو مختلف انداز سے کہا گیا ہے۔

۱۰۔ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

چرا بہ سنگ وگیاہ پیچی ای زبانہ طور
زراہ دیدہ بدل در رو وزجاں برخیز

ایک ہی خیال ہے جسے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔

۱۱۔ خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

وقتست کہ خونِ جگر از دردِ بجوشد
چنداں کہ چکد از مژہ داد رس ما

اُردو شعر کے مصرع اولیٰ میں جو خیال ہے اسے فارسی کے پورے شعر میں ادا کیا گیا ہے۔

۱۲۔ رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

جان غالب تاب گفتاری گماں داری ہنوز
سخت بی مہری کہ می پرسی ز ما احوال ما

دونوں شعر بنیادی خیال کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ اُردو شعر میں یاس
و قنوط کا جو رنگ ہے وہ فارسی شعر میں زیادہ شدید ہوگیا ہے

۱۳۔ سامان خورہ خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں
تن پروری خلق فزوں شد ز ریاضت
جز گرمیٔ افطار ندارد رمضان ہیچ

دونوں جگہ ایک ہی خیال ہے اُردو قطعہ میں جو بات رمز و کنایہ کے انداز میں کہی گئی ہے فارسی شعر میں اسے واشگاف الفاظ میں کہدیا ہے۔

۱۴۔ خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
مرا دمیدن گل در گمان فگند امروز
کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت

دونوں شعروں میں ایک ہی خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔

۱۵۔ سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
خوش وقت اسیری کہ برآمد ہوس ما
شد روز نخستیں سبد گل قفس ما

دونوں شعروں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔

۱۶۔ محابا کیا ہے میں ضامن اِدھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
ز وارثانِ شہیداں ہراس یعنی چہ
قوی ست دست قضا کشتۂ ادائے تو کیست

دونوں شعروں میں بنیادی خیال ایک ہی ہے۔

۱۷۔ پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
اختلاط شبنم و خورشید تاباں دیدہ ام
جرأتی باید کہ عرض شوق دیدارش کنم

یہاں بھی دونوں شعر متحد الخیال ہیں۔

۱۸۔ اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی
بعد مردن مشت خاکم در نوردِ صرصر است
بے قراری میزند موج از سراپایم ہنوز

اسی انداز کا ایک دوسرا شعر ہے۔

اللہ ری ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

تینوں شعروں میں ایک ہی خیال کو ادا کیا گیا ہے۔

۱۹۔ کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
ندارم تاب ضبط راز و می ترسم ز رسوائی
مگر جویم ز بہر ہمزبانی بی زبانی را

ایک ہی خیال ہے جسے مختلف انداز سے ظاہر کیا گیا ہے

۲۰۔ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
حیرانی ما آئینہ شہرت یار است
شد جادہ بکویش نفس باختۂ ما

فارسی شعر کا مصرع اولیٰ اُردو شعر کے مصرع ثانی کی بازگشت ہے۔ بھی دونوں شعروں کا تاثر ایک ہی ہے۔

بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

کس سے محرومیٔ ہمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

پس از عمری کہ فرسودم بمشق پارسائیہا
گدا گفت و بمن تن در نداد از خود نمائیہا

نامرادی بود توئی آبرو غالب دریغ
در ہلاک خویش کوشیدیم و کوشیدن نداشت

دونوں شعروں کے مصرعہای اولیٰ ایک ہی انداز کے ہیں۔ مصرعہائے ثانی متحد الخیال ہیں۔

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

خوں شد اجزای زمانی در فشار بے خودی
رفت ایامی کہ من امسال و پاری داشتم

گیتی زگریہ ام تہ و بالاست بعد ازیں
جویند درمیانہ دریا کنارہ را

یہاں فارسی کا مصرع ثانی اُردو شعر کے مصرع اولیٰ کا ہم خیال ہے ویسے ایک ہی خیال ہے انداز بیان کے اختلاف کے ساتھ

غزل

محمود عشقی

جب بھی چھوٹی گئی ہے فکرِ معاش
آئی ہے دل کے آئینے پہ خراش

دیوتاؤں کے خیر مقدم کو
دم بخود ہے کھڑا ہوا کیلاش

واسطہ کیا مجھے فرشتوں سے
صرف انسان کر رہا ہوں تلاش

اس نے ٹھکرا دیا ہے خوشیوں کو
پھر دلِ غم زدہ کو دو شاباش

منتظر ہیں صنم چٹانوں میں
کب پکاریں گے اُن کو سنگ تراش

ہر طرف ہُو کا ایک جنگل ہے
لے کے آئی کہاں یہ راہِ معاش

کوچہ کوچہ عوام بکھرے تھے
راستے میں پڑی ہوئی تھی لاش!

پھول کے ساتھ تھی نکہت:
آپ ہوتے مرے قریب اے کاش

سب سے ملئے مگر تکلف سے
ابنِ آدم کا ہے عجب قماش

تہ و بالا ہے نظمِ میخانہ؛
کون رندوں میں آگیا اوباش

نئی کتابیں

ریاست یا تحقیق عدل از افلاطون مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین
ناشر: ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی۔ صفحات ۴۵۵۔ طبع دوم ۱۹۶۷ء
قیمت: پندرہ روپے۔

انسانوں کی طرح کتابوں پر بھی اچھے اور برے وقت گزرتے ہیں کچھ مردہ حالت میں پیدا ہوتی ہیں، کچھ پیدائش کے چند دن بعد ہی رحلت کر جاتی ہیں کچھ طویل عمر پاتی ہیں اور گنی چنی خوش نصیب کتابیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کبھی پرانی نہیں ہوتیں اور جس قدر زمانہ گذرتا جاتا ہے ان کا شباب اور نکھرتا جاتا ہے۔ ایسی ہی چند خوش قسمت کتابوں میں افلاطون کی 'ریاست' بھی ہے۔ عام طور پر ایسی کتابوں کے ساتھ ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے اوراق تو زندہ رہتے ہیں مگر ان اوراق کے اندر پوشیدہ روح مسخ ہو جاتی ہے یا نظروں سے مکمل طور پر اوجھل ہو جاتی ہے اس صورت میں ان کتابوں کا مقام تو الماری کے سب سے اونچے خانے اور سب سے بیش قیمت جزدان میں ہوتا ہے مگر دلوں سے ان کا مقام محو ہو جاتا ہے۔

افلاطون کی 'ریاست' آج بھی زندہ کتاب ہے خیال انگیز، خیال آفریں اور ناگزیر۔ اور جب تک فکر وفہم کا چراغ روشن ہے افلاطون کی جلائی ہوئی شمعیں بھی شاید ماند نہ پڑیں گی۔ البتہ ان کی روشنی کے زاویے مختلف ہوتے جائیں گے۔ افلاطون کی شخصیت فلسفی کے تجسس اور شاعر کے احساس جمال کا مجموعہ ہے۔ اور ان دونوں قدروں میں اس نے 'عدل' کی مدد سے توازن اور آہنگ پیدا کیا ہے۔

ترجمہ نگار کے لیے سب سے مشکل مرحلے فلسفے اور شاعری ہی کے سلسلہ میں پیش آتے ہیں۔ کیوں کہ ان مراحل میں فکر اور تخیل کی اڑان میں لفظ اور معنی کے شہپر پوری طرح ساتھ نہیں دیتے۔ ذاکر صاحب نے اس مرحلے کو حسن طبیعت کے سہارے حل کیا اور ایسا حل کیا ہے کہ یونانی نام اور تلمیحات نکال دی جائیں تو ترجمے پر اصل کا دھوکہ ہو۔

یہ ترجمہ ۱۹۳۲ء میں پہلی بار مبسوط دیباچے اور نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا اب دوبارہ یونسکو اور ساہتیہ اکادمی کے مشترکہ اہتمام سے مشرق و مغرب کے درمیان بہتر تفہیم کے منصوبے کے ماتحت شائع ہوا ہے ذاکر صاحب نے لطف بیان اور خصوصاً بات چیت کے لطف کو قائم رکھا ہے اور لفظی ترجمے پر غیر ضروری حد تک زور نہیں دیا ہے۔ ترجمہ گو آکسفورڈ کے مشہور پروفیسر بی جی جووٹ کے انگریزی ترجمے کی مدد سے کیا گیا ہے مگر افلاطون کے بنیادی تصورات سے آشنا ہو کر کیا گیا ہے اور جہاں یہ نہیں بن پڑا وہاں اصل متن کی عبارت دیانتدارانہ اعتراف شکست کے ساتھ چھوڑ دی گئی ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۱۹)

ترجمہ بڑے جوکھم کا کام ہے۔ ذاکر صاحب اس مرحلے سے بڑی خوش اسلوبی سے گذرے ہیں اس کے اندیشوں اور کامیابیوں کا اندازہ چند جملوں کی مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ دسویں کتاب کے ایک ٹکڑے کا انگریزی ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے۔

... all poetical imitations are ruinous to the understanding of the hearers, and the knowledge of their true nature is the only antidote to them.

اس کو اردو میں اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

"تمام شاعرانہ تعالی سننے والوں کی سمجھ کے لئے تباہ کن ہوتی ہے اور اس زہر کے لئے بس ایک تریاق ہے یعنی اس کی اصلی ماہیت کا علم۔"

ANTIDOTE کا لفظی ترجمہ تریاق شاید درست نہ ہو لیکن یہاں تریاق اور اس کے ساتھ زہر کے لفظ کے اضافے سے اصل مصنف کے مافی الضمیر کو بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ اور عبارت کو فصیح بنا دیا ہے۔

پوری کتاب شستہ اور رواں اندازِ بیان کا نمونہ ہے۔ ذاکر صاحب کی نثر میں، واقعیت، سادگی، تاثیر اور بے ساختہ پن کا جو انوکھا امتزاج ملتا ہے وہ اس ترجمے میں بھی جابجا نمایاں ہے۔ اردو داں طبقے کے لئے یہ ترجمہ نعمت سے کم نہیں۔ دیباچہ کی جامعیت اور تعلیقات میں فراہم کردہ معلومات نے اسے اور زیادہ مفید بنا دیا ہے کاش دنیا کی اعلیٰ ترین نعمتوں کی طرح یہ نعمت بھی ارزاں ہوتی!

(محمد حسن)

- - - - - - - - - -

"شرارِ سنگ": عرش ملسیانی۔ پبلشر: مرکز تصنیف تالیف نکودر (پنجاب)۔ صفحات: ۲۵۹۔ سائز: ۲۲×۳۶/۱۶
قیمت: آٹھ روپے۔ ملنے کا پتہ: عرش ملسیانی ایف ۱/۴ ماڈل ٹاؤن دہلی

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک کے دس سال اُردو ادب کے لئے نہایت سازگار ثابت ہوئے۔ یوں تو اس مدت میں ہند کے گوشے گوشے سے نئے اور باکمال شاعر و ادیب اُبھرے جنہوں نے ادب میں نئی راہیں نکالیں اور اُسے نیا روپ دیا لیکن حق تو یہ ہے کہ اگر اس دور کو 'پنجابی عشرہ' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نثر نگاری میں سالک، تاثیر اور پطرس، افسانہ نویسی میں بیدی، کرشن چندر، اور منٹو، اور شعر و سخن میں فیض، راشد اور میراجی، عرش، آزاد اور ساحر نے اسی دور میں نام پیدا کیا۔

اچھی شاعری اسی وقت ممکن ہے جبکہ شاعر نہ صرف دلِ گداز اور طبعِ موزوں رکھتا ہو۔ بلکہ زبان کے مزاج سے بھی آشنا ہو اور علم و فن سے بھی واقف ہو۔ پنڈت بال مکند عرش ملسیانی اس لحاظ سے انتہائی خوش قسمت ہیں کہ وہ پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کے فرزند ہیں جن کی صاحب زبانی کا لوہا جوش ملیح آبادی ایسے اہلِ زبان بھی مانتے ہیں۔ عرش نے مشاعروں اور علمی مذاکروں کی دنیا میں آنکھ کھولی۔ اُردو فارسی میں پختہ ہو کے شعر سمجھنا اور شعر پرکھنا سیکھا اور اس کے بعد خود فکرِ سخن کی طرف مائل ہوئے۔

عرش کے فکر و فن میں ایک خاص رچاؤ اور ٹھہراؤ ہے۔ ان کا دل گداز ہے، طبیعت شوخ۔ انداز سلجھا اور زبان پختہ۔ "شرارِ سنگ"، ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے اور اس کی ترتیب و طباعت سے عرش کی مدبرانہ چابک دستی ظاہر ہوتی ہے۔ دیوان کے مختلف اجزا کو، غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ پنہاں، اور غمِ ایں و آں کی سرخیوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ غمِ دوراں میں سیاسی اور محاکاتی نظمیں ہیں۔ جن میں "میرے وطن، پیارے وطن"، "شعرائے پاکستان کا خیر مقدم"، "بادِ شمال" (چینی حملے کے بارے میں) اور "روشنی کا مینار" (جواہر لال نہرو کا مرثیہ) خاصے کی چیزیں ہیں۔

"غمِ جاناں" میں عرش کی وہ آٹھ نظمیں یا "نوحے" شامل ہیں جو انہوں نے اپنی پہلی رفیقہ حیات کی وفات پر لکھے تھے۔ ان میں "روحِ غم" خاص طور پر دل گداز ہے۔

عرش نے ہیئت میں تجربے نہیں کئے لیکن انھیں جملہ اصنافِ سخن پر عبور حاصل ہے اور انھوں نے مسدس، مثنوی۔ اور قصیدے کے فارم کو روایتی مقامات سے ہٹ کر اپنایا ہے۔ "بشارتِ قم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرش قصیدہ بھی خوب لکھ سکتے ہیں جیسا کہ صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا ہے اس مجموعے کا سب سے وقیع حصہ "غمِ پنہاں" یا غزلیات کا باب ہے۔ ان غزلوں میں کہیں تو ایسے اشعار ہیں

کس کو چلا ہے حال سنانے
دور گئے سب یار پرانے
رشتوں پر موقوف نہیں ہے
اُلجھے ہیں سب تانے بانے

جن میں غزل کی وہ خاص ہلکی پھلکی زبان استعمال ہوئی ہے جس پر اہلِ لکھنؤ سر دھنتے ہیں۔ اور کہیں شوخیِ طبع کے ایسے نمونے ملتے ہیں،

یارب یہ سنا ہے وہ سمجھتے نہیں اُردو :
دے اور دلِ اُن کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

دُنیا میں تو ممنوع ہے جنت میں ہے جائز
کیا بات ہے واعظ کی یہاں اور وہاں اور

بہت دشوار راہیں آدمیت کی ہیں اے واعظ
فقط سجدوں سے تو یہ مرحلے آساں نہیں ہونگے

لیکن ان سب سے الگ ان غزلوں میں ملک کی تقسیم کے باعث پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے بچھڑنے کا ملال اور نئے ناقابل اعتبار دوستوں کا گلہ بار بار ظاہر ہوتا ہے۔

ایک لمحہ جو مسرت کا ملا :: ہم کو ایک عہد کے غم یاد آئے
جب بھی غیروں کی نوازش دیکھی :: ہم کو اپنوں کے ستم یاد آئے
چھوٹے بھی جو الزام تھے وہ ہم نے اٹھائے :: مایوسیٔ احباب کا ساماں نہ ہوئے ہم

شاعر کا ذاتی نکتہ نظر کچھ ان شعروں سے ظاہر ہے۔

کچھ ہو سکے تو خود مری بگڑی بنایئے :: یہ جانتا ہوں میں کہ خدا کارساز ہے
اصنام تراشی بھی بڑی چیز ہے لیکن :: ہے نازکی کارگہِ شیشہ گراں اور
کچھ ماہ و نجوم سے بھی آگے :: منزل کا سراغ مل رہا ہے۔

اس مجموعے میں اگر "غمِ این و آں" کا جز نہ ہوتا جس میں کچھ وقتی اور ہنگامی چیزیں شامل ہیں تو بہتر ہوتا لیکن یہ ذاتی پسند کا سوال ہے۔ صفحہ ۲۳ کی پہلی سطر میں کتابت کی ایک غلطی ہے جسے ذہین قاری خود درست کرسکتا ہے۔ مجموعی طور پر "شرار سنگ" کو دیکھ کر قاری کو ایک خوش کن تعجب ہوتا ہے کہ ؎

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے

(مہدی عباس حسینی)

- - - - - - - -

گفت و شنید از ظفر ادیب صفحات ۲۰۰۔ قیمت ۶ روپے۔
ناشر: قصرِ ادب اردو بازار دہلی ۶۔

تنقیدی مضامین کے اس مجموعے میں ظفر ادیب نے، جدید اردو ادب کی بعض نمائندہ اصناف کے نمائندہ اور پسندیدہ ادیبوں کا مطالعہ کیا ہے ان اصناف میں تحقیق تنقید، ناول، شاعری اور افسانہ شامل ہیں۔ ابتدا میں سخن ہائے گفتنی کے عنوان سے مصنف نے فن تنقید اور ادب کے بارے میں اپنے بعض تصورات کی وضاحت بھی کی ہے۔ تنقید اُن کے خیال میں حسن کو مجروح کرنے کا نہیں بلکہ حسین پہلوؤں کو ابھارنے کا فن ہے۔ چنانچہ ان مضامین میں بھی حسن شناسی کا پہلو غالب ہے۔ اگرچہ مصنف نے بعض کوتاہیوں کی طرف بھی ہمدردانہ اشارے کئے ہیں۔ ان مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ نقاد نے کہی ہوئی باتیں یا روایتی خیالات دہرانے کے بجائے آزادانہ طور پر اپنے ذاتی غور و فکر کا اظہار کیا ہے اور اپنی رائے کو دلائل کے ساتھ پیش کرنے اور علمی انداز سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے اقتباسات کچھ زیادہ فراخ دلی سے نقل کئے ہیں جو کہیں کہیں مضامین کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔ مطالعہ کے لئے انھوں نے جن ادیبوں یا فنکاروں کو چُنا ہے اس میں اُن کی ذاتی پسند کو خاصہ دخل ہے۔ مثلاً تحقیق میں صرف دتاتریہ کیفی اور قاضی عبدالودود کا اور تنقید میں ڈاکٹر محمد حسن اور ممتاز شیریں کا انتخاب کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے تنقیدی شعور کا مطالعہ متوازن اور منصفانہ ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ ممتاز شیریں کے صرف چند مضامین کی بنیاد پر انہیں نقاد کی حیثیت سے بے جا اہمیت دی گئی ہے۔ شاید افسانہ نگاری میں ان کی حیثیت زیادہ منفرد اور ممتاز ہے قاضی عبدالودود، احمد ندیم قاسمی اور بیدی کے بارے میں مضامین بڑی حد تک تعارفی اور تاثراتی ہیں۔ لیکن عصمت چغتائی، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، احسان دانش اور قرۃ العین حیدر کے بارے میں مضامین تنقیدی بصیرت کے قابلِ قدر نمونے ہیں ظفر ادیب نے ان فنکاروں کے ذہنی اور تخلیقی مزاج و معیار کو ہی نہیں ان کے بارے میں بعض دوسرے نقادوں کی آرار کو بھی پرکھا ہے مثلاً عصمت چغتائی کے بارے میں انھوں نے دلائل کے ساتھ آل احمد سرور کی اس رائے کی تردید کی ہے کہ اُن کا آرٹ چھیڑ چھاڑ اور آنکھ مچولی کا آرٹ ہے اسی طرح دوسرے فنکاروں کی تخلیقات کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے بعض نقادوں کے خیالات کو تائیدی یا تردیدی نقطۂ نگاہ سے پیش کیا ہے ان مضامین کا ایک قابلِ قدر پہلو اسلوبِ تحریر کی سادگی، وضاحت قطعیت اور شگفتگی ہے۔ جدید اردو ادب کے طلبا کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔ (قمر رئیس)



ترکی کے وزیر خارجہ ہز ایکسیلینسی جناب احسان صابری
ہندوستان کے سرکاری دورے پر تشریف لائے۔
۵ جنوری ۱۹۶۸ء کو انھوں نے وزیر اعظم شریمتی
اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔

No. 7 A J K A L (Monthly) February 19
Old Secretariat, Delhi-6
and Published by the Director, Publication Division, Old Secretariat, D
by the Asian Art Printers Private Ltd., D.B.Gupta Road, New Delhi.
Regd. No.D 509

آجکل

اپریل ۱۹۶۸ء

چیت بیساکھ شک سمت ۸۹

۶۰ پیسے



کربلائے معلّے (عراق) میں سیدالشہداء امام حسین علیہ السلام کا روضۂ مبارک۔ یوں تو ساری دُنیا کے مسلمان ہر سال محرم کی دسویں تاریخ
کو شہادت کا سوگ مناتے ہیں لیکن ہندوستان میں نہ صرف مسلمان بلکہ کثیر تعداد میں غیر مسلم بھی انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل
دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سرورق - عملہ: جیون اڈلجہ

جلد ۲۶ نمبر ۹

چیت جیاکو شک سمت ۱۸۹۰
اپریل ۱۹۶۸ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل (اُردو)
اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۶

ترتیب

شرح چندہ

	فی پرچہ	ایک سال	دو سال	تین سال
ہندوستان میں	۶۰ پیسے	۷ روپے	۱۲ روپے	۱۷ روپے
پاکستان میں	۶۰ پیسے (پاک)	۷ روپے (پاک)	۱۲ روپے (پاک)	۱۷ روپے (پاک)
دیگر ممالک سے	۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ	۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ۱½ ڈالر	۱۸ شلنگ یا ۲٫۷۵ ڈالر	۲۵ شلنگ ۶ پنس یا ۳٫۵۰ ڈالر

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی - ۶

ملاحظات

بجٹ صرف حکومت کے آمد و خرچ کا حساب نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ملک کی معاشی حالت اور پالیسی کا عکاس ہوتا ہے اور ملک کی معیشت پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔

۲۹ فروری کو نائب وزیر اعظم اور وزیر خزانہ شری مرار جی ڈیسائی نے ۶۹-۱۹۶۸ کا جو بجٹ پارلیمنٹ میں پیش کیا ہے وہ کئی لحاظ سے بیحد اہم اور دور رس ہے۔ گذشتہ دو تین سال سے ملک کی معاشی حالت اس حد تک تسلی بخش نہ تھی جس حد تک ہم چاہتے تھے۔ پچھلے سال شدید خشک سالی کی وجہ سے ملک کے خاصے بڑے حصے میں اناج کی پیداوار بالکل برائے نام ہوئی تھی۔ صنعتوں میں پوری پیداواری صلاحیتوں سے کام نہیں لیا جا رہا تھا اور زرعی اور صنعتی پیداوار کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں لہٰذا ملک کی معاشی حالت کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لئے جن اقدامات کی ضرورت تھی سال رواں کے بجٹ میں وزیر خزانہ نے انھیں ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے سرمایے کی تشکیل کے لئے کئی طرح کی رعائتیں دی ہیں اور ایسی بہت سی رکاوٹوں کو دور کیا ہے جو سرمایہ کاری کی راہ میں حائل تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ریزرو بنک نے بنک کی شرح سود میں کمی کر کے سرمایے کو مزید سہل الحصول بنا دیا ہے۔ اس طرح صنعتوں کو فروغ حاصل ہوگا۔

سال رواں کی عمدہ فصل سے اناج کی قیمتیں گری ہیں۔ ہم نے زرعی پیداوار بڑھانے کی طرف جو خصوصی توجہ کی ہے اس کے فائدے اب حاصل ہونے لگے ہیں۔ وزیر خزانہ نے ملک کی معیشت کے اس اہم پہلو یعنی زراعت کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور بجٹ میں کئی ایسی تجویزیں شامل ہیں جو زرعی پیداوار بڑھانے میں معاون ہوں گی۔ ملک کی خوشحالی کا دار و مدار زیادہ زرعی پیداوار پر رہی ہے۔ اناج کی قیمتیں کم ہونے سے دوسری اشیائے صرف کی قیمتیں کم ہونے لگی ہیں۔

کوئی بھی وزیر خزانہ رائے عامہ کے ہر طبقے کو مطمئن نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ملک کی موجودہ حالات کے پیش نظر وزیر خزانہ نے جو اقدامات کئے ہیں وہ درست اور بر وقت ہیں۔

نائب وزیر اعظم شری مرار جی ڈیسائی نے ۹ مارچ ۱۹۶۸ کو ہوشنگ آباد میں سیکوریٹی پیپر مل کا افتتاح کیا۔ اس مل میں کرنسی اور بنک نوٹ اور دیگر اقسام کے کاغذ تیار ہوں گے۔ اب تک ایسے کاغذ درآمد کئے جاتے تھے۔

اس مل کی تعمیر پر ۱۲ کروڑ روپے کا خرچ آیا ہے جس میں سے ۲ کروڑ ۹۵ لاکھ روپے کی مالیت کا غیر ملکی زرمبادلہ خرچ ہوا ہے جسے برطانیہ نے مہیا کیا۔

اس مل میں جو کاغذ تیار ہوگا اس سے ملک کو ہر سال ۲½ کروڑ روپے کے غیر ملکی زرمبادلہ کی بچت ہوگی۔

اپریل کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمارے گذشتہ شماروں کی جس طرح علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی کی گئی ہے اس سے ہماری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ ہم "آجکل" کو خوب سے خوب تر بنانے میں لگے ہوئے ہیں اور آپ کے تعاون کے متمنی ہیں۔ اپنی رایوں سے ہمیں نوازتے رہیئے تاکہ اس کی روشنی میں ہم اپنا راستہ متعین کر سکیں۔ ●●



ساغر نظامی

غزلیں

نہ کشتی ہے نہ فکرِ ناخدا ہے
دلِ طوفاں طلب کا آسرا ہے
یہیں تو خوئے تسلیم و رضا ہے
ترے ذوقِ کرم کو کیا ہوا ہے
الٰہی خیر ناموسِ وفا کی!
انھیں بھی فکرِ ناموسِ وفا ہے
سبکسارانِ ساحل جانتے ہیں
دلِ ساحل میں کیا طوفاں بپا ہے
کہیں الفاظ سے رُکتے ہیں طوفاں
دُعا بھی اک فریبِ ناخدا ہے
نہیں یہ نغمۂ شورِ سلاسل
بہارِ نو کے قدموں کی صدا ہے
زمانے کی غلامی ہم نفس کیوں
زمانہ آدمی کی خاکِ پا ہے
شکایت ہائے سوزِ تشنگی کیوں؟
ابھی ساغر درِ مے خانہ وا ہے

مرحبا سوزِ سفر، ذوقِ سفر، عزمِ سفر
خود ہی رہ گیر شبِ تار ہوں خود ہی رہبر
تا بہ کے آہ یہ روندی ہوئی راہوں کا طواف
اک نیا ذوقِ جہاد، ایک نیا ذوقِ سفر
کم سے کم اتنی بلندی پہ تو ہو تیرا مقام
کہ ترے سائے میں ہوں خود ترے نجم و اختر
فطرتِ بحر نے صدیوں میں تراشا ہے جسے
گوشِ قدرت کا وہ آویزۂ نادر ہے گہر
جس میں محلول ہو زہرابِ تعلق کی مٹھاس
صاف اقرارِ محبت ہے وہ نفرت کی نظر
تلخ و نابینا حقائق سے گرانبار نہ ہو
یہی نابینا حقائق تجھے بخشیں گے نظر
ساغرِ مے سے چھلکتی ہے نشاطِ ابدی
میری توہین ہے اس وقت غمِ نیکی و شر

اعجاز حسین

شاعرانہ چشمک کا جائزہ

ولی سے مصحفی تک



زبان اور انسان کے مزاج میں اتنی مماثلت ہے کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ایک فن کار میں فن اور شخصیت کے امتزاج کا کیا تناسب ہے؛ شخصیت نے ایک مشہور فن کار کے فن میں امتیازی پہلو پیدا کیے یا فن نے اس کی شخصیت کو انفرادیت عطا کی۔ بہر حال دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اُن کے علیحدہ کرنے کا تصور گوشت سے ناخن جُدا کرنے کے مترادف ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کبھی فن پر شخصیت حاوی ہو جاتی ہے کبھی شخصیت پر فن کا غلبہ ہو جاتا ہے، کہیں شاہراہِ ذہن پر دونوں ساتھ ساتھ رواں دواں رہتے ہیں۔ اس نظریہ کی روشنی میں جب ہم اُردو ادب کی اُن شخصی اور ذاتی کاوشوں پر نظر ڈالتے ہیں جن کو چشمک سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ یہ کارنامہ اچھا ہو یا بُرا فن اور شخصیت کے امتزاج کی باہمی پیداوار ہے اور اس امتزاج کی تہہ میں معاشرت کارفرما ہے۔

شاعری کی ہیئت میں شگفتہ مزاجی جزوِ اعظم ہے بغیر اس کے فن کا دلکش ہونا ممکن نہیں، نہ شاعری کو فلسفہ بنایا جا سکتا ہے کہ وہ سراسر غور و فکر کا مرقع ہو جائے نہ اُسے تاریخ و فقہہ کا درجہ دیا جا سکتا ہے کہ جذبات کی دُنیا سے وہ دُور جا پڑے۔ شگفتہ مزاجی کی دُنیا بہت وسیع ہے مگر یہاں ہمارے پیشِ نظر اس کا صرف وہ پہلو ہے جس کا سہارا لے کر شاعر ذاتی چھیڑ چھاڑ اور مخصوص کمزوریوں کے ذکر کو دلکش بنا دیتا ہے۔ مگر معاشرہ کے معیارِ مذاق اور کلام کی نزاکت و اہمیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اچھا تو یہ ہوتا کہ اس مضمون میں صنفِ ہجو کے جملہ پہلوؤں پر کچھ کہا جاتا مگر موضوع کی ضخامت نے یہ نہ ہونے دیا چنانچہ اختصار کے خیال سے ہجو کے صرف اس پہلو پر خامہ فرسائی ہو سکی جس کا تعلق ذاتی باتوں سے کم ہے، ادبی و فنی شعور سے زیادہ ہے۔ اس انداز کی نظموں کو ہم نے ہجو ملیح کہنا مناسب سمجھا ہے۔

اُردو کی بعض قدیم اصنافِ سخن کو بغیر غور و فکر کے لغو و لاطائل کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے جس دفتر کو مجموعہ خرافات سمجھا جاتا ہے اس میں کچھ ایسا مواد بھی مِل جائے جو ادبی یا ثقافتی اعتبار سے قابلِ قدر ہو۔ اسی معذرت کے ساتھ ہجو پر اِس مضمون کے پیش کرنے کی جرأت کی جا رہی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ ہجو کی زیرِ بحث صورت یعنی ہجو میں بھی کوئی پہلو قابلِ قدر ملتا ہے یا نہیں؟

اُردو زبان جیسے جیسے ادب کی منزل کے قریب آتی گئی اس میں شگفتہ مزاجی کا عنصر روز بروز بڑھتا گیا۔ لیکن اس وقت تک جس طرح قواعد کی پابندی سے زبان ایک گونہ آزاد تھی، محاورات، تراکیب، تلفظ الفاظ پر زیادہ دھیان نہ تھا۔ اُسی طرح شاعر کے اس لطیف پہلو یعنی شگفتہ مزاجی

کو بھی بعض وقت شائستہ تہذیب نہ بنا سکی۔ یہ کمی زیادہ تر ذاتی کمزوریوں کے بیان میں نمایاں ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر ہمارے شعراء حدِ اعتدال سے آگے نکل جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ لطافت کثافت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کچے مال کو بھی پختہ و نظر فریب سمجھ کر بے محابا بازارِ سخن میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایسے بزرگ حضرات بھی بے تکلف نظر آتے ہیں، جیسے مظہر جان جاناں اور شاہ مبارک آبروؔ۔ حالانکہ شمالی ہند کی نظر میں جو بزمِ ادب کے لئے شمعِ اولیں ہے اس نے چشمک یا چھیڑ چھاڑ کے پہلو بہت ہلکے انداز میں پیش کیا ہے۔ خوبصورتی سے اپنے احساسِ برتری کو قلم بند کر کے ناصر علی سرہندی کو لکھا تھا۔

اُچھل کر جا پڑے جوں مصرعِ برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

اس کا جواب بھی قاعدے سے دیا گیا۔

باعجازِ سخن گر اوڑ چلے وہ
وَلی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں

لیکن بعد والوں نے اپنے جوشِ بیان میں اس اندازِ بیان و متانت کو بھی نظر انداز کر کے ایسا لب و لہجہ اختیار کیا کہ وہ شگفتگی جو معاشرہ کے لئے نسیمِ صبا بن کر آئی وہ بادِ سموم اور بادِ صرصر ہو گئی۔ غالباً اس خرابی کے پس پشت معاشرہ کی بدمذاقی اپنا کام کر رہی تھی۔

مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ مبارک آبروؔ نے جس انداز سے اپنی چشمکیں پیش کی ہیں وہ ہر لحاظ سے نامناسب تھیں اس ضمن میں دونوں بزرگوں کے اشعار ایسے بھی نہیں کہ اُن کو نقل کیا جا سکے، اور یہ بھی خیال ہے کہ اُردو اَدب کے ہر طالبِ علم کو یہ اشعار کسی وجہ سے یاد بھی ہوں گے اس لئے بھی اُن کا یہاں پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ لیکن چشمک یا چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ کچھ ایسی ساعت سے شروع ہوا تھا کہ کم و بیش آج تک قائم ہے۔ اگر ہم اس کی اصل وجہ دریافت کرنا چاہیں تو سب سے پہلے ثقافت و معاشرہ کی سطح و رجحان کا جائزہ لینا ہوگا اور یہ سوچنا پڑے گا کہ کون کہہ رہا ہے کیوں کہہ رہا ہے اور کس شخص کو خطاب کر رہا ہے۔ جس چشمک کا یہاں ذکر ہے وہ زیادہ تر شاعروں سے متعلق ہے۔ جب کسی شاعر کو احساس ہوا کہ اس کا ہمنوا اپنے کو بہت کچھ سمجھتا ہے حالانکہ وہ اس پایہ کا شاعر نہیں جس کا اپنے کو اہل سمجھتا ہے لہٰذا اس کی غلط فہمی پر اسے آگاہ کر دیا جائے۔ اس جذبہ کے ساتھ وہ ناصح مشفق کا فرض ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوتا۔ لیکن اس آگاہی کا انداز رفیقانہ نہیں بلکہ معاندانہ ہوتا، اصلاح کے بجائے نکتہ چینی ہوتی۔ فن کے پردے میں ذاتی خصومت بڑھتی جاتی فنی خرابیاں اور کبھی کبھی ذاتی یا خاندانی کمزوریاں بیان کر کے وہ معاشرہ کو گدگدا کر ہنسا دیتا۔ اس لئے کہ معاشرہ کی بدمذاقی اسی کو خوش مزاجی سمجھتی تھی۔ بہر حال بنائے مخاصمت ادعائے شاعری تھا۔ انتقام کا جذبہ اوّل تو اشعار کی صورت میں نمایاں ہوتا اور دوسرے یہ کہ فنی نقائص بیان کر کے فریقِ مخالف کو اپنے سے کمتر ثابت کرنے کی خواہش ہوتی۔ نکتہ چینیوں میں اپنے علم و فن کی نمائش ضرور مقصود تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ محض غلطی پر انگشت نمائی کم لوگوں کو متوجہ کر سکے گی اس لئے کبھی اندازِ بیان ایسا ہوتا کہ دلکشی پیدا ہو جائے کبھی نامناسب باتوں کی آمیزش سے ایسی شاعرانہ گفتگو کو پرلطف بنانے کی کوشش کی جاتی بایں ہمہ ان اشعار و جذبات کی تہہ میں چند باتیں قابلِ قدر بھی نظر آتی ہیں۔ انہی خصوصیات میں ایک قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ شاعری بنیادی تصور بن کر موافقین و مخالفین کے سامنے غور و فکر کی مرکز تھی۔ چنانچہ فن کی خوبی و خرابی پر شعراء کی توجہ مرکوز تھی، نکتہ چینی کے جلو میں کچھ ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جن کو تنقید تو نہیں کہا جا سکتا مگر وہ اپنے وقت کے ذہنی شعور کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں۔ عروضی خامیاں، صرف و نحو کی کمزوریاں اور اس طرح کی دوسری خرابیوں کو قابلِ اعتراض سمجھ کر ادب کی صالح قدروں پر نظر ڈالنے کا ثبوت برابر ملتا ہے۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ملتی ہے کہ یہی رنجش بے جا جو طرفین کی یاوہ گوئی کا باعث تھی۔ عموماً وجہِ ندامت بھی ثابت ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کئے پر شاعر بہت پشیمان ہے اس کا وہ پُرنور جذبہ جو وسیع النظری اور انسان دوستی کا مظہر ہوتا معاشرے کی پستی اخلاق میں دب کر گرد آلود و حقیر ہو گیا تھا۔ وہ ایک سانحہ یا شدید احساس کے جھٹکے سے اوپر آگیا ہے اس نے اپنی اصل جگہ حاصل کر لی ہے اُس کی روشنی نے شاعر کے دیدہ و دل کو ہمیشہ کے لئے روشن کر دیا ہے۔ چنانچہ وہی شعراء جو تمام عمر آپس کی چشمک زنی کے لئے بدنام تھے انہی نے فریقِ ثانی کے انتقال پر بڑے دردناک الفاظ میں اظہارِ تاسف کیا۔ بعض بعض نے تو شعر کہنا چھوڑ دیا گویا زندگی بھر کی لذت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ اُن کی یہ دست برداری نہ صرف گزشتہ خامیوں کی کفارہ تھی بلکہ ایک طرح سے دوسروں کے لئے اعلان بھی کہ ع من نہ کردم شما حذر بکنید۔

بہر حال مقابل کی وفات نے بدمذاقی کی گرد ہٹا کر اصل انسان اور عظمت شاعری کا احساس فریق کو دلا دیا۔ اس اجمال کی تفصیل اور دعوے کے ثبوت کے سلسلہ میں اچھا تھا کہ ہم اردو شاعری کی چشمک کی نشو و نما پر ایک نظر ڈال لیں۔

اس سلسلہ میں ولی کا ایک شعر ملتا ہے جس میں ناصر علی پر چوٹ کی گئی ہے جس کا جواب بھی دیا جا چکا ہے اور ہم اوپر پیش بھی کر چکے ہیں۔ اس نوک جھونک کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند میں چشمک کی ابتدا بری نہ تھی حالاں کہ یہ خیال اس وقت غلط ہو جاتا ہے جب ہم مرزا جان جاناں اور شاہ مبارک آبرو کی بے تکلفی اور بے باکی دیکھتے ہیں مگر آگے چل کر اس قسم کی کچی بات نہیں ملتی۔ مثال کے لئے مرزا جان جاناں اور مرزا رفیع سودا کو لے لیجئے۔ سودا نے مرزا مظہر جان جاناں کی شان میں پہلے جو چند اشعار کہے ہیں اُن کو ملاحظہ فرمایئے۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہوئے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شاہ کی لاٹ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں
کتا ہے دھوبی کا کہ گھر کا نہ گھاٹ کا

لیکن یہی مرزا سودا، مرزا مظہر جان جاناں کی وفات پر جس اثر کے ساتھ تاریخِ وفات کہتے ہیں وہ اُن کے دل کا درد معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی بے چینی و اشک ریزی کا اندازہ اس قطعہ سے کیجئے ؎

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتد شوم
اور اُن کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ از روئے درد یہ سن کے کہی
سودا نے کہ ہائے جان جاناں مظلوم

بظاہر ان دونوں قطعات میں جذبات کا تضاد ہے پہلے میں اعتراضات کی بھرمار ہے، اور دوسرے میں احترام و افسوس کا احساس، لیکن یہ سودا کے ذہنی شعور کا اختلاف نہیں، پہلے قطعہ میں مظہر جان جاناں کی شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سودا کو اُن کے کلام میں ایسی خرابیاں نظر آتی ہیں کہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور دوسرے میں مرزا مظہر جان جاناں کے خونِ ناحق اور عظیم شخصیت کا ردِ عمل اُن کو اتنا متاثر کرتا ہے کہ اس قتل کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور غم آمیز انداز میں نوحہ کرتے ہوئے اس بزرگ ہستی کو یاد کرتے ہیں تو کہتے ہیں "ہائے جان جاناں مظلوم"۔ سودا کی رائے جو مرزا مظہر کے کلام کے بارے میں ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اُن کے اس اندازِ کلام پر اعتراض ہو سکتا ہے اُن کے پہلے قطعہ کو بدکلامی کا نمونہ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن وہ اُن کے تنقیدی شعور کی نمایندگی کرتا ہے وہ کسی وجہ سے مظہر جان جاناں کے کلام کو ناقص پاتے ہیں، غالباً فصاحت اور بلاغت کی کمی پاتے ہیں جو اُن کے اشعار کی زبان و تصرفِ الفاظ کے لحاظ سے "روڑا ہے باٹ کا" کہتے ہیں۔ لیکن اُن کو اظہارِ خیال پر ٹوکا نہیں جا سکتا۔ بہر حال مرزا مظہر جان جاناں کی وہ شاعرانہ خامیاں جو سودا کے نزدیک قابلِ مذمت تھیں وہ بھی انسان دوستی اور مرزا مظہر جان جاناں کے اعترافِ عظمت میں سدِ راہ نہ ہو سکیں اُن کی مفارقت کے احساس اور اظہارِ غم میں وہ سودا کے لئے "روڑا ہے باٹ کا" نہیں بن سکیں۔

ان باتوں کی پیش کرنے کی غرض یہ ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ شاعر کی ادبی منافرت مستقل حیثیت نہیں اختیار کر سکی، علمی قابلیت، روحانی بلندی، اخلاقی جوہر کو اسی منافرت سے کوئی خاص صدمہ نہیں پہنچا۔ یہ ہمارا مفروضہ نہیں بلکہ سودا کے حالاتِ زندگی میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ نمونہ کے لئے فاخر مکیں کا واقعہ دیکھ لیجئے۔ مگر اس سے پہلے اس ضمن میں محمد حسین آزاد کی بھی رائے سنتے چلئے "آبِ حیات" میں وہ رقمطراز ہیں کہ "حق یہ ہے کہ جو کچھ اِن (سودا) کی زبان سے نکلتا تھا باعث اس کا یا فقط شوخیٔ طبع یا کوئی عارضی جوشِ ناراضی کا ہوتا تھا اور مادہ کثافت فقط اتنا ہوتا تھا کہ جب الفاظ کاغذ پر آجاتے تھے تو دلِ صاف ہو جاتا تھا۔" ... ہمارا زمانہ ایسے مہذب اور شائستہ لوگوں سے آراستہ ہے کہ لفظ 'ہجو' کو گالی سمجھتے ہیں مگر دلوں کا مالک اللہ ہے[1]۔"

مرزا فاخر اور مرزا سودا کی لڑائی کی بنیاد بھی علمی و ادبی تھی مرزا فاخر کی شعر فہمی اور فارسی کے مستند شاعروں کے کلام کو قابلِ اعتراض کہنا مرزا سودا کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ سودا نے ایک رسالہ[2] عبرت الغافلین

[1] آبِ حیات۔ سلسلہ ذکر مرزا مظہر جان جاناں ص۱۴۵ [2] آبِ حیات ص۱۶۲

لکھا اور مرزا فاخر کی غلط فہمیوں کو اصول انشا پردازی کے بموجب کماحقہ ظاہر کیا۔ ساتھ ہی ان کے دیوان پر نظر ڈال کر اس کی غلط فہمیاں بھی بیان کیں اور جہاں ہو سکا اصلاح مناسب دی۔ غرض کہ بنائے مخاصمت شعر و فن کی خوش فہمی یا غلط فہمی تھی مگر بات اتنی بڑھی کہ اہلِ قلم کی لڑائی تیغ و سناں تک پہونچی۔ مرزا فاخر کے ساتھیوں نے مرزا سودا کی جان ہی لے لی تھی وہ تو حسن اتفاق سے ہی سعادت علی خاں کی سواری اس طرف نکل آئی جہاں مرزا فاخر کے ساتھی مرزا سودا کو نرغہ میں لئے رکھتے۔ انہوں نے سودا کی جان بچائی۔ جب اس جاہلانہ و جارحانہ کارروائی کی خبر آصف الدولہ کو ہوئی تو انہوں نے حکم دیا کہ مرزا فاخر جس حال میں ہو اسی حال سے حاضر کرو، سودا کی نیک نیتی دیکھئے جا ہے، ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ ۔

"جناب عالی ہم دونوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان
میں آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے حضور اس میں مداخلت
نہ فرمائیں۔ غلام کی بدنامی ہے۔"

سودا کا نواب آصف الدولہ سے یہ کہنا کہ جناب عالی ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں فیصل ہو جاتی ہے"، بجائے خود ایک بیّن ثبوت اس بات کا ہے کہ شعرا کا باہمی اختلاف علم و ہنر کے لئے تھا۔ ذاتی خصومت کا دخل نہ تھا ورنہ جس حریف نے ہر طرح کی اذیت پہنچانے کی کوشش کی ہو اس سے بھرپور انتقام لینے میں کیا دریغ ہو سکتا ہے۔ اُن کی دوسری بات کہ غلام کی بدنامی ہے" اس احترام کی نشان دہی کرتی ہے کہ اہلِ علم کو ذلیل و خوار کرنا جاہل کا کام ہے کوئی اور صاحبِ شعور کسی حال میں دوسرے عالم کی توہین نہیں پسند کرتا اگرچہ اس عالم نے بیوقوفی سے کیسے ہی غیر عالمانہ حرکت کی ہو۔ یہ چشمک زنی اس معنی میں تو ضرور ذاتی تھی کہ کبھی کبھی فریقین جیتے جی اس سلسلہ کو قائم رکھتے۔ کسی ایک کی وفات کے بعد باقی رہنے والا، مرنے والوں کے لئے بجز اظہارِ غم کے اور کوئی بات نہیں کہتا تھا، عموماً نظم کہہ کر اپنے درد و تاسف کا اظہار کرتا۔ لیکن ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ باقی رہنے والا شاعر اپنے ایسے اشعار کو خرافات سمجھتا جو مرحوم کی زندگی میں چھیڑ چھاڑ کے لئے اُس نے کہے تھے کبھی کبھی ساتھ ہی ساتھ اپنی ندامت کا اظہار بالاعلان نثر میں بھی کیا۔

اس قسم کے واقعات کی ایک مثال سودا و میر ضاحک کے سلسلہ میں ملتی ہے۔ لگے ہاتھ اُسے بھی دیکھتے چلئے۔

سودا اور میر ضاحک میں چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ نہایت تیز ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے کو اس طرح خطاب کرتا تھا کہ جیسے شرافت دھو کر پی گیا ہے، اخلاق کا کوئی معیار نہیں رہ گیا تھا بلکہ بعض وقت تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اوباش بھی اس یاوہ گوئی پر شرما جائیں تو عجب نہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اتنے قابل اور ذی مرتبہ شعراء کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کتنی کثافت رہی ہوگی مگر میر صاحب کے انتقال کے بعد سودا پر اسی پیمانے کا ردِ عمل بھی ہوا۔ اس کا بیان محمد حسین آزاد[۱] سے سنئے، لکھتے ہیں۔

"میر صاحب کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لئے گئے، اور دیوان اپنا ساتھ لے گئے، بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں تھی، بہت سے عذر کئے، اور کہا ۔ ۔ ۔ ۔ جو کچھ اس رُوسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو، بعد اس کے نوکر سے دیوان منگوا کر جو ہجویں ان کے کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بہ مقتضائے علو حوصلہ و سعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا منگوایا اور جو ہجویں اُن کی تھیں پھاڑ ڈالیں" اس احساسِ ندامت پر غالب کی زبان میں یہ تو کہا جا سکتا ہے "کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ" مگر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ اس انداز کی توبہ بھی کون کرتا ہے؛ اس چھیڑ چھاڑ میں اردو کے تمام شعرا سے زیادہ سودا کا کارنامہ قابلِ توجہ ہے۔ اتفاق سے وہ اردو کے متعدد اہم شعراء سے بھی متعلق ہو گیا ہے اور اس میں تنوع بھی بہت ہے۔ سودا نہ اپنی چھیڑ چھاڑ کے جواب کا انتظار کرتے ہیں نہ کسی کی خاموشی پر خاموش رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر اُن پر کوئی اعتراض کرتا ہے تو کبھی کبھی خوش ہو کر معترض کو انعام دیتے ہیں۔ کبھی نکتہ چیں سے گلے مل کر شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی چشمک زنی میں جتنی علمی و ادبی لطافت ہے اتنی کسی اور کے یہاں نہیں نظر آتی وہ اپنے مخالف کی اُن شاعرانہ خرابیوں پر بھی اشارے کرتے ہیں جو اُن کی نظر میں نامناسب نہیں، مثال کے لئے خواجہ میر درد کے بارے میں کہتے ہیں ؎

درد کِس کِس طرح بُلاتے ہیں

---

۱ آبِ حیات ص۱۶۸

کرکے آواز منحنی و حزیں !
اور جو احمق کہ اُن کے سامع ہیں
دم بدم اُن کی یوں کریں تحسیں
جیسے سبحان من یرانی .... پر !!
لڑکے مکتب کے سب کہیں آمیں
شعر و تقطیع اُن کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقش نگیں !
اِس میں بھی دیکھیے تو آخر کار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں !
اتنی کچھ شاعری یہ کرتے ہیں
مینخ در .... آسماں زمیں

اس بیان کے بعد محمد حسین آزاد یہ بھی لکھتے ہیں۔

" خیر یہ شاعرانہ شوخیاں ہیں، ورنہ عام عظمت اُن (دردؔ کی) کی جو عالم پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے اثر سے سودا کا دِل بھی بے اثر نہ تھا چنانچہ کہا ہے " ؎

سوؔدا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ
اے بے ادب تو دردؔ سے بس دو بدو نہ ہو

میر دردؔ کی مجموعی خصوصیات کا سودا کے دل پر بہت اچھا اثر تھا کہ صحیح معنوں میں اُن کو اپنا دوست سمجھتے تھے چنانچہ آب حیات میں ہے کہ ایک شخص لکھنؤ سے دلّی چلے، مرزا رفیع کے پاس گئے اور کہا دلّی جاتا ہوں کسی یار آشنا کو کچھ کہنا ہو تو کہہ دیجیے۔ مرزا بولے کہ بھائی میرا دلّی میں کون ہے۔ ہاں خواجہ میر درد کی طرف جا نکلو تو سلام کہہ دینا۔ ذرا خیال کر کے دیکھو مرزا رفیع جیسے شخص کو دلی بھر میں (اور دلّی بھی اُس زمانہ کی دلّی) کوئی آدمی معلوم نہ ہوا۔ الاّ وہ "

اس دور میں جب میرؔ و سوؔدا بر خود غلط شعرا کو شعر کہنے سے باز رکھنا چاہتے تھے اور ہونہار نوجوانوں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ ریختہ کو فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھال کر ایک حسین رُوپ میں دیکھنا چاہتے تھے اس زمانہ میں زبان اور الفاظ کی تراش خراش پر بھی اتنا زور تھا کہ شاید شاعری کے اور کسی پہلو پر اتنا نہ تھا چناں چہ آپ نے دیکھا کہ مظہر جانِ جاناں ایسے بلند پایہ ادیب کی شاعری کو بھی سوؔدا نے جب الفاظ و زبان کی کسوٹی پر کسا تو وہ اُن کو ناقص معلوم ہوئی اسی طرح میر سوزؔ کے ایک شعر پر بھی سوؔدا نے اعتراض کیا اور وہ بیچارے ہنس کر چپ ہو رہے۔ سوزؔ کا مطلع یہ تھا۔

نہیں نکسے ہے مرے دل کی آپا ہے گا ہے
اے فلک بہر خدا رخصت آہے گا ہے

سوؔدا نے کہا میر صاحب بچپن میں ہمارے یہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں یا تو جب یہ لفظ سُنا تھا یا آج سُنا، اس کے بعد اپنا مطلع سُنایا۔

؎ نہیں جوں گل ہوس ابر سیا ہے گا ہے
کاہ ہوں خشک میں اے برق نگاہے گا ہے[1]

میر سوزؔ کی خاموشی کی وجہ معلوم نہیں کیا تھی، ہو سکتا ہے اپنی بزرگی کی وجہ سے چپ رہے ہوں یا سوؔدا کی نزاع پسندی سے گھبرا کر چپ رہنا ہی مناسب سمجھا ہے۔ میرؔ سوز کے مطلع پر مرزا سوؔدا کے اعتراض کا ذکر کرنے کے بعد ہی "آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ :۔

" میاں جرأت کی ان دنوں میں ابتدا تھی، خود جرأت نہ کر سکے ایک اور شخص نے کہا حضرت : یہ بھی کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، مرزا نے کہا، کیوں بھئی کیا، جرأت نے پڑھا ؎

سر بسری اُن سے ملاقات ہے گا ہے گا ہے
صحبتِ غیر میں گا ہے سرِ راہے گا ہے

سب نے تعریف کی اور مرزائے موصوف نے بھی تحسین و آفرین کے ساتھ پسند کیا"

میرؔ و سوؔدا کی شاعرانہ رقابت سے اُمید تھی کہ ایسی چشمک پر بھی کافی مواد ملے گا جس پر ایک دوسرے کی شاعری کو نشانہ بنا کر اعتراضات کے تیر برسائے گئے ہوں[2] لیکن مایوسی ہوئی بلکہ اندازہ ہوا کہ وہی شاعر جو، ہجو قبیح میں ناگفتہ باتیں نظم کر جاتا ہے وہی، ہجو ملیح کہتے وقت بڑا سنجیدہ ہو جاتا ہے ہمارے اس خیال کی تائید سوؔدا و میرؔ کے ایسے اشعار سے ہوتی ہے جن میں شاعر پر بحیثیت فن کار چوٹ کی گئی ہے۔ مثلاً سودا میر کے بارے میں ایک شعر کہتے ہیں ؎

نہ پڑھیو یہ غزل سوؔدا تو ہرگز میرؔ کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

اور میرؔ صاحب کہتے ہیں ؎

---

[1] آبِ حیات صفحہ ۱۹۷

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ اس شعر کے فن میں
یوں ہی سوداؔ کبھی ہوتا ہے، سو جاہل ہے کیا جانے

اس موقع پر سوداؔ نے اپنی وضعداری میں فرق نہیں آنے دیا۔ شوق و شرارت سے دل خوش کرنے کے لئے یہ تو کہہ دیا کہ وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے، مگر جہاں یہ ہے وہیں اُن کے دیوان میں میرؔ کی عظمت کے اعتراف میں یہ شعر بھی نظر آتا ہے ؎

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے اُستاد کی طرف

ہلکے سے سہی مگر یہاں بھی سوداؔ نے اپنے فنی شعور کی نشان دہی کر دی ہے اُن کی طرزِ خاص اور اندازِ بیان سے اُن کے نزدیک میرؔ بہرہ ور نہیں اس لئے وہ اپنے فن کا میرؔ کے سامنے پیش کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ میرؔ نے حسبِ معمول اپنی بلندیٔ فن کا جامعیت کے ساتھ اعلان کیا اور بتایا کہ میرے ادراک و اشعار میں فن کی وہ بلندیاں ہیں کہ میدانِ سخن میں کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بھولے بھٹکے سوداؔ کبھی معرکہ آرائی میں سامنے آجاتا ہے مگر وہ بھی کیا ہے۔

سوداؔ اور میرؔ کے دور سے آگے بڑھئے تو شاعرانہ چشمک کے میدان میں انشاؔ و مصحفیؔ معرکہ آرا نظر آتے ہیں۔ یہاں سوداؔ کی طرح انشاؔ شاعر و غیر شاعر دونوں کو ہدفِ ملامت بنا لیتے ہیں جو بھی اُن کے نزدیک قابلِ ہجو ہوا اس کا ذکرِ بد ضرور کرتے ہیں لیکن اس دور میں نہ اتنے اہم شعرا ہیں نہ سید انشاؔ کی چشمک میں وہ تنوع ہے جو سوداؔ کے یہاں تھی۔ ہم کو غیر شاعر کے تذکرے سے کوئی واسطہ نہیں صرف شعرا کے کلام سے واسطہ ہے جنہوں نے دوسروں کے بارے میں کچھ کہا یا اُن کے بارے میں کچھ کہا گیا اس لئے اس دور میں چشمک کے متعلق کلام کی ضخامت بھی میرؔ و سوداؔ کے دور سے نسبتاً کم ہے لیکن علمی و ادبی کمزوریوں کی صراحت اس میں ہمیشہ سے زیادہ ہوئی۔ انشاؔ و مصحفیؔ دونوں نے زبان و شعر میں جو کچھ تنقیدی اشارے پیش کئے وہ تنقید کی بنیاد تو نہیں بن سکتے۔ لیکن اس کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ اس وقت کے لوگوں کے بھی نزدیک فنی خوبی و خرابی کا ذکر صرف زبان تک محدود نہیں رہ گیا تھا تحریر میں بھی آنے لگا تھا، علم سینہ، علم سفینہ کی سرحد سے روز بروز قریب ہوتا جا رہا تھا۔ مثال کے لئے مصحفیؔ کی ایک غزل لے لیجئے اور پھر اس پر جو بحث ہوتی ہے وہ ملاحظہ فرمائیے۔ مصحفیؔ کی یہ غزل ایک طرحی مشاعرہ کے سلسلہ میں ہے۔ یہ غزل بجائے خود تو ہمارے موضوعِ سخن سے الگ ہے مگر اس کا نقل کرنا اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ بغیر اس کے دیکھے ہوئے نہ انشاؔ کے اعتراضات کا لطف آئے گا نہ مصحفیؔ کے جواب کا مزہ ملے گا۔

سر مُشک کا تیرا ہے تو کافور کی گردن
نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن
مچھلی نہیں ساعد میں ترے بلکہ نہاں ہے
دو ہاتھ میں ماہیٔ سقنقور کی گردن
یوں مرغِ دلِ اس زلف کے پھندے میں پھنسا ہے
جوں رشتۂ صیاد میں عصفور کی گردن
دل کیوں کہ پری حور کا پھر اس پہ نہ پھسلے
صانع نے بنائی تری بلور کی گردن
اک ہاتھ میں گردن ہو صراحی کی مزا ہے
اور دوسرے میں ساقیٔ مخمور کی گردن
ہر چند میں جھک جھک کے کئے سیکڑوں مجرے
پر خم نہ ہوئی اس بتِ مغرور کی گردن
کیا جانئے کیا حال ہوا صبح کو اس کا
ڈھلکی ہوئی تھی شب ترے رنجور کی گردن
یوں زلف کے حلقے میں پھنسا مصحفیؔ اے وائے
جوں طوق میں ہوئے کسی مجبور کی گردن

سید انشاؔ نے اس طرح میں ایک غزل کہی اور ایک قطعہ بھی کہا جس سے چشمک کے علاوہ مصحفیؔ و انشاؔ کی زبان دانی و فنی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ قطعہ

سُن لیجئے گوشِ دل سے مرے مشفقانہ عرض
مانندِ بید غصہ سے مت تھرتھرائیے
بلور، گو درست ہو، لیکن یہ کیا ضرور
خواہی نخواہی اُس کو غزل میں کھپائیے
دستور و نور و طور یہ ہیں قافئے بہت
اس میں جو چاہئے تو قصیدہ سُنائیے۔

یہ تو غضب ہے کہیئے غزل آٹھ بیت کی
اور اس میں رُوپ ایسے انوکھے دکھایئے
کیا لُطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر
مُردے کی باس زندوں کو لاکر سنگھایئے
یوں خاطرِ شریف میں گذرا کہ بزم میں
کھُلا ہوا شریفہ غزل کو بنایئے
ایسے بجس، کثیف قوانی سے نظم میں
دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمایئے

گردن کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا:
سانڈے کی طرح آپ نہ گردن ہلایئے
مشفق کڑی کمان کو کڑی نہ بولیئے
چِلّا کے مفت تیرِ ملامت نہ کھایئے
اُردو کی بولی ہے یہ بھلا کھایئے قسم
اس بات پر اب آپ ہی مصحف اُٹھایئے
اُستاد گرچہ ٹھہرے ہیں صاحب یونہی سہی
لیکن ڈھکی ہی رکھیئے بس اُس کو چھپایئے

انشاء اللہ خاں کے مزاج میں جتنی بھی ظرافت رہی ہو اس وقت ہم کو اس سے سروکار نہیں، یہاں یہ کہنا ہے کہ فنِ شعر پر اُن کی اچھی خاصی نظر تھی چناں چہ یہاں سب سے پہلی بات جس پر اُن کو اعتراض ہے، وہ یہ ہے کہ ہر قافیہ کو غزل میں نظم کرنے کی کوشش بدمذاقی ہے۔ گردن کافور باندھنا جائز ہو یا نہ ہو مگر انشا کا یہ اعتراض قابلِ غور ہے کہ کافور عموماً تجہیز و تکفین کے کام میں آتا ہے۔ اُس کی خوشبو ذہن کو میت کی طرف منتقل کرتی ہے۔ ایسے قافیئے غزل کو بجائے صحت مند بنانے کے کھُلا ہوا شریفہ بنا دیتے ہیں۔ ان قافیوں کو وہ غزل میں مکروہ سمجھ کر گریز کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ مصحفی کے مشاہدہ پر بھی اعتراض ہے کہ سقنقور (حشرات الارض) کو غالباً شاعر نے دیکھا ہی نہیں ورنہ اس کی گردن کا ذکر ہی نہ کرتے اس بات کا کہنا بالفاظ دگر ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ بتا رہا ہو کہ شاعری میں تخیل کے علاوہ مشاہدہ بھی ضروری ہے، ورنہ غلطی کا احتمال رہے گا۔ آگے چل کر انشا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُردو کی بولی کسی اور زبان کا چربہ نہیں کہ اصلی زبان پر عبور حاصل کرنے سے اُردو پر بھی عبور حاصل ہو جائے اس کے آئین وضوابط، مذاق ومزاج انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کو دُنیا نے عروض و قوت بیان کی وجہ سے اُستاد مان لیا اسی کو غنیمت سمجھیئے۔

سید انشا کے اعتراضات کا جواب مصحفی کی طرف سے بھی دلچسپ اور پُراز معلومات ہے۔ آخر الذکر نے اپنی بریت میں جو کچھ کہا وہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے:
تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن
ہے آدم خاکی کہنا خاک کا پُتلا:
گر نور کا سر ہوئے تو ہو نور کی گردن
میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا
ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں
کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لیے وضع ہے ناداں
بے جا ہے خمِ بادۂ انگور کی گردن:
اس سے بھی میں گذرا، غلطی اور یہ سُنیئے
باندھے ہے کوئی خوشۂ انگور کی گردن
کافور سے مطلب ہے میرا اس کی سفیدی:
ٹھنڈی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن
یہ لفظ مشدد بھی درست آیا ہے تجھ سے
خم ہوتی ہے کوئی مری بلّور کی گردن:
آئی نہ تمیز آئی تجھے ربط بھی کچھ ہے
ہر قافیہ میں تو نے جو منظور کی گردن
یوں سینکڑوں گردن تو گیا باندھ تو کیا ہے
سُوجھی نہ تجھے حیف کہ مزدور کی گردن
جو گردنیں میں باندھی ہیں لا تجھ کو دکھا دوں
تو مجھ کو دکھا دے شبِ دیجور کی گردن

منصف ہو تو پھر نام نہ لے دعوے کا ہرگز
یہ بوجھ اُٹھا سکتی نہیں مور کی گردن

انصاف کیا اس کا میں اب شہ کے حوالے
جھکتی ہے جہاں مار سے لے مور کی گردن
وہ شاہ سلیمان کہ اگر تیغ عدالت
ٹک کھینچیں تو دو ہو وہیں فغفور کی گردن

مصحفی کے جوابات میں بھی وزن ہے انھوں نے بھی چوتھے شعر میں یہ اشارہ کیا ہے کہ غزل میں لنگور کی گردن کا نظم کرنا شاعر کا کام نہیں، متشاعر کا ہو سکتا ہے گویا دونوں اُستاد اس بات کے معترف ہیں کہ غزل کی نزاکت ہر قافیہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، سوچ سمجھ کر غزل میں قافیہ صرف کرنا چاہیئے۔ مصحفی نے سید انشار کی طرحی غزل پر جو اعتراضات کیے ہیں اُن کی معقولیت و غیر معقولیت کا جائزہ لینا ان دونوں فریق میں سے کسی کا ہمنوا ہونا ہے۔ اس لیے ہم صرف محمد حسین آزاد کی مختصر مگر معقول رائے کو پیش کر دینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ آزاد کا فیصلہ ہے۔

"ان دونوں قطعوں کو پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ دونوں باکمال ادائے مطلب پر کسقدر قدرت رکھتے تھے بے شک عام لطف بیان اور خاص طنزوں کے نشتر سید انشار کی سفارش کریں گے، مگر بڈھے دیرینہ سال نے جو اسی غزل کی زمین میں مطالب مطلوبہ کو ادا کر دیا یہ قدرت کلام شاید اسے پیچھے نہ رہنے دے۔" آگے چل کر اس ضمن میں لکھتے ہیں۔" اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ منجملہ اور اعتراضوں کے مصحفی کی غزل میں ماہی سقنقور میں ق یہ تشدید پڑھی جاتی ہے۔ سید انشار نے اس پر بھی تمسخر کیا اور شیخ مصحفی نے یہ شعر سند میں دیا کہ ؎

مائم و فقیری و سیہ روئی کونین
رخسار سفید، امرا رانہ شناسیم

سید انشار پر جو اعتراض کیا ہے کہ فقط سقنقور کیوں کہا؟ یہ شیخ مصحفی کا کہنا بیجا ہے کیوں کہ سقنقور ایک جانور کا نام ہے اور یہ لفظ اصل میں یونانی ہے، مچھلی کو اس سے کچھ خصوصیت نہیں۔"

اُردو زبان اس ہنگامے میں بھی اپنی نامیاتی قوت کی بدولت کچھ نہ کچھ ادبی فیض حاصل کرتی رہی۔ مثلاً مصحفی کو یہ خیال تھا کہ شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ، انشار کی وجہ سے مصحفی کو موردِ الزام سمجھتے ہیں۔ چناں چہ اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ایک قصیدہ بطور معذرت شہزادے کی خدمت میں پیش کیا، یہ قصیدہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ اس سے پہلے اُردو میں شاید ہی کوئی منظوم عرض داشت کسی بڑے شاعر نے کسی ممدوح کے سامنے پیش کی ہو جس میں تسلسل کے ساتھ حقیقت کی روشنی میں ذاتی حالات بیان ہوئے ہوں۔ نزاع باہمی کی وجہ، فریق مخالف کی چھیڑ چھاڑ، سید انشار کے خلاف جلوس نکالنے والوں سے اپنی علیحدگی اور اس قسم کی دوسری تفصیلات مصحفی نے بڑی لطافت و دلکشی کے ساتھ قلمبند کی ہیں۔ اگر ادبی محاسن کی اس قصیدے میں کمی ہوتی تو ساری عرض داشت کچہری کی عرض نالش کا نمونہ ہو جاتی۔ مگر واقعات میں چاہے صحت ہو نہ ہو حُسن بیان نے اس قصیدہ کو ایک نئی عظمت عطا کر دی ہے، اس کے علاوہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس وقت تک اُردو زبان میں وہ صلاحیتیں پیدا ہو گئی تھیں کہ قاعدہ و اثر کے ساتھ زبان شعر میں بھی ساری نجی باتیں بیان کی جا سکیں۔

ایک ایسا قطعہ بھی اُسی دور کا ہے جس میں مصحفی نے فنِ شعر کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ بتایا ہے کہ اُردو کے شاعر کو کن کن باتوں سے واقف ہونا ضروری ہے اس کو کتنے مسائل کو عبور کے بعد میدانِ شاعری میں قدم رکھنا چاہیئے۔ عروض پر سرسری نظر کر کے اپنے کو استاد سمجھنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ اس قسم کی اور بھی کمیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو بغیر پوری کیے شاعر گم راہ ہو جاتا ہے۔ اس قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بعضوں کا گماں ہے یہ کہ ہم اہلِ زباں ہیں
دلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں
سیفی کے رسالہ پہ بنا اُن کی ہے ساری
سو اس کو بھی گھر بیٹھے وہ آپ ہی نگراں ہیں
اک ڈیڑھ ورق پڑھ کے وہ جامی کا رسالہ
کرتے ہیں گھمنڈ اپنا کہ ہم قافیہ داں ہیں:
تعقید سے واقف نہ تنافر سے ہیں آگاہ !!
نہ حرف یہی قافیہ کے وردِ زباں ہیں
حاصل ہے زمانہ میں جنہیں نظم طبیعی . . .
نظم اُن کی کے اشعار بہ از آب رواں ہیں

مجھ کو تو عروض آتی ہے نہ قافیہ چنداں
اک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں

یہ تو نہیں کہ اس سے پہلے چشمک زنی میں اردو شعراء نے اپنے فنی شعور کا ذکر نہ کیا ہو مگر عموماً یہ ہوا کہ دوسروں کے اشعار پر اعتراض یا نکتہ چینی کرتے وقت اپنا نقطۂ نظر پیش کر کے لوگ چپ ہو گئے ہیں گویا صرف ایک مخصوص بات کی خوبی و خرابی تک ان کا بیان محدود تھا۔ مصحفی کے اس قطعہ میں اگرچہ باتیں معمولی کہی گئی ہیں لیکن جو کچھ کہا گیا ہے اس میں عمومیت ہے۔

کسی ایک شعر یا شاعر ہی تک انہوں نے روئے سخن محدود نہیں رکھا لیکن اس موقع پر ان کے ذہن میں انشا ر ہے ہوں اس خیال کو تقویت مطلع سے بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ سید صاحب دلی میں اتنا نہیں رہے جتنا اس زمانے کے لوگ اہلِ زبان بننے کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مگر مصحفی نے یہاں متانت اور بڑے پن سے کام لے کر انشا رکا کہیں نام نہیں آنے دیا نہ اُن کے کسی شعر کی طرف انگشت نمائی کی۔ یہ قطعہ اور اس سے پہلے کا وہ قصیدہ جو بطور معذرت پیش ہوا دونوں ہنگامہ و انتشار کی پیداوار ہیں اگر مصحفی و انشا ر میں بدکلامی یا چھیڑ چھاڑ نہ ہوتی تو یہ چیزیں شاید وجود پذیر نہ ہوتیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ادبی ہنگامہ آرائیاں اس فائدے کی وجہ سے قابلِ قبول سمجھی جا سکتی ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط بلکہ معاشرہ و ادب دونوں کے لئے تباہ کن ہوگا۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو نے اندھیرے سے بھی تھوڑی بہت روشنی حاصل کر کے اپنی امتیازی خصوصیت کا یہاں ثبوت دیا ہے۔

مصحفی اور انشا کا جھگڑا ایک طرح سے اور بھی فائدہ پہنچا گیا۔ دونوں استاد زیادہ سے زیادہ قوتِ تخلیق سے کام لے کر اپنی شاعرانہ عظمت کا ثبوت پیش کرنے میں منہمک نظر آتے ہیں، مشکل زمین میں بھی اچھے اشعار کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے قطعات و قصائد میں شعر کے حسن و قبح اور فنکاری کو کامیابی کے دروازے تک پہنچنے کے لئے مخصوص لوازم کا پتہ بتاتے ہیں۔ اس نشان دہی سے اُن کی ذہنی کاوش کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس زمانے میں بلکہ اس جھگڑے میں سید انشا ر نے اپنی ندرت پسندی کا ایک اور ثبوت دیا، عرصہ سے یہ خیال اُن کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا کہ اردو کے عروض میں کچھ تبدیلی ہونی چاہئے۔ اس کو خواہ اُن کی تمسخر پسندی کی دوسری شکل سمجھئے یا اس نظریہ کا شاخسانہ سمجھئے کہ وہ اردو کو ہر لحاظ سے فارسی اور عربی کی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ قواعد اردو میں بھی تبدیلی کی خواہش و کوشش دریائے لطافت میں تلاش کی جا سکتی ہے تقطیع میں مفاعلین مفاعلین کی جگہ پری خانم پری خانم، اور فاعلن کی جگہ چت لگن اور اس طرح بعض دوسری بحروں میں بھی تبدیلی انشا ر نے سوچی تھی، مثلث کا نام تکرا اور مربع کا نام چوکرا انہی نے تجویز کیا تھا، یہ تبدیلیاں برائے نام سہی۔ کوئی بنیادی یا مرکزی ترمیم کی حامل نہ سہی مگر پھر بھی ایک ذہنی خلفشار کی نمائندگی ضرور کرتی ہیں۔ تبدیلی کا یہ جذبہ بھی جھگڑوں میں اُبھر کر عملی صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ انشا ر نے اپنی پوری اُفتادِ طبع سے متاثر ہو کر ایک ایسی بحر میں مصحفی کی ہجو کہی جو اردو میں کبھی نہ تھی نہ اس سے پہلے تھی نہ بعد میں رواج پا سکی۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

یہ خداوندی ذاتے کہ رحیم است و کریم است و حلیم است و حکیم است و عظیم است و سلیم است و قدیم است و شریف است و لطیف است و خبیر است و بصیر است و نصیر است . . . " یونہی قسمیں کھاتے دور تک انشا ر چلے جاتے ہیں۔ تب اس کے بعد مصحفی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

"شنو اے مردکِ ناداں . . . . غزل پوچ تو و مثنوی ہرزہ کہ مجموعہ دشنام غلاظات"

یہ سلسلہ پھر پہلے مصرعہ کی طرح کوسوں چلا جاتا ہے۔ آزاد نے اس بحر کو بحرِ طویل کہا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اگر یہ بحرِ طویل ہے تو اردو فارسی کی مروجہ بحرِ طویل کو کیا کہا جائے گا۔

اِن تیز نشتروں کے باوجود بھی جب انشا ر کا انتقال ہوا تو مصحفی نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے اُن کی ساری زندگی بے کیف ہو گئی ہے۔ بڑے درد سے کہا ہے

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگِ قتیل و سید انشا ر مجھے

ان تبدیلیوں کے ذکر سے ہمارا مقصد یہ نہ سمجھا جائے کہ اِن نمونوں کو ہم قابلِ قدر سمجھتے ہیں عرض یہ کرنا تھا کہ ذہنی انقلاب کی لہر یا خواہش کی مختلف صورتیں اس طرح نمایاں ہو رہی تھیں کہ اُن میں بجائے خود بنیاد بننے کی صلاحیت نہ تھی مگر مستقبل کے ادبی خدمت گذاروں کو زبان کی ترقی کے لئے اشارے ان میں ضرور ملتے ہیں۔

انشا ر و مصحفی کے بعد اس صنفِ شاعری کا رنگ وہ نہ رہا جس میں سخت کلامی اور ہاتھا پائی کی نوبت آتی، ناسخ، آتش، یا غالب اور ذوق کے زمانے سے لے کر دورِ حاضر تک بدلے ہوئے حالات میں چشمک زنی کی بدلی ہوئی صورت کا جائزہ پھر کسی وقت ملاحظہ فرمائیے گا۔



شروَن کمار ورما

آٹیال

کوشلیا کی شادی کو مشکل سے دو سوا دو سال ہوئے تھے کہ اس کا سہاگ اجڑ گیا محلے میں جس نے سُنا دوڑا آیا۔ ایک ہنگامہ ہوا اور لوگ اپنی اپنی مصروفیات میں کھو کر بھول گئے کہ کبھی اس گھر سے منوہر سائیکل لے کر نکلا کرتا تھا۔ ہر ملنے والے کو چاچا جی تایا جی نمستے کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ خود منوہر کی بوڑھی ماں اور کوشلیا بھی زندگی کی راہ پر گامزن ہو گئی تھیں۔

اس شام کوشلیا نے جب دھوپ کو چھجے سے ہٹ کر سامنے والی شکستہ حویلی کی برساتی پر پھیلتے دیکھا تو منے کو تیار کر کے دادی کے حوالے کیا اور خود ہاتھ منہ دھونے بیٹھ گئی۔ وہ بچے کی کلکاریاں اور دادی کی لاڈ پیار کی باتیں سُن کر خوش ہو رہی تھی۔ دادی کو دل بہلانے کے لیے جیتا جاگتا کھلونا مل گیا تھا اور کوشلیا کو ایک نیک ساس۔ وہ خوش تھی کہ منوہر اُسے جی جان سے چاہتا ہے اور اُس کی ساس اُن بوڑھیوں میں سے نہیں تھی، جو پرائی لڑکیوں میں کیڑے ڈالا کرتی ہیں۔ ساس، خاوند اور ایک خوبصورت پیارا سا بچہ۔ اس چھوٹے سے پریوار میں خوشی سدا بہار پھول کی طرح مہکتی تھی محلے کی بڑی بوڑھیاں منوہر کی ماں کی قسمت پر رشک کرتی تھیں کہ اس کی چاند سی بہو بی اے بی ٹی ہو کر بھی مغرور نہیں۔ ساس کی سیوا کر کے خوش ہوتی ہے۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی جوڑے میں آخری سوئی لگا رہی تھی۔ منوہر کو اس کا ڈھیلا ڈھالا، گردن پر لٹکتا جوڑا پسند تھا۔ اس کی ساس ہنس ہنس کر پوتے کو ڈانٹ رہی تھی کہ وہ ابھی سے بے حد شرارتی ہو گیا ہے اور دادی کو ستانے کے لئے اس کے کپڑوں پر پیشاب کرتا ہے۔

"بہو، منوہر بھی اسی طرح کرتا تھا"

کوشلیا آئینہ کو ترچھی نظروں سے دیکھتی مسکرائی۔

"میری پوجا بھنگ کر دیا کرتا تھا۔ ماں جی کہہ رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر محبت اور ممتا کی جوت سی جل رہی تھی۔ آنکھیں کئی برس پیچھے دیکھ رہی تھیں۔ بہت رویا کرتا تھا، اس کے پتا جی لئے لئے پھرتے۔ بڑا شیطان تھا اور یہ منا اس کا بھی گرو نکلے گا۔ دیکھ کیسا ہنس رہا ہے اپنے باپ کی باتیں سُن کر۔ تل گن دا بچہ، ے۔" وہ پھر منے سے توتلی زبان میں باتیں کرنے لگیں۔ "بالکل منوہر سا ہے۔ وہی آنکھیں وہی ناک، وہی ہونٹ، وہی بال وہی بات بات پر ضد کرنا۔ چھوٹا منوہر لگتا ہے۔ لڑکا باپ پر ہی ہوتا ہے۔ لڑکی جائے گی تجھ پر۔"

کوشلیا شرما گئی تھی۔ اس نے سوچا دادی جب پوتے کو پیار کرتی ہے تو اُس میں اُس کا بچہ جھانک رہا ہوتا ہے۔ عمر کے دو سروں پر ہوتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

اور اسی گھڑی کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

یہ وقت تو منوہر کے آنے کا تھا۔ لیکن وہ دستک تو نہیں دیتا تھا وہ تو سائیکل کی گھنٹی بجاتا اور کوشلیا بچے کو لئے بھاگی جاتی اور ماں جی آواز دیتی رہ جاتیں۔

"بہو دھیرے دھیرے، بہو دھیان سے، سیڑھیاں موئی خراب ہیں۔ پکڑتی ہوں آج منوہر کے کان، مرمت بھی نہیں کرواسکتا۔"

ماں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ آنے والے کو پہچان نہیں سکی۔ وہ اس سے پیشتر کبھی نہیں آیا تھا۔ نو وارد نے پوچھا۔

"منوہر لال کا گھر یہی ہے؟"

"ہاں" ماں نے جواب دیا

کوشلیا بھی ساری کا پلہ سنبھالتی کھڑکی میں آ گئی تھی۔

" ذرا نیچے آئیے ۔" اس شخص نے کہا

ماں نے کوشلیا کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔ تم اسے پہچانتی ہو؟

کوشلیا کی آنکھوں میں وہی جواب تھا جو ماں جی کی نگاہوں میں سوال بن کر چمکا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نیچے دیکھا۔ وہ آدمی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

" تم بیٹھو بہو۔" ماں جی نے کہا۔ " نہ جانے کون ہے، کیوں آیا ہے، میں جاتی ہوں۔" اور وہ بچے کو لے کر سیڑھیاں اتر گئی۔

گھڑی نے پورے چھ بجا دیئے۔ لیکن منوہر کی سائیکل کی گھنٹی نہیں بجی۔ گھڑی کی آخری ٹن کے ساتھ نیچے ماں جی کی دل دوز چیخ گونجی۔ اس نے منوہر کا نام لے کر پکارا تھا۔ پھر کوشلیا کا نام لے کر چیخی تھی۔ کوشلیا گھبرائی سی نیچے پہنچی۔

ڈیوڑھی میں ماں فرش پر بیٹھی سینہ کوٹ رہی تھی۔ اس نے اپنے سفید بال نوچ لئے تھے۔ جمپر پھاڑ لیا تھا۔ بچہ موری میں ٹانگیں ڈالے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ شاید دادی کے اس طرح رونے پیٹنے سے دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اجنبی ڈیوڑھی کی چوکھٹ کا سہارا لئے، سر جھکائے کھڑا تھا۔ کوشلیا ساس کو سنبھالنے کے لئے جھکی۔ ساس نے اجڑی اجڑی آنکھوں سے بہو کی طرف دیکھا اور بازو پھیلا کر چیخی۔

" تو لٹ گئی بہو — تیرا سہاگ، ہائے منوہر" ہائے منوہر ماں نے چھاتی پیٹ لی۔

ایک لمحہ کوشلیا مبہوت سی، ساس کی اجڑی اجڑی صورت کو دیکھتی رہ گئی اور دوسرے لمحے کٹے ہوئے درخت کی طرح اس کی بانہوں میں ڈھیر ہو گئی۔ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ ایک بوڑھی ماں کا اکلوتا جوان بیٹا چل بسا تھا۔ ایک نوجوان عورت کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ ایک معصوم بچہ بغیر کسی قصور کے یتیم ہو گیا تھا۔

بے ہوش کوشلیا کی کلائیاں سونی کر دی گئیں۔ ایک بوڑھی جہاں دیدہ عورت نے انگوٹھے سے اس کی مانگ کا سندور صاف کر دیا، بندیا پونچھ دی۔ کانچ کی چوڑیاں توڑ دیں۔ کوشلیا کی گوری کلائی پر سرخ خون کی ایک بوند چمکنے لگی۔ ساس نے بہو کو دیکھا تو اس کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی اور اس نے بے ہوش کوشلیا کو زور سے بھینچ لیا۔

ہسپتال سے لاش لائی گئی۔

کوشلیا کو کئی بار غش آیا۔ جب ڈیوڑھی میں وہ ہر صبح، مسکرا کر منوہر کو الوداع کہا کرتی تھی اور جہاں وہ پل بھر کو مڑ کر منے کا گال چومنے کی کوشش میں شرارت سے کوشلیا کو چوم لیا کرتا تھا، جہاں وہ ہر شام اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ وہاں اس کی لاش پڑی تھی۔ وہ جو راہ کے کیڑے کو بھی بچا کر چلتا تھا۔ ایک شرابی کے ٹرک تلے آ کر کچلا گیا تھا۔

ہنستے گاتے گھر میں منوہر ایک کہانی بن کر رہ گیا، جو جوان بیوہ اور بوڑھی ماں کی آنکھوں میں ساون بھادوں بنی رہتی۔ ماں کی ہنسی اس حادثے نے چھین لی تھی۔ کوشلیا کی زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا تھا۔ ماں جیسے ایک دم بہت ہی بوڑھی ہو گئی تھی۔ چہرے کی جھریاں گہری ہو گئی تھیں اور وہ کمر جھکا کر چلنے لگی تھی۔ گھنٹوں بھگوان کی مورتی کے سامنے سجدے میں پڑی رہتی۔ کوشلیا آ کر ساس کو سنبھالتی، اور اس کی آنکھیں برسنے لگتیں، اور پھر دیر تک وہ ایک دوسرے کے گلے سے لگی روتی رہتیں۔ اچانک ماں آنسو پونچھ کر کہتی۔

" پاگل ہوئی ہو بہو ۔"

کوشلیا کی ہچکی بندھ جاتی۔ پھر نہ جانے کیا ہوتا کہ ماں اس کے شانے پر سر رکھ کر پھپھک کر رو دیتی۔

کوشلیا کے ماں باپ آئے، اور دیگر رشتہ داروں کے جانے کے بعد وہیں رہ گئے۔ اس کی ساس ان دنوں اور بھی چپ رہنے لگی تھی۔ وہ ماں بیٹی کو اکٹھے دیکھتی تو اٹھ کر اندر چلی جاتی۔ کوشلیا کی ماں نے اسے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ کوشلیا نے دھوپ میں چارپائی پر لیٹی ساس کی طرف دیکھا، جو تھوڑے ہی عرصے میں بہت کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی اور ان میں ایک کرب ناک ویرانی بس گئی تھی۔ چارپائی پر پڑی وہ اسے ایسی لگی جیسے ایک وحشت ناک چیخ مجسم ہو گئی ہو۔ ماں نے بیٹی کی نظروں کا تعاقب کیا اور بولی

" تیری ساس سے میں کہے دیتی ہوں ۔"

کوشلیا نے سوچا وہ ماں کے ساتھ چلی جائے۔ دل ہی بہل جائے گا۔ اس گھر میں تو ہر سمے منوہر کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہتی ہے۔ شام کو چھ بجے سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے اور وہ جیسے سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔ صبح جیسے وہ صحن میں ٹہلتا ہے۔ دیواریں تک اداس ہو جاتی ہیں۔ منوہر کے ہاتھ کی

لگائی ہوئی چمیلی کی بیل جیسے اُس سے پوچھتی ہے۔ وہ کب آئے گا۔ وہ کہاں ہے — اور تب اُس کے آنسو روکے نہیں رُکتے تھے۔

دھوپ ڈھل کر دیوار تک چلی گئی تھی۔ اُس کی ساس چارپائی دھوپ میں لے جانے کی کوشش کر رہی تھی، اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کوشلیا نے اُٹھ کر چارپائی دھوپ میں ڈال دی۔ اُس کی ساس منّے کو بسکٹ کھلا رہی تھی اور اُس سے بے معنی سی باتیں کرتی جا رہی تھی۔ منّا بار بار دادی کی انگلی پر شرارت سے دانت رکھ دیتا اور ہنستا۔

"سامان باندھ لے،" ماں بولی "تیرے پتاجی بھی یہی چاہتے ہیں۔ وہاں بچوں میں رہے گی تو طبیعت بہل جائے گی۔"

"ہاں، جب جی چاہے لوٹ آنا۔" باپ نے آہستہ سے کہا۔

کوشلیا نے باپ کی طرف دیکھ کر نگاہیں جھکا لیں۔ ماں نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور کمرے میں لے گئی۔ اُن کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ ساس نے منّے کو سینے سے لگا کر بند دروازے کی طرف دیکھا پھر بچے کو دیکھ کر لپٹ گئی۔ چند منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ کوشلیا کی ماں اپنے خاوند کی طرف دیکھتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ اُس کے خاوند نے اندر سے نکلتی ہوئی بیٹی کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر بیوی کے پیچھے چلا گیا۔

"کیا کہتی ہے —؟" اُس نے پوچھا۔

"کوئی جواب ہی نہیں دیتی — پہاڑ سی گُم سُم ہو گئی ہے۔" ماں تھکے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے سمجھاتی رہو۔"

کچن میں کوشلیا چولہے کے سامنے بیٹھی جیسے کسی گہرے سوچ میں ڈوب گئی۔ نظریں سامنے دھوئیں سے کالی دیواروں پر مرکوز تھیں۔ ایک چنگاری اُڑ کر اس کے ہاتھ پر گری تو وہ چونکی۔ اُس نے باہر دیکھا۔ ساس اپنی چارپائی پر نہیں تھی۔ منّا اکیلا سو رہا تھا۔ بڑے کمرے میں کلاک نے پانچ بجائے کوشلیا کو خیال آیا کہ ماں جی کو دوا پلانی ہے۔ وہ اٹھی اور ساس کے کمرے میں چلی گئی۔

وہ بھگوان کی مورتی کے سامنے سجدے میں پڑی تھی۔

"ماں جی —" کوشلیا نے ساس کو اُٹھایا اور لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ دوا پلا کر جب وہ لوٹنے لگی تو ساس نے آواز دی۔

"بہو —"

وہ لوٹ کر ساس کے پلنگ کے قریب آ گئی۔ ساس نے اُداس اور غمزدہ سی نظروں سے اُسے دیکھا پھر چھت پر نظریں جما کر بولی۔

"بہو، تم میکے چلی جاؤ —"

کوشلیا خاموش رہی۔ ماں جی کو کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ مجھے لے جانا چاہتے ہیں۔ اُس نے غور سے ساس کی طرف دیکھا۔ اُسے لگا جیسے چراغ تیز ہوا کی زد میں آ گیا ہے۔ ایک ویران پگڈنڈی ہے جس پر دھول اُڑ رہی ہے۔ وہ گھبراتے سے بولی۔

"میں کہیں نہیں جا رہی ہوں ماں جی —"

"کیسی بات کرتی ہو بہو، چلی جاؤ کوئی حرج نہیں۔ دل بہل جائے گا، جب چاہو آ جانا، یہ گھر تو سدا تمہارا رہے گا۔ اس کے دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کھلے ہیں —"

"ماں جی" کوشلیا کا گلا رندھ گیا "میں یہیں رہوں گی —"

ساس نے سوکھی، کمزور باہیں پھیلا دیں۔ کوشلیا اُن میں آ گری۔

"روتی کیوں ہے بیٹی۔ تو تو جانتی ہے تیرے آنسو مجھ سے نہیں دیکھے جاتے۔" اور ساس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

کئی منٹ تک ساس بہو ایک دوسرے کے سینے سے لگی آنسو بہاتی رہیں۔ پھر کوشلیا نے آہستہ سے خود کو الگ کیا اور آنسو پونچھتی باہر نکل گئی۔ دروازے پر کھڑی ماں نے بیٹی کی طرف دیکھا اور ایک طرف ہٹ کر راستہ دے دیا۔

کوشلیا جب رات کا کھانا بنانے بیٹھی تو اس کی ماں پیڑھی لے کر پاس آ بیٹھی۔ کوشلیا سمجھتی تھی کہ ماں کیوں اس کے پیچھے پڑی رہتی ہے وہ اپنے دھیان میں رہی۔ کوشلیا کی سفید دھوتی، روکھے، اُلجھے بال، بنا سندور کی مانگ، بندیا کو ترستی پیشانی، پھیکا پھیکا سا چہرہ اور بجھی بجھی سی آنکھیں، ماں کے سینے میں جیسے تیر اُتر گیا۔ ابھی کل ہی کی بات تھی اس نے پھول سی بیٹی کو بیاہ کا سُرخ جوڑا پہنایا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں مہندی رچائی تھی، سجا بنا کر ڈولی میں بٹھایا تھا اور آج — کیا حالت ہے اس کی۔ جیسے کسی ویران مکان میں گرد و غبار بھر گیا ہو۔ وہ یوں ڈولتی، گرتی پھرتی جیسے خشک پتہ۔

"ماں اور پتاجی کو کھلایا بہو —" اُس کی ساس نے پوچھا

"وہ میرے گھر کا نہیں کھاتے ماں جی۔"

رسوئی سے فارغ ہو کر اُس نے مُنّے کو سنبھالا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اب بھی وہ اُسی کمرے میں سوتی تھی، جس میں منوہر کی زندگی میں سویا کرتی تھی۔ وہاں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ الماری میں منوہر کا شیو کا سامان جوں کا توں رکھا تھا۔ کھونٹی پر اُس کی ٹائی لٹک رہی تھی۔ اُس کا سیاہ چشمہ کارنس پر رکھا تھا۔ ریڈیو پر وہ کتاب آج بھی رکھی تھی، جو وہ موت سے ایک رات پہلے پڑھ رہا تھا۔ صفحہ ۱۳۲ پر اس کی رکھی ہوئی نشانی آج بھی موجود تھی۔ اس کے سلیپر بیڈ کے نیچے قرینے سے رکھے تھے۔ کوئی اجنبی اس کے کمرے میں آکر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ منوہر اب اس دُنیا میں نہیں ہے۔

بچے کو سُلا کر کوشلیا نے منوہر کی تصویر کارنس سے اُتار کر اُس کے بستر پر رکھ دی، خود فرش پر بیٹھ گئی اور سر پلنگ کی پٹی پر رکھ دیا۔ اُسے احساس تک نہیں ہوا کہ کب ماں اندر آکر اُس کے نزدیک بیٹھ گئی تھی۔ وہ اُس وقت چونکی جب ماں نے ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ اُس کمرے میں کوئی نہیں آتا تھا۔ اُس کی ساس تو اُس کمرے کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہوئے بے ہوش ہونے لگتی۔ اُس کے آنسو جھر جھر بہنے لگتے۔ منوہر اسی کمرے میں تو پیدا ہوا تھا۔

کوشلیا کی ماں بیٹی کو خاوند کی تصویر کے آگے اس طرح جھکی دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اپنی جائی اُسے غیر معلوم ہو رہی تھی۔ گھر میں تو وہ اودھم مچایا کرتی تھی، اور ماں کو دن میں دس مرتبہ اُسے سمجھانا پڑتا تھا۔ اری ٹِک کر بھی بیٹھا کر، اب تو دوسرے گھر جائے گی۔ عقل کر کچھ ــــ اور آج یہ حالت ــــ ماں نے ہمدردی سے کہا ــ" ابھی تک سوئی نہیں بیٹی ــــ"

"تم نہیں سوئیں ماں ــــ"

ماں نے اُسے سینے سے لگایا اور بولی " اس طرح اپنے آپ کو دُکھ دینا تو اچھا نہیں، میں جانتی ہوں سُہاگ کا دُکھ عورت کے لیے کتنا گہرا ہوتا ہے۔ لیکن آدمی کر بھی کیا سکتا ہے، جو بھگوان کی اچھا ہو، وہی ہوتا ہے " پھر کچھ سوچ کر بولی ۔" میری بات پر دھیان دے۔ میں تیرے بھلے کی کہتی ہوں ــ دُنیا دیکھی ہے میں نے۔"

" تم جاؤ ماں ــ" کوشلیا نے بغیر ماں کی طرف دیکھے کہا۔

" کوشلیا مورکھ نہ بن، ٹھنڈے دل سے سوچ، ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، کیوں زندگی برباد کرنے پر تُلی ہے، تیرے دو چار بچے ہوتے یا عمر ہی زیادہ ہوتی تو میں کبھی نہ کہتی۔ چوبیس پچیس کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ تیرے ساتھ کی رما بھی تو ہے۔ اس پر بھی یہی گزری تھی۔ سال بھر بعد دوسرا بیاہ ہو گیا۔ اب اپنے گھر سُکھی ہے۔ وہ پچھلی باتیں نہ رہیں، اب تو روز ودھوا کے بیاہ ہو رہے ہیں۔ اپنی صحت دیکھی ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے۔" ماں نے ذرا وقفے کے بعد کہا۔ " یہاں رہ کر جان دے گی کیا ــ ؟"

" دوسرا بیاہ رچا لوں اور اس بوڑھی عورت کو کِس کنویں میں دھکا دے جاؤں جس کا اکلوتا لڑکا مرا ہے، جس کا میرے اور اس بچے کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کس کے آسرے پر چھوڑ جاؤں۔ اس کی صورت بھی دیکھی ہے۔ کبھی اُسے بیٹے کی تصویر چھاتی سے لگائے سسکتے ہوئے دیکھا ہے، اس دہلیز پر غش کھا کر گرتے سنبھالا ہے ــــ تمہیں اپنی بیٹی کا غم ہے، مجھے اِس گھر کی فکر ہے۔"

ماں نے ٹھنڈے اور گمبھیر لہجے میں کہا

" ٹھیک ہے، پر گھر والا تو اب رہا نہیں۔ رہا تیری ساس کا سوال تو اس کی بہن کلکتے میں ہے۔ اُس کے پاس جا رہے گی۔" ماں نے غور سے بیٹی کو دیکھا پھر بات آگے بڑھائی " میری بات کڑوی ضرور ہے پر ہے سچ۔ کل کلاں کو اگر بڑھیا مر گئی تو ــــ پھر نہ تو اِدھر کی رہے گی اور نہ اُدھر کی رہے گی۔ اس بچے کا خیال کر ــــ"

کوشلیا نے دیوار کی طرف دیکھا۔ ماں جی بھی بھگوان کو پیاری ہو گئیں تو ــــ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا

" ٹھیک ہے، لیکن اگر میرا سہاگ پھر اُجڑ گیا ــ کیا تیسرا بیاہ کر دو گی۔ کہاں تک یہ سلسلہ جائے گا، بولو ؟ " اُس نے ماں کی آنکھوں میں جھانکا۔ " کیا اس بچے کو نئے گھر میں وہی پیار مِل سکے گا۔ کسی اور کا خون سمجھ کر اگر وہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے تو ــ یا صرف رشتہ ہمدردی اور رحم تک رہا تو ــ ؟

ماں کوشلیا کی دلیل سُن کر سکتے میں آگئی۔ وہی کوشلیا ہے جسے اس نے جنم دیا تھا، پالا تھا، جسے بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ جو صرف ہنسنا کھیلنا جانتی تھی۔

" جاؤ سو جاؤ ماں ۔" کوشلیا کھڑے ہو کر بولی " مجھے ماں جی کو رامائن سُنانا ہے۔"

ماں نے بیٹی کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔

دوسرے دن کوشلیا کے والدین چلے گئے۔"

دن صبح شام کے چکر میں تیزی سے اُڑتے چلے گئے۔ جمع پونجی دھیرے دھیرے ختم ہوگئی۔ کوشلیا نے ساس کی اجازت لے کر ایک اسکول میں نوکری کرلی۔ گھر کی گاڑی پھر چلنے لگی۔ صبح وہ نہا دھو کر ناشتہ کرتی، ساس کو ناشتہ کراتی، بچے کو دودھ دیتی اور ساس کے حوالے کر کے اسکول چلی جاتی شام کو آکر گھر کے کاموں میں مصروف ہوجاتی۔ زندگی میں ایک طرح کی باقاعدگی اور ضابطہ پیدا ہوگیا۔ بے کاری اور تنہائی دور ہونے سے غم کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ وہ اس بھٹی سے نکلی تو اس کی صحت بھی ٹھیک ہونے لگی۔

اتوار کی چھٹی تھی۔ ساس منے کو پاس بٹھائے سوئی میں تاگہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوشلیا دھوپ میں بال سکھا رہی تھی۔

"ماں جی کل چل کر عینک لگوا لیں۔"

"لے چلنا بہو اکیلی کہاں جاؤں گی۔"

کوشلیا خاموش ہوگئی اور سامنے مکان کی چھت پر بیٹھے گوپال اور اس کی بیوی کو دیکھنے لگی۔ گوپال کی پہلی بیوی مر چکی تھی، اس نے دوسری شادی کرلی تھی۔ دوسری بیوی شیلا کی بھی دوسری شادی تھی، پہلے خاوند سے اس کے ایک لڑکی بھی تھی، جسے وہ ساتھ لائی تھی۔ وہ بھی اُن کے پاس ہی دھوپ میں کھیل رہی تھی۔ گوپال اخبار پڑھ رہا تھا اور شیلا نئے ہونے والے بچے کے لئے سوئٹر بن رہی تھی۔ لڑکی کھلونوں سے اُکتا کر گوپال کے پاس آگئی۔ گوپال نے اخبار رکھ کر اُسے اٹھا لیا اور پیار کرنے لگا، پھر گوپال نے شیلا سے کچھ کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی، کوئی اُسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کبھی وہ بیوہ بھی ہوئی تھی۔

کوشلیا نے ساس کے پاس بیٹھے منے کی طرف دیکھا جو کپڑوں کی کترنوں سے کھیل رہا تھا۔ اُس کا دل اُداسی کے سمندر میں ڈوب گیا۔ نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ اُٹھ کر منے کو اٹھا لیا اور اُسے پیار کرنے لگی۔ اُس نے بہو کی طرف دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

کچھ دیر بعد شیلا اور گوپال کہیں جانے کے لئے تیار ہو آئے چھجے پر آکر شیلا نے کوشلیا کو آواز دی۔

"کیا کر رہی ہو ___؟"

"بیٹھی ہوں ___"

ماں جی نے شیلا کی طرف دیکھا اور یونہی پوچھ لیا۔

"کہیں جا رہی ہو کیا۔؟"

"نمائش لگی ہے۔ یہ کہتے ہیں ساتھ چل۔" شیلا مسکرائی۔

ساس نے کوشلیا کی طرف دیکھ کر نظریں جھکالیں۔ فراک سیتی کوشلیا کی اُنگلی میں سوئی اُتر گئی۔ اُس کے لبوں سے ہلکی سی 'سی' نکل گئی۔

"دھیان سے بہو ___" ساس نے کہا

ایک دن اچانک کوشلیا کے بھائی بھاوج آگئے۔ بھائی سے ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ ایک نامعلوم سا خوف بھی اس کے دل کو دبوچنے لگا۔ بھائی کے کئی خط آتے تھے۔ بھاوج نے الگ سے لکھا تھا۔ اُسے بلایا تھا کہ بچے اپنی بُوا کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اور وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن بھائی اور بھاوج کو ہمیشہ ٹالتی رہی۔ وہ اس گھر کو چھوڑتے ہوئے ڈرتی تھی۔ آخر وہ لوگ خود چلے آئے۔

بھائی اور بھاوج نے بھی وہی باتیں کہیں جو ماں باپ نے کی تھیں۔ بھیا نے تو اُس کی ساس سے صاف صاف کہہ دیا "ماں جی، اگر اس کی زندگی بن جائے تو آپ کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔

"ہاں بیٹا،" وہ ٹوٹتے لہجے میں بولیں "میں تو خود اس سے کہہ چکی ہوں۔

"بھیا،" وہ بولی "میں کیا بچی ہوں۔ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں یہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہوں۔"

"یہ محض جذباتیت ہے۔" ___ بھیا نے جوش میں آکر کہا ___ جب ماں جی کو اعتراض نہیں تو تم کیوں ضد کر رہی ہو؟"

"دیدی تمہارے بھیا غلط نہیں کہہ رہے۔ بھاوج نے کہا۔" ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے چلی چلو ہمارے ساتھ۔ ہم زبردستی تو تمہاری شادی کر نہیں دیں گے۔ وہاں رہنا جی نہ لگے تو لوٹ آنا۔ اب بھلا اس میں کیا بُرائی ہے۔ یوں کیا میکے نہ آئیں کبھی۔؟"

کوشلیا نے جواب نہیں دیا۔ وہ میکے سے ناتا تو توڑ نہیں لے گی۔ بھابی کہنے لگیں "گوگی اور پُشپا کہتے تھے کہ آنٹی کو ضرور لانا۔ کب سے نہیں دیکھا انہیں۔ تم نے تو بچوں کو بھی بُھلا دیا۔ دل پتھر کر کے بیٹھی ہو، پُشپا تمہاری دی ہوئی گڑیا کسی کو چھونے تک نہیں دیتی۔ چلی چلو کچھ دنوں کے لئے۔"

"ہاں کیا حرج ہے۔ جب کہو گی میں خود آکر چھوڑ جاؤں گا۔ ہم کیا تمہارے اب کچھ نہیں رہے۔؟"

کوشلیا نے ساس کی طرف دیکھا۔

" ہاں، ہاں، ہو آؤ بہو۔ کوئی بھائی بہنوں کو تھوڑی چھوڑ دیتا ہے۔" ماں جی نے کہا — " اسکول تو آج کل بند ہی ہے۔"

رات کو بھائی نے رَما کا ذکر چھیڑ دیا۔

"بڑی سُکھی ہے صحت بھی اچھی ہو گئی ہے۔ اب تو دوسرا بچہ ہونے کو ہے۔ گھر والا وکیل ہے۔ ہزار بارہ سو کما لیتا ہے۔ کھاتی پیتی ہے۔ راج کر رہی ہے۔ کہہ رہی تھی گرمیوں میں پہلگام جائے گی۔ پہلا لڑکا کونونٹ میں پڑھ رہا ہے — تو نے تو اپنا حلیہ ہی بگاڑ لیا ہے۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ بچّے کی زندگی بھی برباد کرے گی۔"

دوسرے دن گلی میں رکشا آ گئے۔ سامان اُتارا جانے لگا۔

"جا رہی ہو کوشلیا —؟" ایک پڑوسن نے پوچھا

"کب آؤ گی —" دوسری نے سوال کیا۔

"آ جاؤ گی نا۔" تیسری بولی

کوشلیا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ سب اس طرح کیوں پوچھ رہی ہیں۔ پہلے بھی تو وہ میکے جایا کرتی تھی۔ آج کون سی نئی بات ہے۔

"ماں جی کے پیر چھوؤ" — بھابی نے یاد دلایا۔

وہ ساس کے قدموں میں جُھک گئی۔ جب سیدھی ہوئی تو نظریں کارنس پر رکھی منوہر کی تصویر پر جا پڑیں۔ وہ جیسے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ کوشلیا جلدی آ جانا، اب میں تو تمہیں لینے آ نہیں سکوں گا۔ کوشلیا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ایک چوہا الماری سے کودا اور منوہر کی تصویر پر گرا۔ تصویر چٹاخ سے فرش پر آ رہی، ماں اور کوشلیا ایک ساتھ اٹھانے کے لئے جُھکیں۔

"گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔" بھابی نے کہا۔

اسی وقت کلاک نے پانچ بجائے۔ کوشلیا کی نظریں دوا کی شیشی پر جا ٹھہریں۔

ساس نے آہستہ سے کہا! "کٹ گئی ہے، انگلی پر پٹی باندھ لو۔"

"چلو اب —" بھائی اُتاولا ہو رہا تھا۔

"منّے کو کھڑکی سے باہر مت جھانکنے دینا بہو۔ کوئلہ پڑ جانے سے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔"

(بقیہ ۴۸ پر)

حسن نعیم



غزل

عشق سے اپنی بنی ہو کہ زمانے سے بنی
تم نے پوچھا نہیں افسوس کہ کیا ہم پہ بنی

اُن کے کوچے میں بسا ہیں کہ پھرا شہر بہ شہر
دَر بہ دَر ساتھ پھرا دردِ غریب الوطنی

جرأتِ شوق کا شاہد ترا پیمانِ وفا
جرأتِ فکر کی مظہر تری پیماں شکنی

کتنے افکار کا زینہ ہے تری زلفِ دراز
کتنے خوابوں کا چمن ہے تری گل پیرہنی

عندلیبوں کی نوا بخششِ گُل ہے تو نعیمؔ
ہم بھی سیکھیں گے لبِ یار سے شیریں سخنی

دکن کا ایک قدیم شاعر

سیدہ جعفر

شاہ ابوالحسن

میراں سید شاہ ابوالحسن قادری کے نام کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ "تذکرہ محبوب الزمن"، "صحیفہ اہل ہدیٰ"، "مشکوٰۃ النبوۃ" اور "تذکرہ اولیاء بیجاپور" میں ابوالحسن کا نام ایک ہی طرح سے لکھا گیا ہے۔ اس نام کے بعض اور بزرگ بھی گذرے ہیں۔ "تفصیل المراتب فی اطوار المراقب" کے مصنف کا نام بھی سید ابوالحسن قادری ہی ہے۔ آپ حضرت قربی کے پوتے تھے۔ آپ کے جد یعنی قربی کا نام بھی سید شاہ ابوالحسن قادری تھا۔[1] "تحفۃ النصائح" کے مصنف رازی کے مرشد شاہ ابوالحسن کا تخلص خاموش تھا۔ آپ کا گولکنڈے سے تعلق تھا۔ صاحب مشکوٰۃ النبوۃ لکھتے ہیں کہ سلاطین قطب شاہیہ آپ کے بڑے معتقد تھے اور آپ کو جاگیر بھی عطا کی تھی۔ شاہ ابوالحسن خاموش ہی کی فرمائش پر رازی نے شاہ راجو کی فارسی تصنیف "تحفۃ النصائح" کا ترجمہ بھی کیا تھا۔

تحفہ ہے اصل یو فارسی سب ترجمہ دکنی کیا
صاحب سو دنیا دین کے شاہ بوالحسن فرمانے پر

مشکوٰۃ النبوۃ "میں شاہ ابوالحسن حیدر ثانی کا ذکر موجود ہے اس میں" انوار الاخیار" کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ آپ سید محمد حسینی گیسو دراز کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے صاحبزادے شاہ علی عباس حسینی مجذوب تھے۔ شاہ ابوالحسن قادری کا وطن بیدر تھا۔ "مشکوٰۃ النبوۃ"[4] کے مصنف نے صاحب "رسالہ مکاشفہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ کے دادا سید عبدالقادر یوسف بغداد سے دکن آئے تھے اور بیدر میں سکونت اختیار کی تھی۔ شاہ ابوالحسن کے والد بیدر کے مشاہیر شیوخ میں سے تھے۔ شاہ ابوالحسن کا مولد بیدر تھا اور یہیں اُن کا بچپن اور شباب کا زمانہ گذرا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ کے عہد (۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ تا ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء) میں انہوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہا اور اپنے چھوٹے بھائی شاہ مصطفیٰ قادری کے ساتھ ہجرت کر کے بیجاپور[5] چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ "صحیفہ اہل ہدیٰ"[6] کے مصنف نے (جو شاہ ابوالحسن کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں) اسی لیے اُن کے نام کے ساتھ "البیدری ثم البیجاپوری" لکھا ہے۔ "روضۃ الاولیا بیجاپور" کے مصنف محمد ابراہیم، شاہ ابوالحسن قادری کے متعلق لکھتے ہیں کہ "وہ جگت گرو کے عہد میں احمد آباد سے بیدر تشریف لائے تھے۔" یہ بیان غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلے تو شاہ ابوالحسن کا احمد آباد سے کوئی تعلق نہیں تھا دوسرے یہ کہ وہ جگت گرو کے عہد میں بیجاپور چلے آئے تھے نہ کہ بیدر کیوں کہ بیدر تو اُن کا وطن ہی تھا اور یہیں اُن کا قیام بھی تھا۔

---

[1] مخطوطہ نمبر ۱۸۶۶۔ تصوف۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد

[2] آپ کی ایک مختصر سی مثنوی "نمک نامہ" اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے اس کے علاوہ "رسالہ تصوف" نمبر ۳۶۶ مخزونہ اسٹیٹ لائبریری بھی آپ ہی کی تصنیف ہے۔

[3] مخطوطہ نمبر ۵۷۱۔ مواعظ، اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد۔

[4] "مشکوٰۃ النبوۃ" جلد اوّل صفحہ ۹۴۔

[5] "تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو جلد سوم صفحہ ۶۳۔ [6] صفحہ ۵۷

شاہ ابوالحسن کے والد کا نام میراں سید شاہ بدرالدین
حبیب اللہ تھا "مشکوٰۃ النبوۃ" کے مصنف لکھتے ہیں کہ

"آن قطب زمن آں بدر معدن قبلہ وقت میراں شاہ ابوالحسن است رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ و نام پدر حضرت ایشاں میراں شاہ بدرالدین حبیب اللہ بن عبدالقادر ۔ ۔ ۔ ۔ است[1]"

صاحب "مشکوٰۃ النبوۃ" نے "مکاشفہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ عبدالقادر ثانی "سبعہ قادریہ" میں سے تھے۔ ہجرت کا سبب بتاتے ہوئے سید محی الدین مولف "صحیفہ اہل ہدیٰ" لکھتے ہیں کہ حکومت میں انتشار پیدا ہوجانے اور حالات کے بگڑنے کی وجہ سے شاہ ابوالحسن اپنے بھائی کے ہمراہ بیجاپور چلے آئے تھے[2]۔ ابوالحسن اور ان کے برادر شاہ مصطفیٰ قادری نے بیجاپور میں اعلیٰ پور کے دروازے اور اندرون حصار بیجاپور کے قریب "سسی بازار" میں قیام کیا تھا۔ یہ محلہ شاہی انبار خانے سے متصل تھا۔

میراں سید شاہ بدرالدین حبیب اللہ کے والد کا نام میراں سید عبدالقادر یوسف تھا۔ آپ نے ترکِ وطن کرکے بغداد سے ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ اُس زمانے میں بیدر علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا یہاں کے بادشاہوں کی علم دوستی کا دور دور کے ملکوں میں چرچا تھا علماء شعرا اور اہلِ ہنر دور دراز مقامات سے یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ انھیں میں سے ایک بدرالدین حبیب اللہ کے والد میراں سید عبدالقادر یوسف بھی تھے جنہوں نے دکھن کے اس خطے کو پسند کرکے ہمیشہ کے لیے یہیں بود و باش اختیار کی تھی۔ بدرالدین حبیب اللہ کا مقام ولادت بغداد ہے یا بیدر یہ نہیں بتایا جاسکتا البتہ اتنا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بدرالدین حبیب اللہ کی زندگی کا بڑا حصہ بیدر میں گذرا۔ بدرالدین حبیب اللہ کے برادر کا نام سید شرف الدین نعمت اللہ تھا۔ میراں بدرالدین حبیب اللہ کے تین فرزند تھے۔ بڑے صاحبزادے شاہ ابوالحسن قادری تھے۔ منجھلے بیٹے کا نام شاہ مصطفیٰ قادری اور چھوٹے کا شاہ قاسم قادری تھا۔

عبدالجبار ملکاپوری نے "تذکرہ اولیائے دکن[3]" میں دو مختلف مقامات پر شاہ ابوالحسن کے حالات درج کیے ہیں اور ان کو دو علیحدہ شخصیتوں کے طور پر پیش کیا ہے جب ہم شاہ ابوالحسن کے سلسلہ نسب پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں عبدالجبار ملکاپوری کو تسامح ہوا ہے۔ شاہ ابوالحسن قادری کا سلسلہ نسب یہ ہے۔

سید عبدالقادر جیلانی
سید تاج الدین عبدالرزاق
سید عماد الدین ابی صالح نصر
سید ابی نصر محی الدین
سید محمد اصغر احمد الدین
سید احسن الدین ابوالحسن
سید یوسف
سید شرف جہاں
سید عبدالرحمٰن
سید یونس ثانی
شمس الدین عارف
شاہ عبدالقادر یوسف
شاہ بدرالدین حبیب اللہ
شاہ ابوالحسن قادری

شاہ ابوالحسن قادری کے خاندان نے جنوبی ہند میں رشد و ہدایت کا جو کام انجام دیا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ شاہ ابوالحسن قادری کے پوتے ابوالحسن ثانی ابن سید عبدالقادر کی صاحبزادی قربی ویلوری کے دادا میراں سید علی محمد سے بیاہی گئی تھیں۔ اس طرح قربی کا تعلق شاہ ابوالحسن قادری کے خاندان سے تھا۔ آپ کی تربیت سے باقر آگاہ اور عبداللطیف ذوقی نے فیض اٹھایا تھا۔ اس خاندان کے ایک اور صاحبِ تصنیف بزرگ شمس الدین قادری تھے۔ آپ شاہ ابوالحسن کے برادرِ خورد شاہ مصطفیٰ کے پوتے اور عبدالقادر قادری کے بڑے صاحبزادے تھے۔ آپ کی ایک مثنوی "علمِ سلوک" کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک سو ایک اشعار پر مشتمل ہے اس مثنوی پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ناسوت، ملکوت، لاہوت، اور جبروت وغیرہ کی اہمیت بتائی گئی ہے

شاہ ابوالحسن کے اخلاف میں شاعری کا ذوق موجود تھا چنانچہ آپ

---

1. مشکوٰۃ النبوۃ از سید علی موسوی القادری۔ صفحہ ۹۳ م
2. مخطوطہ صحیفہ اہل ہدیٰ صفحہ ۳۹

کے صاحبزادے سید شاہ عبدالقادر قادری کے خلف رشید ابوالحسن ثانی المعروف بہ گورے حسن کنکالی بقول 'صاحب صحیفہ اہل ہدیٰ' بڑے شاعر، عالم، فاضل اور فقیہ و ادیب تھے۔ "مخزن السلاسل الحسینیہ" آپ ہی کی تصنیف ہے۔

شاہ ابوالحسن قادری کی حقیقی ہمشیرہ کے صاحبزادے شیخ محمود خوش دہاں شاعر اور ادیب تھے۔ ان کا کلام اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے۔ "رسالہ واجب الوجود" آپ ہی کی گرانقدر تصنیف ہے۔ ایک[1] نظم بھی اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے جس کا کاتب نے کوئی عنوان نہیں تحریر کیا ہے۔

اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں ایک مخطوطہ موجود ہے جس کا نام نصیر الدین ہاشمی نے وضاحتی فہرست میں "نوری نامہ" بتایا ہے[2]۔ یہ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ اس نظم میں نوری کے انداز میں مسائل تصوف سمجھائے گئے ہیں۔ آپ کی ایک فارسی تصنیف "صلوٰۃ العاشقین" بھی اسی لائبریری میں موجود ہے[3]۔ "معرفت السلوک" آپ کی فارسی تصنیف ہے جو ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ہے اس کا ترجمہ شاہ ولی اللہ قادری مرشد نواب انوار الدین خاں ارکاٹ نے کیا ہے۔

شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ مصطفیٰ بھی شاعر تھے۔ ادارہ ادبیات اردو میں ان کی نظم "وصیت نامہ" موجود ہے۔ ان شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ابوالحسن قادری کا خاندان نہ صرف اپنے زہد و ورع کے لئے مشہور تھا بلکہ اپنی علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے بھی اس خاندان نے بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی تھی۔

شاہ ابوالحسن پابند شریعت، حق رسیدہ، متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ آپ کو علماء کی صحبت کا شوق تھا۔ پیر محمد لطف اللہ بن شیخ موسیٰ کی تربیت نے شاہ ابوالحسن کی روحانی قوتوں کو اجاگر کر دیا تھا۔ شاہ کمال الدین جیسے عالم متبحر

۱۔ نوری نامہ نمبر مخطوطہ ۹۱۹ جدید اسٹیٹ لائبریری۔ حیدرآباد
۲۔ وضاحتی فہرست۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۸
۳۔ مخطوطہ نمبر ۱۶۹ مجموعہ فلسفہ ۳۲۴۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد
۴۔ مخطوطہ نمبر ۶۵۶

سے شاہ ابوالحسن نے فیوض و برکات حاصل کیں۔ شاہ ابوالحسن اپنے والد حبیب اللہ کے انتقال کے بعد شاہ کمال الدین کے جانشین ہوئے۔ ساری زندگی خلق اللہ کی ہدایت اور رہنمائی میں گذار دی۔ بیجاپور اور بیدر کے اطراف و اکناف کے مقامات میں شاہ ابوالحسن قادری اپنی ریاضت اور اپنے روحانی تصرفات کی وجہ سے مشہور تھے جس زمانے میں آپ نے اپنے وطن بیدر سے بیجاپور کا رخ کیا۔ اس وقت وہاں ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمراں تھا۔ بیجاپور میں بہت جلد شاہ ابوالحسن قادری کی روحانی قوت اور برکات کا چرچا ہوگیا۔ دور دراز مقامات سے لوگ آپ کی زیارت کے لئے آنے لگے اور بقول سید محی الدین "جس نے بھی دست بوسی کی وہ مرتبہ ولایت کو پہنچا"[1]۔ سید محی الدین ابن سید محمود قادری نے محمد اکرام ابن محمد خلیل الرحمٰن سے جو حکایت سنی تھی اس کو "صحیفہ اہل ہدیٰ" میں اس طرح نقل کیا ہے۔ بیجاپور میں ایک نامی پہلوان اسرافیل دکنی رہا کرتا تھا۔ اس کی قوت اور زور آزمائی کا مقابلہ کسی پہلوان سے ممکن نہ تھا۔ اسرافیل کو بادشاہ نے اپنا مقرب بنالیا تھا۔ جس کی وجہ سے بعض امراء اور مصاحب اس سے حسد کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک روز بادشاہ سے کہا کہ اسرافیل کو اپنی قوت اور توانائی پر بڑا گھمنڈ ہے ایک دن اس کا امتحان لینا چاہئے۔ بادشاہ نے اس تجویز کو طوعاً و کرہاً قبول کیا[2] ایک کھلے میدان میں دربار منعقد کیا گیا۔ تمام درباریوں کے ساتھ اسرافیل دکنی بھی وہاں حاضر ہوا۔ بدخواہوں نے فیل خانے کے داروغہ کو حکم دیا کہ مست ہاتھی کو مجمع کی طرف دوڑا کر چھوڑ دو۔ چنانچہ فیل بان نے ایسا ہی کیا اور آواز دی ہاتھی میرے قابو میں نہیں ہے۔ جب مست ہاتھی دوڑتا ہوا آیا تو تمام لوگ اپنی جگہ سے ہٹ گئے لیکن اسرافیل نے جنبش نہیں کی۔ ہاتھی نے اس پر حملہ کر دیا۔ اسرافیل نے ہاتھی کی سونڈ اپنے بازو میں لے کر اس طرح دبایا کہ وہ چنگھاڑنے لگا اور آخر کار زمین پر گر پڑا[3]۔ فیل بان نے شور مچایا یہ سواری خاص کا ہاتھی ہے۔ کہیں ہلاک نہ ہوجائے۔ اسرافیل نے ہاتھی کو چھوڑ دیا وہ انتہائی کمزور ہوچکا تھا۔ چھٹکارا پاتے ہی اس نے

۱۔ مخطوطہ مشکوٰۃ النبوۃ۔ صفحہ ۴۹۳
۲۔ مخطوطہ صحیفہ اہل۔ صفحہ ۵۹
۳۔ روضۃ الاولیاء۔ بیجاپور۔ صفحہ ۵۷

نیل خانے کی راہ لی۔ اسرافیل سمجھ گیا یہ حاسدوں کی سازش ہے اس نے غضبناک ہو کر چبوترے پر ایک گھونسہ مارا اور وہ تہہ و بالا ہو کر گر پڑا۔ اسرافیل اپنے گھر چلا گیا۔ اور بادشاہ کے بار بار بلانے پر بھی اس نے دربار کا رُخ نہ کیا۔ اب اُس کا دل دُنیا اور اہلِ دُنیا سے متنفر ہو چکا تھا اس نے اہلِ طریقت کے زمرے میں شامل ہو جانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور یہ طے کیا کہ جو شخص طاقت میں مجھ سے قوی تر ہو اسی کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ چنانچہ وہ ہر جمعہ کے دن جامع مسجد کے ایک دروازے پر بیٹھ جاتا اور ہر شخص سے مصافحہ کرتا۔ اسی طرح چند روز گذر گئے۔ ایک دن اتفاقاً سید شاہ ابوالحسن شرقی دروازے سے برآمد ہوئے جیسے ہی آپ باہر تشریف لائے، اسرافیل دکنی نے مصافحہ کیا۔ ابوالحسن نے اسرافیل کا ہاتھ اتنی قوت سے دبایا کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو حضرت کی قیام گاہ پر پہنچا اور آپ ہی کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ [3]

عبدالجبار ملکاپوری لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ نے آپ کے لئے وظیفہ معقول مقرر کر دیا تھا، آپ دلِ جمعی سے ذکر و شغل میں مشغول رہتے تھے۔" [4]

ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کا بڑا معتقد تھا۔ صاحب "صحیفہ اہلِ ہدیٰ" نے بادشاہ کا وہ واقعہ تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح حکمراں وقت آپکی روحانی قوت اور خوارق عادت دیکھ کر آپ کا دلدادہ ہو گیا اور کیوں کر اس نے اپنے پال جوگی کی مکاریوں سے نجات پائی شہزادی زہرہ سلطانہ کی وفات اور شاہ ابوالحسن کے معجزات بھی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ شاہ ابوالحسن نے تمام زندگی رشد و ہدایت اور خدمتِ خلق میں صرف کی۔ آپ کا وصال ۲۴ ربیع الثانی ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں ہوا۔ آپ کا مزار بیجاپور کے حصار کے باہر اعلیٰ پور کے دروازے کی طرف

[1] تذکرہ اولیاء دکن صفحہ ۴۹
[2] تذکرہ اولیاء دکن صفحہ ۵۰
[3] مخطوطہ صحیفہ اہلِ ہدیٰ صفحہ ۵۹
[4] تذکرہ اولیاء دکن صفحہ ۴۹

واقع ہے آپ کے برادرِ خورد شاہ مصطفیٰ قادری کا مزار مغرب کی جانب ہے اور مشرق میں آپ آسودہ ہیں۔ شاہ ابوالحسن کے مرقد پر جو گمٹی بنی ہوئی ہے اس لئے بیجاپور کے لوگ آپ کو "چوکھنڈی والے صاحب" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

مصنف صحیفہ اہلِ ہدیٰ سید محی الدین ابن سید محمود قادری نے آپ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

بوالحسن بود کعبہ مقصود
می نمودند نہ فلک پابوس
ہادی و رہنمائے عالم شد
از کرامات در جہاں زد کوس
نقل چوں کرد دار فانی را
ہر دو عالم بماند در افسوس
گفت ہاتف بوصف تاریخش
"زیب پیرائے جنت الفردوس" [1]

(۱۰۴۵ ہجری (مطابق ۱۶۳۵ء)

شاہ ابوالحسن کی دو شعری تخلیقات کا پتہ چلا ہے: "توصیف نامہ" ایک مختصر نظم ہے جو اپنے اختصار کے باوجود خاصی دلچسپ اور پرکشش ہے "توصیف" میں شاعر نے محبوب کا سراپا بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کو حسین تشبیہات اور دلفریب استعاروں نے رنگین اور پرلطف بنا دیا ہے۔ دکنی ادب میں "سراپا" کے بہت سے دلکش نمونے موجود ہیں لیکن ان کی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ مثنوی کا جزو بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے برخلاف شاہ ابوالحسن کی یہ نظم اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے، اس لحاظ سے بھی یہ نظم اہمیت رکھتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے گلابی رنگ کے گلگوں بدن
گل رخن، پستہ دہن، گل پیرہن
لب کی دیکھیا[2] جب ستی[3] سرخی تیری
ہے خجل لب کا تیری لعل یمن

[1] مخطوطہ صحیفہ اہل ہدیٰ صفحہ ۶۶ - [2] دیکھا ، [3] سے

جعد کے گیسو تیرے سنبل کی جال
کیس[1] ہیں تجھ سیس[2] کے عنبر شکن
سیس پر سیس پھول[3] سارا چاند ہے
ماہ ہور[4] خورشید کا جیسا لگن
ہے آرائش پہ چہرۂ گلنار بر
چشمہ سورج سیں جوں دستا[5] کرن
خم تری ابرو کا ہے قوس قزح
تجھ پلک سو تیر، جادو گر نین[6]
گوشوارے ہیں تیرے کاناں[7] کے بیچ
اُسے[8] ثریا کے ہیں خوشے دو کدن[9]

شاہ ابوالحسن کی ایک اور شعری تخلیق "سکھ انجن" ہے جس میں طفلانہ بازی آنکھ مچولی کے ذریعے سے تصوف کے مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ نظم میں پہیلیاں حکایتیں اور اقوال موجود ہیں۔ یہ نظم چار سو گیارہ اشعار پر مشتمل ہے اور اپنی قدامت اپنی لسانی خصوصیات اور اپنے تمثیلی انداز کی وجہ سے دکنی ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ "سکھ انجن" کے شاعر ابوالحسن کا انتقال ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں ہوا۔ اس سن میں وجہی کی "سب رس" مکمل ہوئی تھی اور وہ بقید حیات تھا نصیرالدین ہاشمی کے قول کے مطابق قطبی کی "تحفۃ النصائح" کا سن تصنیف بھی یہی ہے[10]۔ شاہ ابوالحسن کے ہمعصر شعرا میں وجہی کے علاوہ عبداللہ قطب شاہ، احمد قطبی جنیدی، ابن نشاطی، اور طبعی وغیرہ کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان شعراء کے کلام میں جو لسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں کم و بیش وہی خصوصیات شاہ ابوالحسن کی "سکھ انجن" میں ملتی ہیں۔ "سکھ انجن" کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

---

[1] بال [2] سر [3] ایک قسم کا زیور جسے عورتیں بالوں میں لگاتی ہیں [4] اور [5] دکھائی دینا [6] آنکھیں [7] کان کی جمع [8] یہ [9] طرف

[10] دکن میں اردو صفحہ ۱۱۳

[11] کچھ [12] محبوب [13] ملاقات [14] یہ [15] سوجھے گا [16] محبوب [17] راستہ [18] بوجھے گا [19] کو [20] خود میں [21] چھپنے والا [22] دل گنواؤ [23] دو [24] محبوب [25] ساتھ [26] راہ و رسم

آؤ میرے پیارے کھیلیں آؤ
کھیلیوں میں کچھ[11] کھیل بناؤ
کھیل میں ایسا کھیل ہووے
پیا[12] ملن[13] کا میل ہووے
جن کوں[14] یو کھیل سوجھے[15] گا
پیو[16] کے مارگ[17] بوجھے[18] گا
یو کھیل نیارا رہے لوگو
آپ کوں[19] آپیں[20] میں دیکھو
چھپو چھپو رے چھاپن[21] ہار
چھپنے چھپنے میں جیو[22] ہار
دو[23] پیا[24] پیو جیتو رے
پیو سنگ[25] اپنی نیتو[26] رے
میت[27] پیا[28] جب آوے ہات[29]
رین[30] اندھیری ہوئے شب برات
سونا جینا مرنا سو
تینوں تو[31] دل دھرنا سو
تفصیل بولوں رے بھائی
سوتوں کے تئیں ٹھوم[32] جگائی
جاگو رے لوگو جاگو رے
پیو پائے میں بھاگو رے
نیند تو موت کی ہے ہو بھان[33]
ناحق لجاوے گی پران[34]

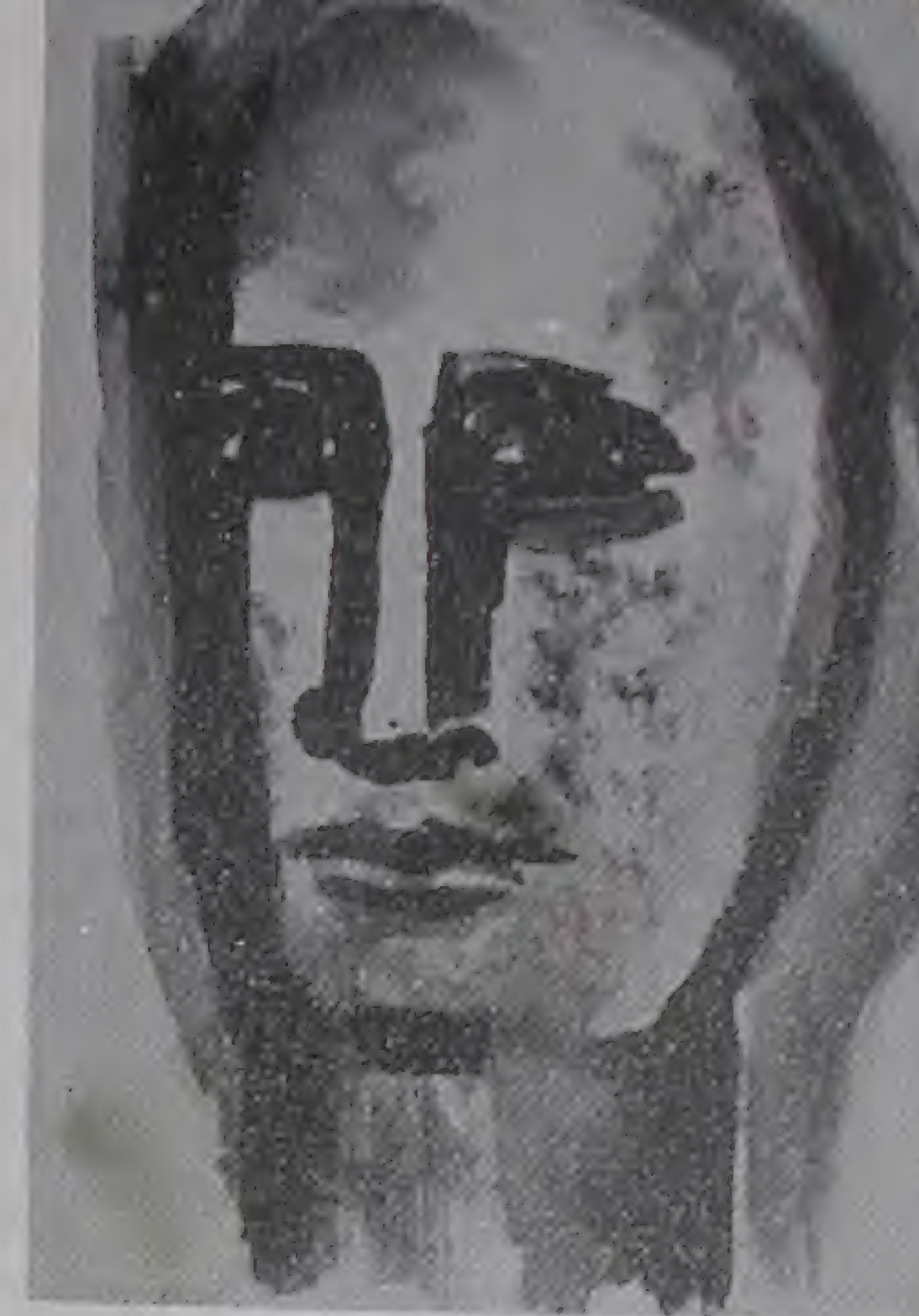
"سکھ انجن" اپنے تمثیلی طرز اظہار، زبان کی سادگی و روانی اور بے ساختگی کی وجہ سے قدیم دکنی ادب کے سرمائے کی بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے

---

[27] دوست [28] محبوب [29] ہاتھ [30] رات [31] پر [32] ٹھوکا دینا [33] بہن [34] جان

ادارہ

مصوّری کی بین اقوامی



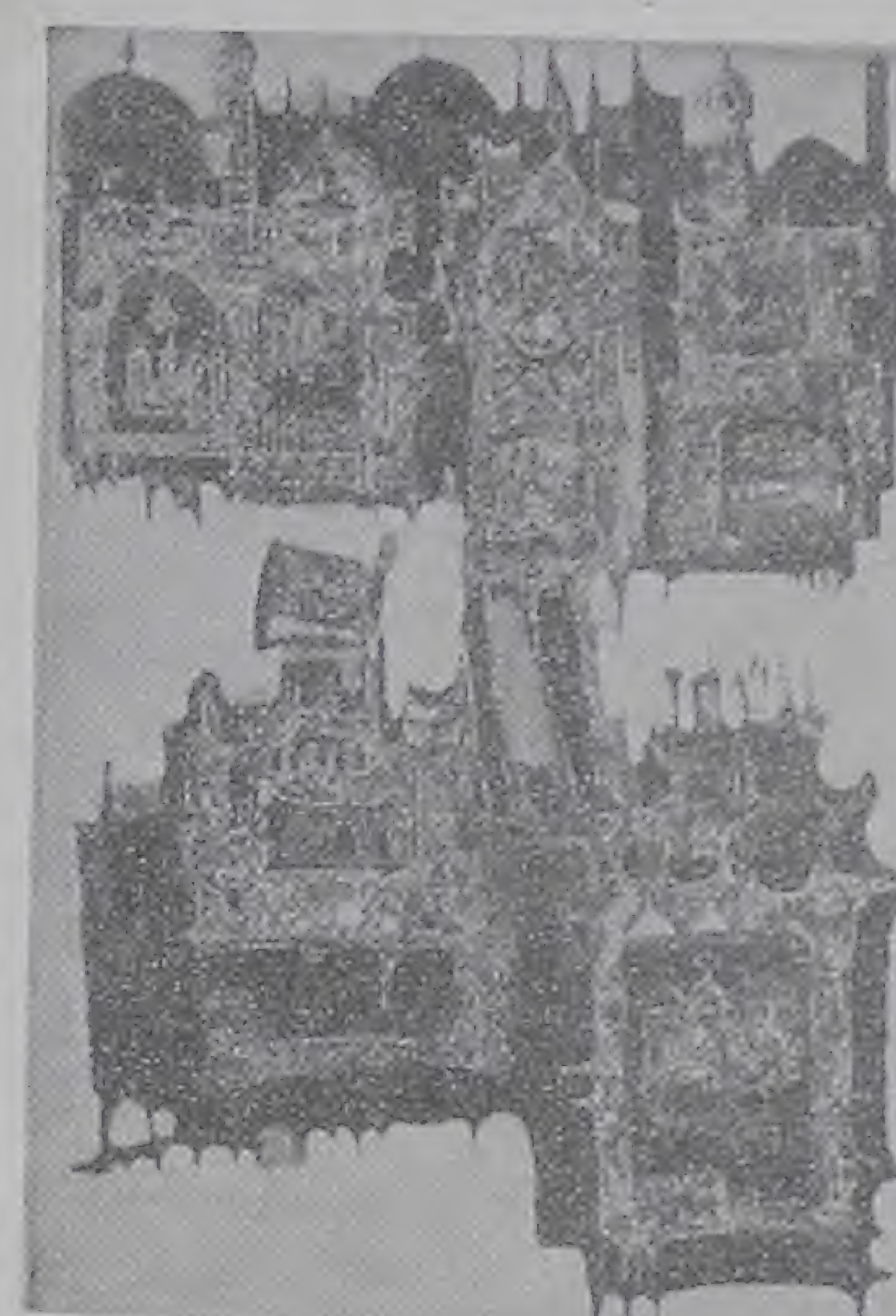
سر

بسلی میک وینی

(آئرلینڈ)

ھندوستان میں جدید آرٹ کی پہلی بین اقوامی نمائش کا انعقاد بلاشبہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے اس نمائش سے ہمیں دُنیا کے دیگر ممالک میں ہونے والے تخلیقی عمل اور تخیلی کاوشوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی اس کے ساتھ ساتھ یہ نمائش ہمارے فن کاروں کو نئے خیالات و انداز سے روشناس کرائے گی اور آرٹ کے نئے تجربوں کے لئے میدان ہموار کرے گی۔ اس طرح ہمارا ملک آرٹ و فن کے لحاظ سے زیادہ جاندار اور مالدار بنے گا۔

اِس وقت جب ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے ایک نئے ہندوستان کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم نئے سماج میں زندگی کے تخلیقی پہلوؤں۔ مصوری، شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کو نظر انداز نہ کریں۔



"اچھی زمین"

سلمان عباس (عراق)

اس نمائش میں ۳۲ ملکوں کے فنکاروں کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ اِن میں بعض تو بڑے نامور مصوّر ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے ابھی حال میں آرٹ کی دُنیا میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ سائنس اور کھیل کود کی طرح آرٹ بھی ملکوں کی حد بندیوں کو توڑتا ہوا عالمی بنتا جا رہا ہے اور اس کو سمجھنے اور پرکھنے کے عالمی معیار بن گئے ہیں۔ مگر اس عمل کے ساتھ ساتھ آرٹ بڑا انفرادی بنتا جا رہا ہے۔ ہر فن کار اپنے فن کے اظہار کے لئے ایک مخصوص اسٹائل کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے آرٹ کی خصوصیت اُس کا تنوع ہے اور فن کے مختلف وسیلۂ اظہار کے امتزاج کا رُجحان نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر سنگ تراشی کے ایسے نمونے پیش کئے گئے ہیں جن پر مصوری کی گئی ہے اور رنگوں کی مدد سے ایسی تصویریں بنائی گئی ہیں جو اتنی واضح طور پر اُبھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں، کہ اُن پر سنگ تراشی کا گمان ہوتا



"ویرا"

امیل سیمومنی

فیڈرل ری پبلک

جرمنی



شخصیت مرجیا (فرانس)



"پریوں کا رقص"

لو با ہو (برما)

نمائش کے

ہے. نمائش میں صیقل شدہ لکڑی پر آرٹ کے نمونے مصوری اور سنگ تراشی دونوں سیکشن میں موجود ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آرٹسٹ اپنے تجربے کو تجریدی طور پر پیش کرتا ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ فن کار نے اپنے موضوع کو خیرباد کہہ دیا ہے بلکہ یہ ہے کہ فن کے اظہار کے لیے موضوع مقصود بالذات نہیں رہا ہے۔ فن کار کسی چیز کی ہوبہو تصویر بنانے کی بجائے رنگ اور ہیئت کی مدد سے اپنے تخیل کا آزادانہ اظہار کرنا چاہتا ہے۔ جدید آرٹ کی



"جنت خوا کی تشکیل" بال چاودا (ہندوستان)

تیسری خصوصیت اُسکا اختصار اور اشاریت ہے۔ کم سے کم اور صرف ضروری اشارے ہوتے ہیں۔ مصوری اور سنگ تراشی کے بعض نمونے محض احساس کی کیفیت پیش کرتے ہیں یا نہایت مختصر ہیں۔

جدید آرٹ موجودہ دور کا عکاس اور اس کی آواز ہے۔ اسے سمجھنا اور اس سے لطف اٹھانا ہمارا فرض ہے۔ کوئی سماج تہذیبی طور پر محض اس وجہ سے مالامال نہیں ہوجاتا کہ اس کے فن کاروں میں تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سماج اپنی قدردانی اور حوصلہ افزائی کے ذریعے اُن کی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کے مواقع عطا کرے۔



"ہوا کا گیت"

کانگ ہنگ جیا (ملائشیا)

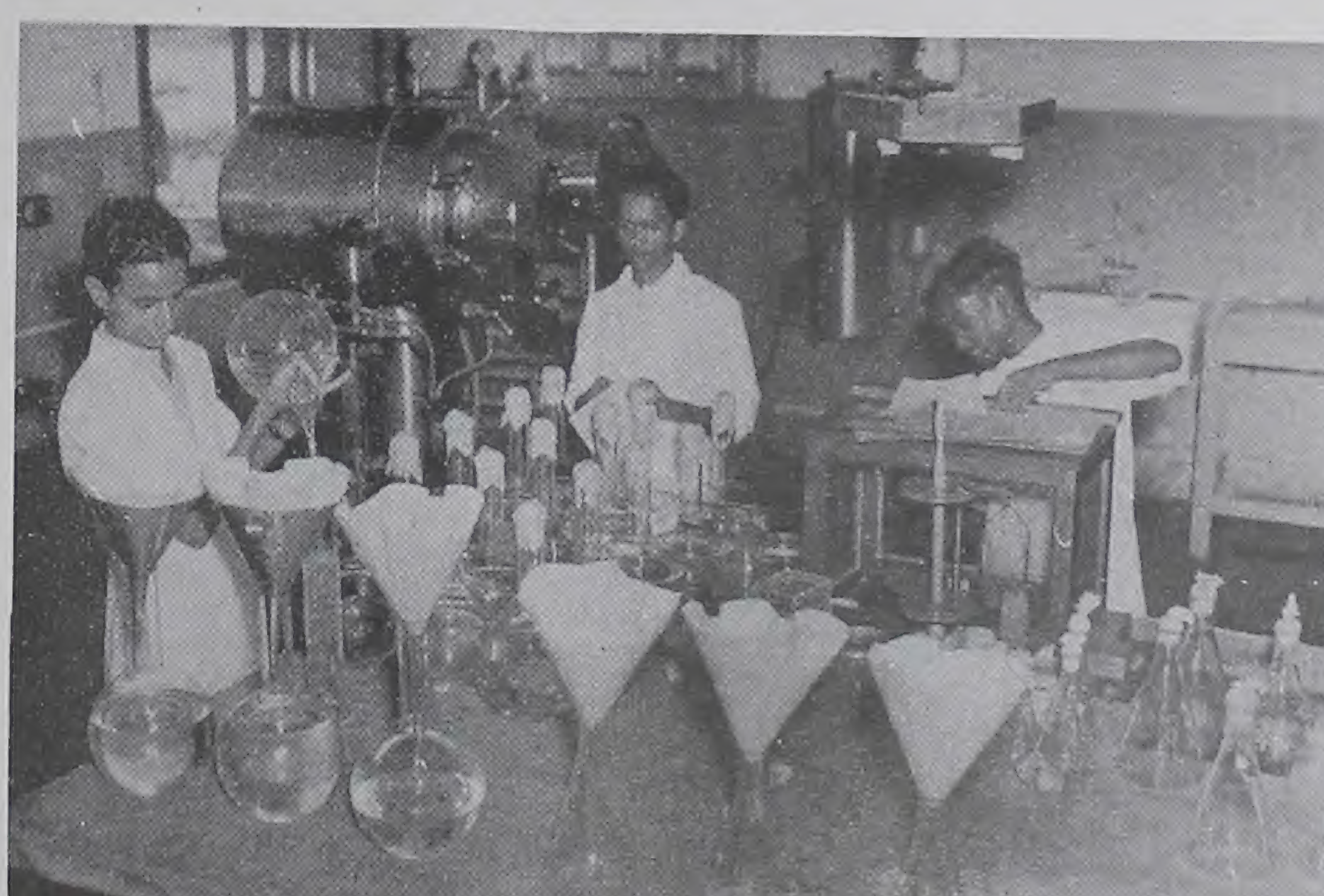


آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس (نئی دہلی) اس ادارے اور اس سے متعلقہ اسپتال میں ملک کے ماہرینِ طب مختلف امراض کے ازالے میں لگے ہوئے ہیں۔

عالمی یوم صحت

تندرستی خوشحالی کی ضامن ہے

ہر سال ۷ اپریل کو عالمی یوم صحت منایا جاتا ہے کیوں کہ آج سے ۲۰ سال قبل ۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو عالمی ادارہ صحت کا دستور نافذ کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ صحت و تندرستی سے متعلق مسائل کی طرف عوام کو متوجہ کیا جائے کیونکہ ایسے کسی بھی پروگرام میں احتیاطی تدابیر کو اولین جگہ حاصل ہے۔



ایک لیبارٹری میں مسلسل کھوج اور چھان بین کے بعد ہی ایسی دوائیں دریافت ہوتی ہیں جو انسانوں کو امراض سے نجات دلاتی ہیں۔



آزادی کے بعد ہندوستان میں صحت عامہ کی بہتری کے لئے بہت کچھ کیا گیا ہے جس کا سب سے واضح ثبوت ہے درازیٔ عمر۔ ۱۹۵۱ء میں ایک ہندوستانی کی اوسط عمر ۳۲ سال تھی جو اب بڑھ کر ۵۱ سال ہوگئی ہے۔ شرح اموات ۱۹۶۱-۶۵ء میں کم ہوکر ۱۷٫۲ فی ہزار رہ گئی ہے۔ بچوں کی شرح اموات ۱۸۲٫۵ فی ہزار سے کم ہوکر ۱۰۹٫۱ فی ہزار ہوگئی ہے۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں ۱۰ کروڑ افراد ملیریا کا شکار ہوئے تھے۔ جب کہ ۱۹۶۶ء میں صرف ۸۷ ہزار آدمیوں کو ملیریا ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں چیچک سے ۷۰ ہزار اموات ہوئیں اور ۱۹۶۲ء میں صرف ۷ ہزار۔ حالیہ برسوں میں اس تعداد میں مزید کمی آئی ہے۔ چیچک، ہیضہ اور تپ دق جیسے متعدی امراض کے مکمل انسداد کے لئے "قومی پیمانے" پر مہمیں چلائی گئی ہیں۔ ۸ کروڑ سے زائد افراد کو بی۔ سی۔ جی کے ٹیکے لگائے جا چکے ہیں۔

تیسرے پلان میں عوامی صحت اور طبی سہولیات فراہم کرنے اور انھیں توسیع دینے پر ۲۰۹ کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اب اس کے مقابلے پر چوتھے منصوبے پر ۴۹۲ کروڑ روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ موٹے طور پر الگ الگ یہ روپیہ اس طرح خرچ ہوگا۔ طبی تعلیم اور تربیت و تحقیق پر ۸۷ کروڑ روپے، ہسپتالوں ڈسپنسریوں اور بنیادی صحتی مرکزوں پر مشتمل طبی نگہداشت پر ۱۸۱ کروڑ روپے، متعدی بیماریوں کی روک تھام پر ۸۷ کروڑ روپے، دیگر عوامی صحت کی خدمات پر ۲۶ کروڑ روپے اور دواؤں وغیرہ کی تیاری پر ۱۰ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔

تجویز ہے کہ طبی کالجوں کی تعداد ۸۸ (تیسرے منصوبے میں ۷۵ کالج کھلنے تھے جب کہ ہم اس نشانے سے آگے بڑھ گئے) سے بڑھا کر ۱۱۲ کر دی جائے۔ تیسرے منصوبے میں ۵۸۰۰ افراد کے لئے ایک ڈاکٹر تھا۔ اب چوتھے منصوبے میں یہ تناسب بڑھ جائے گا اور ۴۶۰۰ افراد کے لئے ایک ڈاکٹر ہوگا۔ ۲۵ مجوزہ طبی کالجوں میں سے ۵ علاقائی ادارے ہوں گے جنھیں حکومت ہند کھولے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ چوتھے منصوبے کے آخر میں ملک میں ۱٫۲ لاکھ ڈاکٹر دستیاب ہوں گے۔

نرسوں اور طبی اسٹاف کو تربیت دینے کے پروگرام کو اس طرح فروغ دیا جائے گا کہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں کم از کم ۴۲۰۰۰ نرسوں اور ۶۰۰۰۰ دائیوں کا اضافہ ہو جائے۔

۴۰۰ مزید بنیادی صحتی مرکز کھولے جائیں گے تاکہ ہر کمیونٹی ڈویلپمنٹ بلاک میں ایک مرکز ضرور ہو۔ نیز ۶۰۰۰۰ مزید بستر مہیا کئے جائیں گے۔ اور ۲۰۰ تپ دق کے کلینک کھولے جائیں گے اور اُن میں توسیع کی جائے گی۔

دوسری خدمات کے علاوہ اسکول ہیلتھ پروگرام اور زچہ و بچہ کی صحت اور خوراک کی اسکیموں پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔ وزارت خوراک اور صحت مشترکہ طور پر استادوں، والدین، طلبا اور سوشل ورکروں کی امداد سے اسکول ہیلتھ پروگرام کو چلائیں گے۔ دوپہر کے کھانے کی اسکیم میں توسیع کے علاوہ طلبا کو متعدی بیماریوں سے محفوظ رہنے اور صحت برقرار رکھنے کے لئے سائنٹفک اطلاعات کا پرچار کیا جائے گا۔

پبلک ہیلتھ لیباریٹریوں میں توسیع کرنے کے علاوہ بڑی ۲۶ علاقائی اور ۲۰۰ ڈسٹرکٹ لیباریٹریاں کھولی جائیں گی۔ اس کے لئے ۲٫۲ کروڑ روپے کا انتظام کیا گیا ہے۔

دوائیں بنانے کے پروگرام کے تحت ضروری دواؤں کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے گا۔ ان دواؤں کی مالیت جو کہ ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۱۵۰ کروڑ روپے تھی۔ ۱۹۷۰-۷۱ میں بڑھ کر ۲۵۰ کروڑ روپے ہو جائے گی۔ رشی کیش اور سنت نگر میں بنائی گئی دواؤں کی فیکٹریوں کے مکمل ہو جانے پر ضروری دواؤں کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوگا۔

ہمارے ملک میں اس مسئلے کا ایک پہلو تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی بھی ہے۔ ہر سال دو کروڑ ۱۰ لاکھ بچے پیدا ہوتے ہیں اور ۸۰ لاکھ افراد مرتے

(بقیہ [illegible] پر)

آنند نرائن مُلا

عالمی نظام میں انسان کے بنیادی حقوق اور آئینِ ہند میں اُن کا تحفظ



(اُردو کے مشہور شاعر، الہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جج اور ممبر پارلیامنٹ جناب آنند نرائن مُلّا نے ۲۹ فروری اور یکم مارچ کو دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو کے زیرِ اہتمام "نظام اُردو خطبات" کے تحت انسان کے بُنیادی حقوق اور آئینِ ہند میں اُن کا تحفظ" کے عنوان سے خطبہ دیا تھا جس کے دو حصے تھے: "عالمی نظام میں انسان کے بنیادی حقوق" اور "آئینِ ہند میں انسان کے بنیادی حقوق کا تحفظ" ذیل میں ہم اُن کے خطبے کے کچھ حصے نقل کر رہے ہیں۔

انسان کے بنیادی حقوق کا تصوّر قریب دو سو سال سے زائد پرانا نہیں اور ماضی بعید کا زمانہ بھی بڑی حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس زمانے میں انسانی حقوق کے خدوخال بالکل مبہم اور غیر واضح ملتے ہیں اور "بنی آدم اعضائے یک دیگر ند" کی آواز ہمارے مذاہب ہمارے اخلاق اور ہماری شاعری میں تو کبھی کبھی سُنائی دیتی ہے لیکن ہماری معاشرت اور ہمارے قانونی نظام پر اس کا کوئی دیرپا یا قابلِ قدر اثر نظر نہیں آتا۔ صحیح طور پر اٹھارویں صدی ہی کو طلوعِ انسانیت کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔

آج انسان کے بنیادی حقوق کی فہرست کافی لمبی ہو چکی ہے لیکن یہ سارے حقوق تین سرخیوں کے تحت مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ یہ تین عنوان ہیں آزادی، مساوات، اور اخوت۔ تاریخ قدیم میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ جب چھوٹے چھوٹے گروہوں، ریاستوں یا شہری جماعتوں نے اپنی آزادی کے حصول یا حفاظت کے لئے اپنی جان پر کھیل کر اپنے سے کہیں زیادہ قوی دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اور اس طرح اس حقیقت کو واضح کیا کہ ایک خود دار انسان یا قوم کے لئے آزادی ایک ایسا حق ہے جس کے آگے جان بھی کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح قدیم یونان اور روم کی تاریخ میں ایسی عوامی حکومت، معاشرت اور سماجی نظام کے نقش ملتے ہیں جہاں آئین رائج ہیں اُن میں بڑے سے لیکر چھوٹے چھوٹے تک کے حقوق برابر نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ چھوٹے چھوٹے نخلستان زندگی کے لق و دق صحرا پر نہ کوئی اثر ڈال سکتے ہیں اور نہ ڈال سکے۔ تاریخ کے صفحات میں یہ صرف کچھ داستانیں اور کچھ یادیں چھوڑ کر فنا ہو گئے۔ بڑھتی ہوئی شہنشاہیت نے نہ اُن کی آزادی باقی رہنے دی نہ اُن کا نظامِ مساوات۔ شاہی کو غلاموں کی ضرورت ہوتی ہے، جبر کو مجبوروں کی اور طاقت وروں کے حقوق چھین کر اپنے با اختیار ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ بڑی بڑی بادشاہتیں قائم ہوئیں اور قانون کی سطر کے بجائے "چینِ خسروی" انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگی۔ انسان نے کہیں کہیں آزادی اور مساوات کا خواب دیکھا لیکن جب آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو زندانِ غلامی میں پایا۔

اس خواب کا شرمندہ تعبیر ہونا لازمی تھا اول تو یہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں کسی سیاسی یا انسانی پیام کی حامل بن کر نہیں آئی تھی بلکہ زیادہ تر ایک بڑے خاندان یا قبیلے کے افراد یا ایک شہر کے شہریوں نے اپنے مشترکہ مقاصد کے لئے ایک سمجھوتہ کر لیا تھا اور وہ اپنے محدود دائرے میں خود مختار ہو گئی تھیں، ان کی نظر کے سامنے کوئی عالمی تصور بھی نہیں تھا۔

اب مناسب ہوگا کہ مساوات کا جو مفہوم میرے ذہن میں ہے وہ بھی یہاں بیان کر دوں۔ مساوات ایک غیر مذہبی قانونی حق ہے اور اس کا دھرم یا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں، اس مساوات کی ہندو دھرم میں تو کوئی بھی روایات نہیں ملتیں اور اسلام میں بھی دورِ خلفاء کے بعد جب حکومت ملک کے تاجداروں کی جگہ زمین کے شہریاروں کے ہاتھ آئی تو مساوات کا جو اسلامی تصور تھا وہ بھی نقش برآب ثابت ہوا۔ یہ مساوات کا تصور موجودہ دور کے تصور سے مختلف تھا کیوں کہ اور باتوں کے علاوہ یہ مومن اور کافر میں فرق کرتا تھا۔

انسان کے بنیادی حقوق کا تصور دراصل مغرب کے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی نظریوں کے تصادم اور ارتقاء میں پیدا ہوا اور دور بہ دور پروان چڑھا اور آج انسان کے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے شعور نے اس کے ہاتھ میں آن کی آن میں دنیا کو مٹا دینے والے ایسے خطرناک ہتھیار دیدیئے ہیں اور اتنی مختلف اغراض کو برسرپیکار کر دیا ہے کہ تمام انسانوں کے بنیادی حقوق کا ایک متحدہ نظام مرتب کئے بغیر نہ تو امن قائم رہ سکتا ہے اور نہ کوئی راہ بقا تلاش کی جا سکتی ہے ۔۔۔ آج انسان کو اندیشہ ہے کہ وہ کہیں خود اپنے علم کا شکار نہ بن جائے اور خود اپنے ہاتھ سے داستانِ آدم کے آگے "تمام شد" نہ لکھ دے۔ شاید نوعِ انسان پر ایسا نازک وقت پہلے کبھی نہیں آیا تھا آج وہ زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہے، ایک راستہ امن و بقا کی طرف جاتا ہے اور دوسرا جنگ و فنا کی طرف اور جنگ و فنا کی طرف کاروانِ انسان کو لے جانے والوں میں سب میں پیش پیش اہلِ سیاست ہیں۔

میں یہ ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ اپنا مطلب کچھ اور واضح کر دوں۔ ہمارے بڑھتے ہوئے علم نے جہاں ایک طرف اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ عوام کی پیٹھ پر کاٹھی باندھ کر کچھ مخصوص خوش نصیب لوگ سواری نہیں کر سکتے وہاں یہ بھی روزِ روشن کی طرح نمایاں کر دیا کہ اگر انسان کو اس دنیا میں ابھی کچھ دن اور زندہ رہنا ہے تو اسے قومیت کی اپنا حلقۂ اثر، طاقت اور اقتدار بڑھانے والی قدروں سے انحراف کر کے بین الاقوامیت اور انسانی اخوت کی قدروں کو اپنانا ہوگا۔ اگر قومیت کے بت طاق سے نہ ہٹائے گئے تو دنیا کو فنا ہونے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اور ایک نہ ایک دن مختلف اقوام کی متضاد اغراض میں ایک مہیب تصادم ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ آج سب میں بڑا سوال یہی اٹھتا ہے کہ انسان کے دل و دماغ میں اتنی لوچ اتنی لچک اور اتنی رواداری موجود ہے کہ وہ انسانی اخوت اور عالمی نظامِ امن کے لئے اس قومی اغراض کی فصیل کو جو اس کے راستے میں حائل ہے پار کر سکے گا یا نہیں۔ کیا وہ طاقت کے قانون کو چھوڑ کر انسانی اخوت کو اپنا سکے گا۔ ابھی تک تو ہر ملک میں اربابِ سیاست قومی اور نظریاتی اغراض کے آگے نہ بین الاقوامیت کو کچھ سمجھتے ہیں اور نہ انسانیت کو اور بجائے اس کے وہ عالمی انسانی نظام میں ان اغراض کو سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ ان اغراض ہی کو انسانی اغراض کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے ہم وطنوں کو بجائے صحیح مشورہ دینے کے گمراہ کرتے ہیں۔

ہو یہ رہا ہے کہ ہر طاقت ور ملک عالمی نظام کے پردے میں دنیا کی بساط پر اپنی چالیں چلتا ہے اور اپنے اپنے مہرے بڑھاتا ہے۔

یہاں تک تو تصویر کا ایک رخ پیش کیا گیا ہے لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا تابناک اور امید افزا رخ بھی ہے۔ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے پیرس میں اپنے عام اجلاس میں انسانی حقوق سے متعلق ایک عالمی منشور کا اعلان کیا اور تاریخ کائنات میں پہلی بار دنیا کی مختلف قوموں نے مشترکہ طور پر ان بنیادی حقوق کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ گزشتہ بیس سال کی تاریخ میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں جب کہ اقوام متحدہ نے اپنی اس ذمہ داری کے تحت قومی یا نظریاتی برسرپیکار اغراض کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اختلافات کا حل میدانِ جنگ میں حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ بات چیت کر کے ایوانِ بزم میں تلاش کریں۔ اقوام متحدہ کو کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں۔ اور ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس عرصہ میں اقوام متحدہ نے نظامِ عالم میں

اپنی ایک جگہ بنالی ہے اور نزاعات کو حل کرنے کے لئے جنگ کے علاوہ ایک اور طریقہ پیش کیا ہے اس عرصہ میں کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ اب جنگ کے شعلوں کو بھڑکنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن ہر بار جلد یا کچھ دیر کے بعد اقوام متحدہ نے جنگجو صفوں کے درمیان پڑ کر انھیں لڑائی بند کرنے پر رضامند کر لیا یا لڑائی کو عالم گیر بننے سے روک لیا اور دنیا تباہی سے بچ گئی۔

آیئے اب اس انسانی صحیفہ میں بنیادی حقوق کی جو فہرست ہے اس پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ فہرست بجائے خود انسانی عظمت اور عزت کا اعتراف ہے اور دنیا کو کیشِ انسانیت کا پیغام دیتی ہے۔

اس منشور میں ۳۰ دفعات ہیں، میں ان دفعات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔[1] دفعہ ۱۔ سب انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور سب کا درجہ اور حقوق ایک ہیں۔

دفعہ ۲۔ ہر شخص کو وہ تمام حقوق اور آزادیاں حاصل ہوں گی جن کا اس منشور میں ذکر ہے۔ کوئی فرق ذات، رنگ، جنس، زبان، مذہب، سیاسی نظریات، قومیت، حیثیت یا اتفاق پیدائش کی بنا پر نہ کیا جائیگا۔

دفعہ ۳۔ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ زندہ رہے، آزاد رہے اور محفوظ رہے۔

دفعہ ۴۔ کوئی شخص غلامی میں زندہ نہ رکھا جا سکے گا۔ اور غلامی اور غلاموں کی تجارت چاہے وہ کسی قسم کی ہو ممنوع قرار دی جائے گی۔

دفعہ ۵۔ کسی شخص کے ساتھ بے رحمی اور ظلم کا برتاؤ نہ کیا جا سکے گا۔ اور نہ اس کے جسم کو جبر اور ایذا رسانی کا شکار بنایا جائے گا۔

دفعہ ۶۔ ہر شخص کو اختیار ہوگا کہ وہ دنیا بھر میں کہیں عدالت کے سامنے جا کر چارہ جوئی کر سکے۔

دفعہ ۷۔ قانون سب کے لئے ایک ہوگا اور بغیر کسی تفریق کے سب کی یکساں حفاظت کرے گا۔

دفعہ ۹۔ کوئی شخص بغیر معقول وجہ کے نہ تو گرفتار کیا جائے گا نہ حراست میں لیا جائے گا۔ اور نہ اپنے ملک سے نکالا جا سکے گا۔

دفعہ ۱۰۔ ہر شخص کو کھلے اجلاس میں ایک آزاد اور ایماندار عدالت کے سامنے ایک منصفانہ قانون کے تحت اپنے حقوق اور فرائض کا فیصلہ حاصل کرنے کا اختیار ہوگا۔

دفعہ ۱۱۔ ہر شخص جب تک کہ جرم ثابت نہ ہو قانون کی نظر میں بے گناہ متصور ہوگا۔

دفعہ ۱۲۔ ہر شخص کی ذاتی نجی اور گھریلو زندگی میں یا اس کی خط و کتابت میں کسی کو بے وجہ من مانے طور پر جھانکنے یا اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہ ہوگا اور نہ اس کو عزت یا نام پر کسی کو حملہ کرنے کا اختیار ہوگا۔ قانون پوری طرح ان حقوق کی حفاظت کرے گا۔

دفعہ ۱۳۔ ہر شخص کو یہ اختیار رہوگا کہ وہ اپنے ملک میں جہاں چاہے جائے اور جہاں چاہے رہے۔ اس کو اپنے ملک سے باہر جانے کا اور واپس پلٹنے کا بھی اختیار رہوگا۔

دفعہ ۱۷۔ ہر شخص کو تن تنہا یا کسی کے ساتھ جائداد کا مالک بننے کا اختیار ہوگا۔

دفعہ ۱۸۔ ہر شخص کو اپنے خیال اور ضمیر کی آزادی کا حق ہوگا اور اپنا مذہب خود چننے کا اختیار ہوگا۔ اس کے ساتھ اسے یہ بھی حق ہوگا کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنا مذہب یا عقیدہ تبدیل کرلے اور اکیلا یا کسی جماعت کے ساتھ چاہے خلوت میں چاہے منظر عام پر اپنے مذہب اور عقائد کا تعلیماً، عملاً، عبادۃً یا رسماً مظاہرہ کرے۔

دفعہ ۱۹۔ ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کا حق ہوگا۔

دفعہ ۲۰۔ ہر شخص کو ایک پُرامن گروہ یا جماعت میں شریک ہونے کا حق ہوگا۔

دفعہ ۲۱۔ ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں چاہے براہ راست یا منتخب نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہوگا۔ اسے اپنے ملک کی سرکاری ملازمتوں میں جگہ پانے کا مساوی حق ہوگا۔ رائے عامہ پر حکومت کا مدار ہوگا۔ اور اس رائے کو جاننے کے لئے متعینہ وقفے کے بعد انتخابات ہوں گے۔ جن میں ہر ایک کو ووٹ دینے کا یکساں حق ہوگا۔ اور یہ ووٹ اس طریقے سے لئے جائیں گے کہ رائے آزادانہ بھی دی جا سکے اور خفیہ بھی رہے۔

دفعہ ۲۲۔ ہر شخص کو بغیر کسی تفریق کے کام کرنے کا حق ہوگا اور

---

[1] طوالت کی وجہ سے صرف چند اہم دفعات کا خلاصہ درج کیا گیا ہے (ادارہ)

آزادانہ طور پر اپنا روزگار چننے کا اختیار ہوگا۔ اُسے یہ بھی حق ہوگا کہ اس کی ملازمت کی شرطیں مناسب اور منصفانہ ہوں اور اُسے بے روزگاری سے بچایا جائے۔

دفعہ ۲۵۔ ہر شخص کو ایسے معیار پر زندگی بسر کرنے کا حق ہوگا جس میں خود اور اُس کے بال بچّوں کی صحت برقرار رہے۔ اُسے کھانا کپڑا مکان ڈاکٹری نگرانی اور دوسری سماجی امداد ملے۔

دفعہ ۲۶ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ تعلیم پائے اور ابتدائی درجوں کی تعلیم مفت دینے کا انتظام کیا جائے۔

دفعہ ۳۰۔ اس منشور میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے معنی کوئی حکومت گروہ یا فرد اپنے طور پر پہنا سکتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اٹھارویں صدی کا چھوٹا سا آزادی مساوات اور اخوت والا نعرہ آج نوع انسان کو کس مقام تک لے آیا ہے۔ آج انسانی حقوق کی تصویر کتنی تابناک ہے اور اس کے خدوخال کتنے صاف اور واضح نظر آتے ہیں۔ اس منشور میں انسان کے خوابوں کی تعبیر ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حرفِ آخر نہیں۔ تاریخ کا ہر اہم واقعہ اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کلیہ سے یہ منشور بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ روحِ عصر کی پرواز کو متعین کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط تک انسانی فکر کس مقام پر تھی اور مختلف تہذیبوں عقیدوں اور نظریوں والی دُنیا ارتقا کے الگ الگ راستوں سے گزر کر کس مرکزِ اتحاد تک پہنچی تھی۔ لیکن انسان کا سفر نہ آج ختم ہوا ہے نہ رہتی دنیا تک ختم ہوگا۔ اب نہ جانے کتنے نئے راستے نئے موڑ اور نئے افق اس کا انتظار کر رہے ہیں اور یہ بات یقینی ہے کہ اس مسلسل بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ساتھ نئے خواب اور نئے تصورات اس کی نگاہوں کو روشنی دیں گے۔ جن کے لئے نئے حقوق کے تحفظ کی ضرورت پیش آئے گی اور نئے منشور قلمبند کئے جائیں گے۔ تاریخ کائنات میں ابھی نہ جانے کتنی صبحیں اپنے آنچل میں نئے نئے آفتاب چھپائے ہوئے ابنِ آدم کا استقبال کرنے کے لئے سرِ راہ کھڑی ہیں۔ آج تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ منشور موجودہ نسل انسان کا نقطۂ عروج ہے جو اقوامِ دنیا کو منزل کا نشان بھی دیتا ہے اور دعوتِ رہروی بھی۔

آیئے اب اس بات پر غور کریں کہ ہمارے ملک میں انسان کے بنیادی حقوق کو کیا مقام دیا گیا ہے اور ان حقوق کی تصویر جن کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے ہمارے آئین کے چوکھٹے میں کس طرح نمایاں ہوئی ہے۔

ایک تازہ فیصلے میں چیف جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے فرمایا ہے۔

اگر ہم عالمی منشور کا اپنے آئین کے تیسرے اور چوتھے ابواب سے مقابلہ کریں تو ہمیں ایک حیرت انگیز مماثلت ملے گی یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ بنیادی حقوق پر کام کرنے والی آئینی کمیٹی اور اقوام متحدہ کی انسانی حقوق سے متعلق عالمی منشور تیار کرنے والی کمیٹی ایک ہی وقت میں ان سوالات پر غور کر رہی تھی اور دونوں نے انسان کے نہ مٹنے والے اور ہر حملے سے بلند و بالا بنیادی حقوق اور آزادی کا اپنے اپنے مینی فیسٹو میں قریب قریب ایک ہی انداز میں اعلان کیا ہے"۔ عالمی منشور ہمارے آئین سے قریب ایک سال پہلے تیار ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے آئین ساز کمیٹی کے ممبروں کی نظر اس کی دفعات پر پڑی ہوگی اور انہوں نے جب انسان کے بنیادی حقوق اور آزادیوں کے تحفظ کے لئے الفاظ تلاش کئے ہوں گے تب اپنے ملک کی نوعیت اور ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس منشور کی عبارت سے بھی مدد حاصل کی ہوگی۔

ہمارے آئین کے تیسرے باب کا عنوان "بنیادی حقوق" ہے اس میں ۲۹ دفعات ہیں حقوق کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصہ کے الگ الگ سرخی دی گئی ہے۔ میں یہاں خالی انہیں سرخیوں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ مساوات کا حق (دفعہ ۱۴ سے لے کر دفعہ ۱۸ تک)

۲۔ آزادی کا حق (دفعہ ۱۹ سے لے کر دفعہ ۲۲ تک)

۳۔ کسی بیگار سے بچنے اور کسی دوسرے کے فائدے کے لئے قربانی سے بچنے کا حق (دفعہ ۲۳-۲۴)

۴۔ مذہبی آزادی کا حق (دفعہ ۲۵ سے لے کر دفعہ ۲۸ تک)

۵۔ تہذیبی اور تعلیمی حقوق (دفعہ ۲۹ اور دفعہ ۳۰)

۶۔ جائداد اور ملکیت کا حق (دفعہ ۳۰، دفعہ ۳۱ الف اور دفعہ ۳۱ ب)

۷۔ آئینی چارہ جوئی حاصل کرنے کا حق (دفعہ ۳۲)

میں پہلے ہی عالمی منشور کے انسانی حقوق آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ ان حقوق کو چھوڑ کر جو بین الاقوامی زندگی ہی میں پیدا ہوتے ہیں (مثلاً دوسرے ملکوں میں جا کر پناہ لینے کا حق، یا اپنی مرضی سے قومیت تبدیل کرنے کا حق) عالمی منشور کے سارے حق ہمارے آئین میں موجود ہیں اور اپنی قومی

(بقیہ ص ۳۸ پر)



عبد المجید

موسم گرما

بیساکھ جیٹھ

ذیل میں میری ایک طویل مثنوی کا ایک اقتباس درج ہے۔ ان ابیات میں موسم گرما کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اردو میں بارہ ماسہ لکھنے کا رواج رہا ہے جس میں دیہاتی شاعری کے پس منظر میں مختلف موسموں کے کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن میری یہ مثنوی، بارہ ماسوں سے جدا رنگ و آہنگ رکھتی ہے جس کا اندازہ قارئین کو خود ہو جائیگا۔

مے تند میں ساقیا برف ڈال
تپش سے طبیعت بہت ہے نڈھال
پریشاں ہے اس وقت ہر آدمی
کہ گرمی ہے یہ جیٹھ بیساکھ کی :
نہ آرام گھر میں نہ باہر ہے چین
مصیبت کا دن ہے، مصیبت کی رین
نہیں گھر سے آساں نکلنا ابھی
مگر دل میں ہے اک عجب بے کلی
کہ دیکھوں میں سورج کا جاہ و جلال
تپش کا نہ کچھ دل میں آئے خیال
اٹھا گو ہے مشکل سے دن اک پہر
مگر ہے ہوا میں تپش زور پر
لوئیں چل رہی ہیں، کڑی دھوپ ہے
بلا جیٹھ بیساکھ کی دھوپ ہے
بگولے رواں رقص کرتے ہوئے
جھجکتے ہوئے اور ٹھہرتے ہوئے
دہکتی زمیں، آسماں شعلہ بار
ہیں سوکھے ہوئے سربسر کشت زار
ہیں جھلسی ہوئی ہر طرف جھاڑیاں
نہیں گھاس تک کا زمیں پر نشاں
گلوں کی اُداسی کا ہے ذکر کیا
کہ کانٹوں کا بھی منہ ہے اُترا ہوا
چلا جا رہا ہے کوئی راہ گیر
کوئی بے وطن، کوئی سادھو، فقیر
تھپیڑوں سے بچوا کے لڑتا ہوا
مقدر سے اپنے جھگڑتا ہوا
درختوں کا سایہ جہاں مل گیا
ٹھہر کر مسافر نے دم لے لیا
یہیں مل رہی ہے سبھی کو پناہ
ہیں بیٹھے ہوئے چھوڑ کر اپنی راہ
سمٹ آئے ہیں باغ میں سب پرند
چھپے بیٹھے ہیں پتوں میں پرند

ہیں چرواہوں کے غول بھی جا بجا !
یہاں کھیل کود اُن کا ہے مشغلہ
کہیں پر جمی ہے کبڈی اگر !
کہیں کھیل چِکّا کا ہے اوج پر
ہیں چرنے میں مشغول بھینس اور گائے
کھڑے ہیں کہیں گھوڑے گردن جھکائے
کہیں ہے اگر بکریوں کا گھیڑ !
تو ہیں جھنڈ میں دوسری سمت بھیڑ

ہیں کھیت اِن دنوں سارے سونے پڑے
بھرے اُن میں کانٹے ہیں چھوٹے بڑے
نہیں گھاس کا بھی یہاں کچھ نشاں
ہیں سوکھی ہوئی دھان کی کھونٹیاں
مگر کھیت گنّوں کے ہیں جا بجا !!
ترو تازگی جن کی ہے دِل کُشا
زمیں آبِ پاشی سے نم ہے یہاں
کہیں "ٹیوب ول" ہے کہیں ہے کنواں
کنوؤں کے منڈیروں پہ لاٹھے لگے
جو جھکتے کبھی ہیں، کبھی ہیں کھڑے
کسانوں کے مضبوط ہاتھوں کا کھیل
انھیں سے ہے پانی کی یہ ریل پیل
ہیں سُورج کی کرنوں سے جُھلسے ہوئے
کُھلی پیٹھ ہے، سر پہ گمچھے بندھے
یہ کرتے ہیں پانی کی نہریں رواں
توانا ہے جسم اور ہمت جواں
یہ کرتے ہیں لُو کے تھپیڑوں کو زیر
کڑی دھوپ، سورج کی کرنوں کو زیر
پسینے کے چشمے رواں جسم سے
نمایاں ہے تاب و تواں جسم سے
بھری پنڈلیاں اور بازو گٹھے
گلے اور سینے کے پٹھے کڑے

ابھی اپنی طاقت سے ہیں بے خبر
مشقت میں کھوئے ہوئے سربسر
جو ہو جائے طاقت کی اپنی خبر
تو کر دیں زمانے کو زیر و زبر !

الگ سب سے انداز ہے باغ کا
ہری پتیوں اور پھلوں سے بھرا
نہ پروا ہے لُو کی، نہ خُشکی کا ڈر
کھڑا ہے عجب شان سے ہر شجر
خزانے ہیں پانی کے زیرِ زمیں !
کہیں دُور پر، پاس ہی میں کہیں
اُنھیں سے ہیں شاداب سارے شجر
اُنھیں سے ہیں بالیدہ برگ و ثمر

کئی رنگ کے باغ میں ہیں ثمر !
ہے نظّارہ جن کا فروغِ نظر
فریبِ نظر رنگ آرائیاں
ہیں فطرت کی ہر سمت گلکاریاں
کہیں لیچیوں کے گلابی ثمر !
بہار اِن سے ہے باغ میں رنگ پر
کہیں کٹھلوں سے تنے ہیں لدے
کہیں پیڑ ہیں بڑہلوں سے جھکے !

ہے آموں سے ہر باغ باغِ جناں
ہے نظارے سے جن کے دِل شادماں
جو زرد آلوؤں سے ہیں زرّیں شجر !
تو ہیں لال پریوں سے لعلیں شجر !!
کہیں توتا پریوں سے رنگیں ہے باغ
کہیں ہیں سفیدوں کے روشن چراغ
کہیں مالدہ اور کہیں بمبئی
کہیں بارِ فجری سے شاخیں جھکی
چمکتے ہیں اس طرح روشن طباق
کہ ہیں قمقمے زیرِ نیلی رواق !!

جو جاتی ہے چوسوں کی جانب نظر :
تو کہتا ہے دل، ہیں بہشتی ثمر !!
کوئی آم ہے شکل میں لاجواب
کوئی رنگ و خوشبو میں 'خاصا گلاب'
ہے گر کوئی تخمی تو قلمی کوئی :
نہیں اُن کی قسموں کی گنتی کوئی
ہراک قسم خوبی میں سب سے جدا
تراوٹ، حلاوت، نفاست جدا
ہراک کی ہے بوباس میں خاص بات
غرض جتنے ہیں آم اتنے صفات

ہوئی جیٹھ کی سہ پہر اب تمام
گئی لُو کے جھونکے سہانی ہے شام
ہوا کی حرارت میں آئی کمی
درختوں پہ آنے لگی تازگی !
فضا سے ہوئی دُور افسردگی
گئی چہرۂ گُل سے پژمردگی !
چھپے تھے جو جھاڑی میں پُھد کے پرند
درختوں کے سائے سے نکلے چرند
تپش سے بھی بسکہ تھے بدحواس
چلے سوئے دریا بُجھانے کو پیاس
گھروں سے نکل آئے انسان بھی
تھے گرمی کے مارے پریشاں سبھی
تھا تیزی سے مہرِ تپاں پر زوال
قبا زرد پہنے ہوئے تھے نہال
تھی ساکت ہوا اور فضا پرسکوں
خموشی درختوں کی تھی پُرفسوں
وہ بھنڈار کونے سے اُٹھی گھٹا
جو تیزی سے پھیلی بدوشِ ہوا
چھپا آن کی آن میں آسماں
سرِ شام تھا رات کا اب سماں

گرجنے کی طوفاں کے آئی صدا
جھلکنے لگی بجلیوں سے فضا
ہوا تھی جو ساکت ہوئی تیز گام
کہ اب رخشِ فطرت ہوا بے لگام
زمیں سے اُٹھی گرد سوئے فلک :
لگے آنکھ ملنے فلک پر ملک
ہوا ہر طرف خاک اُڑانے لگی !
درختوں کو جھولا جھلانے لگی
اگر راہ میں پھونس کی ٹھاٹھ آئی
اُڑا کر اُسے خوب ہی گت بنائی
جو انساں کبھی راہ میں پڑ گیا !
تو مشکل سے دو اک قدم چل سکا
جو اشجار طوفاں کی زد میں پڑے
بڑی مشکلوں سے رہے وہ کھڑے
ملا راہ میں جو، جھنجھوڑا اُسے
ہوا گر مقابل تو توڑا اُسے
گئیں شاخیں اور پتیاں ٹوٹ ٹوٹ
گئے کتنے اثمار شاخوں سے چھوٹ
عجب نشہ میں جھومتے تھے درخت
خود اپنے قدم چومتے تھے درخت
بسیروں میں چڑیوں کو تھا کب قرار
تھا طوفان میں اُن کا عجب حالِ زار
نہ بچوں کی سدھ بدھ نہ انڈوں کی فکر
بچے جان اپنی، اسی کی تھی فکر

جو کچھ دیر کے بعد آندھی تھمی !
ہوا پیش دستی سے آخر رُکی
ٹپاٹپ ٹپاٹپ کی آئی صدا
یکایک جو پانی برسنے لگا !
مسافر چھپے پیڑ کی چھاؤں میں
گئے ان میں کچھ بھاگ کر گاؤں میں

تھا اب موسلا دھار بارش کا زور
گرج بادلوں کی ہواؤں کا شور
نہ ٹھہری یہ بارش بہت دیر تک
فضا صاف ہونے لگی یک بیک
ہُوا ابر دوشِ ہوا پر رواں !
بدلنے لگا رنگ پھر آسماں
ہٹی چاند کے رُخ سے کالی گھٹا
سفید ابر آئے نظر جا بجا
جبینِ اُفق پر نہ اب تھی شفق
حسیں چاند کے گرد پھوُلی شفق
ہُوا سُرخرو ہالۂ ماہتاب !
کھلے جس طرح سے چمن میں گلاب
کچھ اِس طرح تھی مہہ پہ غازے کی ضو
ہو شرمیلے چہرے پہ سُرخی کی لو
عطارد کی گردوں پہ نعلیں گلی !!
ضیا پاش اک سمت ہونے لگی
کھلے غنچۂ زہرہ و مشتری !
ستاروں میں آئی نئی تازگی
زمیں پر بھی اب ڈھلی چاندنی
درختوں نے اوڑھی ردا نقرئی
تھے پانی سے تابندہ برگ و گیاہ
تھا ہر قطرۂ آب میں عکسِ ماہ !
فضا میں تھا نشّہ ہوا میں نمی
تھی فطرت کی ہر سانس میں تازگی
ہوئی ختم شب اور بدلی فضا
ہوا مہرِ تابندہ جلوہ نما
رہی چند دن کچھ تپش سے نجات
نہ گرمی اگر دن میں ٹھنڈی تھی رات
پھر اندازِ موسم بدلنے لگے
وہی جھونکے پچھوا کے چلنے لگے
جلانے لگی جیٹھ کی دھوپ تیز
کہ مہرِ درخشاں تھا پھر جلوہ ریز
زمیں تپ کے آتش اگلنے لگی !
جو سُلگی ہوا ڈوب جلنے لگی

بقیہ: ایک گلاس پانی

کھا جانے کے لئے اُس کی طرف لپکتے۔

اُس نے پرائیوٹ، اس سال انٹر کا فارم بھر دیا تھا اور اسی بیچ ٹائپ سیکھ کر وہ ایک فرم میں ٹائپسٹ کی جگہ پر کام کرنے لگی تھی۔

اُس دن آفس میں کام زیادہ تھا۔ چند ضروری کاغذات ٹائپ کرنے تھے، گھر سے سویرے ہی ٹفن کیریئر میں کچھ کھانے کا سامان لے کر آفس چلی آئی تھی۔ قریب ۱۲ بجے جب کام سے فرصت ملی تو دراز سے اُس نے کھانے کا سامان نکالا، اور چپراسی سے پانی بھجوانے کے لئے کہہ کر وہ کھانے میں مشغول ہو گئی۔

تھوڑی دیر ہی بعد، پردہ ہٹا کر کوئی اس کے کمرے میں داخل ہوا، اور پھر مینا اس نے سر اٹھا کر دیکھ لیا۔ اور دیکھتی ہی رہ گئی، ماضی کے جنگل کا ایک درندہ اس کے شوہر کے روپ میں پانی کا گلاس لئے کھڑا تھا جو آج ہی "پانی والے" کی جگہ پر نوکر ہوا تھا۔

بقیہ: اندھی کاکی

آنکھوں میں دھندسی چھا گئی ہے۔ میں نے اُسے صاف کیا ہے تو ملبے سے نکلی ہوئی رامو کاکا اور اندھی کاکی کی لاشیں پھر میرے سامنے آگئی ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر اب بھی وہی شفیق مسکراہٹ کھیل رہی ہے جس سے گاؤں کا بچہ بچہ آشنا ہے۔ میں اُن کے نزدیک جاتا ہوں اور کہتا ہوں۔

" رامو کاکا اور کاکی! تمہاری محنت۔ گاؤں والوں کے لئے تمہاری خدمت اور محبت کی زندگی ہمیشہ ہی ہمارے لئے مشعلِ راہ رہے گی۔"

اور کاکی اور رامو کاکا جیسے مجھ سے اور سارے گاؤں سے کہہ رہے ہیں۔

" ہمارے پاس آؤ ہمارے بچو — یہاں — ہمارے نزدیک — آؤ ہم تمہیں ایک بار پھر وہی راز بتائیں — اپنی آنکھوں کے اُجالے بھی اُس وقت تک بے معنی ہیں جب تک کہ اُن سے دوسروں کو روشنی نہ ملے۔

بادشاہ حسین رضوی



ایک گلاس پانی

اس سال بھی شوکت ہائی اسکول پاس نہ ہوسکا۔ یہ اس کا چوتھا سال تھا۔ اس کے والد امجد صاحب بڑی دیر تک حقے کے لمبے لمبے کش لیتے رہے۔ اور بوسیدہ کمرے کی بوجھل فضا میں دُھواں اگلتے رہے۔ آخر اُن کی بیوی ساجدہ نے ٹوکا۔

"کیا سوچ رہے ہیں اتنی دیر سے؟"

"سوچ کر کیا کروں گا ___؟" ___ اپنی قسمت کو کوس رہا ہوں۔"

"ایسی باتیں سوچ کر دل جلانے سے فائدہ؟"

"اور اب دل کیا جلے گا؟ ___ زمینداری تھی جو کب کی ختم ہوگئی۔ دھیرے دھیرے ساری زمین بھی بک گئی سب سامان بھی ختم ہوگیا سوچا تھا بڑھاپے کی لکڑی، بڑا لڑکا ہے، پڑھ لکھ کر ہاتھ بٹائے گا۔ مگر صاحبزادے اڑیل گھوڑے کی طرح ایک ہی کلاس میں جم گئے ہیں، چار سال تو ہوگئے، اب کیا پاس کرسکے گا ___ زندگی بھر پاس نہیں کرسکتا۔" اور پھر امجد صاحب اور بھی اُداس ہوگئے۔ چہرے کی جھرّیاں اور بھی نمایاں ہوگئیں، حقے کا ایک لمبا کش لے کر انہوں نے کہا۔

"بیگم میں سوچتا ہوں پڑھائی، لکھائی کا چکر چھوڑوا کر، کیوں نہ اب اُسے کسی کام میں لگا دیا جائے پڑھانا اب میرے بس کی بات نہیں، ہائی اسکول بھی پاس نہیں، اس لئے کوئی نوکری ملنے سے رہی۔ آج کل بے چارے بی اے اور ایم اے نوکری کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ کیوں نہ کوئی چھوٹی موٹی تجارت ہی شروع کرادی جائے۔"

"ہاں یہ تو بہت اچھا ہوگا۔" ساجدہ نے بھی ہاں میں ہاں ملادی۔

تھوڑا بہت سرمایہ جو بانڈ وغیرہ فروخت کرکے حاصل ہوا اور موروثی باغ جو بکتے بکتے بچ گیا تھا اُسے بھی بیچ کر ڈوڈھائی ہزار کے سرمائے سے کپڑے کی دوکان شروع کرادی گئی۔ شروع شروع میں شوکت نے بڑے انہماک اور بہت پابندی سے کام شروع کیا۔ والدین بھی خوش تھے کہ لڑکا اب کام میں دلچسپی لے رہا ہے۔ دن پھر اچھے آجائیں گے۔ "چلو لڑکے نے دل لگایا تو" ماں یہ سوچ سوچ کر اور بھی خوش ہو رہی تھی کہ رشتے کی وہ عورتیں جو لڑکے کو ناکارہ سمجھ رہی تھیں ___ اور طعنے دیتی تھیں، اب تو ان کا سر نیچا ہوگا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا، شوکت کے لئے کچھ جگہوں سے بات بھی آنے لگی۔ ساجدہ تو جانے کب سے اس کی شادی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ آخر ایک رات، جب امجد صاحب حقے سے شوق فرما رہے تھے انہوں نے کہا۔

"اے سنتے ہو جی اپنے شوکت کے لئے کئی جگہ سے بات آرہی ہے کبھی اس کے بارے میں بھی سوچا ہے۔ لڑکا بڑا ہوگیا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہیں شادی کردی جائے تو اس کام سے بھی چھٹی مل جائے۔ اور پھر ہوسکتا ہے، کام میں بھی اُس کی دلچسپی بڑھ جائے۔ بیوی آجائے گی تو کہاں تک خیال نہیں کرے گا۔"

"امجد صاحب کو یہ اسکیم پسند آگئی، اور انہوں نے اپنی بیوی کی تائید کرتے ہوئے "ہاں" کردیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد، ایک اچھی جگہ، جہاں کافی جہیز ملنے کی امید تھی، بات پکی کردی گئی۔

شوکت کی شادی جہاں طے پائی تھی۔ نوکر پیشہ لوگ تھے، کوئی جائداد، زمین، خاندانی ورثہ کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ تھا سب اُن کی گاڑھی کمائی اور اپنی محنت کا پھل تھا۔ مگر پھر بھی اُن لوگوں کی جتنی ماہانہ آمدنی تھی، امجد صاحب کی سالانہ آمدنی بھی نہیں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ امجد صاحب سے اُن کا اور اُن کے اجداد کا شاندار ماضی جڑا ہوا تھا۔ لڑکی والوں نے شاید یہی سوچ کر "زمیندار صاحب کے یہاں شادی ہو رہی ہے، بڑے لوگ ہیں، اُن کی شان میں کمی نہ آنے پائے، یہی کیا کم ہے، اتنے بڑے خاندان میں لڑکی کی شادی ہو رہی ہے، جہیز وغیرہ میں کسی قسم کی کمی نہ آنے پائے۔" بڑی فراخدلی سے اور اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ خرچ کر کے شادی کر دی، بہت سا سامان اور کافی نقد دے کر نسرین کو رخصت کر دیا۔

نسرین ہائی اسکول پاس تھی، بڑی ذہین اور کافی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُسے اپنے شوہر کے کم پڑھے لکھے ہونے کا ملال تھا۔ مگر کر ہی کیا سکتی تھی۔ اپنے والدین کی خوشی، اور اپنی قسمت کے لئے یہ سب کچھ قربان کر دیا۔ قسمت کی ستم ظریفی پر مسکراتے ہوئے اُس نے سب کچھ قبول کر لیا۔

سسرال کی اقتصادی حالت اور بے سر و سامانی دیکھ کر وہ لرز گئی۔ بہت بڑی حویلی جس کا بیشتر حصہ گر چکا تھا، جتنا بچا تھا خستہ حال، بوسیدہ اور سیلن زدہ، جا بجا پلستر اُدھڑے ہوئے، ۔ اور جس کی صفائی بھی نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے آتے ہی گھر کی صفائی سے لے کر سارا کام کاج خود ہی سنبھال لیا ـــ مگر یہاں ابھی تک زمینداروں کی وہی مغرورانہ ذہنیت اور روایت پرستی کا رنگ دیکھ کر اُسے بڑی کوفت ہوتی ـــ "کس قدر ریاکار ہیں یہ لوگ اپنی پرانی دنیا میں کھوئے ہوئے۔"

شوکت، کچھ دنوں تک تو نسرین میں کافی دلچسپی لیتا رہا۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد حسب معمول اپنے دیرینہ دوستوں کے ساتھ، خوش گپیوں میں کھو گیا۔ کافی رات تک اس کے ساتھی اُسے گھیرے رہتے، حویلی سے دوکان تک۔ اور جب رات آتی تو کافی دیر تک چائے سگریٹ کا دور چلتا اور تاش کا شغل جاری رہتا۔ نسرین کو شروع میں بڑی کوفت ہوتی مگر دھیرے دھیرے جیسے وہ عادی ہو گئی۔ ان سب سے بے پروا، اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ اپنے حسین خوابوں کی دنیا میں لوٹ جاتی، کیوں کہ اب اُسی دنیا میں پہنچ کر اُسے بڑا سکون ملتا ـــ جہاں اُس کے اپنے سپنے ہوتے، اپنی دنیا ہوتی، اور سب کچھ جانا پہچانا ہوتا۔ اُسے اُن لوگوں سے کوئی شکایت یا نفرت نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ اپنی قسمت سے قریب قریب سمجھوتہ کر چکی تھی۔ مگر پھر بھی اس ماحول میں خود کو الگ تھلگ محسوس کرتی تھی۔ وہ سوچتی اپنی بے لوث خدمت اور سیرت کی خوبیوں سے اس حویلی کو ایک دن بدل ہی دے گی، کیوں کہ وہ حالات سے ہار ماننا تو جانتی ہی نہ تھی، زندگی سے لڑنا سیکھا تھا۔

مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا سینہ روز روز کے طعنوں اور جلتے فقروں سے چھلنی ہونے لگا۔ کبھی رات میں اگر زیادہ جاگ جانے سے سویرے اُٹھنے میں ذرا دیر ہو جاتی، تو نند، ساس، یا گھر کی بوڑھی عورتیں اُسے ایک منٹ میں سُنا کر رکھ دیتیں۔

"لاٹ صاحب کی بیٹی ہیں نا۔ ابھی تو اُن کے لئے صبح ہی نہیں ہوئی کیوں نہ باپ سے کہا تھا، چند نوکرانیاں بھی ساتھ بھیج دیتے۔ ہمارے لڑکے کی تو قسمت پھوٹ گئی۔"

حالاں کہ قسمت کس کی پھوٹی تھی وہ کیسے کہتی؟۔ اور وہ آنسو پیتے ہوئے اُٹھ پڑتی، اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی، جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ مگر اُس کے سینے میں کھولتا ہوا لاوا کبھی کبھی اُبل پڑنے کو بے چین ہو جاتا ـــ "کیا نہیں دیا میرے گھر والوں نے۔ دیکھوں گی اور کیا دیتی ہیں یہ اپنی صاحبزادی کو" مگر وہ خاموش رہ جاتی، ہر زہر کو امرت سمجھ کر پی جاتی۔

مگر اُس دن تو انتہا ہو گئی۔ شام کجلا گئی تھی۔ اُفق پر دُور تک اندھیرے کی ملگجی چادر پھیلتی ہوئی چلی گئی تھی۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہی خیالوں میں ڈوبی بیٹھی تھی کہ شوکت شراب کے نشے میں دُھت، لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ، کمرے میں داخل ہوا، وہ اُسے دیکھ کر حیران ہو گئی، اس حال میں تو اُسے وہ کئی بار دیکھ چکی تھی ـــ "مگر یہ آج ابھی سے کیسے؟" وہ ابھی طے ہی نہیں کر پائی تھی۔ کہ اُس نے آتے ہی کرخت لہجے میں کہا۔ "مجھے روپے کی ضرورت ہے جلدی نکالو۔"

"مگر میرے پاس کہاں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے؟ جلدی لاؤ۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

اُس سے ضبط نہ ہو سکا، اور بڑی کوششوں سے رُکا ہوا باندھ ٹوٹ گیا۔

"آپ نے کبھی ایک کوڑی بھی مجھے دی ہے، جو مانگ رہے ہیں
دکان میں نہیں ہے کیا، ختم ہوگیا؟ آپ کو کئی بار سمجھایا۔ مگر آپ کیوں ماننے لگے۔
شراب، جوا، دھیرے دھیرے سب برباد کردیا — میں کہاں سے دوں۔"

اور پھر وہ تقریباً چیخ کر بولا "چپ بدزبان، بحث کرتی ہے؛ روپیہ نہیں ہے تو زیور دے۔ مجھے بہت جلدی ہے۔"

"میرے پاس زیور ہی کون رہ گئے ہیں، اس گھر سے مجھے ملا ہی کیا تھا۔ جو کچھ بھی میں اپنے گھر سے لائی تھی، اُسے بھی تمہارے گھر والوں نے تمہاری بہن کو شادی میں دے ڈالا۔ میرے پاس کیا رہ گیا۔"

اس وقت کمرے میں اُس کی ماں بھی آگئی اور اُسے بہت کچھ سُنا ڈالا۔

"خبردار! جو میری بچیوں کو کچھ کہا تو ابھی گھسیٹ کر باہر کر دوں گی" — وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، شوکت اسے بری طرح پیٹ رہا تھا، ماں کی شہ پاکر وہ اور تیز ہوگیا اور زبردستی اُن کے کانوں سے بُندے (یہی جو اُس کے پاس رہ گئے تھے) چھین کر چلا گیا۔ اُس کے کان بھی بُری طرح زخمی ہوگئے۔

کالی رات اور بھی اندھیری ہوگئی، اور اس کی آنکھوں سے چلتے ہوئے آنسو بہتے بہتے، جانے کب خشک ہوگئے۔

دوسرے دن صبح والی گاڑی سے وہ اپنے میکے چلی گئی۔ جیسے رات بھر میں اپنے لئے وہ کوئی فیصلہ کرچکی تھی۔ اس طرح کی زندگی سے وہ تنگ آچکی تھی بس قدر بے رنگ ہوگئی تھی اس کی زندگی ہر بات پر طعنے جلتے فقرے اور کوسنے، یہ سب تو کسی طرح اس نے برداشت کرلیا تھا مگر اب تو حد ہوگئی، گھر بھی ملا تو اس طرح کا۔ شوہر بھی اس قدر لاابالی، بے فکرا، شرابی اور جواری، دنیا کی ساری برائیاں رکھنے والا۔ عورت مجبور ہے مگر اتنی نہیں اور پھر اُس نے طے کرلیا اب وہ اس گھر میں نہیں آئے گی۔ زندگی کا یہ اُجاڑپن کیوں نہ اکیلے ہی بسر کرے۔

میکے میں رہتے ہوئے اُسے ایک سال سے زیادہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنا ماضی بھولتی جارہی تھی۔ اب اسے کچھ نہیں یاد آرہا تھا کبھی یاد بھی آتا تو کانپ کانپ جاتی۔ ماضی ایک گھنا اندھیرا تھا۔ ایک خوفناک، دُور تک پھیلا ہوا جنگل، جس کے خونخوار درندے اپنا خوفناک جبڑا کھولے ہوئے، اُسے

(بقیہ ۳۵ پر)

بقیہ: عالمی نظام میں انسان کے بنیادی حقوق اور آئین میں اُن کا

ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے کچھ حق اور بڑھا دیئے گئے ہیں۔ ہر ملک کے آئین میں اس قسم کے حقوق کا اضافہ کرنا لازمی ہوجاتا ہے کیوں کہ ہر ملک کے اپنے مخصوص مسائل اور تصورات ہوتے ہیں۔

ان سرخیوں اور دفعات سے جو میں نے سنائی ہیں یہ اندازہ تو کیا ہی جاسکتا ہے کہ ہمارے آئین میں سارے بنیادی حقوق کا تحفظ موجود ہے اور جو ہماری مخصوص قومی غلط کاریاں اور گمراہیاں ہیں اُن کا بھی انسداد کیا گیا ہے۔

اگر آپ میری رائے سے متفق ہیں تو انسانی قافلے کو بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے دو متضاد تقاضوں اور ضرورتوں کے بیچ سے راہ نکال کر آگے بڑھنا ہے۔ ایک ضرورت تو یہ ہے کہ قانون کی حکومت ہو اور حکمرانوں کو یہ اختیار نہ ہو کہ بنیادی حقوق کو اپنی اغراض کے لئے کچل سکیں اور انسان کو پھر جبر اور ناانصافی کا شکار بنا دیں دوسری ضرورت یہ ہے کہ قانون میں اتنی لوچ اور لچک ہو کہ آنے والی نسلوں کو بدلتے ہوئے تقاضوں کے لئے اس میں گنجائش ہو اور ارتقار کے راستے میں فصیل بن کر کھڑا نہ ہوجائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے آئین کی دفعہ ۱۳ اور دفعہ ۳۶۸ کو اگر ساتھ ساتھ پڑھا جائے اور انہیں سمونے کی کوشش کی جائے تو یہ بیچ کا راستہ نکل سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آئین ہند میں قانون کے راج کو انسانوں کی حکومت پر فوقیت دینے کے لئے وہ تمام حدود و پابندیاں موجود ہیں جو انسان کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ لوچ اور لچک بھی ہے جو آنے والی نسلوں کے تقاضے بھی پورے کرسکے گی۔ یہ ایک مشعل ہے جو ہر دَور اپنے بعد آنے والے دور کو سونپتا رہے گا کیوں کہ یہ آئین امانت بھی ہے اور ورثہ بھی۔

بقیہ: عالمی یوم صحت، تندرستی خوشحالی کی ضمانت ہے۔

ہیں۔ اس طرح ہماری آبادی میں ایک کروڑ ۳۰ لاکھ سالانہ (آسٹریلیا کی آبادی کے برابر) اضافہ ہو رہا ہے چوتھے پلان میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ شرح پیدائش ۴۰ ہزار سے کم ہو کر ۲۵ ہو جائے۔



تسنیم فاروقی

دھرتی کی آواز

میری زُلفوں میں جھنکتا ہے سپیروں کا خیال
میری پلکوں پہ ہے پُرامن بہاراں کا خُمار
جن سے رنگین ہوئی کتنی ہی صدیوں کی شفق
میرے ہونٹوں میں بہاروں نے اَماں پائی ہے
میری مُسکان میں گوکل کے نشاں ملتے ہیں !
گنگناتی ہوں تو کاشی کا گُماں ہوتا ہے
میرے شانوں پہ کلابن کے دیئے جلتے ہیں
میرے آنچل کے لہریوں میں سنورتے ہیں چمن
نفس تاج دَھڑکتا ہے میرے سینے میں
میرے کولہوں پہ ہیں رادھاؤں کی گاگر کے نشاں
ہندو مسلم و سکھ سب ہیں مری دھڑکن میں
میری تہذیب سے گوتم کا پتا چلتا ہے
دَرد سنگیت نے پایا ہے مری پائل سے
میرے چرنوں نے اُگائے ہیں ستارے کیا کیا
کھیلنا سب کو "گھروندے" سے سِکھایا میں نے
میرے آنگن میں جو رہتے ہیں وہ سب بھائی ہیں

چھاؤں میں اس کی درخشاں ہے سویروں کا جمال
میری آنکھوں میں ہے کشمیر کے چشموں کا نکھار
میرے رُخسار ہیں راماین و گیتا کے ورق
میری ہر سانس میں گاتی ہوئی پُروائی ہے
میرے اِک بول سے کلیوں کے نگر کھِلتے ہیں
سازومِضراب کا احساس جواں ہوتا ہے
میری باہوں میں اجنتا کے صنم ڈھلتے ہیں
اس کی ہر موت سے پاتے ہیں جلاِ گنگ و جمن
شعلۂ عشق بھڑکتا ہے میرے سینے میں
جن کی ہر شوخ لچک میں ہے خم کاہکشاں
ہوں لئے کتنے شہیدوں کا لہو، دامن میں
میرے سائے نے ہمالا کو جواں رکھا ہے
میں اگر رنگ پہ آجاؤں تو جگ ناچ اُٹھے
میری آغوش پہ نازاں ہیں نظارے کیا کیا
کوکھ سے دے کے جنم دُودھ پلایا میں نے
میرے فرزند ہیں سب، سب مرے شیدائی ہیں

جو مرے دِل کو دُکھائے گا وہ پچھتائے گا
بابِ تاریخ میں غدار لکھا جائے گا

مجیب صدیقی

اندھی کاکی

" اپنی آنکھوں کے اُجالے بھی اُس وقت تک بے معنی ہیں جب تک اُن سے دوسروں کو روشنی نہ ملے ستاروں کی جگمگاہٹ کو کون پوچھے اگر وہ اپنے وجود کی قربانی دے کر سورج کے رُخِ روشن سے رات کی سیاہ چادر نہ ہٹائیں۔" یہ ہے وہ دُھندلی سی، پُرانی اور مِٹی مِٹی سی تحریر جو ایک بوسیدہ سے کاغذ پر آج اچانک ہی میرے سامنے آگئی ہے۔ کاغذ کا یہ پُرزہ مجھے رامو کاکا اور اندھی کاکی کے مکان کے ملبے سے ملا ہے۔ گاؤں کے نشیبی حصے میں یہی پہلا مکان تھا جو کل رات چڑھتے ہوئے سیلاب کی زد میں آکر ڈھے گیا۔ اس کا ملبہ سیلاب کو تو نہ روک سکا۔ لیکن پانی کا چڑھاؤ اتنی دیر کے لیے مدھم ضرور پڑ گیا جتنی دیر میں کہ باقی گاؤں والے اپنی اپنی جان بچا کر دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ سارے گاؤں کی جانیں بچ گئیں۔ لیکن رامو کاکا اور اندھی کاکی کی لاشیں ملبے کے نیچے ہی دفن ہو کر رہ گئیں — رامو کاکا اور اندھی کاکی کا خود کو ڈبو کر پورے گاؤں کو بچا لینا، ایک حادثہ تھا، یا یہ اُن دونوں کا ارادی فعل تھا، میں نہیں جانتا — میں تو صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ سارے گاؤں کے سر سے اس بلائے ناگہانی کے ٹل جانے کی خوشی محض ایک قطرہ تھی، جو رامو کاکا اور اندھی کاکی کی موت کے سمندر میں گر کر اپنا وجود کھو بیٹھی ہے۔ گاؤں کا ہر فرد اُداس ہے۔ ہر گھر پر سناٹا طاری ہے۔ کئی چولھے میں آگ نہیں جلی۔ کئی کے منہ میں کھیل تک اُڑ کر نہیں گئی۔ سارے گاؤں کی عقیدت مندانہ نگاہیں ملبے سے نکالی گئی اُن دو لاشوں پر جمی ہیں جن کے ہونٹوں پر اِس وقت بھی ایک ملکوتی مسکراہٹ ہے۔ میں بھی اس مسکراہٹ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس مسکراہٹ کی سدا بہار تازگی کو محسوس کر رہا ہوں۔ کاغذ کا وہ پُرزہ اب بھی میرے ہاتھ میں ہے — پُرزہ نہیں۔ ایک کتاب۔ ایک کہانی۔ ایک داستان جس کے اوراق خیالات کی تیز آندھی میں ایک ایک کر کے کھلتے جا رہے ہیں — پہلا ورق کھلتا ہے۔ اس کی پیشانی پر وہی تحریر درج ہے۔" اپنی آنکھوں کے اُجالے بھی اس وقت تک بے معنی ہیں — . . . . ." اور اس تحریر کے نیچے سے اُبھر رہی ہے، اندھی کاکی کی معصوم شبیہہ۔ جن کے ہونٹوں پر اس وقت بھی وہی ہمدردانہ مسکراہٹ ہے جسے گاؤں والے اپنے ہر رنج، ہر غم کا مداوا سمجھتے تھے۔ کاکی کی شبیہہ اُبھر رہی ہے۔ اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے آگیا ہے۔ میرے دل میں ایک سوال جاگا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں پوچھ رہا ہوں —

" کاکی! کسی دوسرے کو روشنی بخشنا، اُس کی تاریک راہوں کو روشن کرنا ایک بڑی بات ہے لیکن اس کے لیے خود کو اندھا کر لینا بھی تو مناسب نہیں۔ خودکشی تو بہرحال ایک گھناؤنا فعل ہے۔"

" میرے پیارے بیٹے! خودکشی ایک گھناؤنا فعل ہے۔ لیکن یہی خودکشی دُنیا کا مقدس ترین کارنامہ بن جاتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گاؤں، اپنے قصبے، شہر یا وطن کے کسی فرد کی جان و مال اور عزت بچانے کی خاطر خود کو موت کے منہ میں جھونک دیتا ہے۔"

" لیکن کاکی: میں تمہاری آنکھ کے اُجالے کی بات کر رہا ہوں، وہ بات جس کو آج تم نے گہرے راز میں رکھا۔ گاؤں والوں کا خیال ہے کہ تم کسی حادثہ کی وجہ سے اندھی ہو گئی تھیں، مگر میرا دل اس بات کو ماننے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوا۔ تم بتاؤ نا کاکی! تمہارے اندھے ہونے کا کیا راز ہے۔ کیا بھید ہے۔ بتاؤ کاکی؟!" اور کاکی میری بات سُن کر بے ساختہ ہنس پڑی ہیں۔ وہ ہنسے جا رہی ہیں۔ میں بھی ہنس رہا ہوں۔ مگر میری ہنسی میں اس راز کو جاننے کی خواہش پوری طرح واضح ہے کہ اچانک کتاب کا ایک اور ورق پلٹتا ہے۔ میرے سامنے اب رامو کاکا کا چہرہ ہے، وہی بھولا بھالا سنجیدہ چہرہ اور چہرے

پروہی جانے پہچانے ہمدردی کے جذبات ـــ وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں ـــ

"تمہارا دل کیا کہتا ہے بیٹے! کاکی کے اندھے ہونے کا کیا راز ہے۔"

"راز چاہے جو بھی ہو راموکاکا! لیکن میرا دل کہتا ہے کہ کاکی کسی حادثے کے سبب نہیں بلکہ خود جان بوجھ کر اندھی ہوئی تھیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے۔ آؤ آج میں تمہیں اس کہانی کے اُس چھور تک لئے چلوں جہاں پہنچ کر ممکن ہے اس سربستہ راز کی حقیقت سامنے آجائے ـــ تم نہیں جانتے ـــ تمہارا یہ راموکاکا جسے تم سب گاؤں والے محبت سے اپنا سرپرست اپنا رکھوالا سمجھتے رہے۔ ایک زمانے میں خود سب سے بڑا بے سہارا، بے سروسامان انسان تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب زمیندار سارے گاؤں کا مالک ہوتا تھا اور کاشتکار اس کے رحم وکرم کے بھکاری ـــ میں بھی ایک کاشتکار کا بیٹا تھا۔ سوچا تھا اپنے باپ ہی کی طرح میں بھی اپنی کڑیل جوانی کھیتوں کی بھُربھُری مٹی میں کھاد بنا کر ملاؤں گا اور ایک اچھا کاشتکار بنوں گا ـــ مگر کہاں ـــ میں ابھی لڑکا ہی تھا کہ میرا باپ چل بسا۔ اس کی بیماری کے دوران دوا علاج میں دونوں بیل بھی بک گئے ـــ اور میرے لئے ساری راہیں مسدود ہوگئیں۔ چاروں طرف بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کہیں کوئی کرن نہ تھی ـــ کوئی راستہ نہ تھا۔ پھر بھی اُس وقت تک ایک وجود تھا جس کی آغوش میں سر چھپا کر مجھے سارے جہان کا سکھ اور چین مل جاتا تھا۔ وہ مقدس وجود میری ماں کا تھا۔ مگر ایک رات ـــ اُف کیسی بھیانک اور تاریک تھی، برسات کی وہ طوفانی رات جب بارش ہر لحظ تیز ہوتی جارہی تھی۔ بادلوں کی گھن گرج زور پکڑ رہی تھی اور میں بخار میں جلتی ہوئی اپنی ماں کو بانہوں میں سمیٹے جھونپڑی کی ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے کونے کونے چھپتا پھر رہا تھا ـــ پھر ـــ آہستہ آہستہ بارش بھی کم ہوگئی۔ بادلوں کی گرج کا شور بھی کم ہوگیا اور طوفان بھی اپنے پیچھے ایک مرگ آلود سناٹا چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔ لیکن وہ جھونپڑی ـــ ہاں ہماری وہ جھونپڑی دیر تک اپنے اندر بسنے والی مخلوق کی بیکسی پر آنسو بہاتی رہی ـــ میری ماں کی آنکھیں سدا کے لئے بند ہوگئیں۔ وہ آنکھیں جو میرے آنسوؤں کیساتھ اپنے جگر کا لہو بہایا کرتی تھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں اور میں اس اتنے بڑے جہان میں حادثات کے تھپیڑے کھانے کے لئے یکہ و تنہا رہ گیا۔

کسان کے بیٹے نے کسان ہی بننے کے خواب دیکھے تھے وہ بھی پورے نہ ہوئے اور حالات نے مجھے ایک چرواہا بنا دیا ـــ چرواہا ـــ جس کی ماں فطرت کی وسیع آغوش اور جس کے مونس و غمخوار بھولے بھالے بے زبان جانور ہوتے ہیں۔ میرے پاس کچھ جانور محلے والوں کے اور کچھ گاؤں کے زمیندار کے تھے ـــ زمیندار کے جانور لینے جب پہلے دن میں اُن کے گھر گیا تھا تبھی میری ملاقات لاجو سے ہوئی تھی ـــ لاجو ـــ جس کی آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگاتی تھیں۔ گاؤں کے زمیندار چندر پال سنگھ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اُس روز پہلی دفعہ جب میں زمیندار کے گھر اُس کے جانوروں کو لینے گیا تو لاجو کی ایک چہیتی گائے مجھے مارنے کو دوڑی مجھے غصہ آگیا اور میں نے اُس کے دو چار ڈنڈے جما دیئے۔ لاجو دروازے پر کھڑی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اپنی گائے کو مار کھاتے دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہوگئی۔ وہ مجھ پر بہت بگڑی۔ دیر تک نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی رہی۔ اور میں چپ چاپ سب کچھ سنتا ہوا اُس وقت وہاں سے چلا آیا۔ لاجو گاؤں کے زمیندار کی بیٹی تھی اور میں ایک چرواہا ـــ اس بات کا احساس تھا مجھے۔ پھر بھی مجھے اُس کی وہ باتیں بے حد بُری لگیں اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ کل سے زمیندار کے جانور نہیں چراؤں گا ـــ اگلے دن میں صرف محلے والوں کے جانور لے کر جنگل کی طرف چلا گیا۔ جانور مُنہ اٹھائے کھلے میدانوں میں دُور دُور تک پھیل گئے اور میں ایک گھنے سے برگد کی گھنیری چھاؤں تلے لیٹ کر سوچتا رہا کہ ان بڑے لوگوں میں اخلاق اور مروّت نام کو نہیں ہوتی۔ اور لاجو ـــ تبھی میں نے آہٹ پاکر پیچھے گھوم کر دیکھا تو لاجو میرے سرہانے گھاس پر ننگے پیر کھڑی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی اس کی طرف سے مُنہ گھما لیا اور اُس سے کوئی بات نہیں کی ـــ وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور بولی۔

"اے رامو! آج تو ہمارے جانور لینے کیوں نہیں آیا۔"

"میں نہیں چرا سکتا تمہارے جانور۔ کسی اور کو رکھ لو۔ زمینداروں کو نوکروں کی کیا کمی ہے۔"

لیکن لاجو میری بات سُنی اَن سُنی کرکے میرے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی۔

"دیکھ رامو، ـــ میں جانتی ہوں تو مجھ سے ناراض ہے۔ مجھے خود

کل کی باتوں کا بہت دُکھ ہے۔ تو سمجھتا نہیں رامو، وہ گائے جسے تو مار رہا تھا، میری بہت چہیتی گائے ہے۔ اُسے تو میں نے خود اپنی ضد سے خریدا ہے۔ تجھے اس گائے پر غصہ ہے تو ــ تو لے ــ تو اُس کے بدلے مجھے مار لے ــ میں کچھ نہ کہوں گی۔"

اور لاجو نے بچوں کی طرح مار کھانے کے لئے اپنے ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔

اُس کے بعد ــ اُس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ خبر نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ اُس کے بعد لاجو چلی گئی تھی۔ میں نے اُس کو دل سے معاف بھی کر دیا تھا اور اُس کے جانور چرانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا ــ اور پھر ــ زندگی جیسے ایک معمول پر لگ گئی تھی۔ میں لاجو کے جانور چراتا رہتا اور لاجو ہر روز دوپہر میں برگد کی اسی گھنیری چھاؤں تلے گھنٹوں بیٹھی مجھ سے باتیں کیا کرتی۔ شام کو جب میں جانور لے کر گاؤں واپس آتا تو لاجو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی میرا انتظار کرتی ہوتی مجھے دیکھتے ہی وہ بناوٹی غصے سے کہتی۔

"گاؤں بھر کے چروا ہے دن ڈھلنے سے پہلے ہی لوٹ آئے مگر تمہارا جنگل سے بستی کی طرف آنے کو دل ہی نہیں چاہتا، میں نہیں بولتی تم سے۔"

"مگر لاجو ــ اب تو بول رہی ہو تم مجھ سے" میں سیدھے سپاٹ لہجے میں کہہ دیتا۔ اور لاجو فوراً میری بات کا جواب دیتی کہتی۔

"ہاں جب تمہارے جانوروں کی گھنٹیاں سنیں تو یہی سوچا کہ اب تھکے ہارے مسافر کو کون پریشان کرے۔ بس اسی لئے بول رہی ہوں تم سے"

اور میں اُس کے یہ میٹھے میٹھے معصوم بول سُن کر نہ جانے کہاں کھو جاتا۔ نہ جانے کیا سوچنے لگتا۔ دیر تک سوچتا رہتا کھویا کھویا سا۔ ڈوبا ڈوبا سا۔

اساڑھ کی پہلی بوند جیسے پیاسی دھرتی کے سینے میں سما جاتی ہے یا جیسے پپیہے کی درد بھری آواز کسی برہن کے کلیجے میں اُتر جاتی ہے۔ لاجو کے وجود کی پرچھائیاں بھی کچھ اسی طرح میری روح کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی تھیں۔ دن جیسے اڑ رہے تھے اور راتیں جیسے بہہ رہی تھیں کہ ایک روز اچانک ہی گاؤں کی فضا بوجھل ہو گئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ زمیندار کی سخت ترین پابندیاں کے باوجود لاجو ہر روز پابندی سے مجھ سے ملتی رہی تھی۔ اُس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن آج سچ مچ ہی وہ سخت پہرے میں مقید کر دی گئی تھی۔ کئی دن گذر گئے ــ لاجو مجھے نہیں ملی ــ اور اتنے روز مجھے ایسا لگا جیسے میں زندہ ہی نہیں رہا۔ یا جیسے میں زندہ رہنے کا ناٹک کرتا رہا۔ ہواؤں میں گھٹن تھی اور کائنات جیسے اپنے محور پر گھومتے گھومتے اچانک سانس روک کر کھڑی ہو گئی تھی کہ ایک رات یکایک سارے گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ پورا گاؤں زمیندار کے گھر کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا اور تبھی مجھے پتہ چلا کہ ــ لاجو اندھی ہو گئی ــ لاجو کیسے اندھی ہوئی تھی۔ یہ راز مجھے بھی نہیں معلوم مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے میرے بیٹے کہ لاجو ــ لاجو تھی ــ جس کو تم سب گاؤں والے اندھی کاکی کے رُوپ میں جانتے ہو، اُسی کی آنکھوں کے تاریک افق سے میری زندگی کی تابناک کرن پھوٹی تھی۔"

اتنا کہہ کر رامو کاکا چُپ ہو گئے ــ میرے ہاتھوں میں کاغذ کا وہ پُرزہ، وہ کتاب اس داستان کے اوراق برابر پھڑپھڑا رہے ہیں۔ رامو کاکا کا چہرہ اوجھل ہو گیا ہے۔ اور اب ایک بار پھر کاکی کی معصوم شبیہ اُن اوراق پر اُبھر آئی ہے۔ میں اُن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ کاکی کہہ رہی ہیں۔

"وہ رات بڑی اندھیری بڑی گھناؤنی تھی میرے بیٹے! جب میرے زمیندار باپ نے تمہارے رامو کاکا کو مار ڈالنے کی بات طے کی تھی۔ وہ اس روڑے کو ہمیشہ کے لئے اپنی راہ سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔ میرے من کی بات کا اندازہ انھیں ہو چکا تھا اسی لئے انھوں نے خاموشی سے اس پلان کو ترتیب دیا تھا۔ میں سنگین پہروں کے بیچ مقید تھی۔ انھیں کسی بات کی اطلاع بھی نہیں دے سکتی تھی۔ وقت بہت کم تھا اور مجھے اُن چند لمحوں میں ہی ایک فیصلہ کرنا تھا۔ ایک ایسی راہ کھوجنا تھی جو رامو کی زندگی بھی بچا سکتی اور میرے اُن کے ساتھ کو جو اُس وقت تک ہر پہلو سے ناممکن تھا ممکن بھی بنا سکتی۔ رات ہر لمحہ تاریک تر ہوتی جا رہی تھی اور مجھے چاروں طرف موت کے بھیانک سائے ناچتے نظر آ رہے تھے جیسے رات کے اُس سناٹے پر سینکڑوں اُلوؤں کا پہرہ ہو، اور اُن کے پروں کی ہیبت ناک پھڑپھڑاہٹ موت کے قدموں کی آہٹ ہو ــ لمحے گذرتے جا رہے تھے۔

یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ گاؤں کا زمیندار — میرا مشفق باپ — اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ گھر سے نکل پڑا ہے —

میں — میں یہ دیکھ کر کانپ گئی، لرز گئی ۔ مجھے کیا کرنا ہے ۔ میں کیا کروں ۔ میرے ذہن میں تند و تیز آندھیاں چل رہی تھیں ۔ میرے کانوں کے پاس ہی سیکڑوں آتش فشاں پہاڑ پھٹ رہے تھے کہ دفعتہً دماغ کے کسی گوشے میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا ۔ اور میں نے — میں نے گھبرا کر پگھلی ہوئی آگ کے چند قطرے اپنی آنکھوں میں ٹپکا لیے ۔ میری چیخ سن میرا باپ اس کے ساتھی اور پھر دھیرے دھیرے سارا گاؤں میرے پاس امنڈ آیا ۔ میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بے نور ہو گئیں ۔ لیکن رامو کی زندگی بچ گئی اور میرے ضدی مغرور باپ کو احساس ہو گیا کہ اُس کی اندھی بیٹی کا ہاتھ تھامنے کے لئے اتنے بڑے جہان میں رامو کے سوا اب اور کوئی نہ تھا — !!"

کاکی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی ہیں ۔ اُن کی معصوم شبیہ بھی آہستہ آہستہ اوجھل ہوتی جا رہی ہے ۔ میرے ہاتھ کی کتاب کے اوراق زور زور سے پھڑ پھڑا رہے ہیں ۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ کتنا اعتماد تھا، کاکی کو اپنے خلوص اپنی محبت اور رامو کاکا پر ۔ آخر انہوں نے ایک بار ایک لمحے کے ہی لئے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اُن کی آنکھیں ختم ہو جانے کے بعد کہیں رامو کاکا کے پیار میں فرق نہ آ جائے ۔ اتنا بڑا اتنا بھیانک فیصلہ کرنے سے پہلے انہوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جس مقصد کے لئے وہ یہ فیصلہ کر رہی ہیں کہیں وہ مقصد ہی ختم نہ ہو جائے ۔ یہ کیسا اعتماد تھا کیسا بھروسہ تھا یہ جسے دیکھ کر عقل محوِ حیرت بھی ہے اور محوِ تماشہ بھی ۔ رامو کاکا اور اندھی کاکی کا بیاہ دھوم دھڑکے سے منڈوے چڑھا اور آج کاکی کے بخشے ہوئے حوصلے اور رامو کاکا کی مثالی محنت افلاس کے مارے اس گاؤں کی تاریکی میں خوشحالی کی شمع بنکر جگمگا رہی ہے ۔

میرے خیالات مجتمع ہو کر اب ایک ٹھکانے پر لگ گئے ہیں ۔ اب کوئی طوفان نہیں ہے ۔ کوئی ہیجان نہیں ہے ۔ میرے ہاتھوں میں بھی اب کوئی کتاب کوئی داستان نہیں، صرف کاغذ کا وہی پُرزہ ہے، جس پر اندھی کاکی کے ہاتھ کی وہ دھندلی سی تحریر درج ہے ۔ میں اس تحریر کو نہ جانے کس جذبے کے تحت آنکھوں سے لگا لیتا ہوں ۔ میری

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر)

وینا والی

دیناناتھ مست



وینا والی چھیڑا تو نے پھر وینا کا راگ
دھیرے دھیرے جل تھل میں ہے سلگا دی اک آگ
چاند ہے پُورنماشی کا اور اُجیاری ہے رات
بھُومی پر ہے چاندی بکھری کیا پیاری ہے رات
انبر آنسو برساتا ہے متواری ہے رات
چیلا چنچل وینا والی
میٹھی کومل وینا والی
امرت ورشا کرتا ہے کیا تیرا میٹھا راگ

مکھ پر الکیں بکھری ہیں یوں جیسے آدھا چاند
مکھڑے سے یہ ہٹ جائے تو چمکے پورا چاند
بانکی چھب ہے بانکی چتون بانکی تیری آن
چاندنی برساتی ہے تیری رُوپ بھری مُسکان
سارے جگ کی جان ہے تو اور وینا تیری جان
گاتے گاتے جھوم رہی ہے
دھرتی جیسے گھوم رہی ہے
سب کو موہت کرتی ہے تو گا کر اپنا راگ

پھُولوں جیسا جوبن تیرا پھُولوں سی بو باس
پھُولوں میں ہی بستی ہے تو پھُولوں میں ہے باس
پھُولوں کا ہے بھوشن گہنا پھُولوں کا ہے تاج
دیکھ کے تیرا پھُول سا مکھڑا سرگ کو آتی لاج
تینوں جگ کی پھلواری میں کیا ہے تیرا راج؛
وینا لے کر تو پھرتی ہے
دُنیا چرنوں پر گرتی ہے
پریم کی شکھشا دیتی ہے تو گا کر اپنا راگ

پاس کی ندی بہتی ہے کیا تھم تھم کر چُپ چاپ
رُک رُک کر ہے وایو چلتی اُپون پر چپ چاپ
چُپ نرناری پکھشی پنچھی جل تھل ہیں چُپ چاپ
نرجھر نہریں نالے چُپ ہیں جنگل ہیں چُپ چاپ
پرتھوی اور آکاش کے دونوں منڈل ہیں چپ چاپ
سُدھ بدھ سارے کھو بیٹھے ہیں
مدماتے سب ہو بیٹھے ہیں
گاتے گاتے کیوں رو اٹھی اس میں ہے کیا بھید؛
روتے روتے گا اٹھی کیوں یہ ہے کیسا بھید؛
جوگن ہے کس پریتم کی تو گاتی ہے کیا گیت
ایسے کس کے بھاگ کھلے ہیں کس سے ہے یہ پریت
پریم میں کس کے ہاری ہے تو کس کی ہے یہ جیت
کس کو بلاتی ہے، تو گا کر
کھو جاتی ہے کس کو پا کر
برہ میں کس کے دکھیا ہو کر چھیڑا دُکھیا گیت
وینا والی وینا کے اب کر دے ڈھیلے تار
دونوں جگ میں گونج رہی ہے وینا کی جھنکار
شکتی کس کو سُننے کی ہے اپنا دُکھیا گیت
دُکھیا سب کو کر ڈالے گا تیرا دکھیا گیت
وینا کو تو ہاتھ سے رکھ دے مت گا دُکھیا گیت
بس کر اب او وینا والی
اپنے پریتم کی متوالی
پریتم تیرے آتے ہوں گے سُن کر تیرا راگ

دیوندر اسر

"پت جھڑ کی آواز"

ـــــ ایک تنقیدی جائزہ



قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسا سانحہ بھی رُونما ہوتا ہے جبکہ اُن کی تہذیب کے بُنیادی محرکات اور صدیوں پُرانی اقدار میں شدید بحران کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کے اجتماعی کردار میں حیرت انگیز تغیر آجاتا ہے۔ ایسا ہی سانحہ ہندوستان کی تاریخ میں تقسیمِ وطن کی صورت میں رُونما ہوا۔ تقسیم اور آزادی کے مشترک تواریخی عمل نے اِس بحرانی کیفیت کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا جس کے ردِ عمل کی بازگشت ابھی تک سُنائی دے رہی ہے۔ سیاست اس دَور کے محرکات میں ایک اہم محرک رہی ہے، جس نے مذہب، سماج اور تہذیب پر حاوی ہو کر ایسی پُر انتشار کیفیت کو جنم دیا ہے جس کے باعث نئی نسل کی ذہنی فضا یکسر بدل گئی ہے۔

اِس عمل کے ساتھ ساتھ دوسری اہم تبدیلی ہوئی، شہری معیشت کا ارتقا، سُرعت سے بڑھتی ہوئی صنعتیں اور نو امیر طبقے کا عروج۔ یہ وہ سماجی پس منظر ہے جس میں قرۃ العین حیدر کے بیشتر افسانوں کی ذہنی فضا کی تشکیل ہوئی ہے۔ تقسیم سے پہلے اور بعد میں فرقہ وارانہ فسادات خون خرابے اور وحشت کے دلدوز مناظر کی داستان تو کئی افسانہ نگاروں نے رقم کی ہے۔ اُن میں زیادہ تر وقتی طور پر انسانیت پرستی کی دُہائی دے کر خاموش ہو گئے اور پھر اپنے روایتی رُومانی تصورات میں کھو گئے۔ کچھ ایسے افسانہ نگار بھی سامنے آئے جنہوں نے تہذیب کے اِس المیے کے درد کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا اور جنہیں اپنے مخصوص سیاسی مسلک اور نئے ملک کی تشکیل کی سرگرمی کے باوجود یہ سوال پریشان کئے ہوئے ہے کہ اُن کا قومی کلچر کیا ہے ؛ اُن کی جڑیں کہاں ہیں ؟ اور تلاش کے اِس عمل میں وہ ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہوئے جو اُن کے نظریات کے یکسر خلاف ہے اور انہیں آٹھ سو سال کی مشترک ہندوستانی تہذیب میں اپنی جڑیں ملیں۔ جڑوں کی اِس تلاش میں قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" تخلیق کیا۔ ہندو مسلم مشترک کلچر کی گہرائی نے اُن کے بیشتر افسانوں کی زمین تیار کی۔ "پت جھڑ کی آواز" (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دلی ۲۵ قیمت ۵/۲۵ روپے) اُن افسانوں کا مجموعہ ہے جن کا بُنیادی عنصر ہندوستانی کلچر کی نمو پاتی ہوئی وہ قوت ہے جس میں مختلف نسلوں، مذہبوں، تہذیبوں اور زبانوں کی رُوح جذب ہوتی چلی گئی اور وہ مشترک تصور میں بندھتے چلے گئے۔ "پت جھڑ کی آواز" کے افسانے اِس مشترک تصور کے مٹنے کا المیہ بیان کرتے ہیں خاص طور پر "جلاوطن"، "قلندر"، "پت جھڑ کی آواز" اور "ہاؤسنگ سوسائٹی"، اجتماعی لاشعور، مشترک تہذیب اور قومی کردار کے تہ در تہ عناصر میں انتشار کی کیفیت کی ترجمانی کرنے کے باعث اُردو افسانے میں اہم اضافہ قرار دیے جائینگے۔

قرۃ العین حیدر نے اِن مسائل پر ایک تخلیقی فنکار کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے جس نے تاریخی شعور کے تحت سماجی محرکات اور عمل کو بخوبی سمجھ لیا ہے اور یہی آگہی وہ قارئین تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ اُن کا رویہ جذبات پرستی کا حامل نہیں بلکہ کسی حد تک انٹی لیکچوئل کا رویہ ہے جو انسانی کردار کی نفسیاتی گہرائیوں اور ردِ عمل کے پیچ و خم سے پوری طرح آشنا ہے۔ انسانیت پرستی کا نعرہ بلند کرنے کے بجائے وہ اپنے کرداروں کے ذہن کے نہاں خانوں میں جھانک کر اس المیے کو پیش کرتی ہیں جسے انہوں نے ایک تخلیقی روح کی حیثیت سے محسوس کیا ہے۔ ہندو مسلم کلچر کی مشترکہ روایت کا ذکر وہ "جلاوطن" میں اس انداز سے کرتی ہیں۔

"زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دُعا مانگنے کے لیے منہ نیلا پیلا کئے ٹین بجاتے

بھرتے اور چلاتے "برسو رام دھڑا کے سے بڑھیا مرگئی فاقے سے"۔ گڈیوں کی بارات نکلی تو وظیفہ کیا جاتا۔ "ہاتھی گھوڑا پالکی جے کنہیا لال کی"۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات چیت نہ کی تھی رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں۔ "بھری گگری موری ڈھرکائی شام"۔ کرشن کنہیا کے اس تصور سے اُن لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، اُف سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جسکا دائرہ مرزاپور، اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصور تھا جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقا نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔" (جلاوطن صہ ۵۸)

اور تقسیم نے کس طرح لوگوں کو جلاوطن کر دیا۔ اس افسانے کے ایک مختصر سے مکالمے میں اُس کا درد پنہاں ہے۔

"کیھا رانی تم ہم کا نا ہیں چینہیں"۔ میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اُس سے کہا۔ جو اُس کی اور میری مادری زبان تھی۔ "ملو کشوری" اس نے مطلق کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ "نمستے" "اُس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا"۔ "یہ میرے پتی ہیں"۔ کھیم نے اُس سے سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ "نمستے بھائی صاحب۔ میں نے بیحد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں نمستے نہیں کہنا چاہیے" کھیم نے بڑی طنز سے کہا۔ تقسیم۔ مشترکہ تہذیب کی تقسیم کا المیہ۔ اس المیے کے جیتے جاگتے پیکر ہیں۔ جلاوطن۔ ڈاکٹر اقبال رائے قلندر اقبال بخت سکینہ اور وہ بے شمار لڑکیاں۔ تنویر کاظمہ سلمیٰ مرزا، کشوری، ثریا حسین .....

اس تغیر کے باعث دونوں ملکوں میں نو امیر طبقے کی غالب حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور ایک ایسا مفاد پرست طبقہ مضبوط ہو گیا ہے جس کے خلاف مسلمان بھائی بغاوت کر رہے ہیں اور جمشید بھائی جسے مستحکم کر رہے ہیں "پت جھڑ کی آواز" کے افسانوں میں مشترک کلچر کے انتشار کے ساتھ ساتھ جس نو دولتیے کلچر کی پرورش ہو رہی ہے اس کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ سماج کی باگ ڈور اس نو امیر طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ طبقہ کلچر کا بھی سرپرست ہے۔ یہ کلچر ہے لذت پرست جسم، اندھی جبلت اور جنس کی تعیش پرست تسکین کا۔ اس میں شہرت، رتبہ، گلیمر اور دولت کا بول بالا ہے۔ لیکن ایک

رو دوسرے کلچر کی بھی ہے۔ عام لوگوں کے کلچر کی۔ شہری اور مغرب زدہ زندگی کی تزک بھڑک، منافقت اور دولت پرستی سے الگ جس کی دھارا بہتی ہے۔ جس میں اب بھی اقدار، اخلاق، مروت، روا داری، ہمدردی، رفاقت، روایت سادگی، خوش خلقی، شائستگی موجود ہے۔ ان دو کلچرل دھاراؤں کا تصادم تقسیم سے پہلے" ڈالن والا، اور تقسیم کے بعد" ہاؤسنگ سوسائٹی، میں ملتا ہے۔ اس تصادم کی شدید اور تیز رو کیفیت ملتی ہے" ایک مکالمہ میں۔ نو امیر کلچر کے ارتقا رکا عمل" پت جھڑ کی آواز" کے افسانوں میں یوں دیکھا جا سکتا ہے۔

"ڈالن والا" میں

"جب سے پڑوس میں مسز جوگ مایا چڑجی کلکتے سے آکر رہی تھیں اس محلے کے باسیوں کو بڑا سخت احساس ہوا تھا کہ اُن کی زندگیوں میں کلچر کی بہت کمی ہے۔ موسیقی کی حد تک ان سب کے گول کمروں میں ایک گراموفون رکھا تھا (ابھی ریڈیو عام نہیں ہوئے تھے۔ فریجڈیر Status Symbol نہیں بنا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اور سماجی رتبے کی علامات ابھی صرف کوٹھی کار اور بیرے پر مشتمل تھیں۔"

"ایک مکالمہ" میں ـــ ینگ جمی کے کردار میں۔

"سول سروس، آکسفورڈ (انڈر کولمبو پلان) ایک سال امریکہ (فل برائیٹ) اسپورٹس، ٹینس، مشغلے، سمفنی کے ایل پی ریکارڈ جمع کرنا"

اور آخر میں ' ہاؤسنگ سوسائٹی' میں نو امیر طبقے کا نمائندہ جمشید بھائی خود اس کلچر کا پردہ فاش کرتے ہوئے سلمیٰ مرزا کو اپنے خط میں لکھتا ہے

"آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا دُنیا بڑی ذلیل جگہ ہے۔ میں بھی دنیا کا ایک فرد ہوں۔ آپ کے بھائی نے دنیا سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس کی سزا بھگت رہا ہے مجھے یقین ہے اور امید ہے کہ بہت جلد اُسے معلوم ہو جائے گا یا شاید معلوم ہو چکا ہو کہ اُس کے تجزیے اُس کی انتہا پسندی اور آئیڈیلزم قطعاً غلط ہے۔ آپ نے اپنے حالات اور اپنی مجبوریوں کے تحت میرے ذریعے دنیا سے ایک حد تک سمجھوتہ کر لیا ہے جس طرح ثریا نے میرے ذریعے دُنیا سے

سمجھوتہ کرکے سورج کے نیچے اپنی جگہ بنالی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قطعی فیصلہ کرنے سے قبل اُسے شدید ذہنی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مگر اُسے معلوم ہوچکا ہے اور آپ بھی دیکھ چکی ہیں کہ آج کی دُنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکٹ ہے جس میں ذہنوں، دماغوں، دلوں اور روحوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فن کار، دانشور، عینیت پسند اور خدا پرست میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں۔ میں خود اکثر اُن کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔

میں یہ سب باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر بڑی ہو جائیں اور زندگی کی طرف سے کسی قسم کے مزید الوژن اور خوش فہمیاں آپ کے دل میں باقی نہ رہیں۔ ورنہ آپ کو مرتے دم تک مزید صدمے اُٹھانے پڑیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی سے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیں اور زندگی کے مکر و فریب اور ریاکاری اور کمینے پن کا انہی ہتھیاروں سے مقابلہ کریں۔ دُنیا میں زیادہ تر انسان جنگل کے درندے ہیں اور ہمیں جنگل کے قانون کا ساتھ دینا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ موجودہ مُلازمت سے کس قدر دہشت زدہ تھیں ... میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی کی دہشت پر جلد از جلد قابو پالیں۔"

اس طویل اقتباس کے بعد موجودہ سماجی حالات اور کلچرل اقدار کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں یہ ہے دُوسرا المیہ۔

اِن دونوں المیوں کا انجام ایک تیسرے المیے کی صورت میں رُونما ہوتا ہے۔ تنہائی، اجنبی پن، جلاوطنی، علیحدگی Alienation اور دہشت کے المیے پر آج اِن الفاظ کے پردے میں آدرش اور اقدار کے فنا کا ذکر بڑے طمطراق سے کیا جاتا ہے لیکن اِن سب کیفیتوں کی تان ٹوٹتی ہے جنسی تسکین پر۔ لیکن "پت جھڑ کی آواز" کے افسانے جسمانی جنس سے پرے اِن کیفیات کو انسانی رُوح کی پنہائیوں اور دِل کے تاریک نہاں خانوں اور ذہن کی تہوں میں محسوس کرتے ہیں اور انہیں اپنے ماحول اور اپنی فضا سے ہم آہنگ کرکے تخلیقی طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ اپنے اِردگرد کے ماحول سے ٹوٹ کر گر جانا، اپنی آرزوؤں کو پامال ہوتے دیکھنا اور اپنے تصورات اور خوابوں اور آدرشوں کی دُنیا سے الگ ہوجانا۔ اپنے وطن سے جلاوطن ہوجانا جس تنہائی اور دہشت کے احساس کو جنم دیتا ہے قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں اس کی المناک روداد ملتی ہے۔ "ڈالن والا" میں ڈاکٹر اصدلیقی کہتی ہیں

"خدا نہ کرے تم پر کبھی ایسی قیامت گذرے۔ خدا نہ کرے کہ تمہیں کبھی تن تنہا اپنی تنہائی کا مقابلہ کرنا پڑے۔"

ہاؤسنگ سوسائٹی میں ـ جمشید، سلمیٰ عذرا اور ثریا حسین۔

"شکستہ جاموں، بکھری ہوئی بوتلوں، فرش پر بہتی ہوئی شراب اور ٹوٹی ہوئی تپائیوں کے انبار پر اس طرح سر جُھکائے بیٹھے رہے جیسے دُنیا کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ وہ جلے ہوئے کرۂ زمین کے آخری جاندار ہیں۔"

اور "جلاوطن" میں کنول کماری کی تنہائی آخری نقطے تک پہنچ چکی ہے۔

"باہر اندھیرا تھا اور سردی اور بے کراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں" ..... لیکن سردی بڑھتی گئی اور بیکراں تنہائی اور زندگی کے ازلی و ابدی پچھتاوا کا ویرانہ۔ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہوسکتی ہے اُس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اُسے بھی اتنا عرصہ ہوگیا ہے کہ اب میں اپنے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"پت جھڑ کی آواز" کی تنویر فاطمہ، زندگی کی مسرتوں کو حاصل کرنے کے بعد۔

"اندھیری راتوں میں کہیں آنکھیں کھولے چُپ چاپ پڑی رہتی ہوں۔ سائنس نے مجھے عالم موجودات کے بہت سے رازوں سے واقف کردیا ہے۔ میں نے کیمسٹری پر اَن گنت کتابیں پڑھی ہیں۔ پہروں سوچا ہے۔ پر مجھے ڈر لگتا ہے۔ اندھیری راتوں میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

قرۃ العین حیدر نے اِن افسانوں کے ذریعے سے کئی منفرد کرداروں سے روشناس کرایا ہے جو تواریخ کے حادثات کا شکار ہوگئے اور کچھ ایسے جو تاریخ کے دھارے کو موڑنے میں مصروف ہیں۔ سائمن، فقیرا، ڈائینا روز کارمن، کنول کماری کستوری، تنویر فاطمہ، آفتاب رائے، اقبال بخت سکینہ، مس سلمیٰ مرزا، جمشید، ثریا حسین، گرلیس اور سلمان بھائی ....

حالات و واقعات کے تصادم اور کرداروں کے موازنے سے جو تصویریں قرۃ العین حیدر نے اس مجموعے میں پیش کی ہیں وہ ہئیت اور تکنیک ہی میں ہی نہیں معنویت اور ذہنی رویے میں بھی خوشگوار تجربے ہیں۔ انہوں نے واقعات

اور حادثات کے نفسیاتی میلانات اور ردِ عمل کی اس پھیلی ہوئی دُنیا کی وسعت سے جو تفصیلات منتخب کی ہیں اور ماحول ، فضا اور کردار نگاری کی جن جزئیات اور باریکیوں کو انہوں نے پیش کیا ہے وہ اُردو ادب میں بے مثال ہیں۔ اس بکھری ہوئی پُر انتشار دُنیا کے حالات کو ایک مرکزی خیال کی وحدت کے تحت پُر اثر اسلوب سے پیش کرنا اُن کے حُسن کا کمال ہے۔ Tonal Unity کو پیدا کرنے اور افسانے کے اختتام تک قائم رکھنے میں انہوں نے بڑی چابک دستی سے کام لیا ہے۔ طوالت کے باوجود اُن میں اُکتا دینے والی کیفیت نہیں۔ اس کا باعث یہی ہے کہ فن کار کا تجربہ مستند اور اہم ہے اور اس تجربے کو پیش کرنے میں انہوں نے فنی نفاست کا خیال رکھا ہے۔ اِن افسانوں کی دُنیا اس معنی میں حقیقی نہیں کہ وہ زیادہ ٹھوس ہے بلکہ اس معنی میں کہ وہ حقیقی دُنیا سے زیادہ سچّی ہے۔ اس لغو دُنیا میں اُنہوں نے معنی تلاش کئے ہیں جس کی مثال ہے "ایک مکالمہ"، جو عصرِ حاضر پر ایک جاندار اور تیز طنز ہے۔

اِن افسانوں میں پلاٹ، وقت اور مقام کی حدوں سے پرے نفسیاتی عوامل اور وقت سے نمو پاتا ہے اس لئے بیشتر افسانوں میں شعور کے بہاؤ کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں خود کلامی بھی ہے، ماضی کی یاد بھی ہے اور احساساتی اور حسیاتی تاثر بھی۔ وقت کا یہی تصور اُن کے بیشتر افسانوں میں موجود ہے، جو برگساں اور مارسل پروست کی یاد دلاتا ہے۔

ہم سب اپنے ماحول، اپنے ماضی، اپنے تہذیبی ورثے اور یادوں اور قومی شعور کے پالے ہوئے ہیں۔ ہمارا کردار اور ہماری شخصیت ایک منجمد جامد ٹھہرا ہوا نقطہ یا لمحہ نہیں بلکہ مسلسل بہتی ہوئی دھارا ہے۔ اس لئے ہم ازلی ہیں اور ابدی ہیں۔ ڈستی ہوئی یادوں، نا آسودہ حسرتوں، ناکام تمناؤں شکستہ آرزوؤں اور پامال اُمیدوں کے مرگھٹ، شعور اور لاشعور کے راستے ذاتی محرومیوں اور اجتماعی شکست و ریخت کے مرقد۔ آگ کا دریا ہے گذرتے ہوئے آنسوؤں کی وادی میں اُترتے ہوئے — "ہم —" پت جھڑ کی آواز۔

لیکن تنہائی اور دہشت اور جلاوطنی کی اس وادی سے سرخرو گذر جانے کی اب بھی امید ہے۔

"ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انہوں نے سوچا۔ لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔ اور ہمارے چاروں طرف لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم۔ یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ لیکن دیکھو۔ یہ راستے، یہ جھیلیں۔ یہ باغات ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آگئی لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو ہمارے پاس یقین ہے۔ اور کامل اعتماد ہے۔ اسے محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے . . .



صدرِ جمہوریہ ہند قرۃ العین حیدر کو ساہتیہ اکادمی انعام دے رہے ہیں۔

میرا نے عہد نامے منسوخ ہوئے . . . کشوری نے آہستہ سے دُہرایا۔ ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو مرنے نہیں دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہوگی۔ آج کی صبح ہے مستقبل ہے۔ ساری دُنیا کی تخلیق ہے لیکن کنول کماری تم اب بھی رو رہی ہو —"

اور شاید قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی کنول کماری ابد تک روتی رہے گی کیوں کہ "کتنی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور رہ جانے پر مجبور ہیں"۔

بقیہ : کٹڑیا

کوشلیا بڑھ کر دوا کی شیشی اُٹھا لائی۔

"اب چلتی ہو کہ نہیں —"، بھائی۔ پریشان ہو کر بولا۔

"آپ لوگ جائیے —" وہ ماں جی کی طرف پیالہ بڑھا کر بولی: "میرا سامان اُوپر بھجوا دیں، میں کہیں نہیں جا رہی"۔

برما کی انقلابی کونسل کے چیرمین جنرل نے ون اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ہندوستان کے خیرسگالی کے دورے پر ۱۵ مارچ ۱۹۶۸ء کو نئی دہلی تشریف لائے جنرل نے ون نے ایک ہفتہ تک ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ اُن کے اس دورے سے ہندوستان اور برما کے درمیان دوستی اوراخوت کے رشتے مزید استوار ہوجائیں گے۔

ہوائی اڈے پر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین، نائب صدر وی وی گری اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اُن کا شاندار خیر مقدم کیا۔



(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر ذاکر حسین، جنرل نے ون، شری وی وی گری، شریمتی اندرا گاندھی، شریمتی نے ون، شری کے سی پنت

****

****



۲ مارچ ۱۹۶۸ء کو دہلی کے مشہور رہنما لالہ شام ناتھ کا بمبئی کے ایک ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔

آپ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم اے اور لا فیکلٹی سے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ جنگ آزادی میں حصہ لینے لگے تھے اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں جیل گئے۔ ۱۹۴۱ء میں وہ دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر اور ۱۹۵۱ء میں اس کے صدر چنے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ دہلی کے میئر بنائے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور کچھ عرصہ وزارتِ اطلاعات و نشریات اور بعد ازاں ریلوے کے نائب وزیر ہوئے۔ آپ کی موت ایک قومی حادثہ ہے۔

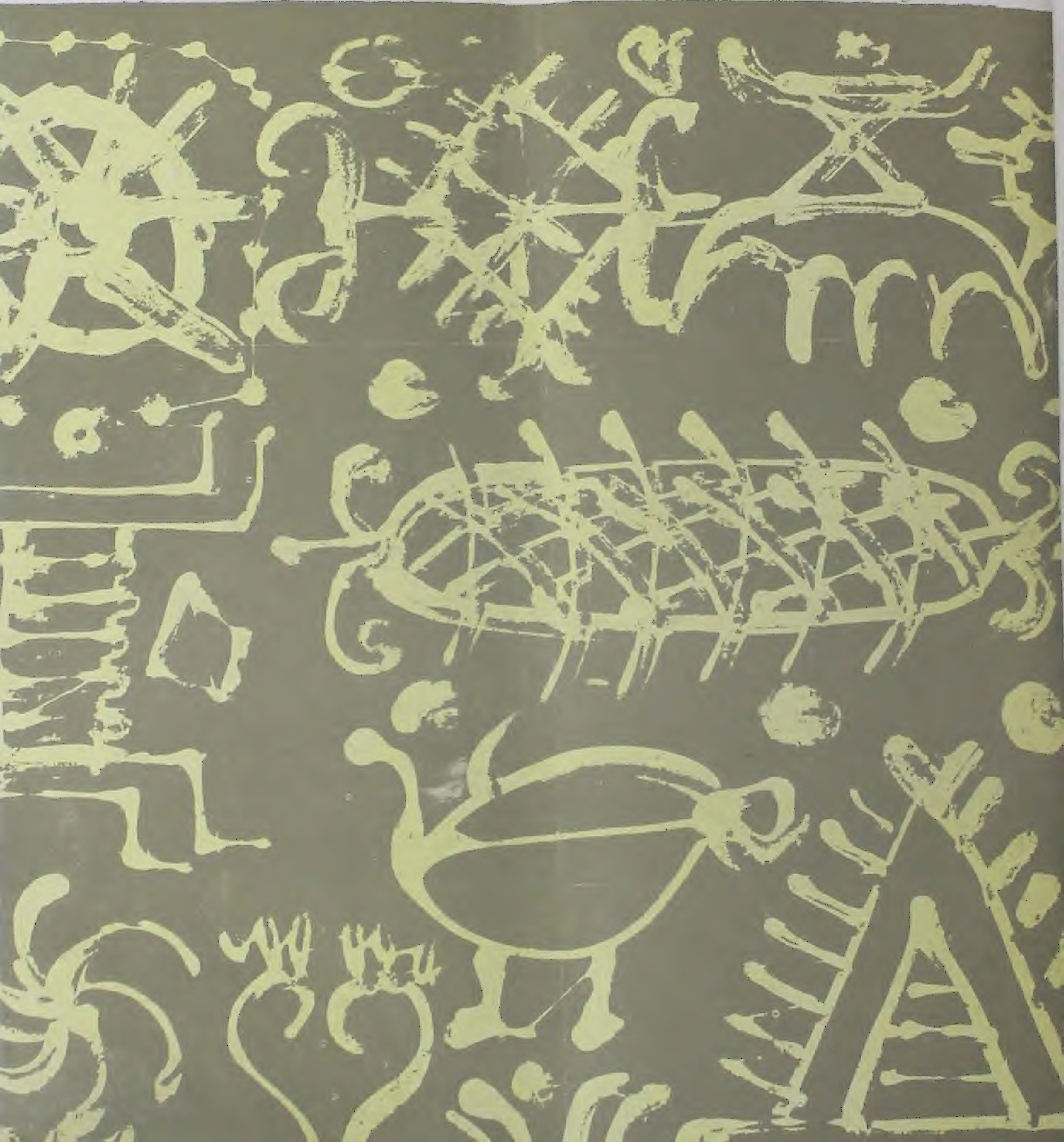


Vol. 26 No. 9 AJKAL (Urdu) April 1968
Old Secretariat, Delhi-6.
Edited and Published by the Director, Publications Division, Delhi.
Printed by the Asian Art Printers Private Ltd New Delhi.

آجکل

مئی ۱۹۶۸ء
بیاکھ جیٹھ شک سمت ۱۸۹۰

۶۰ پیسے





ہندوستانی ہوائی فوج کی ۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہوائی فوج کے مختلف مظاہروں کا معائنہ کیا۔ آپ کے ساتھ (دائیں طرف) چیف آف ایر اسٹاف مارشل ارجن سنگھ ہیں۔

آج سے ۲۵ سال قبل جب انڈین ایئر فورس وجود میں آئی تھی تو اس میں صرف دو افسر اور ۱۹ ہوا باز تھے۔ انڈین ایر فورس انڈیا سینڈہرسٹ کمیٹی کی سفارشات کے نتیجہ میں یکم اپریل ۱۹۳۳ء کو قائم کی گئی تھی۔ یہ کمیٹی ہندوستانی رہنماؤں کے پرزور مطالبے پر بنائی گئی تھی۔ کہ ہندوستانیوں کو بھی ہوائی فوج میں کمیشن حاصل کرنے کا مستحق سمجھا جائے اور ہندوستانی ہوائی فوج قائم کی جائے جسے چلانے کا کام ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں ہو۔

دوسری عالمگیر جنگ چھڑنے کے وقت ہوائی فوج میں ۱۶ افسر اور ۲۶۹ ہوا باز تھے۔ اسی جنگ کے زمانے میں ہوائی فوج کی کافی توسیع کی گئی۔ اور ۱۹۴۳ء تک اس کے نو اسکواڈرن قائم ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ملک کی دفاعی ضروریات کے پیش نظر ہوائی فوج میں توسیع ہوتی گئی۔ اور اس وقت ہماری ہوائی فوج مضبوط کارکردہ اور بڑی موثر ہے جس نے مختلف نازک موقعوں پر ملک کی بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔

اُردو کا مقبول عوام ماہنامہ

آجکل

دہلی

مئی ۱۹۶۸ء

بساکھ۔ جیٹھ ۱۸۹۰

جلد ۲۶ شمارہ نمبر ۱۰

ترتیب

ایڈیٹر

شہباز حسین

سرورق: عملی: جیون اڈلجہ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اُردو) اولڈ سیکریٹریٹ دہلی-۶

	فی پرچہ	ایک سال	دو سال	تین سال
ہندوستان	۶۰ پیسے	۷ روپے	۱۲ روپے	۱۷ روپے
پاکستان	۶۰ پیسے (پاک)	۷ روپے (پاک)	۱۲ روپے (پاک)	۱۷ روپے (پاک)
دیگر ممالک	۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ	۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر	۱۸ شلنگ ۲،۷۵ ڈالر	۲۵ شلنگ ۶ پنس ۳،۵۰ ڈالر

مُرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات اولڈ سیکریٹریٹ دہلی-۶

نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر

اُردو گھر

کی تعمیر



وزیرِاعظم "اُردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھ رہی ہیں۔

۲۲ مارچ ۱۹۶۸ء کو وزیرِاعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی کے مبارک ہاتھوں سے "اُردو گھر" کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ راؤز ایونیو نئی دہلی میں بننے والی یہ عمارت انجمن ترقی ہند کا مرکزی دفتر ہوگی۔

حکومتِ ہند نے یہ زمین رعایتی شرح پر انجمن ترقی اُردو کو فراہم کی ہے۔ عمارت کے اخراجات کا تخمینہ ۲ ۱/ لاکھ روپے ہے۔ جو حکومتِ ہند اور اردو دوستوں کی امداد سے فراہم کیا جائے گا۔

انجمن کی داغ بیل ۱۹۰۳ء میں دہلی میں پڑی۔ پھر انجمن کا دفتر اورنگ آباد منتقل ہوا اور ۱۹۳۸ء میں دہلی میں آیا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد انجمن کا صدر دفتر علی گڑھ منتقل ہوا، اور اب اس عمارت کی تعمیر کے بعد انجمن پھر اپنے گھر لوٹ آئے گی، جہاں اُس کی ایک ننھی سی کٹیا بن رہی ہے۔ جسے دُنیا "اُردو گھر" کے نام سے پکارے گی۔

انجمن کا ماضی اور حال مسلسل جدوجہد کی ایک طویل داستان ہے۔ اس ادارے کے قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ملک کی مقبول عام زبان اُردو کو ترقی دی جائے، اور اُسے عالمی معیاروں تک لے جایا جائے۔

اس انجمن کے سب سے پہلے صدر مشہور مغربی عالم مسٹر آرنلڈ تھے اور سیکریٹری علامہ شبلی۔ مسٹر آرنلڈ کے بعد نواب محسن الملک صاحبزادہ آفتاب احمد، نواب الملک، سر راس مسعود، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالمجید خواجہ، کرنل بشیر حسین زیدی ایسی ہستیاں انجمن کی صدر رہیں۔ آج کل پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اس کے صدر ہیں۔



ہردے ناتھ کنزرو صدر انجمن ترقی اُردو ہند

علامہ شبلی کے بعد مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی، عزیز مرزا، مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار اس کے سیکریٹری رہے۔ آجکل پروفیسر آل احمد سرور سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

انجمن کی ترقی میں ملک کی مقتدر ہستیوں نے حصہ لیا ہے۔ اس



کے ارکین اور ہمدردوں میں مولوی ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، حکیم اجمل خاں، ظفر علی خاں، پنڈت کشن پرشاد کول، اور منشی پریم چند ایسے متعدد نامی گرامی بزرگ شامل ہیں۔

انجمن ترقی اُردو ہمیشہ ہر طبقے میں مقبول اور ہر دلعزیز رہی ہے۔ ابتدا میں جن احباب نے پانچ ہزار سے پانچ روپے تک یکمشت چندہ دیا تھا اُن ۸۶ حضرات میں سے ۷ انگریز اور ۲۲ ہندو تھے۔ ان میں سر فہرست راجہ امانت راؤ مہابلونت، جاگیردار دوم کنڈہ کا نام نامی ہے۔ انجمن کا سب سے پہلا انعام بھی ایک ہندو ادیب منشی نرائن پرشاد ورما کو 'پیغمبران ہند' نامی کتاب پر دیا گیا تھا۔

انجمن نے اُردو ادب کے سرمائے میں اضافہ و فروغ میں غیر معمولی سرگرمیاں دکھائی ہیں، اور اُسے زمانہ قدیم و حال کے علمی خزانوں سے مالا مال کیا ہے۔ اس نے تصانیف، تالیفات، اور تراجم کی صورت میں دُنیا کے کلاسیکی ادب کے مشہور شاہکار، مشرقی اور مغربی زبانوں کی مشہور کتابیں اور جدید و قدیم علوم و فنون کا قابل قدر ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ آج تک یہ ادارہ لگ بھگ ۲۰۰ کتابیں شائع کر چکا ہے اور بہت سے مسودے اشاعت کے لئے پڑے ہوئے ہیں۔ اب تک شائع کی گئی کتابوں میں انگریزی اُردو ڈکشنری، اُردو ہندی لغت، اصطلاحات


ڈاکٹر عبدالحق



پیشہ وراں، اُردو صرف و نحو دیوانِ غالب از عرشی، اور ریاست (ترجمہ افلاطون) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۲۱ء میں انجمن نے ایک سہ ماہی رسالے 'اُردو' کا اجرا کیا تھا۔ جو ۱۹۵۰ سے اُردو ادب کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہفت روزہ اخبار 'ہماری زبان' بھی شائع ہو رہا ہے کچھ عرصہ بیشتر انجمن نے ایک سہ ماہی رسالہ 'سائنس' بھی نکالا تھا۔ مگر مالی دُشواریوں اور ناقدری کی وجہ سے اُسے بند کرنا پڑا۔

انجمن کا ایک اپنا کتب خانہ بھی ہے جو اپنے مخطوطات اور بعض نوادر کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ انجمن کا ایک شعبہ لغت بھی ہے، جو اب تک ۹۵ ہزار الفاظ کے کارڈ بنا چکا ہے اس کا کام سرمائے کی کمی کی وجہ سے فی الحال رُکا ہوا ہے۔

اس وقت انجمن اُردو کے لئے گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ اور اس کا تنظیمی نظام ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ انجمن کی عمارت 'اُردو گھر' بن جانے سے اسکی سرگرمیوں میں کافی اضافہ ہوگا اور اُردو کی ترقی اور فروغ میں وہ زیادہ موثر اور کارآمد ثابت ہوگی۔


انجمن ترقی اردو ہند کے موجودہ جنرل سیکریٹری پروفیسر آل احمد سرور



غزلیں

(۱)

یہ ایک مشتِ خاک کہ دُنیا کہیں جسے
ہے آب و گِل کا کھیل تماشا کہیں جسے

زخموں کا اک ہجوم ہے گُلشن ہے جس کا نام
ذرّوں کا اژدہام ہے صحرا کہیں جسے

تقدیرِ صبح و شام کی اک ٹھنڈی سانس ہے
گُلشن میں بادِ سرد کا جھونکا کہیں جسے

ہیں خونِ آفتاب کے دھبّے شفق نہیں
ناسور ہے زمین کا دریا کہیں جسے

یہ جلوہ کیا ہے دے نگہِ شوق کیا جواب
وہ بھی تو چُپ ہے دیدۂ بینا کہیں جسے

گل اور شرارِ خاک کے دو بھیس ہیں جمیل
وہ بھیس ارتقار کا کرشما کہیں جسے

جمیل مظہری

(۲)

سائل کی خامشی کہ تقاضا کہیں جسے
منعم کا وہ سکوت کہ غصا کہیں جسے

حالات تیشہ زن ہوں تو آہن سے کم نہیں
شاعر کا دل کہ آپ بھی شیشا کہیں جسے

قدرت خدا کی اس میں تصور بہشت کا
زاہد کا یہ دماغ کہ صحرا کہیں جسے

اِک مدھ بھری نگاہ نے بخشی ہے ذہن کو
وہ کیفیت کہ نشۂ صہبا کہیں جسے

اک آئینہ کہ حُسنِ خود آرا کے روبرو
اور اک وہ بدنصیب کہ شانا کہیں جسے

جو ذہن جام بن کے قریب آیا بھر گیا
ایسا بھی اک دماغ ہے مینا کہیں جسے

ہنگامۂ بہار یہ اک طنز ہے جمیل
عارف سکوتِ منظرِ صحرا کہیں جسے

جگن ناتھ آزاد

"مجھے آج تک یاد ہے وہ زمانہ"

(۱)

میرے کمرے میں ہندوستان اور پاکستان کا ایک مشترکہ نقشہ آویزاں ہے۔ میری نظریں اکثر غیر ارادی طور پر اس نقشے کی طرف اُٹھ جاتی ہیں اور دریائے سندھ کے اُس پار ایک ایسے مقام کی تلاش میں کھو جاتی ہیں جس کا اس نقشے میں کوئی ذکر نہیں۔ میری نگاہیں اپنی اس جستجو میں اس نقشے پر کئی شہروں سے گزر جاتی ہیں لیکن جس مقام کی انھیں تلاش ہوتی ہے وہ اس نقشے پر نہیں نظر نہیں آتا۔ یہ نقشہ چھوٹے بڑے ہزاروں شہروں پر مشتمل ہے، لیکن وہ شہر غالباً اتنا چھوٹا ہے کہ اس نقشے پر آنے کا حق دار ہی نہیں۔

میں اپنے تصور میں دریائے سندھ کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیتا ہوں اور کالا باغ اور بنوں ایسے پُر فضا مقامات سے بے نیاز گزرتا ہوا ایک چھوٹے سے قصبے میں جا پہنچتا ہوں جس کی فضائیں میرے بچپن کے لئے آغوشِ مادر ہیں اور جس کی ہوائیں گہوارہ۔ یہ شہر ہے عیسیٰ خیل۔ اسی عیسیٰ خیل میں میں نے ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کی صبح کو آنکھ کھولی۔ چار پانچ سال کی عمر میں یہ شہر مجھ سے چھٹ گیا۔ لیکن اس وقت کے نقوش یادوں کے شبستاں میں اس طرح جگمگا رہے ہیں گویا ابھی کل ہی کی بات ہے۔

عیسیٰ خیل، اس زمانے میں اگرچہ تحصیل کا صدر مقام تھا لیکن تھا بہت ہی چھوٹا سا شہر۔ آخری بار میں نے اس شہر کو ۱۹۳۲ء میں دیکھا۔ اُس وقت تک اس کے طول و عرض میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ اب پاکستان بننے کے بعد ممکن ہے اس کا شمار بھی بڑے شہروں میں ہونے لگا ہو۔ لیکن یہ شہر چھوٹا ہو یا بڑا میرا وطنِ مالوف ہے اور میری نظر میں اس کی اہمیت کسی بھی بڑے شہر سے کم نہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ پاکستان جانے کے مواقع مجھے متعدد بار ملے ہیں لیکن اس شہر کو ایک بار چھوڑنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔

ایسے ہے وطن کی اب تمنا دل میں
جیسے کوئی چبھتا ہوا کانٹا دل میں
کل تک جو مری نظر میں لہراتے تھے
اب ہیں وہ تمام شہر و صحرا دل میں

یہاں والد محترم اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے میری تعلیم کی ابتدا گھر ہی پر کی۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے گتے کے متعدد ٹکڑوں پر "ا" "ب" لکھ کر مجھے دیئے اور انہیں کی مدد سے مجھے ابجد سے آشنا کیا۔

اس منزل سے آگے گذرا تو ایک دن والد نے دیوانِ غالب کھول کر میرے سامنے رکھا اور ایک خاص غزل پڑھنے کو کہا۔ میں نے وہ غزل پڑھی۔ والد کہنے لگے اب تم امتحان میں پاس ہو۔ میں نہ سمجھا کہ اُن کا مطلب کیا ہے۔ ہاں یہ واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہا اور جب کئی سال بعد میں نے پوچھا کہ اس امتحان کی نوعیت کیا تھی تو انہوں نے بتایا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا تم موزوں شعر پڑھ سکتے ہو یا نہیں۔ وہ غزل یہ تھی۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

پانچ برس کا تھا کہ والد کا تبادلہ عیسیٰ خیل سے کلور کوٹ کے اسکول

میں ہوگیا۔ جیسے خیال ہے کلورکوٹ جانے کے لئے کالا باغ کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

کالاباغ ایک بڑا ہی پرفضا مقام ہے۔ دریا کے کنارے آباد ہے۔ نمک کے پہاڑوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے۔ اُن پہاڑوں پر خوبصورت مکان بنے ہوئے ہیں۔

اس وقت تک ابھی یہاں دریا پر پل نہیں بنا تھا۔ چھوٹی بڑی کشتیاں یا اسٹیمر ہی آمدورفت کے ذرائع تھے۔ ہمارا اسٹیمر روانہ ہوا ہی تھا کہ پہاڑوں پر بنے ہوئے مکان دیکھ کر والد نے ایک مصرعہ پڑھا۔

"پہاڑوں کے اُوپر بنے ہیں مکان"

اور مجھ سے دوسرا مصرعہ لگانے کو کہا میں نے فوراً کہا۔

"عجب اُن کی صورت عجب اُن کی شان"

والد نے کہا "صورت" نہیں "شوکت" کہو۔ میں اس وقت تو "صورت" اور "شوکت" کا فرق نہ سمجھ سکا۔ لیکن مدت بعد جب دونوں لفظوں کا فرق مجھ پر ظاہر ہوا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ شعر میں رہنمائی اور مشورے کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔

کلورکوٹ میں باقاعدہ طور پر اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ اس زمانے کی اور تو کوئی بات مجھے تفصیل سے یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ہر ہفتے اسکول میں ایک ادبی جلسہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس میں طلبا، زبانی یاد کی ہوئی اُردو اور انگریزی نظمیں سناتے تھے۔ تقریریں بھی ہوتی تھیں اور کبھی کبھار ڈرامہ بھی ہوجاتا تھا۔ میں ان پروگراموں میں اکثر حصہ لیتا تھا اور اس طرح سے اُردو اور انگریزی کی متعدد نظمیں مجھے زبانی یاد ہوگئی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے کہ والد کبھی کبھار رات کو سونے سے قبل مجھے کوئی مصرع دے دیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے اس پر مصرع لگاؤ۔ اُس وقت کے بہت سے زیادہ مصرعے تو مجھے یاد نہیں دو ایک حافظے میں ہیں۔ مثلاً رات کے دس بجے کے قریب ایک ریل گاڑی کلورکوٹ سے بھکر نامی ایک شہر کو جایا کرتی تھی۔ اس کی سیٹی کی آواز رات کے سناٹے میں دُور دُور تک گونجتی تھی۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ اُس نے سیٹی دی تو ایک مدرس نے کہا۔

"بھکر کو جانے والی اس وقت جارہی ہے"

میں نے اس پر مصرع لگایا۔

"سیٹی بجا بجا کر ہم کو بُلا رہی ہے"

والد نے یہ سنا تو اُس سے مخاطب ہو کر بولے ایسے ٹھس مصرعوں سے اسے آشنا نہ کیجئے۔ مصرع آسان دیجئے لیکن مصرع ہو بہو سا نہ ہو۔ یہ تو مصرع کو مثال سمجھ کے مصرع لگائے گا۔ مثلاً میں نے اسے مصرع دیا۔

"آگئی ٹھنڈی ہوا برسات کی"

تو اس نے کہا۔ ع

"چھاگئی کالی گھٹا برسات کی"

اور آپ نے سپاٹ مصرع دے دیا تو ویسا ہی سپاٹ ردعمل اس پر ہوا۔ یہ بچہ ہے۔ اس کی جیسی ذہنی تربیت ہوگی۔ یہ ویسا ہی بنے گا۔ اسے میں شعر کہنا نہیں سکھانا چاہتا بلکہ شعر کی فضا سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔

میں آٹھ برس کا تھا کہ ضلع کے صدر مقام میانوالی میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ معلوم نہیں جلسہ کس سلسلہ میں تھا مجھے اتنا یاد ہے کہ ولسن صاحب نامی ایک انگریز اس جلسہ کے صدر تھے۔ میں نے اس جلسہ میں چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم "جوگی" اوّل سے آخر تک زبانی سنائی۔ انگریز صدر کی تھپکی مجھے ابھی تک یاد ہے اور انعام میں لیا ہوا ایک روپیہ بھی۔

اس سے ایک برس بعد میری زندگی ایک نئے اور عجیب وغریب ادبی تجربے سے دوچار ہوئی۔ والد نے مجھ سے کہا کہ چلو تمہیں بھیرے لے چلیں۔ ایک مشاعرے میں۔ "مشاعرہ" — یہ میرے لئے ایک نیا لفظ تھا۔ میں نے اس کے معنی پوچھے۔ والد نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ لیکن اس وضاحت کے باوجود مشاعرے کا مفہوم میری سمجھ میں نہ آسکا۔

خیر مقررہ تاریخ کو میں والد کے ہمراہ روانہ ہوا۔ راستے میں غالباً کندیاں نامی ایک اسٹیشن پر ریل تبدیل کرنا تھی۔ وہاں بھیرے کی ریل کے انتظار میں ہمیں کافی دیر رکنا پڑا۔ اس لئے کہ ایک ٹرین لاہور سے آتی تھی اور اس کے بعد بھیرے کی ٹرین روانہ ہوتی تھی۔ لاہور کی ٹرین آئی تو ایک صاحب انگریزی وضع کے کوٹ اور قمیص شلوار میں ملبوس ٹائی لگائے ہوئے اس میں سے اُترے اور بڑے تپاک سے والد کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ یہ صاحب سیکنڈ کلاس میں سے اُترے تھے ہم لوگ انٹر میں سفر کر رہے تھے۔ اُس وقت تک میرا خیال یہ تھا کہ سیکنڈ کلاس میں صرف اسکولوں کے انسپکٹر ہی سفر کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر میں پتہ چلا کہ یہ صاحب اسکولوں کے

انسپکٹر نہیں ہیں بلکہ شاعر ہیں اور اُن کا نام ہے حفیظ جالندھری۔ یہ نام بھی میرے لئے نیا تھا۔ بلکہ میں تو اس وقت تک کسی بھی شاعر کے نام سے آشنا نہ تھا۔ ہاں اپنی درسی کتابوں میں جن شعراء کی نظمیں پڑھ چکا تھا اُن کے ناموں سے واقف تھا جیسے مولانا حالی، مولینا محمد حسین آزاد، مولانا اسمٰعیل میرٹھی، نظیر اکبرآبادی، سورج نرائن مہر، دوارکا پرشاد افق، برج نرائن چکبست اور درگا سہائے سرور اور میں سمجھتا تھا کہ ان اشخاص کے علاوہ دنیا میں اور کوئی شاعر ہے ہی نہیں۔ چناں چہ جب ریل چلنے لگی اور ہم لوگ جاکر اپنے ڈبے میں سوار ہوئے تو پہلا سوال میں نے اپنے والد سے یہ کیا کہ ان کی نظمیں تو "مرقع ادب" میں نہیں ہیں پھر یہ شاعر کیسے ہیں؟ والد نے کہا کہ ابھی اِن کی نظمیں درسی کتب میں شامل نہیں ہوئیں کچھ وقت کے بعد ہو جائیں گی۔

پھر پہنچے تو میرے لئے مشاعرے کے وقت کا انتظار کرنا مشکل ہوگیا۔ میں اس خیال میں تھا کہ وہاں جو نظمیں پڑھی جائیں گی وہ کچھ اس طرح کی ہوں گی جیسے "مرقع ادب" میں شامل ہیں۔ مثلاً۔

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی
اور بوند ابھی نہیں پڑی تھی

سہانا سہانا سحر کا سماں ہے

ضعیفہ پھٹے کپڑے پہنے کھڑی ہے
ضعیفی سے اس کی کمر جھک گئی ہے
ہمراہ اپنے بن کو مجھے ساتھ لے چلو!
رکھا تمہارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو

لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ والد نے جو نظم پڑھی، وہ تو بالکل ہی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حفیظ صاحب کی نظم مقابلۃً آسان تھی لیکن مجھے پتہ نہ چل سکا کہ نظم کس عنوان اور موضوع پر ہے۔ ایک ہی مصرع میری سمجھ میں آرہا تھا "میرا سلام لے جا" ان دو کے علاوہ باقی تمام شعراء تقریباً مقامی تھے اور اُن کا کلام بھی میری سمجھ سے باہر تھا۔

اس مشاعرے کا اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ (غالباً منتظمین میں سے) ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا "تمہیں بھی کوئی نظم یاد ہے۔ میں نے کہا کہ جی ہاں کئی نظمیں یاد ہیں۔ انہوں نے عنوان پوچھے۔ میں نے کہا "جوگی" "ہندو مسلمان" "پہلے کام پیچھے آرام" اور اسی طرح سے دو چار نام اور میں نے اور گنا دئے۔ چناں چہ انہوں نے مجھ سے کہا تم "ہندو مسلمان" سناؤ۔ چنانچہ میں نے والد کی یہ نظم اوّل سے آخر تک زبانی سنا دی اور ایک لُنگی انعام میں پائی۔ یہ انعام پاکر میں پھولا نہ سمایا کیوں کہ اس سے قبل اسکول میں جو انعام میں نے حاصل کئے تھے وہ اس کے مقابلے میں معمولی اور کم پایہ کے تھے اور یہ انعام ایسا تھا کہ جسے دیکھ کر میرے سب ہم جماعت مرعوب ہو سکتے تھے۔

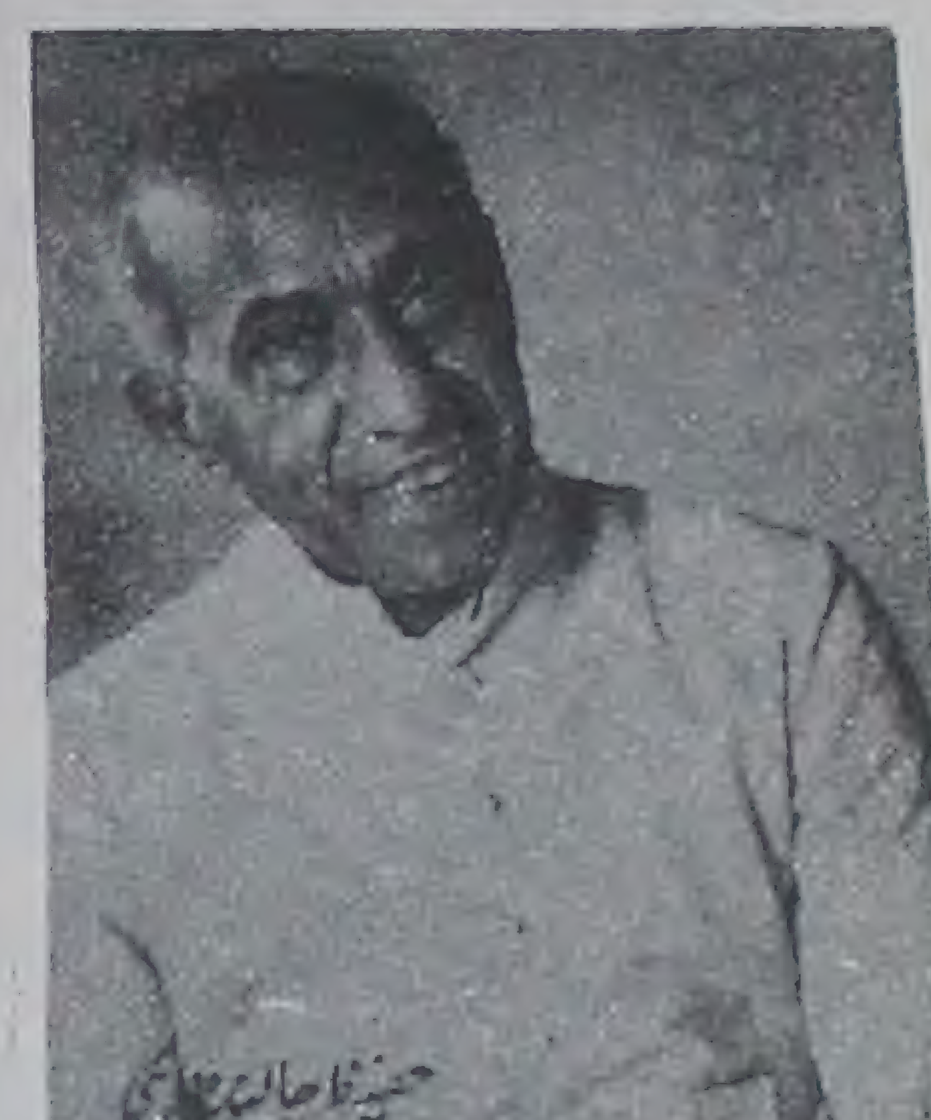
مشاعرے کے بعد ہم جائے قیام پر واپس پہنچے تو والد نے پوچھا کہو مشاعرہ پسند آیا؟ میں نے کہا کہ میری سمجھ میں تو کوئی نظم آئی نہیں کہنے لگے حفیظ صاحب کی نظمیں بھی؟ میں نے کہا وہ بھی سمجھ میں نہیں آئیں چنانچہ دوسرے دن جب والد حفیظ صاحب سے ملنے گئے تو انہوں نے اُن سے کہا کہ جگن کا تو مشاعرے میں آنا ہی بے کار رہا۔ یہ کہتا ہے کہ کوئی نظم میری سمجھ میں آئی ہی نہیں۔ یہ سنتے ہی حفیظ صاحب نے اپنی ایک کتاب نکالی "ہندوستاں ہمارا" اور اس میں سے ایک نظم اپنے خاص انداز میں جو سنائی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے فضا میں چاروں طرف جادو کا عمل ہوگیا ہو۔ نظم کا عنوان تھا "سروپ نکھا کی لچھمن سے ملاقات"۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی آنکھوں سے سروپ نکھا کی ناک کے کٹنے کا نظارہ دیکھ رہا ہوں اور وہ روتی پیٹتی ہوئی اپنے بھائی کے دربار میں پہنچی ہو، اور یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔ میں نے والد سے اصرار کیا کہ یہ کتاب میں ضرور لوں گا۔ چنانچہ حفیظ صاحب نے اسی وقت اس کتاب کی ایک جلد میرے حوالے کی اور میں اُسے اپنی عزیز ترین متاع کی طرح اپنے ساتھ لے آیا۔

یہ کتاب میں نے نہ جانے کتنی بار پڑھی اور کئے برس تک پڑھتا رہا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ آٹھویں جماعت تک مجھے اوّل سے آخر تک یہ کتاب زبانی یاد تھی۔ اس کی ہر نظم، ہر شعر اور ہر مصرع مجھے ازبر تھا چناں چہ آٹھویں کے امتحان میں جب تاریخ کا پرچہ تھا تو میں نے عام سوالات کے جواب نظم میں دیئے اور وہ جواب اسی "ہندوستاں ہمارا" کی منظومات پر مشتمل تھے۔

امتحانات کی تاریخ میں غالباً یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا ہمارے راولپنڈی ڈویژن میں اس کا چرچا ہوا۔ طالب علم کا نام تو کسی کو معلوم نہ تھا رول نمبر تھے۔ لیکن لاہور کے اخبارات میں جب یہ خبر چھپی کہ طالب علم نے تاریخ کے پرچے میں تمام سوالات کے جوابات حفیظ جالندھری کے مجموعۂ نظم "ہندوستان ہمارا" میں سے دیئے ہیں تو میں نے یہ تمام اخبارات سنبھال کر رکھ لئے کہ

اگر ہمارا نام نہیں چھپا تو کیا ہوا ذکر تو ہمارا ہی ہے۔

"ہندوستاں ہمارا" بچوں کی ذہنی تربیت اور اُن کے وجدان میں جلا پیدا کرنے کے لئے ایک عجیب و غریب کتاب ہے۔ یہ موضوع اور اندازِ بیان کے اعتبار سے اُردو کی واحد کتاب ہے۔ آج یہ کتاب ہندوستان میں بھی نایاب ہے اور پاکستان میں بھی۔ پاکستان میں کسی ناشر کو اس کتاب یا اس کے موضوع سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس کتاب کی اشاعت ہمارے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہمارے ملک کے کسی نہ کسی ناشر کو چاہیئے کہ وہ مصنف کی اجازت سے اس کتاب کو یہاں شائع کر دے۔


حفیظ جالندھری

آج مجھے اس کتاب کے اشعار یاد نہیں ہیں۔ مجھے اُسے پڑھے چھتیس برس ہو گئے ہیں لیکن کبھی کبھی سے کوئی نہ کوئی مصرع آج بھی یاد ہے مہاتما بُدھ پر نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

کپل وستو میں اک راجہ سُدھودن راج کرتا تھا
سری ساکی منی گوتم اسی راجہ کا بیٹا تھا
یہ لڑکا ابتدا ہی سے نہایت عقل والا تھا
بہت چپ چاپ رہتا تھا زمانے سے نرالا تھا

ایک اور شعر یاد آ رہا ہے۔

ناصر الدین بڑا نیک تھا شاہِ دہلی
ہر طرح اُس کی حکومت سے رعایا خوش تھی

نورجہاں پر ایک ہی مصرع یاد رہ گیا ہے۔

مٹی میں دفن اک موتی ہے۔

حفیظ صاحب کی شاعری کے ساتھ میرا یہ تعلقِ خاطر آج بھی قائم ہے۔ حفیظ کو میں بقول ڈاکٹر عابد حسین ایک غیر معمولی شاعر سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہند و پاکستان میں حفیظ صاحب کے کلام کو اس توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا گیا جس کا یہ مستحق ہے۔ ہمارے نئے شعراء اور نقادوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو حفیظ کی شاعری کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اُس طبقے سے متعلقہ حضرات محض عدمِ واقفیت کا شکار ہیں۔ بعض حضرات حفیظ کو صرف گیتوں کا شاعر مانتے ہیں۔ میں اُسے بھی تنگ نظری سمجھتا ہوں۔ گیتوں میں تو خیر حفیظ کو ایک مجتہد کا مقام حاصل ہے۔ غزل اور نظم اِن دونوں کی روایات کو حفیظ نے جس خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے اُس کا اعتراف نہ کرنا ایک طرح کی کوتاہ بینی اور کم ظرفی ہے۔

بھیرے کے مشاعرے سے کچھ مدت بعد والد صاحب ملتان کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے جانے لگے تو مجھ سے انہوں نے پوچھا چلو گے؟ میں نے کہا کہ اگر حفیظ صاحب آ رہے ہوں تو ضرور چلوں گا۔ حفیظ صاحب کی مشاعرے میں متوقع شرکت کی اطلاع والد صاحب کو مل چکی تھی۔ چنانچہ حفیظ صاحب کو سُننے کے شوق میں میں ملتان روانہ ہو گیا۔

یہاں بھی مشاعرے کی عام کیفیت تو وہی رہی۔ یعنی میری سمجھ سے بالا لیکن ایک تو میں نے قدرے توجہ سے شعراء کا کلام سُنا اس لئے زیادہ نہیں تو کسی حد تک ضرور محظوظ ہوا۔ دوسرا یہ امید آخر تک رہی کہ "ہندوستاں ہمارا" سُننے کا موقع ملے گا۔ یہ امید اگرچہ پوری نہیں ہوئی لیکن اس امید نے میرے لئے مشاعرے میں ایک دلچسپی پیدا کر دی تھی۔

اسی مشاعرے میں میں نے پہلے پہل پنڈت ہری چند اختر کو دیکھا اور اُن کے کلام کے ساتھ اُن کے لطائف بھی سُنے۔ ہوا یوں کہ اختر صاحب نے جو غزل پڑھی وہ سامعین کو بہت پسند آئی اور انہوں نے "ایک اور ایک اور" کا تقاضا کیا۔ اس پر پنڈت جی نے سامعین کو بتایا کہ

"ایک صاحب تھے افیونی۔ انہوں نے افیون کی پینک ہی میں سائیس کو حکم دیا کہ گھوڑے پر زین کس دو سائیس نے جواب دیا کہ جناب کس دی۔ اس نے کہا ایک اور بھی کس دو۔"


ہری چند اختر

اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

اس مشاعرے کی مجھے زیادہ باتیں تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ایک شاعر صاحب نے نظم شروع کرنے سے پہلے کہا "حضرات میری نظم کا عنوان ہے "آنسو" اور پھر

ترمیم پیش کرتے ہوئے کہا کہ "میرا آنسو" اس پر ایک آواز آئی "میرا اپنا آنسو" فوراً ایک اور آواز آئی "میرا اپنا پیارا آنسو" اور پھر ایک طرف بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ میں حیران تھا کہ یاالٰہی یہ کیا معاملہ ہے بعد میں پتہ چلا کہ یہ ہوٹنگ تھی جو مشاعرے کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔

حفیظ صاحب بھیرے میں نظم "ہندو مسلمان" میری زبانی سُن چکے تھے یہاں انہوں نے اعلان کر دیا کہ اب یہ بچہ آپ کو نظم سُنائے گا اور مجھ سے کہا کہ پڑھو میں نے پوچھا "کون سی" "ہندو مسلمان" یا "آندھی"۔ انہوں نے کہا "آندھی" اور میں گراموفون ریکارڈ کی طرح شروع ہو گیا۔ ذرا سا میرا قد تھا۔ بس میز ہی کی اونچائی کے برابر اور مشاعرہ یہ بہت بڑا تھا۔ بھیرے کے مشاعرے سے کہیں بڑا۔ وہ اسکول کے ایک ہال میں تھا یہ باہر وسیع اور عریض میدان میں۔ حفیظ صاحب نے مجھے دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر میز پر کھڑا کر دیا اور میں نے والد کی نظم

اب یہ دکھا کہ رنگ بدلتی ہے کس طرح
آندھی کلورکوٹ کی چلتی ہے کس طرح

آندھی کی رفتار سے سُنا ڈالی۔

یہ مشاعرہ طرحی تھا اور اس میں دو طرحیں تھیں۔ ایک مصرع جوش ملیح آبادی کا تھا۔

"آگ بننا ہی نہیں ہے آگ برسانا بھی ہے"

اور دوسرا مولانا حالی کا۔

"کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم"

حفیظ صاحب کی غزل

یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر
چُپ ہو رہیں گے کچھ نہ کہیں گے زباں سے ہم

اسی مشاعرے کی یادگار ہے اور یہ غزل انہوں نے مشاعرے سے تھوڑی دیر قبل ملتان پہنچنے کے بعد "فی البدیہ" کہی تھی۔ مشاعرے کے منتظم بال کرشن بترہ آبر کے مکان پر۔ والد صاحب کی غزل بھی فی البدیہ ہی تھی اور انہوں نے حفیظ صاحب کی غزل کے بعد اپنی غزل کہی تھی۔ اس غزل میں حفیظ کے مصرعے کی تضمین بھی ہے۔

ہاں بے مبالغہ ہے یہ کہنا حفیظ کا
مٹ مٹ گئے مگر نہ دبے آسماں سے ہم

اوّل الذکر مصرعے پر تضمین ایک مخمس کی صورت میں والد پہلے ہی کر کے لائے تھے ؎۱

؎۱ اس سفر کے بعد بھی میرا ملتان جانے کا اتفاق اکثر ہوا۔ تقسیم سے قبل بھی اور تقسیم کے بعد بھی۔ ہر بار مشاعرے ہی کے سلسلے میں جانا ہوا تقسیم کے بعد کے ایک مشاعرے کا ذکر ہے۔ عدم صاحب انتہائی نشے کے عالم میں اپنا کلام سُنا رہے تھے جب وہ اس قطعے پر پہنچے۔

عشق کچھ فرضِ منصبی تو نہیں
آپ معشوق ہیں نبی تو نہیں

تو سامعین میں سے ایک جماعت کے بعض کارکنوں نے اعتراض کیا کہ اس قطعے میں نبیٔ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ عدم صاحب کے خلاف اور حق میں کافی آوازیں بلند ہوئیں۔ عدم صاحب کے حامیوں کا کہنا تھا کہ یہاں نبی سے مراد حضورؐ نہیں ہیں۔ آخر عدم صاحب نے نشے کے عالم ہی میں معترضین سے یہ کہا کہ اب میں اور قطعہ پڑھتا ہوں۔ سماعت فرمایئے۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے لیکن عدم صاحب پھر وہی قطعہ پڑھ گئے۔ اس پر پھر شور و غوغا بلند ہوا اور پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شعراء نے عدم صاحب کو سمجھایا کہ اب کے کوئی اور قطعہ پڑھیے۔ عدم صاحب نے "بہتر حضور" کہہ کے پھر وہی قطعہ داغ دیا۔ اب تو مخالفت کا طوفان تھا کہ سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ بصد مشکل بیس پچیس منٹ کی محنت کے بعد معترضین کو سمجھا بجھا کر خاموش کرایا گیا کہ عدم صاحب نشے میں ہیں۔ اس وقت ان پر کسی نصیحت کا اثر نہیں ہوگا۔ آج تو آپ حضرات مان جایئے آیندہ ہم محتاط رہیں گے۔

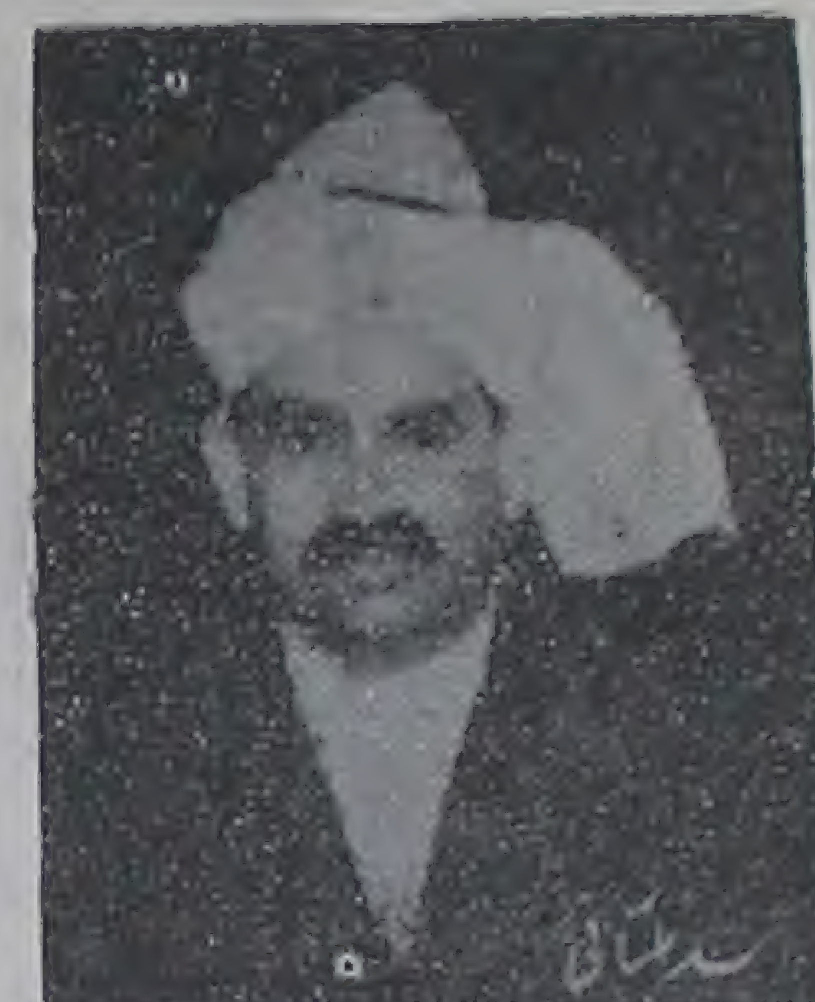
ملتان کے ذکر نے اس وقت یادوں کی بزم میں متعدد چراغ روشن کر دیے ہیں۔ اسد ملتانی، عبداللطیف تپش، کشفی ملتانی، اور نہ جانے کتنے اور درخشندہ ستارے اس وقت حافظے کے افق پر دمک رہے ہیں۔ کشفی صاحب تو بہ فضلہٖ آج بھی ہم میں موجود ہیں۔ لیکن اسد ملتانی اور عبداللطیف تپش اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

عبداللطیف تپش تو تقسیم ہند سے بہت پہلے (سلسلہ اگلے صفحے پر)

یہاں کلور کوٹ سے میں نے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ میری عمر اس وقت بارہ برس کی تھی۔ اس وقت تک صورت یہ تھی کہ میں کبھی کبھار کوئی مصرع موزوں کر لیا کرتا تھا۔ یا کبھی کوئی شعر ہو جاتا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ ہاں یاد آیا۔ میں نے اس دوران میں ایک نظم بھی کہی تھی جو ہفتہ وار "گلدستہ" میں شائع ہوئی تھی۔ وہ نظم رسالہ "گلدستہ" ہی کے بارے میں تھی [1]

اگلے دو برس میں نے میانوالی میں گذارے جہاں سے میں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔

اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں ڈی اے وی کالج راولپنڈی میں داخل ہوا۔ والد نے بھی کوشش کر کے اپنا تبادلہ یہیں کرا لیا اور یہیں سے دراصل میری شعر و شاعری کی ابتدا ہوئی۔



اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ اسد صاحب کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ حفیظ ہوشیارپوری نے

"مرگِ اسد اے وائے جدائی"

۱۳۷۹

اور ظریف جبلپوری نے

"کہہ دو چراغِ انجمنِ شعر بجھ گیا"

۱۹۵۹

کہہ کے تاریخیں نکالیں۔

ملتان کے بارے میں اسد مرحوم کے چند اشعار غالباً بے موقع نہ سمجھے جائیں گے۔

وقتِ غروب کوہِ سلیماں کا سلسلہ
دیتا ہے اک جہانِ طلسمات کا سُراغ
پھرتا ہے آ کے چشمِ تصور کے سامنے
دُور کہن کہ جس سے ہوں پھر تازہ دل کے داغ
اُس سمت روضۂ ذکریا ہمہ پیام!
اور شاہ رکنِ عالم: دھر پیکر بلاغ
مندر بھی ہے قریب بھگت پرہلاد کا
لوہے کی گرم لاٹھ جسے دے سکی نہ داغ
تھا ماموں دیو کا اسی قلعے میں ایک غار
اس کا تو لیکن اب کہیں ملتا نہیں سُراغ

لگے ہاتھوں اس شہر کے بارے میں جس کی تعریف

چہار چیز است تحفۂ ملتاں
گرد، گرما، گدا و گورستاں

کی صورت میں تاریخ ادب کا جزو بن چکی ہے آپ کو شیر افضل جعفری کے بھی چند اشعار سنا دوں۔

مصر نیوں کی زلیخاؤں کی زلفوں کی طرح
رُوپ نگری کے چراغوں کا دُھواں ہوتا ہے
شہر کی سانولی گلیوں سے بہلنے کے لیے
کتنا بے تاب دلِ کاہکشاں ہوتا ہے
موٹریں چھم سے تھلتی ہیں کھلی سڑکوں پر
اُن کی رفتار پہ قربان جھناں ہوتا ہے
آم کی نازلی شاخوں کے بسنتی رُخسار
چوم لیتا ہے تو بوڑھا بھی جواں ہوتا ہے

[1] "گلدستہ" بچوں کا ایک مقبول ہفتہ وار جریدہ تھا جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اُس وقت بچوں کے تین جریدے لاہور سے نکلتے تھے اور بڑی آب و تاب کے ساتھ۔ ایک گلدستہ جسے رائے صاحب گھوناتھ سہائے مرتب کر رہے تھے۔ دوسرا دار الاشاعت کا "پھول" اُس کے مدیر پہلے حفیظ جالندھری تھے پھر ہری چند اختر، اور اُن کے بعد حفیظ ہوشیارپوری، اور تیسرا تھا مولانا تاجور نجیب آبادی کا "پریم" جس کی پیشانی پر کچھ اس قسم کی عبارت لکھی رہتی تھی ــــ "سال بھر تک پریم کا مطالعہ کرنے والا بچہ دسویں جماعت کی اُردو سیکھ سکتا ہے اس عبارت کے نیچے یہ قطعہ درج رہتا تھا۔

بھارت ماتا سب کی مائی ؛ سب ہندی ہیں بھائی بھائی
من میں بہائیں پریم کی گنگا ؛ ہندو مُسلم سکھ عیسائی!

یوں تو ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" اور ہفتہ وار "رفیق التعلیم" میں چند صفحات بچوں کے لیے وقف رہتے تھے، لیکن بنیادی طور پر یہ دونوں تعلیمی رسائل تھے اساتذہ کے لیے اوّل الذکر کے اڈیٹر ماسٹر جگت سنگھ تھے جو بعد میں سردار صاحب بن گئے

(بقیہ سلسلہ اگلے صفحہ پر)

[2] چناب



عبدالحمید عدم اُن دِنوں راولپنڈی میں تھے۔ اُن کے ابتدا ہی سے والد کے ساتھ دوستانہ مراسم ہو گئے تھے وہ ہمارے گھر ہفتے میں تین چار بار آیا کرتے تھے اور رات کے دو دو بجے تک والد کے ساتھ اُن کی شعروسخن کی محفل گرم رہتی تھی۔ وہ اپنے رسائل اور دوسری ڈاک بھی ہمارے پتے پر منگوایا کرتے تھے اور جب وہ اپنی ڈاک کھولتے تھے تو ہر رسالہ اور ہر خط کسی نہ کسی ادبی گفتگو کا موضوع بن جایا کرتا تھا۔ نگار جب بھی آتا حضرت نیاز فتحپوری اور ان کی تصانیف موضوعِ گفتگو بن جاتی تھیں۔ اسی طرح "ساقی" کا ریپر کھلتے ہی شاہد احمد اور دہلی کے تذکرے شروع ہو جاتے تھے۔ ہمیں باقاعدہ موصول ہونے والے ادبی رسائل کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ کچھ عدم صاحب کے نام آتے تھے کچھ والد کے نام۔ میں بھی کبھی کبھار ان رسائل کی ورق گردانی کر لیا کرتا تھا اور جوش اور فیض کے کلام سے میری دلچسپی شروع ہو گئی تھی۔

اسی زمانے میں عدم صاحب نے اپنا مجموعۂ کلام "نقشِ دوام" مرتب کیا۔ آج یہ مجموعہ نایاب ہے اور اس میں جس قسم کی شاعری ہے وہ عدم کے آج کے رنگِ سخن سے بہت مختلف ہے۔ عدم کی ابتدا غزل سے نہیں بلکہ نظم سے ہوئی اور اس مجموعے میں اگرچہ غزلیں بھی موجود ہیں لیکن اصل میں یہ عدم کا ایک نمائندہ مجموعۂ نظم ہے جس کا مطالعہ عدم کے شاعرانہ ارتقا کا جائزہ لینے کے لئے بہت ضروری ہے۔

یہ مجموعۂ کلام عدم صاحب نے میر عثمان علی خاں تاجدارِ دکن کے نام معنون کیا تھا۔ دیباچہ اس کا حضرت علامہ نیاز فتح پوری نے لکھا تھا۔

راولپنڈی میں اُس زمانے میں حاجی سید وحیدالدین المتخلص بہ حاجی تاریخ گوئی کے فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے ادھر ان سے تاریخ کا مطالبہ کیا ادھر مادہ تاریخ مصرعے کی صورت میں اُن کی زبان پر موجود ہے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے ہزاروں تاریخیں نکالی ہوں گی۔ "نقشِ دوام" کی بھی تاریخ انہوں نے نکالی۔ مصرعِ تاریخ تھا۔

تابندہ بادنیّرِ لمعاتِ سیدی

(۱۳۵۴ھ)

کبھی کبھی والد سے ملنے کے لئے عبدالعزیز فطرت [۱] اظہر امرتسری اور آغا صدیق حسن ضیا بھی آجایا کرتے تھے۔ اظہر اور ضیا کم آتے تھے۔ فطرت مقابلتہً زیادہ۔ لیکن اتنا نہیں جتنا عدم۔ اُن کا تو ہر روز کا معاملہ تھا۔ عدم صاحب بالعموم دفتر سے چھٹی ہوتے ہی سائیکل پر پاؤں رکھتے اور ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ رات کو بہت دیر گئے رخصت ہوتے تھے۔ ان کے ایک دوست مختار قریشی بھی اُن کے ساتھ ہی آتے تھے۔ مختار قریشی اکثر ہمیں بتلاتے تھے کہ رات کو بائیسکل میں لیمپ نہ ہونے کی وجہ سے عدم صاحب کا چالان ہو گیا۔

یہ صورتِ حال کوئی تین برس تک رہی اور میں راولپنڈی سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ہندوستان کے شاعرانہ ماحول کی ایک ہلکی سی جھلک عدم اور والد کی تین برس کی گفتگو میں دیکھ چکا تھا۔ اس مختصر سے وقفے کے بعد عدم صاحب مصر چلے گئے اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن میرے دل میں ذوقِ ادب

تھے۔ اور آخر الذکر کے مدیر طالب علی پابند قریشی تھے۔ اس ہفتہ وار جریدے کا بچوں کا حصہ "رفیق الاطفال" کہلاتا تھا۔

یہ تمام لاہور کے پرچے تھے لیکن الہ آباد اس معاملے میں لاہور سے بازی لے گیا تھا انڈین پریس الہ آباد کی طرف سے بچوں کی دنیا شائع ہوتا تھا۔ اس کے اڈیٹر پیارے لال شاکر میرٹھی تھے اور اس کی چمک دمک کے آگے لاہور کے تمام بچوں کے پرچے ماند تھے۔ اُس دَور میں اُردو کا یہ ماہنامہ ایسے چھپتا تھا جیسے آج کل انگریزی اور ہندی کے ماہنامے ہندوستان کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے ہیں۔ اس ماہنامے میں میری بھی ایک نظم چھپی تھی۔ اس کا عنوان تھا: "بندر کی خودکشی" میں نے کسی رسالے میں خبر پڑھی تھی کہ امریکہ کے ایک چڑیا گھر میں ایک بندر نے خودکشی کر لی۔ میں نے اس خبر کو قافیہ اور ردیف کے ساتھ موزوں مصرعوں میں ڈھال لیا اور "بچوں کی دُنیا" کو بھیج دیا۔ اس میں اڈیٹر نے بعض مصرعوں میں ترمیم کر کے انہیں قدرے جاندار بنا دیا۔

---

[۱] آپ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اور ذوقِ مطالعہ کا جو شعلہ اُس زمانے میں روشن ہوا تھا وہ بڑھتا ہی گیا۔

عبدالعزیز فطرت مرحوم راولپنڈی کی ادبی محفلوں کی جان تھے۔ شہر میں انجمن ترقی اردو کی قیام اور پہلے یومِ اقبال کا انعقاد انہیں کی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ اس یومِ اقبال کا اجلاس دو دن منعقد ہوا۔ دونوں دن سر شیخ عبدالقادر نے صدارت کی۔ پہلے دن یہ اجلاس ڈی۔اے۔وی کالج میں ہوا اور دوسرے دن گارڈن کالج میں۔ ممکن ہے اتنا بڑا اجلاس لاہور یا حیدرآباد میں منعقد ہوا ہو۔ لیکن امکان نہیں کو کسی اور شہر میں اسی طرح دو دن تک مسلسل یومِ اقبال منایا جاتا رہا ہو۔ اور اس ساری کامیابی میں عبدالعزیز فطرت کا خلوص اور اُن کی شبانہ روز کی دوڑ دھوپ کار فرما تھی۔ میں نے اس میں اپنا مقالہ "اقبال کی منظر نگاری" پڑھا جو شیخ سر عبدالقادر (مرحوم) کو اتنا پسند آیا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ اور اُسے "ہمایوں" میں شائع کرایا اور بعد میں یہ "ہمایوں" سے "ادبی دنیا" میں نقل ہوا۔

عبدالعزیز فطرت ہی کے اصرار پر میں نے باقاعدہ طور پر انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ گارڈن کالج ہماری سرگرمیوں کی جولانگاہ تھی۔ استاذی سید قمقام حسین جعفری اردو کے پروفیسر تھے۔ اُن کی وجہ سے ہمیں کالج میں ہر طرح کی آسانیاں میسر تھیں۔ ہر پندرھویں بیسویں دن ہم وہاں کوئی نہ کوئی ادبی جلسہ منعقد کر دیا کرتے تھے۔ جب کوئی موضوع نہ ملتا تو طرحی یا غیر طرحی مشاعرے کا انعقاد کر دیتے تھے۔ والد بھی ان مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اگرچہ ہمارا مکان گارڈن کالج سے بہت دور تھا۔ عدم صاحب کرکٹ کے میدان سے سیدھے مشاعرہ گاہ میں پہنچتے تھے۔ اکثر وہ کرکٹ کا بیٹ ساتھ ہی لے کر آتے تھے۔

صدیق حسن ضیا ان مشاعروں کی ایک خاص شخصیت تھے ان کی شاعری فلسفیانہ شاعری تھی۔ اندازِ بیان سلجھا ہوا اور ژولیدگی سے پاک تھا فلسفیانہ افکار کو وہ بڑی خوبصورتی سے نظم کرتے تھے۔ اُن کی ژرف نگاہی اردو شاعری کے لئے بڑی دولت تھی۔ افسوس ہے کہ اُن کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ ہاں دو مثنویاں جو قریباً دو دو سو اشعار پر مشتمل تھیں "مقامِ محمود" اور "ہبوطِ آدم" کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔ برج لال رعنا انہیں کے شاگرد ہیں اگر رعنا صاحب کہیں سے اپنے اُستاد کا کلام ڈھونڈ نکالیں اور اس کی اشاعت کا بندوبست کر دیں تو یہی نہیں کہ اُستادِ مرحوم کی روح کو شاد کام فرمائیں گے بلکہ اردو ادب پر اُن کا بہت بڑا احسان ہوگا۔

زندگی میں ضیا صاحب کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ لیکن جیسا کہ ہم مردہ پرستوں کا دستور ہے اُن کی یاد میں سالانہ جلسے منعقد ہونا شروع ہو گئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو "مقامِ محمود" اور "ہبوطِ آدم" دونوں اُن کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔

مجھے یاد ہے کہ تقسیمِ ہند تک ضیا صاحب کی برسی بڑی باقاعدگی سے راولپنڈی میں منائی جاتی رہی ؎۔ بعد میں مجھے معلوم نہیں کہ اُن کی یاد منانے کا یہ سلسلہ جاری رہا یا نہیں۔

اُسی زمانے میں میں نے ایک بہت بڑی شخصیت کو دیکھا اور وہ شخصیت تھی رابندر ناتھ ٹیگور۔ غالباً ۱۹۲۵ء کی بات ہے ٹیگور لاہور تشریف لائے۔ وشو بھارتی کے لئے چندہ جمع کرنے۔ بریڈلا ہال میں اُن کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہوا۔ سروجنی نائیڈو کی صدارت میں۔ مدعو شعراء کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے باہر سے صرف تین شعراء کو مدعو کیا گیا تھا جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی غالباً پونا سے آئے تھے اور والدِ محترم راولپنڈی سے۔ جوش صاحب نے اپنی نظم "پروگرام"۔ اے شخص اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے۔ ترنم سے پڑھنے کی کوشش کی لیکن چل نہ سکے۔ ہال میں دس ہزار افراد کی جگہ اور اس میں بیس ہزار کا مجمع۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ پولیس امن قائم کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ والد صاحب نے اپنی نظم "شاعرِ اعظم کے نام" شروع کی۔ انہوں نے صرف پہلا بند جو پانچ سات

؎ والدِ محترم کی یہ رباعیات ضیا صاحب کی پہلی برسی کی یادگار ہیں۔

اک شاعرِ خوش نوا کی برسی ہے آج
اک صوفیٔ باصفا کی برسی ہے آج
تازہ صدمہ ہے اہلِ دل کے دل پر
صدیق حسن ضیا کی برسی ہے آج

اللہ رے آب و تابِ اشعارِ ضیا
تھی ابرِ رواں طبعِ گہر بارِ ضیا
ہیں دیدہ و دل آج بھی روشن اُن سے
اشعارِ ضیا میں ہیں انوارِ ضیا

اشعار پر مشتمل تھا پڑھ کر بیٹھ جانے میں مصلحت دیکھی۔ ساغر نظامی واحد شاعر تھے کہ جنہوں نے رنگ جما دیا۔ انہوں نے "پجارن" پڑھی۔ آواز میں جادو کا اثر تھا۔ آپ مشاعرے پر چھا گئے۔ بعد میں ڈاکٹر ٹیگور نے اپنی بنگالی نظم سنائی۔ نظم تو کسی کی سمجھ میں کیا آئی آواز کا طلسم اپنا کام کر رہا تھا۔ ہال میں ایک سناٹا تھا۔ سننے والے یوں جھوم رہے تھے جیسے سپیرے کی بین پر سانپ جھومتا ہے۔

کئی برس بعد اسی بریڈلا ہال میں میں نے ایک اور نقشہ دیکھا۔ کانگرس کے زیر اہتمام مشاعرہ منعقد ہوا۔ حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی اس مشاعرے کے دو ممتاز شاعر تھے۔ انور صابری نئے نئے مشاعروں میں قدم رکھ رہے تھے۔ راقم التحریر ایک تو مبتدی تھا دوسرا جس کالج میں زیر تعلیم تھا اس کے ضابطے کے مطابق کانگرس کے جلسے میں شریک نہ ہو سکتا تھا اس لئے صفِ سامعین سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ مشاعرہ حفیظ جالندھری کے ہاتھ رہا۔ انور صابری نے بھی اچھی داد پائی۔ انہوں نے سیاسی انداز کی غزل پڑھی ۱؎ ساغر نظامی نے اپنی نظم 'پجارن' شروع کی اور وہ نظم جو ایک بار اسی بریڈلا ہال میں طلسم بن کر چھائی تھی اب کے سپاٹ رہی۔ بعد میں پتہ چلا کہ بعض لوگوں نے ساغر صاحب کے ساتھ سازش کی تھی اور ساغر صاحب کی نظم پجارن اسی سازش کا شکار ہو گئی ۲؎

ڈی اے وی کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں بی اے میں آیا تو اسی گارڈن کالج میں داخلہ لے لیا۔ گارڈن کالج میں میں نے دوستوں کے ساتھ مل کر بزم ادب کی بنیاد ڈالی۔ اس کالج میں اگرچہ طلبار کی طرف سے ادبی اجلاس اکثر منعقد ہوا کرتے تھے لیکن باقاعدہ طور پر اردو کی کسی بزم کی تشکیل ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ کالج کے وائس پرنسپل ریورینڈ جے بی کنگز امریکی پادری تھا اور اردو سے اُنہیں بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے بزم کی سرگرمیوں کو ہمیشہ سراہا اور اس کی ہمت افزائی کی۔ ہم لوگوں نے اس بزم کے زیر اہتمام اکثر مشاعرے اور اجلاس جن میں یوم پریم چند ایک خاص اہمیت رکھتا ہے منعقد کئے۔ کالج میگزین کا میں ایڈیٹر تھا۔ اس میں میرے اشعار شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ "ادبی دنیا" (لاہور) اور "زمانہ" (کان پور) میں میرا کلام شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ منشی دیانرائن نگم اور مولینا صلاح الدین احمد کی حوصلہ افزائی کا اس موقع پر ذکر نہ کرنا ایک صریحی احسان ناشناسی ہوگی ۳؎

راولپنڈی کی ادبی شخصیتوں میں یوں تو کئی نام اس داستان میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔ لیکن ان میں ایک نام ایسا بھی ہے جس کے بغیر اس

۱؎ مجھے اس کا مطلع ابھی تک یاد ہے ع

غلام قوم کا دل بھی غلام ہوتا ہے ؎ غلام قوم کا سجدہ حرام ہوتا ہے۔

۲؎ ساغر صاحب کے ساتھ یہ سازش پنجاب اور یوپی کے شعرار کی باہمی رقابت کا ایک شاخسانہ تھی۔ اردو مرکز کے زمانے میں مولینا تاجور نجیب آبادی نے یوپی کے متعدد نامور شعرار اور ادبا مثلاً مولینا سیماب اکبر آبادی، حضرت ساغر نظامی، حضرت جگر مراد آبادی اور حضرت اصغر گونڈوی کو لاہور بلوا کر ان کا تقرر اردو مرکز میں کرا دیا تھا۔ پنجاب کے بعض شعرار کو جن میں حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر، مولانا سالک مرحوم اور ڈاکٹر تاثیر مرحوم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مولینا کا یہ رویہ بہت ناگوار گذرا تھا۔ چناں چہ دونوں صوبوں کے شعرار میں باہمی چپقلش کا ایک دور چل نکلا جس کا مظاہرہ علمی ادبی دنیا میں بالعموم اور مشاعروں میں بالخصوص نظر آجاتا تھا۔

۳؎ مولینا صلاح الدین احمد مرحوم کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کے بارے میں میں نے ایک مقالہ اُن کے انتقال پر لکھا تھا۔ یہ "ادبی دنیا" لاہور کے صلاح الدین نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔

مذکورہ مقالہ مولانا مرحوم کی شخصیت کے بارے میں ہے اور زیر تحریر روداد کا تعلق بھی ادبی مباحث سے نہیں ہے۔ لیکن مولینا کے بارے میں ایک خاص بات کا ذکر جو شاید میں نے اس مقالے میں بھی نہیں کیا ضروری ہے۔ اور وہ ہے افادی ادب کے بارے میں مولینا کا نظریہ۔ افادی یا مقصدی ادب سے متعلق اُن کے ساتھ جب بھی بات ہوئی انہوں نے مقصدیت کو فن کا دشمن قرار دیا۔ اس نظریے کی تائید میں نہایت خوبصورت جملے اُن کے قلم اور اُن کی زبان سے نکلتے تھے۔ ایک بار کہنے لگے "ایوانِ ادب کی محراب پر یہ بات جلی حروف میں لکھ دو کہ جب مقصد ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے تو فن دوسرے دروازے سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ایک اور موقع پر دوستوں کی محفل میں انہوں نے فرمایا" فنی ادب اور مادی ادب میں بنیادی فرق ہے۔ ایک ایسا فرق جو ایک نادرہ کار مصوّر اور ایک ہوشیار کاریگر میں ہوتا ہے اور ہر ابھرنے والے ادیب کو اس فرق سے آشنا ہونا چاہئے۔"

زمانے کی راولپنڈی کا ادبی ذکر نامکمل رہے گا۔ اور یہ نام ہے فضل الرحمان اشک کا۔

مجھے یاد نہیں کہ فضل الرحمان اشک ہماری ادبی سرگرمیوں میں کبھی شریک ہوئے ہوں لیکن اُن کا تعاون ہمیں ہر لمحہ اور ہر قدم پر حاصل تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُن کے نکھرے ہوئے ادبی ذوق کی وجہ سے اُن کی دُکان ایشیاٹک آپٹیکل ورکس ہم لوگوں کے لئے کعبۂ مقصود تھی۔ ایشیاٹک آپٹیکل ورکس اب بھی راولپنڈی میں ایڈورڈز روڈ پر موجود ہے اور پاکستان بننے کے بعد اس کی ایک شاخ اس وقت کراچی میں ہے۔ ہمارے دوست اشک صاحب کراچی کی شاخ کے مالک و منتظم ہیں۔ اشک صاحب مہینوں میں ایک آدھ غزل کہتے ہیں۔ لیکن انتہائی پاکیزہ وشستہ اور بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ، اپنا کلام رسالوں کو نہیں بھیجتے۔ صرف احباب ہی کو سُناتے ہیں اور بڑی خوبی ان کی غزل کی یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار اُن کے احباب کو زبانی یاد رہ جاتے ہیں۔

بی۔ اے کے بعد میں راولپنڈی سے چلا تو لاہور کی کھلی فضائیں پروانے کے لئے موجود تھیں۔ یہاں کا ہر فرد ایک انجمن اور ہر گوشہ ایک بساطِ ادب ہے۔ یہاں کی قد آور شخصیتوں میں سب سے پہلے ملاقات مولینا تاجور نجیب آبادی سے ہوئی۔ اُن کے مشوروں اور فیض محبت کے متعلق مجھے یہی کہنا ہے کہ ع

جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو با خبر ہو کر

مولینا کی خدمت میں مجھے کرپال سنگھ بیدار لے کر گئے تھے۔ کرپال سنگھ بیدار سے تعارف وقار انبالوی کے ذریعے سے ہوا تھا اور وقار انبالوی سے میں لاہور آنے کے بعد خود ہی جا کر ملا تھا۔ اس لئے کہ "چندن" (لاہور) کی ایڈیٹری کے زمانے میں وقار انبالوی نے "والد محترم کی کتاب" گنج معانی" پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو مجھے بہت پسند آیا تھا اور میں نے اُن کے ساتھ ایک دلی قرب محسوس کیا تھا۔

مولینا اس زمانے میں مزنگ والے مکان میں رہتے تھے جب میں اور بیدار وہاں پہنچے تو ایک صاحب وہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ یہ صاحب کمیونزم کے موضوع پر مولانا سے گفتگو کر رہے تھے اور انہیں کمیونزم کی خوبیوں سے واقفیت بہم پہنچا رہے تھے۔ مولینا کی سیاسیات میں زیادہ گہری نظر نہیں تھی۔ وہ جواب میں یہ کہہ رہے تھے کہ میاں! کمیونسٹ برسرِ اقتدار آئیں گے تو سب سے پہلے تمہیں ہی نشانہ بنائیں گے کیوں کہ تم سُوٹ پہنتے ہو اور ٹائی لگاتے ہو۔ خدا معلوم مولینا کے دماغ میں کمیونسٹ کا کیا تصور تھا۔

گوپال مِتّل بھی اس محفل میں موجود تھے۔

مولینا کے ساتھ اس وقت کیا باتیں ہوئیں مجھے تفصیل سے یاد نہیں۔ غالباً میرے ساتھ ان کی کم بات ہوئی۔ زیادہ تر وقت وہ بیدار اور مِتّل سے باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے انہوں نے والد کی خیریت پوچھی اور یہ بھی پوچھا کہ تم بھی شعر کہتے ہو۔ میں ابھی جواب کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بیدار صاحب نے کہا کہ مولانا ادبی دُنیا میں ان کا کلام نہیں دیکھا۔ اُن کا کلام "زمانہ" کانپور میں بھی چھپتا ہے۔ "ہمایوں" میں ان کا ایک مقالہ اقبال کی شاعری پر شائع ہو چکا ہے۔ مولینا نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے بیدار صاحب کی کسی بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔

نئے اُبھرنے والے شعراء میں قتیل شفائی کا نام بڑی تیزی سے سامنے آ رہا تھا۔ قتیل کا کلام میں پڑھ چکا تھا۔ نام سُن چکا تھا۔ ان سے ملنے کا مجھے



اشتیاق بے اندازہ تھا۔ ایک بار میں دو ایک چھٹیوں میں لاہور سے راولپنڈی گیا تو عبدالعزیز فطرت نے میری آمد کے سلسلے میں ایک نشست کا انتظام کیا گارڈن کالج میں۔ اس میں قتیل سے میری ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے محسوس ہوا جیسے قتیل سے میری مدتوں کی دوستی ہے۔ قتیل نے اپنا کلام سُنایا۔ میں نے اپنا کلام بھی سنایا اور والد کا بھی کیوں کہ والد اس جلسے میں مدعو تھے۔ ـــ وقت گذرنے کے ساتھ قتیل کے ساتھ میرا رشتۂ محبت استوار سے استوار تر ہوتا گیا۔ مجھے قتیل کی شاعری اور شخصیت دونوں پسند آئیں اور یہ قرب اور تعلق خاطر روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ ـــ کرپال سنگھ بیدار کی اٹھان اپنی جگہ قیامت خیز تھی۔ ان کی نظموں نے جن میں "فریادِ شکستہ" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے سارے پنجاب کو چونکا دیا تھا۔ لیکن بیدار کا وہ اندازِ کلام جس نے ایک بار پنجاب بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، دیرپا ثابت نہ ہوا اور ع
"خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود" کے مصداق بیدار کا کلام اور نام دونوں ذہنوں سے محو ہونے لگے۔ (باقی)

رشیدہ رضویہ



اکیلا کبوتر

بے نیازی سے اخبار دُور پھینک کر وہ بچوں کے بال سنوارنے لگی۔ بچوں کے بال اخبار سے بہرحال بہتر تھے۔ اخبار کیا تھا ؟ اُلٹی سیدھی خبروں کا مجموعہ : بچوں کو تیار کر کے وہ مدرسہ لے گئی۔ اور واپسی پر بازار سے پانچ سیر لڈو بھی لیتی آئی۔ وہ گھر پہنچی تو ملازمہ اُس کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ اور اخبار پر موتی کتا کیک رکھے کھا رہا تھا کل شام ہی چھوٹے بچے کی سالگرہ تھی۔ لیکن موتی کتا اُس وقت مہمانوں کے سامنے آنے کے بجائے اپنی کوٹھری میں بند تھا اس لئے سالگرہ کا کیک نہ کھا سکا تھا۔

— "ارے موتی سالگرہ کا کیک اُڑا رہے ہو"۔ ہنستی ہنستی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ لمحہ بھر کے لئے وہ موتی کے پاس رُکی۔ اخبار اُٹھانے کے لئے جھکی اور پھر سر جھٹک کر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر ناخن سنوارنے لگی۔ گیارہ بجے اُسے ایک ایسی کافی پارٹی میں شرکت کرنا تھی جو کسی بڑے افسر کی بیگم صاحبہ کے اعزاز میں دی جا رہی تھی۔

ناخنوں سے فارغ ہو کر وہ لباس کا انتخاب کرنے لگی اور مختلف رنگوں سے ہوتی نگاہ سبز رنگ کے ایک جوڑے پر پڑ گئی۔ یہ رنگ پہننے سے وہ عموماً گریز کرتی تھی۔ لیکن آج اُس نے یہی لباس نکال لیا۔ آج سے آٹھ سال پیشتر بھی تو یہی لباس زیب تن کیا تھا۔ اس روز بھی کسی نے افسر کی بیگم کے اعزاز میں دی گئی کافی پارٹی میں جانا تھا۔ سرتا پا بہار بنی وہ پارٹی میں جانے سے پیشتر انوری کی تلاش میں شوقی کے دفتر میں جا گھسی تھی۔ شوقی کاغذات پہ جھکا تھا اور قدموں کی آہٹ پہ سر اُٹھائے بغیر اُس نے کہا تھا۔

"انوری! تم ہمیشہ میرے کام میں حارج ہوتی ہو۔ ہزار مرتبہ کہا ہے کہ دفتری اوقات میں نہ آیا کرو۔ لوگ یہاں آتے رہتے ہیں۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا۔ تنہائی میں آیا کرو میری جان۔ تنہائی میں۔ تاکہ سینہ سے لپٹا کر تمہیں وہ اشعار سُنا سکوں جو تمہارے اور محض تمہارے لئے ہیں۔ لیکن اس وقت تو میں اپنا کالم لکھ رہا ہوں"

وہ یہ سب کچھ سُن کر بے تحاشا سٹ پٹا گئی۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ انوری اور شوقی کا کچھ قصہ چل رہا ہے۔ لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ شوقی کیسی ننگی ننگی باتیں کرتا ہے

"انوری تم گئیں نہیں۔ چلی جاؤ میری جان چلی جاؤ۔ دو بجے کے بعد آنا جبکہ دفتر میں میرے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ ابھی تو لوگ —"

لوگ : لوگ ! وہ یک لخت بھڑک اٹھی۔ ایک تو اُسے انوری جان کر برابر ترغیب دے رہا تھا۔ دوسرے لوگوں کا خوف دلا رہا تھا۔

"لوگ۔ ہونہہ ! کون لوگ آتے ہیں تمہارے پاس۔ ایک سے ایک پھیچڑ، مطلبی، اور خود غرض۔ جو خوشامدیں کر کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں" اور یہ کالم جو آپ تحریر فرماتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں ؟ دوستوں اور حکمرانوں کے قصیدے۔ جس نے چائے پلا دی۔ کیک کھلا دیا۔ اُس کا مدحیہ ! آپ میں اور ایک درباری شاعر میں کیا فرق ہے ؟ وہ ہنسی۔ طنزیہ اور کاٹ کر رکھ دینے والی ہنسی۔ جو کبھی تھی۔

" شوقی جناب : ہم آپ کے پس منظر سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کتنی اہمیت، کتنا بڑا عہدہ بھی کیوں نہ سنبھال لیں۔ لیکن ہم یہ بات نہ بھولیں گے کہ آپ کیا تھے ؟"

اُس کی ہنسی کو پہچان کر شوقی تلملا ہی گیا اور جان گیا کہ اس کے

سامنے انوری نہیں بلکہ امیلہ تھی۔

دیکھو امیلہ بیگم — کہتے کہتے غصہ سے شوقی نے سر اٹھایا تو ننگ یاد آنے کے بجائے پھولوں کی سرسبز ڈالی یاد آگئی۔ وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اور پھر دفعتاً وہ کانٹا جو اس کے دل میں بند رہتا تھا۔ دل سے آنکھوں میں آکر چبھنے لگا۔ گلاب کا وہ شگفتہ پھول روندنے کے لئے لپکنے لگا۔ لیکن شوقی کی نگاہیں بھانپ کر انوری کے متعلق کچھ دریافت کئے بغیر ہی وہ باہر نکل گئی اور کھلی فضا میں سانس لے کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

وہ اب بھی ویسی ہی شوخ اور ہلکی پھلکی تھی۔ گزرتے آٹھ سالوں نے اس کے چہرہ اور جسم پر کوئی نقش نہ چھوڑا تھا۔ دوپٹہ لہراتی وہ آپ کمرے سے باہر نکلی۔ تو بچے امی جانی، امی جانی کی تکرار کرتے اس سے آ لپٹے۔ بچے گھنٹہ بھر بعد ہی گھر لوٹ آئے تھے۔ یوں کہ کسی بڑے آدمی کی وفات سے تعزیتی جلسہ کے بعد مدرسہ بند ہو گیا تھا۔ بچے بے حد خوش تھے۔ اور چڑیا گھر جانا چاہتے تھے۔

"ہم پہلے کافی پارٹی میں جائیں گے۔ پھر چڑیا گھر چلیں گے۔ اور پھر گھر آکر لڈو بانٹیں گے۔ آج میں بھی بہت خوش ہوں۔ میرے بچو۔!"

بچوں کو لئے وہ چمن کی طرف آئی تو چمن میں جمعدار سوکھے پتوں کے ساتھ گھر بھر کا کوڑا جمع کرکے آگ لگا رہا تھا۔ اس کوڑے میں آج کا اخبار بھی تھا جو اپنی تمام تر اچھی بری خبروں سمیت جل چکا تھا۔ دھواں اٹھ رہا تھا اور یہ دھواں فضا میں بلند ہو کر کہتا تھا۔۔۔۔

"تو تم آج بھی بہت خوش ہو۔ امیلہ بیگم۔ اور تم آج بھی لڈو بانٹو گی۔ میں جانتا تھا کہ تم ہمیں نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی ہو۔ لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسی پتھر دل ہو۔"

"پتھر دل"! لمحہ بھر کے لئے امیلہ نے پھیلے دھوئیں کی جانب دیکھا اور پھر پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ ایک آدمی کی موت سے شہر کی معمولات اور افراد کی زندگیوں پہ کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ شہر کے وہی ہنگامے تھے۔ ہاں ایک مدرسہ ضرور بند ہو گیا تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ اس مدرسہ پہ اس بڑے آدمی کے کچھ احسانات تھے۔

دوسروں پہ احسانات کے قابل وہ زندگی کا طویل عرصہ گذارنے کے بعد ہوا تھا۔ ورنہ ایک مدت تک محض معمولی کالم نگار تھا۔ جو اپنے کالموں میں کسی کے قصیدے لکھتا اور کسی کی ہجو۔ اس نے امیلہ کے خلاف بھی بے شمار کالم لکھے تھے۔ وہ امیلہ سے کہا کرتا تھا۔ کہ امیلہ جم خانہ کلب نہ جایا کرے۔ لیکن جب امیلہ پر اس کی باتوں کا رتی بھر بھی اثر نہ ہوا تو جم خانہ کلب کے خلاف ہی ایک کالم لکھ ڈالا۔ وہ امیلہ سے کہتا تھا کہ کبوتر، طوطے اور چڑیاں نہ پالا کرے۔ لیکن امیلہ نے ایک نہ سنی۔ اور شوقی صاحب نے امیلہ کے پرندوں کے خلاف ایک کالم لکھ مارا۔ ایک مرتبہ اس نے امیلہ سے دریافت کیا کہ امیلہ کے خاندان میں حق مہر کتنا رکھا جاتا ہے؟

چالیس ہزار!۔۔۔۔ امیلہ کا یہ جواب پاکر وہ چالیس ہزار حق مہر کے خلاف ہی لکھا کیا۔ یونہی لکھتا لکھتا وہ یتیم خانہ بالغان کا گرو گھنٹال بھی بن گیا۔ یتیم خانہ بالغان یتیم بچوں کے لئے نہ تھا۔ یتیم بچوں کی پرورش کے لئے شہر میں ہمدرد و مخیر حضرات کی کمی نہ تھی۔ یتیم خانہ بالغان تو ذہنی یتیموں کے لئے تھا جو اپنے یتیم خانہ میں جمع ہو کر ہر صبح یہ ترانہ گاتے تھے۔

ذہنوں کی فریاد سن لیجیے
کوئی عہدہ، مملکتِ غیر کا نیا دورہ دے دیجیے۔

یتیم خانہ بالغان دور دراز کے یتیم اذہان خریدنے میں بھی اپنا جواب نہ رکھتا تھا کہ شوقی اور شوقی کا دوست امیر خاں اس ادارہ کے زبردست ذہنی بلیک میلر تھے جنہوں نے جلسوں کے ذریعے بھی اپنی ساکھ بٹھا رکھی تھی۔

ایک مرتبہ ایک جلسے میں امیلہ بھی شریک ہوئی۔ اختتام پہ اس نے اپنی موٹر کو جلسہ گاہ کے باہر نہ پایا۔ جب کہ خالد نے ٹھیک وقت پہ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور یہاں کہیں فون بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ بچے اور بچے کی ملازمہ فاتو کے ہمراہ پریشان پریشان سی ادھر ادھر گھوم رہی تھی کہ ایک برقعہ پوش لڑکی نے وجہ پریشانی دریافت کی۔ اور پھر اسے ایک دفتر میں لے گئی۔ جہاں کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ امیلہ کو لوگوں سے مطلب؟ وہ گھر فون کرنے لگی تو معلوم ہوا کہ خالد اپنے چند دوستوں میں مصروف ہے امیلہ کو مزید بیس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔

"بیس منٹ! — اس واہیات دفتر میں —؟" امیلہ نے دفتر کا جائزہ لیا۔ دریچوں پر سبزی مائل سیاہ پردے لگے تھے۔ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ کچھ بدصورت اور فربہ اندام حضرات خاموش بیٹھے کبھی امیلہ اور کبھی برقعہ پوش انوری کو دیکھتے تھے اور امیلہ کو یہی محسوس ہوتا

تھا کہ کسی جاسوسی فلم کا کوئی منظر دیکھ رہی ہے۔ ابھی ابھی کوئی حادثہ رونما ہوگا۔ کوئی ہیرو نما شخص ہاتھوں میں پستول لئے وارد ہوگا اور دھائیں دھائیں کرتا امیلہ فاتو اور بچے کو بدمعاشوں کے چنگل سے بچائے گا۔ اور بدمعاشوں کی ساتھی وہ برقعہ پوش الوزی روایات کے عین مطابق فوراً ہیرو نما کے عشق میں مبتلا ہو جائے گی۔

لیکن افسوس ایسا کوئی حادثہ رونما نہ ہوا۔ محض فاتو بچے کو غسلخانے میں لے گئی اور چند لمحات بعد صاحبِ دفتر یعنی شوقی بھی فاتو کے پیچھے ہولیا فاتو کے پیچھے کسی مرد کا جانا کسی حادثہ سے کم نہ تھا۔ لہٰذا امیلہ بھی غسلخانہ میں پہنچی۔ شوقی فاتو سے کہہ رہا تھا۔

"اپنے کپڑے اتار دو۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔

اور فاتو — وہ بارہ سالہ نابالغہ کچھ نہ سمجھ کر جواب دے رہی تھی۔ یہ کپڑے تو بی بی جی نے بنا کر دیئے ہیں۔ بی بی جی سے کہو وہ تم کو بھی کپڑے بنا کر دیں گی۔

اے کاش! اس وقت کوئی ہیرو آجاتا اور اس شخص کا مزاج درست کر دیتا جو خود کو راجپوت کہتا تھا۔ لیکن راجپوتوں جیسی کوئی خصوصیات نہ رکھتا تھا۔ غصہ سے امیلہ نے شوقی کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا جو فاتو کے گریبان میں نہ جانے کیا ٹٹول رہا تھا۔؟

میں اس لڑکی سے کہہ رہا تھا، اگر بچے کے کپڑے خراب ہو گئے ہیں تو دھو کر یہاں انگیٹھی پر سکھا دے۔ کھسیانا سا ہو کر وہ کہا گیا۔ امیلہ نے بغور اُسے دیکھا۔ جلد تارکول کی مانند سیاہ۔ ہونٹ موٹے موٹے باہر کو لٹکتے ہوئے۔ کدو کی طرح چپٹا اور گول چہرہ۔ جس پہ ناک بڑے اہتمام سے پھیلی تھی۔ دھندلائی دھندلائی آنکھیں اور پیٹ باہر کو نکلا ہوا وہ جاسوسی فلموں کا کوئی سمگلر، کوکین فروش اور قاتل ہی محسوس ہوتا تھا۔ بچے اور فاتو کو سمیٹ کر ناراض ناراض سی وہ سڑک کنارے کھڑی ہو کر خالد کا انتظار کرنے لگی۔

گھر پہنچ کر بھی اُسے کافی دیر تک کوفت ہوتی رہی۔ لیکن جب خالد نے لطائف سنائے اور بوٹ کلب کا پروگرام بنایا تو کہیں جا کر اس کی طبیعت ٹھیک ہوئی۔

بوٹ کلب۔ جم خانہ کلب۔ کافی پارٹیوں اور سیاسی و ادبی جلسوں میں گہرا تضاد تھا۔ امیلہ کو کلبوں اور پارٹیوں تک ہی محدود رہنا چاہئے تھا۔ جبکہ اُسے سیاسی یا ادبی لیڈر بننے کا بھی قطعی شوق نہ تھا۔ لیکن بے چین طبیعت کا کیا کیجئے کہ چمکیلی بھڑکیلی سطح سے ہٹ کر وہ کھردری زمین پر بھی آجاتی تھی۔ لہٰذا اس کا کسی سیاسی یا ادبی جلسے میں جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ شہر میں آئے دن سیاسی جلسے ہوتے رہتے تھے۔ جہاں غنڈہ گردی بھی خوب ہوتی تھی اور پھول برسانے کے بجائے جوتوں سے لیڈر حضرات کو نوازا جاتا تھا۔ بعض اوقات پولیس لاٹھی چارج پر بھی مجبور ہو جاتی کہ یہ تمام باتیں ایشیائی شہروں کی زندگی کا جزو تھیں۔ تو ایسے ہی ایک جلسے سے بھاگ کر پناہ لینے کے لئے امیلہ کو پھر ایک مرتبہ شوقی کے دفتر آنا پڑا جہاں الوزی بھی موجود تھی۔ شوقی کا دفتر اس عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ جہاں جلسے ہوتے تھے۔ شوقی اپنے دفتر میں بے حد پرجوش اور مسرور نظر آتا تھا وہ کسی مغربی مملکت میں اپنی علمی و ادبی شہرت کے ڈنکے بجا کر اور وہاں کی لڑکیوں سے اپنی تنہائی کا مداوا کر کے چلا آرہا تھا، اور اپنے چھ روزہ قیامِ مغرب کے بعد بے شمار رومانی قصے ہمراہ لایا تھا۔ اور خود کو رومیو یا ڈان جوان قسم کی کوئی مخلوق تصور کر رہا تھا۔ شوقی کے مکروہ صورت حواری موالی بھی وہیں بیٹھے زور و شور سے شوقی کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ لیکن الوزی خاموش تھی اس کی بڑی بڑی آنکھیں متورم تھیں سانولے چہرے پہ چمک کے بجائے زردی و ویرانی پھیلی تھی۔ وہ بے حد اداس اور پریشان تھی۔ غالباً اُسے شوقی کا تذکرہ حسینانِ مغرب پسند نہ آیا تھا۔

امیلہ وہاں بیٹھی اُسی کے متعلق سوچا کی۔ اُسے علم بھی نہ ہوا کہ کب تمام لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔ دفتر میں محض شوقی، الوزی اور امیلہ رہ گئے تھے۔ بچہ اور فاتو باہر برآمدے میں کھیل رہے تھے۔ شوقی کی نگاہیں امیلہ پر یوں جمی تھیں گویا نگاہوں نگاہوں میں ہی اس کی جوانی کا تمام رس پی جائے گا۔ امیلہ کو الجھن ہونے لگی اور کرسی سے اٹھ کر دریچی میں آگئی۔

آپ اٹھ کیوں گئیں۔ یہاں آیئے۔ میرے سامنے بیٹھئے اس روز آپ آئیں تو لوگ یہاں موجود تھے۔ آج آپ آئیں تو آج بھی لوگ موجود تھے اور ہم کسی طور پر مل نہ بیٹھے۔ حالِ دل نہ کہہ سکے۔ آیئے یہاں آیئے۔ میرے دل میں آ بیٹھے۔۔۔ شوقی اپنی واہیات بھونڈی آواز میں کہتا گیا۔ شوقی کی آواز میں بے قابو جذبات تھے۔ اور نگاہوں میں شرافت، شفقت اور نرمی کے بجائے وہ چمک تھی جو اشتہا انگیز کھانا سامنے دیکھ کر ایک کتے کی نگاہوں میں

اجاتی ہے۔ امیلہ گھبرا گئی۔ لیکن انوری مسکرا دی

" آپ کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں یہ"، انوری نے طنزیہ کہا کہ مجھے دیکھ
ر ــــ لیکن میں تو ــــ امیلہ یہ کہتے کہتے رک گئی کہ وہ تو اپنے خالہ زاد بھائی خالد
ی بیوی ہے۔ اور ایک سالہ بچے کی ماں ہے۔ وہ بچہ جسے شوقی اس کا بھانجہ
بھتیجہ تصور کرتا تھا خود امیلہ کا ہے۔ امیلہ کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا اور
امیلہ سے قربت کی تمنا نے شوقی کے لئے ہذیان کی صورت اختیار کرلی شوقی
کے الفاظ سمجھ نہ آتے تھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا کوئی جنگلی شہر کی زبان
بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پہلی نگاہ میں شوقی کوئی جنگلی مخلوق محسوس ہوتا
تھا۔ اس کی زبان سے بار بار میرا گریبان تیرا گریبان کے الفاظ نکلتے تھے ۔
ا ئبا بچپن میں اسے ماں کا دودھ نصیب نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے ہر عورت کا
ریبان یاد آتا تھا۔ امیلہ تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔ اسی لمحہ برآمدے
ں امیلہ کا بچہ رونے لگا۔ بچہ گھر جانا چاہتا تھا۔ شوقی بھی امیلہ کے گھر کا راستہ
وں نہ دیکھتا ؟

خالد کے مزید انتظار کے بجائے شوقی کی گاڑی میں امیلہ گھر آگئی اور
ں شوقی نے اس کے گھر کا راستہ بھی دیکھ لیا۔ وقتاً فوقتاً بہانے تراش
س کے گھر آنے لگا لیکن وہ یہ ماننے کو اب بھی تیار نہ تھا کہ امیلہ ایک بچے
ماں ہے۔

امیلہ کو اس کے ماننے نہ ماننے کی چنداں پروا نہ تھی۔ وہ اپنے گھر اور
، دُنیا سے مطمئن تھی، اور ساس نندوں، دوست احباب اور گھرداری میں
ی مصروف تھی۔

اس کی ایک مصروفیت داستانیں لکھنا بھی تھا۔ افسانوں کی صورت
یا ناول کی صورت میں، ہر صورت میں وہ لکھتی تھی۔ ناول نگاری امیلہ کے
شہر اور دیگر شہروں میں باقاعدہ فن کی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ گھریلو خواتین اپنے
شوہر۔ جانور، پرندے اور ملازم پالنے کے علاوہ ناول نگاری کا روگ
پالتی تھیں۔ جو مختلف ناموں سے ایک ہی سانچے میں ڈھل کر یوں باہر نکلتے
۔ گویا گہرے اور چھچھورے رنگوں کا کوئی کپڑا گزوں کے حساب سے تیار ہوتا چلا
ئے۔ لیکن یہی ناول سیاسی مصلحتوں کی بنا پر انعامات بھی حاصل کرتے
، مثلاً نگری میری کب تک یونہی خزاں آلود رہے گی" یا" آبلے پڑ گئے
وں میں کپڑے دھو دھو کر" یا" خزاں کی تلاش میں ویران ہوگئی ہیں بہاریں"

وغیرہ وغیرہ

ایسی کتابوں پر ہی کثیر رقم کے انعامات ملتے تھے جو شوقی اور اُسکے دوست امیر خاں کی سدا بہار بادشاہت کے لئے یتیم خانہ بالغان کے آئندہ الیکشن کے واسطے ووٹ حاصل کرتے تھے الیکشن کے مواقع پر وہ دونوں عموماً وہ لباس پہنتے تھے۔ جسے پہن کر انہوں نے کبھی کینیڈی کے ساتھ کھانا تناول فرمایا تھا کبھی ملکہ ایلزبتھ کے ساتھ اور کبھی کوسی گن کے ساتھ۔

شوقی کو امیلہ کی ناول نگاری کا علم ہوا، تو امیر خاں سے مشورہ کیا کہ ایسی لڑکی سے کس قسم کا مطلب نکالا جا سکتا ہے ؟ یتیم خانہ بالغان کی رکنیت اختیار کرنے پر وہ رضامند نہ تھی، کہ ابن الوقتی اُس کے بس کا روگ نہ تھا۔ لہٰذا امیر خاں نے یہی مشورہ دیا کہ امیلہ سے بیاہ رچا لو۔ مفت میں امیلہ کو انعام کیوں دیا جائے ؟ بھلا بغیر قیمت وصول کئے، شوقی اور امیر خاں نے آج تک کسی کا معمولی سا کام بھی کیا ہے ؟

ناول امیلہ اپنے طور ایک ناشر کو دینے کی تیاری کر رہی تھی کہ شوقی نے لے کر اپنے کسی ناشر دوست کو دے دیا۔ امیلہ چیختی چلاتی رہ گئی لیکن شوقی تو امیلہ کو مرعوب اور زیر احسان کرنے کی فکر میں تھا اسی لئے یتیم خانہ بالغان کے انعامی مقابلہ کی تاریخیں بھی بڑھاتا چلا گیا۔ لیکن ہوا وہی ۔جیسا کہ امیلہ کو امید تھی یعنی ناول کسی صورت شائع ہی نہیں ہوا اور آخرش امیلہ نے اپنے ہی ناشر کو دے دیا۔

اور ان جھگڑوں میں شوقی نے بہت زیادہ پر پھیلائے اور اس کا اظہار دلچسپی آگ کی طرح شوقی اور امیلہ کے خاندانوں میں پھیل گیا۔ شوقی کے اہل خانہ خوش تھے کہ اچھی لڑکی گھر آئے گی۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ امیلہ کسی کی بیوی اور کسی کی ماں ہے۔

امیلہ نے کہرام مچا دیا کہ اس شوقی کا دماغ خراب ہوگیا تھا یا امیلہ کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ آخر کیا سوچ سمجھ کر اظہار دلچسپی کیا تھا ؟ امیلہ اُس خاندان کی فرد تھی جو سات پشتوں تک حسب نسب دیکھتا تھا۔ کوئی جانور بھی خریدتا تھا تو پورا شجرہ نسب دریافت کرتا تھا۔ اس خاندان کے اپنے کچھ اصول تھے۔ جن میں سچائی، شرافت اور خودداری کو فوقیت حاصل تھی۔ اس خاندان نے جس ماحول میں زندگی کو آگے بڑھایا تھا وہاں تحریکیں تھیں، اصول تھے اور ضمیر کی پکار تھی۔ لیکن شوقی اور امیر خاں کے لئے یہ باتیں اور یہ اصول کچھ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اُنہیں تو ان باتوں پہ ہنسی آتی تھی اور وہ لوگ بیوقوف نظر آتے تھے۔ جو اصولوں اور شرافت و انسانیت کی باتیں کرتے تھے۔ یہ دونوں ہی خوشامدی، خوشامد پسند و پرست انسان تھے۔ جو ہر قسم کی سیاسی ہواؤں کا رُخ دیکھ کر چلتے تھے ان کا کوئی پس منظر۔ ماضی کی کوئی روایات نہ تھیں وہ جس ماحول و

معاشرہ میں زندگی کو آگے بڑھا رہے تھے۔ اس میں ہر انسان کی صبح حرام کاری سے شروع ہوتی تھی۔ وہاں ایک معمولی قانونی محافظ یہ تہیہ کر کے گھر سے نکلتا تھا کہ آج دن بھر میں بمن چار سو کی رقم لے کر ضرور گھر آئے گا۔ شہر چونکہ حادثات کا شہر تھا۔ انسانوں، جانوروں اور سواری گاڑی کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ سڑکیں جا بجا ٹوٹی پھوٹی۔ خندق نمائیں اور شہر کو بھنبھور یا موہن جو داڑو کی طرح آثار قدیمہ کا درجہ دینا چاہتی تھیں اس لئے حادثات بھی اکثر ہوتے تھے اور ہر حادثہ میں مجرم دو تین سو روپے دے کر چھٹکارہ حاصل کر لیتا۔ اگر کسی روز شہر میں کوئی حادثہ نہ ہوتا تو قانونی محافظ خود ہی حادثہ پیدا کر دیتا۔ جس کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ کسی جوان عورت کو کسی دوکان میں داخل کر کے دوکان دار پر بدکاری کا الزام لگا کر رقم وصول کی جائے۔

وہاں تو ایک کلرک بھی دفتر جاتے ہوئے رستہ بھر موٹر، بنگلا اور ریڈیو کے لئے رقم جمع کرنے کا حساب کتاب کرتا جاتا تھا۔ ایک تاجر گھر سے نکلتا تھا تو یہ سوچ کر کہ قانونی طور پر حاصل کردہ لائسنس پہ مال منگوایا ہے، اُسے چھڑانے کے لئے اتنی رقم دینا پڑے گی اور فلاں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے فلاں کلب میں شراب پلانے کے لئے اتنی رقم خرچ ہوگی اور وہاں ایک فقیر بھی گونگا بہرا اور اپاہج بن کر دن بھر میں دس بیس کما لیتا تھا۔

تو ایسے ماحول کے ایک بدکردار شخص سے امیلہ کیسے نبھا سکتی تھی۔ وہ بھی بچے، شوہر اور رستا بستا گھر چھوڑ کر!

امیلہ پہلے تو شوقی کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر ڈانٹ ڈپٹ پہ اُتری۔ اور پھر شوقی سے لاتعلق ہو کر قصّے کہانیوں میں مصروف ہو گئی۔ امیلہ کی پہلی کہانی کسی پرچے میں آئی تو شوقی اترایا اترایا پھرنے لگا ــــ کہ دیکھو لوگو! امیلہ نے اس کے عشق میں مبتلا ہو کر یہ کہانی لکھی ہے۔

امیلہ کی دوسری کہانی شائع ہوئی تب بھی شوقی بیٹھا من گھڑت داستانیں ترتیب دیتا رہا۔

عشق۔ ہا۔ امیلہ تک یہ باتیں پہنچیں تو بے نیازی سے ہنس دی۔ شادی سے پیشتر عشق کس قدر بے معنی اور گھٹیا بات تھی اور شادی کے بعد شوہر کے بجائے ایک اجنبی مرد سے عشق کرنا یوں ہی تھا جیسے کوئی بوسیدہ جوتے میں اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرے۔ امیلہ نے شوقی کو یہی بات یاد دلائی کہ شوقی درحقیقت ایک پھٹے جوتے کی مانند ہے۔

امیلہ کی تیسری اور چوتھی کہانیاں آئیں تو شوقی کو بھی امیلہ سے اپنی تمام تر ناکامیوں اور حسرتوں کا انتقام لینے کی ایک صورت نظر آ گئی۔ اُس نے فرض کر لیا کہ یہ تیز و تند کہانیاں بھی اسی پہ لکھی گئی ہیں۔ ان کہانیوں کے ذریعہ امیلہ کے خلاف یتیم خانہ بالغاں میں ایک فضا ہموار کرنے کے لئے، وہ امیلہ پر برس پڑا۔

امیلہ تم جس آگ میں بھڑک رہی ہو، ہم اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرد کر دیں گے۔ ہم تمہیں ایسا ذلیل و خوار کریں گے کہ تم لکھنے کے قابل نہ رہو گی۔ ہم تمہاری تحریریں ضبط کروا دیں گے۔ ہم تمہیں ہر طرف یوں بدنام کر دیں گے کہ تم سر اٹھانے کے قابل نہ رہو گی۔

لیکن شوقی زیادہ سے زیادہ یہی کر سکا کہ امیلہ کی کتاب انعامی مقابلہ سے خارج کرا دی اور پھر مونچھوں پہ تاؤ دے دے کے امیر خاں سے کہا۔

"دیکھو۔ امیر خاں۔ اب میں بھی دیکھتا ہوں یہ امیلہ کیوں کر لکھتی ہے؟ ایسا انتقام لیا ہے، ایسی شکست دی ہے کہ کبھی سر اٹھانے کی ہمت نہ کرے گی۔ میں خالق ہوں۔ میں خدا ہوں۔ میری قوت مشرق و مغرب تک پھیلی ہے۔ لوگ میرے آگے سر جھکاتے اور میرے قدم چومتے ہیں۔ میں عزت بھی دیتا ہوں میں ذلت بھی! اب میں بھی دیکھوں گا کہ کون پرچہ امیلہ کی کہانیاں اور کون ناشر اسکی کوئی کتاب چھاپتا ہے۔

ہاں گندے کیچوو۔ مجھے تمہاری انتقامی کارروائیوں کی نہ پہلے پروا تھی نہ اب ہے۔ میں یتیم خانہ بالغاں سے پہلے بھی لاتعلق تھی اور آئندہ بھی لاتعلق رہوں گی۔ تم مکروہ صورت بڈھے۔ نہ کسی کی جوانی برداشت کر سکے۔ ہو نہ شرافت۔ تم کسی کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکے۔ اپنی جوانی کا ہر ہر لمحہ معایب اور تنگ و دو میں گزار کر آج اس بڑھاپے میں تم کسی قابل بنے ہو۔ جبکہ ہماری جوانی کو ہر آسائش مہیا ہے تو تم ہمیں برداشت نہیں کر سکتے ہو ـــــ

لیکن آج جو تم ہر طرف چھائے نظر آتے ہو۔ کل تمہارا کوئی نام لیوا بھی نہ رہے گا۔ لوگ تمہیں ابن الوقت کے نام سے پکاریں گے۔ اور میری لعنت، اس عہد کی امیلہ کی لعنت قبر کی گہرائیوں تک تمہارا پیچھا کرے گی میں تمہارا ضمیر اور شعور ہوں۔ تم مجھے کچلنا چاہتے ہو۔ لیکن میری آواز ہمیشہ تمہیں تنگ کرتی رہے گی۔ تم زندگی کو اس رُخ پہ لے جانا چاہتے ہو۔ جہاں نرم و نازک احساسات فنا ہو جاتے ہیں اور محض ایک جذبۂ حیوانی رہ جاتا ہے میری آواز تمہیں خیر اور حسن کی جانب کھینچتی ہے۔ اور یہی تمہیں ناگوار ہے۔

سرجنک کرامیلا اپنے نئے بچے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ زمانہ خود کو ان بچوں کے لیے ہموار کر رہا تھا۔ اُن بڈھوں کے لئے نہیں جو نئی نسل کے سامنے دیوار چین بن کر کھڑے تھے۔

لیکن شوقی اور امیر خاں بڑی اونچی پرواز کر رہے تھے وہ سمجھتے تھے کہ امیلہ کا غرور توڑ دیا ہے۔ امیلہ کے لیے آگے بڑھنے کے تمام راستے مسدود کر دئے ہیں جب کہ امیلہ اب بھی اسی مقام پر تھی جہاں پہلے تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پھل کسی روز ضرور نیچے آگرے گا لیکن یہاں کشش ثقل بھی رائیگاں گئی۔ شکست امیلہ کو نہیں شوقی کو ہوئی تھی۔ اس لئے امیلہ نے مبارکباد دینا ضروری سمجھا۔

کس بات کی مبارک باد دے رہی ہو؟ امیلہ کے کانوں میں آواز آئی رسیور ہاتھ میں تھا۔ امیلہ لپٹی تو الوری کو سامنے پایا الوری جو اچانک غائب ہوگئی تھی۔ اب گود میں بچہ لئے کھڑی تھی کیا الوری کی شادی ہوگئی تھی؟

"شوقی کو اس بچے کی مبارک باد دو"، الوری نے گود کے بچے کی جانب اشارہ کیا۔ لیکن شوقی کا اس بچے سے تعلق؟ فون بند کر کے امیلہ نے دریافت کیا۔ الوری کا رونا یہی تھا کہ شوقی اُسے اس حالت پہ پہنچا کر شادی سے منکر ہو رہا ہے شوقی جس طرح امیلہ کے لئے کہتا پھرتا تھا ـــ امیلہ میرے غم میں بے حال ہو رہی ہے۔ یار و کسی طرح امیلہ کو میرے گھر لے آؤ" اسی طرح وہ الوری کے لئے کہتا پھرتا تھا کہ ـــ اصل گنہ گار تو الوری ہے۔ الوری خود مجھے ترغیب گناہ دیتی تھی۔

بھلا کوئی شریف لڑکی ایسی بات کر سکتی تھی جبکہ شوقی نے خود اپنا دفتر ایک تفریح گاہ بنا رکھا تھا جب کہ وہ خود ہر لڑکی کو تنہا لمحات میں آنے کی دعوت دیتا تھا۔ الوری اس کی باتوں میں آگئی۔ شوقی نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ اور شادی کی ایک شرط رکھی۔ الوری نے تکمیل شرط کی۔ تو الوری پر بدکاری کا الزام لگا کر بے نیاز ہو گیا۔

شوقی نے اپنی کمینگی کا تجربہ الوری کو بھی دیا اور امیلہ کو بھی۔ الوری شوقی نظر انداز کر گیا۔ لیکن امیلہ ایک شعور۔ ایک سچائی ہے اور ایک کھری آواز برلے تنگ کر رہی تھی۔ اسی لیے امیلہ ہنس کر کہتی تھی

" الوری ـــــ گو ہم مسموم فضا میں سانس لئے رہے ہیں اور ہمارے چاروں طرف بڑے لوگ عفریت کی طرح پھیلے ہیں۔ لیکن ہمارا وقت بھی جلد ہی آئے گا۔ آخر اکیلا کبوتر اتنی اونچی پرواز کب تک کر سکتا ہے؟ کبھی تو پَر ٹوٹیں گے۔

اکیلا کبوتر: الوری متعجب ہوئی۔

ہاں اکیلا کبوتر: کہتی کہتی امیلہ کبوتروں کے کابک کی طرف آئی۔ اور ایک جنگلی سرمئی کبوتر نکال کر فضا میں اڑا دیا۔ لیکن اڑنے کے بجائے کبوتر وہیں کابک پہ بیٹھ گیا۔

امیلہ نے بڑے بچے کے لیے کئی شیرازی اور لقا کبوتر پال رکھے تھے۔ ایک جوڑا سرمئی رنگ کے جنگلی کبوتر کا بھی تھا جو اچھوتوں کی مانند سب سے الگ تھلگ رہتا الگ دانہ چگتا۔ الگ پرواز کرتا۔ ایک روز ایک جنگلی کبوتر پرواز کرتا کرتا بلندیوں تک جا پہنچا اور زمین پر نہ اُترا۔ یہ تنہا کبوتر دوست کی جدائی میں اپنی پرواز بھی بھول گیا تھا اور چپ چاپ کابک پہ بیٹھا نیلی وسعتوں کو دیکھا کرتا۔

" دیکھا تم نے الوری ـــ یہ کبوتر اپنے پر توڑ چکا ہے۔ اسی طرح ایک روز شوقی بھی بے بس ہو جائے گا۔ تم اس کا حیوانی جذبہ اور احساس شر تھیں۔ جس نے ایک نئی برائی کو جنم دیا، ناجائز طور پر! لیکن میں اس جذبہ حسن اور احساس خیر ہوں۔ تم ختم ہو سکتی ہو۔ لیکن میں ابدی ہوں۔ شوقی کے حیوانی جذبوں کی تکمیل ہوگئی تو تمہیں نظر انداز کر دیا۔ اور اب اس کے ہر طرف میں ہی میں ہوں جب میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں گی۔ تو وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ سمجھیں تم۔

" مجھ سے ہمدردی کے بجائے شوقی کا ساتھ دے رہی ہو۔ شوقی کی طرح تمام الزام مجھ پر دھر رہی ہو! الوری چیختی چلاتی چلی گئی اور دوبارہ امیلہ کو نظر آئی۔

اور ایک روز امیلہ اور الوری کی طرح امیر خاں بھی شوقی کا ساتھ چھوڑ گیا شہر کے ایک مے خانہ میں مے سے شغل کرتے ہوئے امیر خاں کے دماغ کی رگ بے ایمان کی قبر کی مانند پھٹ گئی۔ وہ جام سمیت عرش سے فرش پہ آگرا۔

جب امیلہ تک یہ خبر پہنچی تو شوقی کو پیغام دیا کہ الوری کی طرح امیر خاں بھی گیا گویا شوقی کے جسم کا ایک اور فاسد حصہ کٹ گیا۔ کتنی خوشی کی بات ہے! لیکن زیادہ خوشی تو اس روز ہوگی جب وہ فاسد حصہ بھی کٹ جائے گا جس کا نام شوقی ہے اور اس روز امیلہ پانچ سیر لڈو بانٹے گی۔

امیلہ کا یہ پیغام اس کی کھری اور صداقت و خیر کی آواز شوقی کو برابر تنگ کرتی رہی اور وہ تنہا کبوتر کی مانند وسعتوں میں ڈولتا پھرا اور آج ـــ آج کا اخبار اس کی موت کی خبر دے رہا تھا۔

موت کو وہ شکست نہ دے سکا۔

رئیس مینائی

شاکر ناطقی

ایک تاثر


رئیس مینائی

درسفالیں کوزۂ رندانِ بخواری منگرید
سالہا شد خدمت جامِ جہاں بیں کردہ اند

ٹھیک سن تو مجھے یاد نہیں غالباً چودہ پندرہ سال کی بات ہے جب میرے والد مرحوم حضرت نفیسؔ بقیدِ حیات تھے میں نے علامہ موصوف کو سب سے پہلے کاتب عبدالعزیز مرحوم کے مطبع کوثر پریس میں دیکھا تھا مولانا کی باوقار اور سنجیدہ ومتین شخصیت کا جو تاثر اس وقت میرے دل و دماغ پر ہوا وہ آج تک قائم ہے اگرچہ زمانے کے فاصلے نے اس واقعہ پر چودہ پندرہ برس کی دبیز چادریں چڑھادی ہیں۔

اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ ۱۹۵۰ء میں میرے والد مرحوم اس دنیا سے سدھار گئے۔ آخر برادر محترم سلیم مینائی مجھے اپنے ساتھ گہوارۂ علم و ادب جامعہ دارالسلام عمرآباد لے گئے۔ دو چار سال میں نے بھائی صاحب کے زیر سایہ اپنی تعلیمی زندگی کے دن گذارے۔ ایک سال جامعہ کے سینیر طلبا نے مشاعرے کا پروگرام بنایا اور صدارت کے لئے انگریزی کے پروفیسر حضرت عزیز مہدی بخاری مرحوم کو آمادہ کیا جو اردو اور فارسی کا بڑا سلجھا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ اقبال کا ایک مصرع

اخوت کی جہاں گیری محبت کی فراوانی

'طرح' کے لئے منتخب کیا گیا۔ میں نے تک بندی کی اور اصلاح کے لئے علامہ موصوف کے پاس لے گیا۔ مولانا نے پوری غزل پڑھی اور فرمایا "اس میں شاعری کم اور مذہبیت زیادہ ہے۔ البتہ ایک شعر کی مولانا نے جی کھول کر داد دی۔

ع۔ ذرا محسوس تو کر اپنے سجدوں میں کمی کیا ہے: ہوا جاتا ہے کیوں داغ جبیں ننگ مسلمانی

انہوں نے میری پوری غزل قلمزد کرکے ایک نئی غزل سات شعر کی مولانا نے مجھے کہہ کر دی۔ مجھے اس کے قبول کرنے میں تامل ہوا۔ لیکن وقت کی کمی کا احساس کرتے ہوئے چپ چاپ غزل لے آیا۔ رات کو مشاعرے میں میں نے غزل پڑھی جو کامیاب رہی۔ اس مشاعرے میں علامہ موصوف خود بھی شریک تھے۔

اس کے بعد مجھے مولانا کی جلوت وخلوت میں رہنے کے کافی مواقع ملے۔ میں نے درسی کتابوں کے علاوہ مولانا سے ادبی وعلمی مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔ ان کی سوچ کی تہوں کو جانچا پرکھا۔ اُن کے ساتھ رہا، پھرا، گھوما اور اُن کی ایک ایک بات کو حرزِ جان بنالیا۔

افہام وتفہیم میں مولانا کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا اور اسی دشت کی سیاحی میں انہوں نے اپنی عمر عزیز کا نصف حصہ صرف کردیا تھا۔

مولانا کا نظریہ ادب یوں تو قدامت پسند ہے مگر چونکہ وہ حضرت ناطق گلاؤٹھوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ اور ناطق داغؔ کے خوشہ چیں۔ مولانا کی زبان میں ایک رکھ رکھاؤ سلیقہ دھیما پن اور وضعداری ہے۔ اگرچہ اُن کی شاعری کا رنگ خالص متصوفانہ ہے جس میں مسئلہ وحدت الوجود کے رموز واسرار اور حقائق و بصائر کی ترجمانی ہے۔ لیکن جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت وہ صرف ایک رند لاابالی تھے اور بادۂ تصوف سے اپنے کام و دہن کو ابھی آشنا کر رہے تھے۔

مولانا ایک مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے جو کسی کے درپۂ آزار نہیں رہتے۔ اُن کی طبیعت میں ایک قلندرانہ بانکپن تھا اور اقبال کے مردِ قلندر کی طرح ہر حال میں اپنی کلاہ کج رکھنا چاہتے تھے۔

وہ کسی سے مرعوب ہونا گویا جانتے ہی نہیں اور بعض ملاؤں کی طرح اپنے پندارِ علم و فن سے کسی کو مرعوب کرنا بھی نہیں چاہتے۔ بلکہ اپنی جامع صفات و کمالات شخصیت سے دوسروں کو اپنا حلقہ بگوش بنالیتے ہیں۔

مولانا عصری تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھے اور ہماری شاعری نے اپنا جو چولا بدلا ہے اُس کی انہیں پوری سُن گن تھی۔

مولانا ایک صوفی منش آدمی ہیں اس لئے ان کا مسلک صلحِ کل اور انسانیت پرستی ہے۔ صوفیا چونکہ بادۂ تصوف سے سرشار رہتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک آئین و مراسم کا اختلاف کوئی معنی نہیں رکھتا۔

مولانا کی شاعری میں غالب کی طرح عارفانہ مضامین صوفیانہ حقیقت نگاری خدا ترسی اور بندگیٔ خداوندی کے اسرار و رموز اور عشق و عرفان کی جھلک اور پرتو ہے۔ مولانا کا کلام اہلِ حال و اہلِ قال دونوں کے لئے دعوتِ نظر دیتا ہے۔

تصوف کی کوئی منطقی تعریف نہیں کی جاسکتی لیکن صوفیہ کے حالات سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ "تصوف قلبِ انسانی کی ایک کیفیت کا نام ہے تصوف و باطنیت میں ذوق و وجدان اور محبت و شیفتگی مرکزی حیثیت رکھتے ہیں"

سالکِ راہِ محبت دنیا میں رہنے کے باوجود اپنے وجود کو دنیا سے علیحدہ دیکھتا ہے ؎

ہم بہ عالم ز اہلِ عالم برکنار افتادہ ام
چوں امام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

مولانا شاکر فرماتے ہیں ؎

ہوں سب میں اور سب سے جدا اور سب سے بے نیاز
میں ہوں بھرے جہاں میں تنہا کہیں جسے

صوفی عالمِ کثرت میں وحدت ہی وحدت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کو تمام صوری اختلافات میں ایک معنوی توازن اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات کی کیفیت عقل و استدلال سے دوسروں کو سمجھا نہیں سکتا۔

عرفانِ نفس معرفتِ حق کا ذریعہ ہے۔ لیکن عرفانِ نفس ممکن نہ ہو تو فنائے نفس کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ بہر حال ذریعہ معرفت نفس ہی ہے علامہ موصوف فرماتے ہیں ؎

وہ تابِ حسن اور یہ میری حیرت نگاہ
اور اک حجابِ دیدۂ بینا کہیں جسے

بزمِ نظارہ میں میں کیا ہوں سراپا حیرت
سخت حیراں ہے مرا دیدۂ حیراں مجھ سے

کل ان کے سامنے میری صورت سوال تھی
یعنی وہ تھا سکوت تقاضا کہیں جسے

عالمِ حیرت کی لذتیں علم کی لذتوں سے بلند ہیں۔ مشاہدۂ قدرت میں دنیائے محسوسات کی حدود سے گذر جاتا ہے۔ حیرت آئینہ کی صفت ہے انسان محوِ حیرت ہو کر خود آئینہ بن جاتا ہے۔ چناں چہ منصور بن حلاج کا انا الحق کہنا اسی عالمِ حیرت سے منسوب کیا گیا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

کیا کہوں عالمِ ہستی کا معمہ کیا ہے
میں ہی اک راز ہوں جو راز ہے پنہاں مجھ میں
جبتک مرا وجود اسیرِ قیود تھا
میں جاہلِ حقیقت و سرِ وجود تھا

کائنات عین ذات ہے اور انسان چوں کہ بساطِ کائنات پر سب سے افضل و اشرف ہے اس لئے وہ ایک مخصوص عظمت کا مالک ہے۔ ہنگامۂ کائنات کی رونق اسی کے دم سے ہے۔ لیکن ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب وہ خود سراپا راز بن جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

کونین کی دولت میں الفت ہی پسند آئی
قسمت کی وہی شے تھی جو ہم نے اٹھالی ہے

رفعتِ احساس اور وسعتِ تخیل آپ کے کلام کا بنیادی جوہر ہے اور تخیل کا انداز نہایت لطیف و نازک ہے اشعار میں جا بجا فکر و فلسفہ اور تصوف و طریقت کی سرحدیں ملتی جلتی نظر آتی ہیں روایات کی حد درجہ پابندی کے باوجود مضامین اسلوب اور غزل کے تیور میں فکر و فن تنوع گہرائی اور گیرائی ہے ان کی غزلوں میں محبت کی روشنی بھی ملتی ہے اور محبوب کی کم سنی بھی حسن کی تابش بھی ہے اور عشق کی سرفروشی بھی حکمت و عظمت بھی ہے اور عبرت و بصیرت بھی چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ملتی ہے بڑی راحت اب خاک نشینی میں
میں نے تو طبیعت ہی مٹی کی بنالی ہے

ہے اہلِ بزم پہ بھی اک انداز نازِ حسن
آنسو کہاں سے شمعِ فروزاں میں آگئے

اس ربطِ باہمی کا نتیجہ نہ پوچھیے
ہم پی گئے شراب ہمیں پی گئی شراب

سُلگ اُٹھے نہ کہیں سوزِ غم سے دلِ اے شوق
بہت چراغ کی لَو کو بڑھا دیا میں نے

مولانا کا اسمِ گرامی غضنفر حسین تخلص شاکرؔ اور اہلِ نوائط میں سے تھے میسور کے باشندے تھے۔ یہ وہی میسور ہے جس کا تذکرہ تاریخ جنوبی ہند اور تاریخ نوابان آرکاٹ میں ملتا ہے۔

مولانا کی تعلیم مدرسۂ لطیفیہ حضرت مکان ویلور میں ہوئی جس کے موسس شاہ عبداللطیف ہیں اور جس کے احاطے میں مولانا قربیؔ اور حضرت ذوقیؔ جیسے اکابر علم وفن اور فاضل شعر وادب آسودۂ خاک ہیں اور جن کے علم وفن کی کرنیں مطلع جنوبی ہند کو منور کر رہی ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے ان بزرگوں کا تذکرہ اپنی کتاب "مدراس میں اُردو" میں کیا ہے۔ اسی درسگاہ سے مولانا شاکرؔ نے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔ علوم ظاہریہ بھی اور علوم باطنیہ بھی اور ویسے بھی مولانا سلسلہ ارادت وطریقت میں حضرت شاہ حبیب اللہ چشتیؔ سے بیعت ہو چکے ہیں مولانا شاکرؔ کے ہم درس ساتھیوں میں مولانا شرقیؔ۔ مولانا نذیر الدین احمد شریف اور کمالی ویلوری بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

مدرسۂ لطیفیہ کی فراغت کے بعد مولانا عمر آباد تشریف لائے اس چھوٹے سے خطّے کو ایک علم نواز ادب پرور اور مخیّر ہستی کاکا محمد عمر نے اپنے نام نامی سے منسوب کر کے بسایا اور اسی خطہ میں جامعہ دارالسلام کے نام سے ایک دینی وعلمی درس گاہ کی نیو رکھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بالکل قلیل عرصہ میں یہ ادارہ کافی ترقی کر گیا اور جس کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے فرمایا تھا کہ یہ جنوبی ہند کا ندوۃ العلماء ہے۔ کاکا صاحب نے مولانا کو بھی موقع دیا کہ وہ اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو بروئے کار لائیں۔ مولانا نے اپنے خونِ جگر سے جامعہ کے در و بام کو نکھارا اور سنوارا یہاں تک کہ جامعہ مولانا کی شخصیت کا اہم جزو بن گیا۔ کاکا صاحب کی موت کے بعد جامعہ کے انتظامی امور ان کے لائق فرزند خان بہادر کاکا محمد اسمٰعیل صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حصے میں آئے۔ خان بہادر صاحب کی بے لوث محبت اور خلوص نے جامعہ کی خدمت کے بہانے کئی عالموں کی قدر افزائی فرمائی۔ اس وقت جامعہ کے پرنسپل شہر مدراس کے ایک جید عالم مولانا فضل اللہ صاحب تھے۔ ان کے رحلت کر جانے کے بعد کاکا صاحب نے مولانا شاکرؔ کو پرنسپل بنا دیا۔ خدا کاکا صاحب کی تربت پر شبنم افشانی کرے کہ اس کا خلوص علم پروری، ادب نوازی اور قدر افزائی حسنات جاریہ کی شکل میں ہند و بیرونِ ہند کے کئی تشنگانِ علم وآگہی کو سیراب کر رہا ہے۔

مولانا شاکرؔ نے اپنے دورِ نظامت میں کئی اصلاحات کیں اور ایک معیاری اور مستند ماہنامہ "مصحف" کے نام سے جاری کیا جس میں ہند و بیرونِ ہند کے کئی نامی گرامی شعراء وادبا کی نگارشات چھپتی تھیں۔ بعض ناگزیر حالات کی بنا پر رسالے نے چند ہی برسوں میں دم توڑ دیا۔ یہاں تک کہ مصحف پریس کے نام سے ایک مطبع کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ مولانا کو افکار وآلام نے کافی مضمحل بنا دیا تھا۔ لہٰذا مولانا نے اپنے عہدہ نظامت سے استعفیٰ دیدیا۔ اب جامعہ کے پرنسپل، شیخ الحدیث، فاضل گرامی، افضل العلماء مولانا عبدالواجد رحمانی ہیں۔

مولانا شاکرؔ نے ایک فارسی واُردو لغت کی ترتیب وتدوین کا کام شروع کیا تھا مگر یہ مفید واہم سلسلہ رک گیا۔ ابھی ایک سال کا عرصہ ہوا کہ مولانا کی ایک عربی تالیف "الانابرالی شعر الصحابہ" حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ جن میں ان صحابہ کرام کا عربی کلام جمع کیا گیا ہے جو شعری ذوق رکھتے تھے۔ اس کتاب کو مولانا کے گرانقدر حواشی توضیحات وتشریحات نے کافی وقیع بنا دیا ہے۔

مولانا کے کیرکٹر اور ان کی سیرت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور ایمان کے سچے کھرے اور پکے تھے وہ بڑے صاف باطن، سادہ لوح ایماندار صائب الرائے اور بے تعصب تھے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مولانا کی ذات بابرکات صوبہ مدارس کے لئے خصوصاً اور جنوبی ہند کے لئے عموماً ایک ایسے چراغ کی حیثیت رکھتی تھی جس سے کئی چراغ اکتساب نور کر چکے ہیں۔ افسوس وہ مینارۂ نور بھی ۲۸ جنوری سنہ ۶۷ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

مخمور سعیدی



... جہاں اور بھی ہیں

اتنے بیزار ہو کیوں، اتنے پریشاں کیوں ہو؟
اپنی پرچھائیں سے یوں خود ہی گریزاں کیوں ہو؟

تجربہ کوئی بہت تلخ ہوا ہے شاید
مضطرب دل کا سفینہ رہا ساحل کے لئے
تم بھٹکتے ہی رہے پیار کی منزل کے لئے
راہ میں کوئی تمہیں چھوڑ گیا ہے شاید

تم نے چاہا تھا جسے جس کی تمنا کی تھی!
دو قدم ساتھ تمہارا نہ نباہا اُس نے
تمہیں ٹھکرا کے کسی اور کو چاہا اُس نے
تم نے جس کے لئے دُنیا کبھی ٹھکرا دی تھی

کتنے ارمان مچلتے تھے جواں سینے میں!
تم پشیماں ہو کہ پورا کوئی ارماں نہ ہوا!
حسرتِ دیدہ و دل کا کوئی پُرساں نہ ہوا
بال پڑتے ہی گئے شوق کے آئینے میں

سلسلے بنتے بگڑتے ہی رہا کرتے ہیں
وقت کچھ گرد اُڑاتا ہے، گزر جاتا ہے
منظرِ شام و سحر اور نکھر جاتا ہے
تجربے روز نیا رنگ بھرا کرتے ہیں

اپنے احساس کے زنداں سے نکل کر دیکھو
شوقِ بیتاب کی تسکین کے عنوان بہت
دیدہ و دل کے بہل جانے کے سامان بہت
اِک ذرا زاویۂ فکر بدل کر دیکھو!!

زندگی خود کسی خوابوں کی دُلہن کی مانند
منتظر ہے کہ تم آؤ تو تمہیں پیار کرے
چہرۂ یاس کو اُمید سے گلنار کرے
کھل اُٹھے غم کی فضا صبحِ چمن کی مانند

خوفِ تنہائی سے اس درجہ ہراساں کیوں ہو؟
آؤ، ساتھ آؤ مرے، خود سے گریزاں کیوں ہو؟

آنکھ اُٹھاؤ تو سہی سر بہ گریباں کیوں ہو
ایسی کیا بات ہوئی اتنے پریشاں کیوں ہو

زیدی جعفر رضا

مولانا آزاد لائبریری (علیگڑھ) میں فارسی رامائن کے

چند قلمی نسخے



ھندوستان کی پاکیزہ سرزمین پر وید مقدس کے بعد رامائن کی حیثیت ایک قدیم ترین صحیفہ کی ہے۔ بالمیک جیسے ایک حساس دلِ انسان کی زبان سے نغمہ ریز ہونے والی یہ پہلی شعری تخلیق ہے جو ایک عظیم ایپک کی صورت میں اس ملک کے عوام کی زندگی کے مختلف شعبوں کو روشن اور تابناک بنانے میں ایک طویل مدت تک پیش پیش رہی ہے۔ اور آج بھی ہندوستان اور اس کے علاوہ دیگر ممالک کے بالغ نظر افراد اس قابلِ قدر شاہکار کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

رامائن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ دُنیا کی تقریبًا تمام زندہ زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ مونئیر ولیم نے اپنی کتاب "انڈین ایپک پوئٹری" میں رامائن کا مطالعہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ رامائن کا پہلا انگریزی ترجمہ ۱۸۰۶ء میں کیری اور مارشمین کی کوششوں کے نتیجہ میں شائع ہوا۔ وہیلر نے ۱۸۶۹ء میں ایک اور انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ جو سابقہ ترجمہ کے مقابلے میں زیادہ مکمل ہے۔ اطالوی زبان میں "سکنور گوریسو" نے اور لاطینی میں "شلیگل" نے اپنے اپنے طرز کے خوبصورت ترجمے پیش کئے۔ ان کے علاوہ انگریزی میں ایک منظوم ترجمہ آر۔ ٹی۔ گریفتھ نے ۱۸۷۰ء میں شائع کیا۔ آزاد ترجمے کی صورت میں مختلف زبانوں میں رامائن کے بے شمار متن شائع ہو چکے ہیں۔ رام و سیتا کی داستان کو موضوع بیان اور چشمۂ زندگی کی صورت میں قبول کرکے کشمیر سے کنیا کماری تک ہزاروں شعراء نے اپنے قلبی تاثرات کی ترجمانی کی اور ذوات مقدسہ سے عقیدت کے باریک لیکن مضبوط دھاگوں کو جوڑنے میں فخر محسوس کیا۔ اودھی زبان کے بے مثال مغنی سوامی تلسی داس کو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کی تصنیف "رام چرت مانس" کو شمالی ہند میں وید اور گیتا سے بھی کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور شمالی ہند کے بیشتر ہندو گھرانوں میں یہ کتاب ایک آسمانی صحیفہ کی صورت میں دیکھی اور سمجھی جانے لگی۔

فارسی زبان میں داستانِ رامائن کو پیش کرنے کی پہلی کوشش غالبًا کشمیر میں سلطان زین العابدین کے عہد میں ہوئی۔ لیکن اس زمانے کا کوئی بھی فارسی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے اس لئے اس سلسلہ میں وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں مغلیہ دور میں شہنشاہ اکبر نے اس طرف خاص توجہ دی اور باقاعدہ طور پر ایک دارالترجمہ قائم کیا جو علامیٔ ابوالفضل کی نگرانی میں سنسکرت کی اہم اور قابلِ قدر تصانیف کو پنڈتوں کی مدد سے فارسی قالب میں ڈھالنے کا کام انجام دیتا تھا۔ فارسی نثر میں رامائن کی داستان پہلی مرتبہ عبدالقادر بدایونی نے پیش کی [1]۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے عرصہ پر فارسی کے ادیبوں نے منظوم اور غیر منظوم دونوں ہی صورتوں میں اس داستان کو اپنے اپنے طرز پر پیش کیا۔ ان فارسی ادیبوں میں امانت رائے، گردھر داس کایستھ، گوپال ابن گوبند چندر منی، مرزا بیدل، دیوی داس کایستھ، امر سنگھ منشی، سعداللہ مسیح بھولا ناتھ نادان، ہری بلبھ سیٹھ، اور گوپی ناتھ سہائے کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اردو زبان میں بھی رام و سیتا کی داستان کے بے شمار مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے ملتے ہیں جن سے متعلق تفصیلات انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع قاموس الکتب کی جلد اول میں ۱۱۵۲۸ سے لے کر ۱۱۵۶۲ تک درج ہیں۔

مسلم یونی ورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں فارسی کی قلمی اور مطبوعہ رام

۱۔ بدایونی منتخب التواریخ۔ صفحہ ۳۶۶

مخطوطوں کا ایک اچھا ذخیرہ ہے۔ اگرچہ قلمی نسخوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے لیکن ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر بھولا ناتھ ناداں کا تلسی کے رام چرت مانس کا سلیس فارسی نثر میں ترجمہ اور مرزا بیدل اور شیتل سنگھ کے بالترتیب نرگستان اور رام گیتا کے نام سے موسوم شاہکار اہل نظر کی توجہ کے مستحق ہیں۔ ان کے علاوہ مسیح کی داستان رام و سیتا کے نسخے بھی اس اعتبار سے کافی اہم ہیں کہ نول کشور ایڈیشن سے مقابلہ کرنے پر ان کے متن میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ان ہی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذیل کی سطروں میں ان قلمی نسخوں کے تعارف کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ یہاں اس بات کا واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قلمی نسخوں سے جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں ان میں متن کی تصحیح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نسخے کی صحیح نوعیت کا اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا کوشش یہی رہی ہے کہ کاتب نے صحیح یا غلط جو بھی نقل کیا ہے اُسے اسی طرح پیش کر دیا جائے۔

۱۔ ثمرۃ الحیات

مصنف بھولا ناتھ ناداں، سال تصنیف ۱۲۰۳ - ۱۱۹۵ھ، سنہ کتابت ۱۲۰۵ھ، ضخامت ۳۶۲ اوراق سائز ½۶ × ½۹ انچ، سطریں فی صفحہ ۱۷۔ خط شکستہ، نمبر اندراج عبدالسلام کلکشن ۴۴۶/۱، مکمل نسخہ خستہ حالت میں ہے پہلے ورق کا نصف بالائی حصہ محفوظ ہے باقی ضائع ہو چکا ہے، بیشتر اوراق کرم خوردہ ہیں۔ موضوعات سرخ روشنائی سے قائم کئے گئے ہیں۔ کاغذ معمولی ہے نسخہ مکمل ہے اور خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

بھولا ناتھ ناداں فارسی کے ایک غیر معروف شاعر ہیں۔ ان سے متعلق تفصیلات کسی بھی تذکرے سے دریافت نہ ہو سکیں۔ زیر نظر تصنیف کی روشنی میں محض اتنا کہا جا سکتا ہے کہ موصوف شاہ عالم کے عہد میں بقید حیات تھے اور آخر کتاب میں مندرجہ ذیل ابیات اس اعتبار سے توجہ کی مستحق ہیں۔

بحمد اللہ کہ در سال مبارک ÷ نوشتم نامہ فال مبارک
بعہد شاہ عالم شاہ افروز ÷ جواں بخت و جواں دولت جواں روز
شہنشاہے جہاں عالم پناہے ÷ سکندر شوکت و جمشید جاہے
خدایا دور عمرش جاوداں باد ÷ بملک کامران کامراں باد

(ورق نمبر ۳۶۲ الف)

ناداں نے کتاب کی ابتدائی سطروں میں ہی اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ ان کی یہ تصنیف تلسی داس کے رام چرت مانس کا فارسی (نثر میں) ترجمہ ہے۔ (ورق ۲ الف) زبان شستہ رواں اور سلیس ہونے کی وجہ سے ترجمہ میں ایک لطف پیدا ہو گیا ہے۔ کتاب کا آغاز ۱۱۹۵ھ مترجم کی تحریر کے مطابق ہوا تھا۔ عنوان کتاب "ثمرۃ الحیات" میں تاریخ آغاز کتاب کے اعداد پوشیدہ ہیں۔ کل کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے۔ مترجم نے ہر حصہ کو ایک اختر اور اس کے مزید حصوں کو لمعہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ کتاب کے پہلے اختر میں ۲۹ لمعات ہیں جو نسخے کے ۱۳۰ اوراق میں پھیلے ہوئے ہیں۔ داستان کا تعلق رام چندجی کے زمانۂ طفلی تحصیل علم، دشرتھ کے ساتھ رہائش اور سیتاجی کے ساتھ شادی سے ہے۔ داستان کے راوی یاگیہ ولکیہ ہیں اور سامع بھاردواج۔ یہ حصہ ۱۱۹۵ھ میں ہی مکمل ہو گیا تھا جیسا کہ اس بیت سے واضح ہے۔

میاں اول از اختر نہاں شد ÷ رُخ سالِ مبارک زو عیاں شد

(ورق ۱۳۰ ب)

آخری اختر پندرہ لمعات پر مشتمل ہے جو قلمی نسخے کے اوراق ۳۲۰ ب سے ۳۶۲ ب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں رام چندرجی کی ایودھیا کی زندگی کے واقعات درج ہیں۔ یہ ۱۱۹۷ ہجری میں مکمل ہوا۔ سن تاریخ اس طرح ہے۔

چہ خوبی گفت تاریخ گرامی
ز نام رام ہر نام است نامی:

کسی بھی کیٹلاگ میں ثمرۃ الحیات کا کوئی نسخہ نہیں پایا جاتا۔ اس اعتبار سے اس نسخہ کو نادر کہنا غلط نہ ہو گا۔

۲ "نرگستان"

مصنف عبدالقادر بیدل۔ سال تصنیف ۱۱۰۵ ہجری مطابق ۹۴-۱۶۹۳ء سن کتابت ۱۲۹۶ ہجری۔ ضخامت ۱۵۶ اوراق سائز ¾۶ × ½۱۰ انچ۔ سطریں فی صفحہ ۱۳ خط نستعلیق۔ نمبر اندراج ذخیرہ حبیب گنج ۵۰/۱۴۲۔ نسخہ کہیں کہیں سے کرم خوردہ ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے قائم کئے گئے ہیں۔ کاتب کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ نسخہ مکمل ہے۔ رلو۔ ایتھ۔ باڈلین بانکی پور اور ادالو کی فہرستوں میں اس کی کوئی کاپی نہیں پائی جاتی۔ ویسے بیدل کا یہ رامائن مطبع نول کشور لکھنؤ سے فروری ۱۸۷۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ آزاد لائبریری میں مطبوعہ کاپی بھی

محفوظ ہے۔

بیدل فارسی کے ایک مشہور شاعر ہیں سنہ پیدائش ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء اور سنہ وفات ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء بتایا جاتا ہے۔ عہد شباب میں شہزادہ اعظم شاہ کے یہاں نوکر تھے لیکن شہزادہ کے اصرار پر کہ اس کی شان میں قصیدہ نظم کریں آپ نے استعفےٰ دے دیا اور دوبارہ کبھی واپس نہیں گئے۔ نہایت خود دار انسان تھے۔ ان کی تصانیف میں 'محیط اعظم' ، چہار عنصر ، انشائے بیدل اور بیس ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان بتایا جاتا ہے۔ بیدل سے متعلق تفصیلات کے لئے 'مرات الخیال' صفحہ ۲۶۸ - ۲۵۷ سرخوش صفحہ ۱۹ ، مصحفی صفحہ ۲۵ ، حسینی صفحہ ۲۹ ، تاریخ محمدی صفحہ ۲۵۳ ، خلاصۃ الافکار صفحہ ۳۵ ، نغمہ عندلیب صفحہ ۵۰ ، اور بیل بائیوگرافیکل ڈکشنری ، بیل صفحہ وغیرہ ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

بیدل کے ایک دوست نے جن کا نام شیتل داس تھا۔ پہلی بار جب رام کتھا انھیں پڑھ کر سنائی اور وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسے فارسی نظم کے سانچے میں ڈھالنے کا طے کر لیا اور نتیجہ میں نرگستان کی صورت میں ان کا یہ ارادہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ ورق ۷ الف پر وہ خود فرماتے ہیں۔

ولی بود ی کہ شیتلداس نامی
رفیق و ہم نشیں و ہم کلامی
چو خواند او داستان رام بامن
شدم بشگفتہ در باطن چو گلبن
دل بیدل بجوش آمد بیکبار
کہ سازم نظم ذکر شاہ دلدار

آخرکار ۱۱۰۵ ہجری میں داستان رام کا یہ منظوم نسخہ بیدل کی کاوشوں سے مکمل ہو گیا۔ سنہ تاریخ خاتمہ شاعر نے اس طرح نظم کی ہے۔

بگویم با تو از روئے حسابے
بغایت دلکشا بآب و تابے
چو جستم از خرد گفتا کہ برخواں
طراوت بخش دلہا باغ ایماں

۱۱۰۵ھ

یہ تاریخ اواخر کتاب میں مختلف ابیات میں نظم کی گئی ہے۔ اسی مقام پر ایک بیت میں شاعر نے یہ بھی اشارہ کیا ہے، کہ اس نسخہ کی تکمیل کے وقت یعنی ۱۱۰۵ھ ہجری میں اس کی عمر ۶۰ برس تھی۔ بیت ملاحظہ ہو۔

دریں شصت سال کہ من کردہ ام
ز ساقی خود فیض ہا بردہ ام

اس طرح بیدل کا سنہ پیدائش ۱۰۴۵ ہجری ہونا چاہئے۔ جبکہ محققین کے نزدیک بیدل کا سنہ پیدائش ۱۰۵۴ ہجری ہے۔ پوری کتاب سات دفاتر پر مشتمل ہے اور اس میں رام کی کہانی اسی انداز سے بیان کی گئی ہے جیسی کہ رامائن میں پائی جاتی ہے کتاب کا ابتدائی بیت اس طرح ہے۔

الٰہی بحر وصفت بیکراں است
خرد را کشتی اندر دیگرانست

نماند است در ما بجز عشق رام
چہ گویم ازیں پیش روالسلام

۳۔ رام گیتا

مصنف شیتل سنگھ۔ سال تصنیف نامعلوم۔ سنہ کتابت ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء ضخامت ۱۵ اوراق۔ سائز ۵½ × ۸½ انچ ، سطریں فی صفحہ ۱۱ ، خط نستعلیق۔ کاغذ دیسی۔ نمبر اندراج ۔ ذخیرہ عبدالسلام ۴۷۳/۲۸۔ سرخ و نیلے حاشیوں کے اندر خوبصورتی کے ساتھ مکمل نسخہ جلی حروف میں ہے۔ کاتب ایودھیا ناتھ ہیں اس کتاب کے کسی دوسرے کا حوالہ کسی کتب خانہ کی فہرست میں غالباً نہیں ہے۔

اس کتاب کے مصنف شیتل سنگھ کا ذکر ایچ۔ ایچ ولسن نے کتاب "اسکیچ آف دی ریلجس ۔ سکٹس آف ہندوز" میں صفحہ ۶ پر کیا ہے اور انہیں راجہ بنارس کا منشی بتایا ہے۔ ریو کی اطلاع کے مطابق شیتل سنگھ نیرنگ ظہور کے بھی مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ میکنزی کلکشن کی جلد دوئم میں صفحہ ۱۴۳ پر انہیں "سلسلہ جوگیاں" کا بھی مصنف بتایا گیا ہے۔ ریو نے ان کا زمانہ تصنیف ۱۸۰۰ء تحریر کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کا حوالہ کہیں بھی راقم کی نگاہوں سے نہیں گذرا۔ ابتدائی سطروں میں ہی مصنف نے تحریر کر دیا ہے کہ رام گیتا کے عنوان سے اس نے آدھیاتم رامائن کے ساتویں باب کے محض ایک حصہ کا ترجمہ پیش کیا ہے ویدانت

پر گہری نظر رکھنے والے مشہور مفکر پرم ہنس کی حوصلہ افزائی کے نتیجہ میں یہ کام دو ماہ کے عرصے میں مکمل ہوا۔ سال تصنیف کا ذکر مصنف نے کہیں بھی نہیں کیا ہے۔ اس کتاب میں صوفیانہ نظریات بیان کئے گئے ہیں کتاب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے

"سپاس بے انتہا براں ازلی اظہور ابدی الحفا کہ فرط اعلانش ... الخ

اختتام اس طرح ہے۔

"ہر کہ از روی اعتقاد بخواند بہ روپ من واصل گردد۔

آخر میں ایک ترقیمہ بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں

نسخہ رام گیتا بدستخط خاصی پنڈت اجودھیا ناتھ عرف کول بخشی بتاریخ بست وسیوم وشہر جمادی الاول ۱۲۷۱ھ روز یکشنبہ۔

---

۴ : داستانِ رام وسیتا

مصنف شیخ سعد اللہ مسیح۔ سال تصنیف ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء۔ سنہ کتابت ۱۱۷۲ھ/۶۰-۱۷۶۱ء۔ ضخامت ۲۲۶ اوراق۔ سائز ۵ × ½۸ انچ۔ سطریں فی صفحہ ۱۹ خط نستعلیق۔ نمبر اندراج ذخیرہ سبحان اللہ ۵۱۴/۳۵ ر ۸۹۱۔ نسخہ خوش سلیقگی کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ مختلف مقامات پر کرم خوردہ ہے۔ کچھ اوراق پر حاشیے بھی لکھے ہیں۔ ورق ۱۲۹ ب پر ایک، ۱۴۶ الف پر دو اور ۱۴۹ الف پر ایک مہر لگی ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی پڑھی نہیں جاتی۔ کاتب گردھاری لال ہیں۔ کاغذ دیسی ہے۔ نسخہ مکمل ہے۔

یہ کتاب رامائن مسیح کے نام سے کافی مشہور ہے۔ اس کے کئی قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ برٹش میوزیم میں اس کا ایک نسخہ ہے۔ جس کی تفصیل ریو کے کیٹلاگ میں صفحہ ۱۰۷۸ ب پر درج ہے۔ انڈیا آفس لائبریری میں ایتھ کی اطلاع کے مطابق اس کے تین نسخے ہیں (صفحات ۸۹-۱۰۸۸) باڈلین میں ایک نسخہ ہے (صفحہ ۸۱۲) بانکی پور کے کتب خانے میں دو نسخے ہیں (۱۱۱-VII) ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں بھی ایک نسخہ کا پتہ چلتا ہے (صفحہ ۱۹۶) ان کے علاوہ براؤن کے کیٹلاگ میں بھی ایک نسخہ کا ذکر صفحہ ۲۷۹ پر ہے۔ مسیح کا یہ رامائن مطبع نولکشور لکھنو سے سنہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

مُلا مسیح کا اصل نام سعد اللہ تھا اور یہ کیرانہ کے باشندے تھے۔ مقرب خاں نے انھیں متبنیٰ بنا لیا تھا۔ فارسی رامائن کے ایک دوسرے مصنف گردھر داس کی طرح مسیح بھی عہد جہانگیری میں بقید حیات تھے۔ آغاز داستان رام وسیتا سے قبل انہوں نے جہانگیر کی تعریف میں بہت سے اشعار نظم کئے ہیں۔ (ورق ۱۰ الف) شیخ پیر محمد ابوالبقا مسیح کے اُستاد تھے۔ موصوف نے اپنے پیر کی توصیف و تعریف میں بھی اشعار نظم کئے ہیں (ورق ۹ الف) ہندوستان سے انھیں والہانہ محبت تھی چناں چہ قصیدہ ہندوستان پیش کر کے موصوف نے اپنی اس محبت کا اظہار کیا ہے (ورق ۱۲ ب) اصل داستان ورق ۱۵ ب پر ان اشعار سے شروع ہوتی ہے ؎

شکر گفتار ایں شیریں فسانہ ؛ بدیں آہنگ بسرود ایں ترانہ
کہ رائے بود اند کشوری ہند ؛ بہ زیر خاتمش بنگال تا سند

ریو کی اطلاع کے مطابق مسیح کی یہ داستان ہندوستانی زبان میں منظوم رام کتھا کا ترجمہ ہے (۱۰۷۸ ب) باڈلین، براؤن اور ایتھ وغیرہ بھی اُسے رامائن کے ترجمہ کی شکل میں تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن رامائن کے اصل نسخے سے مقابلہ کرنے پر یہ بات تقریبا وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مسیح کا یہ رامائن کسی سنسکرت یا ہندی زبان کے رامائن کا ترجمہ نہیں ہے۔ مسیح نے عوام میں مقبول رام کتھا کو لے کر اپنے طرز پر نظم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ابواب اور کانڈ کی تقسیم نہیں پائی جاتی بلکہ داستان مثنوی کے طرز پر نظم کی گئی ہے۔

کتاب کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

خداوند از جام عشق کن مست
کہ از مستی فشانم بر جہاں دست

اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

ز کوہ آں سو حدیثش کس ندانست
کسے احوال او زاں پس ندانست

آخر میں ایک ترقیمہ بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"تمت تمام شد کار من نظام شد نسخہ سری رامائن کہ در فارسی در نظام ترجمہ تصنیف افصح الفصحا ابلغ الشعرا متخلص مسیح روحانے عرف شیخ سعد اللہ ساکن پانی پت بتاریخ نوزدہم شہر ذی الحجہ سنہ ۱۱۷۲ھ بخط اضعف العباد کمترین مخلوقات گردھاری لعل در قصبہ لکھنؤ کہ بتقریب رفاقت نواب صاحب .... نصیر الدولہ سید نجابت علی خاں بہادر سپہ دار جنگ مطابق سنہ شاہ عالم بہادر کہ در صوبہ بہار عظیم آباد بتاریخ کے جلوس مرقوم شد۔

شیخ سعداللہ مسیح کی "داستان رام وسیتا" کے پانچ اور نسخے اس لائبریری میں موجود ہے۔

۵۔ رامائین (امر پرکاش) بال کانڈ

معنف امر سنگھ۔ سنہ تصنیف ۱۱۱۷ھ/۶-۱۷۰۵ء۔ سنہ کتابت ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۵ء ضخامت اوراق ۶۸۔ سائز ۵¾ × ۷½ انچ۔ سطریں فی صفحہ ۱۶۔ خط معمولی نستعلیق۔ نمبر اندراج ذخیرہ سر سلیمان ۲۵/۳۸۔ ابتدائی حصہ ناقص ہے۔ کاتب جن گوپال ابن رادھا کرشن ہے جس کا تعلق کھتری خاندان سے ہے اور جو سراوہ ؟ کا باشندہ ہے۔ امر سنگھ کا یہ شاہکار ۱۸۷۷ء میں نولکشور لکھنؤ کے مطبع سے شائع ہو چکا ہے۔ کیٹلاگوں میں اس کے قلمی نسخوں کا حوالہ نہیں ملتا۔

امر سنگھ کا وطن بنارس تھا۔ اُن کے آبا و اجداد پہلے الٰہ آباد میں آکر مقیم ہوئے تھے اور پھر بنارس میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان لوگوں کا تعلق سری واستو کایستھوں کے خاندان سے تھا۔ امر سنگھ کے والد کا نام رگھوناتھ داس تھا۔ یہ بھی فارسی کے اچھے عالم تھے۔ امر سنگھ نے ۵۵ برس کی عمر میں ۱۱۱۷ھ میں رامائن کے ترجمہ کا کام شروع کیا جیسا کہ مطبوعہ نسخے کی چند سطروں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ (نول کشور ایڈیشن صفحہ ۴۲۔ ۵۴۰)

پیش نظر نسخہ کا فارسی ترجمہ کسی ایک رامائن کا عکس نہیں ہے۔ بلکہ مصنف نے مہابھارت۔ بالمیکی رامائن ہنومان ناٹک اور رام چرت مانس میں پائی جانے والی رام کتھاؤں کا بہترین حصہ اپنے لئے منتخب کر لیا ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ مصنف کے خاندان ہی کے ایک اور بزرگ نے جن کا نام گوبند داس ہے برج بھاشا میں اکبر کے زمانے میں رامائن کا ترجمہ کیا تھا۔ پیش نظر نسخہ میں محض داستان بال کانڈ پائی جاتی ہے دوسرے کانڈوں کی جلد سازی علیحدہ کی گئی ہے جیسے ایودھیا کانڈ، بن کانڈ، سندر کانڈ، لنکا کانڈ اور اتر کانڈ وغیرہ

مطبوعہ نسخہ میں سن تصنیف ۱۱۱۹ھ درج ہے لیکن مصنف نے صاف الفاظ میں ۱۱۱۷ھ درج کیا ہے۔

"در زمان خلافت پادشاہ جم جاہ تا مع بنیان میل و اعتصاف رافع اعلام عدل و انصاف توزبخش چراغ تیمور، گوہر یکتای اکلیل چنگیز یہ مطلع انوار الٰہی مورد عنایات نامتناہی پادشاہ بی ہمتائی شاہ شاہان شاہ حال و مستقبل و ماضی ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کہ سن خمسین و ست

(بقیہ ص ۳۰ پر)

شفا گوالیاری

غزل

اللہ تو کسی کو نہ دینا کسی کے زخم
بھرتے نہیں ہیں موت سے بھی زندگی کے زخم

وائے نصیب چین گھڑی بھر نہیں مجھے
یارب پڑے تھے دل پہ مرے کس گھڑی کے زخم

اے چارہ گر توجہ کا ممنون ہوں مگر
چارہ گری ہی سے جو پڑے ہوں کسی کے زخم

سر لے رہے ہو کیوں گنہ تہمت جمال
داغوں کو چاند کے نہ کہو چاندنی کے زخم

ملتا ہے خوش نصیبوں کو یہ تحفۂ جمیل!
جب دوست ہی نہ ہوں تو کہاں دوستی کے زخم

زیبا نہیں ہیں عصمتِ غم کی نمائشیں
رکھتے ہیں دل کے پردوں میں آزردگی کے زخم

عکاسِ صبح چاک گریباں سہی مگر
آئینہ سارے ہو گئے دیوانگی کے زخم

جذباتِ دل سے ہٹ کے ذرا غور کیجئے
یہ زندگی کے پھول ہیں یا زندگی کے زخم

کیا اُن کی لغزشِ نگہ و فہم کا علاج
جو کہکشاں کو سمجھیں شفاؔ روشنی کے زخم

پرکاش پنڈت



ٹیلی فون

(آوازوں میں ایکانکی)

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ پھر چونگا اُٹھایا جاتا ہے)

دیناناتھ: ہیلو،

ٹیلی فون کی آواز: دیناناتھ جی ہیں؟

دیناناتھ: جی ہاں میں بول رہا ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟

آواز: بھئی مبارک ہو دیناناتھ۔ میں رادھے شیام بول رہا ہوں۔

دیناناتھ: کہو بھئی رادھے شیام! کیا حال ہے؟ رات کے آٹھ بجے تمہاری محبت کی کون سی رگ پھڑکی ہے۔ کاہے کی مبارک باد دے رہے ہو؟ کیا پانڈے جی والے کیس کا پتہ چل گیا؟

آواز: ارے یار، تم بھی بس ایک گھن چکر ہو۔ تم پر تو ہر وقت دفتر کا بھوت سوار رہتا ہے۔ کسی وقت تو کوئی ڈھب کی بات کیا کرو۔

دیناناتھ: تو بتاؤ، کاہے کی مبارکباد دے رہے تھے اس وقت۔

آواز: ٹیلی فون لگوانے کی اور کاہے کی۔

دیناناتھ: اوہ! اچھا اچھا۔ تمہیں بھی مبارک ہو بھائی۔ سچ پوچھو تو رادھے شیام ٹیلی فون آج کی زندگی کا بہت ضروری حصہ ہے۔ فون کے بغیر تو سوشل لائف نام کی کوئی چیز رہ ہی نہیں سکتی۔ آج جب سے گھر میں فون لگا ہے، سارے فاصلے، ساری دوریاں مٹ گئی ہیں، ورنہ کسی سے کوئی معمولی سی بات بھی کرنا ہوتی تھی تو پوری شام برباد ہو جاتی تھی۔ پھر دلی کے فاصلے تو تم جانتے ہی ہو۔ اپنی مثال آپ ہیں۔ بھگوان نہ کرے، کسی وقت کوئی مصیبت آجائے تو فون کے بغیر جیسے شہر میں رہے ویسے جنگل میں۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کا گھر لٹ رہا ہے اور آپ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

آواز: تو تم نے چوروں کے ڈر سے ٹیلی فون لگوایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بہت مال جمع ہو گیا ہے۔

دیناناتھ: ارے نہیں پیارے۔ وہ تو بات سے بات نکل آئی تھی ورنہ یہاں کیا رکھا ہے۔ تم کسی زخم، چوٹ یا بیماری ہی کی بات لو، کون جانے کب کیا ہو جائے۔ گھر میں آگ بھی لگ سکتی ہے، ایسی حالتوں میں ٹیلی فون کے بغیر۔ ۔ ۔

آواز: کمال ہے صاحب۔ میں نے مبارک باد دینے کے لیے فون کیا تھا ٹیلی فون کے فائدے سننے کے لیے نہیں۔ بائی بائی۔

دیناناتھ: بائی بائی۔ (چونگا رکھتا ہے)

دیناناتھ: (قدرے اونچی آواز میں) سنتا ڈارلنگ! بھئی کہاں ہو۔ ادھر آؤ۔

بیوی: (آواز دور سے قریب آتی ہے۔ طنز سے) جی، فرمایئے۔

دیناناتھ: او ہو، حضور کے تیور آج پھر بگڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بھئی مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ شاپنگ کے لئے نہیں جا سکا۔ سچ مانو ڈارلنگ سیدھا آفس سے چلا آرہا ہوں۔ اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ بس تیل نکل جاتا ہے۔ صبح سے فائیلوں میں ڈوبا ہوں تو یہ سمجھو بس اس وقت۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی۔ دیناناتھ چونگا اٹھاتا ہے)

دیناناتھ: ہیلو دیناناتھ اسپیکنگ۔

آواز: صبح اٹارسی کی گاڑی کس وقت چھوٹتی ہے؟

دیناناتھ: رانگ نمبر۔

(چونگا رکھ دیتا ہے)

دیناناتھ: ہاں تو میں کہہ رہا تھا ڈارلنگ ....

بیوی : اجی چھوڑیئے۔ میں سب جانتی ہوں، جو کام رہتا ہے آپ کو۔ پوری شام دوستوں کی چوکڑی میں کٹتی ہے۔ اور لوگ بھی تو ہیں۔ دیکھتی ہوں پانچ بجتے ہی سیدھے گھر کو بھاگے آتے ہیں لیکن آپ گھر کو گھر سمجھیں جب نا!

دیناناتھ: نہیں ڈارلنگ، یہ بات نہیں۔ مجھ پر یقین نہ کرنے کی تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ اب تو گھر میں بھی ٹیلیفون لگ گیا ہے۔ کل اس وقت ٹیلیفون کرکے دیکھ لینا کہ میں آفس سے بولتا ہوں یا نہیں؟

بیوی : اس کا مطلب ہے، جناب کل بھی دیر سے آئیں گے۔

دیناناتھ: کیا کروں ڈارلنگ! کوئی کتنا بڑا افسر ہی کیوں نہ ہو جائے، نوکری آخر نوکری ہی ہوتی ہے۔ میرا کام کوئی اور تو آکے کرے گا نہیں۔ مجھی کو کرنا پڑے گا اور آجکل کام کی اتنی بھرمار ہے کہ ....

بیوی : یہ سب میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ دُنیا سے نرالے نہیں ہیں۔ ساری دُنیا پانچ ساڑھے پانچ، حد چھ بجے تک گھر لوٹ آتی ہے۔ لیکن آپ بھی سمجھے ہیں۔ آپ کو تو گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ گھر میں وہ باہر کے مزے کہاں؟

دیناناتھ: تم کلرک لوگوں کی باتیں کرتی ہو ڈارلنگ! کلرک لوگ تو ....

بیوی : کلرک لوگ! تو آپ کے خیال میں یہ کھنہ صاحب کلرک ہیں۔ آپ سے کہیں زیادہ تنخواہ پاتے ہیں۔ آپ سے بڑا عہدہ ہے۔

دیناناتھ: کھنہ صاحب کی بات دوسری ہے۔

بیوی : جی ہاں! کھنہ صاحب کی بات دوسری ہے۔ ملہوترہ صاحب کی تیسری، چاولہ صاحب کی چوتھی، بھٹناگر صاحب کی پانچویں۔ میں سب جانتی ہوں۔

دیناناتھ: نہیں ڈارلنگ، تم کچھ نہیں جانتیں۔

بیوی : جی ہاں، میں کچھ نہیں جانتی۔ اسی لئے تو آپ مجھے بیوقوف بنا دیتے ہیں میں خوب جانتی ہوں کہ آپ کی شامیں کہاں گذرتی ہیں ....

(ٹیلی فون کی گھنٹی۔ دیناناتھ چونگا اُٹھاتا ہے۔)

دیناناتھ: ٹو ون، ڈبل تھری، فور ون۔

آواز : جی میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ اٹارسی کی گاڑی ....

دیناناتھ: جی میں نے آپ کو بتایا تھا کہ آپ رانگ نمبر ملا رہے ہیں۔ یہ ریلوے انکوائری نہیں، سیلز ٹیکس آفیسر کا مکان ہے۔

آواز : ریلوے انکوائری کا نمبر کیا ہے؟

دیناناتھ: ڈائرکٹری دیکھیئے۔

آواز : یہاں ڈائرکٹری نہیں ہے۔

دیناناتھ: تو جہنم میں جایئے۔ میں سیلز ٹیکس آفیسر ہوں، ٹیلیفون کی ڈائرکٹری نہیں ہوں۔

(زور سے چونگا رکھتا ہے)

دیناناتھ: عجیب مصیبت ہے۔ ہاں تو ڈارلنگ! اب تم اپنا غصہ تھوکوگی یا نہیں؟

بیوی : ہمیں کبھی پر غصہ کرکے کیا لینا ہے۔ ہماری تو قسمت میں ہی ....

دیناناتھ: کیا ہوا ہے تمہاری قسمت کو....

بیوی : جی نہیں، کچھ نہیں ہوا۔ راج بھوگ رہی ہوں۔ یہاں پوری پوری شام گھرے ....

دیناناتھ: یہ تم ہر روز شام کا کیا جھگڑا لے بیٹھتی ہو۔ کہاں گذرتی ہے میری شام؟

بیوی : میری بلا سے، جہاں بھی گذرے۔ مجھے کیا پڑی ہے۔

دیناناتھ: ڈارلنگ، تم تو بے کار شک کرتی ہو۔ بڑا شکی مزاج ہے تمہارا۔ مجھ سا سعادت مند شوہر بھی کوئی نہیں ملے گا!

بیوی : جی ہاں، کیا کہنے ہیں آپ کی سعادت مندی کے۔ یہ تو کہیئے آپ کی قسمت اچھی تھی جو مجھ ایسی بیوی مل گئی آپ کو۔ آج کل کی کوئی لڑکی ہوتی تو ناکوں چنے چبوا دیتی۔ آگے پیچھے گھومتے پھرتے۔

دیناناتھ: میں تو اب بھی تمہارے آگے پیچھے ....

(ٹیلی فون کی گھنٹی۔ دیناناتھ چونگا اٹھاتا ہے)

دیناناتھ: ہیلو، دیناناتھ اسپیکنگ۔

آواز : (لچکدار) آداب عرض کرتا ہوں قبلہ!

دیناناتھ: آداب عرض، فرمایئے۔

آواز : جی بات دراصل یہ ہے کہ خاکسار نے ابھی ابھی ایک غزل کہی ہے

دینا ناتھ: (تعجب سے) جی ؟

آواز : عرض کیا کہ ایک غزل کہی ہے۔

دینا ناتھ: بہت اچھا کیا آپ نے۔ لیکن یہ جو آپ نے غزل کہی ہے تو اس میں اس خاکسار کا کیا قصور ہے ؟

آواز : اجی حضرت میں آپ کو وہ غزل سُنانا چاہتا ہوں۔

دینا ناتھ: دیکھئے جناب، میرا خیال ہے کہ آپ نے غلط نمبر ملا لیا ہے۔ میں کوئی شاعر یا سخن فہم نہیں ہوں۔ میرا نام دینا ناتھ ہے اور میں سیلز ٹیکس آفیسر ہوں۔

آواز : کوئی مضائقہ نہیں۔ در اصل غزل کہنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ آنکھیں بند کر کے چھ بار ڈائیل گھماؤں گا اور جس کا بھی نمبر ملے گا، بس اُسی کو اپنی غزل سُنا دوں گا۔ وہ چاہے سیلز ٹیکس آفیسر نکلے یا کسی ہسپتال کا مہتر۔

دینا ناتھ: یہ کیا بے ہودگی ہے۔

آواز : اب اسے آپ کچھ بھی کہئے۔ غزل آپ کو سُننا پڑے گی۔

دینا ناتھ : میں ہرگز ہرگز نہیں سُنوں گا۔

آواز : کمال ہے، کیسے نہیں سُنئے گا۔ یہ شاعر کے موڈ کی بات ہے۔

دینا ناتھ : میں موڈ ووڈ کچھ نہیں جانتا۔

آواز : آپ کچھ جانتے بھی ہیں۔

دینا ناتھ: میں صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ بڑے بدتمیز ہیں، پاجی ہیں، گدھے ہیں ۔ ۔ ۔

آواز : کیا یہ آپ اپنی تعریف فرما رہے ہیں۔

دینا ناتھ : نان سینس۔

(زور سے چونگا پٹک دیتا ہے)

دینا ناتھ: حد ہے۔ ڈھٹائی کی حد ہے ۔ سُنا ڈارلنگ، کوئی شاعر صاحب تھے۔ یہ شاعر لوگ بھی بالکل اُلٹی کھوپڑی کے ہوتے ہیں۔ بے کار میں شریف آدمیوں کو پریشان کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی تُک ہے کہ...

بیوی : جی ہاں، بڑے شریف ہیں آپ۔ آپ کی شرافت کی تو پوری دلّی میں دھاک ہے۔

دینا ناتھ: تمہارا غصہ ابھی تک دُور نہیں ہوا ڈارلنگ: بھئی یہ کیا ظلم ہے۔ میں تھکا ہارا دفتر سے آرہا ہوں۔ تمہیں تو کچھ خیال کرنا چاہئے۔

بیوی : خیال کرنے کے لئے دُوسرے جو موجود ہیں۔ میرے خیال کی آپ کو کیا ضرورت ہے۔ !

دینا ناتھ: پھر وہی ـــ تمہارا غصہ تو بس ناک پر دھرا رہتا ہے۔ آخر کوئی بات بھی تو ہو۔

بیوی : جی، میرا تو سر پھر گیا ہے۔ آپ صبح نو بجے سے رات کے نو بجے باہر گلچھرے اڑاتے پھریں اور گھر والے چاہے مریں چاہے جئیں یہ کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ یہی کرنا تھا تو شادی ہی کیوں کی تھی !

دینا ناتھ: گلچھرے ؟

بیوی : ہاں ہاں گلچھرے۔ آپ سمجھتے ہیں، میں جانتی نہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔

دینا ناتھ: اچھا بابا، تم سب جانتی ہو۔ بس۔ تم جیتیں۔ میں ہارا۔ اب غصہ تھوک دو اور آؤ، ادھر بیٹھو میرے پاس۔

بیوی : جی نہیں، رہنے دیجئے، میں ایسی چکنی چپڑی باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ وہ اور ہوں گی جو ۔ ۔ ۔

(دروازہ کھٹکتا ہے)

دینا ناتھ: (اونچی آواز میں) کون ہے ؟

آواز : (دُور سے) دینا ناتھ جی ہیں ؟ میں سرو دیال ہوں۔ سُنا ہے آپ کے یہاں ٹیلی فون لگ گیا ہے۔

دینا ناتھ: آئیے۔ آئیے۔ دروازہ کھلا ہے۔

سرودیال: یہ آپ نے بہت اچھا کیا دینا ناتھ جی کہ ٹیلی فون لگوا لیا۔ اس سے پہلے میل بھر دُور جانا پڑتا تھا اور آپ جانئے، میرا دھندا ٹیلی فون کے بغیر ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ سٹے بازی میں یہی کچھ تو ہے دینا ناتھ جی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ کم سے کم رات کو دس بار بھاؤ پوچھنے پڑتے ہیں۔ اب آپ کو تکلیف دیا کروں گا۔

دینا ناتھ: نہیں نہیں، اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ بلا تکلف کیجئے گا ؟

سرودیال: جی ہاں اسی لئے تو آیا ہوں۔ اور دیکھئے اب میں منڈی میں یہی نمبر دیئے دیتا ہوں۔ اسی نمبر پر میرے ٹیلیفون آیا کریں گے۔ آپ کو بُلوانے

میں تکلیف تو ہوگی لیکن . . . .

دیناناتھ: نہیں نہیں، اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔

(سرودیال چونگا اٹھاتا ہے اور پھر ڈائیل گھماتا ہے)

سرودیال: فور سیون سِکس ایٹ نائن . . . .

دوسری طرف سے آواز: کون بول رہا ہے ؟

سرودیال: میں سیٹھ سرودیال۔ کہو منیم جی کیا بھاؤ ہے۔

آواز: (ایک ہی سانس میں) سونا پاسہ ۱۵۶ ، سونا زیور ۲۲ کیرٹ ۱۵۰ ، سونا گنی . . . .

سرودیال: اوں ہوں۔ دوسرے . . . .

آواز: (اسی طرح ایک ہی سانس میں) گیہوں ڈرا ۴۹ ، فارم ۵۱ ، چنا ۵۸ جوار ۳۶ ، لوبیا ۴۴ ، باجرہ ۳۵ ، مکا ۳۴ ، مٹر ۴۵ ، جو ۴۲ ، ارہر ۶۲ اُرد ۶۶ ، مونگ ۶۸ ، گوار کالی ۳۰ ، سفید ۳۱ ، دال چنا . . . .

سرودیال: منیم جی :

آواز: جی سیٹھ جی :

سرودیال: ایک بار پھر بتائیے۔

آواز: (پھر ایک ہی سانس میں) گیہوں ڈرا ۴۹ ، فارم ۵۱ ، چنا ۵۸ ، جوار ۳۶ لوبیا ۴۴ ، باجرہ ۳۵ ، مکا ۳۴ ، مٹر ۴۵ ، جو ۴۲ ، ارہر ۶۲ اُرد ۶۶ مونگ ۶۸ ، گوار کالی . . . .

سرودیال: بس بس منیم جی ہوگیا۔

آواز: کیا ؟

سرودیال: اُرد :

آواز: کتنا خریدلوں سیٹھ جی۔

سرودیال: ٹھیک ہے، بس لگادو، اور میرا خیال ہے دس نہیں پندرہ لگا دو۔ اور سنئے منیم جی، پندرہ منٹ کے بعد خود ہی مجھے ٹیلی فون کیجئے گا اب تو ہمارے گھر کے پاس ہی ٹیلیفون لگ گیا ہے۔ نمبر نوٹ کر لیجئے۔ دیناناتھ جی کیا نمبر ہے آپ کے ٹیلی فون کا ؟

دیناناتھ: (مری ہوئی آواز میں) نو ون ڈبل تھری فور ون۔

سرودیال: منیم جی

آواز: جی سیٹھ جی

سرودیال: نو ون ڈبل تھری فور ون۔ اور دیکھئے پندرہ منٹ کے بعد نمبر ٹیلیفون کیجئے۔

آواز: جی سیٹھ جی۔

(سرودیال چونگا رکھتا ہے)

سرودیال: بڑا آرام ہوگیا ہے، دیناناتھ جی بڑا آرام ہوگیا ہے۔ میل بھر دور جانا پڑتا تھا اور گھنٹوں بیٹھنا پڑتا تھا۔ آپ جانیں سٹے بازی میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ہر گھڑی بھاؤ بدلتے رہتے ہیں۔ اچھا، پندرہ منٹ کے بعد پھر آپ کو تکلیف دوں گا۔ . .

دیناناتھ: (مری ہوی آواز میں) جی نہیں، اس میں تکلیف کی . . . .

(سرودیال جاتا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

دیناناتھ: ہیلو

آواز: ہیلو

دیناناتھ: (زور سے) ہیلو

آواز: (ویسے ہی زور سے) ہیلو

(چونگا پٹکتا ہے)

دیناناتھ: ڈارلنگ ! ڈارلنگ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ؟

بیوی: کیا ہو رہا ہے ؟

دیناناتھ: کچھ نہیں ڈارلنگ کچھ نہیں۔ اٹھو، جلدی سے اٹھو اور ایک دم تیار ہوجاؤ۔

بیوی: تیار ہوجاؤں ؟ کس بات کے لئے تیار ہوجاؤں۔

دیناناتھ: بس تم تیار ہوجاؤ۔ ایک دم۔ اسی وقت۔ ایک منٹ میں ـ باہر چلیں گے۔

بیوی: باہر! باہر کہاں ؟

دیناناتھ: کہیں۔ کہیں بھی۔ کسی ہوٹل میں۔ کسی سینما میں اور نہیں تو کچھ شاپنگ کریں گے۔

بیوی: شاپنگ کریں گے اس وقت ؟ آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ؟

دیناناتھ: ہاں ڈارلنگ : میرا دماغ خراب ہوگیا ہے، اگر تم جلدی تیار نہ ہوگئیں تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میرا دماغ پھٹ جائے ؟

بیوی: لیکن آخر ہوا کیا ہے۔ یہ آپ ایک دم پریشان کیوں ہوگئے ہیں۔ ؟

دینا ناتھ : وہ پندرہ منٹ کے بعد پھر آئے گا ڈارلنگ۔ اس کے پندرہ منٹ کے بعد وہ پھر اور اس کے پندرہ منٹ کے بعد وہ پھر . . .

بیوی : تو کیا ہوا۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ؟

دینا ناتھ : نہیں ڈارلنگ۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ ڈارلنگ۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا ـــ بس اب تم دیر نہ کرو۔ ایک منٹ کی دیر نہ کرو۔ چلو جلدی سے کہیں بھاگ چلیں۔ ؟

بیوی : بھاگ چلیں ؟

دینا ناتھ : ہاں ڈارلنگ۔ اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتا۔ ابھی پندرہ منٹ کے بعد وہ پھر آئے گا۔ اور میرا سر چکرا رہا ہے۔ دن بھر دفتر کا کام کرتے کرتے میرا دماغ سن ہو گیا ہے۔ دفتر کی فائلیں میرا دماغ چاٹ چکی ہیں اور ابھی پندرہ منٹ کے بعد وہ پھر آئے گا . . .

بیوی : میں اُسے منع کر دوں گی۔

دینا ناتھ : نہیں ڈارلنگ ـــ تم اسے منع نہ کر سکو گی۔ اور اگر وہ نہیں آئے گا۔ تو کوئی اور آئے گا۔ کوئی اور نہیں آئے گا تو ٹیلی فون آئے گا . . .

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ چونکا اُٹھتا ہے۔)

دینا ناتھ : (مری ہوئی آواز میں) ہیلو

آواز : مسٹر دینا ناتھ

دینا ناتھ : بول رہا ہوں۔

آواز : یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔ مسٹر دینا ناتھ۔ میں بلونت رائے بول رہا ہوں۔ سیلز ٹیکس کمشنر۔

دینا ناتھ : (گھبرا کر) جی جی۔ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔

آواز : دیکھو، وہ پانڈے جی والے کیس کی فائیل تمہارے ہی پاس ہے نا ؟

دینا ناتھ : جی ہاں۔ جی ہاں۔ میرے ہی پاس ہے۔

آواز : تو اُسے لے کر فوراً میرے پاس آؤ۔ بنگلے پر۔ یہ تمہارا ٹیلی فون کس وقت لگا تھا ؟

دینا ناتھ : جی شام کو۔

آواز : اچھا کب تک آ رہے ہو ؟

دینا ناتھ : جی ابھی۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(چونکا اُٹھتا ہے)

دینا ناتھ : (آواز پھر مر سی جاتی ہے) ڈارلنگ : میں جا رہا ہوں ڈارلنگ !

بیوی : کہاں جا رہے ہیں اس وقت ؟ یہ اس وقت کس کا ٹیلی فون تھا ؟

دینا ناتھ : صاحب کا ٹیلی فون تھا ڈارلنگ ـــ بُلایا ہے۔ فوراً بلایا ہے۔

بیوی : صاحب نے بُلایا ہے (آواز میں تیزی آجاتی ہے) کیوں مجھے تم بے وقوف بناتے ہو۔ میں سب جانتی ہوں کہ اس آدھی رات کے وقت کس نے بُلایا ہے۔ آپ کو میرے سر کی قسم جو جھوٹ بولیں۔ سچ سچ بتا دیجئے کہاں جا رہے ہیں ؟ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گی۔

دینا ناتھ : تمہارے سر کی قسم ہے ڈارلنگ ! صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔

بیوی : جھوٹی قسم : اب آپ جھوٹی قسمیں بھی کھانے لگے۔ میں سمجھتی تھی ایک دن آپ کو ٹھوکر لگے گی اور آپ سنبھل جائیں گے۔ لیکن نہیں میری تو قسمت ہی پھوٹ چکی ہے۔ میں بھی اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ ایک دن نہیں رہوں گی۔ ایک منٹ نہیں رہوں گی۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) جائیے جہاں آپ کا جی چاہے چلے جائیے۔

دینا ناتھ : ڈارلنگ ! ڈارلنگ !!

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی ہی چلی جاتی ہے۔)

بقیہ: فردوسی رامائن کے چند قلمی نسخے

از جلوس فرمانروائی ویک ہزار یک صد و ہفتاد است از سال ہجری . . . انجام یافت۔ میرے نزدیک کتاب کا آغاز ۱۱۱۷ھ میں ہوا اور خاتمہ ۱۱۱۹ھ میں۔

نسخہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

" شاہی . . . . . وپوست آہو در برگرفت و بیدو پران بسیار می شنید خود ہم می خواند . . . . .

خاتمہ اس طرح ہے :" ہر روز بہ شادی و شب ہا بہ شادکامی ہمہ رامی گذاشت"

۶۔ رامائن

مصنف، سنہ کتابت، سنہ تصنیف وغیرہ نامعلوم۔ ضخامت ۲۴۸ اوراق۔ سائز ۴ × ۶ ۱/۲ انچ۔ سطریں فی صفحہ ۱۲۔ خط شکستہ، نمبر اندراج، ذخیرہ لٹن اخبار فارسی۔ معمولی کرم خوردہ۔ ناقص از ہر دو جانب۔ نسخہ میں کل ۶۲ ابواب ملتے ہیں۔ شروع کے چار باب نہیں پائے جاتے۔ اس کے علاوہ اور کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

آغاز : وشوامتر می گوید کہ بطرف صوبہ دکھن ہشں رنج راجہ می ردیم۔ الخ

خاتمہ : از تقدیر سبائی از تو کار آمنہ کہ سرای آں عمر از کشتن بخواہد بود

پرچھائیں بھی کشمکش کو
نہ روک سکی

شہریار

کشمکش

جسم کے قہر کی فریادی ہے
رُوحِ تنہائی
پھر بھی آنکھوں میں مری دُور تلک
نیند کی پرچھائیں نہیں
اور اُفق دُھند کا زندانی ہے
اور سناٹوں کی سرگوشیاں
تلواریں لیے
صف بہ صف بڑھتی چلی آتی ہیں دِل کی جانب
دھڑکنیں چھیننے
سانسوں کا گلا کاٹنے کو
ہونٹ اُس سمت ہیں، آنکھیں ہیں اُدھر
ہاتھ اِدھر
اور میں ہل نہیں سکتا ذرا اپنی جا سے
بچ کے جاؤں گا کہاں
رات کے اِس صحرا سے

ایک نظم

ابھی تو رنگ کی اُڑان
سرحدِ نظر میں ہے

ابھی تو نورِ لازوال :
دِل کی رہ گذر میں ہے

ابھی تو رُوح بے قرار
جسم کے سفر میں ہے

ابھی سے آئینے تمام
ٹوٹ کر بکھر گئے

ابھی سے خوف کے مہیب
دیوتا بکھر گئے

محمد عمران خاں

ہنگامۂ غدر اور ٹونک

جس وقت ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا، اس وقت ٹونک کی یہ نومولود ریاست اپنی عمر کے صرف چالیس سال گذار سکی تھی۔ ۱۸۱۷ء میں اس ریاست کے بانی نواب میرخاں انگریزوں سے معاہدہ کرکے اپنے جری و بہادر ساتھیوں کی اُمنگوں پر پانی پھیر چکے تھے۔

یہ ریاست سید احمد شہید رہ کی تحریکات کا مرکز رہی اور سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی اس ریاست کو سید صاحب کے نسبی و نسبتی پسماندگان کی خدمت کرنے کا فخر حاصل رہا۔

نواب میرخاں اور اُن کے جانشین نواب وزیرالدولہ دونوں سید صاحب سے تربیت یافتہ اور اُن کی تحریکات پر دل و جان سے فدا تھے۔

۱۸۵۷ء میں جب غدر کا ہنگامہ ہوا، اس وقت نواب وزیرالدولہ اس ریاست پر حکمرانی کر رہے تھے۔ موصوف اگرچہ اصولی طور پر اپنے بنیادی معاہدہ پر قائم رہے جو قیام ریاست کے وقت انگریزوں کے ساتھ ہوا تھا۔ عملاً بھی آپ نے ریاستی سطح پر کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیا جس کی وجہ سے اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہوتی یا انگریزوں کے خلاف بغاوت یا سرکشی کا الزام لگایا جاسکتا لیکن سکوت و خاموشی اختیار کرکے اگرچہ آپ نے ریاستی پہلو سے اپنے دامن کو اس ہنگامہ سے بچالیا لیکن یہاں کی رعایا اس پر اکتفا نہ کرسکی۔ اس لیے جونہی اس ہنگامہ کی خبریں یہاں پہنچیں، فوراً ہی یہاں کے عوام و خواص اور یہاں کی فوج و رعایا اس ہنگامہ میں شرکت کے لیے تیار ہوگئی اور جوق در جوق دہلی پہنچنا شروع کردیا۔ غدر کے واقعات پر جو تذکرے اور تبصرے لکھے گئے ہیں ان میں برابر یہ جھلکیاں نظر آتی ہیں کہ ٹونک سے کس طرح لوگ پہنچ کر شرکت کرتے رہے، لیکن خود ٹونک میں کیا بیتی۔ اس سے تمام تذکرے خالی نظر آتے ہیں۔ خود ریاست ٹونک کی ایک جامع تاریخ نہیں لکھی گئی جس میں یہ تفصیلات مل سکیں۔ اتفاق سے ریاست کا ایک قلمی تذکرہ جس کے شائع ہونے کی ابھی نوبت نہیں آئی ہے، نظر سے گذرا۔ اس تذکرے میں غدر کا واقعہ غیر معمولی طور پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غدر کے موقع پر خود اس ریاست میں اندرونی طور پر کیا خون خرابے ہوئے۔ یہاں کے لوگوں میں کس طرح یہ جذبہ پیدا ہوا اور اس کے لئے کیا کیا ہنگامہ آرائیاں کرنا پڑیں۔

غدر کے سلسلہ میں مختلف تذکروں اور روزناچوں میں ٹونک سے متعلق جو جھلکیاں ملتی ہیں، اُن کا خلاصہ اس طرح ہے۔

شمس العلماء ذکاءاللہ اس سلسلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سو دو سو کے قریب وہاں جہادی بن کر ٹونک سے آئے"

تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ میں ہے:-

"غلام معین الدین خاں رسالدار نے بادشاہ کو عرضی دی کہ فدوی ٹونک سے تقریباً پانچسو آدمیوں کے ساتھ آیا۔ اُن کو سپاہ کی صورت میں مرتب کیا اور پندرہ سو اور جہادی، غازی یا شہید بننے کے لیے، جمع ہوئے ہیں"

منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں۔

"۲۱ جولائی ۱۸۵۷ء ٹونک سے چھ سو مجاہد آئے اور آج بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اطلاع دی

کہ ابھی دو ہزار مجاہد اور آ رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ میرے پاس تم لوگوں کے رسد کا انتظام نہیں ہے"۔

"۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء جہادیوں کا ایک قائد اعظم ٹونک سے آیا اور بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی"۔

اِن حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے بسلسلہ مولوی نصیرالدین، مولانا محمد میاں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہی ٹونک ہے، جہاں سے مجاہدین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا ہے، یہاں تک کہ اُن کی تعداد دو ہزار یا دو ہزار سے بھی زائد ہو جاتی ہے"۔[1]

ایک دوسرے موقع پر تحریر کرتے ہیں۔

"دلی میں اصل باشندوں کی تعداد بقول شمس العلماء تقریباً دو سو تھی، یہ سرفروش و جانباز زیادہ تر بیرونجات سے آئے تھے۔ جن میں "ٹونک" کو یہ خاص شرف حاصل تھا کہ وہاں سے کم و بیش دو ہزار آئے تھے"۔[2]

جن علماء نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اُن کا ذکر کرتے ہوئے "باغی علماء"[3] میں لکھا ہے کہ مولوی امام خاں رسالدار ٹونک کے تھے، دلی آکر مجاہدین میں شامل ہوئے۔ اسی طرح مولوی عبدالغفور صاحب ٹونکی کو بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔

ان تمام اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ باشندگان ٹونک نے جس فدائیت اور والہانہ انداز[4] سے اس تحریک حصہ لیا اس کی نظیر دوسرے مقامات پر کم ملتی ہے۔

ریاست ٹونک کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ مفصل اور ضخیم تاریخ "تاریخ ٹونک" مصنفہ سید اصغر علی آبرو ہے۔ یہ کتاب اگرچہ غیر ضروری واقعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول نہیں ہو سکی لیکن اس میں بھی غدر کے اس ہنگامہ کو مختصراً اس طرح ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔

"اسی سال (۱۲۷۳ھ) میں صاحب زادہ میر عالم خاں صاحب خلفِ اکبر

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی۔ جلد چہارم صفحہ ۲۰۹

[2] ایضاً صفحہ ۲۱۷

[3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی صفحہ ۴۵

[4] ٹونک سے ان سربکفن جانے والے جانبازوں کے جوش و خروش کا اندازہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے اُس تاریخی ڈرامہ سے ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے واقعات کے سلسلہ میں ترتیب دیا گیا اور "آزمائش" کے نام سے شائع ہوا۔ ذیل میں اُس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اسی دوران میں "اللہ اکبر"، "نصر من اللہ و فتح قریب" کے نعرے سنائی دیتے تھے اور بڑے طریقہ پر مسلح مردوں اور عورتوں کی ایک ٹولی اندر آتی ہے۔ بخت خاں کو دیکھ کر سب بہت زور سے "السلام علیکم" کہتے ہیں۔ بخت خاں انہیں دیکھ کر مایوسی کے انداز میں سر ہلاتا ہے۔

بخت خاں:۔ بالیکم، بالیکم کہو۔ کون سے ملک سے آئے ہو۔

ایک جہادی: ہم ٹونک سے جہاد کرنے آئے ہیں۔

بخت خاں: ٹونک، ٹونک، وہی ٹونک نا، جہاں اپن سسرے انگریز ایک ٹھگ کا نواب بنائی وہیں رہین ہا کا تم کا وہی بھیجن ہے۔

جہادی: جی نہیں۔ نواب امیر علی خاں[1] کا انتقال ہو گیا۔ ہمارا نواب صاحب سے کوئی تعلق نہیں، ہم دین کے لیے لڑنے اور جان دینے آئے ہیں۔

بخت خاں: تو اِتی دور کاہے کا آیو بھیا، کا ہوان کتل کرنے کے لے، تم کا کوؤ نا ہین ملا ہے۔

جہادی: ہم عیسائی حکومت سے اور انگریزوں سے لڑنے آئے ہیں . . . .

بخت خاں: . . . . ای مہریاں کاہے کا آئی ہیں۔

جہادی عورتے: ہم بھی مردوں کے ساتھ لڑیں گے اور مریں گے۔

بخت خاں: بٹیا مرے کا ہوئے تو اپنے گھر جاؤ۔ . . . .

جہادی عورتے: آپ ہمیں میدان میں بھیج کر دیکھ لیجیے۔

بخت خاں: میدان مان۔ ہم تم کو نہ بھیج دیبا۔ پہلے لڑنا سیکھو تب مرنا آئی ہے۔ . . . . تو بٹیا پہلے تم کوائد سیکھو

جہادی عورتے: ہم فوجی قواعد سیکھنے کو تیار ہیں۔

---

[1] معلوم نہیں بعض تذکروں میں نواب امیر خاں کا نام امیر علی خاں کیوں شائع ہو گیا۔ غالباً کسی کو کہیں اشتباہ ہوا ہے۔ اس وجہ سے بعض تذکروں تک میں یہ نام لکھا ہے۔

ممتاز الدولہ اخوندزادہ ، محمد ایاز خاں بہادر استقامت جنگ ، خسر نواب امیر الدولہ بہادر بوجہ سرغنگی باغیان تمرد توأماں فوج ریاست کی ہنگامہ آرائی میں قتل ہوئے۔ اور اسی ہنگامہ میں صاحبزادہ صاحب مقتول کے ہاتھ سے بیان خان رسالدار شہید ہوئے اور انہیں دنوں صاحبزادہ عظیم اللہ خاں عرف بنے میاں برادر خرد صاحبزادہ صاحب مقتول نے مقید جیل ریاست ہو کر بحالت قید ہی انتقال کیا ـــ بتاریخ بست و چہارم ماہ ذی الحجہ یوم سہ شنبہ ۱۲۷۴ھ مفسدان گوالیار نے کہ تخمیناً بیس ہزار سوار اور پیادے تھے ، لکراج[۱] علاقہ ٹونک میں اوّل قیام کیا۔ بتاریخ بست و ششم ماہ مذکور روز پنجشنبہ سنہ صدر ، مفسدان خسارت منش نے اپنے لشکر کے تین حصے کر کے تین جانب سے ٹونک پر یورش کی ، وقتِ عصر سے غروب آفتاب تک بازار کارزار گرم رہا ، بعدہ بتاریخ بست و ہفتم مفسدین خبر آمد لشکر انگریزی سنکر بوقت نصف النہار فرار ہو گئے۔

(تاریخ ٹونک مطبوعہ صفحہ ۴۴)

" امیر نامہ فارسی " جو نواب میر خاں اور اس ریاست کی تاریخ کے سلسلہ میں بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے وہ اس سے بالکل خالی ہے ۔ اس لئے کہ یہ سانحہ اس کی تصنیف کے بعد واقع ہوا۔

مولوی سید احمد علی سیماب نے نواب محمد علی خاں کے دورِ حکومت میں " محامد علیہ " کے نام سے اس ریاست کی ایک مختصر تاریخ فارسی میں لکھی ہے ، جو اب تک شائع نہیں ہو سکی ۔ اس میں بھی ان واقعات کو تفصیل سے لکھنے سے گریز کیا گیا ہے۔

ہنگامۂ غدر کی سب سے زیادہ تفصیل جس کتاب میں ملتی ہے وہ واقعاتِ ہفدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر " مصنفہ دیوان شمس الدین ہے۔ رزیڈنٹ راجپوتانہ کی تحریک پر دوسری ریاستوں کی طرح ۱۲۷۰ھ میں اس کتاب کی ترتیب شروع ہوئی ۔ دوسرے تمام تذکروں کے مقابلہ میں یہ کتاب زیادہ اہم ہے ، اس لئے کہ اوّل تو یہ کتاب ریاستی سطح پر ترتیب دی گئی ۔ پھر اسے ایک دیوانِ ریاست نے ترتیب دیا جسے واقعات کے تحریر کرنے اور یکجا کرنے کی تمام سہولتیں حاصل تھیں ۔ غدر کا واقعہ اس کتاب میں غیر معمولی تفصیل سے لکھا گیا ہے اس لئے کہ کتاب کی ترتیب کے وقت یہ ہنگامہ برپا ہوا۔

ذیل میں ضروری حصوں کا اقتباس تحریر کیا جا رہا ہے[۱]

جب ماہ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ میں انگریزی فوج کی بغاوت کی خبر[۲] ٹونک میں فوج کے سرکاری ملازمین تک پہنچی ، نواب صاحب کی فوج کے ناعاقبت اندیش لوگوں نے بھی علم بغاوت بلند کر کے دہلی کی روانگی کا ارادہ کر لیا تاکہ انگریزی سرکار سے باغی فوج میں شامل ہو جائیں وہ یہاں اپنے خیمے نصب کر کے اپنی باقی تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگے ۔ اور بلوہ و فساد کے لئے آمادہ ہو گئے ۔[۳] .... مجبوراً اس فساد کی آگ کو بجھانے کی نیت سے مفسدوں کی چڑھی تنخواہیں ادا ہونے کی تجویز ہوئی ۔ ان لوگوں نے اپنے ابدی ولی نعمت سے انحراف کیا اور اپنی تنخواہیں وصول کر کے خود رائی اور خود سری کا راستہ اختیار کیا اور دہلی کے لئے روانہ ہو گئے ۔

[۴] یہ حالات دیکھ کر نواب صاحب کے علاتی بھائی صاحبزادہ محمد منیر خاں اور نواب کے ماموں امیر[۵] عالم خاں اور ان کے دونوں بیٹوں نے بھی دہلی جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ۔ نواب صاحب بہادر نے صاحبزادہ صاحب موصوف کو حکمت عمل سے

---

[۱] بناس ندی کے کنارے یہاں کا بندھ ، باغ اور کوٹھی قیام کے لئے بہترین مقام ہے اور بہترین تفریح گاہ بھی ہے۔

[۱] اصل فارسی عبارت کی بجائے اس کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔

[۲] یہ رمضان ۲۶ اپریل سنہ ۱۸۵۷ء روز یکشنبہ سے شروع ہو کر ۲۵ مئی سنہ ۱۸۵۷ء روز دوشنبہ کو ختم ہوا۔

[۳] درمیان میں وہ تفصیلات ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ اس باغی فوج نے کس طرح تنخواہ کی وصولی کے سلسلہ میں سختیاں کیں ۔ سرکاری اہلکاروں اور خزانچی کو گرفتار کر کے جبراً اپنی تنخواہیں وصول کیں اور دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

[۴] نواب وزیر الدولہ کے قریبی عزیزوں میں بھی بعض حضرات اس تحریک میں شامل تھے اور دہلی جانے کے لئے بالکل تیار ہو چکے تھے ۔ اس ہنگامہ میں ان کی شرکت خود نواب صاحب کی بدنامی کا سبب بن سکتی تھی ۔ اس لئے حسن تدبیر سے ان حضرات کو قید کر لیا گیا اور اس وقت تک انہیں آزاد نہیں کیا گیا جب تک کہ یہ فتنہ بالکل ختم نہیں ہو گیا۔

[۵] اس دور کے مشہور نوجوان شاعر مخمور سعیدی ٹونکی (مقیم دہلی) انہی کی اولاد میں ہیں۔

گرفتار کر کے بالاقلعہ کی سنگین قید میں قید کر دیا جو امیر گڑھ کے اندرونی حصہ میں واقع ہے اور امیر عالم خاں اور ان کے دونوں بیٹوں کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا۔ کمپو دوم کی فوج کا کچھ حصہ خانصاحب محمد فیض اللہ خاں[1] اہلکار جو کمپو دوم کے افسر کلاں تھے ان کی نگرانی وافسری میں ان لوگوں کی گرفتاری کے لئے مامور ہوا۔ مذکورہ فوج نے ان کے سکونتی مکان کا محاصرہ کر کے ان لوگوں کو حویلی[2] میں سے باہر طلب کیا۔ یہ لوگ مقابلہ کے ارادے سے باہر آئے اور یہاں خان رسالدار غول کو بندوق سے ہلاک کر دیا اور مار پیٹ کے لئے تیار ہو گئے۔ اسی دار و گیر کے ہنگامہ میں چونکہ اُن کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس لئے سپاہیوں کے ہاتھ سے قتل کر دیئے گئے۔ اور اُن کے دونوں بیٹے زندہ گرفتار لے جا کر قلعہ میں قید کر دیئے گئے۔ اور اس مدت تک قید میں رہے جب تک کہ انگریزی حکومت کی جانب سے باغیوں کے قصور معاف کرنیکا حکم جاری نہ ہو گیا۔ تب ان لوگوں نے اور صاحبزادہ محمد منیر خاں نے رہائی پائی۔"

اس کے بعد اس سلسلہ کی مزید تفصیلات سے خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ جن حضرات نے نواب صاحب کی پالیسی سے اختلاف کر کے علم بغاوت بلند کیا اونکی تعداد کوئی معمولی تعداد نہیں تھی جسے یونہی صرف نظر کر لیا جاتا یہ لوگ ایک معتدبہ تعداد میں تھے اور طاقت کے بھی مالک تھے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں نے طلب تنخواہ کے سلسلہ میں کارپردازان سرکاری تک کا ناطقہ بند کر دیا اور شورش بپا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اگر ایسا نہیں ہوتا تو نواب وزیرالدولہ اپنی پالیسی کے تحت ہرگز ان لوگوں کو دہلی جانے کی اجازت نہیں دیتے اور انہیں بھی گرفتار کر کے اُن کے ساتھ وہی عمل کرتے جو اپنے عزیزوں کے ساتھ کیا۔ مجبوراً ان لوگوں کو اجازت دیدی گئی۔ لیکن چونکہ خود نواب صاحب انگریزوں کے خلاف نہیں تھے اس لئے لوگوں کے اس اقدام اور اس جذبہ کو سراہا نہیں گیا۔ تذکرہ نویس اور تاریخ نگار حضرات تک نے اس واقعہ کی تفصیل بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ یہ تمام تذکرے انگریزی دور میں مرتب ہوئے۔ یہاں کے رئیس نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی یا اُن کی ریاست کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب ہو جس سے بغاوت کا الزام لگایا جا سکے۔ افسوس اب کوئی ایسا ذریعہ باقی نہیں رہا جس سے یہ تفصیلات حاصل ہو جائیں۔ یا ان حضرات کے نام یہ تفصیل معلوم ہو سکیں جنہوں نے اس جنگ آزادی میں حصہ لیا۔

ہنگامۂ غدر فرو ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی پھر اس ٹونک کو میدانِ آزمائش میں اُترنا پڑا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ اکثر مقامات پر فرنگی طاقتوں کا تسلط ہو چکا تھا اور جنگ آزادی کے "بقیہ السیف" چند افراد، فیروز شاہ، نواب صاحب باندہ، تانتیا ٹوپے اور راؤ صاحب وغیرہ مختلف مقامات پر دھاوے مار رہے تھے! اور گوالیار میں شکست کے بعد راجپوتانہ کا رُخ تھا۔ چنانچہ جھالاور، جے پور ہوتے ہوئے یہ لوگ ایک دم ٹونک میں داخل ہو گئے۔ اور ٹونک پر قبضہ کرنا چاہا۔ انہیں امید تھی کہ نواب صاحب ٹونک اب بھی شاید ان کا ساتھ دیدیں۔ لیکن اُن کی توقع پوری نہیں ہوئی اور انہیں نواب سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر انگریزی فوجیں جو ہر طرف سے تعاقب میں تھیں، انہوں نے زیادہ موقع نہیں دیا۔ ورنہ پورے شہر پر ان لوگوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔

مذکورہ کتاب میں یہ واقعات اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

ذلیقعدہ ۱۲۷۵ھ[3] میں دہلی سے باغی فوج کے شکست کھانے کے بعد تانتیا ٹوپے، راؤ صاحب، فیروز شاہ، نواب باندہ اور نواب رحم علی خاں وغیرہ مفسد لوگوں کی کثیر جماعت جو مور و ملخ سے زیادہ تقریباً ہزار[4] آدمی سوار و پیادہ کے قلعہ مرار و گوالیار کی تسخیر کے بعد جے پور کی عملداری کے راستے.... نصیر محمد خاں باغی کی رہنمائی میں جو اس سے پہلے ریاست ٹونک کا جاگیردار رہا ہے، ٹونک میں داخل ہو گئے۔ نواب صاحب نے اول رود بناس[5] پر جو ٹونک سے قریب واقع ہے

---

[1] مختار الدولہ محمود خاں بہادر کے داماد تھے۔ فوج کے بڑے افسروں میں سے تھے اور بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۲۵۹ھ میں مختار الدولہ کا انتقال ہوا تو انکی جگہ انہی کا تقرر عمل میں آیا اور کمپو دوم اُن کے سپرد ہوا۔

[2] یہ مکان شکستہ حالت میں اب بھی آباد ہے۔ حویلی سے باہر جو میدان ہے اس میں یہ مقابلہ ہوا۔ یہ گھیر اب تک میر عالم خاں کے گھیر کے نام سے موسوم ومعروف ہے۔

[3] پیش نظر نسخہ میں اس موقع پر ۱۲۷۵ھ لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ اس لئے کہ یہ واقعات سنہ ۱۲۷۱ھ میں پیش آئے اور دوسری تمام تاریخوں میں بھی سنہ ۱۲۷۴ھ ہی درج ہے۔ یہ سال ۲۲ اگست سنہ ۱۸۵۷ء روز شنبہ سے شروع ہو کر ۱۰ اگست ۱۸۵۸ء روز سہ شنبہ پر ختم ہوتا ہے۔ تاریخ ٹونک آبرو میں ذیقعدہ کے بجائے ذی الحجہ کا مہینہ لکھا ہے اور تاریخیں اس طرح لکھی گئی ہیں۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۷۴ھ روز سہ شنبہ (۵ اگست ۱۸۵۸ء) کو یہ لوگ آئے۔ ۲۶ ذی الحجہ

ان سے مقابلہ کا ارادہ کیا۔ اس کے بعد قلعہ میرگڑھ سے میدان میں مقابلہ کیا۔ اس لئے کہ ریاست کے مشیروں نے صلاح دی کہ سرکاری جماعت قلیل ہے۔ اور مفسد لوگ ہزاروں[4] کی تعداد میں ہیں اس لئے توپخانہ کمپو خاص اور توپخانہ[6] قلعہ باہر کے میدان سے قلعہ کے اندر سے کر ان سے محاربہ ہونا چاہئے اور ان سے مقابلہ کے لئے، کمپو دوم کی فوج اور دونوں توپخانے قلعہ سے باہر چھوڑ دینا چاہئے۔ نواب صاحب سے صلاح کاروں کی بہت عرض معروض کے بعد اس مشورہ کو منظور فرمایا۔[7]

جب باغی لوگ کمپو دوم کے قواعد کے میدان میں جوق جوق اور فوج در فوج داخل ہوئے۔ کمپو دوم کی فوج[8] نے معہ دونوں توپخانوں کے ان سے مقابلہ کیا۔ مگر چونکہ باغیوں کی جمعیت کئی ہزار تھی اور یہ لوگ کم تھے ظاہر ہے کہ قلیل جماعت، کثیر جماعت کے مقابلہ میں کیا کر سکتی ہے، اس لئے اُن کا مقابلہ بے سود رہا اور ان کے پائے ثبات میں تزلزل پیدا ہوگیا۔ مذکورہ باغیوں نے محمد فیض اللہ خاں افسر کلاں اور دوسرے افسران کو قید کر لیا اور تمام میگزین اور دونوں توپ خانوں پر مسلط و قابض ہو گئے۔[10]

اس کے بعد جیلخانہ صدر[11] اور کوتوالیوں[12] پر پہنچ کر تمام قیدیوں کو قید سے رہا کر دیا گیا۔ اور تھانوں میں بیٹھ کر تمام شہر میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا گیا اور بعض لوگوں کا مال لوٹنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ سہ پہر کے وقت کمپو دوم کی چاروں توپوں کے ساتھ جن پر قبضہ کیا گیا تھا، اپنے مورچے قلعہ چاروں طرف موتی باغ[13] اور نظر باغ سے متصل لگا کر قلعہ امیرگڑھ پر گولہ

سنہ ۱۲۷۴ھ روز پنجشنبہ (۷ اگست ۱۸۵۸ء) کو ٹونک پر یورش کی اور ۲۷ ذی الحجہ (۸ اگست ۱۸۵۸ء) کو بوقت نصف النہار یہ لوگ فرار ہوگئے۔

[2] ان جانبازان حریت کے حالات غدر کے سلسلہ میں تمام ہی تذکروں میں موجود ہیں۔ اسلئے ان حضرات پر یہاں مزید کچھ نوٹ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

[3] تاریخ ٹونک آبرو میں یہ تعداد بیس ہزار ظاہر کی گئی ہے خود اس کتاب کی بعد کی عبارتوں سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

[4] چونکہ کالون کی یہ فوج جے پور کی طرف سے آرہی تھی۔ اس لئے نکراج میں جانب شمال ان کا قیام ہوا جو بناس ندی کے کنارے پر آباد ہے۔ ندی درمیان میں حائل تھی اس لئے اصولاً پہلا مقابلہ وہیں ہو سکتا تھا۔

[5] یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ سابق میں جو "ہزار کس" لکھا ہے وہاں کاتب کا سہو ہے

[6] یہاں توپخانہ کا نام لکھا ہے۔ لیکن نام اس طرح لکھا گیا ہے جو پڑھنے میں نہیں آتا۔

[7] یہ مشورہ اس وجہ سے بھی برابر دیا جا رہا تھا کہ نواب کو اب بھی فوج پر پورا اعتماد نہیں تھا۔ ایسی حالت میں کھلے میدان میں مقابلہ کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ اسی لئے قلعہ میں بند ہو کر مقابلہ کیا گیا۔

[8] اس کمپو کا پڑاؤ اس مقام پر تھا جو اسی وقت سے چھاؤنی کے نام سے آباد ہے اور اب بھی شہر کے ایک محلے کی حیثیت سے اسی نام سے معروف ہے۔

[10] اس ہزیمت کی اصل وجہ یہ بھی تھی کہ جونہی توپ خانہ کی طرف سے توپیں جمائی گئیں، باغیوں نے فوراً کلمے پڑھے اور اظہار کیا کہ مسلمان ہو کر مسلمانوں پر توپیں چلا رہے ہو، اکثریت نے ارادہ مقابلہ کا ترک کر دیا۔ فیض اللہ اور دوسرے افسران اس کے لئے تیار نہیں ہوئے اس لئے انہیں باغیوں کی طرف سے گرفتار کر لیا گیا اور اس طرح اس پورے توپخانے پر باغیوں کا قبضہ ہوگیا۔ یہی وہ خطرہ تھا جو نواب صاحب اور اُن کے خاص مشیروں کو پہلے سے لاحق تھا۔

[11] جیل خانہ کی یہ عمارت اب بھی موتی باغ کے گوشہ پر پرانے جیلخانے کے نام سے موسوم ہے اور اس عمارت میں اب بھی شفاخانہ حیوانات وغیرہ چل رہے ہیں۔

[12] اُس دَور میں اصل کوتوالی جامع مسجد امیر گنج سے قریب چاہ کلاں کے گوشہ جنوب مشرق میں جو عمارت ہے اُس میں قائم ہے۔ اس عمارت میں اب ایک ہوٹل قائم ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے چاروں طرف پولیس کی چوکیاں قائم تھیں۔ ان سب پر بھی باغی فوجوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ اور شہر میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

[13] یہ باغ اُسی وقت سے گورستان بنایا جا چکا ہے۔ باغ کے جانب جنوب تالاب ہے۔ اُس کے کنارے پر چند عمارتیں ابتدائی دَور کی تعمیر شدہ موجود ہیں۔ انہی عمارتوں میں آنے والے باغی امراء کا قیام تھا۔

اندازی اور توپ زنی شروع کردی اور محاصرہ و محاربہ تک سے دریغ نہیں کیا۔

اس طرف سے نواب صاحب بہادر نے بھی پورے استقلال، جوانمردی اور توکل علی اللہ کے ساتھ مفسدوں پر توپ زنی کا حکم دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک گھڑی دن باقی رہا تھا اور اس وقت سے تمام رات اور تمام دن میں ایک گھڑی دن چڑھے تک قلعہ سے توپ اندازی اور گولہ باری جاری رہی۔[1] ۔ ۔ ۔ ۔ مفسد لوگ بھی پوری بہادری کے ساتھ قلعہ کے نیچے تک آگئے اور گھوڑے کھول کر دے گئے حالانکہ مفسدین کافی تعداد میں تلف ہوئے اور حالانکہ وہ لوگ پوری دلیری کے ساتھ بُرج اور بالا قلعہ کے قریب تک آگئے تھے۔ لیکن صرف اللہ کے فضل اور اس کی حفاظت کی وجہ سے قلعہ پر یورش کا موقعہ نہ آسکا اور مخالفین سینکڑوں کی تعداد میں گولہ و تفنگ کی صدمات سے ہلاک ہوکر خاک میں لوٹا دیئے گئے۔ باغیوں نے سرکاری گنجیوٹن[2] میں آگ لگا کر ہلاک شدہ لوگوں کو اس میں جلا دیا۔ اور سرکاری فراشخانہ کا بہت سامان جو قیام وغیرہ سے متعلق تھا اور قلعہ سے باہر تھا، لوٹ کر ساتھ لے گئے۔ اور اس کے علاوہ کمپو دوم کی چاروں توپیں[3] اور وہاں کا میگزین اور سرکاری ہتھیار بھی لوٹ کرلے گئے۔

اس درمیان میں نواب صاحب نے پولیٹیکل ایجنٹ جے پور اور رزیڈنٹ دیولی چھاؤنی کو اطلاع دیدی تھی۔ اس لئے فوراً ہی دونوں جانب سے انگریزی فوج تیار ہوکر آگئی جن کی وجہ سے ان حضرات کو فوراً ہی یہ علاقہ چھوڑ کر آگے جانا پڑا۔

اس سلسلہ میں موصوف لکھتے ہیں:۔

" باغیوں نے جب سرکاری (انگریزی) فوج کی آمد کی خبر سنی۔ اس روز زوال سے پہلے پہلے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے اور انگریزی فوج کے مقابلہ میں موت دیکھ کر اپنی شکست کو غنیمت جانا اور بھاگ جانے کی شرم کو پسند کرتے ہوئے بھاگ گئے۔ کمپو دوم کے لوگوں سے جو چار توپیں چھینی گئی تھیں وہ بھی ساتھ تھیں اس طرح یہ لوگ بروآڑہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور جے پور کے علاقہ میں ہوتے ہوئے ناتھ دوارہ کا رُخ کیا۔ انگریزی فوج نے ٹونک پہنچکر آمد کے سلسلہ میں کچھ قیام و آرام کیا اور اس کے بعد مفسدوں کے تعاقب میں ٹونک سے روانہ ہوگئی۔

صاحب ریجنٹ بہادر نے چند روز ٹونک میں قیام اور محمد فیض اللہ خاں باغیوں کی قید سے رہائی پاکر نواب صاحب بہادر کے حضور میں حاضر ہوئے میجر ایڈل صاحب اور انگریزی فوج کے دوسرے افسروں کو یہ گمان و شبہ ہوگیا تھا کہ شاید کمپو دوم کی فوج نے باغیوں سے ساز باز کر لیا تھا اور سرکاری توپوں میگزین اور ہتھیاروں وغیرہ سے اُن کی مدد کی تھی[2]۔ نواب صاحب بہادر نے اُن کے اس شک و شبہ کو بالکل دور کیا جو افسران وغیرہ کے ذہنوں میں جاگزیں ہوچکا تھا۔

---

[1] یہاں میگزین کا وہ واقعہ نقل کیا گیا ہے جو عین محاصرہ کی حالت میں پیش آیا کسی بے احتیاطی سے قلعہ کے اندر بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی۔ جس کی وجہ سے قیامت خیز دھماکہ ہوا، بہت سامان جل کر خاک ہوگیا اور کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس واقعہ کی کچھ تفصیل یہاں بیان کی گئی ہے

[2] تالاب موتی باغ کے جانب جنوب اسی وقت سے " ذخیرہ کے نام سے وہ مقام ہے جہاں سرکاری جانوروں کے چارہ کے لئے گھاس وغیرہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اس کی گنجیوں میں آگ لگا کر باغیوں نے اپنے مقتولوں کو جلایا یہ مقام اب بھی اسی نام سے موسوم ہے اور اس میں جنگلات کا دفتر قائم ہے

[3] یہ چاروں توپیں باغیوں کے ساتھ رہیں۔ حتیٰ کہ ناتھ دوارہ جاکر اُن کی گرفتاری عمل میں آئی۔ توپیں ضبط کرکے گلا دی گئیں۔ فتنہ رفع ہوجانے کے بعد ریاست نے ان توپوں کا مطالبہ کیا، تو اُن کے بجائے آگرہ کے قلعہ سے دو توپیں ریاست کو دی گئیں۔

[1] ٹونک سے قریب، جے پور کے ایک ٹھکانہ کا نام ہے جو ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔

[2] اس بیان سے پورا اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کے ہنگامہ کے سلسلہ میں ٹونک سے مجاہدین کا جو تانتا بندھا ہوا تھا، اس کی وجہ سے انگریزوں کو سخت خطرہ تھا کہ کہیں ٹونک کی فوج یا فوج کے ساتھ خود نواب صاحب کی طرف سے بغاوت نہ ہوجائے۔ لیکن نواب وزیرالدولہ اس معاملہ میں پختہ اور اپنے معاہدہ کے پورے پابند تھے۔ فوج کے ایک حصہ نے اس موقع پر بھی عین وقت پر بھی ساتھ چھوڑ دیا جس کی وجہ سے انگریزوں کی جانب سے اس بدگمانی کا موقع آیا لیکن چوں کہ مخالفین کی کثرت اور ریاستی فوج

ان تمام اقتباسات سے اس سلسلہ کی کافی تفصیلات علم میں آجاتی ہیں جن کا ذکر تاریخ کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا۔ لیکن اس قدر تفصیل کے باوجود چند باتیں خصوصیت سے سامنے آتی ہیں۔ یہاں کے علمی ماحول اور اصلاحی تحریکات کی وجہ سے یہاں انقلابی تخیل کا پیدا ہونا اور یہاں کے لوگوں کا اس انقلابی تحریک کے اثرات فوراً قبول کرلینا ایک فطری امر تھا۔ یہ وہ علاقہ یا وہ مقام نہیں جہاں ماحول بنانے اور جدّو جہد کرنے کی ضرورت ہوتی۔ یہاں سید صاحب کے اثرات موجود تھے۔ اُن کی شہادت کے بعد اُن کے خلفار ومتعلقین یہاں آباد تھے مولانا نصیرالدین دہلوی اپنی تحریک کے پورے اثرات یہاں چھوڑ کر گئے تھے اور زمانۂ غدر کے رئیس المجاہدین مولانا احمد اللہ شاہ ایک مدت ٹونک میں گزار چکے تھے۔ اِن ہی تمام اسباب وحالات کا نتیجہ تھا کہ جونہی دہلی سے اطلاعات ملیں، یہاں کے عوام وخواص اور یہاں کی فوجیں فوراً دہلی جانے کے لئے تیار ہوگئیں۔

کی قلت کا ایک صحیح عذر موجود تھا اس لئے انگریزوں کی اس بدگمانی کو بآسانی دور کردیا گیا اور انہیں مطمئن کردیا گیا کہ فوج نے سازباز نہیں کیا تھا۔

۲ـ اس کے بعد کتاب ہذا میں باغی فوجوں کے ٹونک سے روانہ ہونے کے بعد کے کچھ حالات ہیں۔ خصوصاً وہ واقعات جو بھوپال کی طرف روانہ ہونے کے بعد، ٹونک کے پرگنہ سرونج پر قبضہ کرنے کے سلسلہ میں رونما ہوئے۔ لیکن چونکہ آثار مالوہ مطبوعہ میں جو سرونج کے حالات پر مفصل کتاب ہے۔ اسی قلمی کتاب کے حوالہ سے وہ واقعات تفصیل سے بیان کردیئے گئے ہیں۔ اسی لئے ان واقعات کو یہاں نہیں دُہرایا گیا۔ اسی طرح ٹونک کے ایک دوسرے پرگنہ نیماہیڑہ ضلع چتوڑ کے واقعات بھی اس بغاوت کے سلسلہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں غیر متعلق ہونے کی وجہ سے اِن تفصیلات کا ذکر بھی نہیں کیا گیا ہے۔

قاسم شبیر نقوی

غزل

ازل کی بزم میں جس کا بنا امانت دار
گنوائے دیتا ہے انساں وہ دردِ دل کا وقار
ہے بُت پرست بھی دل اور بُت شکن بھی ہے
بنا بنا کے مٹاتا ہے روز نقش ونگار
مریضِ دل کے تو اچھے بھی ہو گئے اکثر
خدا کرے کہ نہ ہو کوئی ذہنیت بیمار
نظر کو زحمتِ تنقید دے اگر کوئی
بہار اصلِ خزاں ہے۔ خزاں ہے اصلِ بہار
ابھی حیات کی آسودگی ہے سست قدم
اگرچہ بڑھ گئی کتنی ہی عقل کی رفتار
میں محوِ منظرِ رخصت تھا جب نگاہ ہٹی
تو یاد آیا ترا مُڑ کے دیکھنا اک بار
چلو تمہیں سہی اہلِ وفا میں کچھ بھی نہیں
ذرا سی بات پہ اب تم سے کیا کروں تکرار
خدا کرے کہ محبت نہ یوں ستم توڑے
کہ حسن اپنے لئے ڈھونڈھتا پھرے غمخوار
ہر اک لفظ میں قاسم ہے نشترِ پنہاں
کھلے ہیں زخم کہ تو نے لکھے ہیں یہ اشعار

ہماری دو بنیادی ضرورتیں

بجلی پانی

ہندوستان کے تمام گاؤوں میں کھیتی باڑی کے لئے آب پاشی کی سہولتیں بہم پہنچانے کی ضرورت محتاج بیان نہیں۔ ہمارے ملک کی زرعی ترقی کے لئے یہ ایک بنیادی ضرورت ہے" یہ الفاظ گاندھی جی نے حصول آزادی سے ایک سال قبل سنہ ۱۹۴۶ میں کہے تھے۔ ایک وسیع ملک کے لئے جس کی زمین زرخیز ہو اور جس میں معدنیات کے قدرتی وسائل کی بھی فراوانی ہو۔ خوشحالی کی منزل تک پہنچنے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے؟ اس کا واضح جواب ہے پانی اور بجلی۔



بھاکڑا ڈیم

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو ہندوستان میں آبپاشی کی سہولتیں بالکل ناکافی تھیں اور ۸۲ فیصدی زیر کاشت رقبے میں کاشتکار بارش کے رحم و کرم پر تھے۔ لیکن تیسرے پلان کے اختتام تک ہندوستان میں پچاس فیصد سے زیادہ زیر کاشت رقبے کے لئے آبپاشی کی سہولتوں کا انتظام کیا جا چکا تھا۔

حصول آزادی کے بعد حکومت ہند نے ملک کی خوشحالی کے لئے دریاؤں کے پانی کو استعمال میں لانے کے کام کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ برسات میں ان میں بہت سے دریاؤں میں سیلاب آنے کے باعث بے شمار دیہات میں فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی تھیں اور اس کے علاوہ جانی نقصان بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ ان دریاؤں کو قابو میں لاکر ان سے فائدہ اُٹھانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔

آبپاشی سے متعلق جن پراجیکٹوں پر عمل شروع کیا گیا۔ انہیں تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بڑے پیمانے کے منصوبے۔ درمیانہ درجے کے منصوبے، اور چھوٹے پیمانے کے منصوبے۔ بڑے منصوبے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں بھاکڑا ننگل (پنجاب) ریہاند (اتر پردیش) دامودر ویلی (بہار و مغربی بنگال) ہیراکنڈ (اڑیسہ) کوسی (بہار) مایورکشی (بہار و مغربی بنگال) ناگ ارجن ساگر (آندھرا پردیش) چمبل (راجستھان و مدھیہ پردیش) لوئر بھوانی (مدراس) اور تنگ بھدرا (آندھرا پردیش اور میسور) شامل ہیں۔ ان میں سے کئی پروجیکٹ بیک وقت ایک سے زیادہ ریاستوں کے لئے آبپاشی و بجلی کی سہولتیں فراہم کرنے کے نقطہ نظر سے تیار کئے گئے تھے اور یہ جدید



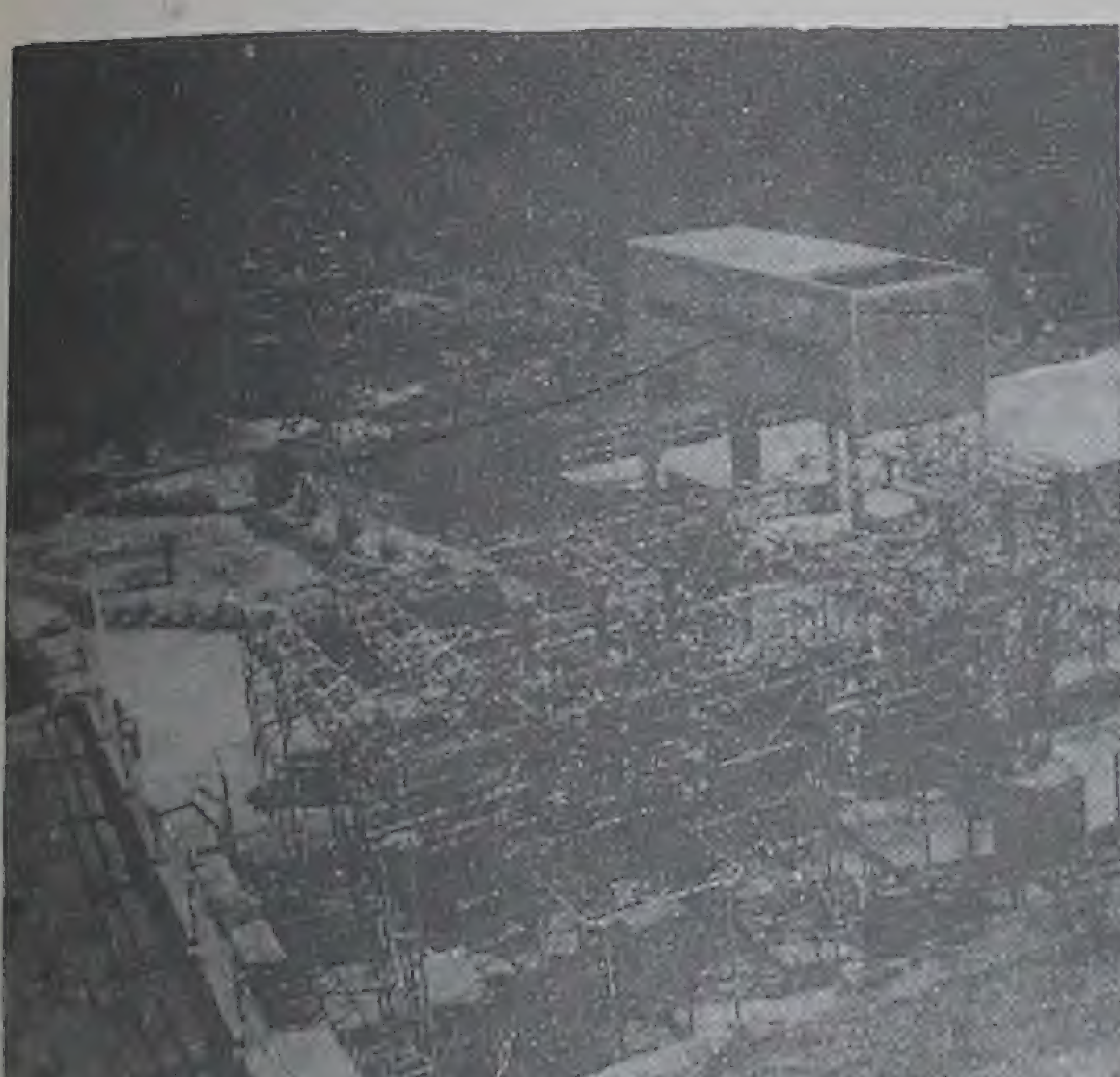
ہیراکڈ ڈیم

ہندوستان کے اتحاد اور اس کی طاقت کے مظہر ہیں۔ ان میں سے ہر پراجیکٹ کی تکمیل کے سلسلے میں کثیر رقم صرف ہوئی ہے اور یہ انجینیروں کی مہارت اور انسانی مشقت کی کامیابی کی درخشاں مثال پیش کرتے ہیں۔ پنجاب کا بھاکڑا ڈیم دُنیا کے بلند ترین ڈیم میں سے ہے۔ اس کی بلندی ۷۴۰ فٹ ہے۔ جو کہ دہلی کے قطب مینار کی بلندی سے تین گُنا ہے۔ اس ڈیم سے آبپاشی کے لیے جو نہریں نکالی گئیں ان کا مجموعی طول ۲۰۰۰ میل کے لگ بھگ ہے۔ اڑیسہ کا ہیراکڈ ڈیم تقریباً ۱۶ میل لمبا ہے۔ یہ دُنیا کا سب سے لمبا ڈیم ہے

بجلی کی پیداوار میں اضافہ

قدرتی وسائل سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے برقی قوت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر بجلی کافی مقدار میں میسر ہو تو ہم اس کی مدد سے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے نئی صنعتیں قائم کر سکتے ہیں۔ اس سے ہمارے ملک کی دولت بڑھے گی۔ لہٰذا زیادہ مقدار میں بجلی پیدا کرنے کی اسکیمیں مرتب کی گئیں اور پنجسالہ پلانوں میں ان اسکیموں کو کافی اہمیت دی گئی۔ بھاکڑا ننگل (پنجاب)، ہیراکڈ (اڑیسہ) چمبل (راجستھان اور مدھیہ پردیش)، ریہاند اور جمنا ویلی کی اسکیمیں (اترپردیش) تنگ بھدرا اور شراوتی (میسور) پریار اور کندہ (مدراس)، کوئنا (مہاراشٹر) سابارگری (کیرالہ) اور امایم (آسام) کے پروجیکٹوں کی تکمیل سے بجلی کی پیداوار میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ ان کی بدولت ہمارے ملک کی بجلی تیار کرنے کی صلاحیت سنہ ۱۹۵۱ء کے مقابلے میں چار گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ کوئلہ اور اور گیس کی مدد سے بجلی پیدا کرنے کے سلسلے میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے ——— ان بجلی گھروں میں گوہاٹی اور ناہرکٹیا (آسام) دھوارن (گجرات) بوکارو اور چندرپور (بہار) درگاپور اور بندیل (مغربی بنگال) ٹرامبے، کھاپر کھیڑا اور چولا کلیان (مہاراشٹر) کوربا (مدھیہ پردیش) اور نیویلی (مدراس) کے بجلی گھر قابل ذکر ہیں۔ یہ بجلی گھر کوئلے کی کانوں، تیل صاف کرنے کے کارخانوں اور قدرتی گیس کے وسائل سے نزدیکی مقامات پر واقع ہیں۔ جہاں ایندھن بہ آسانی دستیاب ہو سکتا ہے

اس کے علاوہ ایٹمی بجلی پیدا کرنے کے سلسلے میں قابل قدر ترقی ہوئی ہے۔ بمبئی کے نزدیک تاراپور اور راجستھان میں کوٹہ کے نزدیک رانا پرتاپ ساگر کے مقام پر ایٹمی بجلی گھروں کی تعمیر کے اقدامات اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہیں۔ چوتھے پنجسالہ پلان کے دوران



ایک بجلی گھر

کلپاکم (مدراس) کے مقام پر بھی ایک اٹیمی بجلی گھر تعمیر ہو جانے کی توقع ہے۔

آزادی سے پہلے ہندوستان میں بجلی کی فی کس کھپت محض ۱۳ یونٹ سالانہ تھی۔ بجلی تیار کرنے کی متعدد اسکیموں پر عمل درآمد کے نتیجے کے طور پر اب ملک میں فی کس ۸۲ یونٹ بجلی تیار کی جا رہی ہے

۱۹۵۱ء میں ملک بھر کے بجلی گھروں کی صلاحیت پیداوار ۲۳ لاکھ کلوواٹ تھی جو کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں ایک کروڑ سے زیادہ کلوواٹ تک پہنچ چکی تھی۔ ایک کلوواٹ گھنٹے بجلی کی طاقت ایک آدمی کے دس گھنٹے کے مسلسل کام کے برابر ہے اور انسانی محنت کے لئے دی جانے والی اُجرت کے مقابلے میں اس پر بہت کم لاگت آتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس قدر کم لاگت سے کام کرنے کی کتنی قوت پیدا کی گئی ہے لیکن اپنی ترقیاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں اس سے بھی کہیں زیادہ بجلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔



گاؤں میں بجلی

آزادی سے پہلے ہندوستان کے صرف دو ہزار دیہات میں بجلی کی سہولتیں میسر تھیں۔ جب کہ اس وقت ۶۱ ہزار سے زیادہ دیہات بجلی سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ آبادی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس وقت ہندوستان کی تقریباً ایک تہائی آبادی کے لئے بجلی کی سہولتیں میسر ہیں۔ توقع ہے کہ چوتھے پنجسالہ پلان کے اختتام تک تقریباً ایک لاکھ



آب پاشی کے لئے ٹیوب ویل

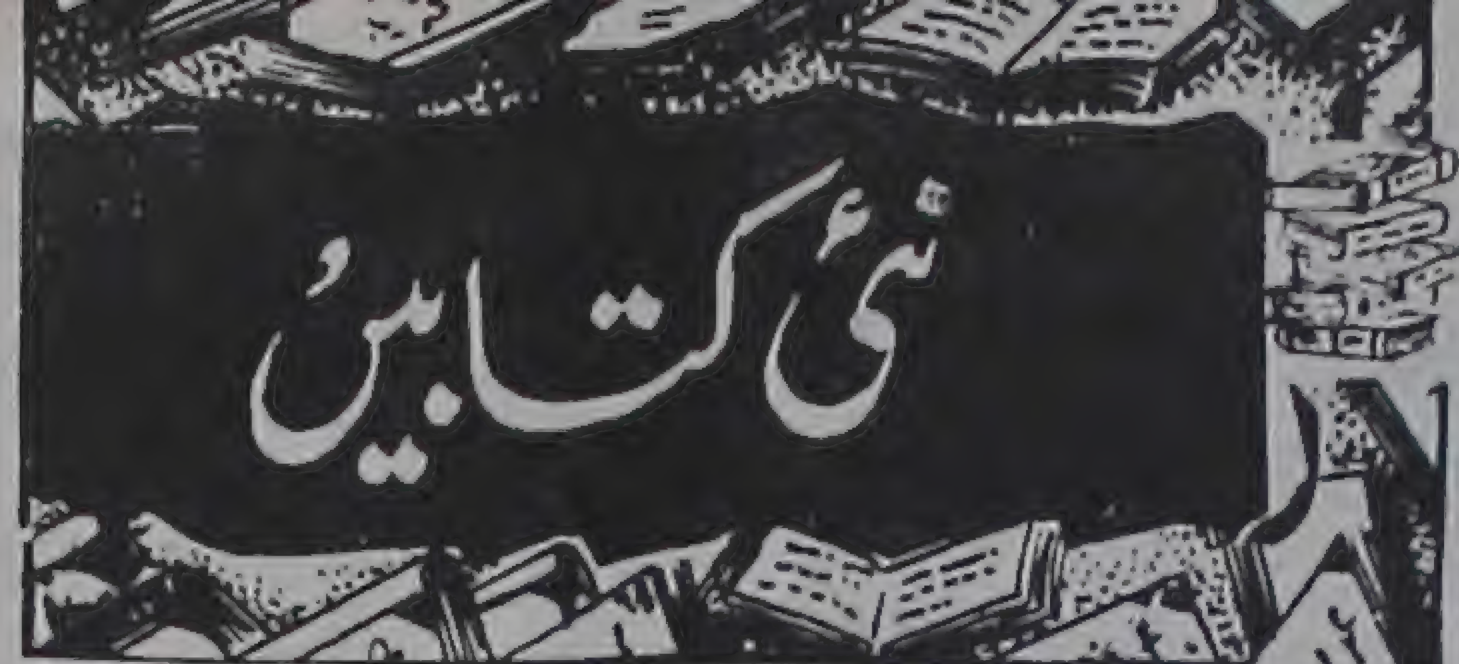
دیہات میں بجلی کی سہولتوں کا اہتمام ہو جائے گا۔

اگست سنہ ۱۹۶۷ء تک آب پاشی کے لئے ۶۶۹۰۰۰ پمپنگ سیٹ بجلی کی مدد سے کام کر رہے تھے۔

آب پاشی کی سہولتوں میں توسیع کے مذکورہ اقدامات کا ہی نتیجہ ہے کہ اب ہندوستان میں کھیتی باڑی کا انحصار محض بارش پر ہی نہیں رہا پچھلے دو برسوں میں اگرچہ خشک سالی کی وجہ سے ہندوستان کی زرعی پیداوار پر بہت برا اثر پڑا، تاہم آبپاشی سے متعلق مختلف پروجیکٹوں پر عمل درآمد کے نتیجے کے طور پر ہمارے ملک میں اناج کی پیداوار اس برس دس کروڑ ٹن کے لگ بھگ متوقع ہے۔ اور یہ بھی توقع کی جا رہی ہے کہ ۱۹۷۱ء تک ہندوستان غذائی ضروریات کے لحاظ سے خود کفیل ہو جائیگا۔

حقائق پر ایک نظر

آبپاشی کی سہولتیں	۱۹۵۱ء	۱۹۶۷ء
بڑے و درمیانے درجے کی اسکیموں سے	دو کروڑ چالیس لاکھ ایکڑ	۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ایکڑ
جسقدر زمین کی آبپاشی ہوئی۔	۲ کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ	۴ کروڑ ایکڑ
کُل رقبہ زمین جس میں آبپاشی کی مختلف سہولتیں مہیا کی گئیں۔	۵ کروڑ ۶۰ لاکھ ایکڑ	۸ کروڑ ۸۰ لاکھ ایکڑ
بجلی کی پیداوار میں اضافہ		
جتنے دیہات اور قصبوں میں بجلی پہنچ چکی تھی	۳۶۷۷	۶۱۲۳۰
بجلی کی فی کس کھپت	۱۸ یونٹ	۸۲ یونٹ
سیلاب کی روک تھام		
مختلف ڈیموں کی مجموعی لمبائی	۳۰۰۰ میل	۷۵۰۰ میل



سخن ہائے گفتنی

مصنف: کلیم الدین احمد : ناشر: کتاب منزل ۔ سبزی باغ پٹنہ ۴ (دوسرا ایڈیشن) قیمت آٹھ روپے۔

کلیم الدین احمد کے مضامین کا مجموعہ دوسری بار شائع ہوا ہے ان میں "سخن ہائے گفتنی" کے عنوان سے معاصر میں شائع شدہ مضامین پہلے باب میں یک جا کر دیئے گئے ہیں۔ ناشر نے یہ دعوی کیا ہے کہ اس ایڈیشن میں اضافہ کیا گیا ہے اس میں صداقت یہ ہے کہ "دیوان جوشش کا ایک قلمی نسخہ" اور "تنقید کیا ہے" کے عنوانات سے دو مضامین دوسرے ایڈیشن میں زیادہ ہیں۔ تحقیق کلیم الدین احمد کا میدان نہیں، ہر چند کہ ادھر انھوں نے بعض تذکروں کی اشاعت کا کام کیا ہے۔ دیوان جوشش پر یہ مضمون تعارفی انداز کا ہے۔ "تنقید کیا ہے" پر ان کا مقالہ مختصر بھی ہے اور سرسری بھی۔ ان دونوں مضامین کے باوجود "سخن ہائے گفتنی" کا بہترین مضمون "اردو ادب میں طنز و ظرافت" کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ باقی مضامین میں اب بھی نظر ثانی اور ترمیم اور اضافے کی بہت گنجائش اور ضرورت ہے مثلاً باغی، آہنگ، رزم، پرچھائیں وغیرہ پر تبصرے آج کے پڑھنے والے کے لئے بڑی حد تک غیر ضروری ہیں اور ان کی کسی مجموعہ مضامین میں شمولیت بے محل سی ہے۔ کیوں کہ ان تبصروں کی اہمیت محض وقتی تھی۔ بہر حال ان تمام مضامین میں کلیم الدین احمد کا ناقدانہ نقطہ نظر تیکھے پن اور ندرت ادا کے ساتھ موجود ہے اور ان کا مطالعہ کلیم الدین احمد کے تنقیدی شعور کو سمجھنے کے لے ضروری ہے۔

(محمد حسن)

۲۵ نظمیں ۔ ایک نظریہ ایک تجربہ

ڈاکٹر سید محمد صدرالدین فضا شمسی

مطبوعہ کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ ۴ قیمت: تین روپے پچاس پیسے

کلیم الدین احمد کی ۲۵ نظموں کی تعبیر، تشریح، اور توجیہہ کی یہ کوشش صدرالدین فضا کی عبارت آرائی اور نکتہ آرائی کا نمونہ ہے مگر کلیم الدین احمد کی شاعرانہ صلاحیت کے بارے میں اس سے کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچتا۔ نقاد کی حیثیت سے کلیم الدین احمد کو اردو میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے انہوں نے حق گوئی اور بے باکی کی اعلیٰ روایت قائم کی۔ ضرورت ہے کہ ان کی شاعری کے بارے میں ان کا نقاد بھی حق گوئی اور بے باکی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کے عنوان کا ہر لفظ بحث طلب ہے کیا واقعی کلیم الدین احمد کی نظمیں نظم کہی جانے کی مستحق ہیں؟ ان کو نظریہ یا تجربہ کہنا تو یقیناً ناممکن ہے۔

ڈاکٹر صدرالدین فضا نے کلیم الدین احمد کی ۲۵ نظموں میں باروچی طنزیہ لب و لہجے کا اثر اور مغربی اثرات کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جہاں کہیں بھی کلیم الدین احمد کی نظموں کے اقتباسات دیئے ہیں ان کی وکالت کا سارا طلسم بکھر گیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے "سخن ہائے گفتنی" کے ایک مضمون میں "والہانہ کیفیت اور جذبات کی شدت" کو شعریت کے لئے ضروری تسلیم کیا ہے "بشرطیکہ حقیقی ہو نقلی نہ ہو" اور یہی دونوں خصوصیات ہیں جو ان نظموں میں ناپید ہیں۔ افسوس ہے کہ صدرالدین صاحب کا سلجھا ہوا رواں انداز تحریر اس طرح ضائع ہوا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شعریت کے لئے صرف والہانہ کیفیت اور جذبات کی شدت ہی کافی نہیں ہے اس کا پر تاثیر اظہار اور موثر بیان بھی ضروری ہے کسی زبان کی شاعری حشو و زوائد کی تاب نہیں لا سکتی۔ پھر شاعری میں الفاظ کا دروبست نہایت موزوں اور متناسب انداز میں ہونا لازمی ہے اور الفاظ کی مزاج شناسی اس کوچے میں قدم رکھنے والوں کے لیے شرط اولین ہے تعجب ہے ڈاکٹر صدرالدین کی نظر اس قسم کے اسقام پر نہیں پڑی جو کم و بیش بھی نظموں میں موجود ہیں اور یہاں ان میں سے چند نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں

اب آؤ چھوڑ دو چکوروں کی زرد رد دینا
یہ جو فروشوں کی چھوڑو بھی گندمی دنیا

(یہاں شاعر گندم نما جو فروشوں کی بات کہنا چاہتا ہے۔ یہاں اہم ٹکڑا "گندم نما" ہے یعنی گندم دکھا کر اصل میں جو بیچے جاتے ہیں دنیا گندمی نہیں ہے، جو فروشی کی ہے)

خاموش زمیں فلک ہے خاموش
سورج لو ہو رہا ہے روپوش

(اس میں لفظ 'لو' بے محل ہے۔)

وہ دیکھ نہ لے وہ دیکھ نہ لے
میں کیسے دکھاؤں منہ اس کو

(منہ، کو یہاں کھینچ کر پڑھنا ضروری ہے)

میں کیسے چار کروں آنکھیں ⁛ سرشار عزائم اس نے دیئے
اور سربفلک امیدیں بھی ⁛ کیسی یہ جواں ہمت بخشی
کیا کیا نہ عطائیں تھیں لیکن ⁛ میں نے ان سب کو نشٹ کیا

(یہاں لفظ "نشٹ" کا استعمال شاعر کی سیاق و سباق سے بے خبری کا غماز ہے پہلے دو شعروں کا انداز بیان اس لفظ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سرشار، عزائم، سربفلک امیدیں، جواں ہمت اور عطا کے ساتھ یہ لفظ پیوندکاری ہے۔)

جلوہ گر ہے تجھی میں اے ذرّے ⁛ جس کی خاطر تجھے تگاپو ہے

(تگاپو کا لفظ یہاں بے محل ہے)

حقیقت یہ ہے کہ عجز بیان ان نظموں میں جابجا نمایاں ہے۔ مثلاً شاعر یہ خیال ادا کرنا چاہتا ہے کہ پھول اور رنگ غیر فانی ہیں اور جنت میں ان میں سے کسی کو فنا سے دوچار ہونا نہیں پڑتا اس بات کو ان مصرعوں میں نہایت ناکافی طور پر ادا کیا گیا ہے۔

جو پھول ہے پھول ہے ہمیشہ ⁛ جو رنگ ہے رنگ ہے ہمیشہ

ان نظموں میں سے اچھی خاصی نظمیں جنس کے موضوع پر ہیں۔ عورت کی اپنے سوتیلے لڑکے سے رغبت، عورت کی زبان سے وصل کا بیان، آدم کے گناہ کا تذکرہ، ایک چوتھائی نظموں کے موضوعات یہی ہیں۔ یہ تجربے معنویت اور تاثیر حاصل نہیں کر سکتے ہیں اور جنسی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر صدرالدین بھی صاف کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ

"عریانش بغایت عریاں و متانتش بار گراں ست"

ڈاکٹر صدرالدین کے انداز استدلال سے اختلاف ممکن ہے مگر ان کی نثر شستہ اور رواں ہے اور ان کی نکتہ آفرینی کی داد دینی پڑتی ہے

کلیم الدین احمد کی نظمیں اکثر انگریزی نظموں کے ترجمے سے زیادہ کچھ نہیں اور ترجمے بھی ایسے جو شعری پیکر میں کامیابی کے ساتھ ڈھالے نہیں گئے ہیں۔

(محمد حسن)

سازِ حیات

(مجموعہ کلام) جناب پریم شنکر فرحت

ضخامت ۲۲×۱۸/۸، صفحات ۱۴۴، قیمت، فی جلد چھ روپے

ملنے کا پتہ، مکتبہ تحریک ۹، انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

"سازِ حیات" اردو کے خوش فکر شاعر جناب پریم شنکر فرحت کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔ فرحت کے انداز فکر اور انداز بیان دونوں میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ گرچہ ان کا انداز بیان روایتی عنصر سے پاک نہیں ہے پھر بھی وہ نئی قدروں کی طرف سے بیگانہ نہیں ہیں۔ روایتی پابندیوں کے باوجود فرحت کا انداز فکر رسمی نہیں ہے۔ صرف مظاہر حسن اور کیفیات عشق تک محدود نہ رہ کر فرحت نے زندگی کے دوسرے لطیف پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھا ہے ان کا عشق خود ان کے قول کے مطابق کنار تخیل نہیں، وہ اسے موجِ سلسبیل کی طرح ہر دو عالم کے لئے منفعت بخش بنانا چاہتے ہیں۔

فرحت کے کلام میں فرار اور گریز کا پہلو بہت کم نظر آتا ہے وہ اضطرابِ مسلسل کے قائل ہیں۔ اور نئی نئی منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بلاواسطہ طور پر ان کے کلام سے حرکت اور عمل کا پیغام ملتا ہے۔

لمحاتِ زندگی اور انسان کے عنوانات کے تحت انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ خاص طور پر قابل توجہ ہیں اور ان سے فرحت کے مزاج کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

زبان و بیان دونوں میں شگفتگی ہیں۔ اور تشبیہوں میں ایک اُپج پائی جاتی ہے۔ ان کے قطعات بھی کافی معنی خیز ہیں۔

"طیور آوارہ" کی پرواز بھی کافی پُرلطف ہے اگرچہ بعض قطعات میں الفاظ کچھ بوجھل سے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً

فریبِ بنتِ عنب سے مذاقِ لذتیہ
شگافِ زخمِ جگر سے رواقیت برتی

(صفحہ ۱۴۳)

ست پرکاش شوق

بانگِ درّوں

عبد الماجد اختر کا مجموعۂ کلام ضخامت ۱۰۴ صفحے قیمت : دو روپے ۔ ناشر : کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴

پروفیسر عبد الماجد بہار کے کہنہ مشق اور ممتاز شاعر ہیں۔ اگرچہ شمالی ہند کے ادبی میدان میں وہ اجنبی سے لگتے ہیں مگر اس کی بڑی وجہ ان کی بے پروائی اور شہرت سے لگاؤ کا نہ ہونا ہے۔ اُن کا یہ مجموعہ ع۔م۔ ساجد نے مرتب کیا ہے۔

اختر صاحب کا یہ مجموعہ فن اور زبان کے اعتبار سے خوب تر ہے جو مختصر ضرور ہے مگر دلکش ہے۔ اہل ذوق کو پرانے زمانے کی یادگار اس بزرگ شاعر کے کلام کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے ــــ لکھائی چھپائی اچھی ہے۔

(تاجور سامری)

گُل نو

مصنف واحد پریمی ضخامت ۱۴۴ صفحے ،

سائز ۳۰×۲۰/۱۶ ۔ قیمت : ۲ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ صبح ادب ، نزد مسجد تولوالی بھوپال ۔ ۱

واحد پریمی ایک نوجوان شاعر ہیں۔ مگر ان کے کلام میں تازگی اور جو پختگی محسوس ہوتی ہے وہ اُن کے کم عمر اور کم مشق ہونے پر شبہ کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن جو تحریر کا مضمون اس کتاب کے شروع میں ہے اس کے مطالعہ سے یہ شک دور ہو جاتا ہے۔ واحد پریمی صاحب ایک اچھے شاعر ہیں مگر ان کی جو روش ہے وہ جدت بھری ہونے پر بھی فکرِ تازہ کی نمایندہ نہیں کہی جا سکتی۔ اُن کا نظریۂ حیات اس دور میں بھی واضح نہیں بلکہ زور و شور کے باوجود منجمد سا لگتا ہے۔ ممکن ہے وقت اُن کی یہ کمی دُور کر دے۔ بہر حال یہ مجموعہ لائق مطالعہ اور دلکش ہے۔

(تاجور سامری)

تاک جھانک

ماہد الباقری کے افسانوں کا یہ مجموعہ عوامی ادب ۔ ۲۳۲ حسن آباد راولپنڈی سے شائع ہوا ہے۔ قیمت دُو روپے

کسی افسانے یا ناول کی کامیابی کی ایک اہم کسوٹی یہ ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی کو شروع سے آخر تک برقرار رکھے۔ اِس کسوٹی پر افسانوں کا یہ مجموعہ پورا نہیں اُترتا۔ کردار مختلف حیثیت کے ہیں۔ اور زندگی کے مختلف شعبوں سے لئے گئے ہیں۔ لیکن سب ہی جنسی بھوک کے شکار ہیں۔ افسانوں میں اوّل تو کردار نگاری ہے ہی نہیں اور ہے بھی تو اسی نظریہ کے تحت۔ کسی کردار میں گہرا پن نہیں ملتا۔ اکثر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو کردار کے توازن کا خیال ہی نہیں۔ مکالمے بھی بے جان ہیں۔

مصنف نے افسانوں کا زاویہ تو ٹھیک رکھا لیکن دوسری چیزوں پر کوئی دھیان نہیں دیا ہے۔

(آفتاب احمد)



پاکستانی وفد کے قائد جناب میر محمد حسین ڈائرکٹر جنرل آف ٹیلیگرافس اینڈ ٹیلیفونس (۱) اور ہندوستانی وفد کے قائد سری ال سی جین (۲) سکریٹری وزارت رسل و رسائل اور وفد کے دوسرے ارکان بات چیت میں مصروف ہیں۔

---

۳۰ مارچ کو ۱۹۶۸ء کو نئی دہلی میں ہندوستان اور پاکستان کے نمایندوں میں ٹیلی کمیونیکیشن کے سلسلے قائم کرنے کے سلسلے میں بات چیت شروع ہوئی۔ اس بات چیت کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تار اور ٹیلیفون کے بہتر سلسلے قائم ہوں تاکہ دونوں ملکوں کے باشندے ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ ٹیلیفون اور تار کی شرحوں پر نظرثانی کرنے سے متعلق بھی گفتگو ہوئی۔ بات چیت کا تسلی بخش نتیجہ نکلا اور یہ ثابت ہوگیا کہ دوستی اور خیرسگالی کی فضا میں ہند و پاک کے تمام حل طلب مسائل باہمی گفتگو سے طے ہو سکتے ہیں۔



Vol. 26 No. 10 AJKAL (Urdu) May 1968
Old Secretariat, Delhi-6.
Edited and Published by the Director, Publications Division, Delhi

آجکل

جیٹھ۔ اشاڑھ شک سمت ۱۸۹۰

جون ۱۹۶۸ء

۶۰ پیسے



۶ مئی ۱۹۶۸ء کو صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے کی علمی و ادبی خدمات
کا اعتراف کرتے ہوئے پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے اداکین کمیٹی
کی طرف سے اُنھیں دو کتابچے پیش کیے۔

(تفصیلات صفحہ ۲ پر)

ترتیب

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر، آجکل، اُردو، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

جلد ۲۶ نمبر ۱۱
جون ۱۹۶۸ء
جیٹھ اساڑھ شک سمت ۱۸۹۰

شرح چندہ

	فی پرچہ	ایک سال	دو سال	تین سال
ہندوستان	۶۰ پیسے	سات روپے	۱۲ روپے	۱۷ روپے
پاکستان	۶۰ پیسے (پاک)	سات روپے (پاک)	۱۲ روپے (پاک)	۱۷ روپے (پاک)
دیگر ممالک	۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ	۱۰ شلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ ڈالر	۱۸ شلنگ یا ۲٫۲۵ ڈالر	۲۵ شلنگ ۶ پینس یا ۳٫۵۰ ڈالر

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی

ملاحظات

۶ مئی ۱۹۶۸ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کو اُن کی اکہترویں سالگرہ کے موقع پر ان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف کے طور پر دو کتابیں پیش کی گئیں۔

یہ تقریب راشٹرپتی بھون کے اشوکا ہال میں منعقد ہوئی جس میں اُردو کے مقتدر ادبا، شعراء بڑی تعداد میں شریک تھے۔

یہ کتابیں اُردو اور انگریزی میں ہیں جن کے مرتب جناب مالک رام ہیں۔ اُردو کے مجموعے میں ۲۲ مقالات ہیں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر محمد مجیب، اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے مقالے ذاکر صاحب کی ذات اور شخصیت سے متعلق ہیں۔ دوسرے مقالہ نگاروں میں قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر عبدالعلیم، مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ عبدالقادر سروری، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر زبیر صدیقی اور صباح الدین عبدالرحمان وغیرہ شامل ہیں۔

انگریزی مجموعے میں آدی شیشایا اے جی۔ آربری، جان سارجنٹ، لوئی گارنے، منٹگمری واٹ، سرگاڈفری ڈرائیور اور آریری شمیل جیسے ممتاز اہلِ قلم کے مقالے شامل ہیں۔

دونوں مجموعوں کے زیادہ تر مقالات، ہندوستانی تہذیب اور علمی مسائل سے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی علمی و ادبی خدمتوں کا اعتراف قابلِ تحسین اقدام ہے جسے اراکین کمیٹی نے بڑی حسن و خوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔

ھندوستان ہمیشہ سے امن کا داعی رہا ہے۔ اس لئے ویتنام کی جنگ بندی کے روشن امکانات سے بلاشبہ ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ امن و صلح کے مذاکرات کامیابی سے ہمکنار ہوں۔

اپریل میں ہندوستانی ریلوں کی ۱۳۵ ویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنی ریلوں کی تعمیر و ترقی کا ایک جائزہ لیا ہے (دیکھیے صفحہ ۳۰)

ہمارا دفتر اب پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی میں منتقل ہو گیا ہے۔ آئندہ خط و کتابت اس پتے پر کی جائے۔

"ایڈیٹر آجکل (اُردو) پٹیالہ ھاؤس نئی دھلی

ترسیل زر اور ایجنسی سے متعلق خطوط اس پتے پر روانہ کیے جائیں۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن
پٹیالہ ھاؤس۔ نئی دھلی

"آج سے کوئی پینتالیس۴۵ برس پہلے کی بات ہے۔ میں الہ آباد میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا انڈر سیکریٹری تھا۔ الہ آباد کے ایک مشاعرے میں "مرزا یگانہ" نے اپنی تازہ ترین فارسی غزل سنائی جس کی شہرت اب تک اردو دنیا کے خاص خاص حلقوں میں ہے۔ اس زمین میں یا اسی بحر میں قافیہ بدل کر صرف تنہا کی ردیف کے ساتھ ہندوستان و پاکستان میں کئی اردو غزلیں کہی گئیں۔ مگر انہیں مرزا یگانہ کی غزل کی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ میرا دل بھی اس زمین میں غزل کہنے کو برسوں سے چاہ رہا تھا۔ آج پینتالیس برس بعد یہ تمنا پوری ہوئی۔ پہلے مرزا یگانہ کی غزل اور پھر نذرِ یگانہ کے عنوان سے پہلے میری فارسی اور بعد کو اردو غزل اسی زمین میں دیکھ کر فیصلہ کیجئے کہ مرزا یگانہ کو دادِ سخن دینے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔"



فراق گورکھپوری



مرزا یگانہ

غزلِ یگانہ

من کہ برنمی تابم دردِ زیستن تنہا
صبحدم چساں بینم شمعِ انجمن تنہا

تا کجا اماں یابد از ہجوم جانبازاں
گوشہ گیرِ فانوسے بہر سوختن تنہا

طرفہ محشرے دارد از فریبِ فردائے
زندہ زیرِ پیراہن مردہ در کفن تنہا

اے کہ کارہا کردی مدفنے مہیا کن
تا بہ کے نہاں دارد عیبِ من کفن تنہا

ہر گلے و ہر خارے فتنہ ہا برانگیزد
الحذر دلِ حیراں صد بہار و من تنہا

ذوق می تواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ
ہست شاہدِ عادل بوئے پیرہن تنہا

چارۂ پشیمانی خوش دلی و خوش کامی
توبہ از ریا کاراں خندہ ہا زمن تنہا

رہبرانِ خود گم را جز دعا چہ فرمائیم
پا شکستہ و حیراں ماندہ در وطن تنہا

ناخدا زمن بگذر سوئے دیگراں بنگر
کارِ من بدریا در دست و پا زدن تنہا

صد رفیق و صد ہمدم پا شکستہ و دل تنگ
داورا نمی زیبد بال و پر بہ من تنہا

نکتہ دانِ خود سازم میرزا یگانہ را
دل نمی تواں برداشت لذتِ سخن تنہا

فارسی غزل

نذرِ یگانہ

من چگونہ برتابم جلوۂ چمن تنہا
وادی و چمن تنہا غربت و وطن تنہا
دہر را مقدر شد سوز و ساز تنہائی
رنگ رنگ در عالم سوز و درد تنہائی
ہر فسانۂ الفت داستانِ تنہائی
ہر فراز را کردند قید و بندِ تنہائی
ہر بہارِ رنگارنگ ماتمِ جدائی ہا
سازِ سخن اقرب ہم یک پیامِ تنہائی
میسزنم بہ ہر نفسم سازہائے کن فیکوں
طرفہ خلوتے دارم طرفہ صحبتے دارم
شد ز سازِ دل پیدا نغمہ ہائے جاں افزا
بیں کہ عالمے دارد عالمِ جواں مرگی
گرچہ از ازل ایں درد بے نیاز تقسیم است
الوداع ہمعصراں الفراق ہم نفساں
دوش خواب می دیدم حلقہ حلقہ ہر جانب
ذکرِ عاشقاں دارد سوز و ساز تنہائی
عاشقاں و محبوباں ہر شب انجمن سازند
کاشکی ہمنوا کردم میرزا یگانہ را

بوئے یاسمن تنہا رنگِ نسترن تنہا
فرد و انجمن تنہا شادی و محن تنہا
سازِ ایں و آں تنہا سوزِ ما و من تنہا
حسن خندہ زن تنہا عشق نالہ زن تنہا
رآم در وطن تنہا قیس بے وطن تنہا
ماہ ضو فگن تنہا مہر شعلہ زن تنہا
از کنارِ گل بردو خوشبوئے چمن تنہا
آرے آرے می شدۂ جانِ جاں و من تنہا
در برم نہاں دارم صد جہان و من تنہا
خامشیِ من تنہا گفتگوئے من تنہا
یک شعاعِ آں نظرے بود زخمہ زن تنہا
صد جہانِ دل داری حسن در کفن تنہا
خویش و غیر بر تابد دردِ زیستن تنہا
سوئے منزلم بروم بے رفیق من تنہا
کثرتِ گنہگاراں بود و اہرمن تنہا
رآم و کوہکن تنہا قیس و نل دمن تنہا
شمع مرا ہر شب کارِ سوختن تنہا
من نمی تواں برداشت بارِ فکر و فن تنہا

من فراق می شنوم سرمدی نواہا را
در فضاء بے پایاں عشق نغمہ زن تنہا

اُردو غزل

میں کہ گا نہیں سکتا نغمۂ وطن تنہا
جب بھی غور سے دیکھا تھی ہر انجمن تنہا
رنگ اور بے رنگی شادی و محن تنہا
ہر کوئی سمجھتا ہے اپنی ہی نگاہ اُس کو
کون آنکھ اُٹھاتا ہے کون کان دیتا ہے
اُن کی ہی بدولت ہے خطۂ ختن آباد
آج تم کو جانا ہے جاؤ خوش رہو بھائی
لے کے ایک انگڑائی بزم ہو گئی رخصت
اجنبی فضاؤں کی بھیگتی چلیں پلکیں :
میں نے خواب میں دیکھا پچھلی رات کو ہمراز
درس گاہِ اعظم ہے درس گاہِ تنہائی
سینۂ زماں میں میں بو رہا ہوں آوازیں
جانے اور انجانے کتنے قیس گذرے ہیں
شب کی کیا ضرورت تھی اہلِ دل کو دُنیا میں
کاش یہ غزل سُنتے میرزا یگانہ بھی
میں فراق سُنتا ہوں سرمدی نواؤں کو

کیسے دہر کا چھیڑوں سازِ انجمن تنہا
سازِ این و آں تنہا سوزِ ما و من تنہا
رونق اور ویرانی باغ اور بَن تنہا
پڑ رہی ہے، اُس رُخ پر آج اِک کرن تنہا
میری خامشی تنہا شیوۂ سخن تنہا
اور خوشبوئے مشکِ آہوئے ختن تنہا
مجھ کو تو اٹھانا ہے ہر غم و محن تنہا
یادگار محفل ہے شمع انجمن تنہا
گا رہا ہوں غربت میں نغمۂ وطن تنہا
حلقۂ گنہ گاراں اور اہرمن تنہا
عشق کسب کرتا ہے زندگی کے فن تنہا
خامشی کے پردوں میں میں ہوں نغمہ زن تنہا
پھر بھی روزِ اوّل سے نجد کا ہے بَن تنہا
تیرگی کو کافی تھی زلفِ پُر شکن تنہا
مجھ سے اُٹھ نہیں سکتا بارِ فکر و فن تنہا
بیکراں فضاؤں میں دل ہے نغمہ زن تنہا

بزم میں بُلاتے ہو اس فراق کو جس نے
عمر بھر پیا غم کا بادۂ کہن تنہا

رتجگے کی نصف شب

رفعت سروش

رات کے دو بج رہے تھے اور برج کی یہ بازی ہم نے گیارہ بجے شروع کی تھی۔ اور حساب لگایا جائے تو ہمیں کھیلتے ہوئے سات مسلسل گھنٹے گذر چکے تھے۔ رب نواز مسلسل ہار رہا تھا اور افتخار کے پو بارہ تھے۔ نو بڑ بول کر اب وہ داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان اپنی مضبوط ٹھوڑی کو مضبوطی سے تھامے اپنے ہی پاؤں کی تھاپ پر سر ہلا ہلا کر مسکرا رہا تھا۔ چونی نے ابرار کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر نو بڑ کہہ دیا ــــ افتخار قہقہہ مار کر ہنسا۔ چونی اور رب نواز نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اُسی دم دھڑاک سے دروازہ کھلا اور پروفیسر نیازی اپنی گاؤن میں ہاتھ گھسیڑے دروازے کے عین درمیان میں کھڑا تھا۔ سنہرے فریم کی نظر کی عینک کے پیچھے دو آنکھیں نہیں دو سُرخ انگارے تھے۔ ایک دم جیسے چاروں اُدر سناٹا ہو گیا۔ ہم چاروں ہاتھ روک کر ایک ساں اس کی طرف دیکھنے لگے ــــ آؤ آؤ جی پروفیسر صاحب ــــ !" چونی نے اُسے خوش دلی کے ساتھ دعوت دی۔

"اوئے کتھے ہے ہمارا کاچو ــ" اور یہ کہتے کہتے پروفیسر نیازی نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر ایک جھٹکا دے کر کھول لیا۔ "کہاں ہے ہمارا کاچو ــ اپنے راج کے سارے حرامزادوں، جواریوں کو ہم دریا بُرد کر دیں گے۔ ان کے ناپاک وجود مٹا دیں گے ــ یہ لو !" اور اس نے کھلا چاقو عین میز کے درمیان۔ پوری قوت کے ساتھ دے مارا۔ رب نواز کے پتوں کو چیرتا ہوا میز میں کھُب کر سیدھا کھڑا ہو گیا ہم سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ حیران حیران۔ ہم کسی آنے والی آفت کے لئے تیار ہو گئے۔ پروفیسر نیازی نے میز پر کھبے سیدھے کھڑے چاقو کو دیکھا۔ پھر جیسے وہ دم بخود ہو گیا۔ ذرا دیدہ نگاہوں سے ہمارے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ چاقو کی طرف بڑھایا تو وہ کانپ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ کر گاؤن کی جیب میں ڈال لیا۔ ایک بار پھر باری باری ہمارے چہروں پر نظریں جمائیں۔ پھر گاؤن کی جیبوں میں اپنے ہاتھ دور تک گھسیڑے وہ مُوے مُوے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"افتخار اس کے جاتے ہی قہقہہ مار کر ہنسا اور بڑی خوش دلی سے خود کو ماں کی گالی دی۔ زنگ لگ گیا ہمارا شیر جوان۔ !" ہم چاروں پھر سے چاروں اور سے غافل ہو کر اپنے پتوں میں غرق ہو گئے ــــ" اور یہ ہے ساری داستان یا یوں کہو کہ ہزار داستان کا ایک ورق"۔

ابرار سامنے بیٹھے وقار کے سامنے کورنش بجا لانے کے انداز میں جھکا۔ اچھا دوستو ! اب میں چلوں تم دونوں تو میرے سامنے شرمار ہے ہو اور لال لال ہو رہے ہو"۔

"دیکھو ابرار تم بھی رُک جاؤ۔ وقار آج کچھ چُپ چُپ سا تھا، اور اُداس بھی۔ اور ساتھ میں بیٹھی عطیہ شہزاد احمد سے آنکھیں چرا رہا تھا ــ" نہیں یار مجھے تو معاف کرو۔ ابرار ہنستا ہوا آگے بڑھ آیا۔

دیکھو رمضان کا کچھ تو احترام کرو۔ آج کل تو اپنے اس کاروبار کو بند کر دو ــ" وقار نے عجیب سے لہجہ میں اُسے کہا عطیہ نے آنکھیں اُٹھا کر ابرار کی طرف دیکھا شک کا ایک تنہا سا پودا فوراً ہی اس کے جی میں سر اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔" ارے دوست ــ ارے میرے دوست ــ میں تو کل سے چھٹیاں لے رہا ہوں آفس جانا بند ــ اگلے چار دنوں کے لئے اب رات کو جاگا کریں گے۔ اور دن کو سویا کریں گے۔ بس نا۔ !" ابرار نے ہنستے ہنستے جھک کر وقار کے

گھٹنوں کو چھو لیا پھر سیدھے کھڑے ہو کر عطیہ کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا لمحہ بھر کے لئے مُسکرایا۔ ایک عجیب انوکھی سی مسکراہٹ اور پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا نکل گیا۔" "اور یہ ساری بات ہے عطیہ" شہزاد احمد آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود سے ہم کلام ہوئی۔" تو تم نے دیکھا عطیہ بیگم۔ ساری بات میں نے تمہیں بتا دی۔ اب کہو کہ میں کیا فیصلہ کروں۔ ؟؟ اور میں سارا وقت مدہوش اس کی باہوں میں گھری رہی۔ اور خود کو بتاتی رہی کہ یہی زندگی ہے ۔ کیا یہی زندگی ہے؟ خود سے پوچھتی رہی۔ پھر میں نے اس سے کہا۔ چلو وقار باہر چلیں۔ اب گھر چلیں تو اُس نے کہا نہیں تم جاؤ۔ تنہا جاؤ۔ باہر نکلنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ اور شک کے پودے ۔ کتنے ہی پودے بالشت بالشت بھر اونچے ہو گئے۔ میں ابرار کے ساتھ یہاں آئی تھی، کہ مجھے کسی سے ملنا ہے ۔ اور راستے میں ابرار نے مجھے بتایا کہ وقار نے اسے رنگ کیا تھا، اور کہا تھا کہ عطیہ کو Collect کر کے گھر چلے جائے اور وہ بعد میں کسی اور صورت وہاں پہنچے گا۔ اور میں نے اُداسی سے اور ندامت سے اور جانے کیوں اپنی جگہ میں گڑ جانا چاہا تھا۔ میرے ساتھ میں اگر وہ پہچان لیا جائے گا تو کیا ہوگا۔ ؟؟ وہ خود سے ڈرتا تھا؛ میرے لئے نہیں اپنے لئے ۔ اپنے نام کے لئے ۔ اور میں ؟؟ اور میں ۔ میں ؟؟؟ پھر اس نے مجھے خاموش پایا تو کہا۔ میں تھک گیا اور مجھ میں ہمت نہیں۔ تم تنہا جاؤ۔ تو میں اس کی باہوں سے نکل کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا، جب تم میں۔ تمہیں معلوم تھا کہ ہمت نہ تھی تو تم مجھ تک آئے ہی کیوں۔ میں تو ایک ہمت والے آدمی کے پاس آئی تھی۔ آدمی کے پاس ؟؟ تب پھر اس نے کہا، ہمت تھی چند دن ہوئے کوئی لوٹ کر لے گیا۔ میں خاموش ہو رہی۔ پھر کہا۔ تم مجھے کچھ سمجھانا چاہ رہے ہو۔ غلط باتوں کا سہارا نہ لو بزدل ۔ تم مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ میں تم سے نہ ملوں۔ کہ تم ان مشکلات سے ڈرتے ہو جو تمہیں میری راہ پر چلتے ہوئے پیش آئیں گی اور ان ذمہ داریوں سے بچنا چاہتے ہو جو میرے تم سے ملنے سے تم پر عائد ہوں گی ۔ پھر میں نے ایک بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف گئی، اور بولٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لمبے قدم لیتا دو قدموں ہی میں مجھ تک پہنچا اور میرے ہاتھوں سے میرا پرس چھین کر دور پھینکا۔ اور دونوں مٹھیوں میں میرے بال کستے ہوئے اس نے اپنا منہ میرے منہ پر جھکا دیا۔

" اور وہ مزاحمت کرتی رہی اور اپنی پوری قوت سے اپنا سر پیچھے کو ہٹاتی رہی۔ مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ کہتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ اس کی مدافعت میں کمی آ گئی اور وہ کمزور ہو کر اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ تم مجھے بُرے لگتے ہو۔ بُرے لگتے ہو۔ نفرت ہے نفرت ہے۔ تم کتنے خراب ہو ؛ کیوں اتنے خراب ہو۔ اور میں بند دروازے کے پیچھے کھڑا اس کی جھری سے آنکھ لگائے کھڑا رہا ۔ اور یہ ساری بات ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ میں کیوں انہیں جانے کا کہہ کر بھی نہ جا سکا۔ اور بند دروازے کے باہر صحن میں بچھی بید کی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اور تیز تیز آوازیں آنے پر لپک کر بند دروازے کی جھری کی آنکھ بن گیا ۔" ابرار نے پروفیسر نیازی کے سامنے بیٹھ کر جھکی آنکھوں سے ۔ اعتراف کیا اور جیسے ایک بوجھ سے نجات کی طرف سفر کرنا شروع کیا ۔ پروفیسر نیازی کہ ابرار کا "اعتراف" سن رہا تھا، نے بات ختم ہو جانے پر اپنی سنہرے فریم کی نظر کی عینک اُتاری ۔ اور میز پر رکھ دی ۔ پھر اپنے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر آنکھیں صاف کیں رومال تہہ کیا۔ اور جیب میں رکھ دیا ۔ عینک اٹھائی اور آنکھوں پر جمالی۔ پھر میز کی سطح پر اضطراب سے انگلیاں بجانا شروع کر دیں

" تم اس لڑکی سے عشق کرنے لگے ہو ۔" اچانک ہی پروفیسر نے موسیقی کو روک کر بڑے ٹھہرے ہوئے، صاف لہجہ میں ابرار کو مطلع کیا ۔ "عشق" یعنی تمہارا مطلب ہے محبت ؟؟"

ابرار قہقہہ مار کر ہنسا اور پھر اُٹھ گیا ۔" اچھا پروفیسر تمہاری تشخیص مجھے افسوس ہے کہ غلط ہے۔ اب میں جا کر اپنا یہ غم غلط کروں گا۔ کہ مجھے کوئی غم نہیں ہے اور وہ اونچے سروں میں " لگی والیاں نوں نیند نہ آوندی نے تیری کیویں آکھ لگ گئی۔ گاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ "تیری کیویں اکھ لگ گئی" کی تکرار کرتا وہ گلی سے گذرا تو پروفیسر نے ایک بار پھر چشمہ اُتارا اور اس کے شیشوں کو نگاہیں جما کر دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر کوٹ کی جیب سے رومال نکالا عینک کے شیشوں کو صاف کیا، پھر آنکھوں کو صاف کرنے کے بعد رومال اور چشمے کو اپنی اپنی جگہ پر پہنچانے کا عمل شروع کر دیا۔

" اور سنو ابرار بیٹے ۔" ابرار ہاتھ میں وہسکی کا گلاس اُٹھائے آئینے کے پاس پہنچا ۔ سنو ابرار بیٹے تمہارا دوست اس سے محبت کرتا ہے

اور وہ تمہارے دوست سے محبت کرتی ہے۔ اور اس محبت کا نام !! اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا اور آخری گھونٹ گلے میں انڈیلتے ہوئے اس نے آئینے میں خود کو آنکھ ماری :: اور پھر مسکراتا ہوا واپس پلٹا۔ پھر گلاس کو فرش پر لڑھکا کر وہ اپنے بستر پر اوندھے منہ گر کر سو گیا — ۔

"دیکھا تم نے۔ اور تم میرے اتنے اچھے۔ پیارے دوست پر شک کرتی ہو۔ نہیں یہ تو مجھ پر جان بھی قربان کر دے۔ ایسا اچھا میرا دوست ہے تم اس سے معافی مانگ لینا Excuse کر لینا۔ اچھا جان !! وہ کوئی جواری۔ شرابی نہیں ہے۔ تم تو اس سے ایسے ہی خراب ٹون میں بولتی ہو اور وہ سارا وقت مجھ سے تمہاری باتیں کرتا رہتا ہے۔ میرا جی بہلانے کو کہ جب میں تمہاری یاد میں اُداس ہو جاتا ہوں اور رات کو مجھے نیند نہیں آتی ہے۔"

"اور یہ ساری بات ہے۔ میں تم سے کوئی مشورہ نہیں لیتی۔ مشورہ تب لے کوئی انسان کہ جب سامنے کے راستے واضح ہوں۔" عطیہ شہزاد احمد نے آئینے میں اپنے پیچھے بیٹھی نور فاطمہ کے عکس کو مخاطب کیا۔ نور فاطمہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی — خاموش لمحے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے گذرتے گئے۔

"عطیہ شہزاد احمد" — آخر کار نور فاطمہ نے خود اپنے ہی عکس میں مدغم عطیہ شہزاد احمد کو مخاطب کیا۔

"ہوں۔" وہ ویسے ہی مگن ہوئے سے گنگنائی۔

"میں نے کہا بانو — میری طرف دیکھو۔"

"کیا ہے — ؟"

"عطیہ شہزاد احمد پہلے میری بات سنو — دیکھو پوری بات سُننا درمیان میں بولنا نہیں — میں تم سے دو سچی سچی باتیں کہوں گی —

"ہوں —" وہ بدستور اپنے عکس میں نابود تھی۔

یونی ورسٹی سے جو یہ تم روز روز غائب رہنے لگی ہو۔ اس کا حشر بھی معلوم ہے —؟ پرسوں ڈاکٹر ڈار کہہ رہے تھے۔ عطیہ بہت دنوں سے یونیورسٹی تو آ رہی ہیں، کلاس میں نہیں آتیں۔ اور وہ چار بدھ کی شکل والا ناگی کہنے لگا۔ سر آجکل اُن کی مصروفیات کی نوعیت دوسری ہے اور وہ پرنس بھی جانے کب کا بدلہ چکانے کا موقعہ ڈھونڈھ رہا تھا، کہنے لگا ڈاکٹر صاحب آپ بھی ایک کار خرید لیجئے۔ عطیہ شہزاد احمد سے پھر آپ کو غیر حاضر رہنے کی شکایت نہ ہوگی۔ اور پورے ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں وہ کھسپ پڑی کہ تم جانو۔ صدیوں تک سُنا نہ ہوسکا — ساروں کی نظریں میری طرف تھیں اور میں مرنے والی ہو رہی تھی — اب کہو — کیا کہتی ہو ؟؟

عطیہ شہزاد احمد مدتوں چپ رہی —

اور باہر شیخ ابرار احمد اور وقار علی بیگ بند دروازے کے پاس کھڑے آپس میں نظریں ملائے دھیمے دھیمے مسکرا رہے تھے مگر کار میں بیٹھی عطیہ شہزاد احمد ابرار کے وجود میں جمع ہوتے، اُبلتے، کھولتے اور ایک مرکز کی طرف اٹھتے غصے کی لہریں محسوس کر رہی تھیں۔ بند دروازے کے باہر کھڑے وہ دونوں مرد چپکے چپکے مسکراتے دروازے کو ٹھوکریں لگاتے پھر نظریں ملاتے — کبھی اس کی طرف دیکھتے اُسے عام انسانوں کی ڈگر سے ہٹے ہوئے نظر آتے۔ دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی عطیہ شہزاد احمد نے اچانک ہی خود کو گہرائیوں میں گرتے دیکھا۔ "ارے یہ میں ہوں — میں"

اُس نے اپنی ذات کو ایک اجنبی کی آنکھ سے دیکھا — "کیا واقعی میں ہوں۔ ہی!! اے پک اپ" اُس نے کار کے شیشوں سے باہر نگاہ کی۔ شیخ ابرار احمد کے زرد رخساروں پر دو لال دھبے نمودار ہو رہے تھے۔ سیاہی مائل سرخ لبوں پر اُس نے سانپ کی ایسی نوکیلی زبان پھیری اور زمانہ قدیم کے وحشیوں کی طرح ایک خوفناک بے معنی آواز حلق میں سے نکال کر پوری طاقت سے جوتے کی نوک سے بند دروازے پر ٹھوکر لگائی۔ وقار نے اسی لمحہ کار میں بیٹھی عطیہ نے شہزاد احمد کی نظریں پکڑ لیں۔ اپنے ساکت وجود میں سانس لیتی۔ عطیہ وقار کی نگاہوں کے جواب میں دھیرے سے مسکرائی پھر گود میں پڑے ہاتھوں پر نظریں جما دیں۔" میں تاں اُچے چباروں ڈھیاں — " جانے کب کا۔ گاؤں کے مزارعوں کی بیویوں سے سُنا ہوا یہ لوک گیت اس کی یاد میں سرسرایا — جس کے سمجھانے پر رضا کلام نے پورے دو گھنٹے اس کے ساتھ مغز ماری کی تھی پھر بھی اُچے چبارے سے گرنے کی رمز وہ اُسے سمجھا نہ سکے تھے — غصہ اور بے بسی کی ایک تیز لہر اس کے پیٹ کی گہرائیوں سے اُٹھ کر اُس کے پورے وجود کے ساتھ ٹکرائی۔

"سنو نور فاطمہ تمہیں اس کا مطلب آتا ہے۔ میں تاں اچے چباریوں ڈھنیاں :—

عطیہ نے پھر آئینے کی سطح پر ابھرے ہوئے نور فاطمہ کے عکس سے آنکھیں ملائیں — نور فاطمہ نے بڑے دکھ اور افسوس سے سر ہلایا — (اب کیا علاج !!) "بی بی اس کو فرسٹریشن کہتے ہیں۔" آئینے میں خود اپنے ہی عکس میں کھوئی ہوئی شہزاد احمد نے اچانک ہی پلٹ کر نور فاطمہ کی طرف دیکھا اور چند ثانئے بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جو ہنسنے پر آئی تو ہنستی ہی چلی گئی۔ اتنا کہ ہنستے ہنستے اس کے آنسو بھی نکل آئے۔ اور رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے پونچھتے سمے اس کے چہرے پر اندھیرے اُجالے کی سی کیفیت تھی۔ اور نور فاطمہ یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ ہنس رہی ہے یا رو رہی ہے۔ یا روتے پر ہنس رہی ہے — پھر جیسے اچانک ہی اس کی ہنسی شروع ہوئی تھی۔ ویسے ہی وہ اچانک چپکی ہو رہی۔ اور دونوں کہنیاں گھٹنوں پر جما کر ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ تھام کر ایک سانس نور فاطمہ کی طرف دیکھنے لگی۔ نور فاطمہ خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ (میں اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں ؟ کیا کر سکتی ہوں ؟ ؟ اس کے لئے کیا کروں !!) نور فاطمہ کا معصوم دل سکون کے ساتھ دھڑکتا رہا۔

"سنو نور فاطمہ ہم ایک دوسرے سے اس قدر دور کیوں ہیں۔ ہر وجود دوسرے وجود کے لئے کس قدر تاریک ہے۔ سیاہ ہے۔ دو وجود ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی کیوں قریب نہیں ہوتے۔ باتوں کے پیچھے کہیں دور چھپی حقیقتوں سے ہم کیوں واقف نہیں ہوتے — ہر وجود ایک تاریک سیارہ ہے اپنے آپ سے آگاہ۔ خود میں گردش کرتا ہوا شاید دوسرے تاریک سیارے کے وجود سے آگاہ — مگر محض آگاہ ہونا ہی تو آگاہی کی ساری منزلیں نہیں — یہ آگاہی ہمیں کب ملے گی ؟ اس تاریکی کے پردے کو چیر کر وجود کی حقیقت تک پہنچنا کب ہوگا — کب ہوگا — کب ہوگا — ؟؟؟" عطیہ کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بالکل نابود ہو گئی۔ اس نے تھک کر اپنا سر میز کی سطح پر ٹکا دیا۔ گذرتے لمحوں کی خاموشی میں سے گذرتے ہوئے نور فاطمہ نے سوچا میں تو وجود کی Existence میں یقین ہی نہیں رکھتی — یہ کس جھگڑے سے الجھتی پھرتی

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)



مشیر جھنجھانوی

غزل

ساقی تری نظر سے پیمانے جا گتے ہیں
رندوں کے دم قدم سے میخانے جاگتے ہیں

اے شمع تو سحر تک رو رو کے جاگتی ہے
ہنس ہنس کے زندگی بھر پروانے جاگتے ہیں

دُنیا کی ہر حقیقت ابتک وہی ہے لیکن
پہلو بدل بدل کر افسانے جاگتے ہیں

دن کو بھی جستجو ہے شب کو بھی آرزو ہے
اہلِ جنوں کے دم سے ویرانے جاگتے ہیں

ہر انقلابِ تازہ آتا ہے میکدے سے
دیر و حرم سے پہلے میخانے جاگتے ہیں

ترکِ جہاں کا مطلب ترکِ عمل نہیں ہے
صحرائے آرزو میں دیوانے جاگتے ہیں

حالت مریضِ غم کی ناقابلِ بیاں ہے
اپنے تو سو رہے ہیں بیگانے جاگتے ہیں

فرزانے سو رہے ہیں آغوشِ رنگ و بو میں
تم تو مشیر جاگو۔ دیوانے جاگتے ہیں

جگن ناتھ آزاد

"مجھے آج تک یاد ہے وہ زمانہ"

(۲)

قیامِ لاہور کے دوران میں اگرچہ علامہ اقبال سے میری ملاقات نہیں ہوئی لیکن علامہ مرحوم کے ذکر کے بغیر یہ داستان نامکمل رہے گی۔ کلامِ اقبال کے ساتھ مری وابستگی اس زمانہ میں شروع ہو گئی تھی جب زمانہ طالب علمی میں مرغوب ایجنسی[1] کے کتابچے میرے ہاتھ لگ گئے تھے۔ اور مجھے "شکوہ، جوابِ شکوہ" "شمع اور شاعر" اور فریادِ امت ایسی نظمیں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ اس شاعری نے مجھ پر جو اثر کیا اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ میرے دل میں اکثر یہ خواہش رہتی تھی کہ میں ان نظموں کے خالق کو ایک بار دیکھ لوں۔

اس زمانہ میں علامہ اقبال کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اپنی خواہش کا اظہار وقار انبالوی سے کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہاں جانا کوئی مشکل نہیں وہ تو کھلا دربار ہے۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

ایک بار میں نے سالک صاحب سے عرض کیا کہ میں کسی روز آپ کے ساتھ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ سالک صاحب نے کہا جب تم چاہو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ لیکن خدا جانے معاملہ کیا تھا میں میکلوڈ روڈ سے گذر جاتا تھا اور ان کی کوٹھی کی جانب قدم بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ اصل میں میں گمان ہی نہیں کر سکتا تھا کہ شکوہ، جوابِ شکوہ، "شمع اور شاعر" "خضرِ راہ" "فریادِ امت" اور "طلوعِ اسلام" ایسی نظموں کا خالق کوئی عام انسان ہو سکتا ہے۔ میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں گا تو میرے منہ سے بات، کیسے نکلے گی۔ "یہ کیسے ممکن ہے . . . یہ کیسے ممکن ہے . . . . علامہ اقبال سے ملاقات کیسے ممکن ہے؟

علامہ تاجور نے مجھ سے کہا اقبال کا کلام جتنا زبانی تمہیں یاد ہے اتنا شاید ہی کسی اور کو یاد ہو اور حیرت ہے کہ تم نے ابھی تک اقبال کو دیکھا نہیں

---

[1] مرغوب ایجنسی لاہور کے کاتبوں نے مل کر جاری کی تھی اور اس میں علامہ اقبال کی منتخب نظموں مثلاً شکوہ، جوابِ شکوہ، نالۂ یتیم، شمع اور شاعر، فریادِ امت، تصویرِ درد، اور ظریفانہ کلام کے علاوہ شکریہ یورپ موجِ زمزم (آغا حشر کاشمیری) سوزِ بیوہ، دنیا کی اجڑی ہوئی محفل، (درگا سہائے سرور) قبلہ نما، پیکرِ نور (خواجہ دل محمد ایم اے) تحفۃ الاخوان، جیب کی داد، شکوۂ ہند (مولانا حالی) اچھے کپڑے (ارشد گورگانی) جوگی اور ناظر (خوشی محمد ناظر) کلامِ نیرنگ (غلام بھیک نیرنگ) شعلۂ طور (غلام محمد طور) اربعینِ جامی (چالیس منظوم ترجمے) رباعیاتِ قلندر (بوعلی قلندر) رباعیاتِ سرمد۔ اقبال کا لیکچر ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر (ترجمہ ظفر علی خاں) وغیرہ متعدد کتابیں چھاپی تھیں آج اس ایجنسی کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ اپنے وقت میں یہ خاصا مقبول اشاعتی ادارہ تھا۔ حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی نے اس ایجنسی کے بارے میں لکھا تھا۔

کون واقف نہیں اس بات سے اربابِ خرد ؎ کہ ہیں مرغوب ایجنسی کے نرالے سب کام
ملک میں چار طرف اس کی کتابوں کی ہے دھوم ؎ نقطہ نقطہ ہے جہاں خال، سیہ کام نام
یہ چھپائی یہ لکھائی یہ چمکتا کاغذ ؎ کسی تصنیف کو ممکن نہیں یہ حسن و نظام



پرسوں شام کو آؤ۔ اُن کے پاس چلیں گے۔ وہ علیل ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کے آجائیں گے۔ میں نے وعدہ کیا کہ ضرور آؤں گا۔ لیکن اُس دن میں مولینا کے وہاں بھی نہیں پہنچا۔ کیوں کہ ہماری منزلِ مقصود علامہ اقبال کے درِ دولت تک رسائی تھی۔

گورداس پور کا مشاعرہ ایک اہم مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اُس میں دُور دُور سے شعرا، تشریف لاتے تھے۔ دو جگری دوست شفیع سرور اور مکھم سنگھ سولی اس مشاعرے کی رُوح رواں تھے۔ تقسیم ہند نے ان دوستوں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔ مکھم سنگھ سولی تو آج بھی گورداس پور میں ہیں اور مشاعروں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ شفیع سرور غالباً پاکستان جا چکے ہیں تقسیم ہند کے بعد میں جب بھی پاکستان گیا۔ میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی لیکن یہ پتہ ہی نہ مل سکا کہ وہ گورداس پور چھوڑ کر پاکستان کے کس شہر میں آباد ہوئے ہیں۔

روش صدیقی سے میری ملاقات اسی گورداس پور کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ شکیل بدایونی سے بھی۔ روش سے سلسلہ ملاقات آگے چل کے بھی جاری رہا اور یہ ملاقات ایک دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن شکیل سے تعلقات زیادہ نہ بڑھنے پائے۔

روش کے ساتھ لمبے لمبے سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ زاہد خشک ہونے کے باوجود میں نے انھیں ایک دلچسپ آدمی پایا۔ اُن کی علمیت سے میں متاثر ہوا اور فیضیاب بھی۔ اُن کی غزل کا فارسی آمیز شیریں لب و لہجہ مجھے ہمیشہ سے پسند ہے۔ غزل کے اشعار میں نئے نئے مضامین پیدا کرنے میں روش کو ایک کمال حاصل ہے۔

ہاں تو میں اقبال سے ملاقات کی خواہش کا ذکر کر رہا تھا۔ اس خواہش کا انجام اقبال کے اس شعر پر ہوا۔

گرمیٔ آرزو فراق شورشِ ہائے وہو فراق
موج کی جستجو فراق قطرہ کی آبرو فراق

اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو جب میں چند روز کے لیے راولپنڈی آیا ہوا تھا میرے کان میں آل انڈیا ریڈیو لاہور کی یہ آواز آئی کہ اقبال اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے ہیں۔

اسی میکلوڈ روڈ کے ساتھ ایک یاد اور بھی وابستہ ہے۔ اور وہ یاد ہے مولینا ظفر علی خاں مرحوم کی یاد

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

مولینا کو سب سے پہلے میں نے راولپنڈی کے ایک جلسے میں سُنا تھا۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ حصولِ پاکستان کے لیے نئی نئی میدان میں اتری تھی۔ مولینا مجسم خطابت کی تصویر فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہے تھے۔ ایک مسلمان نوجوان نے ایک پرچے پر ایک سوال کیا اور مولینا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سوال کچھ اس قسم کا تھا "مجوزہ پاکستان میں اقتصادی مسئلے کا آپ نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ پاکستان اپنے فلاں فلاں اقتصادی مسائل کیسے حل کرے گا۔؟ اس سوال کا مولینا نے جو جواب دیا وہ بڑی حد تک مضحکہ خیز تھا۔ حالانکہ ان مسائل کا پروفیسر برج نرائن ایم اے جو سناتن دھرم کالج لاہور میں اقتصادیات کے اُستاد تھے اور تحریک پاکستان کے حامی تھے۔ اپنے اکثر و بیشتر مقالات میں حل پیش کر چکے تھے۔ اگر وہ فسادات کے دنوں میں قتل نہ ہوتے تو پاکستان کو ایک اعلیٰ پائے کا ماہر اقتصادیات و مالیات مل جاتا۔

یہ ظفر علی خاں کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو میری نظر میں

ؔ مولینا کی تقریر سے کوئی دو ایک برس قبل ایسی ہی ایک اور تقریر سننے کا مجھے لاہور میں اتفاق ہوا تھا اور یہ صاحبِ تقریر بھی ایسے ہی شعلہ بیاں تھے

اس سے زیادہ اہم اور زیادہ تابناک تھا اور وہ پہلو اُن کی زندگی کا ادیبانہ اور شاعرانہ پہلو تھا۔ آپ کہیں گے دونوں میں کیا فرق ہے؟ اُن کی ادبی زندگی اور سیاسی زندگی میں حدِ فاصل کہاں نظر آتی ہے؟ اُن کے ادبی نظریات سیاسی نظریات سے کہاں متصادم ہوتے ہیں؟ میرا جواب شاید آپ کو مطمئن نہ کرسکے



لیکن مجھے اپنے جواب سے اطمینان ہوجاتا ہے۔ اور وہ جواب ہے میرا نظریۂ فن۔ اُن کی سیاسی زندگی ایبک وغوری کے معرکے تھے جو باقی نہ رہیں گے اور اُن کی شاعری نغمۂ خسرو ہے جو ہمیشہ تازہ وشیریں ہے۔

آج دنیائے اُردو میں کون ہے جو اُن کی شاعری کا معترف نہیں

یہی مولینا ظفر علی خاں یہ آتش نفس مقرر تھے سید عطاءاللہ شاہ بخاری گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نیا نافذ ہوا تھا۔ اس ایکٹ کے تحت چونکہ بظاہر خود مختاری دیکر حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی زنجیرِ غلامی کو اور مضبوط کردیا تھا اس لئے تمام حریت پسند جماعتیں اس کے خلاف مصروفِ عمل تھیں۔ اس سلسلہ میں مجلس احرار کا ایک عظیم الشان جلسہ شاہی مسجد لاہور میں منعقد ہوا اور سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے کہ ایسے مقررِ ہندوستان نے شاذونادر ہی پیدا کئے ہیں۔ اس جلسے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دھجیاں بکھیرنا شروع کیں مسجد کا دالان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن ایک سناٹے کا عالم تھا۔ اور اس میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی تقریر بم کے دھماکے کی طرح گونج رہی تھی۔ ان کی تقریر شروع ہوئے آدھ گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ لا کالج کے ایک طالب علم کی جو شامت آئی تو اس نے کھڑے ہوکر یہ سوال کرڈالا کہ حضرت آپ جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے خلاف اس قدر زوردار تقریر کر رہے ہیں ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پڑھا بھی ہے؟" بس پھر کیا تھا شاہ صاحب نے اپنی تقریر روک لی اور نہایت اطمینان سے اس طالب علم کو جواب دینا شروع کیا۔

"میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمان قرآن شریف کے سوا اور کچھ نہیں پڑھتا۔ میں قرآن پڑھتا ہوں مجھے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اور پھر باوازِ بلند انھوں نے مجمع سے خطاب کیا۔

"مسلمانو! اگر تمہارے سامنے قرآن شریف اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ رکھ دیئے جائیں تو تم ان دونوں میں سے کیا پڑھو گے؟"

سارا مجمع بیک زبان فلک شگاف انداز سے پکارا "قرآن شریف"

شاہ صاحب بولے "یہ نوجوان کہتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پڑھنا چاہئے۔" چنانچہ مجمعے نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اس نوجوان کو اٹھایا اور ایک دوسرے کے سروں سے گزارتے ہوئے مسجد سے باہر پھینک دیا۔

یہ شاہ صاحب کی ایک تقریر تھی۔ اُن کی کس کس تقریر کا ذکر کیا جائے ۱۹۳۶ء سے بہت پہلے کا ذکر ہے۔ ابھی مائکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ لائلپور میں مجلس احرار کا جلسہ تھا شاہ صاحب تقریر کے لئے تشریف لائے اور اس فقرے سے خطابت کا آغاز کیا "آج تقریر کے لئے میرے پاس کوئی موضوع نہیں ہے آپ سے خطاب کروں تو کس موضوع پر" یہ کہہ کر جو تقریر شروع کی تو سیاسیاتِ عالم کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو انہوں نے اپنی تین گھنٹے کی تقریر میں بے نقاب نہ کیا ہو۔ سیاسیاتِ افرنگ، مشرقِ وسطیٰ میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں، ہندوستان میں حکومت برطانیہ کے قول وفعل کا تضاد، آنے والی آزادی کا مژدہ، غرض تین گھنٹے تک انہوں نے سامعین پر ایک جادو کا عمل کئے رکھا اور جب تقریر ختم ہوئی تو ایسا محسوس

اور کون ہے جو اُن کے سائے کلام کا مُعترف ہو۔ مولینا کے کلام نے جہاں اُردو شاعری کو حدِ نظر تک پھیلتی ہوئی وسعتیں اور فلک بوس بلندیاں عطا کی ہیں، وہاں وقتی سیاست کی بدولت اس میں ایسی غلط اندیشیاں بھی راہ پا گئی ہیں جن کا متحمل کسی زبان کا ادب العالیہ نہیں ہو سکتا۔ اعلیٰ شاعری سیاست سے متاثر تو ہو سکتی ہے سیاسی اکھاڑہ نہیں بن سکتی۔ موضوع کوئی بھی ہو اُسے آفاقیت، اُس وقت حاصل ہو گی جب اس پر فنکار کی آفاق گیر نظریں پڑیں گی۔ یہ آفاقیت ظفر علی خاں کے کلام میں نظر تو آتی ہے، لیکن کہیں کہیں آج اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا جائے تاکہ آنے والی نسلوں کے آنکھوں سے اس نابغۂ عصر کی تصویر کے وہ خد و خال اوجھل نہ ہو جائیں جو اُردو ادب کے تصویر خانے کیلئے جاودانی فخر و مباہات کا باعث بن سکتے ہیں۔

مجھے اس زمانے میں مولینا کے ساتھ بعض مشاعروں میں شریک ہونے کا بھی اتفاق ہوا۔ اِن مشاعروں میں سے میں دو کا ذکر کروں گا ایک سیالکوٹ میں منعقد ہوا، دوسرا بہاولپور میں۔ سیالکوٹ کے مشاعرے کی صدارت نواب جعفر علی خاں اثر نے کی۔ جو اس زمانے میں کشمیر کے ہوم منسٹر تھے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت مولانا کی وہ تقریر تھی جو انہوں نے اپنے کلام سے پہلے کی اور اس کی ابتدا یوں ہوئی "سرزمینِ سیالکوٹ کا ذرہ ذرہ ایک آفتابِ عالمتاب ہے۔ . . . . . " اس تقریر میں انھوں نے علامہ اقبال اور اُن کے اُستاد میر حسن کا ذکر خاص طور سے کیا[1]۔ مجھے اس وقت تقریر یاد نہیں، لیکن اس تقریر کا جاہ و جلال ابھی تک میری چشمِ تصور کے سامنے ہے اس تقریر کے ایک حصے میں انہوں نے اُردو اور اس کے مستقبل کا ذکر کیا اور اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان قرار دیا۔

آخر الذکر مشاعرہ ایک تاریخی مشاعرہ تھا کئی اعتبار سے، اور ایک انوکھی بات اس مشاعرے میں یہ تھی کہ دو دنوں میں اس کی مسلسل کئی نشستیں منعقد

ہوا جیسے کوئی طلسم ٹوٹ گیا ہو۔

یہ تھا خطابت کا جادو جو آج ایک افسانہ بن چکا ہے ہزاروں کے مجمعے میں بجلی کی طرح کڑکنے والی شخصیتیں اب کہاں، آج پانچ سات سو کے مجمع کو خطاب کرنے کے لیے مائکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت مائکروفون کم از کم لاہور اور راولپنڈی میں تو آیا نہیں تھا ہو سکتا ہے کہ کچھ مدت بعد اس بات کو باور کرنا ہی مشکل ہو جائے کہ مولینا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو اور وٹھل بھائی پٹیل کس جاہ و جلال کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر پندرہ، پندرہ، بیس بیس ہزار کے مجمعے سے خطاب کرتے تھے اور اُن کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی کس طرح سامعین کے دلوں میں اُترتی چلی جاتی تھی

ے

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

---

[1] مولینا ایک طوفانی دریا تھے۔ وہی طوفانی دریا جس کے بارے میں جوش نے کہا ہے۔

دریا ہوں اک مقام پہ رہتا نہیں ہوں میں
اک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں ہوں میں

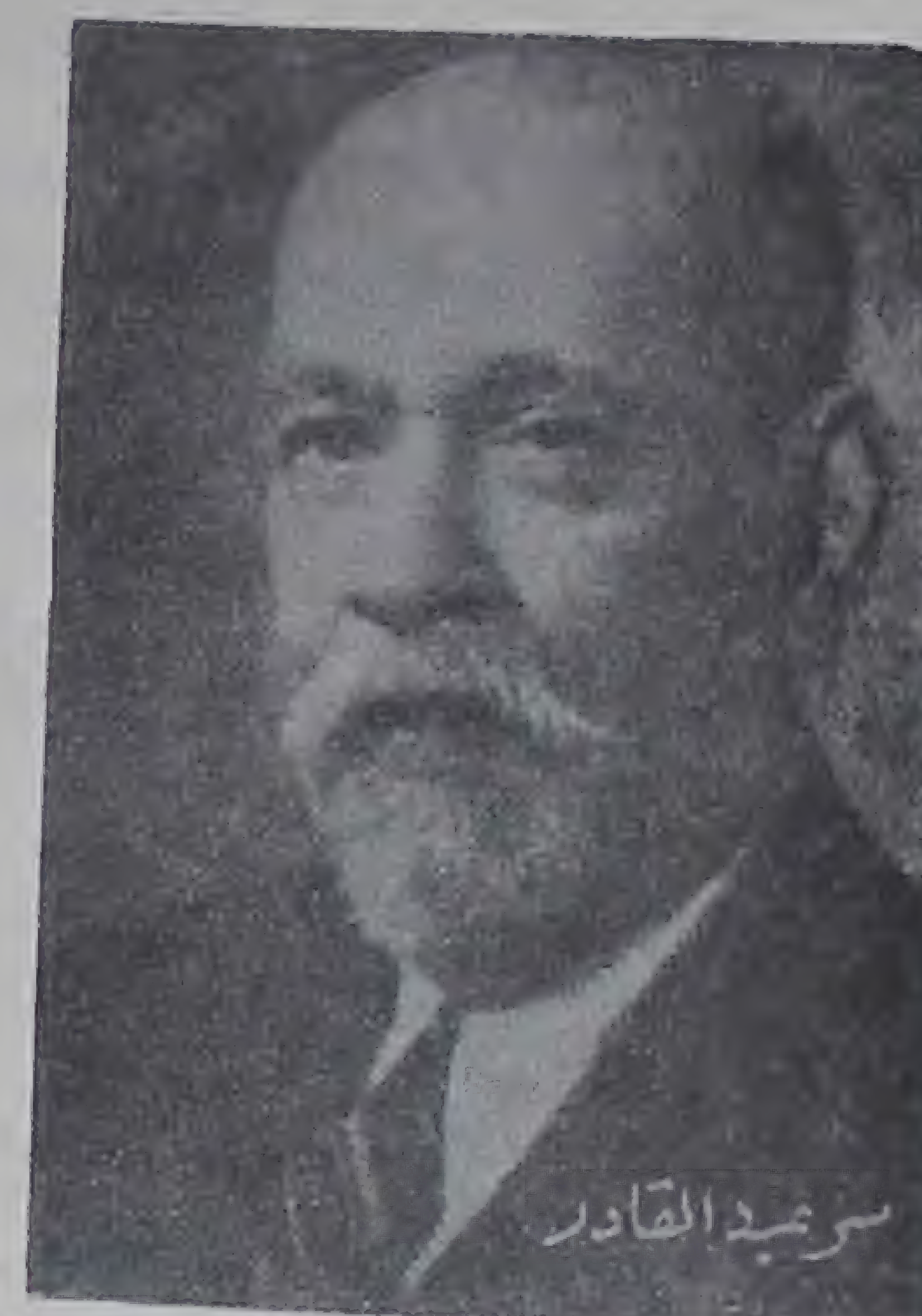
یہ شعر جوش نے اپنے بارے میں کہا ہے لیکن اس کا صحیح تر اطلاق مولانا ظفر علی خاں پر ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی شان میں مذکورہ تقریر کے علاوہ مولانا کے متعدد اشعار موجود ہیں جن میں اقبال کی جی بھر کے تعریف کی گئی ہے مثلاً

ملت کو نئی زندگی اقبال نے بخشی
ممکن نہیں اس بات کا اقرار نہ کرنا

یہ شعر اگرچہ مولینا نے اقبال کے انتقال پر کہا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی بھر مولینا کے اقبال کے ساتھ دوستانہ تعلقات رہے۔ علامہ اقبال کی رائے مولانا کے بارے میں یہ تھی کہ مولانا کا قلم مصطفےٰ کمال کی تلوار ہے لیکن جب مولانا علامہ سے بگڑے تو ان کے بارے میں یہ اشعار نوکِ قلم پر لائے۔

مانگ، کہ احباب سے رجعت پسندی کی کداں :: قبرِ آزادی کی کھودی کس نے سرِ اقبال نے
کہہ رہے تھے ڈاکٹر عالم یہ افضل حق سے آج :: قوم کی لٹیا ڈبو دی کس نے سر اقبال نے

ہوئیں۔ اس مشاعرے کے بعد بغداد الجدید میں "بندگان عالی" کی طرف سے ہم تمام شعراء کی دعوت ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ سر عبدالقادر مرحوم ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس تھے۔ ایک شامیانے کے نیچے نہایت قیمتی صوفے پر ہز ہائی نس نواب صاحب، انگریز ریذیڈنٹ خاکی رنگ کی ترکی ٹوپی پہنے جسے دربار بہاولپور میں بہت ضروری سمجھا جاتا تھا اور شیخ سر عبدالقادر تشریف فرما تھے۔ شامیانے کے باہر لان میں ہم لوگوں کی نشستیں


سر عبدالقادر

تھیں ایک صاحب نے جن کا تعلق دربار سے تھا۔ ہم میں سے اکثر شعراء سے آکر پوچھا کہ کیا ہم قصیدہ پڑھیں گے۔ ہم تقریباً تمام شعراء ان آداب سے ناواقف تھے۔ معذرت کر دی۔ مولانا ظفر علی خاں ہمارے قریب ہی تشریف فرما تھے اُن سے بھی یہی سوال کیا گیا مولانا نے کہا لکھا تو نہیں لیکن پڑھوں گا چنانچہ مولینا اٹھے اور شامیانے کے قریب پہنچ کر انہوں نے فی البدیہ اشعار پڑھنا شروع کیے۔ دو ایک مجھے ابھی تک یاد ہیں ؎

نصیب اچھے ہیں اُن نازک خیالوں کے پہنچ جن کی
بہاول پور کے فرماں روا کی آستاں تک ہے۔

دلوں کی گتھیاں جو کھول دے چٹکی بجاتے میں
وہ جادو ان دنوں پنجاب میں میری زباں تک ہے

اس وقت جب کہ میں اس مشاعرے کا ذکر کر رہا ہوں اس کے اکثر واقعات ایک ایک کر کے میری نظر کے سامنے آ رہے ہیں۔ ایک غیر معروف شاعر نے ایک انقلابی نظم پڑھ دی۔ مشاعرے کی دوسری نشست میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس شاعر کو حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔

اس مشاعرے میں مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ حضرت سیماب اکبرآبادی جناب جوش ملسیانی، میرے والد محترم، اسد ملتانی اور اثر صہبائی بھی تشریف لائے تھے۔ لیکن جو رنگ نخشب جارچوی اور شعری بھوپالی نے جمایا وہ کسی اور سے نہ جم سکا۔ احسان دانش، عرش ملسیانی اور شکیل بدایونی بھی بہت کامیاب رہے۔ مشاعروں میں ان شعراء کی کامیابی کا یہ خاص دَور تھا۔

اس مشاعرے میں شرکت کے لیے شعراء کے قافلے کی بہاولپور پہنچے کی رُوداد بھی خاصی دلچسپ ہے، دہلی اور پنجاب کے دوسرے حصوں سے آنے والے شعراء سب لاہور میں آ کر جمع ہوئے۔ کیوں کہ یہیں سے ریل براہ راست بہاولپور کو جاتی تھی۔ ایک ہی ریل میں تمام شعراء نے سفر کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے تمام شعراء نے ایک سوہن لال ساحر کے علاوہ تھرڈ اور انٹر کلاس کے ٹکٹ خریدے۔ سوہن لال ساحر چونکہ یوراج کپورتھلہ کے مصاحب تھے۔ انہوں نے سیکنڈ کلاس میں سفر کیا۔ اُن کے ساتھ ملازم بھی ہم رکاب تھا۔

جن حضرات نے لاہور سے بہاولپور یا کراچی تک ریل کا سفر کیا ہے۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ اس سفر میں ریت اور گرد چاروں طرف سے مسافروں پر کس طرح یلغار کرتی ہیں۔ آپ بے شک ریل کی کھڑکیاں اور دروازے بند رکھئے منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے آپ کی وہ

علامہ اقبال کو سر کا خطاب ملا تو یہ کہہ کر ان کی توضیح کی۔

سرکار کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبال

جب کانگرس میں تھے تو کانگرس اور گاندھی جی کی شان میں ایسے اشعار کہے کہ اردو میں اُن کی مثال نہ ملے۔

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا :: باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
تن من کیا نثار خلافت کے نام پر :: سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔

مگر جب کانگرس سے برگشتہ ہوئے تو مخالفت میں بھی زوردار نظمیں لکھیں

آج کل دہلی۔

حالت ہوگی کہ آپ پہچانے نہ جا سکیں گے۔ ہم لوگوں کی بھی بہاولپور تک پہنچتے پہنچتے یہی حالت ہوگئی اور سب اسی خیال میں تھے کہ بہاولپور پہنچ کر اطمینان سے ہاتھ منہ دھوئیں گے۔

نخشب کو نہ جانے کیا سوجھی دو ایک اسٹیشن پہلے حضرت غائب ہو گئے ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں چلے گئے۔ جب بہاولپور ریل پہنچی تو کیا دیکھتے ہیں کہ این جناب نہائے دھوئے، صاف ستھرے بنے، بال سنوارے سیاہ شیروانی زیب تن کئے سیکنڈ کلاس سے برآمد ہو رہے ہیں۔ ہمیں ان حضرت کی چالاکی اور اپنی سادگی اور حماقت پر بہت غصہ آیا کیوں کہ یہ اُس وقت ایک معزز شخص نظر آ رہے تھے اور ہم ایسے معلوم ہو رہے تھے کہ جیسے بیگار میں پکڑے ہوئے آئے ہوں۔ حکومت کی طرف سے جو لوگ ہمارے استقبال کے لئے آئے تھے وہ بھی دھوکا کھا گئے۔ وہ بزرگ شعراء سیماب اکبرآبادی، والد محترم، جوش ملسیانی، اسد ملتانی وغیرہ کے لئے ہار لے کر آئے تھے۔ وہ انہوں نے سب کے سب نخشب جارچوی کے گلے میں ڈال دیئے۔ اور ان کے علاوہ کسی شاعر کو درخور اعتنا ہی نہ سمجھا۔ اسٹیشن پر ہماری سواری کے لئے ایک کار تھی اور ایک لاری جو ٹرک کی طرح پیچھے سے کھلتی ہے۔ انہوں نے کار تو نخشب جارچوی صاحب کو پیش کر دی اور لاری میں باقی تمام شعراء کو سوار کرا دیا۔ سوہن لال ساحر نے ریل سے اترنے اور باہر پہنچنے میں اتنی دیر لگا دی کہ انھیں بھی کپورتھلے کا شاہی وضع قطع کا لباس زیب تن کرنے کے باوجود لاری ہی میں جگہ ملی۔

آگے آگے نخشب کی کار چلی اور اس کے پیچھے ہم لوگوں کی لاری۔ اس کار کی وجہ سے اٹھنے والی گرد ہی کیا کم تھی کہ لاری نے بھی اپنے چاروں طرف گرد اڑانا شروع کر دی۔ ہماری ہیئت کذائی میں جو تھوڑی بہت کمی رہ گئی تھی وہ اس لاری کے سفر نے پوری کر دی۔

نخشب کی اس عزت افزائی پر شکیل بدایونی بار بار یہی کہتے تھے۔ دوستو گھبراؤ نہیں پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔

اسی عالم میں ہم لوگ نواب صاحب کے محل میں جا پہنچے وہاں چائے کی دعوت کا انتظام تھا۔ چائے سے پہلے ہم پر اتنا کرم ضرور کیا گیا کہ پانی تولئے اور صابن کا انتظام کر دیا گیا تاکہ ہم بقول اثر صہبائی تاجدار کے حضور میں جانے کے قابل ہو سکیں۔

چائے کے بعد ہم لوگ ڈاک بنگلے کے لئے روانہ ہوئے۔ کار کے سفر نے نخشب صاحب کے سر میں ہوا بھر دی تھی۔ اور لاری کے سفر نے ہمارے ذوق و شوق پر خاک ڈال دی تھی۔ ڈاک بنگلے میں پہنچے تو قیام کے لئے نخشب صاحب کو کوئی کمرہ پسند ہی نہیں آیا۔ باہر بڑے دروازے ہی میں ایک زینہ دوسری منزل کو جاتا تھا۔ نخشب نے سوچا کہ اسی دوسری منزل کے بالاخانے میں قیام کیا جائے۔ شاعرانہ مرتبے میں اضافہ ہوگا چناں چہ بولے "ہمارا انتظام اس بالاخانے میں کر دیا جائے" منتظمین نے ایک آدھ بار عذر کیا اور کہا کہ یہ بالاخانہ مدت سے غیر آباد ہے۔ اس میں آپ کو تکلیف ہوگی آپ نہ مانے چنانچہ ارشاد کی تعمیل کی گئی۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ نخشب صاحب نے ابھی اس زینے میں آدھا سفر ہی طے کیا ہوگا کہ بھڑوں کو جو ایک چھتے کو آباد کئے بیٹھی تھیں ان کے آنے کی اطلاع مل گئی۔ وہ پیشوائی کو آگے بڑھیں اور اس سے پہلے کہ نخشب صاحب رجیع القہقری کا عزم فرمائیں انھوں نے ان کی بلائیں لینا شروع کر دیں ان کے چہرے و ہاتھوں پر وہ اس محبت سے چپک گئیں کہ ان کی پذیرائی میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ نخشب نے "ہائے مر گیا" "بچاؤ" کا نعرہ لگایا۔ منتظمین دوڑتے ہوئے آئے۔ نخشب صاحب زینے میں منہ کے بل پڑے تھے وہ انہیں اٹھانے کے لئے آئے۔ ڈاکٹر طبیب جمع ہو گئے۔ دوا دی گئی کہ بخار نہ آ جائے۔ چہرے کی مالش شروع ہوئی لیکن اس کے باوجود نخشب پہلے روز کے مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے۔ دوسرے روز آ کے چہرے کی سوجن کچھ مدھم پڑ چکی تھی۔ لیکن آواز مدھم نہیں تھی۔ ترنم اپنا جادو جگا گیا۔

ختم ●●

اُردو کے ناشرین سے گذارش ہے کہ گذشتہ ۲۰ سال میں انھوں نے جتنی کتابیں شائع کی ہیں اس کی ایک فہرست ہمیں جلد سے جلد بھیجدیں۔ (ادارہ)



نازش پرتاپ گڑھی

غزل

پھر میں نے کہا۔ لاؤ، مرا جام مجھے دو
اے بادہ کشو! پھر کوئی الزام مجھے دو

"شعلوں پہ ذرا رقص کا پیغام مجھے دو"
جینے کے علاوہ بھی کوئی کام مجھے دو

اک میں ہی سردار رہا اور رہوں گا
تاریخ نگارو! کوئی بھی نام مجھے دو

صرف ایک ہی جرعے میں بھرم کھل گیا سب کا
اب کس کا یہ منہ ہے جو کہے جام مجھے دو

سوچا ہے اُسے گردِ رہِ شوق بنا دوں
اے ہم سفرو! لاؤ، غمِ شام مجھے دو

عیسیٰ کے مقدر سے جو کچھ چھوٹ گیا ہو
وہ نام۔ وہ الزام۔ وہ دشنام مجھے دو

کہنا ہو جو اشکوں کی زبانی وہ کہو تم
جو خون سے لکھنا ہو وہ پیغام مجھے دو

اس دور میں جینے کی سزا دی گئی ہم کو
جس دَور کو ضد ہے کہ ہر آلام مجھے دو

لمحوں سے کہو لذتِ آغاز اُٹھائیں
میں عہد ہوں، تلخابۂ انجام مجھے دو

شاعر کا تو مفہوم ہے اک بے عمل انساں
اے ہم سخنو! اور کوئی نام مجھے دو

اِس دَور میں نازش وہی فنکار بڑا ہے
جو کھل کے یہ کہتا ہو کہ انعام مجھے دو



رفیعہ منظور الامین

خلائی قاصد

پڑوسی گھر، پڑوسی محلے، پڑوسی شہر، پڑوسی ملک اور پڑوسی براعظموں کی باتیں کافی پرانی ہو چکی ہیں۔ اور اب ان کی جگہ، کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں، آج کی نشستوں کا موضوع بنتی جا رہی ہیں۔ جو لوگ پہلے بے پر کی اڑایا کرتے تھے اب حیران ہیں کہ وہ کونسی غیر مانوس خبر دنیا کو دیں کہ جسے سنکر دنیا لمحہ بھر کے لئے چونک اٹھے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کی دنیا امکانات وحقائق کی دنیا ہے۔ کوئی تعجب خیز خبر سنکر ہم اب چونک نہیں پڑتے۔ بلکہ نہایت سادگی سے کہہ بیٹھتے ہیں کہ "ہاں ایسا ہو سکتا ہے" حتیٰ کہ کسی نہایت ہی بے ڈول اور بدہئیت انسان کو دیکھ کر بچے اب ڈرتے ہیں نا ہنسی اڑاتے ہیں بلکہ "یہ خلا سے آیا ہوا آدمی ہے" کہہ کر معاملہ ختم کر دیتے ہیں۔ یہی بچے بڑے ہو کر اگر سائنسدان بنیں تو کسی غیر معمولی چیز کو دیکھ کر بے اعتنائی نہیں برتتے۔ ہو سکتا ہے کہ سائنس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور حقیقت پسندی انسان کے بہت سے جذبات کو ختم کر دے لیکن تجسس کا جذبہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر اڑن طشتریاں Flying Saucer جنہیں کچھ عرصہ پہلے واہمہ سمجھا جاتا تھا، آج کی سائنسی دنیا میں اپنا تفتیشی مقام پا چکی ہیں۔ انہیں Un-identified Flying Objects کہا جاتا ہے۔ اور ان کے بارے میں تفتیش جاری ہے ابھی سے کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ اڑن طشتری دراصل ہے کیا چیز۔ کچھ دنوں سے اخباروں میں انکے دیکھے جانے کی خبریں زیادہ آرہی ہیں بعض چند ایک لوگوں نے ان طشتریوں کو دیکھا ہوتا، تو نفسیاتِ تحلیلی کے ماہر یہ بات ثابت کر دیتے کہ یہ محض ان لوگوں کے دماغ کی اپج ہے۔ لیکن پانچ لاکھ سے زیادہ لوگوں کی شہادت معمولی شہادت نہیں کہی جا سکتی۔

مشرقی اقوام کے بارے میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ زیادہ جذباتی، وہمی اور اعتقاد کے کمزور ہوتے ہیں لیکن امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں تقریباً پچاس فیصدی لوگ ایسے ہیں جو اڑن طشتری کو ایک زندہ حقیقت سمجھتے ہیں۔ ان میں قابلِ نظر انداز تناسب ان نیم مذہبی دماغوں کا ہے جو اڑن طشتریوں کو خدا کی بھیجی ہوئی خطرے کی گھنٹیاں سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم روحانیت پسند زیادہ ہیں۔ اور مغربی ممالک والے ہمارے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہم جہاں بعض چیزوں اور مظاہر کو روحوں سے وابستہ کر کے چھٹی پا لیتے ہیں، وہ ان کا تجزیہ کر کے جواز ڈھونڈنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ چناں چہ اسی طرح کے لوگوں کی عینی شہادت کی بنا پر امریکہ میں اڑن طشتریوں کی تفتیش شروع ہوئی۔

اس بارے میں سائنسدانوں کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ بیرونی خلا سے آئی ہوئی سواریاں ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ایک امریکی ہوا باز کینتھ آرنلڈ نے خبر دی کہ اس نے تو بہت ہی بڑے سائز کی طشتریوں کو فضا میں لڑکھڑاتے دیکھا ہے۔ تب ہوائی بیڑے کی ایک یونٹ کی طرف سے اس معاملے کی چھان بین شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں دس ہزار سے زیادہ مشاہدات کا ریکارڈ موجود ہے لیکن پھر بھی ان طشتریوں کی قطعی پہچان نہیں ہو سکی۔ انہیں کبھی تو غبارے کہا گیا اور کبھی شہاب ثاقب۔ البتہ تفتیش کی ۲ فیصد رپورٹوں میں انہیں "مسئلہ لاینحل" قرار دیا گیا۔ آخرکار

سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے کہ اڑن طشتری کے مسئلے کو واہمہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چوں کہ ہر حقیقت واہمہ ہی کے بطن سے جنم پاتی ہے لہذا اس گتھی کو بھی سائنسی دنیا کے غیر حل شدہ گتھیوں کی صفِ اوّل میں جگہ دی گئی۔ اس سلسلے میں بڑی تیزی سے چھان بین کا سلسلہ جاری ہے۔

کمزور مذہبی رجحان رکھنے والوں کا اعتقاد اس سلسلے میں جو کچھ ہو۔ اس سے قطع نظر ٹھوس شہادتوں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اکثر ممالک میں اڑن طشتری کا نزول وقتاً فوقتاً ہوتا ہی رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں سویڈن میں یہ طشتریاں ہزاروں کی تعداد میں دیکھی گئیں۔ اور ان کے بارے میں خیال ہوا کہ یہ روسی میزائل ہوں گی۔ لیکن بعد میں یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

اُڑن طشتری کا ایک سائنسی تجزیہ یہ بھی ہے کہ یہ بہت ہی شدید برقی میدانوں سے آزاد ہونے والے برقی کرّے ہیں۔ اس طرح کے برقی میدان بعض مرتبہ شدید فضائی تناؤ والے حصوں میں اپنے آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر اڑن طشتریاں دُنیا کے ایسے حصوں میں نظر آتی ہیں جہاں ایسے فضائی تناؤ کے امکان زیادہ ہیں۔ لیکن یہ تھیوری بھی مکمل طور پر قابل قبول نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ عینی شہادتوں کے مطابق اڑن طشتری محض ایک ہیولا نہیں بلکہ ٹھوس شئے ہے۔

یہ انسانی نفسیات ہے کہ جب لوگ باوُجود انتہائی کوشش کے کسی بات کی تہہ کو نہیں پہنچ پاتے تو تھک ہار کر کوشش کرتے ہیں کہ اس کی صداقت کو تسلیم کر لیں اور ساتھ ہی خود کو دھوکہ دیتے ہوئے چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کے ہم خیال ہو جائیں۔ لہٰذا اڑن طشتری کے سلسلے میں افواہیں پھیلانے والوں اور توہم پرستوں کا ذکر ہی بیکار ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اُڑن طشتری سے جو لوگ برآمد ہوئے اُن کا قد بہت ہی لمبا تھا اور انہوں نے سونے چاندی کی طرح چمکیلے لباس پہنے ہوئے تھے۔ کسی کا دعویٰ ہے کہ انہیں اڑن طشتری کے باسی اٹھا لے گئے تھے۔ اور ان کے ساتھ بہت ہی محبت اور اخلاق کا برتاؤ کیا گیا۔ وغیرہ

حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور اور فضائی خلائی معلومات کے باوجود ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں اب بھی کئی لامعلوم خلائی راز ایسے ہوں جو اڑن طشتریوں کا جواز بن سکتے ہوں۔ ہارورڈ کالج کی رصدگاہ کے سابق ڈائرکٹر ڈونالڈ مینزل کا خیال ہے کہ کبھی کبھی بعض بہت روشن ستاروں کی روشنی کا انعطاف [1] جب فضا سے ہوتا ہے تو منعطف شدہ شعاعیں چمکتی ہیں اور پھیل بھی جاتی ہیں۔ اور نتیجہ کے طور پر بھٹکتے ہوئے روشن کرّوں جیسی نظر آتی ہیں۔

کولوریڈو کے ایک ماہر طبیعیات 'کونڈن' نے اس سلسلے میں سرے سے ایک نیا تحقیقاتی قدم اٹھایا ہے۔ انھوں نے کمپیوٹر کی مدد سے دو ہزار مشاہدات کا تجزیہ کیا ہے۔ فی الوقت تین مستند شہادتوں پر اکتفا کرتے ہوئے کونڈن نے اپنا کام شروع کیا ہے۔

سب سے پہلی شہادت ایک کسان پالے ٹینیٹے کی ہے جس نے اتفاقاً ایک اڑن طشتری کو اپنے کھیت پر منڈلاتے دیکھا اور کیمرے سے اس کی تصویریں اتاریں۔ یہ واقعہ ۱۱ مئی ۱۹۵۰ء کا ہے۔ اڑن طشتری قطر میں اندازاً ۲۰ سے ۳۰ فٹ تھی اور اس کی شکل کسی ڈبے کے ابھرے ہوئے ڈھکنے کی طرح تھی۔ یہ تصویریں کافی صاف ہیں۔ اب ان کا برقی تجربوں سے تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

کونڈن کے پاس دوسری شہادت ۲ نومبر ۱۹۵۷ء کی ہے۔ جبکہ ٹکساس میں ایک ساتھ کئی طشتریاں دیکھی گئیں۔ ان کی شکل بیضوی تھی اور یہ تقریباً دو سو فٹ لمبی تھیں عین شاہراہ پر ان کے نزول سے لوگ بدحواس ہو گئے اور سڑک پر موجود گاڑیوں کی روشنیاں خود بخود بند ہو گئیں۔

تیسرا اور عجیب تر واقعہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۸ء میں برازیل میں پیش آیا

---

[1] روشنی جب کسی جسم سے ٹکرا کر واپس ہوتی ہے تو اسے روشنی کا انعکاس کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ روشنی جب کسی جسم سے گذر جاتی ہے تو اسے روشنی کا انعطاف کہیں گے۔ شعاع وقوع اپنا مقررہ راستہ چھوڑ کر دوسرے جسم سے گذرنے لگتی ہے تو وہ اپنا مقررہ راستہ چھوڑ کر ایک زاویہ سی بناتی دوسرا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ چناں چہ ستاروں سے نکلتی ہوئی روشنی جب زمین تک پہنچتی ہے تو مختلف کثافتی میدانوں سے گزرتی ہے اس لئے اس کا مختلف زاویوں پر اپنا راستہ بدلتے ہوئے ہم تک پہنچنا لازم ہے۔

جبکہ جہاز سے اڑن طشتری کی چار بہت ہی صاف تصویریں لی گئیں۔ یہ طشتری سیارے زحل سے بالکل مشابہ تھی۔

کونڈن کی رپورٹ تقریباً سال بھر میں مکمل ہو جائے گی۔ تب پتہ چلے گا کہ وہ اپنی مہم میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

بالفرض اگر اڑن طشتریوں کو خلاء سے آئے ہوئے جہاز مان بھی لیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کائنات میں ہماری نسلِ انسانی کے علاوہ کوئی اور نسل، ہم سے ممتاز، بھی موجود ہے۔ یہ بات بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم نے سوچا کہ اس کائناتِ بسیط پر صرف ہمارا ہی تسلط ہے تو یہ ہمسری اور خود فریبی ہی ہو گی۔ لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جہاں ہم خلاؤں کو ٹٹولتے پھر رہے ہیں۔ وہیں کوئی ہماری بھی حرکات و سکنات کا قدردان موجود ہے۔

زمین ایک معمولی سا سیارہ ہے جو کہکشاں کے کروڑوں سیاروں میں سے ایک سیارے سورج کے گرد اپنے مدار پر گھومتا رہتا ہے اور کائنات میں ایسی بیس کروڑ سے زیادہ Galaxies اور کروڑوں سورج موجود ہیں۔ ان سورجوں کی تلاش صرف سائنسدانوں ہی کو نہیں بلکہ ہمارے نازک خیال شاعر اس مہم میں زیادہ پیش پیش ہیں۔

بعض بڑے طبیعیاتی ماہروں کا خیال ہے کہ خود ہماری کہکشاں میں ہو سکتا ہے کہ لاکھوں ستیارے ایسے ہوں گے جہاں کی اقوام ہم سے زیادہ تہذیب یافتہ ہوں گی۔ لیکن سیاروں کے مابین فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ خود ہماری کہکشاں ایک لاکھ نوری سال قطر میں پھیلی ہوئی ہے۔ (ایک نوری سال = ایک کروڑ اسی لاکھ میل) جب کہکشاں اتنے بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی ہو گی۔ تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں موجود ستاروں اور ستیاروں کے مابین فاصلہ کتنا زیادہ ہوا۔ ریاضی کی مدد سے معلوم کیا گیا کہ یہ فاصلہ تین سو سے ایک ہزار نوری سال تک ہو سکتا ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ ملنے ملانے اور ایک دوسرے تک جانے کے کیا امکانات ہوئے کہ اپنی دُنیا کے علاوہ ہم دوسری تہذیبوں سے روشناس ہو سکیں۔ خیر اب "فسانۂ آزاد" کا زمانہ تو نہیں رہا کہ فاصلہ کا اندازہ "ٹکا ڈولی" یا "چار ٹکے ڈولی" بھر کے مطابق ناپا جائے۔ زمانے کے ساتھ پیمانوں کی اکائیاں بھی بدل گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والی کسی صدی میں سائنس اس قدر ترقی پا جائے کہ آئے دن لوگ دوسرے سیاروں میں آنے جانے لگیں۔ لیکن فی الحال یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ زمین کی خلائی سرگرمیوں کے نتیجے کے طور پر دوسرے سیاروں کے باسی زمین کی طرف متوجہ ہوئے اور کسی مشاہداتی مشن کے تحت یہاں اُڑن طشتریاں بھجوائی جا رہی ہوں۔ کیوں کہ آواز اور پیغامات کی ترسیل کا سلسلہ اس میں شک نہیں کہ بہت عرصہ سے جاری ہے۔ لیکن بہت ہی طاقتور ریڈیائی لہروں کو جو غیر معمولی فاصلے تک پہنچ سکتی ہیں شروع ہوئے ابھی لگ بھگ بیس سال ہی ہوئے ہیں۔ فضا میں یہ فتح انسان کی معمولی فتح نہیں ہے۔ پھر بھی سب سے پہلی طاقتور ریڈیو لہریں ان بیس سالوں میں ۲۰ نوری سالوں سے آگے نہیں بڑھ پائی ہوں گی اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے فی الحال روشنی سے زیادہ تو کجا خود روشنی کی رفتار تک نہ پا سکی۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہماری یہ ریڈیائی لہریں کسی تہذیب یافتہ سیارے تک پہنچ بھی گئی ہیں۔ پھر بھی یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنے کم عرصہ میں ان کا جوابی قاصد "اڑنے طشتری" میں بیٹھ کر زمین پر بھی آدھمکا ہو۔ اگر فرض کیا کہ طشتری نے ہمارے خلابازوں کی رفتار سے مسافت کی (۱۷،۵۰۰ میل فی گھنٹہ) تو اُسے ہم تک پہنچنے کے لیے ۱۷،۰۰۰،۰۰۰ سال درکار ہوئے۔ اس نکتہ پر پہنچ کر یہ گتھی ہمارے لئے کچھ اور اُلجھ جاتی ہے۔ کیوں کہ جب امریکہ اور روس کی خلائی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو فوراً ہی طشتریوں کا ظہور بھی عمل میں آیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان طشتریوں کو باقاعدہ دُنیا کے کسی نہ کسی حصّے میں جہاز، ہوائی جہاز یا ریل گاڑیوں کا پیچھا کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ بعض صورتوں میں ان کی رفتار ناقابلِ بیان حد تک تیز تھی۔ چنانچہ ۲ نومبر ۱۹۵۷ء کو جب روس نے اسپتنک ۲ خلاء میں بھجوایا تو اس میں پہلی بار ایک جاندار کتا لائیکا نامی سوار تھا۔ کسی جاندار کو خلاء میں بھجوانے کی یہ پہلی انسانی کوشش تھی جس کا فوری ردّعمل یہ ہوا کہ اس واقعہ کے چند گھنٹوں ہی کے اندر کئی طشتریاں نمودار ہوئیں۔ جن کے قریب آنے پر کئی جگہوں پر بجلی گھر اپنے آپ فیل ہو گئے جہازوں کے کمپاس اپنے آپ گھوم کر عارضی طور پر بے کار ہو گئے اور جیسے ہی یہ

طشتریاں دُور ہوئیں وہ اپنے آپ ہی درست بھی ہو گئے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ لائیکا کے خلا میں جانے کے ۱۵۔۱۶ دن بعد فوٹوگرافک پلیٹ پر جہاں لائیکا کے مسکن اسپوتنک ۲ کی روشن بہتی لہروں جیسی شبیہ آتی تھی۔ اس کے پاس ہی اسی طرح کی کوئی اور شبیہ بھی تھی۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ خلا میں اسپوتنک ۲ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کا کوئی ساتھی بھی موجود تھا جس کی رفتار کنٹرول کی جا رہی تھی۔ مندرجہ ذیل واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ طشتریوں کی رفتار ہمارے جدید ترین جیٹ طیاروں سے کہیں زیادہ ہے۔

امریکہ میں ۱۱ جنوری ۱۹۶۵ء کو چار بجکر ۲۰ منٹ شام میں فوجی رسل و رسائل کے کئی ماہرین نے دیکھا کہ ایک درجن سے زیادہ انڈے کی شکل والی طشتریاں کوئی پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تیزی سے لڑکھڑاتی اڑی جا رہی ہیں۔ اچانک دو جیٹ طیاروں نے ان کا پیچھا کیا اور فوراً ان طشتریوں کی رفتار تیز ہو گئی، اتنی تیز کہ جیٹ طیارے اس کی گرد بھی نہ پا سکے اور وہ غائب ہو گئیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کسی سیارے سے، جہاں کے باسی بہرحال سائنس میں ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ طشتریاں خلائی تحقیقات کے سلسلہ میں بھجوائی گئی ہوں گی۔ اور کائنات کے گشت کے دوران انہوں نے زمین کو پا لیا ہوگا اور تب سے یہ قاصد برابر بھجوائے جا رہے ہیں لیکن ماہرین طبیعیات کے اعداد و شمار کے مطابق یہ بات بھی ممکن نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہماری ہی کہکشاں سے تعلق رکھنے والے دس لاکھ سیارے اگر پابندی سے ہر سال ایک خلائی کشتی ہم تک بھجواتے رہیں تب بھی ایک لاکھ سال میں صرف ایک خلائی کشتی ہم تک پہنچ سکتی ہے۔

دنیا کا چارٹ بنا کر جب اندازہ کیا گیا کہ یہ طشتریاں کہاں کہاں اُتریں تو پتہ چلا کہ ان کا نزول زیادہ تر روس، امریکہ (شمالی و جنوبی) یورپ برطانیہ عظمیٰ پر ہوتا ہے اور دنیا کے دوسرے حصوں میں نسبتاً کم۔ جتنی کہ عینی شہادتیں ملی ہیں ان میں سے ۹۵٪ طشتریاں بکھرے ہوئے یا غیر آباد علاقوں میں، گاؤں، کھیتوں وغیرہ میں دیکھی گئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خلائی پڑوسی فی الحال ہماری نباتات، جمادات اور حیاتیات کا جائزہ زیادہ لے رہے ہیں۔ کیا وہ ہمارے بڑے بڑے جوہری تجربہ خانوں اور سائنسی اداروں کو بھی کبھی اپنا نشانہ بنائیں گے یا پہلے ہی سے ان کی نظر میں انسانی دماغ کے یہ شاہکار محض ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے؟ اس سوال کا جواب ظاہر ہے ابھی نہیں دیا جا سکتا۔

مخصوص جگہوں پر ہی طشتریوں کا ظہور کیوں ہوتا ہے یہ بات سمجھنے کے لئے ۲ مارچ ۱۹۵۸ء کی دریافت سے مدد ملتی ہے جب کہ پتہ چلا کہ زمین سے ۶۰۰ میل دور خط استوا کے آس پاس خوفناک طاقت ور تابکار بلٹ موجود ہے۔ یہاں تابکاری کے اثرات اتنے تباہ کن ہیں کہ ان سے گزر جانا انسان کے بس کی بات نہیں، اور طشتریاں بھی بظاہر اس خطرے سے خائف ہیں۔ لہٰذا اس خطہ سے دور دور ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔

اڑن طشتریوں کا راز جو بھی ہو ایک حیرت انگیز بات جو اس معاملہ کو اور بھی پیچیدہ تر کر دیتی ہے وہ ہے سربراہ اور تفتیشی میدان میں پیش پیش ممالک کی حکومتوں کا وقتاً فوقتاً پہلو تہی کر جانا اور حقائق کو یکسر جھٹلا جانا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بڑی طاقتیں، اڑن طشتری کے راز کو ایک معینہ مدت تک راز ہی رکھنا چاہتی ہیں۔ اس سلسلہ کا غالباً سب سے اہم واقعہ ۱۹۶۱ء میں پیش آیا جب کہ روس کے دو خلا باز ایک عورت اور ایک مرد نے خلا ہی میں اپنے سانسوں کا حساب بے باق کر ڈالا۔ لاکھوں لوگ ٹیلی وژن پر دم سادھے ان دو بہادر خلا بازوں کی کشمکش اور کرب دیکھتے رہے۔ جیسے اچانک خلا میں کسی اور شے کی موجودگی نے انھیں دہلا دیا ہو یا اچانک پروگرام بند کر دیا گیا۔ اس خلائی جوڑے پر واقعتاً کیا گزری یہ غالباً ابدی راز ہی رہے گا۔ اس واقعہ کے بعد کئی بار متجسس شہریوں نے جب بھی ان طشتریوں کو دیکھا اور جواز مانگا تو ان لوگوں کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی غیر اطمینان بخش جواب دیا گیا یا سرے سے جھٹلا ہی دیا گیا کہ ایسی کوئی چیز دیکھی ہی نہیں گئی۔ اس سلسلہ میں ہزاروں حیران کن چشم دید واقعات کا ریکارڈ موجود ہے۔ لیکن ہاں حال میں رونما ہوئے دو واقعات کا ذکر دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔

سال گزشتہ یعنی ۱۹۶۷ء ہی کی بات ہے۔ کولوریڈو کے ایک مقام لوہا کی حیرت انگیز خبر اخبارات میں شائع ہوئی جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے

کہ کس طرح ایک گھوڑے کی موت واقع ہوئی اور نہایت ہی پر اسرار طریقہ سے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو غائب کر دیا گیا۔

الموسا کے مقطعہ دار ہیری کنگ کو پتہ چلا کہ ستمبر ۱۹۶۷ء کو ایک گھوڑا مقطعہ میں واپس نہیں آیا۔ ہیری کنگ کو فکر ہوئی اور وہ اس گھوڑے کی تلاش میں نکلے۔ تقریباً ایک تہائی میل دور انہیں گھوڑا نظر آیا لیکن مردہ حالت میں۔ گھوڑے کے سر اور گردن کی ساری چمڑی غائب تھی اور محض ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں جن پر ایک ریشہ بھی گوشت کا باقی نہیں تھا۔ گردن تک کھال اس صفائی سے اتاری گئی تھی کہ کسی معمولی چھرے کا کام نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کنگ نے فوراً اس گھوڑے کے مالک مسٹر اور مسز بربل لیوس کو خبر کی اور تینوں مقام واردات پر پہنچ کر چھان بین کرنے لگے۔ انہوں نے آس پاس کی اُجڑی ہوئی گھاس کو دیکھا۔ گھوڑے سے سو گز دور انہیں پندرہ گروی نشان نظر آئے۔ اس کے علاوہ پاس ہی انہیں (پہیتوں کے) چھ یکساں نشان نظر آئے جو دو انچ چوڑے اور چار انچ گہرے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُوپر سے کوئی چیز وہاں آکر اُتری ہو۔

ڈنور کے تحقیقاتی عملے نے جب زمین پر پائے گئے ان نشانوں کو ناپا تو سب سے بڑا نشان ۷ء۵ فٹ قطر کا تھا۔ اور دوسرے نشانات ۱۵-۱۵ انچ قطر کے تھے۔

مسز لیوس کو پاس ہی پڑا ہوا ایک اوزار ملا جس پر گھوڑے کے بال لگے ہوئے تھے۔ لیکن جیسے ہی اس نے وہ اوزار ہاتھ میں لیا۔ اس کا ہاتھ سرخ پڑ گیا اور جلنے لگا۔ یہ جلن اس وقت تک کم نہیں ہوئی جب تک کہ اس نے ہاتھ دھو نہیں لیا۔ (اگر اس اوزار کے ملنے کو زیب داستان نہ سمجھا جائے تو غالباً یہ پہلا موقعہ ہے جب کہ اُڑن طشتری نے اپنے پیچھے کوئی ٹھوس ثبوت چھوڑا ہے۔)

لیکن محض گھوڑے کی موت اور نشانوں کا پایا جانا ہی کسی اہمیت کا باعث نہیں ہے۔ قابلِ حیرت انکشاف تو اس وقت ہوا جب کہ گھوڑے کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ بظاہر گھوڑے کے جسم میں کوئی چیز داخل نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس کے پیٹ سے معدہ اور دوسرے اعضاء غائب تھے۔ اسی طرح جب کھوپڑی میں آرے سے شگاف کیا گیا تو وہاں دماغ یا کسی اور مائع کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز انکشاف یہ تھا کہ ریڑھ کی ہڈی سے نقوی مائع یکسر غائب تھا۔

گزشتہ اکتوبر میں ہی ایک واقعہ خود ہندوستان میں پیش آیا۔ سشیلانگ کے لائیکور گاؤں میں چیرا پونجی سڑک کے قریب ہی ایک شعلہ بار شے نظر آئی۔ اور دیہاتیوں نے غیر مانوس سے دھماکے سنے۔ یہ شعلہ بار شے طشتری نما تھی جس کا قطر اندازاً ۲۰ سے ۳۰ فٹ تک تھا۔ اس سے بہت ہی تیز سبز اور سرخ روشنی نکل رہی تھی۔ یہ شے چند منٹوں تک لٹو کی طرح گھومتی رہی۔ پھر زمین سے اُڑی، کچھ دور جا کر رُک گئی اور ایک ہی جگہ لٹو کی طرح گھومتی رہی۔ پھر اڑی اور قریب کے ایک نالے میں جا اُتری۔ متذکرہ بالا دھماکے یہیں ہوئے۔ جبکہ بظاہر یہ اُڑن طشتری نالے سے پانی چوس رہی تھی اور تیزی سے گھومنے کی وجہ سے پانی فوارے کی طرح اڑ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے یہ ہوا میں اُوپر اُٹھی اور گھنے جنگل پر سے ہوتی ہوئی غائب ہو گئی لیکن جاتے جاتے اس نے درختوں پر نشان بھی چھوڑے۔ کچھ درخت ایسے لگتے تھے جیسے کسی آرے سے کاٹے گئے ہوں۔ اُڑن طشتری کی ان کارستانیوں کے دوران آس پاس کی ہوا گرم ہو گئی۔ جو اس کے جانے کے بعد بھی کافی دیر گرم رہی۔ یہ سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے جاری رہا۔

اب اسے اتفاق سمجھئے یا کچھ اور، بہرحال جیسے جیسے روس اور امریکہ کی خلائی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اُڑن طشتریوں کی خبریں اور شہادتیں زیادہ موصول ہونے لگی ہیں۔

یہاں ایک دلچسپ نکتہ یہ اُٹھتا ہے کہ اگر یہ خلائی باسی واقعی ذی روح اور ذی حس ہوئے تو ان کی شکل کیا ہو گی۔ زمین پر زندگی نے کئی روپ بدلے اور یہاں وہی پنپتے ہیں جنہوں نے زمین پر موجود حالات کے مطابق خود کو ڈھال لیا۔ ویسے بھی زندگی کے لئے زمین جیسے موزوں و سازگار حالات کسی اور سیارے میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات بھی تسلیم کی جا چکی ہے کہ لاکھوں دوسرے سیاروں پر بھی زندگی موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے حالات کے مطابق گوشت پوست کا وجود نہ ہو اور زندگی کسی اور ہیئت میں موجود ہو۔ وقت ہی ان گتھیوں کو سلجھائے گا۔ آیئے ہم اپنے ان خلائی پڑوسیوں کے منتظر رہیں۔ لیکن معلوم نہیں ان کی اخلاقی قدریں کیا ہوں گی۔ زبان کیا ہو گی؟

ادارہ

"جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی"



ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ

۴ اپریل ۱۹۶۸ء کو مشہور امریکی نیگرو رہنما ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ شہید کر دیئے گئے۔ وہ مزدوروں کی حمایت کرنے اور اُن کے احتجاجی جلوس میں شرکت کرنے کے لیے میمفس (ٹینیسی) گئے ہوئے تھے۔ جہاں وہ لورین موٹل کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں مقیم تھے اپنے دوستوں کے ہمراہ بالکونی میں کھڑے ہوئے۔ جہاں قضا ان کی منتظر تھی۔ رائفل کی گولی چلی اور اپنا کام کر گئی۔ انھیں کئی بار دھمکیاں دی جا چکی تھیں، بم بھی پھینکے گئے۔ اور ڈاکٹر کنگ خود جانتے تھے کہ اُن کی زندگی ہر وقت خطرے میں ہے۔ مگر جو لوگ عظیم مقاصد کو اپناتے ہیں وہ راہ کے خطروں سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ انسان کتنے دن تک زندہ رہتا ہے، اہم یہ ہے کہ وہ کس طرح زندہ رہتا ہے۔

ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو ۱۹۶۴ء میں ان کی امن پسندی کے لیے نوبل امن انعام ملا تھا۔ وہ دوسرے نیگرو رہنما تھے جسے یہ انعام ملا۔ ۱۹۶۰ء میں جنوبی افریقہ کے نیشنلسٹ رہنما چیف البرٹ لوتھولی کو یہ انعام ملا تھا۔ ہندوستان کو ان کی اس عزت افزائی سے خاص طور پر خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ مغرب میں مہاتما گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد کے داعی اور پیروکار سمجھے جاتے تھے۔ اور لوگ انہیں محبت سے امریکی گاندھی کہتے تھے۔

ڈاکٹر کنگ امریکی حبشیوں کی آواز تھے۔ جو عدم تشدد کے ذریعے گورے لوگوں کے مساوی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے اس جدوجہد کو پُرامن رکھنے کے لیے ڈاکٹر کنگ کو گورے اور کالے، دونوں طبقوں کے انتہا پسندوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے عقیدے پر پختگی سے ڈٹے رہے انہوں نے اپنے پیروکاروں سے کہا

"آپ میں سے کچھ لوگوں کے پاس چاقو اور دوسرے ہتھیار ہیں۔ میں گزارش کرتا ہوں کہ آپ ان ہتھیاروں کو ایک طرف رکھ دیں اور عدم تشدد کا ہتھیار اور سچائی کی ڈھال اٹھالیں اور پھر آگے بڑھیں"۔

وہ ۱۵ فروری ۱۹۲۹ء کو اٹلانٹا (جارجیا) میں پیدا ہوئے۔ اسکول کے بعد انہوں نے اٹلانٹا نیگرو مورہاؤس کالج میں تعلیم پائی۔ مہاتما گاندھی کے طریق کار سے وہ جس حد متاثر تھے، اس کا جواب خود ان کے الفاظ میں یوں ملتا ہے۔

"اپنے خاندانی ماحول کی بدولت عیسائیت کے اصول میری زندگی کا جزو تھے۔ مگر اپنے اصولوں کو عملی شکل دینے کا طریقہ میں نے گاندھی سے سیکھا۔" انہوں نے بوسٹن یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا دیگر تصانیف کے علاوہ ان کی ایک تصنیف "ہم انتظار کیوں نہیں کر سکتے" ہے جس میں

انہوں نے امریکہ میں نیگرو باشندوں کی شہری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

۱۹۵۵ء میں انہوں نے منٹگمری، البامامیں ان بسوں کے بائیکاٹ کی تاریخی مہم کا آغاز کیا تھا جس میں نسلی امتیاز کے تحت کالے اور گورے باشندوں میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ ۳۸۰ دن ہزاروں نیگرو اپنے دفتروں اور کام کاج کی دوسری جگہوں پر پیدل جاتے رہے اور پیدل ہی واپس آتے رہے اور یہ بائیکاٹ اس وقت ختم کیا گیا جب امریکہ کی سپریم کورٹ نے گورے اور کالے کے امتیاز کی بنا پر بسوں میں نیگروں باشندوں کی مخصوص سیٹوں کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ملک کے اسکولوں میں رنگ کی بنا پر داخلے میں امتیاز کو ختم کرانے اور مساوی حقوق حاصل کرنے کے لیے اس طرح کی کئی تحریکوں کا آغاز کیا اور ۱۹۶۳ء میں شہری حقوق کے لیے اس تاریخی مارچ کی باری آئی جس میں کالے گورے دونوں نسلوں کے دو لاکھ افراد نے مل کر حصہ لیا۔ یہ جلوس واشنگٹن مانومنٹ سے شروع ہو کر ڈاکٹر کنگ اور ان کے ساتھیوں کی قیادت میں لنکن میموریل تک پہنچا اس کے نتیجہ میں امریکہ میں نیگرو باشندوں کو شہری حقوق عطا کرنے کا بل منظور کیا گیا۔

ڈاکٹر کنگ نے اپنی زندگی میں اپنا پیغام دنیا بھر کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے دور دراز ملکوں کا سفر کیا۔ ان کے ایک دوست نے ان کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ جن لوگوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں ان کی تمام توقعات ڈاکٹر کنگ کی ذات سے وابستہ ہو گئی ہیں وہ انتہائی دیانتدار انسان ہیں اور عجز و انکساری ان کے کیریکٹر کا ایک خاص وصف ہے۔ انہوں نے عیسائیت کے اصولوں سے اپنی گہری وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ محض نیگرو باشندوں کو نہیں، بلکہ تمام قوم اور اس کی روح کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر کنگ کی موت پر ساری دنیا بھر میں انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا



ڈاکٹر کنگ کی ہندوستان کے دورے (۱۹۵۹ء) کے دوران لی گئی ایک تصویر

گیا ہے۔ خود ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ان کی موت کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ اور ہزاروں سفید اور کالے امریکیوں نے دوش بدوش ان جلسوں اور جلوسوں میں حصہ لیا جو امریکہ میں ان کے سوگ میں نکالے گئے۔

"جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی"۔ کنگ صرف نام کے بادشاہ نہ تھے بلکہ انہوں نے لاکھوں دلوں پر حکمرانی کی ہے اور اپنی موت سے ایک ایسا روشن کر گئے ہیں جو آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

بقیہ "رتجگے کی نصف شب"

ہے ایک ہی دفعہ کیوں نہیں ہر شے سے انکار کر دیتی۔ سارے جھگڑوں کا یہی تو ایک علاج ہے۔ کہ تم منکر ہو جاؤ۔ انکار کر دو۔ نفی کر دو — گرمیوں کی اس دوپہر کا گونجتا سناٹا اچانک اس کمرے میں در آیا — ابرار نے تکیہ پر سے سر اٹھا کر سوجی ہوئی سرخ کم خواب آنکھوں سے نیچے دری پر پھیلے ہوئے ان چاروں کی طرف دیکھا۔ میز پر بے ربطی سے پھیلے ہوئے تاش کے پتے اور میز کے نیچے وہسکی کی خالی بوتلیں اور گلاس آخری شب کے تھکے ہوئے راہیوں پر نوحہ خوانی کر رہے تھے! اس نے گردن پر آئے پسینے کو چادر کی رگڑ سے صاف کیا پھر کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ ایک بار پھر نیند کی تاریکیوں میں کھونے سے پہلے اس نے عطیہ شہزاد احمد کو وقار کے سینے سے لگے سسکیاں لیتے دیکھا — اور پھر چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ باہر دسط گرما کا سیال تانبے کا کھولتا سورج پھر مغرب کی طرف جھک گیا۔

قاضی سلیم

لمس



اُس دن یہ دھرتی کتنی الگ تھی۔
جیسے پایاب ندی کی بہتی ہوئی چمکیلی گیلی ریت پہ کوئی چلے
نیند کی مضمحل بانہوں میں کھلتے پھولوں جیسی نرم ملائم لچکیلی
ہر رستہ، پگڈنڈی، ... ایک پھسلتا بہتا خواب
در و دیوار .. .... پگھلتا موم
امنگوں کے چلتے پھرتے ہیولے ... دشمن دوست سبھی
جیون کا ہر کل پرزہ چکناہٹ میں پھسلتا
—— بے ٹکراؤ تھا
—— بے آواز تھا
—— جیسے ہونٹ سے ہونٹ ملیں

خوابوں کی پُر جوشش اڑانیں .... جس میں پر نہ ہلیں
اور ایک ہی جھونکے میں میلوں، دور تلک
—— ہم تیرتے منزل پر جا پہونچیں

جب بھی سوچا ایسے لگا
جیسے میں لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھا
—— ایک ننھا فاتح ہوں
جو اپنی چمکیلی تلوار چلاتا مملکت اپنی کمرہ کمرہ پھیلاتا ہے۔

کون و مکاں کی وسعت آنگن میں محصور ہے
—— میرا خدا خود میرا دوست
—— مرا ہم عمر ہے مرے ساتھ ہے
—— اس کے فرشتے مری فوج میں شامل ہیں

(۲)

لیکن جس دن میں نے پہلی بار یہ سوچا
پھول کھلے ہیں آج تو کل یہ کہاں رہیں گے ؟
میری روح کے سناٹوں میں جو راگ بسے ہیں
—— شور و فغاں میں کیسے جئیں گے ؟
کل کیسی ہوگی ؟
میری محبت کا کیا ہوگا ؟
پہلی بار مرے اس دل نے فکر و تردد کا پھل چکھا
اور اسی دن میرے خدا نے مجھ کو تنہا چھوڑ دیا

اب یہ دھرتی میرے لیے
ایک شکستہ آئینہ ہے
اس کی چکنا چور سطح پہ ہاتھ پھرا کر دیکھو
خون کا دھارا بہہ نکلے گا۔

اس جہنم میں

کہاں سے آگئے تم
خلاؤں میں چھپی نادیدہ آنکھیں دیکھتی ہیں
پلک جھپکی —— کئی نوری برس بیتے
قیامت سے گلے مل کر ذرا پلٹی تو یہ دھرتی
کسی سورج کی بھٹی سے نکلتی راکھ کا ایک ذرّہ ہے۔

کہاں سے آگئے تم
راکھ کے ذرّے میں تم کیا! اور میں کیا!!
محبت کا سہارا بے بسی کی انتہا ہے
دھڑوں کو اپنے چمٹا کر لہو اپنا نچوڑیں بھی تو کیا ہوگا؟
تمناؤں میں دیوارے ہوئے یہ کلبلاتے لوتھڑے کیسے
بلندی سے نظر آئیں گے۔ ——
—— ہنستے ہیں کہ روتے ہیں
جنازہ چیونٹیوں کا جا رہا ہے،
—— یا کوئی بارات نکلی ہے
افق کے اس پار ستر اونٹ کاغذ سے لدے سر کو جھکائے جا رہے ہیں

سیکڑوں اجداد گذرے
عقابی پتلیوں سے کوئی خلیہ
اس زمیں کے اندھے جوہڑ میں گرا تھا
تبھی شاید وہ سب کچھ کھو چکا تھا
سیکڑوں اجداد گزرے

سب پریشان ہیں
اسے کس نے چرایا ہے
ہر اک کو شبہ ہے کہ دوسرے نے
اپنے سینے میں چھپا کر رکھ لیا ہے
سبھی کی آتمائیں کھوکھلے ناموں کے کاسوں میں
چھپکلی کی اک کٹی دم کی طرح
تڑپتی —— پھڑپھڑاتی ہیں

تبھی تو شہر میں ہلچل مچی ہے
گلی میں شور بڑھتا جا رہا ہے
جلا دو پھونک دو —— نابود کر ڈالو
چیر دو ہر جسم
—— اندر جھانک کر دیکھو
سڑک پر خون بہتا ہے
—— اسے چکھو
خدا کا ذائقہ شاید ملے گا

(۲)

کہاں سے آگئے تم
اس جہنم میں
کہاں سے آگئے تم
خلاؤں میں چھپی نادیدہ آنکھیں
بنا جھپکائے پلکیں دیکھتی ہیں
مکوڑوں اور کیڑوں میں بڑے گھمسان کا اک رن پڑا ہے
ہزاروں ڈھیر ہو کر رہ گئے ہیں
افق کے پار ستر اونٹ کاغذ سے لدے سر کو جھکائے جا رہے ہیں
(شور ہے آہ و فغاں کا
ٹھوکروں سے دھول اڑتی ہے
ہزاروں شہر لٹتے جا رہے ہیں)

چلو جلدی کرو
وقت کے رتھ کو
تیز دوڑاؤ —— روشنی سے تیز دوڑاؤ
چلو اس کارواں کو روک کر پوچھیں
ہمارے نامۂ اعمال لے کر کس خلا میں جا رہے ہو
کون ہے؟
جو ہماری بے بسی پر آج ہنستا بھی نہیں
زمیں کے ایک اک سوراخ میں
خود زندگی کی کوکھ میں
کیوں موت انڈے دے رہی ہے۔

سوشیلا شرما

وصیت

آج ہاتھ میں قلم اٹھایا ہے اگر پہلے کبھی ایسی خواہش ہوتی تو ستار لے کر بیٹھتی۔ یوں ستار کو چھوڑ کر اور کون ہے میرا ساتھی۔ لیکن اب جیسا میرا حال ہے ویسا ہی خستہ حال اس کا بھی ہے۔

کپڑوں کا اپنا شوق میں نے اپنے پیارے ستار پر نئے نئے غلاف چڑھا کر پورا کیا ہے۔ خود اپنے جوڑے کو کبھی پھولوں سے نہیں سجایا مگر ستار کو میں جوہی کے گجرے پہناتی رہی۔

گھر میں کسی کے داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر میرے ستار پر ہی جاتی۔ اس سے مجھے انتہائی مسرت ہوتی۔

یہ ستار اب بھی مجھے اتنا ہی پیارا ہے جتنا پہلے تھا۔ اس کے تاروں کو سہلاتے اور جھنجھناتے میرے من کے نہ جانے کتنے دکھ اس میں سما گئے تھے۔ مگر اب میرے ہاتھوں میں وہ طاقت نہیں رہی۔ کتنے بوجھ جو ہنستے ہنستے جھیلے اب رو کر بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔

قلم کھولنے کے لئے میں نے اس کا ڈھکن گھمایا۔ اس کے ساتھ میرا من بھی گھوم گیا۔ قلم کھولنے اور بند کرنے کے لئے کچھ گھیرے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی میری زندگی کے گنے چنے کچھ واقعات بھی ہیں۔

آج برسوں پہلے کا وہ دن مجھے یاد آیا جب ستار تیز آواز سے بج اٹھا تھا اور انگلیوں نے پانی پر تیرتی ہوئی مچھلی کی طرح ناچنا شروع کیا تھا۔ من کے خیالات کے ساتھ ساتھ انگلیوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ تار ٹوٹ گئے تھے، آواز رک گئی تھی اور خیالات کا سلسلہ بھی درہم برہم ہوگیا تھا۔ نہ صرف تار ہی ٹوٹے تھے بلکہ میں خود بھی سمٹ کر رہ گئی تھی۔ آخر میری ہی قسمت اتنی کھوٹی کیوں؟

پاؤں خود بخود تلسی کی جانب بڑھے۔ روئی کی بتی بنتے بنتے من بھی کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ میں بولی — "کیوں ری تلسی ماں، تو نے شیام بھلا کیسے رجھائے تھے؟ ماں، اب تو مجھ سے بھی برداشت نہیں ہوتا یہ اکیلا پن۔ مجھے بھی دیدو ایک شیام۔ لو یہ دیپک قبول کرو۔ اور میرے من میں روشنی کرو ماں، . . . . تلسی ماں شیام دیدو۔"

روتے روتے میرا ہاتھ اور سارا جسم کانپنے لگا۔ باہر کی اندھیری رات نے مجھے اور بھی مایوس بنا دیا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکوں نے مجھے بڑی بری طرح ہلا دیا تھا۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کی وجہ سے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ من سے نکلا "شیام"۔ نام ہونٹوں پر آ کر جم گیا تھا۔ تبھی ایک آواز سنائی دی "اندر چلی جاؤ۔ آج بہت سردی ہے کتنا غلط وقت ہے تمہارا روز دیا جلانے کا۔"

آواز میرے بہت قریب کی تھی کبھی نیند میں بھی میں نے ایسا میٹھا خواب نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر بھی لمحہ بھر کے لئے یقین نہ رہا۔ چاہتے ہوئے بھی میں آنکھیں نہ کھول پائی۔ ڈر تھا کہ کہیں اصلیت خواب میں منتقل نہ ہو جائے۔ تب ہی کسی کی باہوں نے مجھے گرم شال اوڑھا دی شال کے اوپر پڑنے پر آنکھیں کھلیں۔

وہ جا رہے تھے . . . . سرد ہوا کی پروا کئے بغیر۔ میری آنکھیں ان

کی چوڑی پیٹھ پر جیسے ٹک گئیں۔ وہ دور ایک گھر میں چلے گئے۔ اپنے شیام کی صورت میں نہ دیکھ سکی۔ چوڑی دیوار سی اُن کی پیٹھ کئی دیواروں میں جا چھپی میں بھی اندر چلی آئی۔ شال کو اپنے جسم سے اور بھی لپٹا لیا۔

تبھی ماما بولے —— "ارے مجھے یوں لگا ورما خود آ پہنچا۔ جیسے لمبا چوڑا وہ ہے۔ ویسی ہی لمبی تم۔ مگر ایک بات ہے کہ عورت کا اتنا لمبا ہونا نحوست کی علامت ہے۔ ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ لمبی کی قسمت ناٹی اور ناٹی کی بڑی۔ مینار سی کھڑی ہوئی عورت بھی کبھی اچھی لگتی ہے بھلا؟"

ایسے تھے میرے ماموں، جو برسوں سے دماغ کا توازن کھو چکے تھے۔ اُن کی بات کا میں نے یا کسی اور نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ مگر اس دن تو خاص طور سے ان کی یہ بات مجھے کھل گئی۔ خوشی سے ناچنا چاہنے والے میرے من کو جیسے وہ روک دینا چاہتے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ میں نے کہا —— "ماما جی اب آپ سو جائیے رات بہت گذر چکی ہے۔"

وہ ہنسے۔ بولے —— "سو جاؤں گا — سو جاؤں گا۔" ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ مگر ہاں ورما کو ڈاکٹروں سے سخت نفرت ہے۔ ٹھیک بھی ہے بھلے چنگے لوگوں کو ڈاکٹروں کی ضرورت بھی کیا۔؟ یہ شال میں اُسے ہر روز اوڑھے دیکھتا ہوں۔"

مجھے لگا شال مجھے اتار دینا چاہئے۔ ماما اس طرح بہکتے رہے تو رات پھر نہ ان کی رہے گی اور نہ میری۔ میں شال اُتار کر رکھنے لگی۔ وہ بولے —— "نہ نہ یہاں نہیں — اسے تو اپنے کمرے میں ہی لے جاؤ۔ دوسروں کی چیز حفاظت سے رکھتے ہیں۔"

شال میں نے پھر لپیٹ لی اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر بستر میں لیٹ گئی۔

ماموں کی اناپ شناپ باتوں میں رات ہو چکی تھی۔ کبھی ماں کو یاد کرتے اور کبھی باپ کو، کبھی بہن کو بُرا بھلا کہتے اور کبھی مجھے۔ کوستے کوستے کبھی کہہ بیٹھتے "ارے ایک سال تیری ماں کو تیرے باپ نے ساتھ رکھا یہ کیا کم تھا کتنی لمبی تھی تیری ماں۔ کیا آدمی سر پر جوتے رکھنے کو گھر رکھے ایسی عورت کو۔" اور کبھی بہن کی یاد میں۔ کہتے۔

"بہن آدمی بڑا ہی خود غرض ہوتا ہے۔" پھر بہن کو یاد کر کے رات بھر رویا کرتے۔ میں سمجھاتی وہ جواب دیتے: "تم نہ سمجھو گی آدمی بڑا خود غرض ہوتا ہے۔ میں اپنی قوم کو خوب جانتا ہوں۔"

ماموں ہنسنے پر آتے تو بغیر کسی بات کے ہنسے چلے جاتے۔ اور روتے تو سارا دن روتے رہتے۔ بھلا پاگل روتے بھی کیسے ہیں؟ مگر اُن کے پاگل پن میں بھی اُن کی کئی باتیں ایسی ہوتیں کہ ہم جیسے اچھے بھلے آدمی بھی جھٹکا کھا جائیں۔ مگر ——

مگر اس روز ماموں نے میرے میٹھے خواب کی کڑیاں توڑ دی تھیں۔ ایسی کتنی ہی کڑیاں بکھری پڑی تھیں کیسے جوڑوں، کسے چھوڑوں۔ اس رات میں سو نہ سکی تھی۔ ایسے میں قاعدے کی پابند ہوں اور جو کچھ بن سکی ہوں اس کا سہرا اس باقاعدگی کے سر ہے۔ میرے پیدا ہوتے ہی ماں نے دم توڑا تھا۔ والد نے اُس سے قبل ہی میری ماں کو چھوڑ دیا تھا۔

ماں کی صورت مجھے بالکل یاد نہیں اور جس کی پناہ مجھے ملنی چاہئے تھی اس باپ نے مجھے اس قابل ہی نہ سمجھا تھا، لیکن درخت سے ٹوٹا ہوا پتہ ہوا کے سہارے سے بھی کبھی کبھی اوپر اڑ جاتا ہے۔ میں نے بھی اس طرح اپنے ننھیال کے کئی لوگوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے زندگی کی کئی کئی سیڑھیاں پار کر ڈالی تھیں۔ پالنے سے گھٹنوں اور گھٹنوں سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر میں کالج تک پہنچ گئی تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ میں اپنی منزل تک پہنچی۔ جہاں کئی آدمی بھی نہیں پہنچ سکے۔ خاص اعزاز کے ساتھ مجھے ڈاکٹری کی ڈگری ملی۔ اس پیشے میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی محنت اور باقاعدگی کے ذریعہ دولت اور شہرت مجھے حاصل ہوئی، مگر دل کا سکون نہ ملا۔ اور نہ ہی کہیں پیار۔

باہر بیماروں کے بیچ اور گھر میں ماموں کے پاگل پن نے مجھے بھی دل کا مریض بنا دیا۔ زندگی میں کوئی بھی نیا پن نہ پا کر دل اندر ہی اندر چیخ اٹھتا۔ پھر ستار بج اٹھتا۔

مریضوں کا دُکھ بانٹنے اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف دور کرنے میں مجھے سکون ملتا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی ڈسپنسریاں جو میرے ارد گرد تھیں، ٹھپ ہو چکی تھیں۔ آنے والے بیماروں کو میں نے کبھی امیر اور غریب کی دو مختلف قسموں میں نہ بانٹا تھا۔ اُن کے دُکھ درد کو ہی دیکھ کر دوا دی تھی۔ تب ہی سب کہتے تھے کہ چٹکی بھر راکھ دے دیجئے۔ ہم ٹھیک ہو جائیں گے زندگی

کا بوجھ ڈھونے کے لئے ایشور نے مجھے جو کام دیا تھا اس کے سہارے میں آپ ہی کو کبھی یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ کبھی میں رونا چاہتی تھی۔ مگر جب تھکی ہاری گھر لوٹتی تو ماموں کو دیکھ کر رہی سہی ہمت بھی دم توڑ دیتی، میں نڈھال ہوتی تو وہ میری ڈھال بننے کی کوشش کرتے۔ میرے مستقبل کی فکر میں وہ مجھے سمجھانے کی غرض سے کہتے کہ عورت کی اصلی زندگی تو بیوی کی حیثیت سے ہی ہے۔ میری شادی کا ذکر چھیڑتے تو میرا تن سے تاڑ اور تاڑ سے پہاڑ بن جانا انھیں پسند نہ تھا۔ میں انھیں سمجھاتی کیسے؟ کیسے سمجھاتی اپنے پاگل ماموں کو۔ نرے پاگل۔

دل بہلانے کے لئے میں من ہی من میں کہتی کہ "کیا بھی کیا جائے۔ میں سمجھ دار وہ پاگل۔"

لیکن اس یقین دہانی سے دکھ کم نہ ہوتا تھا۔ میں بے ہوش سی ہو جاتی پھر اس حالت سے ابھر کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ بیمار کی طرح میں بھی اٹھ کھڑی ہوتی۔ میں نے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی تعلیم پائی تھی مگر یہ تعلیم بھی میرے کام نہ آسکی۔

ورما کی شال نے میری یہ ہمت بھی مجھ سے چھین لی۔ نہ وہ مجھ سے اپنی محبت جتاتے، نہ میں کسی سے پیار کی امید کرتی۔ ایک بار سنا ہوا وہ ایک فقرہ میرے من میں ٹوٹے ہوئے ریکارڈ کے گیت کے بول کی طرح بار بار بجتا رہتا۔ آخر اس رسیدہ زندگی میں بہار سی آجاتی۔

بند کمرے میں مجھے شال نے کئی بار گرماہٹ دی۔ اسے اوڑھ کر میں نے ہزاروں خواب دیکھے اور سنوارے۔ دن میں اسے دیکھ کر میں خوش ہوتی کچھ دن یہ بھی سوچتی رہی کہ کیسے انھیں ملوں اور شال لوٹا دوں۔ کبھی سوچتی کہ کیوں نہ اسے اوڑھ کر ماموں جی کے سامنے بیٹھوں اور دیکھوں وہ کیا کہتے ہیں ان کے بارے میں۔

ماما نے ایک دن مجھے شال اوڑھے ہوئے دیکھ کر کہا — "ورما بھلا آدمی ہے۔ بیچارا آج ہی مل کر گیا ہے۔ شال تک نہ مانگی۔ اس کی چیز انھیں خود لوٹا دینی چاہئے تھی۔ بیچا ... را ... شادی ..."
اور ماما جی زور سے ہنس دیے۔ ہنستے ہنستے اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ کیوں ہنسے، کیوں روئے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

مارفیہ کے انجیکشن کے بعد بڑی دیر تک بڑبڑاتے رہے: "اسے میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ تمہاری ماں کی ایک سال کی زندگی میں اسے موت کے منہ میں ڈھکیل دیا۔"

ورما چلے گئے کہاں؟ کس کے پاس؟ کب تک کے لئے؟ یہ سب سوال میرے لئے ایک معمہ بن گئے تھے۔ مگر ماما جی نے اس معمہ کو حل کرنے کا بھی موقعہ نہیں دیا۔ ان کے دماغ کا توازن اور بھی ڈانواڈول ہو گیا۔ اپنے پرائے نوکر کے سہارے میں جیسے تیسے گھر اور ڈسپنسری کو سنبھال پائی تھی۔

دن گزرنے تھے گزرتے گئے۔ ماما کی حالت بگڑتی گئی۔ کب دن ہوا، کب رات ڈھلی، دیکھنے کا مجھے ہوش نہ رہا۔ لیکن لاکھ کوشش کرکے بھی میں ماموں کو بچا نہ پائی۔ ایک دن نیند میں ہی اچانک ان کی موت ہوگئی۔

اس پاگل سہارے کا چھن جانا بھی میرے لئے ناقابل برداشت ہوگیا۔ اس روز ورما جی مجھے بہت یاد آئے۔ جی چاہتا تھا ان کے سینے پر سر رکھ کر رو دوں۔ مگر کہاں انھیں تلاش کرتی۔ کہاں سے انھیں بلاتی۔ اب ان کی شال ہی میرا سہارا تھا۔

ماموں جی کی موت کی خبر سنکر پتا جی بھی آئے۔ میں روئی کہ انہوں نے مجھے صبر کرنے کو کہا۔ مانو میرا دکھ کم کرنے کے لئے ہی انھوں نے جاتے جاتے کہا — "تمہارے چھوٹے بھائی کی پندرہ دن بعد شادی ہے۔ تم ضرور پہنچ جانا۔ میں تمہارا راستہ دیکھوں گا۔" میں نے ان سے وعدہ کرلیا — "میں ضرور پہنچ جاؤں گی۔"

ماموں جی کے پھول دریا میں بہا کر میں پتا جی کے آشیرواد کے لئے چل پڑی۔ والدہ کی کئی ان دیکھی تصویریں میرے من میں بنتی مٹتی گئیں۔ اور میں پہلی بار اپنے پتا کے گھر میں داخل ہوئی۔ شہنائی کی میٹھی آواز نے مجھے "خوش آمدید" کہا۔ پتا جی مصروف تھے انھوں نے ہر ایک کے ساتھ مختصر سا تعارف کروادیا۔ مجھے بھنڈارا اور گہنوں کا کام سنبھالنے کا کام ملا۔ بڑے خاندان میں بہن کی حیثیت میں میں نے اپنے بیتے دنوں کو برے خواب کی طرح سے بھلا دیا۔ میری زندگی میں نئی

صبح ہوئی۔

شادی کے گھر میں میں ایسے گھل مل گئی تھی، جیسے سوتیلے بھائی بہنوں کے بیچ ہی میں پیدا ہوئی اور بڑی ہوئی ہوں۔ وہ سب مجھے بہت اچھے لگے۔ سوتیلی ماں نے اَن دیکھی ماں کی کمی کا زخم بھر سا دیا۔ اُن کا سوکھا پیلا چہرہ دیکھ کر میرے من کے پت جھڑ میں ننھی کونپل پھوٹ پڑی۔ پریوں کی کہانی سا یہ کھیل مجھے بہت رومانٹک لگا۔

نئی دلہن کے گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے گھر میں شادی کا سارا کام پورا ہوگیا۔ شہنائی کی دُھن خاموش ہوگئی۔ میں نے بھی بھنڈار کو تالہ لگا دیا۔ دن بھر پاؤں پہ بیتا تھا۔ چیزوں کو اٹھانے رکھنے میں اب ہاتھ پاؤں نے جواب دے دیا تھا۔ تبھی پتاجی آئے۔ بولے۔ "انجان گھر میں بھی خوب کام سنبھالا تم نے۔" اس ایک فقرے سے جیسے پھر ہاتھ پیروں میں نئی طاقت آگئی۔ پتاجی نے کہا۔ "لاؤ چابیاں تمہاری ماں کو لوٹا دوں۔"

میرے ہاتھ سے چابیاں لے کر پتاجی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا "اب تو یہی خواہش ہے کہ تمہارے ہاتھ پیلے کردوں۔ بیٹا اب میں بوڑھا ہوچکا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔" پتاجی کی بات نے مجھے رُلا دیا۔ وہ بولے۔ "ور کھوج دوں گا۔ تم ایسا کرو کہ کچھ مہینے کی اپنی تنخواہ یہاں بھیجتی جاؤ تاکہ میں ٹھاٹ باٹ سے شادی کرسکوں۔"

جو میں بھولی ہوئی تھی اچانک مجھے یاد آیا۔ میں پتاجی کی جانب بغیر پلک جھپکائے دیکھتی رہی۔

" . . . . تم نے آج بڑی بھول کی۔ شادی کے موقعہ پر یوں سادی دھوتی نہیں پہنی تھی۔ میں سب مہمانوں سے تمہارا تعارف بھی نہ کرا سکا۔" پتاجی نے کہا۔

میرے پاؤں کانپنے لگے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور کہا۔ "اب میں چلوں گی پتاجی صبح بیماروں کو دیکھنا ہوگا۔"

"کیسے روکوں بٹیا۔ میں بھی اب بہت تھک گیا ہوں۔" انھوں نے کہا اور میری پیٹھ کو ایسے تھپتھپایا جیسے وہ میری پیٹھ کو چھونا نہ چاہتے ہوں۔ وہ تھپتھپی میری پیٹھ پر کیلوں کی مانند چبھی۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگی۔

"میں کیوں آئی یہاں۔" جس گھر میں کسی نے مجھے اب تک پانی کے لئے بھی نہ پوچھا تھا۔ وہاں پل بھر رُکنا بھی مجھے ناگوار لگنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور شرم اور غصے سے میں کانپ رہی تھی۔

جیسے تیسے پاؤں بڑھا کر نکلی ہی تھی کہ پاس والے کمرے میں داخل ہوتے بھائی ٹھٹک کر رُک گیا اور بولا "دیدی کیا بات ہے؟" "میں اب چلوں" کہہ کر مُڑ گئی۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا اور بولا۔ "نہ دیدی نہ۔ آج تجھے نہ جانے دونگا جس ننھے بھائی کی شادی کا اتنا کام کیا۔ کیا اُسے ایک دن بھی سیوا کرنے کا حق نہیں دوگی۔"

میں رو رہی تھی۔ سگے باپ نے ہی سوتیلے کو سوتیلے بنائے رکھا۔ میں کیا کہتی، میں بولی۔ "آج مجھے جانے دو بھیا۔ مجھے صبح تک پہنچنا ہی ہے۔" میں رُکنا نہیں چاہتی تھی مجھے ڈر تھا کہ میں گر پڑوں گی۔ دو قدم اور بڑھی تو وہ بولا کہ "دیدی ٹھہر، یہ شال اوڑھ لو۔ دیکھو تو جاڑے سے کانپ رہی ہو مگر مانتی بھی تو نہیں۔ کیا یہ وقت جانے کا ہے؟"

دلوں بعد پھر کسی نے مجھے ٹوکا۔ وہ مجھے شال اوڑھانے لگا مگر میں نہ مانی۔ نئی دلہن کے اوڑھے ہوئے شال کو میں نے نہ اوڑھا۔ میں نے دیکھا کہ کسی کے دو آنسوؤں نے دیدی نام کے لفظ کو پیار اور خلوص سے سینچ دیا تھا۔"

ساری رات اسٹیشن پر ٹھٹھرتی رہی۔ اتنی سرد ہوا سے نہیں جتنی اپنے آپ سے۔

اب کوئی میرا اپنا نہ تھا۔ گھر اور ڈسپنسری کے بیچ پھر وہی زندگی چلنے لگی۔ زندگی میں کئی چیزیں پیچھے چھوٹتی گئیں۔ نہ چھوٹی تو صرف دو چیزیں ـــــ ایک شال اور ایک ستار۔

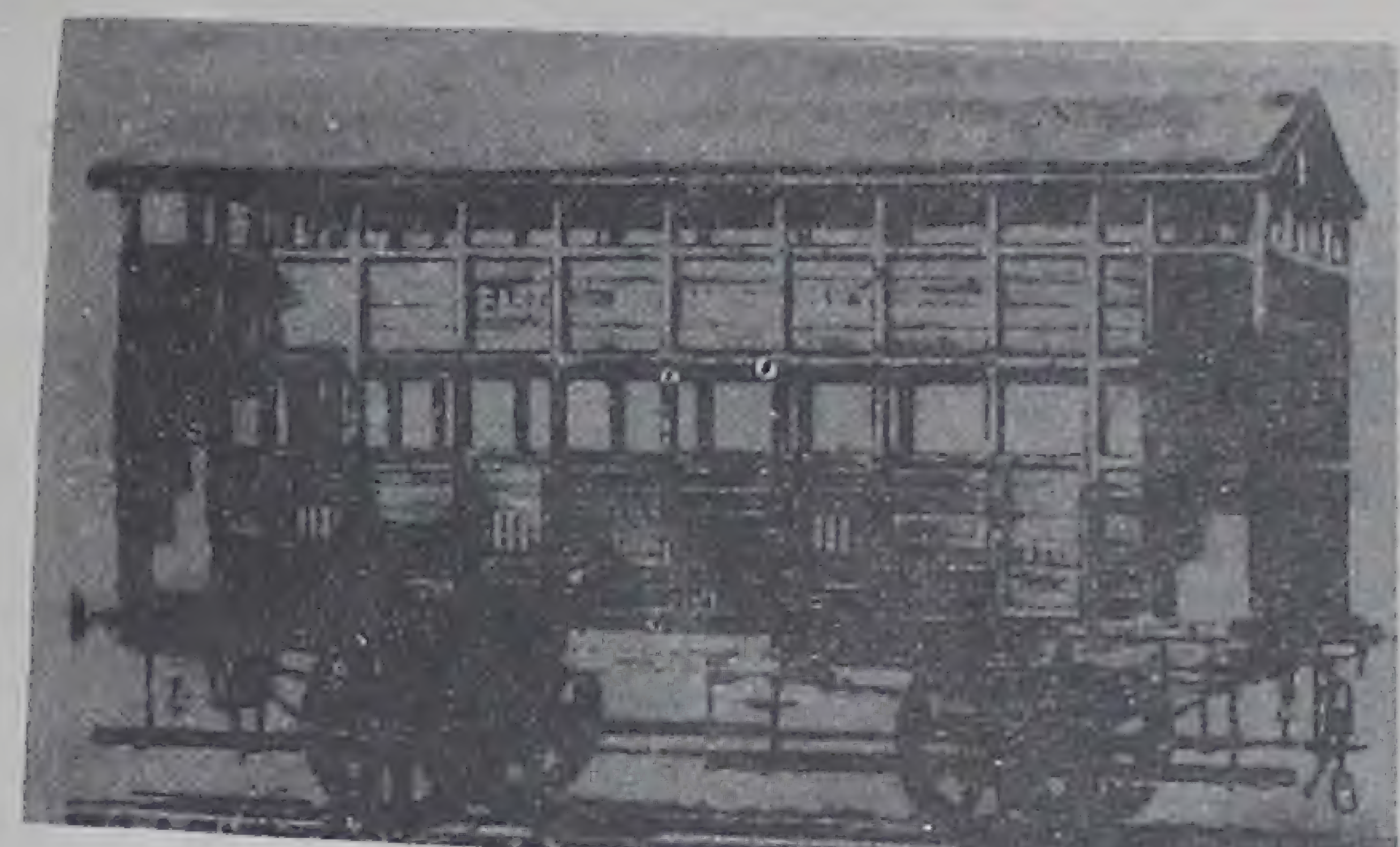
اوڑھتے اوڑھتے شال بھی میرے دل کی طرح چھلنی بن گئی۔ ستار بھی شکستہ حال ہوگیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم تینوں میں بڑھاپے کی دوڑ سی لگ گئی ہے اور آج میں نے قلم ہاتھ میں لیا ہے۔

عینک اور آنکھ کے درمیان کے فاصلے کے برابر میری آج کی اور بیتی ہوئی زندگی میں بھی فرق پڑ گیا ہے۔ اب سانسوں کے تار نہ جانے کب ٹوٹ جائیں۔ سوچتی ہوں کیوں نہ جیتے جی دُنیا کے لئے کچھ کہتی جاؤں۔

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)



ہماری ریلیں



پہلے پہل چلنے والی گاڑی

ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۶ اپریل ۱۸۵۳ء کو بمبئی اور تھانے کے درمیان ریل شروع کی گئی۔ یہ دوری صرف ۳۲ کلومیٹر تھی۔ مگر آج ہمارے ملک میں ۵۸۰۰۰ کلومیٹر لمبی ریلوے لائن ہے جو ایشیا میں سب سے لمبی ریلوے ہے۔ ہمارے ملک میں روزانہ دس ہزار گاڑیاں چلتی ہیں جو دس لاکھ کلومیٹر کی مسافت طے کرتی ہیں۔ جو زمین اور چاند کے درمیانی فاصلے سے لگ بھگ تین گنا ہے۔ اور دُنیا کے ارد گرد ۲۵ چکروں کے برابر ہے۔

اگرچہ آج ہماری ریلوے نے بہت ترقی کرلی ہے۔ لیکن جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندوستان آزاد ہوا تھا۔ اُس وقت ہماری ریلوے کی حالت بڑی غیر تسلی بخش تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں ریلوے سے خوب کام لیا گیا تھا اور مرمت و تبدیلی کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی۔ ہزاروں میل لائنوں کو اکھاڑ کر جنگ کے دور دراز علاقوں میں بچھا دیا گیا تھا۔

ہندوستان کی آزادی کے وقت ہمارے پاس ۴۰۵۲۴ میل لمبی ریلوے لائن تھی تقسیم ملک کی وجہ سے ۶۹۵۸ میل لمبی ریلوے لائن پاکستان کے حصے میں چلی گئی۔ اور ۳۳۵۶۶ میل ہمارے پاس رہ گئی۔

ایک تو جنگ نے ریلوے کو خستہ حال کر دیا تھا اس پر تقسیم کی کاری ضرب نے اُسے بُری طرح متاثر کیا تھا۔ دو ریلوے تنظیمیں نارتھ ویسٹرن اور بنگال آسام دو حصوں میں بٹ گئیں۔ ہزارہا ریلوے ملازمین کو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کرنا پڑا جس سے کئی طرح کے کارکنوں کی کمی واقع ہوگئی اور کچھ قسم کے کارکن فاضل ہوگئے۔ مثلاً ہندوستان میں ۱۸ فی صد انجن ڈرائیور کم ہو گئے۔ کچھ ریلوں میں یہ کمی ۴۵ فی صد تک پہنچ گئی



جدید آرام دہ اور خوبصورت ڈبہ

تقسیم کا اثر ریلوں کی آمد و رفت اور رفتار پر بھی زبردست پڑا۔ فسادات کی وجہ سے مال کو ادھر ادھر لے جانے میں بھی تعطل پیدا ہو گیا۔ نیز کچھ لائنوں پر غیر معمولی رش ہو گیا۔ اس کے علاوہ تقسیم اور فسادات کی وجہ سے ہجرت کرنے والے لاکھوں افراد کو ہندوستان اور پاکستان سرحد سے محفوظ جگہ پر پہنچانا پڑا۔ اور ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنی پڑیں۔ اندازہ ہے کہ صرف تین مہینے کے قلیل عرصہ میں لگ بھگ تیس لاکھ مہاجرین ریلوے کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے۔

آزادی کے بعد ریلوے کو بہتر بنانے کی طرف خصوصی توجہ کی گئی اور مختلف قسم کے اقدام کئے گئے۔ اُس وقت ریلوے میں ۴۲ طرح کے نظام رائج تھے۔ انھیں ختم کر کے ایک واحد نظام رائج کیا گیا۔ اب ریلوے کے نو زون بنا دیئے گئے ہیں اور ہر زون ایک جنرل منیجر کے ماتحت کر دیا گیا۔ علاوہ بریں پرانے اور ناقص ریلوے انجن، مسافر گاڑی کے ڈبوں، اور پٹڑیوں کی جگہ نئے انجن، ڈبے اور پٹڑیاں مہیا کی گئیں۔ ریلوے ورکشاپ میں جدید مشینیں اور پلانٹ نصب کئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ریلوے کو بہتر اور زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے گزشتہ تین پنج سالہ پلانوں کے دوران ریلوے پر تین کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا جو آزادی سے پیشتر خرچ کی جانے والی مجموعی رقم سے تین گنا ہے۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی ہمیں دوسری ضرورتوں کی طرح ریلوے کی ضروریات کے لئے غیر ملکیوں سے امداد لینی پڑی یعنی بہت جلد ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور اب ریلوے کی ضروریات کے معاملے میں ہم تقریباً خود کفیل ہیں۔

سب سے پہلے ہم نے مغربی بنگال میں چترنجن کے مقام پر ریلوے انجن بنانے کا کارخانہ قائم کیا جو آج ایشیا کے چند بڑے کارخانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کارخانے میں ۲ ہزار سے زائد بھاپ سے چلنے والے انجن اور ۷۰ سے زائد بجلی سے چلنے والے انجن بنائے جا چکے ہیں۔ ٹاٹا کمپنی جمشید پور میں چھوٹی لائن کے انجن بنائے جاتے ہیں، اور وارانسی میں ڈیزل سے چلنے والے انجن۔

کئی کارخانوں میں مسافر گاڑیوں کے ڈبے تیار کئے جا رہے ہیں۔



پیرامبور (مدراس) کی انٹگرل کوچ فیکٹری

ایسے ڈبے تیار کرنے والے کارخانوں میں مدراس کے نزدیک پیرامبور انٹگرل کوچ فیکٹری سب سے بڑی ہے۔ یہاں دو دو ڈبے روزانہ تیار کئے جاتے ہیں اور اب تک پانچ ہزار سے زائد ڈبے بنائے جا چکے ہیں۔

پہلے ہم مال گاڑی کے ویگن بھی باہر سے منگواتے تھے مگر آج حالت یہ ہے کہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد فاضل ویگن ہم غیر ممالک کو برآمد کر رہے ہیں۔ اس وقت ملک میں ہر سال ۴۰ ہزار سے زیادہ ویگن تیار کئے جا رہے ہیں۔

آج سے بیس برس پیشتر صرف ۳۰ لاکھ افراد روزانہ ریلوں میں سفر کرتے تھے۔ لیکن اب ۶۰ لاکھ افراد روزانہ اُن میں سفر کر رہے ہیں۔ مگر آج صرف ریلوں میں سفر کرنے والے مسافروں ہی میں اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ ان کے آرام اور سہولیت میں بھی کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ آزادی سے پیشتر تھرڈ کلاس میں سفر کرنا بے حد تکلیف دہ تھا۔

مگر آج ایسا نہیں ہے۔ پہلے تھرڈ کلاس میں پنکھے نہیں ہوتے تھے۔ مگر اب ان میں بھی پنکھے لگ گئے ہیں۔ روشنی کا انتظام بھی بہتر ہے سیٹیں آرام دہ ہیں۔

فرسٹ کلاس کی طرح تھرڈ کلاس میں سیٹ اور سونے والی



دہلی اور آگرہ کے درمیان چلنے والی تیز اور آرام دہ گاڑی تاج ایکسپریس کا اندرونی منظر

برتھ ریزرو کی جاتی ہے۔ طویل سفر کرنے والے مسافروں کو سلیپر کوچ میں معمولی کرایہ کے عوض سونے کی جگہ فراہم کی جاتی ہے۔ صرف تھرڈ کلاس مسافروں کے آرام کی خاطر طویل سفر کے لئے تیز رفتار جنتا گاڑی چلائی جاتی ہے

اب ریلوے اسٹیشن پر بہتر قسم کے ویٹنگ روم تعمیر کئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں تقریباً تمام اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر چھت ڈال دی گئی ہے بڑے اسٹیشنوں پر اپنا ٹرنک روم بنائے گئے ہیں جہاں مسافر معمولی کرایہ دے کر ٹھہر سکتے ہیں۔ سامان رکھنے کے لئے کلاک روم موجود ہیں۔

پہلے صرف بھاپ کے انجن استعمال ہوتے تھے مگر اب ڈیزل اور بجلی سے چلنے والے انجن بھی استعمال کئے جا رہے ہیں جن سے زیادہ وزنی گاڑیاں زیادہ تیز رفتاری سے کھینچی جا سکتی ہیں۔ اگر ٹرینوں کی رفتار تیز ہو تو ہم زیادہ گاڑیاں چلا سکتے ہیں۔

اس وقت مسافر گاڑیوں کی زیادہ سے زیادہ رفتار ۱۰۵ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ اور مال گاڑیوں کی ۷۲ کیلومیٹر فی گھنٹہ

اب ٹرنک لائنوں پر ان کی رفتار میں بتدریج اضافہ کرنے کا پروگرام ہے۔

ریلوے میں اب بہتر قسم کے ویگن استعمال ہونے لگے ہیں جو پہلے ویگنوں کے مقابلے میں زیادہ مال لاد سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاص خاص سامان کے لئے خاص خاص وضع کے ویگن بھی بنائے جاتے ہیں۔ پتھر کے ٹکڑے اور کچا لوہا ڈھونے کے لئے ایک خاص قسم کا ویگن بنایا جاتا ہے جس کے نیچے کا فرش کھل سکتا ہے مویشیوں کو لے جانے کے لئے سواری ویگن فراہم کئے جاتے ہیں۔ دودھ، مچھلی فروٹ ایسی خراب ہو جانے والی اشیاء کے لئے ٹھنڈے ویگن تیار کئے جاتے ہیں۔

ریلوے نے ملک میں زبردست صنعتی انقلاب لانے میں غیر معمولی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اگر ریلوے کا امداد و تعاون حاصل نہ ہوتا تو ہماری صنعتیں اس قدر سرعت سے ترقی نہ کرتیں۔

ریلوے نے صنعتوں کی مختلف طریقوں سے امداد کی ہے جہاں نئے کارخانے کھل رہے ہیں وہاں ریلوں کے ذریعے مشینیں اور تعمیراتی ساز و سامان پہنچایا اور جب یہ کارخانے بن گئے تو ان کے لئے کھیتوں کانوں اور بازاروں سے کچا مال فراہم کیا۔ اس کے بعد جب مال تیار



مسافروں کو مناسب قیمت پر کھانے پینے کی چیزیں فراہم کی جاتی ہیں۔

ہوگیا تو ملک کے گوشے گوشے میں خریداروں تک پہنچایا۔

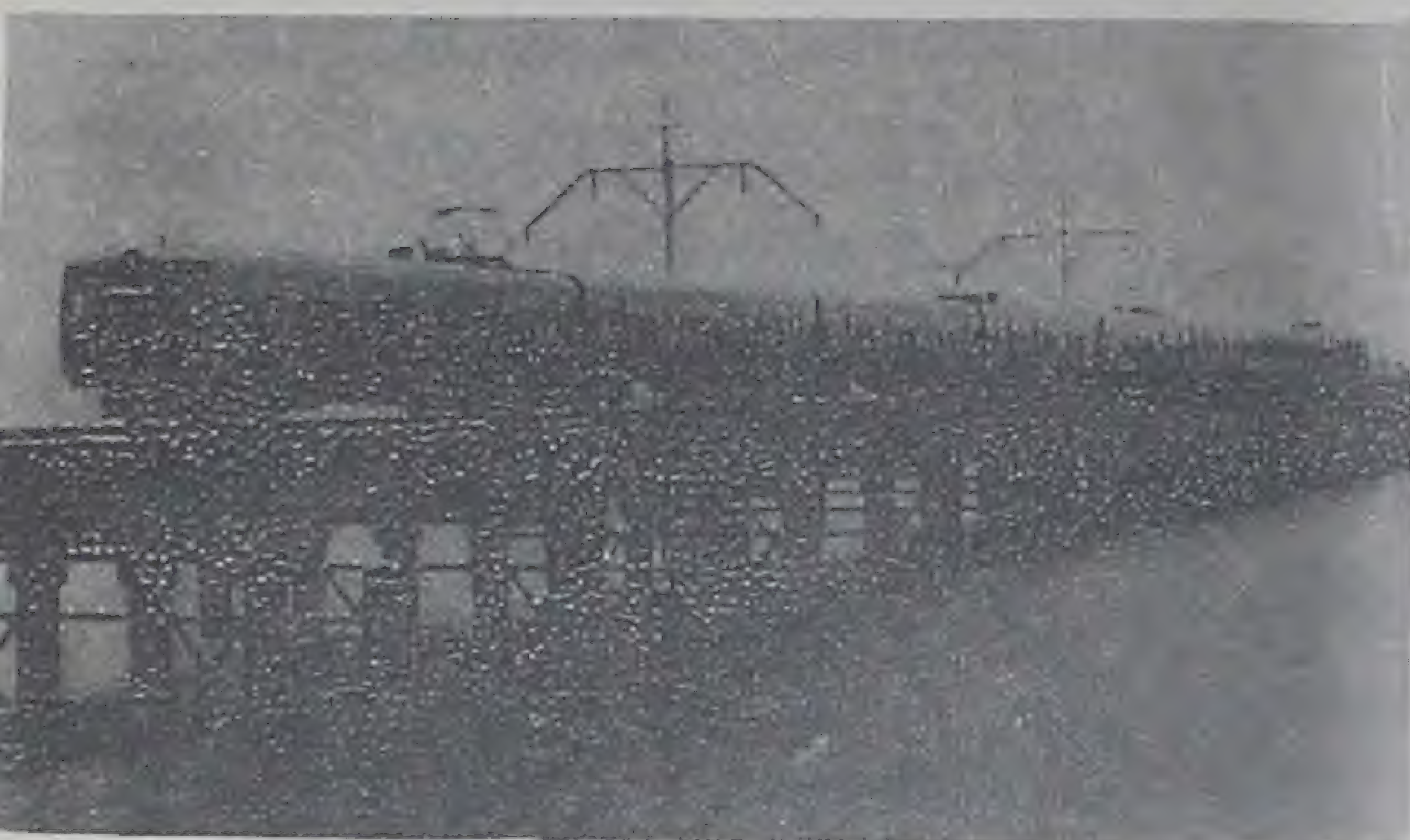
پہلے کے مقابلے میں اب ریلوں کے ذریعے ہر سال بیس کروڑ ٹن زیادہ سامان ڈھویا جارہا ہے۔ پندرہ سال پیشتر ریلوں کے ذریعے جتنا مال ڈھویا جاتا تھا یہ اضافہ ہی اس سے دگنا ہے۔ ملک میں ہزارہا گاڑیاں صرف سامان ڈھونے میں لگی ہوئی ہیں۔ اور ملک کے مال کا ۸۰ فیصد حصہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ریلوں کے ذریعے ہی پہنچایا جاتا ہے۔

ریلوے صرف صنعتی انقلاب میں مددگار ثابت نہیں بلکہ اس نے مختلف طریقوں سے کسانوں کی بھی مدد کی ہے۔ ریلوے رعائتی شرحوں پر کھادیں اور کچا مال ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ کیمیادی کھاد کے کارخانوں سے ہر روز ۱۶۰۰ ویگن کھاد مختلف مقامات پر پہنچائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کم پیداوار علاقوں میں زیادہ پیداوار والے علاقوں سے اناج پہنچایا جاتا ہے نیز غیر ممالک سے آنے والا غلہ بندرگاہوں میں اترنے کے بعد ریلوں کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں میں بھیجا جاتا ہے۔ ۷۴،۵ ویگنوں میں گنا چینی ملوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کپاس، سبزیاں، بانس اور دیگر اشیا بھی ریلوے کے ذریعے ہی ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پہنچائی جاتی ہیں۔



مدراس کا ریلوے اسٹیشن

ریلوے ملکی دفاع میں بھی بہت اہم حصہ لیتی ہے۔ اگر ریلیں نہ ہوتیں تو ہمیں ملک کے دفاع میں زیادہ دقت پیش آتی۔ آج ریلوں کے ذریعے فوجی ٹینک، جیپ گاڑیاں، ٹرک، توپیں، گولہ بارود اور فوجی جوان سرحدوں اور فوجی مقامات تک پہنچائے جاتے ہیں۔ فوجی اسلحات، اور آتش گیر مادے ڈھونے کے لیے خاص طور پر محفوظ ویگن تیار کرائے گئے ہیں۔



بجلی سے چلنے والی ایک گاڑی

آج ہم اپنی ریلوں پر جتنا فخر کریں کم ہے۔ آزادی کے بعد اس نے بڑی سرعت سے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ اور آج یہ لمبائی کے لحاظ سے دنیا کے دوسرے نمبر پر ہے اور ملک کا سب سے بڑا قومی اثاثہ ہے۔

اس کی ملکیت ۳۲۵ کروڑ روپے ۱۳ر۵ لاکھ آدمی اس میں ملازم ہیں ۱۲۰۰۰ ہزار بھاپ کے انجن ۳۲۸۰۰ مسافر گاڑی کے ڈبے ۳۷۰۰۰۰ مال گاڑی کے ویگن اس کی ملکیت ہیں۔ اس کے سات ہزار ریلوے اسٹیشنوں کے درمیان دس ہزار گاڑیاں روزانہ چلتی ہیں اور تقریباً ۶۰ لاکھ مسافروں اور ۵ر۵ لاکھ ٹن مال کو منزل مقصود تک پہنچاتی ہیں اس کی سالانہ آمدنی ۵۰،۷ کروڑ روپے ہے۔

ریلوے ہماری قومی دولت ہے، اور اس کی حفاظت ہمارا قومی فریضہ ہے۔



فرحت قمر

حُسن

ماضی — حال — مستقبل

حُسن نے زندگی میں غم کی فراوانی سے پیدا ہونے والی اذیت کو قابل برداشت بنائے رکھا ہے۔ اس عالم رنج و محن میں جہاں ناگواریاں اور ناخوشگواریاں ہیں وہیں رنگ و بو کی گلکاریاں بھی ہیں۔ فطرت کے حسن کے جلوے سمیٹنے کے لئے مخصوص آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ انسانی حسن ہر آنکھ کو بھاتا ہے۔ شاعر کی آنکھ ہر شئے کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔ وہ جب بادلوں کو دیکھتا ہے تو ان کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ شفق کو دیکھتا ہے تو اس کا خون کر دیتا ہے۔ پھول کی پنکھڑی کو اس باریک بینی سے دیکھتا ہے کہ خورد بین شرما جائے۔ لیکن حسن انسانی بلکہ یوں کہئے کہ حسنِ نسوانی کے معاملہ میں شاعر صرف سطح تک ہی اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اگر وہ اس معاملہ کو ذرا گہرائی سے دیکھتا تو شاید انگریزی کے مقولہ کو صحیح پاتا کہ حسن صرف جلد تک محدود ہوتا ہے — کھال کے نیچے خوف انگیز گوشت و خون اس نے دیکھے نہیں۔ پہلے زمانہ میں آج کی طرح آپریشن ہوتے نہیں تھے اور آج کے شاعر نازک مزاج، رقیق القلب ہونے کی وجہ سے اُن کو دیکھتے نہیں ہیں ورنہ اُن کو اس طریقے سے بھی حسن کی ماہیت کا پتہ لگ جاتا۔ غرضکہ برنبائے وجوہ متفرق شاعر جس نے حسن کے گیت گائے ہیں اور حسن کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے ڈھول بجائے ہیں حسن کو صرف سطحی طور پر دیکھ پایا ہے اور ظاہر ہے جو مشاہدہ صحیح نہ ہوگا وہ حقیقت سے دور اور نامکمل ہوگا۔

شاید شاعر نے کسی حسین کو چھو کر نہیں دیکھا ورنہ اس کی یہ جراٴت نہ ہوتی۔ کہ کہدیتا کہ اس کا محبوب کمر ہی نہیں رکھتا۔ ایک دوسرے صاحب نزاکت حسن کے بیان میں دروغ گوئی کی حدیں پار کر گئے ہیں۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ اپنے محبوب کی تصویر چوم رہے ہیں اور جب اس خواب کو بشارت سمجھ کر وہ محبوب کے گھر پہنچے تو دیکھا اس کے عارض نیلے پڑ گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ خواب میں تصویر کا بوسہ لیے جانے کا نتیجہ تھا۔ نہ معلوم وہ حسین چلتے کیسے ہوں گے جن کے کمر ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور چولھے کے سامنے کیسے بیٹھتے ہوں گے جن کے عارض خواب کی تاثیر سے ہی نیلے پڑ جاتے تھے۔ لیکن شاعر کا محبوب تو ان عام انسانی افعال سے مبرا ہوتا تھا۔ وہ تو شاعر کی آنکھ میں بستا تھا اور ایسی جگہ رہنے کی عادت پڑ جانے کے بعد دل کی گہرائیوں میں رہنے لگتا۔ بعض شاعروں کے محبوب تو اتنے لطیف تھے کہ روح میں رہتے تھے۔ نزاکت اور لطافت کے ان پتلوں کو عام خوراک سے کیا کام۔ وہ جب تک باہر رہتے، پھول سونگھ کر جیتے اور جب دل میں سما جاتے تو ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ان کی غذا بھی بدل جاتی۔ شاعر خود بھی خون جگر پیتا تھا اور محبوب کو بھی پلاتا تھا۔ دل میں رہ کر خون کے علاوہ اور کونسی غذا آسانی سے مل سکتی تھی۔ اور خون کوئی معمولی غذا بھی تو نہیں ہوتا۔ غذا کا جوہر کہیے خون کے اس مسلسل استعمال ہی کی وجہ تھی کہ جب شاعر کا دل چیرا جاتا تو ایک قطرۂ خون نکلتا تھا۔

ماضی کے حسین بڑے ظالم ہوتے تھے۔ عاشقوں کو اپنے دربانوں سے پٹوانا، اُن کو رُسوا کرنا، اُن کا دنیا میں رہنا دوبھر کر دینا تو معمولی باتیں تھیں۔ تیر چلا کر سینے چھلنی کرنا اُن کی ہابی تھا۔ اور جب زیادہ ظلم کے موڈ

میں ہوتے تھے تو باقاعدہ خنجر لے کر جان لینے پر آمادہ ہو جاتے تھے حسینوں کے گلی کوچوں میں قتل گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ جتنا زیادہ کوئی حسین ہوتا اتنی ہی بڑی قتل گاہ ہوتی۔ عاشق پا بہ زنجیر کشاں کشاں قتل گاہوں تک لائے جاتے اور قتل کیے جاتے۔ غالب مرحوم کے مستند بیان کے مطابق دلّی جیسے بڑے شہروں میں قتلِ عشاق کا سلسلہ کچھ اتنا زیادہ تھا کہ مُردوں کے دل ڈھیر کے ڈھیر لگا کر بیچے جاتے تھے۔ اگر کسی کو دل کی ضرورت ہوتی تو پریشانی کی بات کیا تھی، جب چاہو اٹھو اور بازار سے دل لے آؤ۔ حسین اتنے سنگدل ہوتے کہ بسمل کے ٹھوکریں لگاتے اور جب وہ تڑپتا تو جی بھر کے مسکراتے۔ ٹھوکر لگانے کی عادت تو حسینوں کو کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ عاشق کے مرنے کے بعد بھی اس کی تربت کے پاس سے گزرتے تو ایک ٹھوکر ضرور لگاتے جاتے۔ پرانے عاشقوں نے کوئی یونین بنا کر حسن کی ان زیادتیوں کے خلاف تحریک نہیں چلائی۔ یہ تعجب کی بات ہے لیکن بغور دیکھنے سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ دراصل عشاق خود ہی رسوا ہونا چاہتے تھے۔ سِسک سِسک کر جینا اور تڑپ تڑپ کر مرنا چاہتے تھے۔ اُن کی یہ سادہ لوحی کہ جفا کو وفا سمجھتے تھے اور حسین اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اپنا بازارِ ستم گرم رکھتے تھے۔

پرانے حسینوں کی عادتوں میں تضاد بہت پایا جاتا تھا۔ ایک طرف ان میں نزاکت اتنی کہ پھول کا بار نہ اٹھا سکیں لیکن دوسری طرف سنگدلی اتنی کہ ہزاروں کو قتل کر دیں۔ اسی طرح ایک طرف اتنے پردہ نشین کہ کوئی ان کی آواز بھی نہ سن سکے اور دوسری طرف وہ باقاعدہ محفلوں میں آتے اور غیروں سے خود چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ گھر میں رہتے تو پردوں اور چلمنوں میں مستور۔ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے جھجکتے۔ کھڑکی سے زیادہ دیر جھانکنا ان کی عادت نہ تھی۔ ہاں لبِ بام کافی دیر تک ٹھہر جاتے تھے، اکثر بے تکلّف باغ کی سیر کو بھی جاتے تھے ایسے چلتے کہ کڑی کمان کے تیر کا گمان ہوتا اور ایسے جلوہ دکھاتے کہ بجلی کی چمک کا دھوکہ ہوتا۔ درونِ خانہ کی بھیگی بلّی بزم میں شیرنی بن جاتی۔ بزم کے سلسلہ میں ہم کو آج تک اُن کی یہ ادا سمجھ میں آئی نہ بھائی کہ آخر وہ سچے عاشقوں کی اتنی بے قدری کیوں کرتے تھے کہ اُن کو محفل سے اٹھوا دیتے، غیروں کو منہ لگاتے۔ ہرجائی پن اُن کی فطرتِ ثانیہ تھا لیکن معتبر ذرائع سے پتہ لگا ہے کہ یہ ان کی ڈپلومیسی تھی۔ عاشقِ صادق کو وہ تخلیہ میں بُلاتے تھے، اور جھوٹوں کو محفل میں دل لگی کرکے باہر سے باہر ہی ٹرخا دیتے تھے۔ دُنیا سمجھتی کہ فلاں بن فلاں سے اُن کا کوئی تعلق ہی نہیں لیکن درپردہ عنایت دراصل ان پر ہی کی جاتی تھی۔ دراصل ان کی کچھ عادت ہی ایسی تھی جب وہ 'ہاں' کہنا چاہتے تو 'نہ' کہتے۔ جب اقرار کرنے کا ارادہ ہوتا تو انکار کر دیتے۔ ظاہر و باطن ان کا ایک نہ تھا۔ ان کی عادتوں میں حد درجہ تضاد تھا۔ کبھی شرم کے مارے آنکھ نہ اُٹھائیں، کبھی اچھے بھلے کام میں لگے عاشق کو ہاتھ میں چوٹی لے کر سانپ سانپ کہہ کر ڈرانے کی شوخی پر اُتر آئیں۔ غرضکہ ان کی کسی بات پر، کسی کیفیت پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا

زمانے کی دستبرد سے حسینوں کی وہ قدیم نسلیں معدوم ہو گئیں۔ اب کہاں وہ ہونٹ جو گلاب کی پنکھڑیوں سے ہوں، اب کہاں وہ رنگ جو صبا کے چھو جانے سے میلا ہو جائے، اور کہاں وہ آواز جسکو سُنکر شعلہ لپکنے کا گمان ہو۔ عشق بھی بدل گیا اور حُسن بھی۔ آج کے حسن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ گھروں میں نہ ہو کر سڑکوں، بازاروں، ہوٹلوں اور پارکوں میں پایا جاتا ہے۔ اب حسن کو حجاب کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی نمائش کا شوق ہے۔ نمائش کا یہی شوق ایسے لباس کی ایجاد کا باعث بنا ہے جسکو پہننے کے بعد عریانی اور بڑھ جاتی ہے۔ سامانِ آرائش اب ایسا بن چکا ہے جو حسن پر حسن کا ایک اور نقاب چڑھا دیتا ہے، جب یہ نقاب اترتا ہے تو نقشہ ہی بدل جاتا ہے اگر آج کا وہ عاشق جس نے محبوب کو سدا دفتر ہی میں دیکھا ہے بھولے سے علی الصباح اس کی صورت دیکھ لے تو شاید پہچان نہ سکے۔ اب حسن کی بیچارگی بہت حد تک اسی سامانِ آرائش کی وجہ سے ختم ہو چکی ہے اب اگر غیر سے ملنے کی بات کھل جاتی ہے تو رنگِ رخ کے اُڑنے کو دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رکھنا کوئی بڑی بات نہیں۔ روژ کی ایک مزید تہہ رنگِ رُخ کو قائم رکھتی ہے، کسی سے آنکھ چرانی ہو تو چشمہ سے یہ مقصد بآسانی پورا ہو جاتا ہے کسی کے طویل انتظار میں بال سفید ہو گئے ہوں تو علاج حاضر ہے اور غمِ دوراں سے بال بھی اُڑ گئے ہوں تو مصنوعی بال موجود ہیں۔ بال بنانے کے طریقے دائرہ انسانی سے نکل کر گھوڑے کی دُم، چڑیا کے گھونسلے اور سوکھی گھاس کے ڈھیر تک پہنچ چکے ہیں۔ زلفوں کی طوالت شبِ ہجراں کی طرح طویل نہیں رہی لیکن ان کی آرائش کا سلسلہ بہت طویل ہو گیا ہے۔ طرزِ آرائش کی پیچیدگی اتنی بڑھ چکی ہے کہ اگر نئے سنورے سر پر کوئی دستِ شفقت پھیر دے تو ہاتھ کو

زخمی کر بیٹھے۔ پہلے زلفیں عاشق کا دل پھنسانے کے لئے جال کا کام کرتی تھیں اب خود جال میں جکڑی گئیں اور جال کے ساتھ کیل کانٹے بھی اتنے ہو گئے کہ زلفِ خوباں کے خم بہت حد تک نکل گئے ہیں۔

تلوار کا استعمال متروک ہو جانے پر اب حسن نے بندوق سنبھال لی۔ ہاں اب اتنی بے رحمی نہیں رہی کہ خواہ مخواہ عاشقوں کا خون کرتا پھرے۔ یا پھر شاید قانون کا ڈر ہو۔ ماضی کی تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہوا جس سے پتہ چلتا کہ عشق کے قتلِ عام پر حسن کو سزا ہوئی ہو۔ لیکن اب قانون اس معاملے میں سخت ہو چکا ہے۔ جب حالات بدل جاتے ہیں تو لوگوں کو مجبوراً اپنی عادتیں بدلنی پڑتی ہیں۔ حسن نے بھی گلا کاٹنے کا کام چھوڑ کر جیب کاٹنے کا کام اختیار کر لیا ہے۔ ہوٹل کے بل، سینما کے ٹکٹ، بس کا کرایہ اکثر عاشق کی جیب پر بار ہوتا ہے۔ یہ جیب کاٹنے کی بات استعارۃً نہ ہو تو اکثر حسین حقیقتاً جیب کاٹتے ہوئے بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ویسے اب عشق اس معاملہ میں چوکنا ہو چکا ہے۔ عشق چاہے محبوب کی باہوں میں نیم خوابیدہ ہو لیکن اپنی جیب سے ہوشیار رہتا ہے۔ استعارۃً "جیب کٹنے" کا معاملہ بھی کچھ بدل چلا ہے، اب عاشقوں کی ایک نسل ایسی پیدا ہو چکی ہے جو کھانے پینے اور تفریح کرنے کا تمام خرچ حسن کے بٹوے سے نکالتی ہے اور یہ صورت حال حسن کے لئے بعض صورتوں میں ناگوار ہوتی ہے بعض میں خوشگوار۔ بہر حال عشق کی یہ بدلتی ہوئی عادت حسن کے لئے خطرناک ہے۔

آج کے حسینوں کی عام خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن کے ہاتھ میں ایک پرس ہوتا ہے جس میں رُومال، روپیہ اور روئی (ردّ فروخت جانے والیوں کے کیس میں) کے علاوہ لپ اسٹک اور پاؤڈر بھی ہوتا ہے اب وہ لب تو رہے نہیں کہ لعلِ بدخشاں کو شرمائیں۔ کھانے پینے سے جن کا رنگ پھیکا نہ پڑے۔ اب تو پانی ہونٹوں کا رنگ دھو دیتا ہے۔ کھانا اُن کی رنگت بدل دیتا ہے اور آج کے حسین چونکہ کھانا اور پانی دونوں استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ہونٹوں کی سُرخی استوار کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے حسن کو رونے کی عادت عام ہے۔ غصہ میں بھی، پیار میں بھی، اقرار میں بھی انکار میں بھی — آنسو پونچھنے کے لئے رومال کافی ہوتا ہے۔ لیکن نمکین پانی سے رخساروں پر چڑھا ہوا رنگ اتر جاتا ہے۔ جس کو پاؤڈر سے ٹھیک کرنا پڑتا ہے۔ لپ اسٹک اور آرائش کے لئے کچھ بادوق قسم کے حسین پرس میں شیشہ رکھے ہوئے بھی پائے جاتے ہیں۔

حسن کے مستقبل کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ حالات کی رفتار کو دیکھ کر کچھ اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں۔ ماضی میں شاعری کی دنیا میں حسن چاہے مغرور اور ظالم رہا ہو لیکن حقیقت میں محکوم رہا ہے۔ آج حسن نے اس محکومی کے خلاف قدم اٹھایا ہے اور مستقبل میں چاہے حُسن شاعری کی دنیا میں محکوم رہے لیکن حقیقت میں حاکم بن جائے گا۔ عشق بچوں کو سنبھالنے کھانا بنانے اور گھر کی صفائی کا کام سنبھالے گا اور اس سے جذبۂ عشق میں کمی واقع ہوتی جائے گی۔ عاشق نازک ہوتے جائیں گے اور محبوب طاقتور کوئی بھی حسینہ نگاہوں کا جادو ختم ہونے پر آنکھ، زلفوں کی گرفت کمزور ہونے پر بال اور خدانخواستہ ناک کٹ جانے پر ناک بدلوا لیا کرے گی بلکہ اتنا ہی نہیں عشق سے پچھلے ستم کا بدلہ لینے کے لئے حُسن ہارمون کا انجکشن لے کر داڑھی مونچھ اگا لیا کریں گے۔ اور ماضی کا مرد جو معشوق کے سبزہ خط سے زندگی پاتا تھا۔ بے موت مر جایا کرے گا۔ اور بوقت ضرورت مکمل انتقام لینے کے لئے حسینائیں حسین مرد بھی بن سکیں گے۔

بقیہ: وصیت

میں نے لکھنا شروع کیا — (۱) اگر میں مر جاؤں تو یہ ستار اس لڑکی کو دینا جو پیدائش سے ہی یتیم ہو اور قد میں کچھ لمبی ہو — مجھ سی بدقسمت ہو۔"

(۲) — "ماموں کے کپڑے، الماری، کرسی، میز وغیرہ اس نوکر کو دینا جس نے دو وقت کی روٹی اور چائے بنانے کے بدلے اپنی پوری زندگی میرے یہاں صرف کر دی!

(۳) — "میری زندگی بھر کی کمائی اس سوتیلے بھائی کو پہنچا دینا جس نے مجھے دیدی کہہ کر پکارا۔

(۴) — اور یہ شال . . . . . میرے مرنے پر کفن کی طرح اڑھا دینا تاکہ میرے پیچھے کوئی یہ نہ کہے — میرا کوئی نہ تھا۔ اُسے در ملنے مجھے اپنے ہاتھوں سے اڑھایا تھا . . . . . سچ انھوں نے خود اڑھایا تھا۔ میرا بھی کوئی اپنا تھا جو جیتے جی کفن اڑھا کر چلا گیا۔

(ہندی سے ترجمہ)

مشتاق احمد استھانوی

شیخ امداد علی بحر لکھنوی کا ایک

قیمتی دیوان

میں شیخ امداد علی بحر لکھنوی تلمیذ ناسخ لکھنوی کے نایاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی تلاش و جستجو میں مصروف ہوں۔ حال میں کتاب خانہ خدا بخش پٹنہ میں مجھے بحر لکھنوی کے ایسے کلام کا ایک خاصا بڑا حصہ دستیاب ہوا ہے جو یا تو زیور طبع سے کبھی آراستہ نہیں ہوا یا مطبوعہ دیوان میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے اب تک پردہ خفا میں ہے۔ بحر لکھنوی کے اس نوع کے کلام کا غیر مطبوعہ حصہ غزلیات بحر لکھنوی کے دیوان "ریاض البحر" کی اشاعت کے مدتوں بعد نہایت کم یاب غیر مطبوعہ ماخذ کی چھان بین سے دستیاب ہوا ہے۔ یہ حصہ صرف ایک صنف شاعری یعنی غزل پر مشتمل ہے اور بحر لکھنوی کے مطالعہ کے سلسلہ میں اہمیت رکھتا ہے اس قلمی دیوان کی دریافت سے نہ صرف یہ کہ بحر لکھنوی کا کچھ اور غیر مطبوعہ کلام ناظرین کے سامنے آجاتا ہے۔ بلکہ اس سے بحر لکھنوی کے قلمی دیوان کے بارے میں کچھ کام کی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔ بحر لکھنوی کے متعلق اب تک اصحاب ذوق اور اہل تحقیق کو جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ بحر لکھنوی کا ایک دیوان مسمیٰ "ریاض البحر" شائع ہو چکا ہے۔ یہ دیوان ۱۲۸۵ھ میں طبع ہوا ہے شیخ امداد علی بحر ناسخ لکھنوی کے نہایت ممتاز تلامذہ میں ہیں۔ موصوف کے دیوان "ریاض البحر" کے سر ورق میں نام کے مقابل ۱۲۵۲ھ لکھا ہے جس کے معنی یہ کہ نام تاریخی ہے۔ اس میں نام مطبع کے ساتھ ۱۲۸۲ھ مرقوم ہے۔ لیکن جیسا کہ امیر اللہ تسلیم کی تقریظ سے پتہ ملتا ہے۔ ۱۲۸۵ھ کی ۲۹ شعبان کو یہ دیوان تمام ہوا تھا۔ بحر کا قطعہ تاریخ صفحہ ۲۸۳ بھی اسی سنہ پر مشعر ہے یہ مطبع مصطفائی لکھنؤ میں طبع ہوا تھا

صفحہ ۲ میں جس سے دیوان کا آغاز ہوتا ہے۔ ستائیس اشعار ہیں۔ دیوان کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بھولو نہ وظیفہ سحر و شام خدا کا۔
ہر وقت کرو ورد زباں نام خدا کا

غزلیں صفحہ ۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۸ میں تمام ہوتی ہے ان کے اشعار کی مجموعی تعداد سات ہزار چار سو بہتر ہے اور بیت آخر یہ ہے۔ ؎

آبرو ریزی ہوئی اے بحر ایسی بہر رزق
صورت گرداب روٹی ہاتھ میں پانی ہوئی۔

غزلوں کے بعد آخر میں تینتیس ۳۳ رباعیاں ہیں۔ جو صفحہ دو سو بیاسی ۲۸۲ میں تمام ہوتی ہیں۔ پہلی رباعی یہ ہے ؎

احباب سے کوئی ہم کو پیارا نہ ہوا
رنج ان کا کسی وقت گوارا نہ ہوا
افسوس ہے دست و پائے زور و زر ہے
ہم سب کے ہوئے کوئی ہمارا نہ ہوا

اور آخری رباعی یہ ہے ؎

قلت بھی جو ہو شکر بہ کثرت کیجئے
ہرگز کس و ناکس کی نہ منت کیجئے
گھر بیٹھے اگرچہ ایک دانہ بھی ملے
اے بحر صدف وار قناعت کیجئے

"ریاض البحر" میں سات ہزار چھ سو اشعار ہیں۔ صفحہ ۲۸۲ میں منشی امیر اللہ

تسلیم شاگرد نسیم دہلوی کی تقریظ ہے۔

اس کے بعد اسی صفحہ سے قطعاتِ تاریخ طبع شروع ہوتے ہیں۔

چودہ قطعات تاریخ طبع دیوان ہیں، ان میں سے گیارہ قطعات طبع فارسی میں ہیں اور تین قطعات اردو میں ہیں۔ مصنف کا قطعہ یہ ہے ؎

جامع اس دفتر کے ہیں سید محمد خاں رندؔ
اس جلیل القدر کا یہ بحرؔ پر احسان ہے
نام تاریخی ریاض البحر ہے دیوان کا
نام پر اس کے گلستاں بوستاں قربان ہے
اب جو بارہ سو بچاسی سن میں یہ چھاپا گیا
اس کی بھی تاریخ کچھ مشکل نہیں آسان ہے
بحرؔ کی طبع رواں سے ہے یہ سال انطباع
شعر ہیں نایاب در کانِ گہر دیوان ہے

بحرؔ کے قطعات صفحہ ۲۸۴ میں تمام ہوتے ہیں۔ قطعات کے بعد کتاب کے آخر میں بحرؔ کی لکھی ہوئی نثر کی چند سطریں بھی ہیں۔ قطعہ مصنف جو اس بات پر مشعر ہے کہ رندؔ مرتب دیوان تھے خاص طور پر توجہ طلب اور قابل غور ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نسخہ میں صرف ۱۲۵۲ھ تک کا کلام ہے یا اس کے بعد کا بھی۔ قرینہ یہ ہے کہ بعد کا بھی کلام ہے۔

کتاب خانہ، خدا بخش پٹنہ میں بحرؔ لکھنوی کا ایک قلمی دیوان بھی ہے جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ کاتب کا نام اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا۔ غالباً جمیل الرحمٰن ہے۔ زمانہ کتابت ۱۸۸۰ء مرقوم ہے جس کے ساتھ ۱۹ محرم ۱۲۹۷ھ ملتا ہے۔ دیوان ناقص الاول ہے۔ اس میں کسی صفحہ پر نمبر نہیں دیا ہوا ہے اور جا بجا دو چار اوراق درمیان سے بھی غائب ہیں۔ یہ دیوان ایک سو چالیس ورق اور ایک صفحہ کا ہے۔ دیوان کے پہلے صفحے میں مطلع نہیں ہے۔ نسخہ ہذا کا آغاز شعر ذیل سے ہوتا ہے ؎

جنوں یہ حال پہونچا ہے تری گستاخ دستی سے
کہیں دامن کی دھجی ہے کہیں ٹکڑا گریباں کا

اس دیوان کی پہلی غزل کا مقطع یہ ہے ؎

تم اپنی جان کے دشمن ہوئے کیوں ہم نہ کہتے تھے
کرو جلدی علاج اے بحرؔ اپنے درد پنہاں کا

اور دیوان کا آخری شعر یہ ہے ؎

ضعیف ہوگئی کیا بحرؔ چشم دریا بار
تم آج ایک بھی آنسو بہا نہیں سکتے

قلمی دیوان میں چار ہزار پانچ سو تیرہ اشعار ہیں۔ بحرؔ لکھنوی کا جو کلام قلمی دیوان میں ہے وہ نہ تو مطبوعہ دیوان "ریاض البحر" میں ہے اور نہ امیر مینائی کی مشہور تالیف بحرؔ لکھنوی کے کلام کے انتخاب "انتخاب یادگار" میں ہے۔ قلمی دیوان کا کلام مطبوعہ دیوان "ریاض البحر" اور "انتخاب یادگار" دونوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔

اب آخر میں نمونہ کے طور پر قلمی دیوان کے کچھ اشعار بطور انتخاب پیش کر رہا ہوں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔

میرے اشعار سے پھولوں کی مہک آتی ہے
میرا دیوان ہے گلدستہ گلستاں ہوں میں

آگیا سبزہ اب اس کے لب شیریں پہ بحرؔ!
ہوگئی تلخ پھپھوندی سے مٹھائی تیری

بحرؔ کی ہے یہ دعا جیتے رہو یار اسیرؔ
یادگار اگلوں کی باقی ہیں فقط اب ہم تم

کہاں سے لائی ہے قسمت کہاں نہیں معلوم
یہاں سے جائے گی اب کہاں نہیں معلوم

عطر گالوں کا پسینہ ہو تو تعجب کیا ہے
مشک و عنبر کی ہے بو باس تمہارے تل میں

اللہ رے نازکی کمر کی
بل کھا گئی میں نے جو نظر کی

بگڑی زلفیں وہ کیوں بناتے ہیں
کیوں بلا میرے سر پہ لاتے ہیں

اس کی رفتار سے نسیم بہار
نقش پا طرفہ گل کھلاتے ہیں

غضب ہے محبوب کی دورنگی کبھی ہے سختی کبھی ہے نرمی
ہمارے حق میں عنایت اس کی کبھی جراحت کبھی مرہم

جرائم کا گوشوارہ

برس	قابل دست اندازی پولیس جرائم کی تعداد	آبادی کا اندازہ (دس لاکھ)	فی لاکھ آبادی کے پیچھے جرائم کی شرح
۱۹۶۱	۶۲۶۶۵۱	۴۳۷٫۷	۱۴۳٫۰
۱۹۶۲	۶۷۴۶۶۶	۴۵۳٫۱	۱۴۸٫۹
۱۹۶۳	۶۵۸۸۳۰	۴۵۹٫۱	۱۴۳٫۶
۱۹۶۴	۷۵۹۰۱۳	۴۷۵٫۲	۱۵۹٫۶
۱۹۶۵	۷۵۲۶۱۵	۴۸۶٫۹	۱۵۴٫۴
۱۹۶۶	۷۹۴۷۳۳	۴۹۸٫۷	۱۵۹٫۴

خیال ہے کہ امریکہ میں بری ہونے والے مجرموں کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جن کے معاملوں میں سیاسی اثر و رسوخ استعمال کیا جاتا ہے یا جن میں سیاسی مداخلت کی جاتی ہے۔ ہندوستان بھی اس بدعت سے خالی نہیں ہے مگر عدالتوں کے اوپر اس کا اثر بہت کم ہے۔

پولیس کی ذمہ داری

جرائم میں اضافے کے بعض پہلو ایسے ہیں جن پر پولیس موثر کنٹرول نہیں رکھ سکتی۔ سماج کے ہر بشر کو ایسی مجرمانہ سرگرمیوں کے بارے میں محتاط رہ کر ان کے بارے میں پولیس کو اطلاع دینی چاہئے۔ مثال کے طور پر پچھلے پانچ برسوں میں جرائم کی وارداتوں میں اضافے کی سب سے زیادہ فیصد جعلسازی کی وارداتوں میں ہوئی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ایسی ۳۵۴ وارداتیں ہوئیں اور ۱۹۶۶ء میں ۹۲۰ یعنی ان میں ۹۱٫۴ کا اضافہ ہوا۔ دوسرے نمبر پر "امانت میں مجرمانہ خیانت" کے کیس ہیں۔ اس عرصہ کے دوران میں ان کی تعداد ۱۶۸۹۵ سے بڑھ کر ۲۵۵۲۴ ہوگئی یعنی ان میں ۱۶٫۵ فیصد کا اضافہ ہوا۔ تیسرا نمبر دنگے کی وارداتوں کو حاصل ہے۔ ان کی تعداد ۲۷۱۹۹ سے ۳۸۸۸۴ ہوگئی اس طرح ان میں ۱۵٫۶ فیصد کا اضافہ ہوا۔ معمولی چوریوں کی وارداتوں میں کافی اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں اُن کی تعداد ۲۱۳۰۰۱ تھی جو ۱۹۶۶ء میں ۳۱۶۶۱۷ ہوگئی یعنی ان میں ۱٫۸۱ فیصد کا اضافہ ہوا۔ راہزنی کی وارداتوں میں بھی ۱۲٫۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔ ان کی تعداد ۳۲۲۴۶ سے بڑھ کر ۹۵۵۵ ہوگئی۔

اگر جرائم کی کل تعداد کو ایک سو تصور کیا جائے تو ہم نوعیت کے بارہ جرائم کی فیصد درج ذیل ہے۔

قتل ۱٫۷۶۔ اغوا ۱٫۰۰۔ ڈکیتی ۰٫۶۶۔ راہزنی ۱٫۶۱۔ نقب زنی ۱۸٫۹۹۔ مویشیوں کی چوری ۳٫۲۳۔ معمولی نوعیت کی چوری ۴۳٫۴۴۔ دنگے ۴٫۴۴۔ امانت میں خیانت ۲٫۶۸۔ دغابازی ۱٫۰۵۔ جعلسازی ۱٫۰۰ اور دیگر ۳۰٫۶۳ فیصد۔ اگر صحیح اعداد و شمار کی گنتی نہ کی جائے تو یہ مجموعی فیصد گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے مثال کے طور پر قتل کی وارداتیں اگرچہ جرائم کی کل تعداد کا صرف ۱٫۷۶ فیصد ہیں تاہم ۱۹۶۵ء میں ان کی تعداد ۱۲۳۱۰ تھی جبکہ ۱۹۶۶ء میں ان کی تعداد ۱۲۶۲۱ تھی۔ یعنی اس میں ۹٫۷۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔

آندھرا پردیش مبارکباد کا مستحق ہے کہ وہاں جرائم میں سب سے کم اضافہ ہوا وہاں صرف ۱٫۶۱ فیصد کا اضافہ ہوا۔ پنجاب واحد ایسا پردیش ہے جس میں اس برس کے دوران میں جرائم میں سب سے زیادہ یعنی ۱۳٫۶۵ فیصد کی کمی ہوئی۔ ناگالینڈ میں جرائم کی وارداتوں میں سب سے زیادہ یعنی ۶۸٫۱۶ فیصد کا اضافہ ہوا۔ ہماچل پردیش دوسرے نمبر پر ہے۔ وہاں اضافے کی فیصد ۸٫۵۷ رہی۔ مہاراشٹر کا نمبر تیسرے درجے پر ہے جس میں جرائم میں ۳٫۴۶ فیصد

کا اضافہ ہوا۔

فی لاکھ آبادی کے پیچھے جرائم کی سب سے زیادہ مقدار دلی میں رہی۔ (۴۸۸٫۶۷ فیصد) انڈیمان اور نکوبار (۳۸۱٫۰۶) گوا، دیو اور دمن (۲۹۶٫۷۶) اور مدھیہ پردیش ۲۲۹٫۶۵۔ مہاراشٹر (۲۰۴٫۶۷) مدراس (۱۸۴٫۶۶) اتر پردیش (۱۷۲٫۶۶) اور مغربی بنگال (۱۸۸٫۶۴)

آٹھ بڑے بڑے شہروں میں سے ۱۹۶۵ء کے مقابلے میں ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں ۹٫۰۶ فیصد اور احمد آباد میں ۴٫۰۶ فیصد جرائم کم ہوئے۔ مدراس میں جرائم کے اضافے کی فیصد ۵٫۹۶ اور بمبئی شہر میں ۳۳٫۶۹ تھی۔

۱۹۶۵ء میں امریکہ میں تیرہ سے سترہ برس کے درمیان کی عمر کے بارہ لاکھ ایک ہزار لڑکے اور لڑکیاں گرفتار ہوئے۔ اس ملک میں اس عمر کے گرفتار شدگان کی کل فیصد ۲۰ تھی اور مجرمانہ سرگرمیوں میں اُن کی فیصد کا حصہ اٹھارہ تھا۔

جرائم کی صورتِ حال کا اگر موازنہ کیا جائے تو دیگر بڑے ملکوں کی نسبت یہاں صورت حال زیادہ بہتر ہے۔ لیکن جرائم میں اضافے کی شرح خصوصاً لاقانونیت یا دغابازی کے کیسوں میں اضافے کی شرح کافی تشویش کن ہے ہر برس تقریباً بارہ لاکھ اشخاص کو جیل خانوں میں بھیجا جاتا ہے اور ہمارے جیل خانوں کی روزانہ اوسط تعداد ایک لاکھ ۵۵ ہزار ہے جیل خانوں سے ہر برس پانچ لاکھ اشخاص کو رہا کیا جاتا ہے اور گرفتار شدگان میں سے عادی مجرموں کی فیصد سات ہوتی ہے جبکہ امریکہ اور برطانیہ میں ان کی فیصد پچیس سے تیس ہوتی ہے۔

جرائم کی روک تھام اور اس میں شہریوں کے فرض کے معاملے میں اگر ہمارے لوگوں کو صحیح تعلیم دی جائے۔ سماجی دفاع کے اداروں کی اچھی طرح سے تنظیم کی جائے۔ مجرم پکڑنے والے اداروں کو صحیح لائنوں پر چلایا جائے۔ رہا ہونے والے قیدیوں کی دیکھ بھال کا کام کرنے والے غیر سرکاری اداروں کی مناسب مدد کی جائے اور انھیں خاطر خواہ رقوم مہیا کی جائیں۔ اور سماجی بہبود اور داخلی امور کی وزارتیں آپس میں گہرے تعاون سے کام کریں تو جرائم کی روک تھام کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

آج ایسی حالت ہے کہ پولیس اور عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوئی منظم کوشش موجود نہیں، ماحول میں مخالفانہ عنصر موجود ہے اور مل جل کر کام کرنے کی صحت مند فضا کا فقدان ہے ایک سرکردہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کا یہ کہنا بجا ہے کہ مجرمانہ ذہنیت کی سرپرستی کے لئے کئی وجوہات ذمہ دار ہیں۔ اور ان میں سے بعض بالکل پولیس کے بس سے باہر ہیں۔ لیکن پھر بھی ابھی پولیس کو بہت کچھ کرنا ہے۔ اور اسے اخبارات اور عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔

اس قسم کے سنجیدہ، پیچیدہ اور اہم سوال کا حل تلاش کرنے کے لئے پہلی مرتبہ ایک مربوط کوشش کی گئی ہے اور ہماری خواہش ہے کہ جرائم کے انسداد کا یہ ہفتہ کامیابی حاصل کرے۔

(پیری پورنا نند ودما)

فلاحی نظامِ حکومت میں جرائم کی روک تھام

عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ایک فلاحی نظامِ حکومت میں جرائم کے روائتی اسباب کافی حد تک کم ہوجاتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں غربت کی پریشانیوں کا وجود نہیں ہوتا اور ماحول بہتر ہوتا ہے لیکن کئی جائزوں کے بعد پتہ چلا ہے کہ فلاحی نظامِ حکومت میں جرم کی نوعیت چاہے الگ ہو اور جرم کے اسباب چاہے مختلف ہوں تاہم جرم کی وارداتیں بہت زیادہ حد تک کم نہیں ہوتیں۔

اگر جرم سے ہمارا مدعا قانون کی خلاف ورزی یا سرکار کی طرف سے عائد شدہ فرائض اور ذمہ داریوں سے پہلوتہی ہے تو ایک فلاحی نظام حکومت میں جرم کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ اس میں حکومت کا کام بڑھ جاتا ہے۔ دفتر شاہی کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے اور سرکاری رقوم سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی غرض سے شہریوں میں قانون کی گرفت سے بچنے کی کوششیں زیادہ مقدار میں موجود رہتی ہیں۔ کئی شہری یا حکومت کی طرف سے نافذ کئے گئے قانون اور ضابطوں کے مطابق نہ چلنے اور پھر بھی بچ نکلنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ضابطوں کی تعداد

جتنی زیادہ ہوگی اُن سے بچنے اور اُن کی خلاف ورزی کرنے کا رُجحان بھی اتنی زیادہ مقدار میں موجود رہے گا۔

فلاحی نظامِ حکومت میں جرائم کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ حکومت کے اقدامات کی وجہ سے ملک میں جو خوشحالی آتی ہے اُس کا پھل لاکھوں آدمیوں کو نہیں ملتا۔ یہ فاصلہ ہی اکثر گناہوں اور جرموں کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اس فاصلے کو ختم کیا جانا چاہئے۔ اس کے علاوہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی نئی دریافتوں اور ترقیوں کی روشنی میں جرائم کے تئیں نظریات اور ان کی چھان بین کے طریقے میں بھی تبدیلی لائی جانی چاہئے۔ اس کے علاوہ ایک اور خراب بات پیدا ہو رہی ہے کہ سماجی اور اقتصادی ترقی کے پروگرام پر حکومت کی طرف سے عمل درآمد ہونے کی وجہ سے امن اور قانون کے بارے میں حکومتی مشینری اور پالیسیوں کے تئیں لوگوں کے اندر ایک طرح کی بے حسی پیدا ہو گئی ہے۔ امن اور قانون کو برقرار رکھنے کی ذمہ دار موجودہ مشینری نئی قسم کی متشددانہ تحریکوں اور قانون کی کھلم کھلا خلاف ورزیوں کو روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ہڑتالوں اور متشددانہ تحریکوں کو بعض اوقات ایک ایسے سماج کا ایک جمہوری طریقہ تصور کیا جاتا ہے جو کہ اپنے آپ کو نئے حالات میں ڈھال رہا ہے۔ اس بات میں شک ہے کہ قانون کی خلاف ورزیوں کی یہ دلیل صحیح ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ امن اور قانون کو برقرار رکھنے اور جان و مال محفوظ رکھنے کی ذمہ دار مشینری کو مضبوط بنایا جائے۔

اس کے علاوہ شہریوں میں فرض شناسی کے جذبے کو فروغ دینے اور جرائم کی روک تھام میں روشن خیال لوگوں کو شریک کرنے کی ضرورت ہے۔ پارٹیوں کی سیاست کو قانون کی خلاف ورزی کرنے کی حوصلہ افزائی کرنے اور لاقانونی پھیلانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔

(وی۔ جگنا دھم)

بقیہ: کشمیری زبان کی مثنویاں - رزمیہ

کرکے قاری کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے۔ یہ داستان بڑے سائز کے ڈھائی سو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے مگر شاعر کے زورِ قلم نے واقعات کے تسلسل اور دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا ہے۔

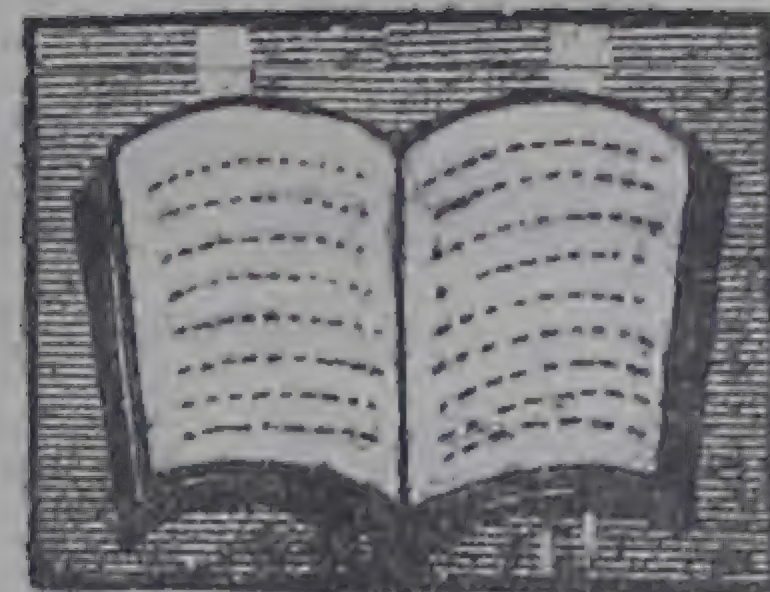
لسہ خاں اسلام آباد کے رہنے والے تھے حال ہی میں اُن کا انتقال ہوا ہے۔ اُن کی گل بکاؤلی اُردو کے ایک قصہ موسوم بہ گلستانِ بقا سے ماخوذ ہے۔

کشمیری ادب کے دورِ جدید میں مثنوی کی طرف وہ توجہ نہیں دی گئی جو ہمارے سخنوروں نے نظم یا غزل اور دوسرے اصنافِ سخن کی طرف مبذول کی تھی۔

ہمارے اکثر شاعر مثنوی کو قریب قریب بھول بیٹھے اور اس کی جگہ نظم معرّیٰ یا اس مثنوی نے لے لی جو ہیئت کے لحاظ سے اگرچہ مثنوی ہی میں شمار ہوتی ہے لیکن مواد اور خیال کے بموجب اُسے جدید مثنوی ہی کہا جا سکتا ہے

کشمیر کے ہم عصر شعرا میں حیرت کاملی، عبدالاحد زرگر، بہار شاہ آبادی قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے آج کے ماحول میں رہ کر بھی مثنوی کا دامن نہیں چھوڑا اور چند اچھی مثنویاں تخلیق کی ہیں۔

رعنا زیبا، پیر شمس الدین حیرت کاملی نے آج سے کوئی تیس چالیس برس پہلے تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب حیرت نے اپنے کسی دوست احسن کے ایما پر لکھی۔ اس کا قصہ علم الاخلاق کی ایک فارسی کتاب "شمس قہقہہ" پر مبنی ہے اصل کتاب نثر میں تھی۔ حیرت صاحب نے اس میں سے ایک افسانہ کا انتخاب کرکے اُسے اختصار کے ساتھ تقریباً اٹھارہ سو اشعار میں نظم کیا اور یہ سارا کام صرف دس دن کے اندر اندر مکمل کیا۔



نئی کتابیں

ادب اور جدید ذہن: مصنف دیوندر اسر، ناشر: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار دہلی
قیمت: چار روپے پچاس پیسے

ادب اور جدید ذہن، دیوندر اسر کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے اس سے قبل اُن کے دو مجموعے 'ادب اور نفسیات' 'فکر اور ادب' شائع ہو چکے ہیں دیوندر اسر پچھلے کئی برسوں سے مغرب کی نفسیاتی، ادبی، سیاسی، اور عمرانی تحریکوں کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ تازہ ترین کتاب میں انہوں نے جدید ادب اور جدید عہد کے کچھ متنازعہ فیہ مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ مندرجات کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی کتاب جن موضوعات کا احاطہ کرتی ہے کس قدر دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ بیٹ نسل، اینگری ینگ مین، اینٹی تھیٹر، وجودیت، دیو ہیکل ادارے۔ وغیرہ وہ چند موضوع ہیں جن پر دیوندر اسر نے زیر تبصرہ کتاب میں بحث کی ہے۔

ہمارے دور کا مرکزی مسئلہ اقدار کے انحطاط کا مسئلہ ہے۔ باقی تمام مسائل اس کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ شخصیت کی شکست و ریخت، سیاسی، عمرانی اخلاقی نظاموں اور فلسفوں سے بے اطمینانی ہمارے دور کا مقدر ہے۔ کیوں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ان کا کھوکھلا پن عملی روپ میں پایۂ ثبوت تک پہنچا ہے۔ ان گنت چھوٹی بڑی جنگوں، جبر و تشدد، اور سیاسی اور اقتصادی استبداد نے انسان کے تمام خوابوں، اس کی تمام خواہشوں اور امیدوں پر اپنا بھیانک سایہ ڈالا ہے۔ انسان کی شخصیت اس کا مکمل وجود ہے صرف جسم نہیں، ذہن بھی ہے روح بھی ہے۔ ہماری تہذیب جسم کی لذتیں اور آسائشیں تو مہیا کر سکتی ہے، لیکن ہماری روح کے لئے کوئی روشنی مہیا نہیں کر سکتی۔ نتیجہ وہ خلا ہے جو ہر انسان اپنے اندر اور باہر محسوس کرتا ہے۔ یہیں سے وہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کی طرف دیوندر اسر نے اپنی کتاب میں بار بار اشارہ کیا ہے۔ وہ مسئلہ ہے۔ وجود کی تلاش۔ ظاہر ہے کہ بند فلسفوں اور نظاموں کی ناکامی کے بعد اس تلاش کا انسان کی ذات تک محدود ہو جانا ناگزیر ہے شاید یہی وجہ ہے کہ وجودیت ہمارے دور کا سب سے جاندار اور مقبول عام فلسفہ ہے۔ دیوندر اسر اپنی وجودیت کے علاوہ وجودیت کے دیگر مدرسہ ہائے فکر کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے ہمارے دور کے مسائل بڑی چابکدستی سے اور مناسب پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن ذاتی طور پر انہیں کالن ولسن کا نظریۂ وجودیت۔ وجودیت کے دیگر نظریوں کے مقابلہ میں زیادہ پسند ہے۔ اس کا اعتراف وہ واضح الفاظ میں اپنی کتاب میں کرتے ہیں۔

دیوندر اسر کی کتاب اگرچہ مختلف مضامین پر مشتمل ہے لیکن اس کے تمام مضامین میں فکر کی ایک بنیادی رو جاری و ساری ہے۔ وہ اپنے آپ کو مرض کی تشخیص اور علامات کی ترتیب و تدوین تک محدود نہیں رکھتے بلکہ امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ وہ سپر ڈالنے کے فلسفہ میں یقین نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کا مقدر احساس شکست سے مغلوب ہونا نہیں بلکہ اپنے حالات کو سمجھنا، ان سے نبرد آزما ہونا، ان کو رُخ دینا اور اُن پر غالب آنا ہے۔ اور یہی سچی وجودیت ہے۔ شاید یہی وہ مقام ہے جہاں فرد کی کشمکش سماجی معنویت سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔

'ادب اور جدید ذہن'، دلچسپ، فکر انگیز، اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔

(بلوراج کومل)

"محترم" — مصنف: محمد طفیل۔ صفحات: ۱۰۰، قیمت: چار روپے
ناشر: ادارہ فروغ اردو لاہور۔

اردو ادب میں سفرنامے، رپورتاژ، اسکیچ اور خاکے کیف و کم کے اعتبار سے انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی اور سید احتشام حسین کے سفرنامے، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور ڈاکٹر محمد حسن کے رپورتاژ۔ سید سلیمان ندوی اور شوکت تھانوی کے اسکیچ مولوی عبدالحق، فرحت اللہ بیگ، چراغ حسن حسرت۔ رشید احمد صدیقی کے خاکے اور . . . . .

"محترم" کہنے کو تو سفر پارہ ہے جس میں لاہور سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس میں شرکت سے کراچی کے مختصر سفر کے رپورتاژ میں جہاں آپ بیتی اور جگ بیتی پیش کی گئی ہے وہاں بڑے بڑوں کے خاکے اڑائے اور اپنے ہم سفروں کے بالکل نئے انداز میں اسکیچ پیش کر دیئے ہیں۔

محمد طفیل مدیر نقوش اردو کے مقتدر صحافی اور ممتاز خاکہ نگار ہیں۔ "محترم" میں انھوں نے وہی تکنیک برتی ہے جو منٹو، شوکت تھانوی، جوش ملیح آبادی، اختر اورینوی، اور نیاز فتحپوری کے خاکوں میں استعمال کی گئی تھی۔ اس سفری مرقع میں سفرنامہ، رپورتاژ، خاکہ نگاری اور اسکیچ کی سرحدیں اُن کے فن سے مل جاتی ہیں۔

"محترم" میں بیان اور ایجاز پر قدرت، اسلوب کے تیکھے پن کے ساتھ ان کے چبھتے ہوئے فقرے اور پھڑکتے ہوئے جملے ملاحظہ فرمایئے

ریاض الوزر: — "چوں کہ وکیل ہیں اس لئے ہر جھگڑے میں بولنا اِن کا پیشہ ورانہ حق ہے۔" ص ۲۴

صہبا لکھنوی: "میں گے تو پیچھے چلے جائیں گے۔ نظروں سے اوجھل ہو جائیے تو پھر یہ بھی دور ہو جائیں گے۔" ص ۴۷

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ: — "یہ مسکراتے بھی بہت ہیں مگر ہر جگہ ان کے مسکرانے کے معنی مختلف ہوتے ہیں۔" ص ۳۴

شیو کے لئے منہ پر صابن لگانے اور بلیڈ نہ ملنے پر — "تھوڑی دیر مقدس صورت بنائے سوچتا رہا۔ کہ کیا کروں کدھر جاؤں۔" ص ۱۵

نہاتے کا پانی "بس تھوڑا سا اور گرم ہوتا تو کوئی بھی شکر صورت چائے دم کر لیتی . . . . . جیسے تیسے پانی سے بچتے ہوئے نہایا۔" ص ۲۱

میزبانوں جن سے ہمارا خیال رکھنے کو کہا گیا تھا وہ خود اتنے مصروف تھے کہ ضرورت تھی کہ کوئی ان کا خیال رکھتا۔" ص ۳۲

میں نے کہا — "یہاں ہوا ایسی شاندار ہے کہ لطف آجاتا ہے۔ پتہ نہیں جنت میں بھی ایسی ہوگی کہ نہیں؟" انہوں نے کہا: "مجھے جنت کا تو پتہ نہیں۔ مگر یہاں تو ہماری ہوا ہی ہوا ہے۔" ص ۴۱

ہوٹل میں: "بیٹھ کر ہم نے مشروبات سے اپنے آپ کو "ٹھنڈا" کیا۔" ص ۴۹

شیخ افضل جعفری نے "اپنے نہایت واہیات چھپے ہوئے مجموعہ کو دیکھ کر کہا: "اپنی زندگی میں دو بار رویا ہوں۔ ایک بار والدہ کے مرنے پر دوسری بار اپنے مجموعہ کلام کے چھپنے پر۔" ص ۵۴

"محترم" میں سفری تفصیلات، جغرافیائی اور تاریخی جزئیات پیش کرنے میں دلچسپی اور اختصار کی وجہ سے اس میں روانی آگئی ہے۔ اور ادبی آب و رنگ نے اس میں ایک قسم کی چمک پیدا کر دی ہے۔ آخر میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اردو کے سفری ادب میں "محترم" ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ (احمد جمال پاشا)

"تکلف برطرف" مصنف: مجتبیٰ حسین۔ صفحات ۱۵۷
ملنے کا پتہ و ناشر: حلقہ ارباب ذوق۔ تلے پلی حیدرآباد ۱-۵ پی

"تکلف برطرف" اُن مجتبیٰ حسین صاحب کے چودہ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن کا قول ہے کہ "میرے آبا و اجداد ایران کے رہنے والے تھے اور درہ خیبر کے راستے سے ہندوستان آئے تھے۔

مگر میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ میں اُن کے مزاحیہ مضامین سے اس وجہ سے متاثر نہیں ہوں کیوں کہ میرے آبا و اجداد عرب سے آچکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعہ میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جو اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان میں جو مزاح کی پاکیزگی، شگفتگی اور ذہانت ہے وہ تو ایک ایسی سعادت ہے جو خداداد ہے۔ مگر اُن کے بیشتر مضامین پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی سے بہت

زیادہ متاثر ہیں۔ چناں چہ اِن دونوں بلند پایہ اور ممتاز ادیبوں کے انداز بیان کی جھلکیاں اس مجموعہ میں ہم کو جگہ جگہ ملتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ اپنی پیدائش کی وجہ تسمیہ اور اپنے زمانہ طالب علمی کا ذکر کرتے ہیں تو اکثر فقروں میں پطرس بخاری کی تحریر کا شبہ ہوتا ہے۔ انہیں وہی آمد اور وہی بے ساختگی پائی جاتی ہے جس نے پطرس کو پطرس بنا دیا۔ "مجھ سے ملئے" کے عنوان سے انہوں نے جو اپنا تعارف کرایا ہے اس میں لکھتے ہیں۔

" میری زندگی کے دیگر احوال یہ ہیں کہ میں ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء کو دُنیا میں پہلی بار پیدا ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک زندہ ہوں اور اندیشہ ہے کہ آئندہ بھی کئی برسوں تک زندہ رہوں گا۔ اپنی تعلیم کے بارے میں یہ عرض کردوں کہ پرائمری اسکول میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا رہا۔ مڈل اسکول میں فٹ بال کھیلتا رہا۔ ہائی اسکول میں پتنگ بازی اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں میں نام کماتا رہا۔ البتہ کالج پہنچکر اسپورٹس سے میری دلچسپی اس لئے کم ہوئی کہ سینما بینی اور ہوٹلنگ نے مجھے اسپورٹس کی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہ دی۔ غرض زمانہ طالب علمی میں ہر ایسی سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا جو "خارج از نصاب ہو۔ مجھے" داخل در نصاب" سرگرمیوں سے ہمیشہ چڑ رہی۔ چناں چہ کالج کے زمانے میں میں نے اپنا ایک ذاتی ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا۔ انگریزی کے گھنٹے میں کالج کے کیفے ٹیریا میں بیٹھتا تھا۔ سماجیات کے گھنٹے میں کلاس روم سے باہر دوستوں سے سماجی تعلقات بڑھانے میں مصروف رہتا تھا۔ معاشیات کے گھنٹے میں دوستوں سے قرض مانگا کرتا تھا۔ اور اردو کے گھنٹے میں لینڈ اسکیپ گارڈن میں بیٹھ کر مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔"

۱۵ جولائی ۱۹۳۶ء سے ۲۰ اپریل ۱۹۶۸ء تک کل بتیس سال اور کچھ مہینے ہوتے ہیں۔ اس بتیس سال کی عمر میں ایسے انداز میں رچے بسے فقرے نکالنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے۔

بڑی خیریت ہوئی کہ چند مزاح نگار مجتبیٰ حسین صاحب سے پہلے پیدا ہوئے ورنہ یقین مانیے کہ اگر خدانخواستہ ان کی سن پیدائش کے لگ بھگ پیدا ہو گئے ہوتے تو ہم سبھوں کو کون گھاس ڈالتا۔

میں مصنف کے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر اور ایڈیٹر ریاست جناب میر عابد علی خاں کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ۱۲ اگست ۱۹۶۲ء کو دن کے ٹھیک بارہ بجے سے ہمارے اس مزاح نگار کو مزاحیہ مضامین لکھنے پر آمادہ کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اُردو کا مزاحیہ ادب ایک ہونے والے ممتاز مزاح نگار سے محروم رہ جاتا۔ اللہ ہم لوگوں کی عزت و آبرو کو اپنی اماں میں رکھے ورنہ ہم لوگوں کی عمر کو پہنچتے پہنچتے یہ نہ جانے کتنوں کے چراغ گُل کر چکے ہوں گے۔

(غلام احمد فرقت کاکوروی)

سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ :-

ناشر : نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی۔ ۶

صفحات : ۱۲۸ قیمت : ایک روپیہ

مورس کرانسٹن کی مرتب کی ہوئی انگریزی کتاب A Glossary Of Political Terms کا اردو ترجمہ مشہور ادیب جناب گوپال متل نے کیا ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں سیاسی مسائل میں اکثر استعمال ہونے والی اصطلاحوں کی مفصل وضاحت کی گئی ہے۔ یہ ایک مستحسن کوشش ہے۔

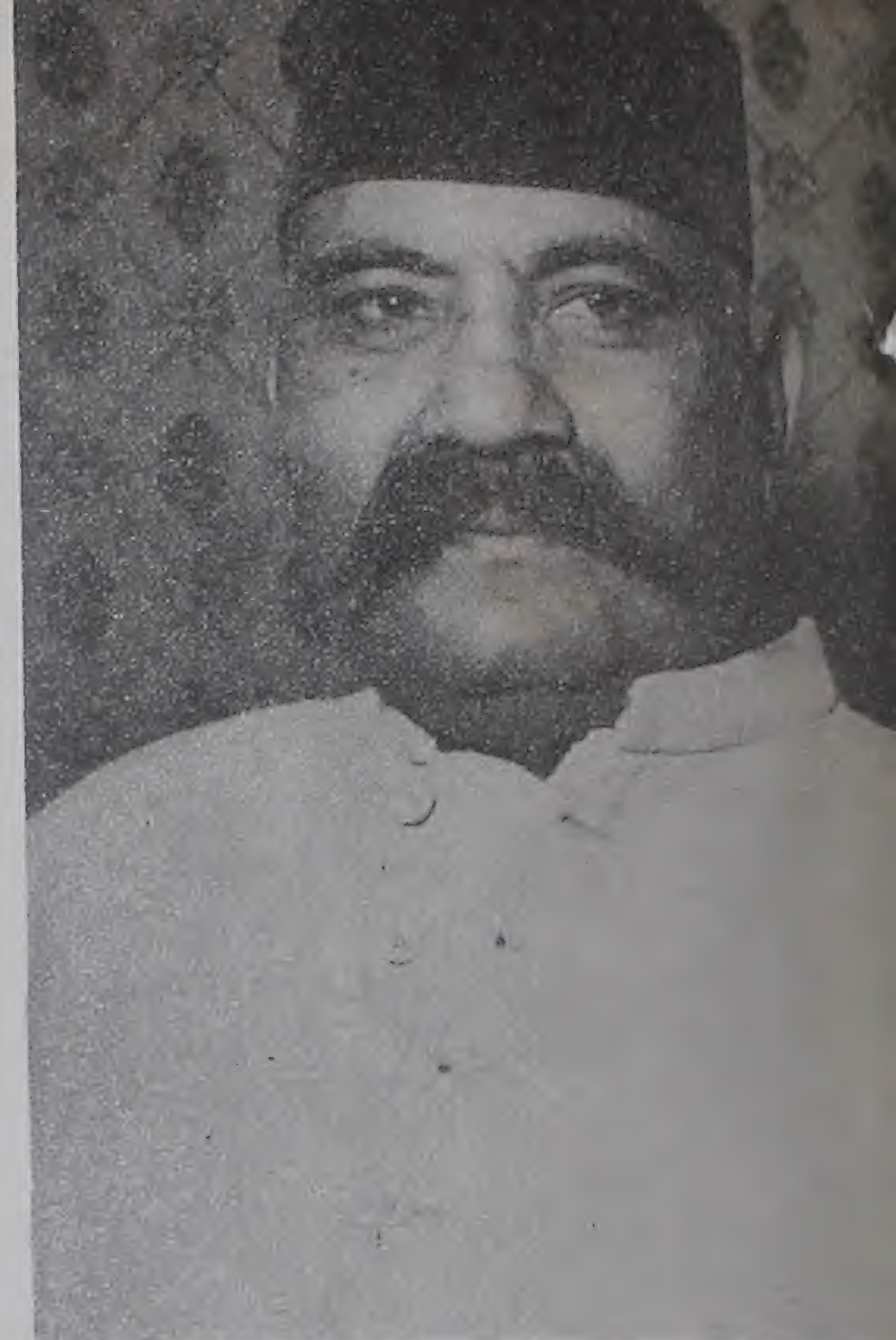
سوویٹ سفارت خانے میں :

ناشر : نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۔ ۶

صفحات : ۳۷۶ قیمت : دو روپے

اس کتاب کے مصنف الیکزنڈر کرناچیف ہیں۔ اور اس کا اُردو ترجمہ مخمور سعیدی، پریم گوپال متل، اور سعیدہ انجم نے کیا ہے۔ اس ضخیم کتاب میں برما میں متعین ایک روسی ڈپلومیٹ نے اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔

(ادارہ)



۲۳ اپریل ۱۹۶۸ء کو ہندوستان کے مشہور و معروف موسیقار بڑے غلام علی خاں کا طویل علالت کے بعد حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات سے دنیائے موسیقی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا امر محال ہے۔

بڑے غلام علی خاں ۱۹۰۲ء میں مغربی پاکستان کے مشہور شہر لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں کلکتہ میں منعقد ہونے والی تاریخی میوزک کانفرنس نے اُن کے لئے شہرت کے دروازے کھول دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے ہندوستان کے متعدد مقامات پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اور لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ رفتہ رفتہ سارے ملک میں ان کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔

۱۹۶۲ء میں انہیں صدر جمہوریہ ہند نے پدم بھوشن کا اعزاز بخشا اور سنگیت ناٹک اکاڈمی نے ہندوستانی موسیقی کا ایوارڈ عطا کیا۔ انہوں نے غیر ممالک میں بھی اپنے کمال کا مظاہرہ کیا اور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا۔

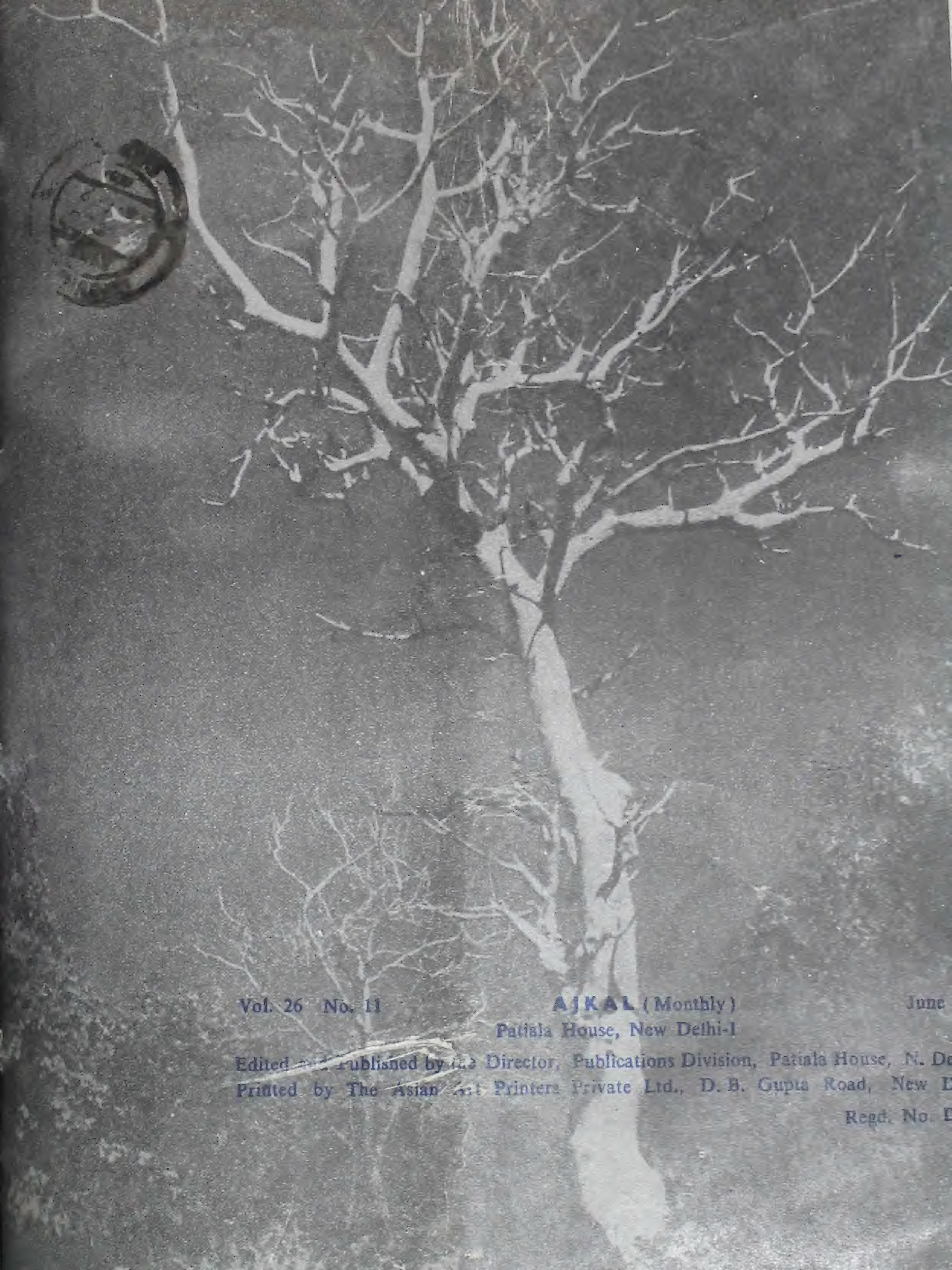
بڑے غلام علی خاں صحیح معنوں میں 'بڑے' تھے۔ وہ صرف بڑے فنکار ہی نہ تھے بلکہ ایک بڑے انسان بھی تھے۔ آسمانِ موسیقی پر بڑے غلام علی خاں ایک ایسے تابندہ ستارہ ہیں، جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑے گی۔



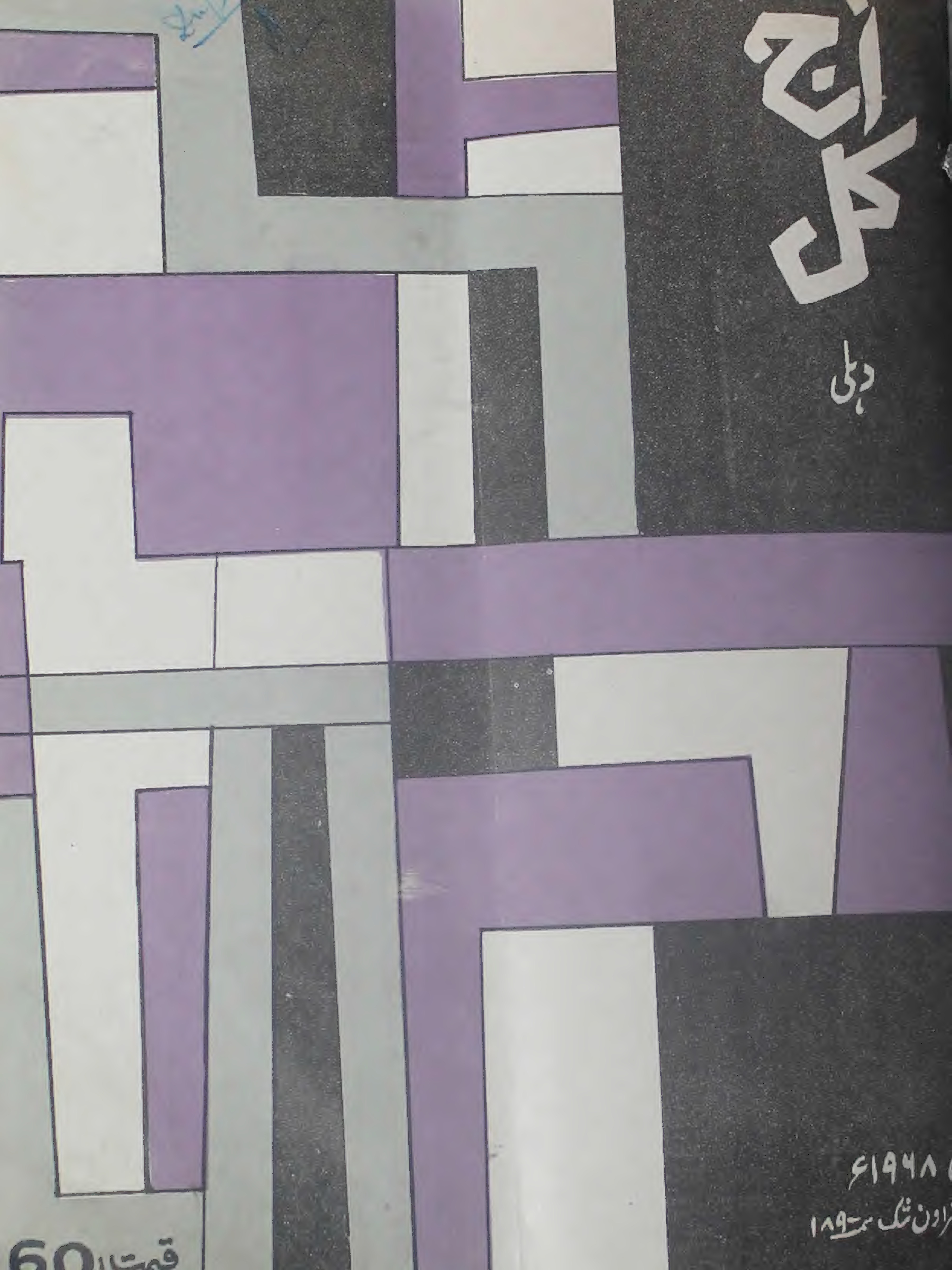
۱۶ اپریل ۱۹۶۸ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے شہنائی کے نامور اُستاد بسم اللہ خاں کو پدم بھوشن کا اعزاز دیا ہے۔

بسم اللہ خاں نے شہنائی بجانے میں ہندوستان ہی میں ہی نہیں غیر ممالک میں بھی غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔

ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ ہر روز ایک گھنٹہ ریاض کرنا ان کا معمول ہے اور ہر سال جب جون جولائی میں وہ اپنے وطن بنارس جاتے ہیں تو زیادہ دیر تک ریاض کرتے ہیں۔ ان کے کئی شاگرد ہیں مگر ابھی تک کوئی اُن کے کمال کو نہیں پہنچا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ عظیم فنکار آئندہ مزید بلندیاں حاصل کرے گا



Vol. 26 No. 11 AJKAL (Monthly) June
Patiala House, New Delhi-1
Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N. De
Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New D
Regd. No. D



آجکل

دہلی

۱۹۶۸ء

راون شک سمت ۱۸۹

قیمت ۱ 60



صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین جون کے پہلے ہفتے میں ہنگری اور یوگوسلاویہ کے سرکاری دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ ان دونوں ممالک سے ہمارے اخوت و محبت کے گہرے رشتے قائم ہیں۔ صدر جمہوریہ ہند کے حالیہ دورے سے یہ رشتے مزید استوار ہوں گے۔

۹ جون کو بڈاپسٹ میں ایک تقریب میں ہنگری کے مشہور مصنف جناب لیزلو نیمتھ نے اپنی کتاب "گاندھی کا قتل" ڈاکٹر ذاکر حسین کو پیش کی۔

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

ترتیب

جلد ۲۶ نمبر ۱۲

اساڑھ ـ شراون شک سمت ۱۸۹۰

جولائی ۱۹۶۸ء

زر سالانہ	ہندوستان میں : ـ سات روپے
غیر ممالک سے	پاکستان میں : سات روپے (پاک)
	۱۰ شلنگ ۶ پنیس یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ	ہندوستان میں : ۶۰ پیسے
غیر ممالک سے	پاکستان میں ۶۰ پیسے (پاک)
	۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین کیلئے خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آجکل" اُردو پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

قومی ترقیاتی کونسل کے اجلاس (منعقدہ ۷ مئی ۱۹۶۸ء) میں چوتھے پلان کے عام خدوخال کو پیش کیا گیا اور چوتھے پلان کی تیاری میں پلاننگ کمیشن نے کن امور کو ملحوظ رکھا ہے اور کس طرح ترجیحات کا تعین کیا ہے اس کا خاکہ پیش کیا گیا۔

چوتھا پلان ہمارے لئے کئی لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ ملک کی معاشی حالت میں استحکام لانے برآمد بڑھانے، غیر ملکی امداد کو کم کرنے اور خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہونے کے سلسلے میں پلان میں متعدد تجاویز شامل کی گئی ہیں اور ان پر کامیابی سے عمل درآمد کے ذریعے ہی ہم ترقی، خوشحالی کی منزل پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

چوتھے پلان کا ایک اہم ترین مقصد یہ ہے کہ ملک کی معیشت میں استحکام پیدا ہو۔ ماضی میں عدم استحکام کی وجہ زرعی پیداوار میں اتار چڑھاؤ اور ان کی قیمتوں میں اضافہ رہا ہے۔ اس کا مقابلہ خاص خاص زرعی اجناس کا اسٹاک رکھ کر کیا جائے گا۔

کھیتی باڑی کے نئے طریقوں کو اپنانے اور سینچائی کی بڑھتی ہوئی سہولتوں سے کام لینے کی وجہ سے زرعی پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے اس کے پیش نظر توقع کی جاسکتی ہے کہ چوتھے پلان کی مدت میں زرعی حلقے کی پیداوار میں ۵ فی صد سالانہ کی شرح ترقی کی رفتار مناسب ہوگی اس پلان کا دوسرا اہم مقصد ہے کہ جس قدر جلد ہوسکے ہم خود کفیل ہوجائیں۔ ترقی کا ایک ایسا عمل جس کو ہمیشہ بیرونی امداد کی ضرورت ہو کبھی سودمند نہیں ہوسکتا اس لئے ہم اس کی پوری کوشش کرنا ہے کہ غیر ملکی امداد بشمول خوراک کی امداد، سود اور قرض کی ادائیگی کو چھوڑ کر، چوتھے پلان کے آخری سال میں، موجودہ مقدار کے مقابلے میں نصف رہ جائے۔ اس کے لئے برآمد کو بڑھانا اور درآمد کو کم سے کم کرنا ہوگا۔

شرح ترقی میں ۵ سے ۶ فی صد سالانہ اضافے کے ساتھ ساتھ بیرونی امداد میں نصف کی کمی کرنے کی غرض سے ملک کے اندرونی وسائل سے اب سے کہیں زیادہ کام لینا ہوگا۔ اور پوری قوم کو بڑی سخت محنت کرنی پڑے گی۔ ہمیں امید ہے کہ اہلِ ملک تعمیر و ترقی کی ان تمام کوششوں سے پوری طرح تعاون کریں گے جو اس سلسلے میں کی جائے گی۔

ہمارا اگست ۱۹۶۸ء کا شمارہ "اردو نمبر" ہوگا جس میں آزادی کے بعد کے ادب کا جائزہ لیا جائے گا۔ چند عنوانات یہ ہیں۔ اردو زبان آزادی کے بعد، اردو ناول، افسانہ، ڈرامہ، نظم، غزل اور صحافت آزادی کے بعد ——

اس سلسلے میں ہم نے اردو کے ناشروں اور کتب فروشوں کی خدمت میں سرکلر بھیجے ہیں جن میں ان سے بعض سوالات کے جواب طلب کئے گئے ہیں ایسے تمام اداروں یا افراد سے جنھوں نے گزشتہ بیس سال میں اردو کی کتابیں شائع کی ہیں اور جو اردو کتابوں کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ گذارش ہے کہ ہمارے سوال نامے کا جواب فوراً بھیج دیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ان تمام لوگوں سے بھی گذارش ہے جو اردو کے فروغ اور ترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں ازراہ کرم یہ لکھ بھیجیں کہ اردو کتابوں کے کم بکنے کی وجہیں کیا کیا ہیں، اور صورت حال کی بہتری کی کیا کیا صورتیں ہوسکتی ہیں ناشروں سے بطور خاص یہ گذارش ہے کہ وہ یہ ضرور لکھ بھیجیں کہ گزشتہ ۲۰ سال میں انھوں نے کتنی کتابیں شائع کی ہیں —— مجھے امید ہے کہ ہمارے قارئین اور ناشرین اس جائزے کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد کریں گے۔

---

۵ مئی کو ہندوستان کے مشہور شاعر جناب اکرام حسین پرویز شاہدی کا کلکتے میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۱۹۵۸ء سے کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے —— پرویز شاہدی کا مجموعۂ کلام "رقصِ حیات" اہل نظر سے داد تحسین حاصل کر چکا ہے ——

ان کی موت ایک سانحہ ہے جس پر ہم اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔

فضا ابن فیضی

بنام ہم سخناں

جدید نسل کے اے باوقار شہزادے
سخن کی مملکت نو کا تاج دار ہے تو

ترا حسین و خوش آہنگ و سرو ناز قلم
ترا جوان قلم تیرا عہد ساز قلم
نئے شعور کے پندار کی علامت ہے
شگفتہ جذبوں کے اظہار کی علامت ہے
ترے خیال کی گرمی ہے انجمن کا چراغ
ہنر کی آبرو ہے، فن کا اعتبار ہے تو
تو اپنے دور کا ہے ایک حالی ایک آزاد
تو اپنے عصر نوی کا ہے تابناک ضمیر
تو اپنی جھیل کا ہے ایک نو شگفتہ کنول
گلابی زخموں کی سوغات کی نہ باتیں کر
نظر میں صبح لئے، رات کی نہ باتیں کر
کہ جو چراغ ہے جادے کا وہ غبار ہے تو
خزاں کے ذہن سے ابھری ہے وہ بہار ہے تو



وہ فن نہ جس سے ہو "ذوق جمال" آسودہ
ملے نہ جس سے کچھ "احساس" کو توانائی
جو حسن اور مسرت کا ہو نہ سرچشمہ
وہ فن ہے صاحبِ فکر و نظر کی رسوائی
ترے وجود پہ وہ فن ہے اک مکمل طنز
وہ فکر ڈھونڈھ جسے زندگی بھی پیار کرے
وہ شعر لکھ جو ترے غم کو تابدار کرے
جو تیری آنکھ میں پیدا نیا خمار کرے
جو تیرے عہد تمنا کو استوار کرے

میں تیرے عہد کی مجبوریوں سے واقف ہوں
تری حیات کی الجھن سے بے خبر تو نہیں
میں تیرا درد، ترا کرب، فن سمجھتا ہوں

اسیر کب سے ہے ان خوں چکاں اندھیروں میں
ترے شعور کی نازک کرن سمجھتا ہوں
وہ شعر تو نے سجایا جسے سرِ قرطاس
اسے بھی میں ترا زخم بدن سمجھتا ہوں

تجھے خبر نہیں لیکن یہ حزن و مایوسی
حیاتِ نو کے مسائل کا حل نہیں پیارے
وہ فن کچھ اور ہو معراجِ فن نہیں جس میں
نشاطِ فکر و سرورِ عمل نہیں پیارے
یہ بات فخر کے قابل نہیں کہ تیری نظر
فریب خوردۂ ذوقِ غزل نہیں پیارے
نوائے یاس کو اس والہانہ پن سے نہ چھو
یہ اک شرارتیاں ہے کنول نہیں پیارے

دلائیے نہ روایات کا اگر احساس؛
وہ تجربہ ہو نیا بھی تو خوش گوار نہیں
کبھی نہ ان کو بتانا وسیلۂ اظہار
وہ لفظ جن کو معانی پہ اختیار نہیں

یہ اکھڑے اکھڑے سے لہجے یہ بے محل فقرے
یہ اُلجھے اُلجھے سے اسلوب منتشر سے خیال
یہ نظمیں، قوتِ ترسیلِ فکر سے محروم
شعور کی یہ کمی، تجربے کی ناداری!!
مشاہدے کا یہ فقدان یہ ہنر کا زیاں
یہ لفظ لفظ کا مفہوم پوچھنے "ایہام"
یہ جادہ جادہ بھٹکتے خیال کے ابلاغ
اشاریت کے افق گہری دھند میں ڈوبے
دبیز کہر میں ملفوف شعر کا مفہوم
معانی اپنے رخوں پر نقاب ڈالے ہوئے
میں دیر سے ہوں اسی اک طویل سوچ میں گم
ندیم: کیا یہی ہونا تھا شاعری کا مآل
بُرا نہ مانے اگر تو تو ایک بات کہوں
کہ یہ فضائے سخن تجھ کو سازگار نہیں
ترے چمن کو سزاوار یہ بہار نہیں

جدید نسل کے اے با وقار شہزادے
سخن کی مملکتِ نو کا تاج دار ہے تو
ترے خیال کی گرمی ہے انجمن کا چراغ
ہنر کی آبرو ہے، فن کا اعتبار ہے تو

اُردو شاعری میں جمہوریت اور سوشلزم کا تصوّر



ـــــ چند تاثرات

جمہوریت اور سوشلزم جدید اُردو شاعری کے بنیادی موضوعات ہیں۔ اس لئے کہ ہماری قومی شاعری پر ان سیاسی نظریات کا خاصا گہرا اثر رہا ہے۔ جمہوریت کا تصور شروع شروع میں خاصا مبہم اور غیر واضح تھا۔ اسی طرح سوشلزم کو بھی کمیونزم سے الگ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انقلاب روس کی کامیابی کے بعد اس صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان میں سوشلسٹ خیالات مقبول ہونے لگے تھے۔ اقبال کی خضرِ راہ جسے آل احمد سرور نے اُردو شاعری کا New Testament کہا ہے، ۱۹۲۱ء میں منظرِ عام پر آئی۔ حسرت موہانی نے بھی اسی زمانے میں اپنے اشعار میں اشتراکی قدروں کو پیش کرنا شروع کیا اور انہوں نے سوویت کے ڈانڈے عربی سوویت سے ملا دیئے۔ پہلی آل انڈیا اشتراکی کانفرنس ۱۹۲۶ء میں کانپور میں ہوئی اور اس کا خطبۂ استقبالیہ حسرت موہانی ہی نے پڑھا۔ یہ شعر انہیں سے یادگار ہیں ؎

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جورِ بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں
کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا

اب تک ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور تحریک آزادی عوامی رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔ چناں چہ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو سوشلزم کے خیالات جو پہلے سے فضا میں موجود تھے، ہمارے شعر و ادب پر پوری طرح چھا گئے۔

اُردو شاعری میں انسان دوستی، حب الوطنی، سامراج دشمنی اور آزادی کا جذبہ پہلے سے موجود تھا، لیکن ۳۶-۱۹۳۵ء میں جب دنیا دوسری جنگ عظیم کا بھیانک خواب دیکھ رہی تھی اور فاشزم کا خطرہ روز بروز بڑھ رہا تھا تو ضرورت تھی کہ جمہوری اقدار اور طرزِ فکر پر زور دیا جائے۔ ترقی پسند تحریک نے یہ کمی بڑی حد تک پوری کی اور ادیبوں اور شاعروں کو ایک واضح نصب العین دیا۔ انجمن کے پہلے اعلان نامے میں اس بات پر خصوصاً زور دیا گیا کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے گا۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔" ان الفاظ میں سوشلسٹ سماج کے مقصد کو سامنے رکھنے کی طرف کھلا ہوا اشارہ موجود تھا۔ ترقی پسند مصنفین اس یقین کی دولت سے مالا مال تھے کہ امیری اور غریبی کی تقسیم ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ چناں چہ انہوں نے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جس میں سماجی عدم مساوات نہ ہوگی اور جس میں سب کو ترقی کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔

دوسری جنگ عظیم میں سیاسی آزادی کے ساتھ معاشی آزادی کے بھی ہو گئے تھے۔ سوشلسٹ پارٹی، کسان سبھائیں اور ٹریڈ یونینیں وجود میں آ چکی تھیں۔ اور قومی جدوجہد میں حصہ لینے لگی تھیں۔ اس وقت ہندوستان سامراج سے آخری ٹکر لینے کو تیار ہو رہا تھا۔ اور ملک کا ذرہ ذرہ بے چینی کی تصویر بنا

ہوا تھا۔ حسرت موہانی۔ ظفر علی خاں، تلوک چند محروم، اقبال سہیل، جمیل مظہری
احسان دانش، عرش ملسیانی، آزاد انصاری، ساغر نظامی، برق دہلوی، احمق
پھپھوندوی، روش صدیقی، نہال سیوہاروی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری
کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی فیض احمد فیض، جاں
نثار اختر، مجاز، جذبی، علی سردار جعفری۔ احمد ندیم قاسمی، شمیم کرہانی،
علی جواد زیدی، مجروح سلطان پوری، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی
مطلبی فرید آبادی، اختر انصاری، جگن ناتھ آزاد، سلام مچھلی شہری، وامق
جونپوری، رفعت سروش، اختر جمال کی رومانی اور انقلابی آوازیں بھی متوجہ
کرنے لگی تھیں۔ سنہ ۱۹۴۲ کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے بارے میں
شمیم کرہانی نے کئی نظمیں لکھیں اور سامراج کی موت کا اعلان کرتے ہوئے
کہا۔ ؎

تھا زبانوں پہ یہ نعرہ "آشیاں کو چھوڑ دو"
چھوڑ دو اے غاصبو ہندوستاں کو چھوڑ دو

جوش ملیح آبادی نے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" وقت کا پیغام
ان الفاظ میں سنایا۔

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

مخدوم محی الدین نے "انقلاب کو محبوب کی حیثیت سے پیش کیا اور اس کا خیر
مقدم کرتے ہوئے کہا ؎

اے جان نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

نہ تابناکی رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مجروح سلطان پوری کے یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے
میرے کام آگئیں آخرش یہ کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

مجاز انقلاب کے رنگین نوا شاعر تھے۔ ان کی رومانی انقلابیت کے یہ تیور
بھی ملاحظہ ہوں۔

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں
لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں نے ہندوستانیوں سے مشورہ کئے بغیر اعلان کر دیا تھا کہ ہندوستان بھی جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دے گا۔ ہندوستان فسطائیت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ لیکن اس جنگ کو سامراجی جنگ سمجھتا تھا۔ اور اس میں انگریزوں کا ساتھ دینے کے خلاف تھا۔ کئی شاعروں نے جنگ کے خلاف نظمیں لکھیں اور اسی سبب وہ جیل بھیج دیئے گئے۔ لیکن جب روس بھی جنگ میں شریک ہوگیا تو ترقی پسند ادیبوں کی انجمن اسے عوامی جنگ کہنے لگی۔ اور اس میں شرکت پر زور دینے لگی۔ اس سے تحریک کا سیاسی تضاد کھل کر سامنے آگیا اور وہ شاعر بھی جو سوشلسٹ اقدار کو اپنانے کے حامی تھے غیر ملکی سیاست کے مہرے بننے کے خطرے سے اشتراکیت سے دور ہونے لگے۔ ترقی پسند تحریک نے سوشلسٹ اقدار میں یقین کی جو مقدس آگ روشن کی تھی، اور سماجی مساوات کے مقصد کو پالینے اور آگے بڑھنے کا جو ولولہ دیا تھا۔ اس کا رہا سہا زور بھی ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے بعد ختم ہوگیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سوشلسٹ نظریات تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ مقبول ہو رہے تھے۔ اور تحریک آزادی اب ختم ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ

ہندوستان کی جنگ آزادی مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کے اصولوں کی مدد سے جیتی تھی اس کا اور مہاتما جی کی شہادت کا اثر ہندوستانی ذہن اور دل پر گہرا تھا۔ ہندوستان میں یہ بات بڑی حد تک تسلیم کر لی گئی تھی کہ اعلیٰ مقصد کے لئے ذرائع بھی اعلیٰ ہونے چاہئیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کی سرکردگی میں سماج کے ایسے سوشلسٹ ڈھانچے کی بنیاد رکھی گئی جو جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومت کے زیر سایہ ارتقا پذیر ہوگا یعنی یہ کہ سماجی انصاف اور معاشی مساوات کے لئے جبر و تشدد سے کام نہیں لیا جائے گا بلکہ فرد کو آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ پرانے ترقی پسند اس کے بعد دو گروہوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو وطن دوستی کو مقدم رکھتے تھے اور دوسرے وہ جو کمیونزم کے حامی تھے۔ کچھ آگے چل کر یہ تقسیم بھی بڑی حد تک ختم ہو گئی اور دونوں کے ہاں وطنیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ حکومت پر نکتہ چینی بھی ملنے لگی۔ مجروح کے ان اشعار میں اپنے ہم وطنوں کی سامراجیت کی طرف کھلا اشارہ موجود ہے۔

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ
سر پر ہوا ہے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجرِ فرنگ
سینے پہ زخم نو بھی ہے داغِ کہن کے ساتھ
ہشیار سامراج : کہ زنجیرِ ایشیا
ٹوٹے گی تیرے سلسلۂ جان و تن کے ساتھ
بھڑکی ہوئی یہ آگ مرے لالہ زار کی
پھونکے گی تجھ کو خون بھرے پیرہن کے ساتھ

جاں نثار اختر کی نظم امن نامہ اگرچہ امن کے موضوع پر ہے لیکن اس کے بعض حصے نظر کی وسعت اور تصور کی سالمیت کے اعتبار سے غیر طبقاتی سماج کی مسرتوں کا سہانا خواب بن گئے ہیں ؎

پلا ساقیا بادۂ خانہ ساز
کہ ہندوستاں پر ہے ہم کو ناز
محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں ۔۔۔
ہری کھیتیاں لہلہاتی رہیں
جواں لڑکیاں گیت گاتی رہیں
لہکتا رہے سبز میداں میں دھان
زمینوں پہ جھکتے رہیں آسمان
دہکتی رہے پاک ہولی کی آگ
رہیں کھیلتی ناریاں پی سے پھاگ
سدا گائے رادھا کنھیا کے گن
مچلتی رہے بن میں مرلی کی دھن
فضا روشنی میں نہاتی رہے
ہماری زمیں جگمگاتی رہے
رہے شاد آباد جمنوں کی دھوم
رہیں آنگنوں میں چھکتے نجوم
سلامت رہے کاجلوں کی لکیر
سلامت رہیں نرم نظروں کے تیر
رہے دھوم ٹیگور و اقبال کی
رہے شان پنجاب و بنگال کی
سدا زندگانی غزل خواں رہے
زمانے میں غالب کا دیواں رہے
دہکتا رہے اپنے دیپک کا راگ
کلیجوں میں لگتی رہے نرم آگ

نئے سماج کے تعمیری پہلو کا ذکر کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں۔

کہسار میں تیشہ جو کھلا چھوڑ دیا ہے
ہم نے دلِ ہر سنگِ گراں توڑ دیا ہے
اے وقت کی رفتار ذرا دیکھ کہ ہم نے
دو روز میں دریاؤں کا رخ موڑ دیا ہے
پیروں میں غلامی کی جو زنجیر نہیں ہے
لب پر گلۂ گردشِ تقدیر نہیں ہے

آزاد! مگر جس سے گریزاں ہوئی ظلمت
تنویر کی تمہید ہے تنویر نہیں ہے

سکندر علی وجد نے نئے ہند کی نوید سناتے ہوئے کہا ؂

اُڑتی ہیں گردِ راہ کی مانند منزلیں
بے باک رخشِ عمر جو گرمِ سفر ہے آج
اک دل نواز خواب حقیقت میں ڈھل گیا
نخلِ امیدِ اہلِ نظر بارور ہے آج
محسوس ہو رہا ہے انوکھا سہانا پن
اک سادہ جھونپڑا ہی سہی، اپنا گھر ہے آج
سوداگرانِ طوق و سلاسل چلے گئے
اے وجد، لطفِ عرضِ متاعِ ہنر ہے آج

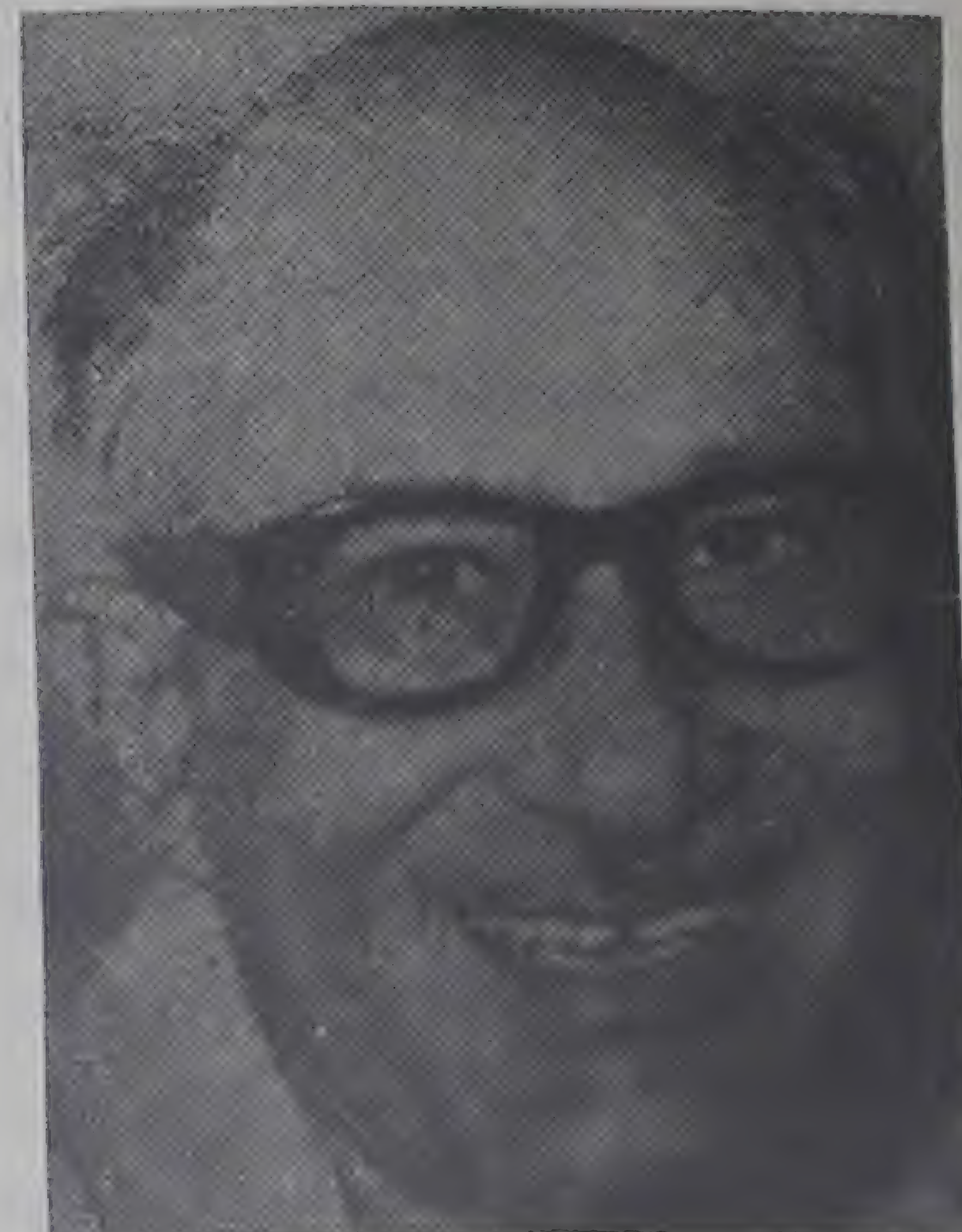
آزادی کے بعد شاعروں کی جو نئی نسل سامنے آئی اسے چھوٹتے ہی خون کے دریا سے گذرنا پڑا تھا۔ ایک طرف فسادات، خونریزی اور ہجرت کے مسائل تھے اور دوسری طرف اُردو کے حقوق کی پامالی چناں چہ شعر و ادب میں مایوسی، بے بسی اور شکست خوردگی کے جذبات عام ہو گئے اور میر اور سودا کی لے پسند کی جانے لگی۔ وجودیت Existentialisim کے خیالات جو یورپ اور امریکہ میں ثقافتی انتشار اور صنعتی حشر سامانی کی وجہ سے مقبول تھے۔ اُردو میں اب ان کے لئے راہ کھل گئی۔ اور نئی نسل کے اکثر ذہین شاعر ان سے متاثر ہونے لگے۔ اس طرح جو شاعری شروع ہوئی۔ اسے اصطلاح میں نئی شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ شاعری سماجی معنویت کی شاعری نہیں اس لئے جمہوریت، سوشلزم وغیرہ موضوعات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ یہ لوگ اپنے آدرشوں کے مارے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے بنیادی سوال یہی ہے کہ زندگی کی غرض و غایت کیا ہے؟ ان کے گرد ایک طرف تو وہ خواب ہیں جو ہمارے مقصدی اور قومی شاعروں نے دیکھے تھے۔ جس کی کوئی اچھی تعبیر آزادی کے باوصف اب تک نہیں نکلی۔ قول و فعل کا تضاد، غربت اور بھوک اور سماجی نابرابریاں اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ دوسری طرف صنعتی دور میں انسان کی انفرادیت کو باقی رکھنے اور اس کی شخصیت کی وحدت کو شکست و ریخت سے بچانے کا مسئلہ ہے۔ موجودہ دور تہذیب کے زوال، قدروں کی پامالی اور یقین کے فقدان کا دور ہے۔ صنعتی ترقی سے انسان کے دل کی ویرانی میں اضافہ ہی ہوا ہے اور زندگی اپنی وحدت کے احساس سے بھی محروم ہو گئی ہے۔ آج انسان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا زندگی بے معنی ہے اور کیا خوشی اور غم واقعی کوئی وجود نہیں رکھتے۔ ان موضوعات پر جن شاعروں نے فنی خلوص سے قلم اٹھایا ہے وہ خاصے کامیاب رہے ہیں اور انھوں نے زبان کے علامتی امکانات کی توسیع بھی کی ہے۔ لیکن جو شاعر جدت کے نام پر بعض الفاظ کا انبار لگانا جانتے ہیں ان کی شاعری مجذوب کی بڑ ہو کر رہ گئی ہے۔ آزادی کے بعد افادی اور مقصدی ادب کے خلاف جو رد عمل شروع ہوا تھا، نئی شاعری اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اُردو میں قومی اور تعمیری نظمیں اگرچہ اب بھی لکھی جا رہی ہیں اور ان میں جمہوری اور سوشلسٹ اقدار کی جھلک بھی ملتی ہے۔ لیکن ایسی نظموں کی تعداد بہت کم ہے۔

ہماری اردو شاعری کی عام فضا اس وقت شکست خوردگی، بے یقینی، اور مایوسی کی ہے، اور آزادی کے وقت جو امید کی گئی تھی کہ نئے دور کی شاعری اپنے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کرے گی۔ خوابوں کی تاجر بھی ہو گی۔ اور حقائق کی رسیا بھی اور ذاتی اور سماجی دونوں مسائل کی ترجمانی کرے گی، تو وہ خواب ابھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ہے۔ ●●

خواجہ احمد عباس

پردۂ سیمیں پر

اندھیرا اُجالا



لائٹس آن
لائٹس آف
روشنی جلاؤ
روشنی بجھاؤ

اُجالا اندھیرا۔ پھر اُجالا۔ پھر اندھیرا۔

فلم کا سارا کھیل اندھیرے اُجالے کا کھیل ہے۔ چاہے فلم کالی اور سفید ہو یا رنگین — اور آج کل تو رنگین فلموں کا ہی زمانہ ہے۔ ہر فلم روشنی اور اندھیرے کے تناسب اور ترتیب سے ہی تخلیق ہوتی ہے۔

فلم کی کہانی میں بھی جذباتی اُجالے اور اندھیرے — دونوں کی موجودگی ضروری ہے۔ کم سے کم ہندوستان اور دوسرے ایسے ایشیائی ملکوں کے فلموں میں بیک وقت کامیڈی اور ٹریجڈی، رومانس اور مار دھاڑ ہیرو اور ولین، ہیروئین اور ویمپ، گانا اور ہنسنا اور رونا رُلانا ان سب عنصروں کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں کامیاب فلم چوں چوں کا مربہ ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں نہ تو تھیٹر ہے نہ آپیرا ہے نہ میوزک ہال ہیں نہ ڈانس ہال۔ سب کچھ سینما ہی میں ملتا ہے۔ اس لئے لوگوں کو بھی ایسی فلموں کو دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ جن میں جذباتی کہانی، کامیڈی، سماجی مقصد، مار دھاڑ اور ناچ گانے سب کچھ ہوں۔

مگر اس وقت میں جس اُجالے اور اندھیرے کا ذکر کر رہا ہوں وہ فنی اُجالا اور اندھیرا ہے، معیار کی اونچ نیچ ہے ... اچھے فلم دیکھنے والوں کے دل و دماغ کو روشن کرتے ہیں، بُرے فلم اِن ہی دلوں اور دماغوں میں اندھیرا کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے بھی سینما اُجالے اندھیرے کا کھیل ہے۔ ہر ملک کے فلموں کے معیار میں یہ اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ کبھی امریکن فلموں کا دور تھا تو کبھی انگریزی فلموں کا، کبھی روسی فلموں کا اور کبھی فرنچ اور کبھی اٹالین فلموں کا۔ پولش فلموں کے دور کے بعد جاپانی فلموں کا دور آیا اور اب ساری دُنیا چیکوسلواکیہ کے فلموں کی گرویدہ نظر آتی ہے۔

اسی طرح ہندوستانی سینما میں بھی کبھی معیاری فن کا اُجالا ہوتا ہے کبھی بدذوقی اور پست مذاقی کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دور ہندوستانی فلم کی تاریخ میں اندھیرے کا دور ہے۔ کبھی ہم "دیوداس" "دُنیا نہ مانے" اور "آدمی" جیسے معنی خیز، سنجیدہ اور فن کارانہ فلم بناتے تھے پھر "خزانچی" اور "کھڑکی" اور "شن شنا کی ببلا بو" جیسی فلمیں بنیں۔ ایک بار پھر ہندوستانی سینما نے کروٹ لی اور "پاتھر پنچالی" "دو بیگھہ زمین" "آوارہ" "بوٹ پالش" "مرزا غالب" اور "منا" جیسی سیاسی فلمیں بنائیں اور اس کے بعد پھر رنگین فلموں کا دور آیا اور ہم نے اس رنگینی کے چکر میں پڑ

کہ آرٹ، مقصد، کردار نگاری، اداکاری سب کو پس پشت ڈال دیا۔

کچھ دن تو رنگین فلموں کا یہ حال رہا جیسے کسی بچّے کے ہاتھ میں کھیلنے کے لیے رنگوں کا ڈبہ آگیا ہو اور جو بے سوچے سمجھے سفید کینوس پر لال، نیلے پیلے، ہرے رنگ بکھیر رہا ہو۔ رنگین فلم مہنگا ہے۔ اگر کالی اور سفید فلم کی شوٹنگ کے لیے اور پچاس کاپیوں کے لیے دو لاکھ کی خام فلم چاہیے تو رنگین فلم کے لیے دس لاکھ کی خام فلم چاہیے۔ اس لیے رنگین فلم بنانے والے کسی قسم کا فنی تجربہ کرنے سے گھبراتے ہیں۔ رنگین فلموں میں خوبصورت اور مقبول فلم اسٹاروں کو بڑی بڑی قیمتیں دے کر لیا جاتا ہے، مہنگے میوزک ڈائرکٹروں سے موسیقی اور گانے لیے جاتے ہیں، رنگین فلموں کے لیے بڑے شاندار اور مہنگے سیٹ بنائے جاتے ہیں۔ ڈانسروں پر اور لباسوں اور آرائش کے سامان پر بہت روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اس طرح رنگین فلموں کی لاگت تیس لاکھ سے چالیس، چالیس سے پچاس لاکھ، ساٹھ ستر لاکھ تک پہنچ گئی ہے — یا پہنچ گئی تھی!

رنگین فلم بنانا تو آسان ہے — یا تھا! رنگین فلم، مقبول فلم سٹار، مشہور میوزک ڈائرکٹر، ناچ گانے، شاندار سیٹ، بھڑکیلے لباس اور مہنگی آرائشیں۔ یہ ہے کامیابی کا فارمولا۔ ڈسٹری بیوٹر فلم کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں — یا لیتے تھے! سینما گھروں کے مالک ان رنگین فلموں کو بڑی خوشی سے چلاتے ہیں — یا تھے! عام فلم بین ان فلموں کو پسند کرتے ہیں — یا کرتے تھے! اس "ہیں" اور "تھے" میں ہندوستانی سینما کی ساری کہانی سمٹی ہوئی ہے — اور عام ہندوستانی فلموں کی طرح یہ کہانی ٹریجڈی بھی ہے اور کامیڈی بھی!

ہندوستانی فلموں کا مارکیٹ چھ علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ دلی یوپی ملا کر ایک علاقہ۔ بنگال آسام اڑیسہ بہار ملا کر دوسرا علاقہ۔ وسط ہند جس میں راجستھان، مدھیہ پردیش وغیرہ شامل ہیں۔ تیسرا علاقہ۔ جنوب کی ریاستیں یعنی آندھرا، تامل ناڈ، میسور، کیرلا۔ چوتھا علاقہ مشرقی پنجاب۔ پانچواں علاقہ۔ اور اوورسیز یعنی بیرونی ممالک کا چھٹا علاقہ۔ جس زمانے میں رنگین فلموں کی بڑی مانگ تھی۔ ہر علاقے کے لیے بڑے اور مشہور فلم اشاروں والی رنگین فلم سات لاکھ سے لے کر بارہ لاکھ میں بک جاتی تھی۔ لیکن فلم بیچنا آسان ہے۔ یا آسان تھا۔ اُس کا چلنا، باکس آفس پر مقبول ہونا، منافع کمانا یہ دوسری بات ہے۔ اس کا دارو مدار عوام کے مذاق پر یا بدمذاقی پر ہے۔ یعنی وہ کیسی فلمیں پسند کرتے ہیں اس پر ہے۔ عوام کی جیب میں کتنے پیسے ہیں یعنی اُن کی اقتصادی حالت کیسی ہے اس پر ہے۔ اور ۱۹۶۷ء میں جتنے ہندوستانی فلم ریلیز ہوئے — اور ان میں زیادہ تر رنگین فلم ہی تھے وہ باکس آفس پر فیل ہو گئے۔ نہ فلم اسٹار چلے نہ فلموں کی رنگینی، نہ ناچ نہ گانے۔ نہ عالیشان سیٹ نہ کشمیر اور سوئٹزرلینڈ کے سین۔ ڈسٹری بیوٹروں کو بڑا سخت نقصان ہوا۔ انہوں نے "ہائے واویلا" مچائی۔ وسط ہند کے ڈسٹری بیوٹروں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم تو بڑے سے بڑے سٹاروں کی فلم کو بھی ساڑھے چھ لاکھ سے زیادہ میں نہیں خریدیں گے۔ اور وہ بھی اڈوانس پر۔ یعنی اگر نقصان ہوا تو وہ پروڈیوسر کو پورا کرنا پڑے گا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے علاقے کے ڈسٹری بیوٹروں نے بھی ایسے ہی فیصلے کر لیے۔ ایک دم فلموں کی قیمتیں پہلے سے آدھی ہو گئیں۔ اب پروڈیوسر خرچ کم کریں تو کہاں کریں۔ آمدنی بڑھائیں تو کیسے؟ فلم کی آمدنی کا کافی حصہ تو انٹرٹینمنٹ (تفریح) ٹیکس کے ذریعے حکومت کو جاتا ہے۔ باقی سینما کے مالک اپنے سینما کے کرائے میں لیجاتے ہیں۔ ڈسٹری بیوٹر اور پروڈیوسر کے حصے میں بہت ہی کم آتا ہے۔ کبھی کبھی تو ان کو جیب سے ڈال کر سینما کا کرایہ پورا کرنا پڑتا ہے یا کرنا پڑتا تھا! اس لئے پروڈیوسروں نے کم سے کم بمبئی کے سینما کے مالکوں سے یہ بات منوالی ہے کہ وہ سینما کا کرایہ نہ لیں، بلکہ ایک فلم سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ اس کا Percentage لیں یعنی ساجھی ہو جائیں صرف منافع خور نہ رہیں۔

موجودہ صورتِ حال معنی خیز بھی ہے مضحکہ انگیز بھی ہے۔ کامیڈی بھی ہے اور ٹریجڈی بھی۔ بمبئی کے سینما تو مہینہ بھر کے جھگڑے کے بعد کھل گئے ہیں۔ لیکن اسٹوڈیوز اب بھی بند ہیں۔ پروڈیوسر بیک وقت چو مکھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ گورنمنٹ کے انٹرٹینمنٹ ٹیکس کے خلاف، ڈسٹری بیوٹروں کے خلاف کہ وہ قیمتیں کم نہ کریں۔ اور اڈوانس پر اصرار نہ کریں، Exibitors یعنی سینما گھروں کے مالکوں کے خلاف کہ وہ اپنے

ینما کا معاوضہ کم کریں، اور اپنے ہی سٹاروں کے خلاف کہ وہ بھی اپنا معاوضہ کم کریں اور اب تو یہ لڑائی ہیچ ملکی ہو گئی ہے کیوں کہ اب پروڈیوسروں میں بھی پھوٹ پڑ گئی ہے۔ بڑے پروڈیوسر ایک طرف ہو گئے ہیں۔ چھوٹے پروڈیوسر دوسری طرف۔

پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے اس صورت حال کو یوں بیان کیا تھا کہ آپس میں مال تقسیم کرنے پر پھوٹ پڑ گئی ہے اور اب وہ جھگڑ رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پروڈیوسروں کا کیا ان کے سامنے آ رہا ہے اور اب وہ بوکھلا گئے ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔

اس ماحول میں سینما کے فنی معیار اور مقصد کی بات کون سوچتا ہے۔ اور کون سوچ سکتا ہے ؛ لوگ کہتے ہیں اور خود فلم پروڈیوسر کہتے ہیں کہ فلم سازی تو ایک تجارت ہے، ایک انڈسٹری ہے، ایک بیوپار ہے۔ مگر یہ انڈسٹری انوکھی ہے۔ یہ لاکھوں کروڑوں کو ہنسا بھی سکتی ہے۔ رُلا بھی سکتی ہے اور کبھی کبھی سوچنے پر مجبور بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے کہ یہ بیوپار ہوتے ہوئے بھی ایک آرٹ ہے۔ بہت عظیم آرٹ۔ بہت خطرناک آرٹ جس سے عوام کے مذاق سلیم کی تربیت بھی ہو سکتی ہے اور عوام کو پستی، بد مذاقی، سستی شہوانیت کی طرف ڈھکیلا بھی جا سکتا ہے۔

کچھ سرپھرے ایسے بھی ہیں جو اس تجارتی ماحول میں بھی مقصد اور فنی معیار کی بات سوچتے ہیں، ایسی فلمیں بنانے کی کوشش کرتے ہیں جو تجارتی اعتبار سے کامیاب ہوں یا نہ ہوں، مقصد کے اعتبار سے معنی خیز اور ترقی پسند ہوں اور فنی اعتبار سے خوبصورت اور پاکیزہ ہوں۔ تجارت کے اس اندھیرے میں بھی کہیں آرٹ کی ننھی ننھی کرنیں پھوٹ نکلتی ہیں مثلاً اس ۱۹۶۷ء میں جب پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ لاکھ روپے کی تجارتی، ناچ گانے کی فلمیں بری طرح فیل ہو رہی تھیں چیتن آنند نے ایک چھوٹی سی کالی اور سفید فلم بنا لی۔ جس کا نام تھا "آخری خط" جس میں کوئی مشہور اسٹار نہیں تھا بلکہ جس کا ہیرو ڈیڑھ برس کا ایک ننھا بچہ تھا۔ مگر اس فلم میں جذباتی اور فنی دلکشی اس قدر تھی کہ یہ فلم کافی حد تک پسند کی گئی اور کئی علاقوں میں تو بہت سی رنگین اور بڑے بڑے سٹاروں کی فلموں سے زیادہ کامیاب رہی۔ اس سے پہلے ایسی ہی ایک تصویر مرحوم شیلندر نے بنائی تھی۔ "تیسری قسم" معمولی دیہاتی لوگوں کی سیدھی سادھی مگر معنی خیز کہانی یہ ایک مشہور ہندی افسانے پر مبنی تھی۔ سال رواں کی بہترین فلم کی حیثیت سے اس کو پریسیڈنٹ گولڈ میڈل بھی ملا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ تجارتی اغراض نے اس فلم کا گلا گھونٹ دیا اور اتنا بڑا فنی اعزاز ملنے کے بعد بھی کتنے ہی علاقوں میں ریلیز نہ ہو سکی۔ بمبئی شہر میں جہاں یہ فلم بنی تھی وہاں بھی ریلیز نہ ہو سکی۔ فن اور تجارت کی کشمکش کی معنی خیز اور عبرت انگیز مثال اس سے بہتر نہیں مل سکتی۔

بعض من چلے اور فن کے ماہر جو سینما کے تجارتی پہلوؤں پر قابو رکھتے ہیں کبھی کبھی اچھی اور مقصدی کہانیاں لے کر ان کی بنیاد پر ایسے فلم بنا پاتے ہیں جو مقصد، آرٹ، اور باکس آفس — تینوں دھاراؤں کا سنگم ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے فلم شاذ و نادر ہی بن پاتے ہیں اور ان میں بھی آرٹ کا پہلو مقابلتہً کمزور ہوتا ہے۔ راج کپور کا "سنگم" ایسے فلموں کی ایک مثال تھا۔ اچھی جذباتی کہانی، پر اثر مکالمے۔ باکمال اداکاری — بہت اچھی تکنیک — ان سب پر مقبول عام گانوں اور ناچوں اور شاندار سٹینگز اور خوبصورت بیرونی مناظر کا ایسا ملمع چڑھایا کہ فلم نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ ایک اور مثال منوج کمار کی ڈائرکٹ کی ہوئی فلم "اپکار" ہے جس کی حیرت انگیز کامیابی کا راز اس کی کہانی باموقع اور بامقصد مکالمے، وطن پرستی کا جذبہ اور ساتھ ہی سطحی قسم کا میلو ڈرامہ اور سستی قسم کی جذباتیت تھی۔ مگر ایسی فلمیں تو کبھی کبھی بنتی ہیں۔

پروڈیوسر پریشان ہیں۔ بوکھلائے ہوئے ہیں، گھبرائے ہوئے ہیں۔ وہ کامیاب فلم بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کم خرچ فلم بنانا چاہتے ہیں۔ ان میں سے چند اچھے بامقصد فلم بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ان میں سے بہت کم ہیں جو سچائی کا سامنا کرنا چاہتے ہیں۔ یا سچائی کا سامنا کرنے کی جرات رکھتے ہیں اور سچائی یہ ہے کہ رنگینی، بڑے بڑے اور لاکھوں معاوضہ لینے والے اسٹار اور میوزک ڈائرکٹر، دس دس بارہ بارہ گانے، پچاس پچاس لڑکیوں کے گروپ ڈانس، سوئٹزرلینڈ، اور کشمیر کے خوبصورت مناظر۔ ان سب چیزوں کے باوجود فلمیں ناکام ہو رہی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک عنصر یا ان عناصر کا مجموعہ — فلم کی کامیابی کا ضامن نہیں ہے۔ تو کیا اب وقت نہیں آ گیا ہے کہ اسٹارز اور میوزک کو چھوڑ کر پروڈیوسر کہانی کی طرف توجہ دیں کہانی دلچسپ ہو۔ معنی خیز ہو، عوام کی زندگی کی جھلک ہو اس میں اور اسے دلچسپ خوبصورت انداز میں پیش کیا جائے جب مہنگے فارمولے فیل ہو رہے ہوں تو یہ سستا فارمولا کیوں نہ آزمایا جائے۔ شاید اسی میں پردہ سیمیں کی نجات ہے !

ندرت کانپوری

غزل

مشغلے کا یہ عالم، روشنی کا نازک دور
شعر و فن کے چرچے ہیں، زندگی کا نازک دور

وہ بتوں کے جھرمٹ میں، گمرہی کا نازک دور
عالمِ جوانی تھا، زندگی کا نازک دور

طے کیا ہے میں نے بھی مرحلہ محبت کا
آپ نے بھی دیکھا ہے بے خودی کا نازک دور

وہ شکستِ پیہم بھی کیا شکستِ پیہم تھی
بزمِ نازِ جاناں تک نارسی کا نازک دور

یہ بہارِ گلشن بھی، قابلِ تاسف ہے
بے ثبات ہے کتنا، دلکشی کا نازک دور

منزلِ محبت میں، ہر طرف وہ سناٹا
دوست کے تجسس میں، رہروی کا نازک دور

ایک قطرۂ مے کو، ہم ترس گئے ساقی
یاد ہے ابھی ہم کو، تشنگی کا نازک دور

دیکھتا ہوں آنکھوں سے اور دم بخود ہوں میں
یہ بزمِ فن کاری، شاعری کا نازک دور

بھولتا نہیں ندرت یاد آہی جاتا ہے
دوستی کے پردے میں دشمنی کا نازک دور



سلام مچھلی شہ

مسئلہ

زندگی آج بھی اک مسئلہ ہے
نہ تخیل،
نہ حقیقت،
نہ فریبِ رنگیں، —!!
گیت قربان کیے،
شعلۂ دل نذر،
نغمۂ خواب دیے،
پھر بھی یہ مسئلہ ہے —!
گیت، موسم کا،
حسیں جسم کا،
خوابوں کا — جسے
میں نے اور میرے ہی ہمعصروں نے گایا تھا۔ اُسے،
زندگی سنتی نہیں،
سُن کے بھی ہنس دیتی ہے —!
آگ،
جذبات کی آگ،
دلنشیں،
شبنمیں،
معصوم خیالات کی آگ،
اپنے قصبے کی کسی درد بھری رات کی آگ،
زندگی آج بھی ہر آگ پہ ہنس دیتی ہے۔
کون جانے کہ مری طرح ہو مرغوب اسے
دردِ دل — نشۂ مے!
— زندگی آج بھی اک مسئلہ ہے۔

اور اسے حل ہونا ہے۔
میں اگر نزع میں ہوں
کل اسے کل ہونا ہے
دل یہ کہتا ہے کہ لے جائے جہاں، رات، چلو
اور "سائنس" یہ کہتی ہے، مرے ساتھ چلو



جیلانی بانو

آرٹسٹ لوگ

اچھا تو یہ ہیں اتنی بڑی مصور ـــــ ؟

مسز کرپال سنگھ نے بڑے غور سے اپنی نئی پڑوسن کو دیکھا۔ اس پڑوسن کے بارے میں انھوں نے سن رکھا تھا کہ وہ بہت بڑی آرٹسٹ ہے۔

اتنی دیر میں کرپال سنگھ ان کے لیے کار کا دروازہ کھول چکے تھے۔ اندر بیٹھنے کے بعد انھوں نے اپنی پیور سلک کی ساڑی سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کسی دن اس کے گھر جا کر ملوں گی۔ جانے کیسی آرٹسٹ ہے صورت سے تو بڑی گنوار لگتی ہے"

"تمھیں بڑی ہی فکر ہے ساری دُنیا کے آرٹسٹوں کی"، کرپال سنگھ نے کار اسٹارٹ کی۔ اپنی کھڑکی میں کھڑے کھڑے ثریا نے اس خوبصورت جھلکتے دمکتے جوڑے کو دیکھا تو اُسے مسز سنگھ بہت پسند آئی۔ کتنا سڈول بدن تھا۔ کپڑوں کا میچ کتنا اچھا تھا اور میک اپ۔ کیسے سلیقے سے کیا تھا؟

ثریا آرٹسٹ تھی۔ ایسے وہ جس پر نگاہ ڈالتی اس کے خدوخال اس کی نظروں میں بس جاتے تھے، ہر انسان اس کے لیے کسی دوسرے آرٹسٹ کی تصویر تھا۔ وہ بڑے غور سے اس کے عیب اور خوبیاں دیکھتی تھی۔

"رنگ گھولنے کے سوا کچھ اور بھی ہے اس سر میں ـــــ ؟ صمد اس کا سر ہلا کے کہتا تھا تو وہ ہنس پڑتی۔ مگر بعض وقت سنجیدگی سے سوچتی کہ اب وہ صمد کی بیوی ہے، لہٰذا اُسے اپنے آپ کو کچھ بدلنا چاہیے۔ لیکن اس کے پاس اچھے اچھے کپڑے تھے نہ میک اپ کا سامان تھا اور نہ اتنا فاضل وقت تھا کہ وہ گھنٹوں صمد کے پاس بیٹھی شادی کے نئے نئے دنوں والے چونچلے بگھارے۔

شادی سے پہلے صمد اس کے اسی والہانہ شوق پر ہی تو مرتا تھا۔ حالاں کہ وہ صمد کی شاگرد تھی اور کبھی خواب میں بھی نہ سوچ سکتی تھی کہ اتنا مشہور آرٹسٹ اس جیسی معمولی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے لیکن طویل رومان اور بے شمار الجھنوں کے بعد ان کی شادی ہوئی تو لوگ کہتے پھر رہے تھے۔

"ان دو آرٹسٹوں کا سنجوگ، مارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔"

عام طور پر ہونہار آرٹسٹوں کی شادی ہو تو لوگ اُن کے فن پر فاتحہ پڑھ لیتے ہیں۔ لو بھئی کر لیا انھوں نے جو کچھ کرنا تھا۔ اب یہ حضرت بھی بیوی کے ناز نخروں اور بچوں کی ریل پیل میں ایسے کھے جائیں گے کہ سارا فن ون دھرا رہ جائے گا۔

مگر یہاں تو ایسے مانے ہوئے مصوروں کی شادی ہوئی تھی کہ ایک سے بڑھ کر ایک اپنے فن کا دیوانہ تھا۔ دونوں کو اپنے کام کے سوا اور کچھ یاد نہ تھا۔ ادھر ثریا خان تھی، صرف بائیس برس کی عمر میں اس نے بڑے بڑے آرٹسٹوں سے اپنی صلاحیتوں کو منوا لیا تھا۔ اور پھر صمد اللہ تھا کہ جناب حیدر آباد چھوڑیے بھارت میں اس کی شہرت پھیل رہی تھی۔ بڑے بڑے آرٹسٹ اس کا احترام کرتے تھے۔ ہندوستان کے باہر بھی نمائشوں میں اس کی تصویریں پسند کی جاتی تھیں۔ اس کے فن میں بھارت کی قدیم مصوری کے ساتھ ساتھ نئے بھارت کی جگمگاہٹ بھی تھی۔ تین سال لندن میں رہ کر اس نے اپنے فن

کو اور نکھارا تھا۔

ایسے جب اُن کی شادی کی خبر عام ہوئی تو صمد کے ایک دوست نے لندن سے لکھا۔

" اب تم دونوں مل کر تہلکہ مچا دو گے۔ یہاں لندن میں بھی تمہارے دوست احباب اس خبر سے کافی دہشت زدہ نظر آ رہے ہیں "

حامد کا خط پڑھ کر صمد کھل اٹھا اور ثریا کو اپنی باہوں میں چھپا کر کہا " تو سنا تم نے ثریا رانی ! اب ہم سچ مچ بھارت کے آرٹ کا دھارا بدل دیں گے۔ بہت جم کر کام کرنا ہوگا۔ اب تمہارے ناز نخرے سب ختم۔ حالانکہ ناز نخرے کرنے کی انھیں فرصت ہی نہ ملی تھی۔ ثریا کو بھی ڈر لگا ہوا تھا کہ شادی کے بعد کہیں سسرال والوں نے گھر بار سنبھالنے میں لگا دیا تو کیا ہوگا۔ وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح اپنا کام بھول کر محض بیوی تو نہ بن جائے گی۔ اس خطرے کو ٹالنے کے لئے اس نے صمد سے علیحدہ گھر میں رہنے کی ضد کی۔ صمد بھی خانہ بدوشی سے تھک سا گیا تھا حالانکہ اپنے گھر کا تصور اس کے لئے بڑا عجیب سا تھا اگرچہ جاگیریں ختم ہونے کے باوجود صمد کے باپ نے اپنی ڈیوڑھی بھی نہیں بیچی تھی مگر وہ تو خانہ بدوش تھا۔ آج کسی دوست کے کمرے میں اس کا میلا کمبل بچھا کے سو گیا کل کسی اخبار کے آفس میں میز پر لیٹ کر رات بتا دی کسی یار میں جا بیٹھے تو کبھی کبھی صبح وہیں استقبال کو آ گئی۔

وہ کبھی وقت پر گھر نہیں آیا۔ کبھی سب کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ کسی دن اتفاق سے وہ سرِ شام گھر آ جاتا تھا تو اماں اس کی پیشانی چھو کر پوچھتی تھیں۔

" بیٹا آج کیسے آ گئے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا ——— ؟

وہ اتنا پڑھا لکھا تھا۔ اتنا مشہور مصور تھا مگر خاندان والے اسے بیٹی دیتے ہوئے ڈرتے تھے کہ لوگوں میں تو یہی مشہور تھا کہ خوب شراب پیتا ہے آوارہ گھومتا پھرتا ہے اور جانے کیا اوٹ پٹانگ تصویریں بناتا ہے جن کا سر نہ پیر۔ بھلا تصویروں سے بھی کسی کا پیٹ بھرا ہے !

اس لئے صمد نے سوچا کہ پہلے وہ گھر بنا کے ذرا سا ذہنی سکون پالے تب کچھ کام شروع ہوگا۔ مہینہ بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک مکان تو مل ہی گیا۔ بہت بڑے آدمیوں کی کالونی میں، لیکن اس گھر میں کچھ نہ تھا۔ سوائے دو چار کرسیوں اور دریوں کے۔ البتہ رنگوں، برشوں، تصویروں اور کینوس کا انبار تھا، جن سے گھر کا ہر کمرہ بھر گیا۔ مکان ملتے ہی ثریا اپنے کام میں لگ گئی۔ صمد کے دوست دوسرے کمرے میں خوب ہوحق مچایا کرتے تھے۔ ثریا انہیں برداشت کر لیتی تھی کیوں کہ فی الحال صمد کی ایسی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی کہ ملازم رکھا جائے اور ثریا کو روٹیاں بیلنا نہیں آتا تھا لہٰذا یہ سب کام صمد کے دوستوں نے سنبھال رکھے تھے وہ کہتے تھے کہ بھابی کو اپنا کام کرنے دو۔

شادی کے بعد ثریا ان سب سے ملی تو سمجھی تھی کہ یہ دن بھر ہنسنے ہنسانے والے بے کار لوگ بس یونہی بے روزگار آوارہ ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ سب شہر کے مشہور شاعر، افسانہ نگار اور آرٹسٹ لوگ تھے۔ انہوں نے صرف کتابوں ہی سے علم حاصل نہیں کیا تھا بلکہ دنیا کی ہر تلخی کا مزہ چکھ چکے تھے۔ وہ سب عوام کے چہیتے فن کار تھے مگر کیونکہ وہ سب لازمی طور پر مفلس اور بے روزگار تھے۔ اس لئے ایک دوسرے سے لڑنا، سخت تنقیدیں کرنا، بلکہ پینا اور ساتھ جینا سب پر واجب تھا۔ لیکن باہر کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن کے ساتھی پر کوئی ہلکا سا اعتراض بھی کر سکے۔ لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ صمد پر تو وہ سب جان چھڑکتے تھے کبھی اس کی بُرائی نہ سن سکتے۔ انھیں اپنے اس دوست پر فخر تھا۔ اس کے فن کو نکھارنے، ابھارنے میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

اس لئے جب ثریا اس گھر میں آئی تو ان سب دائمی کنواروں نے اُسے کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ صمد کی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی۔ مگر اس کے دوست شراب اور سگریٹ کا خرچہ گھٹا کے اس کی ضرورتیں پوری کر دیتے تھے۔

ابھی انہیں نئے گھر میں آئے ہوئے ایک مہینہ ہوا ہوگا۔ کہ ایک دن ثریا کی پڑوسن مسز سنگھ اس سے ملنے آئیں۔ کرپال سنگھ فرنیچر کا بزنس کرتے تھے۔ مگر ان دونوں میاں بیوی کو آرٹ سے دلی لگاؤ تھا۔ صمد اور ثریا کی

انھوں نے بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ بلکہ مسز سنگھ تو کالج کے زمانے میں صمد پر مرتی تھی۔ بیچارے صمد کو خبر تک نہ تھی کہ اتنی حسین اور امیر لڑکیوں کی نظر میں اس جیسا بدشکل اور مفلس انسان بھی آسکتا ہے۔

مسز سنگھ کو یوں دری پر بٹھاتے ہوئے ثریا کو بڑی ندامت ہوئی۔ اس نے جھجک کر کہا۔

"معاف کیجئے آپ کو یہاں بٹھانا پڑ رہا ہے۔ ابھی ہم نے فرنیچر نہیں خریدا۔"

"اجی تو اس میں کیا بات ہے۔ آپ کے بھائی تو فرنیچر ہی کا دھندا کرتے ہیں۔ آپ کو جس جس چیز کی ضرورت ہو ہم آپ کے گھر پہنچا دیں گے۔" مسز سنگھ نے بڑی صاف دلی سے کہا۔

ثریا گھبرا گئی کہ اب کیا جواب دے! "جی — مگر ہم ایک دم اتنی رقم خرچ نہیں کر سکتے۔"

"اجی تو انسٹالمنٹ پر خرید لو۔ آپ سے ہمیں کیا بزنس کرنا ہے۔ ہاں تو آپ کو صوفہ سٹ چاہیئے۔ بک شلفس، ڈائننگ ٹیبل اور چیئرز — کل سب سامان آجائے گا۔ دوسرے دن واقعی سب سامان آگیا۔ ساتھ ہی اس کا بل تھا جو پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہی تھا، اور دو سو روپے مہینے کی قسط ادا کرنی تھی۔

بل دیکھ کر ثریا چکرا گئی۔ صمد کو بھی بہت غصہ آیا کہ ان بڑے آدمیوں کی بڑی باتوں کے رعب میں وہ کیوں آ گئی۔ ہمیں فرنیچر اور اس ٹیپ ٹاپ کا کیا کرنا ہے؟ لیکن مسز سنگھ کے اس خلوص بھرے احسان کو ٹھکرانے کی ہمت صمد میں بھی نہ تھی۔ پھر ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اسی ہفتے صمد کو ایک اسٹوڈیو میں کچھ کام مل گیا اور فرنیچر کی قسطیں ادا کرنے کی فکر دور ہو گئی۔

ادھر مسز سنگھ نے فرنیچر کیا بھیجا کہ صمد اور ثریا کو اپنے خلوص میں جکڑ لیا۔ وہ دونوں میاں بیوی بڑے کھرے پنجابی تھے اس نے جس سے ملتے بڑے کھلے دل سے ملتے تھے۔ جسے دوست بناتے اس سے فوراً بے تکلف ہو جاتے تھے۔ مسز سنگھ بے حد زندہ دل اور ہنس مکھ خاتون تھیں زندگی نے انھیں سب کچھ دے رکھا تھا۔ کرپال سنگھ چار پانچ ہزار ماہوار کما لیتے تھے۔ دونوں بچوں کے لئے علیحدہ علیحدہ آیائیں تھیں۔ گھر دیکھو تو ایسا خوبصورت کہ کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہو۔ مسز سنگھ دن بھر اپنے باغ میں بیٹھی کتابیں پڑھتی تھیں یا نٹنگ کرتیں۔ یا پھر مہمانوں کے ساتھ قہقہے لگاتیں۔ ان میاں بی بی کو لوگوں سے ملنے جلنے کا بڑا شوق تھا۔ شہر کے سارے مشہور لوگ۔ گزٹیڈ آفیسر ادیب، آرٹسٹ اور دوسری نمایاں شخصیتوں سے ان کی ملاقات تھی۔ اس طرح کرپال سنگھ نے سرکاری حلقوں میں بھی کافی اثر و رسوخ بڑھا لیا تھا۔ مسز سنگھ دل کھول کر مہمانوں کی خاطر تواضع کرتی تھیں۔ اسی لئے وہ دونوں ثریا اور صمد سے بھی بڑی جلدی بے تکلف ہو گئے۔

اگلے ہفتے کرپال سنگھ نے اپنے ہاں ایک شام کی پارٹی میں ان دونوں کو بلایا تا کہ ان مشہور آرٹسٹوں سے اپنے دوستوں کو ملائیں۔

اس دن ثریا کافی پریشان ہوئی۔ پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے پاس نہایت معمولی ہینڈلوم ساریاں ہیں۔ اچھے کپڑوں پر اس نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ مگر اب مسز سنگھ کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اچھی اچھی ساریاں پہنے۔ اس طرح ایک اچھی سی قیمتی ساری کی معصوم فرمائش پر آج صمد کو بہت شرمندہ ہونا پڑا۔ مگر اس نے اپنی شرمندگی دور کرنے کے لئے ثریا کو خوب بنایا۔

"پگلی وہاں تمہارے کپڑوں پر کون غور کرے گا۔ تم تو فن کار ہو۔ جیسا لباس تم پہنو گی۔ سب اسی کی نقل کریں گے۔"

ثریا نے کچھ نہ کہا۔ مگر آج اس کا عورت پن اپنے مفلس شوہر کو بڑی اُداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بار بار اسے مسز سنگھ پر رشک آرہا تھا۔ ان کے کپڑوں کا انتخاب دیکھ کر یوں لگتا جیسے خوبصورت کپڑے صرف کرپال سنگھ کی بیوی کے لئے ہی بنائے گئے ہیں۔ وہ کوئی ماڈرن گرل لگتی تھیں۔ ثریا نے انھیں اطلاع دیئے بغیر اپنی کئی تصویروں میں ان کا سڈول بدن پینٹ کیا تھا۔

اسی شام صمد اور ثریا وقت سے پہلے ہی کرپال سنگھ کے ہاں پہنچ گئے تھے۔ ثریا بالکل گنواروں کی طرح مسز سنگھ کو پارٹی کا اہتمام کرتے دیکھ رہی تھی۔ آج ثریا نے سفید وائل کی ساری پہنی تھی۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا جس کی وجہ سے (صمد کے کہنے کے مطابق) وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ لیکن مسز سنگھ نے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈال کر مشورہ دیا کہ اتنے بہت سے بالوں کا یہ

سیدھا سادھا جوڑا باندھنے کی بجائے وہ بال کٹوا کر کسی خوبصورت ڈھنگ سے سٹ کروائے تو زیادہ اچھی لگے گی۔ ثریا نے انھیں جواب دینے کی بجائے صمد کی طرف دیکھا۔ کیوں کہ صمد کو اس کے لمبے بال بہت پسند تھے۔ وہ خود بھی جب کبھی کھلے بالوں کے ساتھ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تھی تو اس کی نظریں اپنے بالوں پر سے نہیں ہٹتی تھیں۔

پھر لوگ آنا شروع ہوئے۔

آج صمد کو بہت دنوں بعد اچھی شراب ملی اور ایک ایسا پرانا دوست بھی مل گیا جس کے ساتھ پینا اچھا لگتا ہے۔ اسلئے وہ پوری محفل سے بیگانہ ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھا مگر ثریا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؛ کیونکہ آنے والوں میں کوئی بھی اس کا شناسا نہ تھا۔ مسٹر اور مسز سنگھ آنے والے مہمانوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس لئے وہ ایک تنہا میز پہ ہاتھ رکھے آنے والے مہمانوں کی صورتوں کو دیکھنے لگی۔ اس وقت بھی اس کا ذہن نئے نئے آئیڈیے ڈھونڈھ رہا تھا پینٹ کرنے کو۔

پھر مسز سنگھ نے مختلف لوگوں سے اس کا تعارف کروایا۔

"آپ ہیں مسٹر اور مسز چینانی۔ لکشری ہوٹل کے مالک اور کئی کپڑا ملوں کے حصہ دار ——" "اور یہ ہیں مسز پشپا لتا — بھارت ناٹیم کی مشہور ڈانسر اور اسٹیج ایکٹرس —— اب ان سے ملو ڈاکٹر خان ہارٹ اسپیشلسٹ —— اور آپ —— ڈاکٹر وجے ناتھ نیو کالج کے پرنسپل ——"

ثریا اور صمد مسکرا مسکرا کے ہاتھ ملاتے رہے جب وہ لوگ ان مشہور آرٹسٹوں سے ملے تو بے حد خوش ہوئے۔ صمد سے تو خیر وہ لوگ پہلے بھی مرعوب تھے کیوں کہ انہوں نے دہلی اور دوسرے پرچوں میں صمد کی پینٹنگیں دیکھی تھیں اور اس کی تعریفیں سنی تھیں۔ مسٹر چینانی نے فوراً ثریا کو "ہوٹل لکشری" آنے کی دعوت دی تاکہ ہوٹل کے ڈیکوریشن میں اس کا مشورہ لیا جا سکے —

ڈاکٹر وجے ناتھ نے صمد سے پوچھا کہ وہ لوگ کسی اچھے اسکالرشپ کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے۔ ایسے مشہور آرٹسٹوں کو باہر بھیجنے کے لئے تو گورنمنٹ کی کئی اسکیمیں ہیں۔"

پشپا لتا کی بڑی خواہش تھی کہ صمد اس کا ایک پورٹریٹ بنائے۔

رات کے ایک بجے وہ دونوں گھر آئے تو ثریا بے حد خوش تھی۔ دُنیا میں اُن کی کتنی عزت ہے، کتنی مانگ ہے۔ لوگ اس کی مدد کرنے کو بے چین ہیں اور وہ ہیں کہ اپنے آپ کو اتنا حقیر اور بے بس سمجھتے ہیں۔

"ہمارے فن کے خریدار صرف اونچے طبقے میں ہیں۔ اسلئے ان لوگوں سے ملنا ہی پڑے گا۔" صمد نے بڑی مایوسی سے کہا۔

"ملنا ہی پڑے گا یہ کیوں ——"؛ ثریا کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بات کہتے وقت صمد اتنا اُداس کیوں ہے۔؟

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ ہم اتنے بڑے اور باذوق لوگوں سے ملیں"

"اتنے بڑے —! کتنے بڑے —؟ صمد نے نشہ جھٹک کر آنکھیں جھپکالیں۔

"کتنے بڑے ہیں وہ لوگ! کیا پیسے کے ساتھ ساتھ قد بھی بڑھ جاتا ہے۔ وہ احمق کیا جانیں آرٹ کی دُم —— نرے جاہل۔ صرف فیشن کے لئے ہماری قدر کرتے ہیں۔"

"اونہہ تو اس سے کونسا فرق پڑ جاتا ہے۔ وہ لوگ ہماری قدر کرتے ہیں نا۔"

ثریا جانتی تھی کہ اب نشے ٹوٹنے کی تلخی صمد پر چھا رہی ہے۔ اور بہت دنوں کے بعد پینے کی وجہ سے اُسے اپنی مفلسی کا شدید احساس ہو رہا ہے۔ پھر وہ سوچنے لگی، کہ آخر ہم کیوں مفلس ہیں جبکہ چینانی جیسا جاہل آدمی لکھ پتی ہے مسز سنگھ ایک دعوت پہ ہزار بارہ سو روپے خرچ کر دیتی ہے — اور ایک ہم ہیں — اتنے باشعور — اتنے مشہور — مگر کسی دوست کی تواضع کرنے کے لئے ایک وقت کھانا نہیں کھلا سکتے۔

چینانی سے ملنے کے لئے ثریا کو پھر ایک نئی ساری اور نئی چپل خریدنا پڑی تاکہ اتنے بڑے ہوٹل میں جا سکے۔ جب وہ تیار ہو کر جانے لگی تو صمد نے اس کا خوب مذاق اُڑایا کہ چینانی اُسے کوئی کام وام نہیں دے گا۔ اس لئے چپل اور ساری اُسے بہت مہنگی پڑے گی۔

چینانی نے اُسے واقعی کوئی فوری کام نہیں دیا۔ البتہ وعدے بہت سے کئے۔ ہفتے کی رات کو اپنے بجارہ ہلز والی بنگلے پر کھانے کی دعوت دی اور ثریا کی ایک پینٹنگ خریدنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

"ایسا لگتا ہے ثریا رانی اب واقعی ٹھاٹ کرنے والی ہیں۔ صمد نے چینائی کا دعوت نامہ دیکھ کر کہا۔" ان موٹے سرمایہ داروں سے ہم کافی روپیہ اینٹھ سکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ ایسی کوئی پینٹنگ تیار نہیں تھی جیسی چینائی چاہتے تھے انہیں اپنے ڈرائنگ روم کے رنگ اور ماحول سے ملتی ہوئی پینٹنگ کی ضرورت تھی۔ ایک بار دہلی کے کسی بڑے آدمی نے بھی صمد سے ایسی ہی فرمائش کی تھی، تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ جیسے وہ بھی کوئی درزی ہو کہ جسم کے ناپ سے کپڑے سی دے گا۔ اس نے یہ قصہ اپنے دوستوں کو کئی کئی بار سنایا تھا

مگر آج ثریا کے اصرار کرنے پر چینائی کی فرمائش پوری کرنا ضروری تھی فرنیچر کی قسطیں بھی ادا کرنا تھیں۔ اس لئے صمد نے اس بات کا ذکر کسی سے نہ کیا اور ثریا کو دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ یہ لڑکی بھی آخر روایتی عورت ہی نکلی ساریوں زیوروں اور خوبصورت گھر کے سپنے سجائے بیٹھی تھی۔ اور صرف آرٹسٹ بھی کہلاتی ہے۔

اس سال گرمی پورے عروج پر تھی جب صمد کے ہاں پہلا بچہ آیا۔

ثریا دن رات بچے کے پاس بیٹھی اُسے پنکھا جھلے جاتی تھی۔ صمد اکیلا کام کرتے کرتے تھک جاتا تھا تو ثریا مسز سنگھ کے ہاں سے تھوڑا سا برف مانگ لاتی تھی۔ پھر تو مسز سنگھ خود ہی ٹھنڈے پانی کی بوتلیں، برف اور آئس کریم بھیجنے لگیں۔ کبھی کبھی شام کے وقت وہ دونوں تھکن اتارنے کے لئے گڈو کو لے کر کرپال سنگھ کے ہاں چلے جاتے تھے وہاں پہنچ کر یوں لگتا جیسے کسی ہل اسٹیشن پر آگئے ہوں۔ ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر آئس کریم کھاتے۔ شربت پیتے، پھر مسز سنگھ کی بھیگی بھیگی مسکراہٹیں۔ کرپال سنگھ کے فوارے کی طرح اچھلتے ہوئے قہقہے ـــــ

وہاں سے آکر جب صمد اپنے گھر کا تالا کھولتا تھا تو لُو کا ایک تھپیڑا ثریا کے ٹھنڈے گالوں پر پڑتا اور اندر پہنچتے پہنچتے وہ اُس کے مارے پسینے میں نہا جاتی تھی۔

"اُفوہ ـــــ اب کی بار کتنی گرمی ہے ـــ" وہ بچے کو پنکھا جھلتے ہیں کہتی۔

"نہیں تو ـــــ صمد اطمینان سے کوئی پنسل اسکیچ بنائے جاتا۔" مجھے تو زیادہ گرمی نہیں لگتی۔ ہر سال جیسی ہی ہے۔"

مگر اب ثریا کو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ زندگی کی کتنی نعمتوں سے محروم ہے۔ خصوصاً بچے کے لئے ایک بجلی کا پنکھا اور آیا ہوتی تو وہ کتنی بے فکری سے اپنا کام کرسکتی تھی۔

مگر یہاں تو یہ عالم تھا کہ پٹسپالتا ایک امریکن لڑکی کو صمد سے ملانے لائی تو گرمی کے مارے سب کا بُرا حال ہوگیا۔ پھر ثریا نے جلدی سے مسز سنگھ کے ہاں سے فین منگوا کر لگایا تب اطمینان سے بات چیت ہوسکی۔

"معاف کیجئے۔ ہم کیوں کہ صرف آرٹسٹ ہیں۔ اسی لئے اتنی بھی استطاعت نہیں رکھتے کہ آپ کو ٹھنڈی ہوا بھی کھلائیں۔" صمد نے امریکن خاتون سے بلا جھجک معافی مانگ لی۔ اتنے بڑے آرٹسٹ کی ایسی مفلسی سے پٹسپالتا اور وہ امریکن خاتون بہت متاثر ہوئیں۔ خاص طور سے اس لئے کہ وہ امریکن خاتون ہندوستان کا سوشل سروے کرنے کے لئے اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ لہٰذا صمد کی ایک معمولی سی پینٹنگ بہت اونچے داموں میں بک گئی۔

ان خواتین کے جانے کے بعد صمد نے ایک ایک کرکے سات سو روپے گنے اور اپنی جیب میں رکھ لئے۔ "ان پیسوں سے اب ہم عیش کریں گے"

ثریا یہ سن کر بہت گھبرائی۔

کتنے چھوٹے چھوٹے قرض ہیں۔ دودھ والا۔ دھوبی۔ مکان کا کرایہ۔ بھلا ایسے میں تفریح کرنا کیا ضروری ہے؛

صمد جھنجلا گیا۔ ہر وقت پیسوں کا رونا۔ دن رات کی ہائے ہائے شادی کیا ہوگئی کہ دوست احباب کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھنا بھی چھوٹ گیا۔ جبھی تو میں اب پہلے جیسی لگن کے ساتھ کام نہیں کرسکتا۔ اب تو دن رات سوائے دال روٹی کی فکر کے ہمارا کوئی کام ہی نہیں رہا ہے۔"

ثریا شوہر کو اتنے غصہ میں دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ شادی کے دو برسوں میں یہ پہلا دن تھا۔ کہ صمد نے اتنے تلخ لہجہ میں بات کی تھی۔

رات کو بڑی دیر تک ثریا جاگ جاگ کر سوچتی رہی کہ اس نے واقعی صمد پر بہت بوجھ لاد دیا ہے۔ وہ خود بھی تو اور کوئی کام کرسکتی ہے۔ پھر اس

نے طے کرلیا کہ کرپال سنگھ سے کسی مستقل ملازمت کے لئے مشورہ کرنا چاہئے

آتنی رات کو اسے کروٹیں بدلتے دیکھ کر صمد اس کے پاس آبیٹھا۔

"مجھے معاف کرو رانی۔ صبح جانے کیا کہہ دیا تم سے۔ آجکل جانے کیوں میری طبیعت اتنی جھنجھلائی ہوئی رہتی ہے۔ خیر، اب تم خرچ کی فکر مت کرو، روپیہ کمانا ہمارا کام ہے۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرو۔ گڈو کو سنبھالو۔ ورنہ لوگ مجھ پر الزام دھریں گے کہ اتنی ابھرتی ہوئی آرٹسٹ کو میں نے دال روٹی کے چکر میں پھنسا دیا ——

وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ آنسوؤں کے طوفان میں ثریا کو صمد ڈوبتا ابھرتا نظر آرہا تھا۔ صبح وہ دونوں بڑے اچھے موڈ میں اٹھے۔ رات جو انتہائی محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنے کا جو عہد کیا تھا، وہ شروع ہوا۔ آج ثریا نے گھر کے کسی کام پر توجہ نہ دی۔ گڈو کو دودھ پلا کر جھولے میں لٹا دیا اور ایک ادھوری تصویر مکمل کرنے بیٹھ گئی۔ صمد کو کچھ فرمائشی کام کرنا تھا اس لئے وہ بھی اپنے کمرے میں دری بچھا کے، کاغذ، پنسل اور اسکیل وغیرہ پھیلا کے بیٹھا تھا۔ لیکن ابھی کام شروع کئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مسز سنگھ مسٹر اور مسز چینائی کو لے کر آگئیں۔ صمد نے انھیں بھی وہیں دری پر بٹھا لیا۔ اتنی دیر میں ثریا نے دوسرے کپڑے بدلے اور مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا۔ ایسے مہمانوں کے آجانے سے اپنی غریبی کا احساس اور بڑھ جاتا تھا۔

چینائی اپنے دوستوں کے لئے کئی پینٹنگس کی فرمائشیں لائے تھے۔ اور رٹز ہوٹل کی ایک پارٹی کا دعوت نامہ بھی تھا۔ دعوت نامہ قبول کرتے ہوئے ثریا بہت گھبرائی۔ کیوں کہ ایسی دعوتیں اسے بہت مہنگی پڑتی تھیں اور پھر وہاں کی میک اپ زدہ عورتوں اور بے تکلف مردوں میں جاکر وہ اپنے آپ کو بالکل حقیر اور اجنبی سا محسوس کرتی تھی۔ لیکن صمد نے ہمیشہ کی طرح اس دعوت کو بھی بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرلیا۔ کیوں کہ وہ تو اپنا کھدر کا کرتا پاجامہ پہن کر بے فکر ہوجاتا تھا۔ اسے نہ تو بار بار شیو کرنے کی عادت تھی نہ حجامت بنوانے کی۔ ثریا کے بڑے اصرار پر وہ کہیں جاتے وقت منہ ہاتھ دھو لیتا تھا مگر ثریا کو ایسی کوئی آرٹسٹ عورت نظر نہ آتی تھی، جس نے بالوں میں کنگھی نہ کی ہو۔ یا میلے کچیلے کپڑوں میں آگئی ہو۔ اس لئے اسے پھر مسز سنگھ کے ساتھ جاکر ایک گجری درم کی ساری ادھار خریدنا پڑی۔ صمد کو بعض وقت تعجب ہوتا تھا کہ چینائی ان پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟ ثریا کو کہنا تھا کہ ان کی جو شہرت چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اس سے وہ لوگ بھی متاثر ہیں۔ اور پھر ایسے امیر آدمی تو مشہور لوگوں سے دوستی قائم رکھنا بھی سوشل زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اب رہا تھوڑے سے بہت فائدے کا سوال! تو کبھی ان جیسے لوگوں کے لئے دو چار سو روپے خرچ کردینا کون بڑی بات ہے؟

بہرحال، ثریا کی خاطر صمد نے چینائی کے لئے وہ پینٹنگ تیار کردی جس کے رنگ چلا رہے تھے اور احتجاج کر رہے تھے کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔

مگر پیسے کی ضرورت نے صمد کو چپ کرادیا کیوں کہ ثریا اب دوسرے بچے کو سنبھالنے کی تیاری کررہی تھی۔

چینائی صمد کے آرٹ سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے آخر کار اپنی کپڑے کی مل میں آرٹ ایڈوائزر کی حیثیت سے صمد کو ایک ہزار روپے مہینے پر ملازم رکھ لیا۔ ثریا کو بھی انھوں نے کوئی کام دلوانے کا وعدہ کیا۔ اور یہ بھی کہا کہ اگرچہ یہ ایک ہی پوسٹ ہے مگر ثریا کو بھی صمد کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ صمد ملازمت ملنے سے پہلے جھنجھلایا کیونکہ آٹھ گھنٹے کی مسلسل قید کو برداشت کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن جب وہ پہلے دن آفس گیا تو وہاں کی آن بان سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی وہ بھی کسی آفس میں یوں ٹھاٹ سے آفیسر بن کر بیٹھے گا۔ پھر ائیر کنڈیشنڈ آفس کے کمرے میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر جب اس نے مل کے آرٹسٹوں سے بات چیت کی تو اسے ایک انوکھی مسرت حاصل ہوئی۔

ادھر ایک ہزار کی مستقل آمدنی نے ثریا کو اچھال دیا۔

بچوں کے لئے آیا کا انتظام ہوا۔ گھر کے لئے ضروری سامان خریدا گیا

ثریا نے ہر رنگ کی بہت سی قیمتی ساریاں خریدلیں۔

صمد کے پرانے دوست بھی اس خبر سے بہت خوش ہوئے۔ فوراً سب نے چندہ جمع کرکے "محفل خیام" سجائی۔

چند مہینے بعد مسز سنگھ کی سفارش پر ڈائرکٹر دبے نا تھنے ثریا کو

ایک مشہور میگزین کا آرٹ ایڈیٹر بنا دیا۔ یہ رسالہ آندھرا پردیش کے فنونِ لطیفہ کی نمائندگی کرتا تھا۔ ثریا کو صرف آرٹ کے متعلق حصے کو ترتیب دینا پڑتا تھا مگر یہ کام بھی اس جیسی نومشق کے لیے اتنا مشکل تھا کہ صبح سے شام تک وہ آفس میں بیٹھی رہتی تھی۔ اُسے ہر مہینے سارے صوبے کی آرٹ سے متعلق سرگرمیوں اور خبروں پر تبصرہ کرنا پڑتا تھا۔ مصوروں کی انجمنوں اور جلسوں میں پابندی سے جانا پڑتا۔ پھر دوسرے صوبوں کی انجمنوں اور آرٹ گیلریوں کے تقاضے جب شدت اختیار کر لیتے تو وہ جھنجھلا جاتی تھی۔ آخر وہ کون سے وقت اپنا کام کرے۔

سارا دن آفس میں دماغ کھپاتے جاؤ۔ گھر آؤ تو بچے اور بچوں کا باپ پچاسوں کام سونپ دیتے تھے۔

اس کے علاوہ آرٹسٹوں کی فوج بھی انہیں گھیرے رہتی تھی۔ یہ سب تو عمر مصور ثریا اور صمد کے فن کے معترف تھے اور یہ دیکھنے کو بےتاب رہتے تھے کہ وہ لوگ آج کل کیا کر رہے ہیں۔ کیا سوچ رہے ہیں ___؟

چھ مہینے بعد انہوں نے مسٹر سنگھ کے پڑوس کا وہ چھوٹا سا مکان خالی کر دیا اور حیدر گوڑہ کے ایک خوشنما کاٹیج میں منتقل ہو گئے۔ کرپال سنگھ نے بہتر فرنیچر سے گھر کا ڈیکوریشن کیا۔ ان دنوں میں ثریا کے پاس اتنی بہت سی ساریاں ہو گئیں تھیں کہ اس کے پرانے صندوق میں رکھنے کو جگہ نہ رہی اور ایک گوڈریج کی الماری بھی خریدنا پڑی۔

اب تو صمد نے بھی پہلی بار اپنے لیے دو چار عمدہ سوٹ سلوائے۔ کیوں کہ ایسی تقریبوں میں اکثر جانا پڑتا تھا جہاں سب بہترین لباس پہن کر آتے تھے۔

کھدر کے کپڑے اب وہ صرف گھر میں پہنتا تھا۔

اب انھیں بھی مسز سنگھ کی طرح کبھی کبھی دعوتیں کرنا پڑتی تھیں کیونکہ بقول کرپال سنگھ اپنا بزنس پھیلانے اور گاہکوں کو پھانسنے کا پھندہ صرف یہی دعوتیں، پارٹیاں تھیں۔ ایسی دعوتوں میں اب صمد اپنے پرانے دوستوں کو بلاتے ہوئے کترانے لگا تھا کیوں کہ وہ سب اس کے نئے حلقۂ احباب میں بالکل نئے تھے۔ اس کے دوست خود بھی ان دعوتوں کو "سرمایہ داروں کی سازشیں" کہتے تھے اور آنے سے کتراتے تھے۔

ایک سال بعد جب انھوں نے قسطوں پر کار بھی خرید لی۔ تو مسز سنگھ کا کہنا مان کر ثریا نے اپنے لمبے لمبے بال کٹوا دیئے۔ اب اس کے سر پر بڑی آرٹسٹک قسم کی بالوں کی ایک ٹوکری رکھی ہوئی تھی۔ مسز سنگھ نے اس کی بھوئیں نوچ کر انھیں بھی نوکیلا بنایا تھا۔ اب سچ مچ ثریا بڑی گلیمر فل شخصیت بن گئی تھی۔ جب وہ بہت شوخ بھڑکیلا میک اپ کئے بغیر آستینوں والا بلاؤز پہنے، ساری کو بدن پر چپکائے ادھر اُدھر گھومتی تھی تو لوگ اس عظیم آرٹسٹ سے بے حد مرعوب ہوتے دکھائی دیتے۔

ان پانچ برسوں میں وہ دونوں اتنے مصروف رہے کہ ایک بھی تصویر مکمل نہ کر سکے۔ سارا وقت اپنے اپنے آفس میں گزرتا تھا۔ شام کو کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام ہوتا۔ ورنہ لوگ خود آ جاتے تھے۔ حالاں کہ اتنے اونچے طبقے میں ملنا جلنا انہیں بہت مہنگا پڑتا تھا۔ دونوں کی تنخواہ انھیں مہینہ بھر کو کافی نہ ہوتی تھی اس لئے قرض کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی رات کو سوتے سوتے اچانک ثریا کروٹ بدل کر صمد سے کہتی تھی۔

"کچھ کیجئے نا۔ ہم پر کتنا قرض ہو گیا ہے ___؟"

"چُکا دیں گے پریشانی کی کیا بات ہے؟" نیند اور شراب کے ملے جلے نشے میں صمد اطمینان سے جواب دیتا۔ "فرصت ہی نہیں ملتی ورنہ دو چار شاندار پورٹریٹ بنا لوں۔ بہت دن ہو گئے کام چھوٹے ہوئے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں برش پکڑنا ہی نہ بھول جاؤں"۔ یہ سن کر ثریا کو بڑا اطمینان سا ہو جاتا تھا۔ وہ خود بھی اکثر یاد کرتی کہ کتنے موضوع نوٹ کر رکھے ہیں اس نے۔ مگر دن بھر کی تھکان اسے کوئی بھی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

کبھی کبھی جلسوں، دعوتوں، وغیرہ میں اس کے فائن آرٹس کالج کے استاد یا کلاس فیلو مل جاتے تھے تو پوچھتے کہ آجکل آپ کیا کر رہی ہیں۔

"ادھر میں ایک اہم موضوع پر کام شروع کرنے والی ہوں۔" وہ جھوٹ موٹ رعب ڈالنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی سوکھا سا فائن آرٹس کا اسٹوڈنٹ ان کے پیچھے پڑ گیا کہ ان کے اسٹوڈیو دیکھے گا۔ تو بھلا اب اُن کے اسٹوڈیو میں تھا کیا خاک، اب کام کرنے کی فرصت

ہی کسے تھی! دن رات کمانے کی دُھن سوار تھی۔

اتنے دنوں میں صمد کی صحت کافی اچھی ہوگئی تھی۔ بقول اس کے دوستوں کے، وہ ایک بھاری بھرکم شخصیت میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ثریا کا کہنا تھا کہ وہ اب بہت کاہل اور آرام طلب بھی ہوگیا ہے۔ شراب نے اسے کسی کام کا نہیں رکھا۔ اسی لئے کام نہ کرنے کے اُسے سینکڑوں بہانے یاد ہوگئے ہیں۔ لیکن کوئی اعتراض کرتا تو وہ بھڑک اُٹھتا تھا۔ اب صمد کا زیادہ وقت جلسوں کی صدارتیں سنبھالنے اور تقریریں کرنے میں گذرنے لگا۔ وہ آرٹ نمائشوں کا جج بنایا جاتا تھا۔ وہ دہلی کی مختلف تقریبوں میں بھی بُلوایا گیا۔

صمد کے پرانے دوستوں کو ان کی ان سرگرمیوں پر افسوس ہوتا تھا۔ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ کیوں کہ وہ خود۔ بچارے ابھی تک خود جینے کی جدوجہد میں جکڑے ہوئے تھے۔ فاقے کرتے اور بڑی پابندی سے اپنے کام میں منہمک تھے۔

اسلئے ثریا اور صمد کہتے تھے کہ وہ انھیں اتنی شاندار کاریں بیٹھے دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔ اور پروپیگنڈہ کرتے پھرتے ہیں کہ یہ دونوں میاں بیوی اب آرٹسٹ نہیں ہے صرف بڑے آدمی بن کر رہ گئے ہیں۔

اِن ہی دنوں یورپ جانے والے ایک ثقافتی وفد کے لئے صمد کا انتخاب ہوا۔ اور پھر ان ہی دنوں دہلی کے ایک بہت بڑے سرکاری تعمیر کا ماڈل بنانے کا کام صمد کو مل گیا۔

اپنی ڈائننگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ثریا ہنسے جارہی تھی۔

قسمت ان پر کتنی مہربان ہے۔ آج سے دس برس پہلے اس نے ایک بار مسز سنگھ کو دیکھ کر سوچا تھا کہ قسمت نے انہیں ہر چیز کیوں دے دی ہے! اور آج —! آج —— اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ اس کا عکس سیز کے پانچ شیشوں میں ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ گریس فل ثریا —— نمبر ون آرٹسٹ —— اس کے استاد سرجیت سنگھ کہا کرتے تھے: "یہ لڑکی نمبر ون آرٹسٹ بنے گی۔" اور اس کی پیٹھ پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ مار کے کہتے: —— خبردار شادی وادی کے چکر میں مت پڑنا تجھے صرف اپنا کام کرنا ہے"

سُنا ہے سرجیت سنگھ اپنے گاؤں امرت سر چلے گئے —— انہیں کینسر ہوگیا ہے۔ —— آج وہ ثریا کو دیکھتے تو —— تو —— اس نے گھبرا کے سامنے دیکھا جہاں وہ کئی حصوں میں بکھر گئی تھی —— ٹوٹ چکی تھی —— اچھا ہوا —— اچھا ہوا جو سرجیت سنگھ چلے گئے —— بھلا وہ کہاں تک اپنی صفائی پیش کرتی

پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اوپر نگاہ اٹھائی —— اس کے ہر عکس کے پیچھے صمد جگمگا رہا تھا —— پائپ منہ میں دبائے ٹائی کی گرہ ٹھیک کر رہا تھا۔ اُفوہ —— صمد کتنا بدل گیا ہے —— کتنا موٹا ہوگیا ہے —— ؟

"کیا سوچ رہی ہو رانی —— ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ وہاں معزز مہمان آنے والے ہیں جلدی چلو ——

لیکن صمد نے جھک کر دیکھا تو آئینے کے ہر عکس میں ثریا روتی نظر آئی۔ میز پر سر رکھے وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ اتنی ساری ثریاؤں کو ایک ساتھ روتے دیکھ کر وہ گھبرا گیا —— اتنے آنسو کیسے پونچھے گا —— ؟

آہستہ سے پردہ ہٹا کے وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سر جھکاتے ہوئے ثریا سوچ رہی تھی کہ اس کے رونے پر صمد کتنا گھبرا جاتا ہے —— اب وہ کیسے منائے گا —— ؟ مگر وہ سارے آئینے خالی تھے۔ صمد وہاں نہیں تھا۔ اپنے آنسو خود ہی پونچھ کر ثریا نے دیکھا صمد دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے۔

جلسے میں ایک آرٹسٹ کا ذکر چل پڑا —— سُنا ہے وہ جوتے نہیں پہنتے۔ شیو نہیں کرتے۔ یہ سن کر ثریا بھڑک اٹھی۔

"واہ یہ خوب رہی۔ کیا جوتے پہننے کی فرصت نہیں ملتی یا اتنے پیسے نہیں ہیں! مجھے بڑے آرٹسٹوں کا یہ ڈھونگ بالکل پسند نہیں ہے۔ مثلاً ہماری مثال لیجیے۔ صمد اتنے بڑے آرٹسٹ ہیں لیکن انہوں نے کبھی سنیاسیوں کا ڈھونگ بالکل نہیں رچایا۔ حالاں کہ لوگ ہمارے اوپر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ ہم کاروں میں گھومتے ہیں اور اتنا روپیہ کماتے ہیں ——"

"بے وقوف ہیں اعتراض کرنے والے" ایک انجانے آدمی نے مسکرا کے ثریا سے کہا۔

"اگر آپ اپنے فن سے اتنا کما سکتی ہیں تو کیوں نہ ایسی ٹھاٹ کریں لیکن بات یوں ہونا چاہیئے۔ کہ آپ نے صرف دولت اور کاروں

کو ہی تو زندگی کا حاصل نہیں بنایا ہے۔

"جی — جی — ثریا مسکرانے لگی اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس آدمی نے ان پر طنز کیا ہے یا ہمدردی — ؟

اس سے پہلے بھی ایک نوجوان آرٹسٹ نے تیز تیز لہجہ میں اس سے بات کی تھی۔ اس نے بڑے صاف الفاظ میں صمد سے کہا تھا کہ آپ کے آرٹ کا کل سرمایہ دس پانچ اچھی پینٹنگیں ہیں لیکن اب آرٹ کے دھارے بدل رہے ہیں۔ ایسے آپ کو ہم پر تنقید کرنے کا اور اپنے آپ کو سب سے اہم آرٹسٹ سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اُس دن بھی ثریا گھر آ کے خوب روئی تھی اور صمد نے سمجھایا تھا کہ پگلی آخر میں رونے اور پچھتانے کی کیا بات ہے۔ تم کہو تو میں آج ہی ملازمت چھوڑ کے پھر اپنے کام میں لگ جاؤں۔ یہ تو بس یوں ہی کچھ دنوں کے لئے عیش کرنے کی خاطر رک گئے ہیں، اور اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کم بخت ہم سے جلنے لگے ہیں۔

ایک مہینے بعد صمد یورپ سے لوٹا تو بقول شخصے اس کی شخصیت بالشتوں اونچی ہو چکی تھی۔ مسٹر چینائی نے اس کے اعزاز میں "لٹریری" میں ایک پبلک جلسہ کیا تاکہ وہ اپنے دورہ یورپ کے تاثرات بیان کر سکے۔

صمد ڈائس پر آکر بیٹھا تو اس نے نیچے ہال میں اپنے بہت سے پرانے دوستوں کو بھی دیکھا۔ پھر پائپ سلگانے میں اس نے سوچا کہ وہ سب آگے بڑھنے کی جد و جہد کیوں نہیں کرتے۔ جہاں تھے آج تک وہیں ہیں۔

آج شہر کے بہت سے آرٹسٹ بھی آئے تھے۔ کچھ صمد کے دوست تھے۔ کچھ ایسے شاگرد، جو اب شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے۔

صمد نے جرمنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا

"وہاں جب ایک آرٹسٹ نے مجھ سے بھارت کے نئے رجحانات کے بارے میں بات کی تو مجھے بڑا شرمندہ ہونا پڑا۔ کیوں کہ آج ہمارے ہاں فن میں تو نراجیت، مایوسی اور انتشار پھیلا ہوا ہے۔ اور اسی لئے —

لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیوں کہ صمد کا ایک پرانا شاگرد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے بڑے سخت الفاظ میں کہنا شروع کیا۔

"آپ کو صرف اپنی ذات پر شرمندہ ہونے کا حق ہے۔ بھارت کا فن اس جگہ سے بہت آگے بڑھ چکا ہے جہاں آپ نے اسے چھوڑا تھا۔ اس لئے آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ دوسرے ملکوں میں ہماری نمائندگی کریں۔"

وہ جانے کیا کیا بک رہا تھا، یہ وہی لڑکا تھا جس پر صمد نے ثریا کے بعد سب سے زیادہ محنت کی تھی۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو صمد کا شاگرد بتا کر بہت خوش ہوتا تھا۔ ثریا اُسے جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے محسوس کیا جیسے جلسے میں شریک سب لوگ اس نوجوان کی تائید میں ہوں۔ کئی طرف سے دبے دبے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ آخر چینائی نے بڑے سخت الفاظ میں اس لڑکے کو بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ صمد نے سگار میز پر رکھ دیا اور ٹائی کی گرہ ٹھیک کر کے بڑی بے نیازی سے پیر کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنی گرج دار آواز میں کہنا شروع کیا۔

"دوستو —! ابھی میرے ایک نوجوان ساتھی نے ناسمجھی اور نوجوانی کے جوش میں جو کچھ کہا ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے فن کے لئے جو کچھ کیا ہے۔ اس کے سیکھے بغیر میرے نوجوان دوست آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اب وہاں کے تجربوں کا سوال! تو سچ پوچھئے تو ابھی ایسا کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے جسے میں کوئی اہمیت دوں۔ بلکہ میں تو — میرے — میرے —

"ہر شکست خوردہ بڈھا یوں ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتا ہے۔" کسی نے آہستہ سے کہا اور پیچھے کی صفوں سے ایک قہقہہ بلند ہوا اور پورے ہال میں پھیل گیا۔

آئے دن کی ان تنقیدوں کا اثر یہ ہوا کہ صمد نے ایک مہینے کی چھٹی لے لی۔ ثریا نے آرٹ میگزین کی ملازمت چھوڑ دی۔ اور وہ دونوں اپنے کام میں لگ گئے۔ لیکن مہمانوں اور دعوتوں کا سلسلہ کسی طرح بند نہ ہوا۔ آمدنی کم ہونے سے قرض اور بڑھنے لگا۔ آخر ثریا نے کار بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن کار کے بغیر اب صمد کا باہر نکلنا مشکل تھا ایک رات — صمد سونے کے کمرے میں آیا تو ثریا بے حد پریشان بیٹھی تھی۔ مکان پر قرقی کا نوٹس آیا تھا تیس ہزار روپے کی فوراً ضرورت تھی۔ لوگ سنیں گے۔

نو کیا کہیں گے محلے میں کتنی بدنامی ہوگی۔" —— ثریا سسکیاں لے رہی تھی ——

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کل ہی کچھ بندوبست کر لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ہی وہ ادھار نپٹا دیں گے۔ میڈم خوشخبری یہ سنو کہ میرا پرانا کام کرنے کا موڈ واپس آ رہا ہے۔ لوگوں کی اتنی سخت تنقید سے واقعی دماغ کے کچھ حصے روشن ہوئے ہیں۔ اب میں ملازمت چھوڑ دوں گا۔"

"ملازمت بھی چھوڑ دو گے"! ثریا نے گھبرا کے کہا

"تصویریں بنا کر آخر تم کتنا کما لو گے تیس ہزار تو قرض کے دینا ہیں۔ اگر بچوں کی فیس نہ گئی تو ہاسٹل سے نکال دیں گے۔ اور پھر مکان کا کرایہ —"

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ صمد بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ثریا کا چہرہ اوپر اٹھا کر کہا۔

"مجھے معاف کر دو رانی —— آئندہ ان فضول کاموں میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔" پہلے اس قرض کو اتارنے کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ چلو اب تم آنسو پونچھ ڈالو ——"

ثریا نے آنسو بھری نگاہیں اٹھا کر صمد کے چہرے کی سچائی دیکھی اور اس کا ہاتھ تھام کر جانے کیوں پھر رو پڑی۔



افقر موہانی

حقائق و معارف

ملی سجدہ کی اجازت جو نہی پاسباں سے پہلے
مجھے مل گئی خدائی ترے آستاں سے پہلے

نہ جہاں کی اب تمنا، نہ متاعِ دو جہاں کی
مجھے مل گیا ہے سب کچھ ترے آستاں سے پہلے

ابھی دور ہے نظر سے ترے آستاں کی منزل
میں طواف کعبہ کر لوں ترے آستاں سے پہلے

یہ ہے مختصر فسانہ مری زندگی کا ناصح
غمِ عاشقی فقط تھا غمِ دو جہاں سے پہلے

وہ چلے مٹانے مجھ کو بخرامِ ناز جس دم
تو پکار اٹھی قیامت کہ مرے یہاں سے پہلے

بنا جب سے آشیانہ، تو نگاہِ چرخ بدلی
نہ گری تھی ورنہ بجلی، مرے آشیاں سے پہلے

مری میکشی کا زاہد نہیں خاص وقت کوئی
کبھی دن کے وقت پی لی تو کبھی اذاں سے پہلے

مری زندگی کی افقر ہمہ شوق داستاں ہے
میں سناؤں بھی جو اس کو تو کہوں کہاں سے پہلے

فولاد ۔ تعمیر و ترقی کی بنیاد

کسی ملک کی ترقی کے لیئے آہنی عزم اور فولادی بازو ہی کافی نہیں ہوتے۔ عزم و ارادے کو عملی شکل دینے کے لیئے دیو پیکر مشینیں چاہئیں۔ ملک کی حفاظت کے لیئے اسلحات چاہئیے۔ اناج اُگانے کے لیئے ٹریکٹر۔ اناج کو لانے لیجانے کے لیئے پانی کے جہاز، ریل گاڑی اور ٹرک چاہئیں۔ غرض کہ ترقی اور خوشحالی کی راہ میں ہر قدم پر لوہے اور فولاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس کے بغیر صنعتی ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیئے ہم نے کیا کیا ہے۔

دس لاکھ ٹن سے پچاس لاکھ ٹن۔ یہ ہے پنجسالہ پلانوں کے ذریعے ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی پیداوار بڑھانے کے پروگرام پر عملدرآمد کا نتیجہ۔

حصول آزادی کے بعد جب ہندوستان کی صنعتی ترقی کے پروگرام پر عمل درآمد شروع کیا گیا تو اس میں فولاد کی پیداوار کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ کیوں کہ ملک کی معاشی ترقی کا دارومدار بہت حد تک اس صنعت کی ترقی پر ہے۔

۱۹۵۰ء میں فولاد پیدا کرنے کا صرف ایک بڑا کارخانہ جمشید پور (بہار) اور دو چھوٹے کارخانے ہیراپور (مغربی بنگال) اور بھدراوتی (میسور) میں موجود تھے۔ ان کی مجموعی پیداوار دس لاکھ ٹن تھی۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی جسے ۱۹۰۷ء میں جمشید جی مرحوم نے سکوچی (بہار) میں قائم کیا، نے پہلی بار ۱۹۱۱ء میں لوہا اور ۱۹۱۳ء میں اسپات تیار کیا۔ ۱۹۳۹ء



جمشید پور کا فولاد کا کارخانہ

میں ہندوستان میں فولاد اور لوہے کے ڈلوں کی پیداوار علی الترتیب ۸ لاکھ ٹن اور ۱۸ لاکھ ٹن تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس صنعت نے

ترقی کی۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۵۰ء تک لوہے کے ڈلوں کی پیداوار ۱۵ لاکھ ٹن اور فولاد کی پیداوار دس لاکھ ٹن کے قریب پہنچ چکی تھی۔

فولاد کی صنعت میں حقیقی ترقی دوسرے پنجسالہ پلان میں ہوئی جبکہ حکومت نے رورکیلا (اڑیسہ) بھلائی (مدھیہ پردیش) اور درگاپور

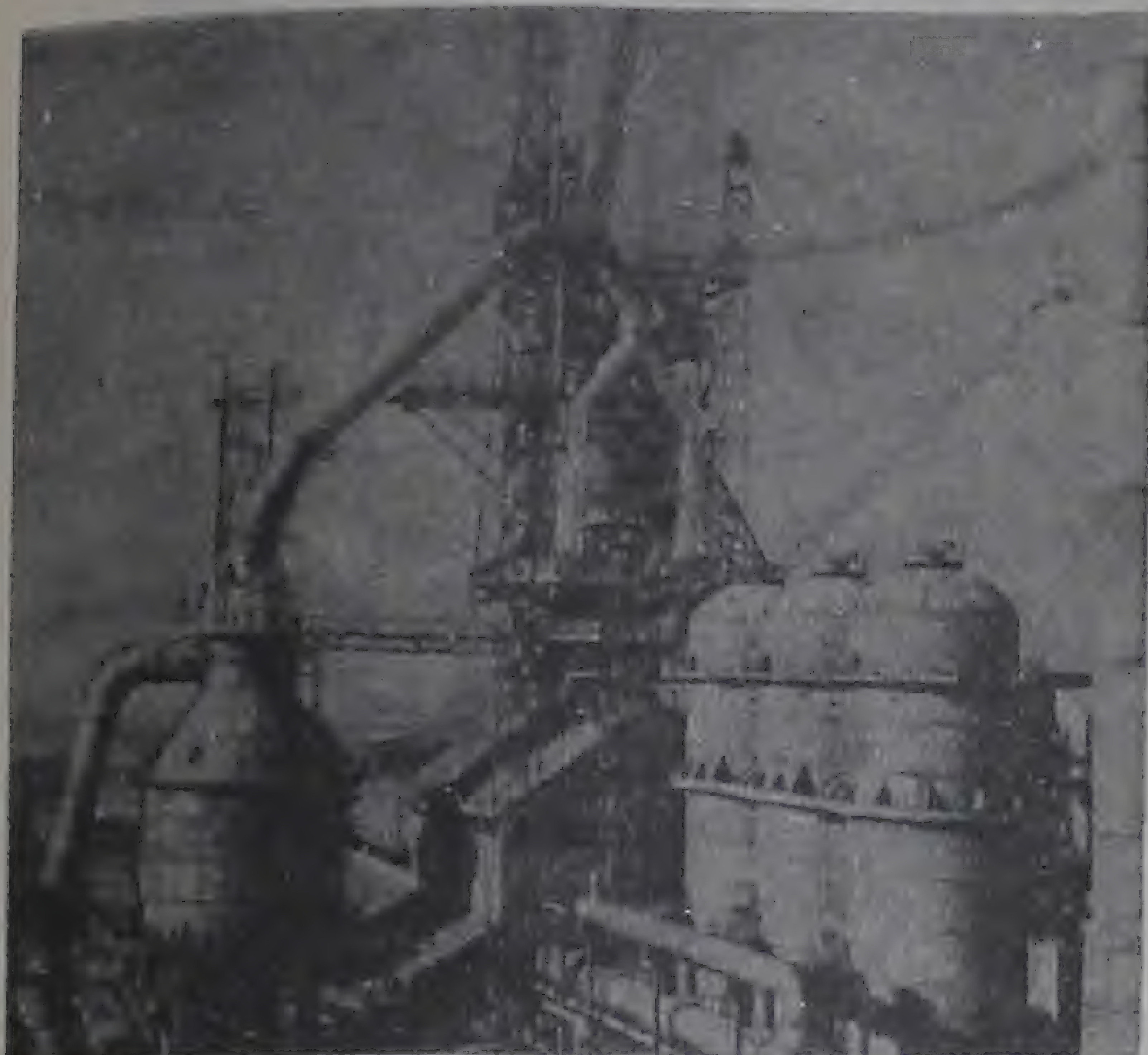


رورکیلا کے فولاد ساز کارخانہ کا ایک منظر

میں فولاد کے کارخانے قائم کئے۔ اس مدت میں پرائیویٹ سیکٹر کے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت میں توسیع کے اقدامات بھی کئے گئے۔ سرکاری حلقے کے مذکورہ تینوں کارخانوں کی ابتدائی صلاحیت پیداوار دس دس لاکھ ٹن تھی۔ ان کا انتظام ایک سرکاری ادارے ہندوستان اسٹیل لمیٹیڈ کے ہاتھوں میں ہے جس کا منظور شدہ سرمایہ چھ ارب روپے ہے۔

دوسرے پنجسالہ پلان کے خاتمے پر ۱۹۶۱ء میں ہماری فولاد کی سالانہ پیداوار ۲۳ لاکھ ٹن ہو گئی تھی۔ تیسرا پنجسالہ پلان ۱۹۶۱ء میں شروع ہوا۔ اس میں فولاد کی پیداوار میں مزید اضافہ ہوا اور اس وقت لگ بھگ ہم پچاس لاکھ ٹن فولاد سالانہ تیار کرتے ہیں۔ اب سرکاری حلقے میں فولاد کا سب سے بڑا کارخانہ بوکارو میں قائم کیا جا رہا ہے۔ جس کی صلاحیت پیداوار شروع میں پندرہ لاکھ ٹن ہو گی جو بعد ازاں بڑھ کر چالیس لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی۔

سرکاری حلقے کے تینوں کارخانوں، رورکیلا، درگاپور اور بھلائی اور بوکارو پروجیکٹ جو کہ اس وقت زیر تعمیر ہے، کے بارے میں چند حقائق ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔



رورکیلا کے فولاد کے کارخانہ کا دوسرا منظر

رورکیلا کا فولاد کا کارخانہ

مغربی جرمنی کی امداد سے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں دس لاکھ ٹن سالانہ کی پیداوار کے لئے کام مکمل ہو چکا ہے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں وہاں ۹۷۶۳۹۱ ٹن فولاد تیار ہوا۔ اس کارخانے کے ساتھ کیمیاوی کھاد کا جو کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔ وہ ۵ نومبر ۱۹۶۲ء میں چالو ہو گیا تھا۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں اس میں ایک لاکھ ۶۲ ہزار ٹن کیلشیم نائٹریٹ (کھاد) تیار کیا گیا۔

رورکیلا کے فولاد کے کارخانے میں شروع میں کئی ایک مشکلات پیش آئیں۔ جن پر قابو پا لیا گیا ہے اور اب اس کارخانے کی سالانہ صلاحیت پیداوار میں ۱۸ لاکھ ٹن لوہے کے ڈلوں تک توسیع کی جا رہی ہے جس سے ۱۲ لاکھ ٹن تیار فولاد حاصل ہوگا۔ اس توسیعی پروگرام کے اس سال مکمل ہو جانے کی توقع ہے۔ اس کے بعد اس کی صلاحیت پیداوار میں مزید ۳۵

لاکھ ٹن تک اضافہ کرنے کی تجاویز زیر غور ہیں۔



درگاپور کا کارخانہ

درگاپور کا کارخانہ

جو برطانیہ کی مدد سے قائم کیا گیا ہے ۱۹۶۲ء میں مکمل ہو گیا اور ۱۹۶۶ء میں اس میں ۹۹۱۲۳۴ ٹن لوہے کے ڈھلے اور ۷۸۰۲۶۱ ٹن فولاد تیار ہوا۔ تیسرے پلان میں پلانٹ کی صلاحیت پیداوار کو ۱۶ لاکھ ٹن لوہے کے ڈھلوں تک بڑھانا مقصود تھا۔ اور چوتھے پلان میں اس کی صلاحیت پیداوار میں ۳۴ لاکھ ٹن لوہے کے ڈھلوں تک توسیع متوقع ہے


بھلائی کے کارخانے کا ایک بھٹی

بھلائی کے کارخانے کی تعمیر کے لیے ۲ فروری ۱۹۵۵ء کو ہندوستان اور روس کے درمیان اشتراک کے معاہدے پر دستخط ہوئے اور روس کی امداد سے اس کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ۴ فروری ۱۹۵۹ء کو ہندوستان کے پہلے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کارخانے میں خام لوہے کو ڈھالنے والی پہلی بھٹی کے افتتاح کی رسم ادا کی۔ اس کے چند ماہ بعد دوسری بھٹی قائم ہوئی۔ یہ کارخانہ ۱۹۶۱ء میں مکمل ہو گیا۔ فروری ۱۹۶۲ء میں ہندوستان اور روس نے اس کارخانے کی پیداواری صلاحیت کو ۲۵ لاکھ ٹن تک بڑھانے کے لیے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ پلانٹ کی توسیع کا کام حال ہی میں مکمل ہوا ہے۔ اب بھلائی کی سالانہ صلاحیت پیداوار ۳۲ لاکھ ٹن تک بڑھانے کا نشانہ ہے اور یہ کام دو مرحلوں میں مکمل کیا جائے گا۔ اس پلانٹ کی تکمیل کے سلسلہ میں تقریباً نو سو بھارتی انجینیروں و دیگر تکنیکی عملے کو روس میں خاص قسم کی تربیت بھی دی گئی۔



بوکارو کا اسپات کا کارخانہ

روس کے تکنیکی اور مالی تعاون سے قائم کیا جا رہا ہے اس مقصد کے تحت جنوری ۱۹۶۵ء میں دونوں ملکوں نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیے ہیں اس کارخانے کے متعلق روس کے تکنیکی ماہروں نے اپنی تفصیلی رپورٹ دسمبر

۱۹۶۵ء میں پیش کر دی تھی۔ جس کے تحت دو مرحلوں میں ۴۰ لاکھ ٹن لوہے کے ڈلوں کی سالانہ صلاحیت پیداوار کا کارخانہ تعمیر کیا جائے گا۔ پہلے مرحلے میں صلاحیت پیداوار ۱۷ لاکھ ٹن ہوگی۔ اس پلانٹ کے لئے درکار زر مبادلہ کے لئے سوویت روس نے ۲۰۰ کروڑ روبل (۲۲۶ء۶ کروڑ روپے) کی رقم قرض دی ہے۔ پلانٹ کے لئے درکار فولاد کا ۸۵ فیصد سامان اور ۹۳ فیصد ریفریکٹریاں ہندستان میں ہی تیار ہوں گی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق پہلی بھٹی ۱۹۶۹ء کے آخر تک چالو ہو جائے گی۔ اور تعمیر کا پہلا مرحلہ مارچ ۱۹۷۱ء تک مکمل ہو جائے گا۔

چوتھے پلان میں لوہے اور اسپات کی صنعت کی صلاحیت پیداوار کو ۹۴ لاکھ ٹن فولاد، ۳۰ لاکھ فاؤنڈری گریڈ لوہے کے ڈلوں اور ۳۵ لاکھ ٹن خصوصی قسم کے فولاد تک پہنچانے کا نشانہ مقرر کئے جانے کی توقع ہے۔

لوہے اور اسپات کی پیداوار کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کی برآمد سے زر مبادلہ کمانے کے اقدامات کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے چنانچہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں ہندوستان سے ½۱ لاکھ ٹن تیار فولاد برآمد کیا گیا۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں دو لاکھ ۴۲ ہزار ٹن تیار فولاد اور ایک لاکھ ۱۹ ہزار ٹن لوہے کے ڈلے برآمد کئے گئے۔ جن کی مجموعی مالیت ۱۵ کروڑ روپے کے قریب تھی۔

لوہے اور فولاد کی مزید پیداوار سے ہم زیادہ تعداد میں یہ چیزیں برآمد کر سکیں گے۔ اور اس طرح زیادہ تعداد میں زر مبادلہ کما سکیں گے۔

غلام مرتضےٰ راہی



غزل

عجب کے اعتبار نگاہ تھا، رُخ آگہی کو ترس گئے!
جو پناہِ دیر و حرم میں تھے وہی بندگی کو ترس گئے

یہ عجیب تھا کہ بساطِ شب سرِ راہ صبح اُلٹ گئی
جو نقیبِ نکہت و نور تھے وہی روشنی کو ترس گئے

یہی آگہی کا کمال ہے یہی آگہی کا زوال ہے
"ہمیں شہر یارِ حیات تھے ہمیں زندگی کو ترس گئے"

وہ رواجِ حسن کی رفعتیں یہ فرازِ عشق کی منزلیں
کبھی کوئی ہم کو ترس گیا کبھی ہم کسی کو ترس گئے

دلِ انجمن کی بساط کیا کہ بقدرِ ظرفِ نگاہ ہے
کئی ایسے تنگ نظر تھے جو یہاں روشنی کو ترس گئے

سبھی رہروِ رہِ شوق ہیں وہ کشاں کشاں کہ رواں دواں
ہے ایک راہیؔ خستہ پا وہی رہروی کو ترس گئے

اخلاق حسین عارف

صفی لکھنوی

شخصیت اور فن



لکھنؤ کی بزم میں صفی نے جب آنکھیں کھولیں تو انیس، دبیر، مونس اور تعشق کے سے مرثیہ گویوں کے علاوہ شعراء میں عرش، امیر اور اسیر کو دیکھا اور جب ان کی شاعری جوان ہوئی تو بحر، ادیب، عشق، انس، نفیس، بقا، کامل یاس اور جلال جیسے شعراء موجود تھے۔ اسی دور کے بعد رشید، عروج، عارف برق، چکبست، رسوا، دانش، ابر، بلیغ، فاخر، جاوید، بہار، شفیق اور ثاقب نمایاں شعراء اور آسمان تغزل کے جگمگاتے ہوئے ستارے تھے اس وقت کے شعراء کا خاص شغف تغزل تھا اور غزل ہی میں طبع آزمائی کہنہ مشقی شاعر کو درجہ کمال تک پہنچا دیتی تھی۔

صفی لکھنوی اپنے تغزل کے دامن کو دبستان لکھنؤ کے ابتدائی ابتدال سے تر کرنے کے باوجود بچ نکلنے کی سرگرم کوشش میں سرگرداں ہے ان کے ابتدائی کلام میں اگر معاشرہ پر مسلط ماحول اور متذکرہ دور کے دیگر شعراء کے کلام کی طرح کہیں کہیں پستیاں ہیں تو ان کے آخری کلام میں پختگی اور اس دور انقلاب سے متاثر ہونے کے بعد کی رفعتیں بھی ہیں۔ ابتداء میں ناسخیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور قدیم اسکول شاعری کے عام اثرات نظر آتے ہیں تو بعد کے جذبات میں قومی بیداری، خیالات کی گہرائی، متانت اور جذبات کی بلندی ملتی ہے۔ اس اعتبار سے صفی کو لکھنؤ کے تغزل کا نکھارنے والا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سید علی نقی صفی کے حسب و نسب کی جستجو میں جب نظریں اٹھتی ہیں تو واقعات کی تلاش میں خطۂ غزنی جانا پڑتا ہے جو صدیوں شعراء کا مامن رہا۔ صفی کے مورث اعلیٰ مبارک شاہ تھے۔ ان کی شاعری اور دیگر حالات کے بارے میں زیادہ تحقیق نہ ہو سکی مگر اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس خطۂ غزنی کی شاعرانہ فضا میں پروان چڑھ کر دلی کی عروج شاعری کے دور میں وہ ہندوستان آئے۔ مبارک شاہ زیدالواسطی تھے۔ تقدس اور شاعری کی نعمتوں سے ان کا ادب نواز خاندان محروم نہ تھا۔ صفی نے اپنے مورث



صفی لکھنوی

علی کی مختصر تاریخ یوں نظم کی ہے : ؎

عیسیٰ بن زید حضرت شہزادۂ حسین
ہیں دونوں زید ابن علی کے یہ نور عین
شہزادہ حسین کا ذوالدمعہ ہے لقب
منسوب انھیں سے غزنویوں کا حسب نسب
غزنی سے آئے شاہ مبارک جو سوئے ہند
خاک قدم سے ان کے بڑھی آبروئے ہند
دلّی میں اُن کا نام و نشاں برقرار ہے
بالائے حوض شمسی ابھی تک مزار ہے
پنگوڑیوں کے مورث اعلیٰ بڑے ولی
اولاد میں انھیں کے ہیں سید جلال بھی
شاخیں جدا جدا ہیں مگر ایک ہے چمن
اجداد کا ہمارے تھا پنگوڑ ہی وطن
جاٹوں کے تیغ ظلم سے جو خون میں نہائے
چھوڑا وطن بزرگ ہمارے اودھ میں آئے
دل سے قریب گو کہ بظاہر بعید ہیں
ہم بھی چراغ مشہد زید الشہید ہیں

صفی کے والد سید فضل حسین خود بھی فاضل و عالم تھے۔ آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ کے بھائی شاہزادہ سلیمان قدر کی محل سرا کے معتمد تھے اسی وجہ سے صفی مرحوم بھی ان کے بیٹے ثریا قدر کے ساتھ مکتب شاہی میں ساتھ ہی تعلیم پائی اور پروان چڑھے۔ سلیمان قدر کی سرکار سے بہت سے شعرا روابستہ تھے۔ دربار کا سدا بہار ماحول علم و ادب سے مدتوں ہم آغوش رہا۔ صفی نے عربی، فارسی اور ٹکسالی اردو میں کمال حاصل کیا۔ انھوں نے اپنے ذوق و شوق کی بدولت انگریزی کی طرف رجوع کیا۔ کیننگ کالجیٹ اسکول سے انٹرنس تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ علی میاں کامل کے سے ادب نواز گھرانے میں ان کی شادی ہوئی۔

سب سے پہلی بار شاہزادہ سلیمان قدر کے داروغہ اچھے صاحب کے یہاں شریک مشاعرہ ہو کر صفی نے غزل پڑھی جس کی بڑی تعریف ہوئی
چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو پیدا ہی نہیں آزردہ جاں ہوتا تو کیا ہوتا
ہوا تھا خلق اگر دل، شادماں ہوتا تو کیا ہوتا
نہیں جب طاقتِ پرواز ہی دل خستہ بلبل میں
قفس پھر کیا بُرا ہے آشیاں ہوتا تو کیا ہوتا
میں کچھ کہتا نہیں اس پر تو ناصح کا یہ عالم ہے
خدا جانے جو میرا راز داں ہوتا تو کیا ہوتا
جب اس نامہربانی پر صفی یوں جان جاتی ہے
خدا جانے جو وہ بت مہرباں ہوتا تو کیا ہوتا

۱۸۹۳ء سے ملازمت کے سلسلہ سے صفی پرتاپ گڑھ رائے بریلی اور سلطان پور میں رہے۔ رائے بریلی کے قیام میں کنور راسدیو سنگھ کے محل میں مشاعروں سے ان کی شاعری کا وہاں بھی چرچا ہونے لگا۔ رائے بریلی کے مشاعروں میں سے ایک نشست کی غزل کے چند اشعار پیش ہیں ؎

اک اداسی چھا گئی ہر سوختہ رو اُٹھ گیا
شمع رو، اُٹھتے ہی تیرے حسن محفل اٹھ گیا
ہائے جی بھر کے نہ دیکھا دل میں حسرت ہی رہی
ہم تڑپتے رہ گئے، پہلو سے قاتل اُٹھ گیا
بزم ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج مست
کل یہیں پہلو سے میرے شیشۂ دل اُٹھ گیا

۱۸۸۹ء میں محلہ نرہی لکھنؤ کے نواب اصغر حسین فاخر مرحوم کے یہاں بڑے پیمانے پر مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں باکمال شعراء شریک ہوتے تھے۔ ان مشاعروں میں صفی مرحوم نے خوب خوب غزلیں پڑھیں۔ ان کے کلام کی شہرت میں چار چاند لگنے لگے۔ متفرق غزلیات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سنتے ہیں قافلہ میں سبھی نالۂ جرس
لیکن غریب کا کوئی فریاد رس نہیں
صیاد کچھ تو میری طرف سے ہے بدگماں
بے وجہ رخنہ بندیِ چاکِ قفس نہیں

سلوک ایسا تو کر جس سے جہاں میں نام روشن ہو
چراغ راہ بن جا دوست اس میں ہو کہ دشمن ہو

نامہ قاصد کو دیا پھر لے لیا کچھ سوچ کر
خط پڑھے گا کون! پیغام زبانی چاہئیے

گلشن میں بہار آئے خزاں آئے ہمیں کیا
ہے ایک کلی دل میں وہ مرجھائی ہوئی سی

وہ رند ہیں جنھیں مئے و معشوق ہیں نصیب
وہ پارسا ہیں جن کو یہ ساماں بہم نہیں

سنئے واعظ آشفتہ بیاں کیا سنئے
دل پریشاں بھی نہ ہوتا تو پریشان ہوتا

مندرجہ بالا اشعار میں خلوص اور سچائی کا اظہار ہے جو تصنع سے کوسوں دور ہے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب چند قابل تقلید مستثنیات سے قطع نظر لکھنوی شاعری تناسبات لفظی کا گھروندہ بنی ہوئی تھی۔ لفظی صنعت گری کی دُھن میں جذبات سے مغائرت برتی جاتی تھی بعید از قیاس مفروضات محض سطحی مشابہت سے ثابت کر دیئے جاتے تھے۔ صفی نے لکھنؤ کی شاعری میں ایک نئے موڑ کا آغاز کیا اور انجمن معیار ادب و نیز رسالہ معیار ادب کی بنیاد رکھی۔ رفتہ رفتہ شاعری میں حقیقت نگاری و ترجمانی جذبات کی جانب مائل ہونے لگے جو حضرات مغربی علوم سے واقف تھے انہوں نے اس تحریک کو مزید تقویت پہنچائی ان میں نمایاں حیثیت مرزا محمد ہادی رسوا کی ہے۔

صفی رموز شاعری کے عالم با عمل شاعر گذرے ہیں۔ اپنی شش سالہ جانکاہ محنت سے ادب کی بے بہا خدمات کر کے جو اضافہ انہوں نے کیا منجملہ ان کے رباعیات عمر خیام کا اردو میں بے مثل ترجمہ بھی ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

رباعی عمر خیام

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کائے رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے
زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

ترجمہ صفی

میخانے سے آئی یہ دم صبح ندا
اے رند خرابات ہمارے شیدا
اُٹھ جام کو تیرے مئے سے کر دیں لبریز
قبل اس کے کہ پیمانہ ہو لبریز اپنا

غزل کے لئے اردو ادب میں سب سے بہتر کسوٹی میر کا رنگ ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ صفی کی ہر غزل میں میر کے تغزل کی جھلک ہے مگر جگہ جگہ صفی کی غزلوں میں میر کا رنگ ضرور ہے۔ وہ میر کے تغزل کے دلدادہ تھے اوروں کی طرح محض زبانی سراہنے والے ہی نہ تھے بلکہ اصولی طور پر برتنے والے بھی تھے۔ انہوں نے اپنے دل کی بات یوں کہہ دی ہے ؎

وہی مرغوب طبیعت ہے صفی کیا کیجئے
حسن الفاظ جو معنی کدۂ میر بھی ہے

یہی نہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ایک بات اور سنئے۔ انہیں رنگ میر کی پابندی پر اتنا ناز تھا اور ان کی بلند ہمتی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے صفائی سے اثر میں ڈوب کر کہہ دیا ہے ؎

جب کہ معنی کدۂ عالم ارواح میں تھے
کرتے تھے مشق سخن ہم بھی صفی میر کے ساتھ

صفی کے بہت سے شعر میر کے خالص رنگ میں ملیں گے جن پر میر کے شعر ہونے کا گمان ہوتا ہے جیسے ؎

جانا، جانا، جلدی کیا ہے ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو، ٹھہرو، دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش میں آنے دو
دور بہار حسن تو ہو پھر جوش جنوں کا مضائقہ نہیں
کوکے گی باغوں میں کوئل بور آموں میں آنے دو

بادل گرجا بجلی چمکی روئی شبنم پھول ہنسے
مرغ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے دہرانے دو

جوانی یاد کرکے آنکھ میں آنسو بھر آتے ہیں
طلوع صبح پیری ہے ستارے جھلملاتے ہیں

وہ میری بے کسی وہ وادیٔ غربت کا سناٹا
نہ آنا کچھ نظر ہر چند کوسوں تک نظر جانا

کل خدا جانے کہ بیمار کی حالت کیا تھی
شب کو اس گھر سے جو نکلا وہ پریشاں نکلا

چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہ خدارا چھیڑو
آنسو آنکھوں میں بھر آئے ہیں تقریر کے ساتھ

سوچئے گا جو زمانہ کبھی کچھ فرصت دے
کیا کیا آپ نے اک عاشق دلگیر کے ساتھ

صفی کی شاعری کا جزو اعلیٰ وہ فلسفۂ حیات ہے جو مشرق کا سرمایۂ ناز ہے یعنی دنیا دارالعمل ہے اور عقبیٰ دارالحساب۔ صفی کی تصنیف مثنوی "تنظیم الحیات" نیز اکثر غزلوں میں متذکرہ فلسفہ نمایاں ہے۔ کہتے ہیں ؎

جان کیوں لذت فانی پہ دیئے دیتے ہو
زہر آلود مصائب یہ شکر ہے کہ نہیں
مطمئن آج ہو بیٹھے ہوئے جس دنیا میں
یہ سرا ہے کہ نہیں۔ راہ گذر ہے کہ نہیں
اس خرابات سے اے مست غرور دولت
ہر جگہ سر بہ فلک فتنۂ محشر ہے کہ نہیں

نظر جادو اثر کے بیان کرنے میں صفی نے کس قدر اچھوتا انداز اختیار کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

جام ہی کے ساتھ گردش میں مقدر آ گیا
آنکھ ساقی سے ملائی تھی کہ چکر آ گیا

چشم انتظار کی صورت کشی صفی نے جس خوبی سے کی ہے آپ بھی ملاحظہ کیجئے ؎

پھری ہیں یوں پتلیاں شب غم کو شام ہی سے سحر ہوئی ہے
مگر نہ آنا تھا وہ نہ آئے ادھر کی دنیا ادھر ہوئی ہے

جن دو چیزوں نے میر کو غزل کا استاد منوایا منجملہ دیگر خصوصیات ان کے کلام کی صفائی ہے۔ دوسرا اثر۔ صفی بھی میر کی طرح زندگی بھر ہر دو باتوں پر عامل رہے۔ صفائی اور اثر ان کا شعار تھا۔ مندرجہ ذیل اعترافات ملاحظہ ہوں ؎

صفی کم فرصتی میں جب غزل کی فکر کرتے ہیں
فقط شعروں میں بندش کی صفائی دیکھ لیتے ہیں

ہیں الفاظ آئینۂ حسن معانی
صفی کیا صفائی ہے تیرے سخن میں

دل پر صفی اثر ہو جس کا وہی سخن ہے
تعریف شعر یہ ہے، خود منہ سے واہ نکلے

صفی لکھنوی کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اللہ اللہ تیرے خاکستر نشینوں کا دماغ
یہ بھی کچھ پروا نہیں کب فرش دیبا جل گیا

کہہ رہا ہے دہقاں سے دانہ دانہ خرمن کا
خون دل کے قطروں سے نرخ ہے گراں اپنا

دست دبرد گل چیں سے خار و خس میں شامل ہے
شاخ گل کی زینت تھا ورنہ آشیاں اپنا

اسی طرح ابھی اے انقلاب آئے جا
رہے سہے جو نشاں ہیں انھیں مٹائے جا
کسی کا قصۂ غم قصہ خواں سنائے جا
کہ سو چلا ہے زمانہ اسے جگائے جا

بے لوث محبت ہے جسے ملک سے اپنے
وہ برہنہ پا خسرو بے تاج و نگیں ہے

کل ہم آئینہ میں رخ کی جھریاں دیکھا کیے
کاروانِ عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کیے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

غزلیہ شاعری کے ناسخت والے رنگ سے اپنے دامن کو بچاکر اور خس وخاشاک کو ہٹاکر چمن آرائی اور نکھار پیدا کرنے کی ان کی کوششوں کو دیکھا جائے تو یہ اعتراف کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے کہ دبستان لکھنؤ کی شاعری کو صحیح جادہ پر ڈالنے میں ان کا بڑا حصہ ہے انہوں نے بہت سے خودرو پودوں کی قطع برید کرکے ان کی جگہ خوش رنگ وخوش وضع بیل بوٹے لگائے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں غالب جیسی فلسفیانہ گہرائیاں ہیں اور نہ میر کے جذبات آشوب کی سرمستیاں۔ یہ بھی مبالغہ نہیں کہ کہیں کہیں ماحول پر طاری اثرات کے دباؤ سے ایسے شعر بھی ملتے ہیں سے

میری نعش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

یا

یا رب پڑی رہے میری میت اسی طرح
بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوئے

تاہم عمومی حیثیت سے ان کے اشعار میں جذبات کا نشاط انگیز ٹھہراؤ پایا جاتا ہے عشق و محبت کے متعلق ان کا انداز نظر پاکیزہ ہے۔ بوالہوسانہ نہیں۔

دنیا کی نمود سیمیائی نمود ہے۔ اس کے موجودات دام خیال کے حلقے ہیں۔ یہ تمام باتیں حکیمانہ وزن رکھتی ہیں لیکن اس مفہوم کو تشبیہی پیرایہ میں ادا کرنا کم ندرت خیز نہیں۔ ملاحظہ ہو سے

دنیا ورق بینش ارباب نظر میں
اک تاش کا پتا ہے کف شعبدہ گر میں

صفی کی غزلیہ شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پرانے حدود اور اصول فن میں جدید رنگ کو سمو دینے کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں صفی کے نقش قدم پر بعد کو چلنے والے آگے نکلتے چلے گئے۔ مگر اس کی فضیلت موجد کے حصہ کی بات ہوتی ہے جس کا سہرا ان کے سر ہے۔ حسرت موہانی نے اس باب میں وہ نام پیدا کیا کہ اصلاحی رنگ کے موجد ہونے کا دھوکا ان پر ہونے لگا۔ یہ تو حسرت کی صفائی قلب ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے انھوں نے اُردوئے معلیٰ میں ذیل کی تحریر ثبت کرکے اس امر کی تردید کر دی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"نصیر الدین حیدر اور غازی الدین حیدر شاہانِ اودھ کے زمانہ میں غزل اور اس کی تخیل کا جو انداز تھا وہ اردو اہلِ ادب کی دقیقہ شناس نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی تاسی اور پیروی کیا بہ لحاظ لفظ و بندش اور کیا بہ لحاظ تخیل جس طرح شعرائے لکھنؤ منہمک تھے اس میں ترمیم و اصلاح کی ہمت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ مولانا صفی کی زندگی اور شاعری کا ایک کارنامہ ہے۔"

صفی نہ صرف شاعر تھے بلکہ اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد بھی تھے انہیں اپنی زبان دانی پر ناز تھا جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے ؎

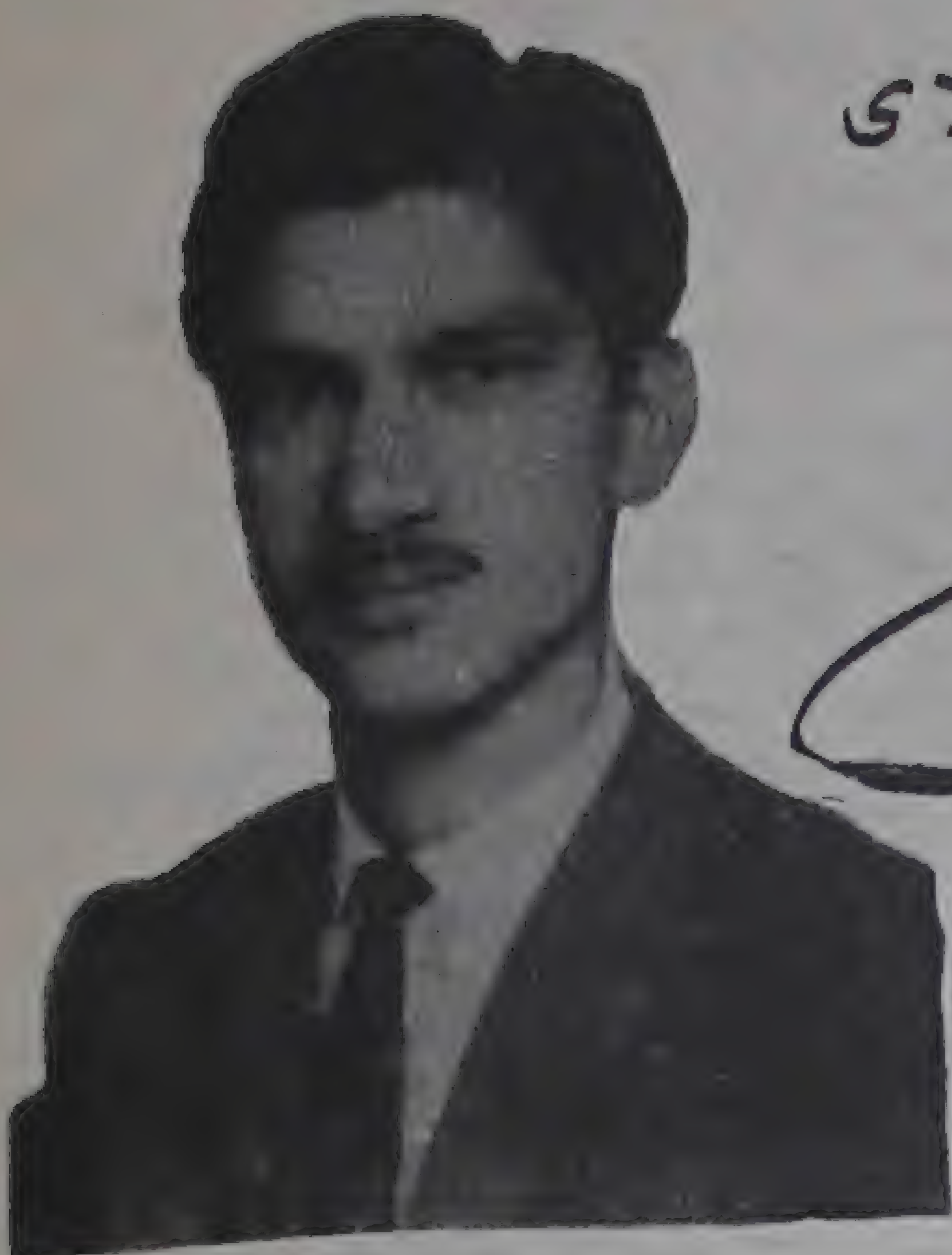
خاص اُردوے معلیٰ ہے صفیؔ جس کا نام
یہ زباں اب نہ رہے گی یہ خدا میرے بعد

سادگی صفی کی غزلیات کا خاص جوہر ہے۔ زبان اور طرز بیان دونوں میں سادگی، صفائی اور دلکشی ہے عاشقانہ مضامین کو نہایت موثر طریقے پر نظم کیا ہے۔ محاورات، روزمرہ تشبیہات کا لطف بھی ہر جگہ برقرار رہا ہے۔ فلسفۂ زندگی اور اپنے عہد کے اہم مسائل پر بھی انہوں نے نہایت خوبی سے روشنی ڈالی ہے اور یہ کہ تغزل کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ کلام کی پختگی ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی کو مسلم کرتی ہے۔ ان کی نظمیں زیادہ تر شیعہ کانفرنس کے جلسوں کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں بعض نظمیں عام دلچسپی کی بھی ہیں۔ نظموں کا عام جوہر پر جوش سادگی ہے اور دوسرا جوہر دلکشی۔ دو چار نظمیں مختلف مقامات کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پر لکھی ہیں جو باوجود اپنے خشک موضوع کے دلکش اور پر لطف ہیں۔ ان کی نظموں میں الفاظ کے ذریعہ سے جو تصاویر کھینچی گئی ہیں وہ ہر لحاظ سے قابلِ داد ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے دور میں پیدا شدہ سیاسی کش مکش سے بھی متاثر ہو کر شعر کہہ گئے ہیں۔ ذیل کی غزل بہ طور نمونہ ملاحظہ ہو ؎

سیرِ گلشن دیکھئے سیرِ بیاباں دیکھئے
دل ہو قابو میں تو سب کچھ دیکھئے، ہاں دیکھئے
اپنی اپنی گا رہے ہیں دونوں شیخ و برہمن
طے بھی ہوتی ہے یہ بحث کفر و ایماں دیکھئے
حق شناسی نام اسی کا ہے کہ دل بھر آئے جب
دیر کو برباد یا مسجد کو ویراں دیکھئے
نقص بینائی سمجھئے فرق اگر آئے نظر
ایک ہی صورت کے ہیں گبر و مسلماں دیکھئے
دیر اسی کو جانئے کعبہ اسی کو مانئے
پوجئے وہ دل جسے ہمدرد انساں دیکھئے
دلِ کے اندر آئیے کیجے حریمِ جاں کی سیر

(بقیہ ص ۳۵ پر)

ناصر زیدی



غزل

پھول صحرا میں کھلا دے کوئی!
میں اکیلا ہوں صدا دے کوئی
کوئی سناٹا سا سناٹا ہے
کاش! طوفان اٹھا دے کوئی
جس نے چاہا تھا مجھے پہلے پہل
اس ستمگر کا پتا دے کوئی
جس سے ٹوٹے مرا پندارِ وفا
مجھ کو ایسی بھی سزا دے کوئی
رات سوتی ہے تو میں جاگتا ہوں
اُس کو جا کر یہ بتا دے کوئی
جو میرے پاس بھی ہے دور بھی ہے
کس طرح اُس کو بھلا دے کوئی
عشق کے رنگ لئے پھرتا ہوں
اس کی تصویر بنا دے کوئی
دِل کے خرمن میں نہاں ہیں شعلے
اپنے دامن کی ہوا دے کوئی
پھول پھر زخم بنے ہیں ناصرؔ
پھر خزاؤں کو دعا دے کوئی

سودیش دیپک



کالا گلاب

کمرے میں ماں کے کمزور بوڑھے قدموں کی آہٹ سنائی پڑی پھر بھی انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ معلوم ہے کس لیے آئی ہیں۔ وہی بات بتانے، جس کا ڈر انہیں گزشتہ گیارہ برسوں سے گھیرے ہوئے ہے۔ سوچا تھا، کوئی بے چینی لاحق ہو گی، کسی قسم کا شاک لگے گا۔ لیکن دل نے جس بے نیازی سے اس حالت کو قبول کر لیا تھا، اس سے وہ پوری طرح مطمئن تھے دریچوں کے شیشوں پر برف گرنے کی ہلکی ہلکی دستکیں پڑ رہی ہیں، تو موسم کی پہلی برف باری شروع ہو گئی! وہ اٹھ بیٹھے۔ وکی بھی ماں کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا ہے، سر جھکائے زور زور سے سانسیں لے رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح ان کی ٹانگوں پر منہ رگڑتا ہے نہ پیار بھری غراہٹ ہی کی ہے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھوں پر چھترا آئے لمبے لمبے بال پیچھے کی طرف سنوار دیئے۔

ماں اُن کے پلنگ پر ہی آ بیٹھیں۔ ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا وہ چُپ چاپ وکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

— "ماں . . . . "

"ہاں بیٹا!"

وہ اُٹھ کر برآمدے میں آ جاتے ہیں۔ بتی جلاتے ہیں۔ ننگا ہیں آنگن کے باغیچے پر چلی گئی — سینکڑوں سُرخ گلاب جو ٹھنڈ کی وجہ سے پہلے ہی بدرنگ ہو چلے تھے۔ کہر آلود دھندلی روشنی میں کیسے کالے کالے نظر آ رہے ہیں! کل مالی سے کہہ کے یہ پودے اکھڑوا دیں گے۔

وہ ہلکے قدموں سے اس کمرے میں گئے جیسے ڈر رہے ہوں، آہٹ پا کر کہیں وہ جاگ نہ اٹھے! نہیں میں اُسے نہیں دیکھوں گا۔ اس کے سرہانے والی کھڑکی کھول کر وہاں کھڑے ہو گئے۔ برف کے ذرّے اُڑ اُڑ کر اپنے ٹھنڈے ریشمی لمس سے کہیں گہری ٹھنڈک اور راحت بخش رہے ہیں! برف گرتی رہی اور لگاتار گرتی رہی۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کی چارپائی کے قریب آ بیٹھے۔ اتنے کھلے پلنگ پر ننھی مُنی کا منی کو دیکھ کر، بیکراں سمندر میں کسی چھوٹے سے ناؤ کی بات دھیان میں آ جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر وہی جانی پہچانی مسکان — ایک مرمریں چہرے پر کسی سنگتراش کی چابکدستی — رات بارہ بجے کے قریب وہ ماں سے اور اس کے کہنے پر جب وہ ناچار اپنے کمرے میں آئے تھے، تب یہی مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

تو وہ مر گئی! اس جدوجہد اور جنگ، جو وہ پچھلے سال سے لڑتے آ رہے تھے، کا آخر یہی انجام ہونا تھا۔ ہو گیا۔ دل میں کہیں بھی شکست خوردگی کا احساس یا ندامت نہیں۔ بس احساس ہے تو ایک تنہائی کا، ایک سکون کا۔

اس کی ننھی سی بند مٹھی کو انہوں نے ہاتھوں میں تھام کر سہلانا شروع

گیا تھا۔ وکی اب بھی ان کی ٹانگوں پر سر رگڑ رہا تھا۔ وہ زوروں سے کانپ رہا ہے۔ انہوں نے اس کا منہ ٹانگوں کے بیچ دبا لیا۔ اس کی کپکپی کم ہوئی، پھر بالکل جاتی رہی۔ ماں کو کچھ دیر کے لئے آرام کرنے کے لئے کہا۔ ان کے چہرے پر ذرا اختلاف کی جھلک ابھری تھی لیکن جانے کیا سوچ کر وہ چپ چاپ اُٹھ گئیں۔

کامنی نے کتنی بار کالے گلاب کی بات کہی تھی۔ آج دیکھتی تو پُرمسرت حیرت میں ڈوب جاتی۔ پچھلی رات ماں نے زبردستی، کامنی کے کمرے سے انہیں اٹھا دیا تھا۔ ان کے چہرے پر وہی مایوسی تھی جو بہو کی موت کے وقت طاری تھی۔

" ماں! کیا آج ..... ! "

" ہاں بیٹا ! "

ماں نے کامنی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا" انہوں نے اپنی لمبی عمر میں کتنی ہی موتیں دیکھی ہیں۔ بغیر کسی پڑھائی یا ڈاکٹری علم کے، انہیں اس آنے والے مہمان کا احساس بخوبی ہو جاتا ہے۔ ایک سختی پچھلے کچھ دنوں سے اُن کے چہرے پر عود کر آئی ہے۔ کسی آنے والے سانحہ کے لئے وہ ذہنی تیاری کئے بیٹھی ہیں۔

آج اتوار ہے۔ مدر روزی نے آج چرچ میں اس کے لئے خصوصی دعا کا اہتمام کیا ہوگا۔ وہ باٹنی کے ڈاکٹر ہیں بس سائینس ہی اوڑھنا بچھونا ہے ان کا۔ ایسی باتوں پر انہیں بالکل اعتقاد نہیں۔ لیکن اس وقت انھیں بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ کیوں میری بچی اتنی من موہنی ہوئی۔ وہ ایک عام سی لڑکی ہی ہوتی۔ تاکہ جو دیکھتا بندھ سا نہ جاتا۔ بیوی مری تھی تو انہوں نے صبر کر لیا تھا کہ کوئی طاقت ہے جسے قدرت کہتے ہیں وہ ایسے ایسے ناٹک کھیلتی ہی رہتی ہے۔ لیکن یہ دوسرا ناٹک بھی انہیں کے یہاں ہی کھیلا جانا تھا؟

وہ بالکل ماں پر گئی تھی۔ وہ ہی پگھل پگھل جانے والے چہرے کے نقوش۔ ویسی ہی مسکراہٹ۔ جسے دیکھ کر آدمی ایک دم پگھل جائے لیکن ان کا دل و دماغ تو آٹھوں پہر پیڑ پودوں کی زندگیوں میں الجھا رہتا۔ دل تھوڑا ادھر مائل ہوا تھا کہ بیوی کی زندگی کا انت ہی ہو گیا۔ کامنی بھی اسی کی طرح چپ چاپ چلی گئی ہے۔ کہیں یہ سب کچھ پچھلے جنموں ..... انہوں نے زور سے سر جھٹکا جیسے غلط راہ پر جاتے خیال کو روک دیا ہو۔

وہ مر گئی تو بچی کے لئے کتنا کچھ کرنا پڑا۔ مزید تحصیل علم کے لئے باہر نہ جا پائے۔ سائنس میں نیا کچھ کرنے دھرنے کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

بوڑھی ماں کا سکھ گوروؤں میں زیادہ اعتقاد ہے۔ پچھلے دنوں گھر میں اکھنڈ پاٹھ ہوتا رہا ہے۔ بھوگ پڑا تو وہ کامنی کو گود میں لئے اس کمرے میں گئے تھے گرنتھی نے اس کے ہاتھوں میں پرساد دے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ایک ٹک کامنی اس کی لمبی سفید داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔ "ایک بات پوچھوں بابا!"

" ہاں پوچھو میرے پُتر جیو "

گرنتھی نے شفقت کے لہجے میں کہا۔

" آپ کی داڑھی کیسی سفید ہے۔ کسی خاص صابن سے دھوتے ہیں ابے آپ ! "

بوڑھے گرنتھی کے چہرے پر سے ایک مسکراہٹ آتے ہی غائب ہو گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں سونی پڑ گئی تھیں اور وہ — واہیگورو، واہیگورو کہتے کہتے آگے بڑھ گیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے واقعات کا لامتناہی سلسلہ، سلسلہ وار دماغ کے پردے پر دہرایا جا رہا ہے۔ اپنے سے دو فٹ اونچے وکی کے ساتھ کامنی کانونٹ سے لوٹ کر آ رہی ہے۔ بستہ وکی کی گردن میں لٹکا ہے۔ نئے دیکھنے والے، اُس چیتے کی طرح کتے کے ساتھ اُسے دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے تراشیدہ بالوں کو ایک جھٹکا دے کر منہ کے ایک طرف گراتی ہے۔ پھر دوسری طرف۔ یہ سلسلہ گھر پہنچنے تک چلتا رہتا ہے۔

جو کچھ وہاں پڑھتی ہے اس کی بنا پر پاپا کا امتحان لیتی ہے جس میں عموماً یہ فیل ہو جایا کریں۔ مثلاً اس نے خرگوش کے بچے کی انگریزی پوچھ لی بالشت بالشت بھر کے لمبے تکنیکی الفاظ پر قدرت رکھنے والے ڈاکٹر پریشان وہ اپنی ننھی سی ناک سکوڑ کر کہتی — آپ وہاں کیا پڑھاتے ہوں گے؟ اتنی ذرا سی انگریزی تو پاپا کو آتی نہیں۔"

کالج جنہوں نے چلا رکھا ہے، بہت مالدار ہستی ہیں۔ سارا روپیہ انہیں کا لگا ہے۔ اسی لئے وہی کرتا دھرتا بھی ہیں۔ کالج میں کوئی جلسہ تھا۔ کامنی ساتھ تھی اور دکی بھی۔ سیٹھ نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ کامنی نے ان کا ایک کان پکڑ لیا۔ سیٹھ جی کی تنک مزاجی زبان زد خاص و عام ہے۔ پاس بیٹھے لوگوں کے دل دھڑکنے لگے۔ کامنی کلکاری بھر کر کہتی ہے ـــــ "پاپا! ان کے کان تو دکی سے بھی بڑے ہیں۔"

اور سیٹھ جی ہیں کہ ہنستے ہی جا رہے ہیں۔ سب کی جان میں جان آگئی تھی۔ اب اکثر ان کی کار کامنی کو گھر لے جانے کے لئے آنے لگی تھی۔ جو کام کمیٹی کی سفارش سے نہ ہو پاتا وہ اب کامنی کو پٹی پڑھا کر پروفیسر لوگ کرا لیتے ہیں۔ ایسے پہاڑی مقام پر اتنی بڑی جگہ ہموار کرا کے کامنی کے کہنے پر ہی ٹینس کورٹ بنا دیا گیا ہے۔

ماں زندہ تھیں تب بھی اکثر شام کا کھانا ہوٹل پر ہی ہوا کرتا تھا اب تو روزانہ یہیں آکر کھاتے ہیں۔ بوڑھا بیرا کامنی سے ہی آرڈر لیتا ہے۔

"رانی بیٹی! آج کیا کھائیگی؟"

"برین"

"کس کا؟"

اس کے سر کی طرف انگلی اٹھا کر کامنی کہتی ـــــ "تمہارا"

اس پر دونوں کی ایک سازشی ہنسی ابل پڑتی۔

کئی بار کالج کی لڑکیاں گھر آجاتی ہیں۔ کامنی کی وہ شام بڑی شاندار رہتی ہے۔ ان سے جی بھر کر چٹکلے سنتی ہے پھر رات کو دادی کو سنا سنا کر ان کی جان کھاتی ہے۔

جب سیلانی، سردیاں اترتے ہی پرندوں کی طرح میدانوں میں اتر جاتے ہیں تب اتنا بڑا شہر سکڑ کر چھوٹا سا بن جاتا ہے بھیڑ کی وجہ سے ٹوٹے تعلقات، پھر سے قائم ہونے لگتے ہیں۔ قریبی رشتہ یا تعلق نہ بھی سہی پر ایک دوسرے کے بارے میں علم تو رہتا ہی ہے۔ شام کے وقت لمبی لمبی سیروں پر نکلنے والے پروفیسر، ان کی بچی، اور ایک درباری کی طرح کبھی آگے کبھی پیچھے چلتا ہوا دکی۔ سب انہیں بخوبی جانتے ہیں۔

پھر اچانک اسے بخار رہنے لگا۔ یہاں کا چھوٹا موٹا علاج چلتا رہا۔ کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ لوگوں کے کہنے پر بچی کو دلی لے گئے۔ چار پانچ دن رکنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے طرح طرح سے ٹیسٹ لئے اور کہا صرف ایک لفظ کینسر۔ دونوں لوٹ آئے۔ کامنی کا کانونٹ جانا بند ہو گیا۔

تعطیل کے دن وہ سارا سارا دن اس کے پاس ہی گذارتے ہیں۔ لال رنگ کی چھوٹی سی گارڈن چیئر میں بیٹھی وہ سرخ گلاب سی لگتی ہے۔ دادی کو تو پوجا پاٹھ سے ہی فرصت نہیں۔ چاول، کبھی کپڑے اور کبھی ناریل وغیرہ اس کے ہاتھوں سے چھوا کر غریبوں میں بانٹتی رہتی ہیں۔ وہ چپ چاپ بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ اس اچھے موسم کے بعد پھر سے کہرے اور برف کے دن آئیں گے۔ تب ان پھول پودوں کی زندگی پر کیا گزرے گی؟

ایک لمبی چپی کے بعد ایک چھوٹے سے سوال سے کامنی انہیں دہلا دیتی ہے "پاپا! اب میں کانونٹ کیوں نہیں جاتی۔؟"

"بیٹی تمہیں بخار جو ہے۔"

"پاپا! اب تو بہت دن ہو گئے۔ ہمارے ساتھ بنٹی پڑھتا ہے نا! اس کو بھی فیور تھا۔ وہ تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں جلدی ٹھیک کیوں نہیں ہوتی ـــــ؟"

ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا اس وقت۔ کسی ہلتی ہوئی شاخ پر ان کی نگاہیں مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اس کی حرکت بند ہوئی کہ بیوی کی طرح یہ بھی چلی جائے گی۔

سیٹھ صاحب اب قریب قریب روزانہ ہی ادھر آ نکلتے ہیں۔ کامنی نے ان سے بھی ایک بار یہی پوچھ لیا۔ وہ باہر اٹھ آئے۔ ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ان کی پیٹھ لگاتار اٹھ بیٹھ رہی ہے۔ ڈاکٹر بھی اٹھ کر پاس آکھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے کندھے چھو کر دلاسہ دیتے ہیں۔ وہ سنبھل کر فیصلہ کن لہجہ میں کہتے ہیں ـــــ "اچھا تو آپ فکر نہ کریں۔ کہیں بھی کیوں نہ لے جانا پڑے۔ میں اس کا علاج کراؤں گا۔"

ڈاکٹر چپ ہیں۔ کیا کہیں؟ پیسے کی ضد کچھ کم نہیں ہوتی۔ آسانی سے نہیں ٹوٹا کرتی۔

انہیں دنوں بمبئی میں معالجوں کی ایک عالمی کانفرنس ہونے جا رہی تھی۔ سیٹھ صاحب کا پیسہ اور مدد، روزی کی رسائی۔ امریکہ کے ڈاکٹر

آرتھر کینسر کے شہرہ آفاق معالج ۔ ایک لمبی سی قیمتی کار میں بیٹھے یہاں پہنچ گئے ہیں

کامنی نے بامحاورہ انگریزی میں ان سے "ڈسنیلینڈ" کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ ڈاکٹر آرتھر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مدر نے بتایا کہ کانونٹ کی سب سے ہوشیار لڑکی ہے۔ ڈاکٹر نے ساری رپورٹیں پڑھ ڈالیں۔ خود بھی دیکھا بھالا۔ پھر بڑی دیر تک لمبا سا سگار بغیر سلگائے دانتوں سے کترتے رہے۔ انہوں نے بھی خون کا ہی کینسر بتایا۔

سیٹھ صاحب بولے "اب کیا ہوگا کہاں علاج کرایا جائے!"

"اب کچھ نہیں بنے گا" ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ "بیماری آخری اسٹیج پر پہنچ چکی ہے اور ویسے بھی . . ."

"ہم اسے امریکہ لے چلتے ہیں۔ آپ وہاں تو علاج کر ہی سکیں گے۔"

سیٹھ صاحب اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے کے لئے تیار تھے۔

ڈاکٹر آرتھر نے مایوس لہجہ میں کہا "اب کچھ نہیں بنے گا۔ "لیٹ ہر ڈائی پیس فلی اِن ہر ہوم۔"

سیٹھ صاحب کا سر جھک گیا۔ مدر روزی جلدی جلدی مالا کے منکے پھیرنے لگیں۔ اور ڈاکٹر کھڑکی سے باہر دیکھ رہے ہیں۔ ایک بے جان سڑک لیٹی پڑی ہے۔

سب باہر آ گئے ہیں ڈاکٹر آرتھر پھر بولتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے ازحد افسوس۔ ڈاکٹری میں اتنی عمر بیت گئی ہے۔ آج مایوس ہونا پڑ رہا ہے۔ لگتا ہے میڈیکل سائنس کچھ ہے ہی نہیں۔ آئی کانٹ سیو دِس چائلڈ"

رخصت ہوتے ہوئے پھر کہا "دیکھئے ڈاکٹر مہتہ! آپ مطالعہ کریں خصوصاً مذہبیات کا مطالعہ۔ آپ، مشرق کے لوگوں کے پاس اتنا اعتقاد کا ذخیرہ ہے کہ اس میں مستغرق ہو کر آپ اس غم کو قطعی بھول جائیں گے ہم لوگوں کی بدقسمتی تو دیکھئے کہ ہمارے پاس یہ بھی نہیں رہا۔"

ڈاکٹر آرتھر کے جانے کے بعد اب صرف ایک روٹین۔ معمول باقی ہے محض اس کا انتظار ہے۔ تب اس کی آمد کے بعد جو بھی وقوع پذیر ہوگا اس کا پتہ تو کسی کو نہیں ہے نا۔

روز کا آنا مدر روزی کا معمول بن گیا ہے۔ ایک ہاتھ سے کامنی کی پیشانی سہلاتی رہتی ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں روزری کو کس کر پکڑے رہتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو کراس بناتی ہیں ان کے چہرے پر کیسا اکیلا پن چھایا رہتا ہے اپنے ناتے رشتوں کو ختم کر کے، یہاں پرائے دیس میں، ایک بچی کے موہ میں جکڑی ان کا دل کیسا بے چین رہنے لگا ہے۔

کامنی کے ساتھ پڑھنے والے بچے بھی اپنی ماؤں کے ساتھ آتے رہتے ہیں۔ پاس جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی شرارتوں کے قصے لے بیٹھتے ہیں۔ کہتے کہتے تھکتے نہیں۔

آج کل وہ خوب سج سنور کر بستر میں پڑی کامیکس پڑھتی رہتی ہے۔ یا دُور دراز کی جگہوں کی تصویریں کتابوں سے کھوج کھوج کر انہیں حسرت بھری نظروں سے تکتی رہتی ہے۔ اُسے بھی تو ایک نامعلوم لمبے سفر پر جانا ہے۔ شاید ان میں سے ہی کسی دیش کو!

شہر! کسی خالی مکان کی طرح سونا پڑا ہے۔ لوگ باگ اپنے اپنے گھروں میں لوٹ چکے ہیں، جیسے کوئی بڑا میلہ اٹھ گیا ہو۔ اب وہ پہلے کی طرح لمبی سیر پر نہیں نکل سکتی۔ تھوڑی دور تک ہی جانا ہوتا ہے۔ اونچے اونچے درخت سڑک کے کنارے، چپ چاپ کھڑے، انہیں آتا جاتا دیکھتے رہتے ہیں کوئی شناسا مل بھی جاتا ہے تو اس بیماری کے موضوع کو نہیں چھیڑتا۔ سبھی لوگ سب کچھ جان چکے ہیں۔ کامنی، تھوڑا ہی چل کر اب تھک جاتی ہے۔ اس لئے اب یہ تھوڑا گھومنا پھرنا بھی بند ہو گیا ہے۔

وکی اس کی چارپائی کے قریب ہی جما رہتا ہے۔ حیوانات کے بارے میں روایت ہے کہ کسی گھٹنا کی بُو انہیں پہلے ہی مل جاتی ہے شاید وکی بھی . . . نوکر دودھ کا برتن اس کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ سونگھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔

کامنی اب چپ چپ پڑی رہتی ہے۔ اتنی ساری دوائیں، عیادت کے لئے آنے والوں کا تانتا، کانونٹ جانا بند، گھومنا پھرنا ختم، کمزوری کی وجہ سے اُٹھ تک نہ پانا، دن رات چارپائی پر پڑے پڑے کاٹنا، دادی کا اٹھتے بیٹھتے جاپ۔ پاٹھ، یہ سب دیکھ دیکھ کر وہ ڈرے دب گئی ہے۔ شاید اسے پتہ چل چکا ہے کہ کچھ ہونے جا رہا ہے۔ مرنے جینے کا چکر، جو سنتوں اور جوگیوں کا موضوع ہے، وہ بھی محسوس کرنے لگ پڑی ہے لیکن زبان پر لانے سے قاصر ہے۔ کبھی کبھی پوچھتی ہے،

"پاپا میری عمر کتنی ہے؟"

"آٹھ برس بیٹا!"

"میں بڑی ہو جاؤں گی، آپ جتنی۔"

"ہاں بیٹا۔"

اچھا تو مجھے لال رنگ کی کار لا دینا۔ اُسے خوب چلایا کروں گی"

ڈاکٹر آرتھر کے مشورہ میں کوئی ابہام نہیں۔ مطالعہ نے ان کے من کو قائم رکھا ہوا ہے۔ محسوس کرتے ہیں کہ وہاں اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے اس آنے والی گھڑی کا مقابلہ وہ آسانی سے کر پائیں گے۔ کبھی کبھی یہ بھی لگتا ہے کہ ان کے ساتھ کہیں نہ کہیں زیادتی ضرور ہو رہی ہے۔ اس جہان میں وہی ایک رہ گئے ہیں، جو بس فرض نبھاتے جائیں۔ اور نتیجہ جو بھی ہو، کیسا بھی ہو۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں، اچھا اس پر ایمان مستحکم نہ بھی کریں تو اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟

کالج سے لوٹتے ہیں تو کامنی سراپا کھڑکی پر کھڑی ملتی ہے۔ آج آئے تو وہاں نہیں تھیں۔ گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ لمبے لمبے ڈگ بھر کر اندر پہنچتے ہیں — دیکھا وہ انسائیکلوپیڈیا کا والیوم لئے بیٹھی ہے۔ اتنی وزنی کتاب بڑی مشکل سے تھام رکھی ہے۔ جھوٹتے ہی پوچھتے ہیں — "کامنی بیٹا! کیا دیکھ رہی ہے؟"

دیکھو پاپا! آپ کہتے ہیں اس میں ساری باتیں لکھی ہوئی ہیں۔" وہ روٹھنے کے انداز میں کہتی ہے۔ "لیکن کالے گلاب کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ملتا۔"

"کالا گلاب ؟"

"ہاں پاپا! میں کالا گلاب دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ڈاکٹر مہتہ لاجواب۔ والیوم اس کے ہاتھوں سے لے کر رکھ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر آرتھر نے زیادہ سے زیادہ چھ مہینوں کا عرصہ دیا تھا۔ مدت پوری ہو رہی ہے۔ کامنی کا چہرہ سردیوں کے پھولوں کی طرح سفید پڑ گیا ہے۔ سانس لیتی ہے تو نرخرا باقاعدہ بجتا ہے۔

تول تول کر قدم بڑھاتی، ہاتھوں میں چائے کا پیالہ لئے کامنی۔ وہ بڑھ کر اُسے چھاتی میں بھر لیتے ہیں کسی خوف زدہ پرندے کی طرح اُس کا سارا بدن دھڑک رہا ہے۔ وہ نم ہو آئی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں —

"بیٹا! نوکر لے آتا۔"

"نہیں پاپا! آپ سارا سارا دن کام کرتے ہیں، نہیں تھکتے" ذرا مچل کر کہتی ہے۔ "میں ایک کپ بھر اٹھانے سے تھک جاؤں گی؟" وہ گھبرا اٹھے۔ ایک دم اُسے گود سے الگ کر دیا۔ اتنی ساری باتیں وہ کیوں کر کہہ پائی؟ اس آنے والے قدموں کی آہٹ جیسے صاف سنائی پڑنے لگی ہے۔ دروازے پر دستک پر دستک — موت کا لاؤ لشکر — آؤ بھگت کے لئے تیار ہو جاؤ

صبح ماں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب انہیں کالج نہیں جانا چاہئے۔ کسی بھی وقت . . . بڑے دن ہیں۔ سر شام ہی گھنٹوں کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ ساتھ والے چرچ کے کراس پر گھنٹوں ایک پرندہ آکر بیٹھا رہتا ہے۔ ڈاکٹر مہتہ کو لگتا ہے وہ ان کے گھر کی طرف ہی ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔ شام سے ہی جیسے یہ رات کمروں میں گھس پڑی ہے۔ ماں سر جھکائے۔ تیز تیز قدموں سے کبھی اس کمرے میں جاتی ہیں کبھی اس کمرے میں۔ گویا اس آنے والے کے لئے قلعہ بندیاں کر رہی ہوں۔ چرچ کے کراس پر بیٹھنے والا وہ خوفناک پرندہ بھی آج وہاں نہیں ہے۔ بادلوں نے شہر پر، مکانوں پر دھاوا بول دیا ہے۔ سر شام اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا ہے۔ انہوں نے سوالیہ نظریں ماں پر ڈالیں۔ ماں نے جیسے ہونٹوں میں ہی کہا ہے — ہاں آج . . . . . .

وہ کامنی کے پاس جا بیٹھتے ہیں۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لے لیا ہے۔ ڈر گئی ہے۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں اور بھی بڑی نظر آ رہی ہیں۔ وہ لگاتار ان کی جانب دیکھ رہی ہے۔

"پاپا! ڈیتھ کیا ہوتی ہے؟"

انہوں نے اس کی پیشانی پر بکھرے بال پرے ہٹا دیئے۔

"پاپا! میں مروں گی تو آپ سے باتیں تو کرتی رہوں گی نا؟"

انہوں نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔

"پاپا! وکی کو میرے ساتھ ہی رہنے دینا۔ وہاں کاٹنے جاؤں گی تو میرا بستہ اٹھایا کرے گا۔"

پھر جیسے تھک کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

انہوں نے باہر کی طرف نگاہ اٹھائی۔ کھڑکی پر جھک آئے بوڑھے

پیڑ کے پتے ہوئے ہل رہے ہیں اور ان میں گذرتی ہوا جیسے بین کر رہی ہے
وہ اسی کے پاس بیٹھے رہے اور آنے والے دنوں کو سوچتے رہے اب تو وہ یہاں سے چلی ہی دیں گے۔ اجنبی شہر کی کھڑکیوں سے تو کامنی کا چہرہ نہیں جھانکے گا۔ کام۔ کام اتنا کام کہ آدمی مشین ہی بن جائے۔ یہ راہ بھی تو ان ہی جیسے لوگوں کے لئے ہے باہر کی دو ایک یونیورسٹیوں کے بلاوے تو اب بھی پڑے ہوں گے، کل انہیں فائیلوں میں تلاش کریں گے۔ ماں تو پہلے ہی کسی تیرتھ استھان پر جا رہنے کا فیصلہ کئے بیٹھی ہیں۔ اتنا کچھ ہاتھوں سے گیا لیکن دل نہیں چھوڑا مگر اس بچی نے انہیں شکست دے دی ہے۔ توڑ ہی ڈالا ہے۔

"پاپا! سو جائیں۔"

وہ ایک جھٹکے سے، اس لمبی یاترا سے لوٹ آئے۔ کہیں ماما اسے تو نہیں کہتے؟ وہ ایک دم بھلی چنگی نظر آ رہی ہے۔ وہی جانی پہچانی مسکان بھی اس کے ہونٹوں پر لوٹ آئی ہے۔

"نہیں بیٹا! ٹھیک ہے۔"

"نہیں پاپا! اب مجھے کوئی ڈر نہیں لگتا۔ آپ جا کر سو جائیں"

ہاں میری بچی! تجھے اب کیا ڈر؟ مسکرانے کی وجہ سے اس کے گالوں پر وہی گڑھے۔ اسی پرانے انداز سے سر کو جھٹکا دے کر اس نے بالوں کو آدھے چہرے پر گرا لیا ہے۔ ماں آ گئی ہیں۔ انہوں نے لال رنگ کے کمبل سے اسے کندھوں تک ڈھک دیا ہے۔ کامنی کو اسی طرح مسکراتا چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں اٹھ آئے ہیں۔

جب اٹھے تو موٹی موٹی بوندیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ درختوں کے پتوں سے اٹھتی ان کی آواز صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ بلبلاتی شاخیں تیزی سے سر دھن رہی ہیں۔

انہیں معلوم تھا۔ آج ہی ......

لیکن وہ کامنی کو جاتا ہوا کیسے دیکھ پائیں گے؟ ماں کا ہی اس کے پاس ٹکنا کافی ہے۔

باہر برآمدے میں پیروں کی آہٹ۔ ماں نے سامنے والا دروازہ آ کر کھول دیا ہے۔ باہر برف ہی برف۔ اندر کوئی آ رہا ہے۔ سر سے پیروں تک ڈھکا ہوا جیسے کوئی قطب شمالی کا راہگیر۔ اس نے کوٹ اتارا۔

مدر روزی ہیں۔ شاید نوکر انھیں خبر دے آیا ہوگا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر کامنی کا ماتھا چوما پھر کراس بنایا۔ باہر سے لائے ہوئے ڈھیر سارے پھول اُس کے پاس رکھ دیئے۔ کانونٹ کی بڑی کلاسوں کے چار پانچ بچے بھی آئے۔ انہوں نے بھی اس کے چہرے کے پاس بہت زیادہ ٹہنیوں پر لگے گلاب رکھ دیئے۔

اور اب کامنی کے لیے گلاب ہی گلاب ہیں۔ اس کے چہرے کے چاروں طرف پڑے ہوئے پھولوں کا عکس ــ کامنی کا سفید پھول سا چہرہ کوئی کالا گلاب ہی نظر آتا ہے۔

++++++++++++++++++++++++

بقیہ صفی لکھنوی

++++++++++++++++++++++

زلزلوں نے جس کو ڈھایا ہے وہ ایواں دیکھئے
تا کجا سرمستیٔ نظارۂ باغ و بہار
چشم عبرت سے ذرا گور غریباں دیکھئے
مہر بر لب دیکھئے محفل کی محفل زیر خاک
بے کسی کو ان خزانوں کا نگہباں دیکھئے
حال اپنا اب یہ ہے بیداریٔ احساس سے
سوتے سوتے جس طرح خواب پریشاں دیکھئے
ذرہ ذرہ کو زمیں دل کے ہے اک اضطراب
کب خدا جانے ٹھہرتا ہے یہ طوفاں دیکھئے
انقلاباتِ جہاں کی فکر ہی کیا ہے صفی
جو دکھائے گردشِ گردونِ گرداں دیکھئے

مولانا صفی ۲ جنوری ۱۸۶۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے پروان چڑھے اور عروج کو پہنچے اور تاحیات لکھنو کے غزل گو شعراء کی انجمن "معیار و بہار ادب" کے صدر رہے اور زبان و فن کی خدمت کرتے ہوئے جولائی ۱۹۵۰ء میں ۸۸ سال کی عمر پا کر رحلت فرما گئے۔ ●●

عادل منصوری

غزل



پھیلے ہوئے ہیں شہر میں سائے نڈھال سے
جائیں کہاں نکل کے خیالوں کے جال سے

مشرق سے میرا راستہ مغرب کی سمت تھا
اس کا سفر جنوب کی جانب شمال سے

کیسا بھی تلخ ذکر ہو کیسی بھی ترش بات
اُن کی سمجھ میں آئے گی گل کی مثال سے

چُپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں کچھ بولتے نہیں
بچے بگڑ گئے ہیں بہت دیکھ بھال سے

رنگوں کو بہتے دیکھئے کمرے کے فرش پر
کرنوں کے وار روکئے شیشے کی ڈھال سے

چہرہ بجھا بجھا سا پریشان زُلف زُلف
اللہ دشمنوں کو بچائے وبال سے

پھر پانیوں میں نقرئی سائے اتر گئے
پھر رات جگمگا اٹھی چاندی کے تھال سے

دو گھروں کے درمیاں

دو گھروں کے درمیاں
ایک سونا راستہ
راستے میں خواہشوں کی خندقیں
خندقوں میں ہانپتے چیتوں کے سائے۔
ایک گھر کی کھڑکیاں
دوسرے گھر کے کواڑوں کو بلائے
اور کالے سنتری
چیختے ہیں رات بھر
کوئی بھی آنے نہ پائے
کوئی بھی جانے نہ پائے

ہوٹل امپیریل میں

امپیریل کی چائے کی پیالی سے اٹھی بھاپ میں
ابتدائی رات کی پرچھائیاں گم ہو گئی ہیں
سامنے دیوار پر جلتی ہوئی۔
لال پیلی آسمانی
بتیوں کے عکس کی ٹوٹی ہوئی قوسِ قزح
پانی کے گلاسوں میں پگھلتی جا رہی ہے
"ایش ٹرے" کے چہرے پر
بجھتی ہوئی سگرٹ کے جلتے ہوئے زخموں پہ
تیری یاد پہرہ دے رہی ہے
گھومتے پنکھے کے نیچے میز پر
اخبار تھر تھر کانپتا ہے۔
جسم میں تنہائی کا کالا سمندر ہانپتا ہے۔

بدیع الزماں اعظمی

ہیروں کی کہانی تاریخ کی زبانی

قیمتی پتھر جنھیں ہم ہیرے کہتے ہیں دراصل وہ معمولی پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو قدرت کے ہاتھوں زمین کی تہوں کے نیچے کروروں برس تک مدفون رہ کر اوپری چٹانوں کا دباؤ کھانے اور زمین کی اندرونی حرارت کا اثر قبول کرنے کے بعد جلا پاکر نورانی پتھر بن جاتے ہیں۔ گویا ان کے اندر بے پناہ ایٹمی توانائی مرکوز ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک کے مایۂ ناز سائنسداں مسٹر سی وی رمن کی تحقیق ہے کہ ہیرے دراصل کوئلے کے ڈلوں کی منقلب صورتیں ہیں۔

یوں تو ہیروں کے متعلق دیو مالائیں بھی ہیں، اور فسانے بھی جو زبان زد خواص و عام ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ہیرے اژدہوں کے سروں میں جنم پاتے ہیں اور ان کے سروں کی زینت بنتے ہیں۔ "سندباد کی ہیروں کی گھاٹی" سے کون نہیں واقف کہ جہاں سے عقاب اپنی چونچ میں ہیروں کے ڈلے لئے پرواز کرتے تھے۔ اس افسانے کی اصلیت قرین قیاس یوں ہے کہ جہاں کہیں کان کنی کے دھندے کی ابتدا کی جاتی تھی وہاں ارواح خبیثہ کے برے اثرات سے بچنے کے لئے سب سے پہلے جانوروں کی قربانی کی جاتی تھی۔ جن کے گوشت کے لوتھڑے بے شک عقاب یا دوسرے شکاری پرندے اپنی چونچوں میں لے کر وہاں سے پرواز کرتے رہتے تھے یہ اور بات ہے کہ سندباد کے قصے میں جس گھاٹی کا ذکر ہے وہاں اسی طرح ہیرے بکھرے رہے ہوں جس طرح آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں بعض ندیوں کی گھاٹی میں ہیرے پائے جاتے ہیں۔

قدرت نے ان انمول خزانوں کو زمین کے اندر چھپا رکھا تھا کہ ابن آدم اپنی عقل و دانش سے کام لے کر انھیں کھوج نکالے اور مصرف میں لائے۔ دنیا میں ہیروں کی پیداوار کے تین خاص خطے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارا ملک بھی ان میں سے ایک ہے۔ دوسرا خطہ جنوبی امریکہ میں اور تیسرا خطہ جنوبی افریقہ میں ہے۔ جنوبی امریکہ اور جنوبی افریقہ کے خطے تو ابھی حال کی دریافت ہیں کیوں کہ یہ دونوں خطے یا تو غیر آباد تھے یا غیر مہذب قبائل سے آباد تھے۔ جن کا شعور پختہ نہ تھا۔ چونکہ ہندوستان زمانہ قدیم سے ایک خاص تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ اور یہاں کے باشندے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی منزلیں طے کر چکے تھے۔ اس لئے یہاں کے لوگوں نے قدرت کے اس انمول خزانے کو بہت پہلے کھوج نکالا تھا۔ دکن کی ندیوں کی گھاٹیوں میں اور دکن کی سنگلاخ زمین کے اندر اتر کر ہیرے دستیاب کئے گئے جو ہندوستان کے فرماں رواؤں کے تاج اور خزانہ کی زینت بنتے رہے۔ مشہور فرانسیسی سیاح ٹیورنیر رقمطراز ہے کہ اس نے ۱۶۴۵ء میں گولکنڈہ کی کانوں میں ساٹھ ہزار مزدوروں کو کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ کانیں جیسا کہ اُسے مقامی باشندوں سے معلوم ہوا سیکڑوں سال قبل دریافت ہو چکی تھیں۔ گولکنڈہ ہیرے کی صنعت کا خاص مرکز تھا۔

ہندوستان کی اس صنعت کو برازیل (جنوبی امریکہ) کی دریافت

ے پہلا دھکا اور جنوبی افریقہ کی کانوں کی دریافت سے دوسرا دھکا لگا۔ بروقت ہندوستان میں بہت کم ہیرے دستیاب ہوتے ہیں۔ اور یہاں سے ان کی برآمد بھی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ برازیل کی کانیں ۱۷۲۵ء میں دریافت ہوئیں سب سے پہلے ضلع ٹیجوکو کان کنی کا مرکز بنا Diamantine اس وقت اس کام کے لئے سب سے اہم ضلع ہے۔ ہیرے پلیٹو کی چٹانوں کے اندر اور بعض ندیوں کی گھاٹیوں میں پائے جاتے ہیں۔ برازیل کی کانوں میں ۱۸۴۵ء تک بیس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ صرف باھیا میں ۱۸۵۸ء میں جو ہیرے دستیاب ہوئے ان کا مجموعی وزن ۵۴ ہزار کیرٹ تھا۔ ۱۸۷۰ء میں ہیروں کی کھدائی کا کام جنوبی افریقہ میں منتقل ہو گیا۔ جنوبی افریقہ کی کانوں نے جہاں سے ۱۹۰۶ء میں دنیا کی پیداوار کا نوے فیصدی ہیرا سپلائی ہوا برازیل کی کانوں کو پس پشت ڈال دیا۔

جنوبی افریقہ میں ۱۸۶۷ء میں پہلی بار اتفاقیہ طور پر ہیرے کی دریافت ہوئی اس دریافت کا سہرا۔ ڈاکٹر ڈبلو۔ جی۔ اتھراسٹون کے سر ہے۔ ایک دن اس نے آرینج ندی کے کنارے ایک فارم پر ایک چھوٹے سے لڑکے کو پتھر کے ٹکڑے سے کھیلتے ہوئے دیکھا اس کی پرکھنے والی نگاہیں اس پتھر پر پڑیں یہ پتھر اسے معمولی پتھر کی بہ نسبت کچھ اور نظر آیا۔ ہاتھ میں لینے کے بعد اس کا خیال یقین میں بدل گیا۔ وہ بلاشبہ ایک ہیرا تھا جسے ایک تاجر نے پانچ سو پونڈ میں خرید لیا وہ اسے گراہم ٹاؤن لے گیا۔ پیرس میں ہونے والی اس سال کی نمائش میں اس ہیرے کی نمائش کی گئی۔ ۱۸۶۹ء میں ۸۳½ کیرٹ وزنی ایک اور ہیرا آرینج ندی کے کنارے پایا گیا۔ اس ہیرے کو ارل آف ڈڈے نے پچیس ہزار پونڈ میں خرید لیا جو بعد میں اسٹار آف ساؤتھ افریقہ کے نام سے موسوم ہوا۔ پھر کیا تھا ہیرے کی بھوکی دنیا ہیروں کی تلاش میں دوڑ پڑی۔ آرینج اور وال ندیوں کی گھاٹیوں میں ہیروں کی تلاش شروع ہوئی ۱۸۷۱ء میں ان ندیوں کے کنارے دس ہزار آدمیوں کے کیمپ لگ گئے۔ دیکھتے دیکھتے جنوبی افریقہ کا یہ دیار ہیروں کا دیار کہلانے لگا۔

چند تاریخی ہیرے

ہندوستانی کانوں سے کئی شہرہ آفاق ہیرے دستیاب ہوئے جن میں خاص خاص یہ ہیں (۱) مغلِ اعظم (۲) دی آرلوف (۳) ریجنٹ یا پٹ (۴) اکبر شاہ (۵) دی نظام (۶) دی گریٹ ٹیبل (۷) کوہ نور اگرچہ ان میں سے بیشتر ہیرے آج ہندوستان میں نہیں ہیں مگر ان کی تاریخ ہندستان کی سیاسی تاریخ سے مربوط ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اثرات سے نہ تخت بچ سکے نہ تاج۔

مغلِ اعظم

یہ مشہور روزگار ہیرا گولکنڈا کی کان سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس کا وزن ۷۸۷ کیرٹ تھا۔ یہ وہی ہیرا تھا جسے ٹریورنیر نے ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب کے خزانہ میں دیکھا تھا۔ جسے بعد میں ایک اطالوی ہیرا تراش نے ہیرا تراش خراش کر ایک گلاب کی شکل دے دی۔ اس کا وزن گھٹ کر ۲۶۰ کیرٹ رہ گیا، اسے مغلِ اعظم کے نام سے پکارا گیا۔ ٹریورنیر کا بیان ہے کہ اس ہیرے کو میر جملہ نے شاہ جہاں کی نذر کیا تھا۔ اس کے متعلق خیال ہے کہ یہ شاہ ایران کے پاس ہے۔

دی آرلوف

یہ وہ ہیرا ہے جو ایک مندر میں رکھے ہوئے بُت کی پیشانی پر جڑا ہوا تھا۔ اسے ایک فرانسیسی فوجی نے چرا لیا تھا جب وہ عازم فرانس ہوا تو جہاز کے کپتان نے اسے ہتھیا لیا۔ اُس کپتان سے شاہزادہ آرلوف نے نوے ہزار پونڈ میں خرید لیا اور ملکہ کیتھرین دوم کی نذر کیا۔ اس کا وزن ۱۹۴¾ کیرٹ ہے اور اس کا رنگ ہلکا زردی مائل ہے۔ یہ مدتوں روسی تاج کی زینت بنا رہا۔

ریجنٹ یا پٹ

یہ ایک شاندار ہیرا ہے۔ اس کا وزن ۴۱۰ کیرٹ ہے۔ اسے مدراس کے گورنر پٹ نے بیس ہزار چار سو پونڈ میں خرید کر ڈیوک آف آرلی انس کے ہاتھ جو فرانس کا ریجنٹ تھا۔ اسی ہزار پونڈ میں فروخت کر دیا۔ قطع برید کے بعد اس کا وزن گھٹ کر $136\frac{14}{16}$ کیرٹ رہ گیا۔ غدر فرانس کے وقت دوسرے

شاہی ہیروں کے ساتھ یہ بھی چوری چلا گیا تھا مگر بعد میں پھر دستیاب ہوا۔ اس وقت یہ فرانس میں ہے۔

اکبر شاہ

شروع میں اس کا وزن ۱۱۶ کیرٹ تھا۔ اس پر عربی حروف کندہ تھے جب اس کی قطع برید کی گئی تو اس کا وزن گھٹ کر صرف ۷۱ کیرٹ رہ گیا۔ اسے بڑودہ کے مہاراجہ نے ۳۵۰۰۰ پونڈ میں خریدا تھا

دی نظام

یہ نظام حیدرآباد کے قبضہ میں ہے۔ اس کا وزن ۲۷۷ کیرٹ ہے یہ ایک بڑے ہیرے کا ٹکڑا ہے جس کا وزن ۴۴۰ کیرٹ تھا۔

دی گریٹ ٹیبل

ایک مستطیل شکل کا ہیرا ہے۔ ٹریونیر نے اسے گولکنڈہ میں دیکھا تھا اس کے اندازے کے مطابق اس کا وزن ۱/۴ ۲۴۲ کیرٹ تھا لیکن لول اسٹوری مسکلین کے نزدیک یہ مستطیل شکل کا ہیرا 'دریائے نور' تھا جس کا وزن ۱۸۶ کیرٹ ہے جو شاہ ایران کے قبضہ میں ہے۔ 'تاج ماہ' ناشپاتی کی شکل کا ہلکا گلابی ہیرا ہے جس کا وزن ۱۴۶ کیرٹ ہے۔ یہ بھی شاہ ایران کے پاس ہے۔

کوہ نور

ہندوستانی ہیروں میں اپنی خصوصیت کی بنا پر یگانۂ روزگار ہے سب سے پہلے یہ ہیرا علاؤالدین خلجی کو دکن کی فتوحات کے سلسلے میں ۱۳۰۴ء میں مالوہ میں ہاتھ لگا تھا اس نے اسے لاکر شاہی خزانے میں رکھا تھا۔ ۱۵۲۶ء میں جب بابر نے ہندوستان میں حکومت مغلیہ کی بنیاد رکھی تو اس نے اس ہیرے کو آگرہ کے خزانہ میں دیکھا۔ دو سو برس تک یہ ہیرا شاہان مغلیہ کی عظمت میں چار چاند لگاتا رہا۔ مگر اسے کوئی 'کوہ نور' کے نام سے نہ جانتا تھا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ درانی نے دلی کو تاراج کیا جس وقت وہ فاتحانہ انداز میں لال قلعہ کے اندر شاہی محل میں داخل ہوا تو معزول مغل تاجدار شاہ عالم کے عمامے میں اس تابناک ہیرے کو دیکھ کر وہ پکار اٹھا "کوہ نور"!

"کوہ نور" یہ تھی وہ ساعت جب ہیرے کو کوہ نور کے نام سے منسوب کیا گیا۔ ۱۷۳۹ء میں کوہ نور ہندوستان سے پہلی بار رخصت ہو کر نادر شاہ کے مال غنیمت کے ساتھ خراسان کے لئے روانہ ہوا۔ لیکن یہ ہیرا اسے راس نہ آیا۔ وہ خود قتل کر دیا گیا اور اس کا بیٹا معزول۔ کوہ نور کو حاصل کرنے کے لئے معزول شاہ کے جسم پر کھولتا ہوا تیل گرایا گیا اور اس کی آنکھیں تک نکال لی گئیں۔ مگر اس نے اس ہیرے کا سراغ نہ دیا بالآخر ہیرے کی معجز نمائی کام آئی۔ وہ دوبارہ تخت نشیں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا وارث تخت و تاج ہوا۔ اسے بھی یہ ہیرا راس نہ آیا۔ لوگوں نے اس کی بھی آنکھیں نیزہ چبھو کر نکال لیں۔ اس قسم کے المیہ واقعات کو دہراتے ہوئے یہ ہیرا نادر شاہ کے وارثوں میں منتقل ہوتا ہوا اسی برس کے بعد شاہ شجاع کے قبضہ میں آیا۔ امرا اس کے بھی خلاف ہو گئے۔ وہ روپوش ہو کر اپنی جان بچا کر بھاگ کر ہندوستان آیا۔ اس وقت پنجاب کا راجہ رنجیت سنگھ تھا۔ رنجیت سنگھ نے اسے پناہ دی اور کھویا ہوا تخت حاصل کرنے کی مدد کا وعدہ کر کے شاہ شجاع سے کوہ نور حاصل کر لیا۔ رنجیت سنگھ نے ہیرے کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے شاہ سے دریافت کیا کہ اس کی قیمت کیا ہوگی۔ شاہ نے جواب میں اتنا کہا کہ قسمت کا بنانا یا بگاڑنا۔ کچھ ایسا ہی ہوا کہ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان کی لڑائیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ انگریز پنجاب پر قابض ہو گئے۔ سرجان لارنس نے رنجیت سنگھ کے خزانہ سے کوہ نور کو حاصل کر لیا۔ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے اس ہیرے کو ملکہ وکٹوریہ کی نذر کیا۔ یہ ہیرا تراش خراش کے بعد تاج برطانیہ میں جڑ دیا گیا اور آج بھی اس کی زینت بنا ہوا ہے۔ اس کا وزن ۱/۱۶ ۱۸۶ کیرٹ تھا مگر ایمسٹرڈم کے کاریگروں نے اسے کاٹ چھانٹ کر اس کا وزن گھٹا کر ۱/۱۶ ۱۰۶ کیرٹ کر دیا۔ اس طور پر وزن کی کمی کے ساتھ ساتھ اس کی اچھی اور بری صلاحیتیں بھی ختم ہو گئیں۔ آج اس کی سب سے بڑی تاریخی عظمت ہے۔

اسٹار آف دی ساؤتھ

یہ برازیل کا مشہور ہیرا ہے جو ۱۸۵۳ء میں دستیاب ہوا تھا۔

اس وقت اس کا وزن ½۲۸۰ کیرٹ تھا اور چالیس ہزار پونڈ پر فروخت ہوا تھا قطع برید کے بعد اس کا وزن گھٹ کر ۱۲۵ کیرٹ رہ گیا۔ اسے بڑودہ کے مہاراجہ نے اسی ہزار پونڈ میں خریدا تھا

لیبریٹر

اسکا شمار دنیا کے بڑے اور خالص ہیروں میں ہے۔ یہ ۱۹۴۲ء میں دستیاب ہوا تھا۔ ایک شخص مسمّی رافیل سولانو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جنوبی امریکہ کے ملک وینی زولا کی ایک ندی کی گھاٹی میں ہیروں کی تلاش میں مہینوں سرگرداں رہا۔ یہ تینوں تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ اتفاق کی بات کہ رافیل سولانو نے آخری بار جب پتھروں کے ایک ڈھیر پر ہاتھ مارا تو انڈوں کی سائز کا ایک پتھر اس کے ہاتھ آیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کا وزن عام پتھروں کے وزن سے کہیں زیادہ تھا۔ بلاشبہ وہ ایک ہیرا تھا۔ نیو یارک کے ایک جوہری نے دو لاکھ ڈالر کی پیش کش کر کے اسے خرید لیا

کُلینن

یہ شہرۂ آفاق دیو قامت ہیرا جنوبی افریقہ کی ایک کان سے اتفاقیہ طور پر دستیاب ہوا بعہد ۱۹۰۵ء میں ایک دن شام کو جنوبی افریقہ کی ایک کان کا مینجر مسمّی فریڈرک ولس کان کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ کان کے اندر ۱۸ فٹ نیچے والی سطح پر گذر رہا تھا کہ اسے دفعتاً جمائی آئی۔ اس کے جسم میں تناؤ پیدا ہوا اور اس کا سر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ اس نے اوپر دیوار میں ایک تابناک ہیرا دیکھا۔ اس نے دیوار پر بمشکل تمام چڑھ کر دنیا کا سب سے بڑا ہیرا حاصل کر لیا۔ اس کا وزن ۳۱۰۶ کیرٹ یا ½۱ پونڈ تھا۔ اس ہیرے کو کمپنی کے پریسیڈنٹ مسٹر تھامس کلینن کے نام سے منسوب کیا گیا۔ جب یہ ہیرا انگلستان بھیجا گیا تو جوہریوں نے اس کی قیمت کا اندازہ ½۷ کروڑ ڈالر لگایا۔ فریڈرک ولس کو دس ہزار ڈالر کا انعام دیا گیا۔ اس ہیرے کو ٹرانسوال کی حکومت نے خرید لیا اور اسے ملک معظم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی چھیاسٹھویں سالگرہ کے موقع پر بطور نذرِ عقیدت پیش کیا۔ ملک معظم کو اس ہیرے کی زیارت کے لئے ۷۲۵ ڈالر انشورنس چارج دینے پڑے کیوں کہ ہیرے کو لندن بنک سے بکنگھم پیلس میں دو گھنٹے کے لئے آنا تھا۔ ملک معظم نے جب ہیرے کو دیکھ لیا تو یہ طے پایا کہ اسے کاٹ کر پانچ حصوں میں منقسم کر دیا جائے۔ اس کام کے لئے ایک مشاق فن مسمّی ایشچر کی خدمات حاصل کی گئی۔ وہ تین مہینے تک اس ہیرے کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور مختلف زاویے سے اسے قطع کرنے کا پلان بناتا رہا۔ بالآخر دس فروری ۱۹۰۸ء کو اس نے اس ہیرے کے اوپر خاص قسم کا ایک نشتر رکھ کر ضرب لگائی۔ ہیرے پر اس ضرب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ نشتر ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سنبھل کر جب اس نے دوسری ضرب لگائی تو ہیرا چار بڑے اور سیکڑوں چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا مگر ایشچر اس کی تاب نہ لا کر غش کھا کر گر پڑا اور سکتے کے عالم میں ہو گیا۔ سب سے بڑا ٹکڑا شاہی عصائے طلائی میں جڑ دیا گیا اور بقیہ تین بڑے ٹکڑے تاج برطانیہ کے زینت بنے۔

جونکر

یہ ہیرا جنوبی افریقہ کی ایلینڈس فون ٹین کی کان سے ۱۹۳۴ء میں حاصل کیا گیا۔ اس کا وزن ۷۲۶ کیرٹ ہے۔ اس ہیرے کو ایک امریکن کے ہاتھ ڈیڑھ لاکھ پونڈ پر ۱۹۳۵ء میں فروخت کر دیا گیا۔

اس وقت کان کنی کے دھندے کے لئے جنوبی افریقہ کا دیار مخصوص ہے۔ آج اس ملک کا مشہور شہر کمبرلی ہے جو ہیرے کی کان کنی کا دنیا میں واحد مرکز ہے۔

ہندوستان میں پنا کی کانوں سے نکلنے والے جواہرات ادھر چھ مرتبہ نیلام کئے گئے مجموعی طور پر ۱۳۰۶۵۰ قیراط کے جواہرات نیلام ہوئے جن کی مجموعی قیمت ۵۲ لاکھ روپے تھے۔ وسط جون میں اندور میں ۴۶۰۰ قیراط کے جواہرات نیلام ہوئے۔

۱۹۶۷-۶۸ء میں پنا کی کانوں سے ۸۱۰۰ قیراط کے جواہرات نکالے گئے۔ ۱۹۶۸-۶۹ء کا نشانہ ۱۶۰۰۰ ہزار قیراط رکھا گیا ہے۔

معدنیات کی ترقی کا قومی کارپوریشن رام کھریا اور مجھ گاواں میں جواہرات کی کھدائی کا کام عنقریب شروع کرنے والا ہے جن سے علی الترتیب ۱۱۲۵۰ قیراط اور ۱۲۰۰۰ قیراط سالانہ کے جواہرات نکالنے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

ادارہ

عزم و عمل کی روشن مثال

ہیلن کیلر



یکم جون ۱۹۶۸ء کو ہیلن کیلر کا امریکہ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی موت سے دنیا ایک ممتاز شہری سے ہی محروم نہیں ہوگئی۔ بلکہ ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جو پر نہیں ہوسکتا جسمانی طور پر معذور افراد کے لئے جو غیر معمولی کارنامے انہوں نے سرانجام دیئے ہیں۔ انہیں دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ انھیں اپنے مقصد میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ خلوص لگن اور محنت کا ہی پھل تھا۔

ہیلن کیلر ایک ایسی حیرت انگیز شخصیت تھیں جنہوں نے سماعت وبصارت سے محروم ہونے کے باوجود تین زبانیں سیکھیں، کئی علوم میں مہارت حاصل کی، متعدد کتابیں تصنیف کیں، بڑے بڑے سیاست دانوں، دانشوروں اور مدبروں سے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ تبادلہ خیال کیا، موسیقی ایسی لطیف صنف سے پوری طرح حظ اٹھایا اور معذور بچوں کے لئے بہتری اور بہبود کا ایک عالمی ادارہ قائم کیا۔ ان کے بارے میں مشہور امریکی مصنف مارک ٹوین نے کہا تھا کہ دنیا کی دلچسپ ترین ہستیوں میں نپولین اور ہیلن کیلر کا نام سرفہرست ہے۔

ہیلن کیلر ۲۷ جون ۱۸۸۰ء کو الباما میں ٹسکمبیا کے مقام پر پیدا ہوئیں: بچپن میں وہ بہت ہی حسین اور جاذب نظر بچی تھیں۔ اس وقت ان کی آنکھیں اتنی تیز تھیں جو شے بڑے افراد کو بھی مشکل سے دکھائی دیتی تھی یہ اسے بھی بہت آسانی سے دیکھ سکتی تھیں۔ انہوں نے اپنی توتلی زبان میں باتیں کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ کہ اچانک بیس مہینے کی عمر میں وہ بیمار پڑ گئیں۔ بیماری کیا تھی یہ ان کے والدین کی سمجھ سے باہر تھا لیکن ایک دن جب ان کی والدہ مسز کیٹ کیلر اس ننھی منھی بچی کو غسل کرا رہی تھیں تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بینائی کھو چکی ہیں اور پھر زور زور سے پکارنے پر انہیں معلوم ہوا کہ بینائی کے ساتھ وہ سماعت سے بھی محروم ہو چکی ہیں

سماعت و بصارت سے محرومی نے ان کی آواز کو بھی متاثر کیا۔ چونکہ ہوش سنبھالنے کے بعد انہوں نے کسی کو بولتے ہوئے نہیں سنا تھا، اس لئے ان کی قوت گویائی بھی جاتی رہی۔ اپنی حسین معصوم بچی کی حالت دیکھ کر اس کے والد کیپٹن آرتھر کیلر اور والدہ مسز کیلر بے حد متفکر رہتے۔ وہ اس سلسلے میں ٹیلیفون کے موجد اور بہروں کے معالج ڈاکٹر بیل سے ملے اور انہوں نے معذور بچوں کے پرکنز اسکول سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر بیل کے مشورے پر ہیلن کے والد

ایں ماتم سخت است



۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء

لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے کہ یکایک زندگی کی رفتار مدھم پڑ گئی۔ لوگوں کو اس خبر کی صداقت پر یقین نہ آتا تھا کہ امریکہ کے صدر مسٹر جان ایف کینیڈی کو ایک امریکی باشندے نے ہی گولی چلا کر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اور

۵ جون ۱۹۶۸ء کو دنیا کے لوگوں نے وہ خبر سنی جسے سننے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ مرحوم جان ایف کینیڈی کے چھوٹے بھائی سینیٹر رابرٹ ایف کینیڈی عین اس وقت جب کہ امریکہ کے صدارتی انتخاب کے ایک امیدوار کی حیثیت سے منزل کامیابی کی طرف گامزن تھے، قاتل کی گولیوں کا نشانہ بن کر انتخابی مہم کو ادھورا چھوڑ کر ہی ہسپتال جا پہنچے۔ اور ڈاکٹروں کی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اور ۶ جون کو ۲ بجکر دس منٹ پر ان کی روح پرواز کر گئی۔

سینیٹر رابرٹ کینیڈی اپنے بھائی جان ایف کینیڈی کی طرح ہی ایک مقبول عوام سیاست داں و مدبر تھے، اس بات کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا کے ہر کونے میں ان کی موت کا ماتم کیا گیا ہے اور ہر ملک کے رہنماؤں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے، پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے ان کی موت کو نہ صرف امریکہ بلکہ تمام دنیا کے لئے ایک عظیم نقصان قرار دیا ہے۔ امریکہ میں سرکاری طور پر ان کا ماتم منایا گیا۔ مسٹر رابرٹ کینیڈی بوسٹن (مساچوسٹس) میں ۲۰ نومبر ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے ہارورڈ یونی ورسٹی سے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے ورجنیا یونی ورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ جنگ عظیم کے دوران انہوں نے تقریباً ڈیڑھ برس امریکی بحریہ میں کام کیا۔ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کیا۔ ۱۹۵۹ء میں جب مسٹر جان ایف کینیڈی نے صدر امریکہ کے عہدے کے لئے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو رابرٹ کینیڈی نے ان کی مہم کے مینجر کے فرائض سرانجام دیتے کے لئے سینٹ کی کمیٹی سے استعفیٰ دیدیا۔ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے اٹارنی جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ اس عہدے پر وہ قانونی معاملات میں حکومت کی نمایندگی کرتے تھے۔ اور صدر امریکہ کے مشیر تھے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ نیویارک سے امریکی سینٹ کے ممبر چنے گئے تھے۔ ان کی تقریر میں جادو تھا وہ نسل پرستی کے مخالف تھے جس کا اظہار انہوں نے متعدد بار کیا تھا۔ ان کے پسماندگان میں ان کی بیوہ مسز ایتھل کینیڈی کے علاوہ دس بچے ہیں۔ ان کی موت یقیناً ایک عظیم سانحہ ہے جس کی دکھ بھری یاد برسوں تک باقی رہے گی۔



Vol. 26 No. 12 **AJKAL** (Monthly) July 1968
Patiala House, New Delhi-1
Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N. Delhi-1
Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd. No. D. 509


اردو نمبر
آجکل
دہلی
اگست ۱۹۶۸ء
شراون۔ بھادرہ شک سمت ۱۸۹۰
قیمت: ۱ روپیہ
QAUMI AWAZ
معارف
THE INQUILAB
قاضی عبدالستار
داراشکوہ
ابوالکلام آزاد
ترجمان القرآن
ہماری زبان


قاضی عبدالودود


مسعود حسن رضوی


امتیاز علی عرشی


مالک رام


احتشام حسین


آل احمد سرور


اختر اورینوی


رشید حسن خاں


رشید احمد صدیقی


راہی


فرقت کاکوروی


دلاور فگار

اُردو کا مقبول عوام ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

جلد ۲۷ شمارہ ۱

اگست ۱۹۶۸ء

شراون بھادر شک سمہ ۱۸۹۰

ترتیب

	فی پرچہ	ایک سال	دو سال	تین سال
ہندوستان	۶۰ پیسے	۷ روپے	۱۲ روپے	۱۷ روپے
پاکستان	۶۰ پیسے (پاک)	۷ روپے (پاک)	۱۲ روپے (پاک)	۱۷ روپے (پاک)
دیگر ممالک	ا شلنگ یا ۱۵ سینٹ	۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر	۱۸ شلنگ ۲٫۷۵ ڈالر	۲۵ شلنگ ۶ پنس ۳٫۵۰ ڈالر

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :

ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔

ملاحظات

۱۵ اگست کا دن ہماری تاریخ کا اہم ترین دن ہے۔ اس دن ہمیں وہ دولت نصیب ہوئی جس کے بغیر کسی قوم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی کے نقشے بنے اور پوری قوم اس کام میں جٹ گئی۔ گزشتہ بیس اکیس برسوں میں ملک کئی مشکل حالات سے دوچار ہوا۔ غیر ملکی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اندرونِ ملک خشک سالی اور اناج کی کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام مسائل کا ہم نے بڑی ہمت اور استقلال سے مقابلہ کیا۔

ادھر کچھ دنوں سے ملک میں انتشار پسند طاقتوں نے سر اٹھایا اور ملک کے بعض حصوں میں فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کے کچھ ایسے مظاہرے ہوئے جس سے ہر سمجھدار اور محب وطن کو سخت تشویش لاحق ہوئی۔ لہٰذا تمام مسائل کا جائزہ لینے کے لیے حال میں سری نگر میں قومی یک جہتی کی کانسل کا اجلاس بلایا گیا جس میں سیاسی پارٹیوں کے سربراہ اور ممتاز اہل الرائے اصحاب نے حصہ لیا۔ اس کانفرنس میں ان تمام پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا جو قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے طریقہ کار پر بھی غور کیا گیا اور بہت سی مفید اور کار آمد تجویزیں پیش کی گئیں اب حکومت ہند اور ریاستی حکومتیں ان تجویزوں کو بروئے کار لانے کے لیے اقدامات کر رہی ہیں جس سے اس مسئلے سے نپٹنے میں بڑی مدد ملیگی۔ انتظامی اور قانونی پہلوؤں سے قطع نظر اس کی بھی ضرورت ہے کہ مختلف مذہبوں، علاقوں اور لسانی گروپ کے درمیان افہام و تفہیم کی بہتر صورتیں پیدا ہوں۔ ایک دوسرے کے بارے میں بے خبری اور غلط فہمی بعض اوقات بے جا اندیشوں کا باعث ہوتی ہے۔ ان امور کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے اس سلسلے میں سیاسی پارٹیوں، صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں اور سماجی کارکنوں کو خاص طور سے فعال بننے کی ضرورت ہے کیوں کہ احتساب ذات قانون کی دار و گیر کے مقابلے میں ہمیشہ کارگر ثابت ہوا ہے۔

"آجکل" کا "اردو نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ چند عنوانات پر مضمون نگاروں نے وعدہ کرنے کے باوجود مضمون نہ بھیجا، چند مضامین بہت تاخیر سے ملے پھر ہماری تنگ دامانی بھی سدِ راہ تھی۔ اس لیے بعض عنوانات پر مضامین شائع ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ہم نے ان شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں زیادہ تعداد میں دی ہیں جنہوں نے آزادی کے بعد شہرت حاصل کی ہے۔ ظاہر ہے ایسے تمام ادبا و شعراء کی تصاویر شائع کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی ہم نے بہت سے لوگوں سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی تصویریں بھیج دیں۔ مگر تمام مطلوبہ تصویریں ہمیں مل نہ سکیں۔ بہرحال ہم جو کچھ کر سکے وہ آپ کے سامنے ہے۔

اس نمبر میں شامل مضامین میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں وہ صاحب مضمون کی اپنی رائیں ہیں۔ ہمارا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ کسی مسئلے کے متعلق مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا اگر ہمارے قارئین ان سے متعلق اظہار خیال کرنا چاہیں تو ہم بڑی خوشی سے اسے شائع کریں گے۔ اس خصوصی نمبر کے متعلق ہمیں اپنے تاثرات سے ضرور آگاہ کیجئے گا۔ ہمیں آپ کی قیمتی رایوں کا انتظار رہے گا۔

نہایت رنج و غم کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے ساتھی اور رفیق کار مظفر شاہ صاحب کا ۲۹ جون کی صبح کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا ان کی عمر ۵۴ سال تھی۔

شاہ صاحب جولائی ۵۶ء سے ستمبر ۱۹۶۳ء تک ادارہ "آجکل" سے منسلک رہے تھے۔

ہم اس غم میں ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔



عرش ملسیانی

ساقی نامہ

پلا ساقیا بادۂ خوش گوار
کہ آئی ہے میرے وطن میں بہار

پلا بادۂ ناب و صافی پلا!
بہت جو نہیں ہے تو کافی پلا

ترے رند آپس میں لڑتے بھی ہیں
مے و جام پر یہ جھگڑتے بھی ہیں

ابھی عقل میں ان کی ہے کچھ فتور
نہیں ان کو پینے کا اچھا شعور

دلوں میں کدورت کی باتیں بھی ہیں
ابھی جنگ جوئی کی گھاتیں بھی ہیں

فرنگی کے چنگل سے آزاد ہیں
مگر اپنی قسمت سے ناشاد ہیں

محبت کا بادہ انھیں پھر پلا
نہ اک دوسرے سے رہے کچھ گلا

فرنگی نے اُن کو بگاڑا بہت
شقاوت سے ان کو لتاڑا بہت

یہ نیکو سیر ہیں یہ نیکو سرشت
وطن ہے بڑی خوبیوں کا بہشت

نہ کرنے دے اب اُن کو من مانیاں
بڑی دی انھوں نے ہیں قربانیاں

انھیں میں ہوئے گاندھی نیک نام
یہیں تھے جواہر یہیں ابوالکلام!

یہ نیکی کے بادہ سے سرشار تھے
ہمہ وقت ہشیار و بیدار تھے

وطن اُن کی ہمت سے آزاد ہے
فرنگی کی معدوم بیداد ہے

ترے رند کہنے کو ہیں خوش نصیب
مگر دونوں جانب ہیں اس کے رقیب

یہاں سرحدوں پر ہے خطرے کا شور
دکھاتے ہیں بڑھ بڑھ کے اغیار زور

ترے رند کرتے ہیں تجھ کو سلام
لنڈھا دے شرابِ محبت کے جام

پلا اُن کو جرائت کا بادہ پلا
بسالت کا ہمت کا بادہ پلا

اخوت کی مے سے بھی سرشار کر
انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کر

نہ آپس میں ہو اور نہ غیروں سے بیر
ترے میکدے کی مناتیں یہ خیر



مسعود حسین خاں

اُردو زبان

آزادی کے بعد

ادب کے مقابلے میں زبان سماج کا نسبتاً دیرپا ادارہ ہوتی ہے
تبدیلیاں اس میں بھی ہوتی ہیں، لیکن نہایت چپکے اور چھپکے۔ جدت طراز ذہن اسالیبِ ادب سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں اور اظہار و ابلاغ کی نئی راہوں کی جستجو کرنے لگتے ہیں۔ سائنسی ذہن ہے تو ہر لحظہ الفاظ کے تعینِ معنی کی دُھن میں رہتا ہے۔ تخلیقی ذہن ہے تو الفاظ کے سلسلے میں اس کی مصروفیت

ع آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔

کی سی ہوتی ہے۔ وہ لفظوں کو معنی کے جھلملاتے ستاروں میں تبدیل کر دیتا ہے اور گنجینۂ معنی کے نئے طلسم بنانے کی فکر میں شب زندہ داریاں کرتا ہے۔ ادب بنیادی طور پر انفرادی عمل اور اس کی کشاکش سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان اس کے برعکس ایک سماجی سمجھوتہ ہے جس میں تبدیلیوں کے لئے اجتماعی مفاہمت کا ہونا ضروری ہے۔ اکثر اوقات اس اجتماعی مفاہمت کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بیس سال کے مختصر عرصے میں اردو زبان کے ارتقاء کی ڈگر کی جانب صرف چند اشارے کئے جا سکتے ہیں اور بس۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اُردو زبان میں تبدیلیوں کی نوعیت کا تعلق زیادہ تر اس زبان کے ہندوستان میں منصب اور مقام سے ہے۔ اس لئے یہ ایک سیاسی اور عمرانی مطالعہ کا مواد فراہم کرتی ہے نہ کہ لسانیاتی تجزیہ کا۔ آزادی و تقسیمِ ہند کا سال نہ صرف سیاسی اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اُردو زبان پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ اس زبان کی پوری تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آزادی سے قبل اُردو کے سلسلے ایک کل ہند زبان کا تصور عام ہو رہا تھا۔ گاندھی جی کی قیادت میں برسوں تک اس ملک کی سب سے اہم سیاسی جماعت کا لسانی مسلک "ہندوستانی" رہا جو فارسی اور دیوناگری دونوں لپیوں میں لکھی جا سکتی تھی۔ گاندھی جی نے اپنی تحریروں میں فارسی رسم خط سیکھنے کی ضرورت پر بارہا زور دیا ہے اور خود اس رسم خط میں بعض دوستوں سے نامہ پیام کر کے مثال بھی قائم کر دی تھی۔ جہاں تک ہندوستانی کی ہیئت ترکیبی کا تعلق تھا، عام بول چال کی زبان پر زور دیا جاتا رہا۔ یعنی ایک طرف سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ سے گریز اور دوسری طرف منشیانہ و اصطلاحی عربی فارسی الفاظ سے اجتناب۔ ہندوستانی کا یہ تصور کسی لسانیاتی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی نیک نیتی اور مصلحت بینی پر قائم تھا۔ اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ ایک طرف ہندی کی نشوونما میں سنسکرت کا جو رول ہو سکتا تھا اس سے جان انجانا پن تھا، اور دوسری طرف اردو کے ارتقاء میں عربی فارسی کا جو حصہ رہ چکا تھا۔ اس سے دیدہ و دانستہ اغماز۔ چناں چہ آزادی سے پہلے ہی تاریخ کے دھارے پر ہندوستانی کی نیّا ڈگمگانے لگی تھی۔ اور اس کے دو کھوّیا یعنی مہاتما گاندھی اور مولوی عبدالحق اسے مختلف

سمتوں میں کھینے کی کشمکش میں گرفتار ہو گئے تھے۔

آزادی آئی لیکن خون میں نہائی ہوئی شمشیر بن کر۔ اس نے نہ صرف ایک ملک کی سیاسی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا بلکہ ایک تہذیب کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک ہی زبان بولنے والوں کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا ——————— ہندوستانی کا خواب یک لخت کافور ہو گیا۔ ایک مہاتما، ایک مولانا اور ایک پنڈت کا خلوص اور نیک نیتی بھی اسے نہ بچا سکی، اس لئے کہ ہندوستانی کوئی زبان نہ تھی بلکہ ایک سیاسی سمجھوتہ تھا۔ ہندوستانی کے دو روپ — اردو اور ہندی کی راہیں بیسویں صدی کے آغاز ہی میں متعین ہو چکی تھیں۔ دونوں کے ارتقاء کی ڈگر وصل کی نہیں فصل کی تھی۔ دونوں کو علمی زبان کی سطح پر لانے کے لئے ضروری تھا کہ ایک طرف عربی فارسی جیسی کلاسیکی زبانوں کا سہارا لیا جائے اور دوسری طرف سنسکرت کے شبد بھنڈار کا، جو ہندوستان کی بیشتر زبانوں کے لئے لازوال ماخذ کا حکم رکھتا ہے۔ تقسیم ہند سے فوراً قبل ہندی اردو کو یکجا کرنے کی کوششیں بھی بار آور ہو رہی تھیں اور اس کا اثر کم از کم اردو لغات پر پڑ رہا تھا۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں اتحاد و یکجہتی کا نقطۂ عروج تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون و ترک موالات کی شکل میں نمودار ہوا۔ اسی زمانے میں ہندی کے بعض الفاظ اردو صحافت اور خطابت کا لازمی جزو بن گئے تھے۔ سودیشی، ستیہ گرہ، اہنسا سماج، سامراج، دیش بھگتی، وغیرہ کا داخلہ اردو میں اسی دور کی یادگار ہے۔

آزادی و تقسیم ہند کے بعد اردو کا منصب یک لخت بدل جاتا ہے۔ تقسیم سے قبل ہندوستانی کی شکل میں اردو کم و بیش ہندی کے ساتھ برابر کی دعویدار تھی۔ دستور ہند کے نفاذ کے بعد ہندی کی کل ہند حیثیت مسلم ہو جاتی ہے۔

دستور ہند سے بہرحال اس ملک میں اردو کے مقام کا تعین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا۔ اب اس کی حیثیت ایک ایسے تاجدار کی سی ہے جس کی کوئی مملکت نہ ہو۔ ریاست جموں و کشمیر میں اس کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے —— حال میں آندھرا پردیش کے لیگویجز ایکٹ میں بھی اس کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ہماچل پردیش نے اسے ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ لیکن اردو کے گڑھ یعنی اتر پردیش اور بہار میں ابھی اس زبان کو ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل جامعہ عثمانیہ نے اردو کے سلسلے میں جو بھی اچھا برا کام کیا تھا، اس کا خاتمہ ہو جانے کی وجہ سے اردو زبان میں ترجمہ و تالیف اور اصطلاحات سازی محدود ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب سے آئے ہوئے اردو والوں کے سہارے اردو صحافت اور پاپولر لٹریچر کی مانگ اور فراہمی بڑھ گئی ہے۔ لیکن کسی بھی زبان کی اہمیت اور استحکام کا دارومدار پاپولر لٹریچر، فلم یا مشاعرہ پر نہیں ہوتا۔ اس کو استحکام ملتا ہے جب یہ اعلیٰ تعلیمی اداروں، سرکاری انتظامیہ اور عدلیہ میں اظہار کا وسیلہ بنائی جاتی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اردو کے مشاعرے آج بھی مقبول ہیں۔ فلم کی زبان آج بھی مقبول عام اردو ہی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج اردو کو یونیورسٹی کی سطح پر استعمال کیے جانے کے امکانات موہوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس میں تفریحی رسائل کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ "معارف"، "اردو ادب" اور "نوائے ادب" جیسے رسائل اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے۔

اس پس منظر میں اگر پچھلے بیس سال میں اس زبان کی رفتار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا، کہ حالات اطمینان بخش نہیں ہیں۔ علمی اصطلاحات کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ آزادی کے بعد کسی ادارے یا درسگاہ میں اصطلاحات سازی کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس زبان کی علمی ترقی و توسیع بند ہو گئی ہے۔ علوم پر اردو میں بہت کم لکھا جا رہا ہے۔ صحافت میں بھی چند فنی اصطلاحات کے علاوہ کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ان چند اصطلاحات میں بھی کسی مستند ادارہ یا اکادمی کے موجود نہ ہونے کے باعث یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ مثلاً یو۔ این۔ او جیسی تنظیم کے لئے اردو صحافت ایک سے زائد اصطلاحیں استعمال کرتی ہے۔

اصطلاحات علمیہ سے قطع نظر کسی بھی زبان کی تجزیاتی نقطۂ نظر

سے تین سطحات ہوتی ہیں۔ (۱) صوتیاتی (۲) صرفی (۳) نحوی

یہ کہنا ذرا دشوار ہے کہ صوتیاتی اور لہجاتی سطح پر ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو میں دور رس تبدیلیاں ہوئی ہیں تاہم بعض میلانات کی جانب اشارہ کیا جاسکتا ہے جو نئے سماجی عوامل میں نمودار ہونے لگے ہیں صوتیاتی سطح پر اردو اور ہندی میں مابہ الامتیاز فرق ان مستعار آوازوں کا (جسے عرف عام میں حروف کہتے ہیں) ہے جو عربی فارسی سے مستعار لی گئی ہیں۔ اور جن کے ذریعے اردو سماج سے تعلق رکھنے والے شخص کی شناخت بآسانی کی جاسکتی ہے۔ اسی کو عام بول چال میں شین قاف کا درست ہونا کہتے ہیں اس ضمن میں حسب ذیل آوازیں آتی ہیں۔ [ز۔ ژ۔ خ۔ ف۔ غ۔ ق۔ خ) یہ آوازیں اُردو رسم خط میں بعض اوقات تین تین بلکہ چار چار حروف سے ظاہر کی جاتی ہیں۔ مثلاً ز۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ان میں سے بعض کے صحت تلفظ کا اس درجہ خیال رکھا جاتا تھا کہ ہندی ساہتیہ سمیلن جیسے مقتدر ادارہ کی مطبوعات میں مختلف حروف کے تحت نقطے لگا کر (ق۔ خ۔ ز۔ ف۔ غ] کے مخصوص تلفظ کو ظاہر کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد رفتہ رفتہ یہ التزام ختم ہو رہا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ہندی بولنے والی نئی نسل اب اختلافات تلفظ کی مطلق پروا نہیں کرتی ہے چونکہ ہندی کے علاقے میں اردو سماج سے تعلق رکھنے والی نئی نسل اب ہندی میں رچ بس گئی ہے اس لئے ان مستعار آوازوں کے صحیح تلفظ کی جانب ان کی لاپروائی بڑھتی جارہی ہے۔ دیہات اور قصبات کے اُردو بولنے والے والدین جن کا شین قاف درست تھا ان کے بچے (ز۔ غ۔ ق اور خ) جیسی آوازوں کا تلفظ صحت کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ ز اور ف کی صورت حال اس لئے بہتر ہے کہ ان آوازوں کو سیکھنے کے مواقع انگریزی کے ذریعے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ جہاں تک (ق) کا تعلق ہے اُردو کو ادبی اور تہذیبی زبان کے طور پر استعمال کرنے والا بڑا طبقہ جس کا تعلق پنجاب اور دکن سے ہے۔ اس کی صحیح مخرج سے ادائیگی پر عبور نہیں رکھتا۔ لازمی طور پر یہ پہلی آواز ہے جو زد پر آئے گی۔ (ژ) کا استعمال بہت محدود ہے اور تعدد کے لحاظ سے بہت زیادہ لائق اعتنا نہیں (غ) کی صورت (ق) سے بہتر ہے لیکن (ز اور ف) کے مقابلے میں یہ کمزور آواز ہے۔ جہاں تک لہجہ کا تعلق ہے ایک دلچسپ تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ کم از کم قصباتی اردو میں سنسکرت کے اکثر لفظ رکنی (Syllabic) خاتمہ پر متحرک ہوتے ہیں اس کے برعکس اردو ہندی میں یہ خاتمہ ساکن ہوتا ہے لیکن ہندی کے علاقوں میں اردو بولنے والے جو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ہندی مدرسوں کے سکھائے ہوئے لہجے کے مطابق اردو بھی اس طرح کی بول رہے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ جو معیاری اُردو یا ہندی لہجہ کے منافی ہے کہ صحیح تلفظ دونوں میں چلتی ہے۔

صوتیاتی سطح سے قطع نظر صرفی تبدیلیوں کا جائزہ لیجیے، تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو اسماء کے سلسلے میں چند اہم رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندی کے زیر اثر نئے ادیبوں کے یہاں "تدبھو" کے مقابلے میں "تت سم" الفاظ کا چلن اُردو میں بڑھ رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سرکاری نظم ونسق کی زبان میں سنسکرت کے تت سم الفاظ رائج ہو رہے ہیں۔ جن میں سے بعض اردو والوں کے لئے بھی ناگزیر ہو گئے ہیں۔ مثلاً لوک سبھا۔ راجیہ سبھا۔ پردھان منتری راشٹرپتی، اُپ راشٹرپتی، راج بھون۔ پردیش، ودھان سبھا وغیرہ وغیرہ۔ ہر چند اردو والے ابھی تک "یمنا" اور "وارانسی" کو ہضم نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن کِشن اور کرشن کے مقابلے میں کرشن، چَندر کے مقابلے میں چَندر۔ اَمرِت کے مقابلے میں امرت کی طرف عام رجحان ہو چلا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اُردو والے جو اب تک عربی فارسی الفاظ کی صحت کا خیال رکھتے تھے، رفتہ رفتہ ہندی کے صحت تلفظ کا بھی خیال کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ دیس کے مقابلے میں 'دیش' عام ہو چلا ہے۔

ہندی کا اثر ایسے اسمائے عام کے تلفظ پر بھی پڑ رہا ہے جن میں ہائے ہوّز کی بجائے ہائے مخلوط آتی ہے۔ مثلاً اردو کا معیاری تلفظ دُلھن ہے لیکن آج بعض شاعر تک اس کا تلفظ دُلہن یا دُلہن (بروزن مدفن) باندھ رہے ہیں۔

اُردو اسماء کے تلفظات میں ایک طرف ہندی اثرات بڑھ رہے ہیں تو دوسری طرف ۱۹۴۷ء کے بعد بڑے پیمانے پر اُردو

ادب کے ہندی رسمِ خط میں منتقل کئے جانے کی وجہ سے تعین تلفظ کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ اردو رسم خط میں اعراب نہ لگانے کی وجہ سے الفاظ کا تلفظ تیزی سے بدلتا رہتا ہے۔ ——————

لیکن جب وہی عبارت ہندی رسم خط میں لکھ دی جاتی ہے اور اگر لکھنے والا اردو کے تلفظ سے بخوبی واقف ہے تو اسے صحت تلفظ کی سند مل جاتی ہے مثلاً اُردو "کیا" اور "کیا"، "پیّا" اور "پیا"، "دور کابیاں" اور "دو رکابیاں" اعراب کی عدم موجودگی یا فاصلہ حروف کی جانب سے لاپرواہی کی بنا پر مابہ الامتیاز نہیں، لیکن ہندی رسم خط میں چھوٹے مصوتوں کے لے ماتراؤں کے ناگزیر استعمال کی وجہ سے یہ صورتِ حال ممکن نہیں۔

انگریزی سے روگردانی کے باوجود انگریزی الفاظ کے استعمال میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ تحریر و تقریر میں ان الفاظ کا استعمال جاری ہے حتیٰ کہ "ڈیڈی" اور "ممی" جیسے الفاظ ہمارے گھروں میں گھس آئے ہیں جو ایک گہرے احساس کمتری کے غماز ہیں۔ اکثر اوقات یہ انگریزی الفاظ اُردو میں غلط طور پر لکھے جاتے ہیں مثلاً 'براورز' کے بجائے "برادرس" اور "گرلز کالج" کی بجائے "گرلس کالج" وغیرہ

عربی فارسی الفاظ کے غلط استعمال کی مثالیں عہدِ جدید کے اکثر مصنفین کے یہاں مل جائیں گی۔ یہ رجحان بڑھ رہا ہے۔ شعرار کے مقابلے میں افسانہ اور ناول نگار اس کے زیادہ بڑے مجرم ہیں۔ ابھی تک مخالفت کے لئے جب کوئی غیر اردو داں "خلافت" کا لفظ استعمال کرتا ہے تو ہم ہنستے تھے لیکن نئی نسل جو فارسی سے بہت کم واقف ہے۔ اس قسم کی بہت سی "خلافیتں" اُردو کو عطا کر رہی ہے۔

جہاں تک افعال کا تعلق ہے مفرد کے مقابلے میں مرکب افعال کا استعمال بڑھ رہا ہے یہ مرکب افعال اسم اور فعل کی ترکیب سے بھی بنتے ہیں۔ اور صفت اور فعل کی ترکیب سے بھی۔ قدیم اُردو اور قصباتی زبان میں مفرد افعال کا کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن آج ہم ایسے عام بول چال کے مفرد فعل مثلاً خرچنا، قبولنا، بخشنا، وصولنا وغیرہ کو ادبی تحریروں میں لاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اسی طرح جہاں تک افعال میں زمانہ کا تعلق ہے، عام رجحان صرف تین واضح زمانوں کی طرف ہے ان کی ذیلی اقسام کو استعمال کرتے ہوئے اکثر زبان داں گھبراتے ہیں۔ اس کی بظاہر وجہ یہ ہے کہ ذیلی اقسام سے نازک معنیاتی اختلافات کا اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

اردو نحو عرصے سے انگریزی فقروں کے دروبست کا شکار ہے مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ شکایت کہ آج بہت کم ادیب ہیں جو اردو کے فقروں کو انگریزی معنوی ترکیب کے ڈھنگ پر مرتب نہ کرتے ہوں، بالکل بجا ہے۔ ہماری علمی تحریروں، بالخصوص ناقدینِ ادب کے یہاں یہ خصوصیت کثرت سے ملتی ہے۔ ذہن جن سانچوں میں سوچتا ہے وہی سانچے اردو نحوی ترکیب پر عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بتانا ذرا دشوار ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اس میں کوئی واضح تبدیلی ہوئی ہے۔ انگریزی کے اثرات، اس باب میں بدستور قائم ہیں۔ ہمارے جملوں کا دروبست رموز اوقاف کی وجہ سے بھی انگریزی نما ہو جاتا ہے۔ بالخصوص نیم وقفہ (کوما) کے بعد جملہ معترضہ کا داخلہ اکثر اوقات انگریزی انداز کا ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کے اثرات کا سلسلہ ۱۹۴۷ء سے قبل بھی ملتا ہے۔

آخری مسئلہ اردو کے عروض کا ہے، ہرچند جدید نقطہ نظر کے مطابق اس کا تعلق قواعد زبان سے نہیں مانا جاتا۔ تاہم قدیم قواعد نویسی کا یہ بھی ایک اہم باب رہا ہے، اس لئے چند باتیں اس سلسلے میں بھی گوش گذار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اردو شاعری اپنے آغاز کے وقت شیخ باجن، شاہ علی جیو گام دھنی، برہان الدین جانم، ابراہیم عادل شاہ ثانی وغیرہ کے ہاتھوں میں ہندی عروض سے بھی آشنا رہی ہے۔ تاہم مجموعی طور پر قدیم زمانے سے لے کر تا حال اُردو شاعری کا قالب عربی فارسی کا عروض ہی رہا ہے۔ ہندی پنگل کی جانب بیسویں صدی میں باقاعدہ طور پر توجہ عظمت اللہ خاں نے اپنے معرکۃ الآرار مضامین جو رسالہ اردو کے ۱۹۳۷ء کے شماروں میں شائع ہوئے تھے، کی تھی۔ اس کے بعد اپنے گیتوں کے مجموعے "سریلے بول" میں انہوں نے اسکو عملی جامہ پہنانے کی ناکام کوشش بھی کی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہرچند گیتوں اور لوک گیتوں کی بھرمار ہو گئی ہے، تاہم اس باب میں ابھی تک کوئی عظمت جیسا ادبی مجتہد پیدا

(بقیہ صہ ۲۱ پر)



خواجہ احمد فاروقی

ایڈیٹر: شاہباز حسین
مرتبہ و ناشر: ڈائرکٹر
پبلیکیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس نئی
دہلی

اردو بیرونی ممالک میں

سکندر اعظم کا یونان سے جہاں کشائی کے لیے نکلنا اور کولمبس کا بحر اوقیانوس کو پار کرنا ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہم واقعات ہیں مغرب سے تعلقات کا جو رشتہ یونانیوں کے حملے سے شروع ہوا تھا وہ چار سو عیسوی میں رومن سلطنت کے زوال کے بعد منقطع ہوگیا ان تعلقات میں ایک نئی استواری اس وقت پیدا ہوئی جب کولمبس اور واسکوڈی گاما ہندوستان کی تلاش میں نکلے، لیکن اس درمیانی عرصے میں بھی مغربی سیاح مارکوپولو تیرہ سو عیسوی میں جنوبی ہندوستان پہنچا اور روسی سیاح نکیتین نے پندرھویں صدی میں ہندوستان کی سیاحت کی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدید تہذیب کا آغاز گرم مسالہ کی تجارت سے ہوتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں معیشت کی دشواریاں بڑی صبر آزما تھیں۔ گوشت کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور وہ زیادہ دیر اسی طرح ٹھہر سکتا تھا کہ اس کو مسالہ لگا کر رکھ دیا جائے۔ اس لئے یہ مسالے زندگی کی ضروریات میں سب سے زیادہ اہم حیثیت رکھتے تھے۔ اسی لئے سترھویں صدی عیسوی تک انگریزی کھانے بھی ہندوستان کی طرح خوب مسالے دار ہوتے تھے۔ یہ مسالہ ایران، بحرِ کیسپین اور قسطنطنیہ کے راستے سے یورپ جاتے تھے۔ لیکن یہ راستہ چنگیز خاں اور تیمور کی فتوحات کے سبب بند ہوگیا۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا مستقل قبضہ ہوگیا، اس وجہ سے اہلِ یورپ مجبور ہوئے کہ بحری راستوں سے مسالوں کے ممالک یعنی ہندستان اور مشرقی مجمع الجزائر پہونچیں۔ اس دوڑ میں پرتگالیوں، ولندیزیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے حصہ لیا اور اس کی کوشش کی کہ ہندوستان کی تجارت کے ساتھ اس کی زبانوں سے بھی شناسائی حاصل کریں۔

سب سے پہلے ڈچ لوگوں نے اس کی کوشش کی کہ اردو زبان کی واقفیت حاصل کریں۔ اس سلسلے میں John Josh - Ua Ketalaer کا نام مشہور ہے، جو جہاں دار شاہ کے دربار میں ڈچ سفیر تھا (۱۷۱۲ء) اور جس نے Lingua Hindustanica کے نام سے اردو قواعد لکھی ہے۔

فرانسیسیوں نے بھی اردو لغت مرتب کی اور اس کے کلاسیکی ادب کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ یہاں گارساں دتاسی کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جس کے کارنامے اردو کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ شروع شروع میں انگریزوں نے بھی اردو زبان کو سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس سلسلے میں فورٹ ولیم کالج

اور بعض مشنریوں کی کوششیں قابل ذکر ہے۔ فیلن، پلاٹ، فوربس، ہنکسپیر، جان گل کرائسٹ کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ لیکن بعد میں مختلف تاریخی وجوہ سے انگریزوں کا میل جول ہندوستانیوں سے کم ہوگیا اور وہ اپنی عظمت کا بوجھ اٹھائے ہوئے عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے لگے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو آزادی ملی اور اس کے ساتھ ہندوستانی زبانوں کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ اردو کے بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستان میں ہے۔ لیکن اس کے بولنے والوں کی بستیاں ملایا، سنگاپور، برما، پاکستان، عراق، حجاز، ٹن جی نائیکا، ناتجیریا، مارشیش، سری نام اور انگلستان وغیرہ میں بھی ہیں۔ اس وجہ سے اردو کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ اس وقت یورپ اور امریکہ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں اردو پڑھنے کا شوق ہے اور اردو کے پروگرام مختلف عالمی اسٹیشنوں سے نشر کئے جاتے ہیں۔ جب روس نے ۱۹۵۷ء میں پہلا اسپتنک چھوڑا تو اس کا امریکہ پر بڑا زبردست تعلیمی اثر ہوا۔ وہاں کے مفکروں نے اپنے نظام تعلیم کا دوبارہ جائزہ لیا اور یہ طے کیا کہ امریکہ کو دنیا کی اہم زبانوں کے سیکھنے کی طرف خاص توجہ دینا چاہئے۔ انھوں نے جو اپنا ڈیفنس ایجوکیشن ایکٹ تیار کیا ہے اس میں تعلیم کو نمایاں جگہ دی ہے اور روسی اور ہسپانوی کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی سیکھنے پر بھی زور دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اب امریکہ میں پانچ چھ یونی ورسٹیوں میں اردو کا کام خاصے پیمانے پر ہو رہا ہے ان میں وسکانسن، کیلی فورنیا اور شکاگو کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ شروع شروع میں امریکہ نے لسانیاتی مطالعہ پر زور دیا ہے اور اردو کو سماجیات، تاریخ اور سیاسیات کے سمجھنے کا ذریعہ بنایا۔ لیکن اب وہ زبان سے گذر کر ادب کی منزل میں داخل ہوگئے ہیں چنانچہ انھوں نے غالب کا جشن منانے کے لئے جو کمیٹی بنائی ہے اس کا پروگرام ادبی اور تنقیدی ہے اور اس کے اراکین میں پروفیسر نارمن براؤن اور ڈاکٹر کنٹول اسمتھ جیسے دانشور شامل ہیں۔ کینیڈا کی میکگل یونی ورسٹی میں جو علوم اسلامیہ کا ادارہ ہے اس میں اردو کو ممتاز حیثیت حاصل ہے پروفیسر عبدالرحمان بارکر کے پاس بیٹھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ اور عظیم آباد کی محفلوں میں شریک ہیں۔

امریکہ میں اردو کی کتابوں کے ترجمہ کا کام بھی شروع ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر داؤد رہبر اور چودھری محمد نعیم کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ امریکہ میں چونکہ لیباریٹریز بہت اچھی ہیں اس لئے طالب علم تھوڑے سے وقت میں زبان بولنے کی اچھی مشق بہم پہنچا لیتے ہیں۔ وسکانسن یونی ورسٹی جہاں مجھے کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے وہاں کے طالبعلم پروفیسر محمد مجیب کا ڈرامہ آزمائش اچھی طرح پڑھ سکتے تھے اور مولانا حفظ الرحمان مرحوم کو اردو میں عیادت کا خط لکھ سکتے تھے۔

انگلستان میں اہل اردو کی خاصی آبادی ہے اور وہاں سو سے زیادہ ہندوستانی کھانوں کے ریسٹوران موجود ہیں۔ اردو کے تین اخبار بھی شائع ہوتے ہیں اور کئی شہروں سے اردو کے پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو کا جو کام مسٹر رالف رسل کی رہنمائی میں ہو رہا ہے وہ ہر ادارے کے لئے باعث فخر ہے۔ ابھی انھوں نے ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ساتھ مل کر غالب کی زندگی کو اس کے خطوں کی مدد سے مرتب کیا ہے جو ایک ہزار صفحات پر محیط ہے۔ یہ کتاب یونیسکو کی طرف شائع ہو رہی ہے۔ ان کی جشن غالب کمیٹی میں پروفیسر خلپس، مسٹر پرسیول اسپیر اور مسٹر آربری شریک ہیں۔ اور توقع ہوتی ہے کہ ان کا کام قدرِ اول کی چیز ہوگا۔

نیدرلینڈز میں پروفیسر ہیسٹر مین سے ملاقات ہوئی جو کہ آج کل لائڈن یونی ورسٹی میں صدر شعبہ ہیں۔ ان کو اردو سے بڑی دلچسپی ہے اور انھوں نے غالب سے متعلق ایک نیا کورس بھی اپنے یہاں شروع کیا ہے ان کے علاوہ ڈاکٹر ڈیغریز اور ڈاکٹر دوی ہیروروی بھی اردو سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

فرانس میں پروفیسر گوبتورا اور پروفیسر فل یونا اردو سے بڑی محبت رکھتے ہیں اور اس کام کی توسیع چاہتے ہیں۔ اول الذکر غالب کے اشعار کا فرانسیسی میں ترجمہ کر رہے ہیں وہ اچھے شاعر اور ادیب ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ ان کا کام پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ پیرس میں جو اردو کے ذخیرے ہیں وہ انگلستان اور جرمنی کے بعد سب سے زیادہ اہم ہیں۔

مجھے بی آن یونی ورسٹی بھی جانے کا موقع ملا وہاں کی فیکلٹی آف آرٹس اُردو کا کام شروع کرنا چاہتی ہے اور اس کی خواہش مند ہے کہ ہندوستان سے کسی ایسے اہلِ علم کو دعوت دے جو غالب شناسی میں ان کی مدد کر سکے۔ چیکو سلو ویکیہ میں جو اکادمی آف سائنس ہے اس نے اُردو کو بھی ایک امتیازی حیثیت دی ہے۔ پراگ میں اردو کے کام کے انچارج پروفیسر یان مارک ہیں جو بے تکان اُردو بولتے ہیں اور آج کل غالب کے کام میں سرگرم ہیں۔ اٹلی میں روم اور نیپلس میں اردو کا کام بڑی سرگرمی سے ہو رہا ہے اس کے روح رواں پروفیسر بوسانی ہیں جو اُردو اور فارسی اچھی طرح جانتے ہیں اور ہندوستان بھی آ چکے ہیں۔ مجھ سے انہوں نے پندرہ بیس منٹ تک بے تکلف اردو میں گفتگو کی۔ اور میں ان کے لب و لہجہ اور علمی آگہی سے بہت متاثر ہوا۔ اطالیہ میں مجھے معلوم ہوا کہ وے ٹی کن اور عدیس ابابا سے اردو کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ مغربی جرمنی میں ہائی دل برگ میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے وہاں سے حمیدہ اختر اور اب ڈاکٹر زیدی اُردو کے کاموں میں مصروف ہیں۔ جرمنی ڈاکٹر اسپرنگر کا وطن ہے اور ان کے ذخیرے میں اُردو کے بے مثل مخطوطات موجود ہیں۔ دہلی یونی ورسٹی نے جو کربل کتھا کا نسخہ چھاپا تھا اس کا عکس بھی ٹیوبن گن سے حاصل کیا تھا۔

روس میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُردو کا کام ابتدائی اسکولوں سے شروع کیا جاتا ہے میرے پاس ایسے ۴۰ طالب علموں کی فہرست ہے جو اُردو میں تحقیقی مقالے لکھ چکے ہیں۔ اور ان کو ڈگریاں بھی مل چکی ہیں یہ حضرات اسکولوں، یونی ورسٹیوں، نشر گاہوں اور دارالترجموں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں رحمان بردی۔ فتح تیشہ بابیف، خان مرزائف، سونیا چرنی کووا۔ مولودہ خانم اور نبی جانف کی اُردو پر مجھے رشک آتا ہے ہندوستان اور ازبکستان میں بڑی تہذیبی مماثلت ہے۔ وہی پین، وہی پوستین، وہی تون، وہی پلاؤ، وہی شعلہ، وہی کھچڑی بریانی، پھر وہی رباب، وہی طنبور وہی دوتار، وہی دف پھر وہی غزل، وہی مقامات، یہی سبب ہے کہ اردو وہاں بہت مقبول ہے اور تاشقند میں بلا مبالغہ تین سو چار سو آدمی ایسے مل جائیں گے جو اردو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں اور اس کے اشعار سے لطف لے سکیں۔ نبی جانف کی بہن کا بچہ، نادر بیگ، جس کی عمر مشکل سے سات برس کی ہے فلم سنگم کے گانے بڑی خوش الحانی سے گاتا ہے۔ ("اعتبار نہ رہا، پیار نہ رہا") ان کا بچہ غالب جس کی عمر چار سال کی ہے، اُردو کی غزلیں، ازبک زبان میں سناتا ہے۔ اسی طرح نبی جانف غالب کی غزل "تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے" اس جوش و خروش کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کو ایسی داد ملتی ہے کہ چھتیں اڑ جاتی ہیں وہ ہند آ چکے ہیں اور ان کے لب و لہجہ سے یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ وہ دہلی کے رہنے والے ہیں یا فرغانہ کے، روس میں اُردو کے جو بڑے مرکز ہیں وہ تاشقند، ماسکو اور لینن گراڈ ہیں۔ لیکن ہندوستان کے رشتہ سے اردو سے دلچسپی مختلف ایشیائی جمہوریتوں میں پائی جاتی ہے چنانچہ جشن غالب کی جو کمیٹی بنی ہے اس میں پروفیسر غفوروف، پروفیسر چلونتوف اور پروفیسر دیاکوف کے علاوہ شاہ اسلام محمد یف مرزا ترسون زادہ مس زلفیہ خانم اور عبداللہ غفاروف، ازبک تاجک اور جارجین اہل علم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کابل، بغداد، جدہ، مکہ معظمہ، اور مدینہ منورہ، عدن اور اسکندریہ میں بے تکان اُردو بولنے والے ملتے ہیں۔ ایک دوست نے مجھے ایسی کتابیں دکھائیں جو اُردو میں سنگاپور سے شائع ہوئی ہیں۔ ایک روز تاشقند میں رحمان بردی صاحب کے یہاں میری دعوت تھی اس میں روسی، ذیچ، ازبکی اور ہندوستانی موجود تھے ان میں جو زبان ترجمانی کا سبب بنی وہ صرف اُردو تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُردو ان علاقوں میں کوئی اجنبی زبان نہیں ہے۔ تاشقند کے ایک محلہ کا نام اُردا ہے اور اردو کا لفظ ازبک اور عورپشتو اور منگولی زبانوں میں موجود ہے۔ اس لیے شاستری جی نے بھی تاشقند کے علمی ذخیرے کو دیکھ کر اُردو ہی زبان میں اپنا سائنٹ نوٹ لکھا تھا۔ یہ ان کی اردو کی آخری تحریر ہے جو تاشقند کے کتب خانے میں موجود ہے۔



گیان چند جین

اُردو تحقیق
آزادی کے بعد

اردو کی ادبی تحقیق کی بسم اللہ شعراء کے تذکروں سے ہوتی ہے گو یہ سچ ہے کہ تذکروں میں تحقیق سے زیادہ عدم تحقیق سے کام لیا گیا ہے پھر بھی تمام تذکروں کے مطالب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ تحقیق کرنے والے کے لیے معلومات کا گنجینہ ہیں۔ ادبی تحقیق کی دوسری منزل آزاد، حالی اور شبلی کی تصانیف ہیں۔ شعر العجم اپنے دور کے لحاظ سے قابل قدر تحقیقی کارنامہ ہے لیکن اس کا موضوع اردو ادب نہیں۔ آب حیات اور یادگار غالب کے مصنفوں نے مواد کی فراہمی اور چھان بین میں اس کاوش اور احتیاط سے کام نہیں لیا جو قابلِ اعتماد نتائج تک لے جاتی ہیں۔ دراصل تحقیق کی مضبوط اور مسلسل روایات اسی وقت قائم ہوئیں۔ جب تعلیم کی اعلیٰ جماعتوں میں اُردو کو بار دیا گیا۔ یونی ورسٹیوں میں نہ صرف اُردو بلکہ دوسری زبانوں اور دوسرے مضامین میں بھی ریسرچ پر زور دیا گیا۔ ان مضامین میں ریسرچ کے اصول مغرب سے لیے گئے۔ ان کے ساتھ اردو نے بھی مغربی طریق کار سے استفادہ کیا۔ پچھلے چالیس سال میں درسگاہیں تحقیق کا مرکز بن گئی ہیں۔ اگرچہ درس گاہوں کے باہر بھی کئی عظیم اور قدآور محقق ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے مخاطب یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ ہی ہوتے ہیں۔ اہل مدرسہ ہی ان کی تحریروں کو پڑھتے اور استفادہ کرتے ہیں۔ اس طرح کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ بیرون مدرسہ کے محقق بھی ذہنی حیثیت سے مدرسے کی برادری کے فرد ہوتے ہیں۔

تحقیق تعلیم کی منش ہے۔ آزادی کے بعد ہندو پاک میں اردو کی اعلیٰ تعلیم بن کی آگ کی طرح پھیلی ہے۔ اس دور میں ادبی تحقیق کو بھی اتنا فروغ ہوا ہے کہ اسے تحقیق کا ذریں دور کہہ سکتے ہیں۔ تحقیق کے مختلف شعبوں میں ہر سطح کے کام بہ کثرت ہوئے ہیں۔ بہت سے بیش بہا کارنامے ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے۔ سرحد پار کی بعض مطبوعات ہماری دسترس میں نہیں۔ ان دشواریوں کی وجہ سے ایک جامع جائزہ لینا مشکل ہے۔ یوں بھی تحقیق کے کام اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا سرسری ذکر بھی ایک مضمون کے کوزے میں نہیں سما سکتا۔

تحقیق کے لیے فال نیک یہ ہے کہ اُردو کے دو بڑے ادیب جو بنیادی طور پر نقاد ہیں۔ تحقیق کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کلیاتِ میر، (اور لندن سے لاکر بعض اور چیزیں) کلیم الدین احمد نے دو تذکرے اور دیوانِ جہاں، ڈاکٹر خورشید الاسلام نے دیوانِ قائم اور ڈاکٹر محمد حسن نے دیوانِ آبرو شائع کیا۔ ان میں ترتیب متن کے ضوابط کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ لیکن پھر بھی ان کاموں سے تحقیق کی مقبولیت تو ظاہر ہوتی ہے۔

تحقیق میں بنیادی کام متون کو صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے اگر اُردو کے بڑے ادیبوں کی تصانیف میل اور کھوٹ سے پاک ہو کر سامنے

آجائیں تو مطالعۂ ادب کے رستے میں لغزش کا امکان کم ہو جائے گا۔ یہ بڑا اچھا ہے کہ دلّی یونی ورسٹی نے مخطوطات شناسی کا کورس شروع کیا ہے۔ ادھر ۲۱ سال میں ترتیبِ متن میں بسیار بلند کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ بغایت پست کے بھی اور ان دونوں انتہاؤں کے درمیان دوسری تمام سطحوں کے بھی۔

ترتیبِ متن

دکنیات آزادی کے بعد کئی دکنی نسخے پہلی بار ترتیب و طباعت سے مزین ہوئے۔ فخرالدین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ انجمن ترقی اردو پاکستان میں زیرِ طبع تھی معلوم نہیں شائع ہو سکی کہ نہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بندہ نواز کی معراج العاشقین کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس میں بندہ نواز کا اردو کلام بھی شامل کر دیا۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ان کے شکارنامے کو ایک نہایت مفصل مقدمے کے ساتھ مرتب کیا۔ جاوید وششٹ نے سب رس کی ایک تلخیص قصہ حسن و دل کے نام سے ترتیب دی اور اس پر سیر حاصل دیباچہ لکھا لیکن میری رائے میں تلخیص کا جواز نہیں۔ سب رس کو کوئی قصے کے لیے تو پڑھتا نہیں انشا کی خاطر دیکھا جاتا ہے۔ دکنیات کے کچھ اہم نسخے عثمانیہ یونی ورسٹی کے رسالے قدیم اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ رسالہ کئی کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی جلد اول میں سب سے اہم غواصی کی مثنوی مینا ستونتی ہے جسے ڈاکٹر غلام عرفان نے بڑی مہارت سے ترتیب دیا ہے۔ قدیم اردو میں دوسرا اہم نسخہ فیروز بیدری کی مختصر مثنوی پرت نامہ مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ہے۔
دکنی کا ایک قابلِ قدر کام کلیاتِ شاہی کی ترتیب ہے جسے علیحدہ علیحدہ مبارزالدین رفعت اور زینت ساجدہ نے مرتب کیا۔ دونوں نے نہایت مفصل مقدمہ اور فرہنگ دی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے دیوانِ ہاشمی کو مرتب کیا۔ منجملہ اور نسخوں کے برہان الدین جانم کی کلمۃ الحقائق، مثنوی چندر بدن و مہیار، قصہ رضوان شاہ و روح افزا، مثنوی طالب و موہنی، علی نامہ، گلشن عشق، مثنوی تصویرِ جاناں، پنچھی باچھا اور کلیاتِ غواصی بھی بڑے سلیقے سے مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

شمالی ہند کی منظومات

منظومات کی ترتیب میں دیوانِ غالب کا نسخۂ عرشی سرِ فہرست ہے۔ مقدمہ، تصحیح، تاریخی ترتیب، تحشیہ اور اختلافِ نسخ سب کے اعتبار سے یہ کام اعلیٰ سے اعلیٰ ہے۔ لیکن میری رائے میں ابتدائی منسوخ کلام اور متداول دیوان کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں بانٹ کر عرشی صاحب نے ایک غیر ضروری حجت کی ہے۔ غالب نے بعض غزلوں میں چند اشعار بعد میں بڑھائے۔ عرشی صاحب لکھتے ہیں:[1]

"ان اشعار کو مذکورہ غزلوں سے جدا کر کے ان کی تاریخی جگہ پر رکھنے کی جرأت نہیں کی کہ اس طرح غزلوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔"

بجا کیا۔ لیکن منسوخ اور متداول کلام کی تقسیم نے بیشتر غزلوں اور قصیدوں کے ساتھ یہی کیا ہے کہ سر اور ٹانگ ایک حصے میں ہیں۔ تو دھڑ اور ہاتھ دوسرے میں۔ غزلوں کی حد تک تو یہ برداشت کر لیا جائے لیکن قصائد میں اشعار کے انتشار سے بڑی پریشانی ہوتی ہے مثلاً گنجینۂ معنی (منسوخ کلام) میں قصیدے کا یہ شعر لیجیے:

بہرہ دولت تھی نصیبِ نسخۂ معنیِ ناز
کہ ہوا صورتِ آئینہ میں جوہر بیدار

جب تک اس سے پہلے کا شعر معلوم نہ ہو یہ عقدہ نہیں کھلتا کہ یہ دولت سے کون سی دولت مراد ہے؟ اس سے پہلے کا شعر متداول کلام میں ہے نسخۂ عرشی سے کوئی رہبری نہیں ہوتی کہ مندرجہ بالا شعر کا سیاق و سباق کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نسخۂ حمیدیہ سے رجوع کیے بغیر اس شعر کے معنی متعین نہیں ہو سکتے۔ کاش طبع دوم میں وہ اس تقسیم کو ختم کر کے نسخۂ حمیدیہ کی طرح ہر نظم یا غزل کو مکمل اکائی کے طور پر درج کریں۔ م لکھ کر منسوخ کلام کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

ترتیبِ متن کی دوسری اچھی مثالیں سید مسعود حسن رضوی کا دیوانِ فائز اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی بکٹ کہانی ہیں۔ مثنوی گوہرِ جوہری کی ترتیب پر صدرالدین فضا نے ڈی لٹ اور مثنویاتِ راسخ کی ترتیب پر ممتاز احمد نے پی۔ ایچ۔ ڈی لی۔ گوہرِ جوہری بکٹ کہانی کی یاد دلاتی ہے۔ مثنویاتِ راسخ مفصل مقدمے اور

---

[1] دیباچہ نسخۂ عرشی ص ۴۳

حواشی سے مزین ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کا "کلامِ انشا" انشا کے پورے کلام کا احصار نہیں کرتا۔ اس زمانے میں کئی اساتذہ کے دواوین کو پہلی بار ترتیب دیا جا رہا ہے۔ ان میں آبرو، جعفر علی حسرت، سوز، قائم اور مصحفی قابلِ ذکر ہیں۔ (حسرت موہانی نے محض انتخاب شائع کیے تھے) مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ بعض دواوین کی ترتیب اس انداز سے کی گئی ہے جیسے کلام اٹھا کر کاتب کو دے دیا گیا ہو اور بس۔ متعدد کاموں میں یہ جذبہ ڈھکا چھپا نہیں کہ کسی طرح دوسرے سے پہلے چھاپ کر اس پر اپنی مہر لگا لی جائے۔ افسوس یہ ہے کہ اس بچکانہ مسابقت اور عجلت کا شکار بعض بڑے بڑے نقاد ہیں۔ کسی شاعر کا کلام ترتیب دیتے وقت ضروری ہے کہ اس کے جتنے نسخوں کا علم ہے حتی الوسع سب کو دیکھا جائے فی زمانہ اسی ابتدائی تقاضے کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی کا دیوان یا کلیات مرتب ہو کر آتا ہے تو وہ پکار پکار کر اپنی ترتیبِ نو کی ضرورت کا اعلان کرتا ہوا آتا ہے۔

نثری ادب

ادھر چند سالوں میں اٹھارویں صدی کی اردو نثر میں بیش بہا اضافے ہوئے ہیں۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ شمالی ہند کے ادبیں تحقیق کا سب سے بڑا مالِ غنیمت کیا ہے تو میں غالب کے نسخۂ بھوپال اور فضلی کی کربل کتھا کو قرار دوں گا۔ غالب کے ابتدائی کلام کی بہت اہمیت ہے۔ لیکن اس کی دریافت کسی بلاکشی کا ثمرہ نہیں۔ کتب خانہ میں نسخہ تھا اٹھا کر چھاپ دیا گیا۔ کربل کتھا کو پردۂ ظلمات سے ڈھونڈھ نکال کر مختار الدین احمد اردو دنیا کے کو ملبس ہو گئے ہیں۔ ترتیبِ متن کے لحاظ سے بھی مالک رام اور مختار الدین احمد کی مرتبہ کربل کتھا اردو کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ قدامت اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے عیسوی خاں کا قصہ مہر افروز و دلبر بھی ایک تاریخ ساز دریافت ہے۔ یہ نسخہ آغا حیدر حسن دہلوی کے دفینے میں بند تھا۔ اسے منظرِ عام پر لانے کا سہرا ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے سر ہے۔ جنہوں نے اسے بدرجۂ احسن ترتیب دیا ہے۔ اپنے منفرد اسلوب اور ادبی حسن کے لحاظ سے یہ اٹھارویں صدی کی نہایت اہم نثری تصنیف قرار دی جائے گی۔

اسی زمانے کی ایک اور قابلِ ذکر دریافت شاہ عالم ثانی کی داستان عجائب القصص ہے۔ اصل نسخہ غالباً چار جلدوں میں تھا جس کی ابتدائی دو جلدیں پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے کتب خانے میں دریافت کی گئیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی فرمائش پر ان کی شاگرد مس راحت افزا بخاری نے اس قصے کو ترتیب دے کر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا۔ کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر عبداللہ کا دیباچہ ہے، جو سیر حاصل نہیں۔ تحشیہ اور فرہنگ کا بھی پتہ نہیں۔ قصہ جس قدر اہم ہے، ترتیب اس کے شایانِ شان نہیں۔ یہ تینوں کتابیں ۱۹۶۵ء میں ایک ایک نسخے کی بنا پر ترتیب دے کر شائع کی گئیں۔ اٹھارویں صدی کی مشہور داستان نو طرزِ مرصع کمیاب ہو چلی تھی۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے متعدد نسخوں کی مدد سے مستند متن تیار کر کے ہندوستانی اکیڈمی سے شائع کیا۔ اپنے مفصل مقدمے اور اختلافاتِ نسخ کی تفصیل کے لحاظ سے یہ ایڈیشن ترتیبِ متن کی بہت اچھی مثال ہے۔ سید مسعود حسن رضوی نے سرور کا فسانۂ عبرت شائع کیا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے لیے ممتاز حسین نے باغ و بہار کو از سرِ نو مرتب کر کے شائع کیا۔ شعبۂ اردو دلی یونی ورسٹی نے میراثن کی گنج خوبی شائع کی جس پر خواجہ احمد فاروقی نے بڑا اچھا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک زمانے میں نول کشور پریس نے کلاسکی اردو ادب کو زندہ و باقی رکھنے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں آج کل وہی کام مجلس ترقی ادب لاہور کر رہی ہے۔ جس نے چند سال کے عرصے میں متعدد کلاسکی کتابیں شائع کی ہیں۔ ۶۵ کتابوں کی مہتم بالشان فہرست میں فورٹ ولیم کالج کی تصانیف خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ کلیات دواوین، تذکرے، پرانے ڈرامے اور ناول بھی شائع کیے ہیں۔ نول کشور پریس اور مجلسِ ترقی ادب کی مطبوعات میں دو انتہاؤں کا فرق ہے۔ نول کشور نے تاجرانہ ارزانی کو پیشِ نظر رکھا تو مجلسِ ترقی ادب نے ترتیب کے جدید تقاضوں کا۔

نثری متون میں ترتیب کے دو اور شاہکار ڈاکٹر وحید قریشی

کامقدمۂ شعروشاعری اور مالک رام کا غبارِ خاطر ہیں۔ وحید قریشی نے مقدمہ شعروشاعری پر بے نظیر مقدمہ اور حواشی لکھے ہیں ان کا کارنامہ مقدمہ کے مندرجات کے انگریزی ماخذوں کا پتہ لگانا ہے۔ مالک رام ساہتیہ اکادمی کے لئے مولانا آزاد کی تصانیف کو مرتب کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے کام انھیں کے معیار کے ہوتے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے ترجمان القرآن کی تیسری جلد باقیاتِ ترجمان القرآن کے نام سے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ پریم چند کو ناول و افسانہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے مضامین پریم چند ترتیب دے کر اہلِ اردو کے سامنے پریم چند کی شخصیت کا ایک اور پہلو پیش کیا۔

تذکرے

آزادی کے بعد تذکرے بھی بڑی تعداد میں شائع کئے گئے ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کے دُنیا میں ایک یا دو تین ہی نسخے ہیں۔ بعض تذکروں کو مناسب تحشیہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے بعض کو محض چھپوا دیا گیا ہے اور بس۔ میرے نزدیک آخرالذکر کام کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ کیوں کہ اس طرح وہ سب کی دسترس میں آجاتے ہیں ادھر شائع ہونے والے تذکروں میں یہ قابلِ ذکر ہیں ۱؎

مبتلا میرٹھی کے تذکرہ طبقاتِ سخن کا خلاصہ ڈاکٹر محمد حسن نے ۱۹۶۰ء کے ربعِ اوّل میں ہماری زبان میں شائع کیا۔ ان میں سے بیشتر تذکرے پہلی بار شائع ہوئے ہیں۔ سب سے ضخیم دلی یونی ورسٹی کا عمدۂ منتخبہ ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود اس کی ترتیب سے مطمئن نہیں ہیں۔ تحشیہ کے لحاظ سے منجملہ اوروں کے مختارالدین احمد کا گلشن ہند اور ڈاکٹر وحید قریشی کا ہمیشہ بہار قابل ذکر ہیں۔ طبقات الشعراء پر نثار احمد

۱؎ تحفۃ الشعراء	مصنفہ	افضل بیگ قاقشال	مرتبہ	ڈاکٹر حفیظ قتیل
مسرت افزاء	"	امراللہ ابوالحسن	"	قاضی عبدالودود رسالہ معاصر میں
تذکرۃ الشعراء	"	ابن امین اللہ طوفان	"	" " "
سفینۂ ہندی	"	بھگوان داس ہندی	"	شاہ عطاء الرحمن کاکوی
سفینۂ خوش گو	"	بندرابن خوش گو	"	" " "
دو تذکرے دو جلد	"	شورش و عشقی	"	کلیم الدین احمد
دیوانِ جہاں	"	بینی نراین جہاں	"	" " "
گلشنِ سخن	"	مبتلا لکھنوی	"	سید مسعود حسن رضوی
تذکرۂ نادر	"	کلب حسین خاں نادر	"	" " "
عمدۂ منتخبہ	"	اعظم الدولہ سرور	"	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
گلشنِ ہند	"	حیدر بخش حیدری	"	ڈاکٹر مختار الدین احمد
طبقات الشعراء	"	قدرت اللہ شوق	"	نثار احمد فاروقی
تلخیص سراپا سخن	"	محسن علی	"	ڈاکٹر سید سلیمان حسین
گلستانِ سخن دو جلد	"	قادر بخش صابر	"	خلیل الرحمن داؤدی
بہارستان ناز	"	فصیح الدین رنج	"	" " "
گلشن ہمیشہ بہار	"	نصراللہ خاں خویشگی	"	ڈاکٹر اسلم فرخی
ہمیشہ بہار	"	کشن چند اخلاص	"	ڈاکٹر وحید قریشی رسالہ اردو میں

فاروقی نے اتنے مفصل حواشی لکھے ہیں کہ متن پہلی جلد میں چھپا ہے اور دوسری جلد محض حواشی پر مشتمل ہوگی۔ مالک رام خیراتی لال بے جگر کا تذکرۂ بے جگر اور خوب چند ذکا کا عیار الشعراء مرتب کر رہے ہیں۔ اہم تذکروں میں شاہ کمال کا مجموعہ الانتخاب اور ناصر کا خوش معرکۂ زیبا اشاعت طلب ہیں۔ اُردو کے ہونہار محقق ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے تذکرۂ نادر کے مصنف کی ایک اور کتاب تلخیص معلی رسالہ اُردو ادب میں شائع کی۔ یہ کتاب زبان و بیان و عروض سے متعلق ہے۔ اس پر مرتب کے حواشی قابل توجہ ہیں۔

ادَبی تحقیق

زیر بحث دور میں ہر صنف اور ہر قابل ذکر مصنف پر ریسرچ کی گئی ہے ان میں سے جو کام شائع ہو گئے ہیں یا غیر مطبوعہ ہونے کی صورت میں میری نظر سے گزر چکے ہیں انھیں پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے اُن میں ذیل کے کام نسبتاً اہم ہیں۔

تواریخِ ادَب

تاریخ ادب میں اہم ترین کام علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول ہے یہ مسلّم کہ اس معیار کا کام نہیں جو اتنے بڑے منصوبے سے متوقع تھا پھر بھی اگر اس کی تمام جلدیں شائع ہو جاتیں تو اُردو کی ایک مفصّل جامع تاریخ بہم ہو جاتی۔ اس تاریخ میں کمی یہ ہے کہ یہ مضامین کا مجموعہ ہے ایک مسلسل منسلک تصنیف نہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا تحقیقی مطالعہ اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء انیسویں صدی کے اوائل تک، دکنی نثر کی مستند تاریخ ہے۔ دکنی نثر پاروں کا انتشار پریشان کن تھا۔ ڈاکٹر رفیعہ نے ان کو ایک سلسلے میں منظم کر دیا ہے۔ میر و سودا و درد کے علاوہ اٹھارویں صدی کے دوسرے غزل گو کسی قدر دھندلے میں تھے۔ ثنا الحق ایم اے کی کتاب "میر و سودا کا دور" ان پر روشنی ڈالتی ہے۔ فیروز سنز لاہور کی "اُردو ادب کے آٹھ سال" جدید شعراء سے متعلق ہے۔

اس زمانے میں علاقائی تاریخیں بھی لکھی گئیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھنؤ کا دبستانِ شاعری اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے دلّی کا دبستانِ شاعری کی طبع دوم میں نظرثانی اور اضافوں کا کام اس شدّ و مد سے کیا ہے کہ طبع اوّل کے مقابلے میں اس کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے ڈاکٹر صفدر حسین کا غیر مطبوعہ مقالہ زندگی اور ادب شاہانِ اودھ کے دربار میں، پی۔ ایچ۔ ڈی کے اچھے کاموں میں سے ہے۔ لیکن یہ دو مقالوں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلے حصے میں زندگی کا بیان ہے۔ دوسرے میں ادب کا۔ دونوں حصوں کو سمویا نہیں گیا۔ معین الدین دردائی اور ڈاکٹر اختر اورینوی نے بہار، وفا راشدی اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بنگال، ڈاکٹر حبیب النساء بیگم اور آمنہ خاتون نے میسور، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے بھوپال اور احترام الدین شاغل نے جے پور کی خدمات روشن کیں۔

اصنافِ ادب

اصنافِ نظم و نثر میں تقریباً سب پر ایک چھوٹی کام ہو چکے ہیں۔ سید محمود نقوی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اپنا مقالہ شمالی ہند کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ داخل کیا۔ اس میں داستانوں کی تحقیق میں نہایت اہم معلومات بہم کی گئی ہیں۔ معلوم نہیں یہ مقالہ ابھی تک کیوں نہ طبع ہو سکا۔ راقم السطور کی "اردو کی نثری داستانیں" کی طبع دوم اس سال مکمل ہو جائے گی۔ اس بار میں نے اپنے جائزے میں دکن کی داستانوں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ نظرثانی اور اضافے اتنی کثرت سے کیے ہیں کہ کتاب کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ شمالی ہند کی مثنویوں پر ڈاکٹر محمد عقیل نے ڈی فل کے لیے اور راقم السطور نے ڈی لٹ کے لیے مقالے لکھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویوں پر تحقیق کی۔ غزل پر جو کچھ کام ہوئے ہیں۔ وہ تحقیق کی بجائے تنقید کے زمرے میں آتے ہیں۔

سفارش حسین کی "اُردو مرثیہ" مرثیہ گویوں کا اچھا تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر حسین فاروقی کی "دبستانِ دبیر" شائع ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے لکھنؤ میں مرثیہ نگاری میر انیس تک، پر ڈی لٹ کی ڈگری لی۔ امید ہے انھوں نے معیاری کام کیا ہوگا۔ قصیدے پر ڈاکٹر محمود الٰہی کا مقالہ ابھی

تک شائع نہیں ہوا۔ لیکن ڈاکٹر ابو محمد سحر کی کتاب ' اُردو میں قصیدہ نگاری' کا دوسرا ایڈیشن بھی آگیا ہے اور یہ اس صنف کا قابلِ قدر جائزہ ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ' دکنی رباعیاں' میں متعدد رباعی گویوں کو متعارف کرایا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سلام سندیلوی اور فرمان فتح پوری نے رباعی پر مفصل کام کئے ہیں جو چھپ چکے ہیں۔ بدیع حسینی کی کتاب ' دکن میں ریختی کا ارتقاء' شائع ہوگئی ہے۔ جس طرح شمالی ہند کے مقابلے میں کرناٹکی موسیقی کار فن پر زیادہ نظر رکھتے ہیں، اسی طرح اُردو تحقیق کے بابت اہلِ شمال کے مقابلے میں اہلِ دکن زیادہ رچا ہوا شعور رکھتے ہیں۔ بدیع حسینی نے بھی بہت اچھا کام کیا ہے۔ انھوں نے ریختی کے تصور کو زیادہ وسیع کرکے دکن کے متعدد شعرا کو ریختی گویوں کے زمرے میں لے لیا ہے۔

بالکل ابتدائی ڈرامے پر اُردو کے بزرگ محقق سید مسعود حسن رضوی کی کتاب ' اُردو ڈراما اور اسٹیج' تحقیق کا شاہکار ہے اُردو میں اس معیار کی تحقیق کم ہوئی ہیں۔ اس کی جلد اول کا موضوع واجد علی شاہ، اور جلد دوم کا امانت اور اس کی اندر سبھا ہے۔ جلد دوم میں اندر سبھا کے متن کی ترتیب اس نوع کے بہترین کاموں میں شمار کی جائے گی۔ ڈرامے کی تاریخ پر عشرت رحمانی کی کتاب قابلِ قدر ہے۔ پارسی تھیٹر کے مستند محقق ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اُردو تھیٹر کی مکمل تاریخ آٹھ جلدوں میں پیش کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ آٹھ جلدوں میں ببلوگرافیا، اردو ڈراما (یہ اُردو کتاب کا نام ہے) بھی مرتب کر رہے ہیں۔ اس کی دو جلدیں شائع ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر نامی کی یہ دونوں کتابیں اردو تھیٹر کی انسائیکلو پیڈیا ہوں گی۔ ناول اور افسانہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں تحقیق کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ پریم چند سے پہلے کے ناول خصوصاً وہ ناول جو داستان اور ناول کی درمیانی کڑی ہیں۔ ابھی محتاج توجہ ہیں۔

مضمون نگاری پر ڈاکٹر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر ناصر حسین نقوی نے مقالے لکھے۔ سیدہ جعفر نے ماسٹر رام چندر کو اُردو کا پہلا مضمون نگار قرار دیا اور مولوی ذکاء اللہ کے چھوٹے بڑے سترہ سو مضامین دریافت کئے۔ کاش یہ دونوں محقق مضمون نگاری کو محدود کرکے انشائیہ پر مرکوز رہتے۔ اُردو نثر میں ادبِ لطیف پر ڈاکٹر عبدالودود کا مقالہ شائع ہوگیا ہے جس میں انھوں نے اس اسلوب کے کئی ایسے ادیبوں کا ذکر کیا ہے جو عام طور سے نہیں جانے جاتے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے مکتوب نگاری کے ارتقا پر تحقیق کی ہے۔ ڈاکٹر قطب النسا ، بیگم ہاشمی نے سفرناموں پر تحقیق کے سلسلے میں اردو کے کئی سو سفرناموں کا پتہ لگایا ہے۔ تذکروں پر تحقیق کے سلسلے میں دو کام قابلِ ذکر ہیں۔ فرمان فتح پوری کا نگار پاکستان کا ' تذکروں کا تذکرہ نمبر' اور حنیف احمد نقوی کا مقالہ ' شعرائے اُردو کے تذکرے ۱۹۵۰ء تک'۔ نگار کے تذکرہ نمبر میں تذکروں میں شامل شعراء کی فہرست دی ہے حنیف احمد نے تذکروں کے مندرجات کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ اُردو سوانح نگاری پر ڈاکٹر سید شاہ علی کا مقالہ شائع ہوگیا ہے۔

صحافت پر امداد صابری کی ' تاریخ صحافت اُردو' تین جلدوں میں ہے۔ عتیق صدیقی نے ' ہندوستانی اخبار نویسی، اور صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات' ، شائع کی ہیں۔ صحافت پر ایک اچھی کتاب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی ' صحافت پاکستان و ہند میں' ہے۔ ' کاروانِ صحافت' ، ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ترتیبِ متن پر ڈاکٹر خلیق انجم نے ' متنی تنقید' کے عنوان سے ایک اچھی کتاب لکھ دی ہے۔ کتاب کا نام انگریزی اصطلاح کا لفظی ترجمہ ہے۔ اُردو کی روایات کے مطابق ترتیب متن یا متنی ترتیب موزوں تر نام ہوتا۔ اصولِ تحقیق پر عبدالرزاق قریشی کی جامع کتاب بھی شائع ہوگئی ہے لیکن ہنوز میں اس سے استفادہ نہیں کر سکا۔ ان کتابوں کے علاوہ اس موضوع ڈاکٹر نذیر احمد، مالک رام، اور راقم الحروف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔

مونوگراف

ایک ایک ادیب کو لے کر بہ کثرت کام کئے گئے۔ درجۂ اول و دوم کا شاید ہی کوئی ادیب بچا ہو جسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا ہو لیکن منزلِ تکمیل تک کم ہی کام پہنچ پاتے ہیں اور اشاعت کا منہ دیکھنے والے اور بھی کم ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

امیر خسرو پر ڈاکٹر وحید مرزا کا تحقیقی کام ہندوستانی اکیڈمی سے شائع ہوا۔ اہلِ اردو کو خسرو کے اردو یا ہندی کلام سے دلچسپی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اس مقالے کے مباحث تشنہ ہیں۔ امیر خسرو کی

ہندی شاعری پر ڈاکٹر صفدر آہ نے اپنے ایک مضمون (نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۱ء) اور شجاعت علی سندیلوی نے اپنی کتاب امیر خسرو اور ہندی شاعری، میں بحث کی ہے۔

——— بعض مدلل مضامین میں امیر خسرو کو خالق باری کا مصنف ٹھہرایا گیا ہے۔ اردو کا پہلا ادب نواز شاعر نظامی ہے۔ افسر امروہوی[1] نے دریافت کیا کہ نظامی کا نام فخرالدین ہے نیز اس کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ۸۶۵ھ نہیں ۸۲۵ھ کے قریب کی تصنیف ہے۔

وجہی کے بارے میں اختر حسن[2] صاحب نے کچھ بیش بہا معلومات بہم پہنچائیں۔ وجہی کا فارسی دیوان دریافت کر کے انھوں نے اس کا تعارف کرایا نیز یہ بتایا کہ وجہی کا نام اسداللہ تھا۔ اور وہ وجہی۔ وجیہہ اور وجیہی تین تخلص کرتا تھا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ کے پروفیسر محمد حیات خاں سیال، وجہی اور اس کا سب رس، کے عنوان سے مقالات کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کر رہے ہیں۔ ولی پر ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی کی کتاب ولی گجراتی تحقیقی اعتبار سے سیر حاصل ہے۔ مظہر جان جاناں پر عبدالرزاق قریشی کی تحقیقی کتاب شائع ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا مقالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ مظہر کا اردو کلام نہیں ملتا۔ قریشی صاحب نے جگہ جگہ سے ڈھونڈھ کر کئی سو اشعار جمع کئے ہیں۔

میر پر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب' میر حیات اور شاعری' پر ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ قاضی عبدالودود نے اس پر اعتراضات میں ایک تحقیقی مقالہ لکھ دیا۔ تحقیق میں قاضی صاحب جس معیار کا مطالبہ کرتے ہیں وہ چوٹی کے چند بزرگ محققین ہی کے لئے ممکن ہے۔ میر پر دوسرے کام کا سہرا خواجہ احمد فاروقی صاحب کے ہم وطن نثار احمد فاروقی کے سر ہے جنہوں نے دلی کالج میگزین کا میر نمبر مرتب کیا۔ اس میں قاضی عبدالودود اور کلب حسین خاں فائق کے مضامین سے حیات میر کے بارے میں بعض اہم معلومات بہم پہنچی ہیں۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے مراثی میر دریافت کر کے شائع کئے۔ راقم الحروف کو میر کی تین نئی مثنویاں ملیں جو ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مرتبہ کلیات میں شا[…] ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب مرزا محمد رفیع سودا، شیخ چاند کے کام پر نہایت وقیع اضافہ ہے۔ قیام الدین صاحب نے بہار کے ایک رجواڑے میں دیوان ضاحک ڈھونڈھ نکالا اور معاصر جولائی ۱۹۶۲ء میں اس کا مفصل تعارف پیش کیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب' میر حسن اور ان کا زمانہ'، ڈی لٹ کا مق[…] ہے۔ جو ایک ادیب پر تحقیق کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی صرف سو جلدیں چھپوائیں جو کسی بھی کتاب کے لئے کم ہیں۔ رنگین پر ڈاکٹر صابر علی خاں کا مقالہ اور انشا پر اسلم پرویز کی کتاب ان ہزار شیوہ ادیبوں کے متنوع کارناموں کا بخوبی احاطہ کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے دریائے لطافت کی ترتیب پر ڈگری لی ہے۔ لیکن انشا مرتبہ کلام شائع نہیں کیا۔ ہاں لطائف السعادت ضرور شائع کر دی ہے جس سے سعادت علی خاں ایک نئی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ عرشی صاحب نے انشا کی ایک بے نقط مختصر داستان سلک گوہر شائع کی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث نے 'مصحفی اور ان کا کلام'، کے علاوہ جرأت اور نظیر پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ موخر الذکر دونوں میں تحقیق پر تنقید غالب ہے۔ مصحفی پر قاضی عبدالودود پچھلے تیس چالیس سال سے تحقیق کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ مصحفی پر یہ کام حرف آخر کی حیثیت رکھے گا۔ لیکن کسی طرح مکمل تو ہو۔

عتیق صدیقی کی گلکرسٹ اور اس کا عہد، ایک قابل اعتماد مستند تحقیق ہے۔ انہوں نے قومی آرکائوز میں فورٹ ولیم کالج کے اصل کاغذات کو دیکھ کر ہر بات قطعی اور مستند طور پر بیان کی۔ متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل نہیں ہندوستانی کا پروفیسر تھا۔ عتیق صاحب کی اسی سلسلے کی دوسری کتاب

Origin of Modern Hindustani

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ۔ قومی زبان ستمبر اکتوبر ۶۲ء

[2] قطب مشتری اور سب رس کے مصنف ملا وجہی کے متعلق بعض نئی معلومات از اختر حسن ایم اے۔ سب رس جنوری فروری ۶۲ء

Literature Source Material

Gilchrist letters ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے رجب علی بیگ سرور پر کام کیا ہے۔ یہ اپنے والد سید مسعود حسن رضوی کے تربیت یافتہ ہیں۔ اس لئے امید ہے ان کا کام اسی انداز کا ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی کا تحقیقی مقالہ ذوق، سوانح اور انتقاد، مطالعہ ذوق میں گراں بہا اضافہ ہے مومن پر عبادت بریلوی کی ضخیم کتاب تنقید کے علاوہ تحقیق کے لحاظ سے بھی قابل قدر ہے۔ اس سے مومن اور صاحب جی کے بارے میں کئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

غالب پر آج کل خصوصی توجہ کی جا رہی ہے۔ ان کی متفرق چیزیں تلاش کر کے قاضی عبدالودود نے تاثر غالب میں، سید مسعود حسن رضوی نے متفرقات غالب میں اور ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کی نادر تحریریں، میں پیش کیں۔ نسخہ عرشی غالب کا کلیات نظم اردو ہے۔ غالب کے جو اشعار اس نسخے کی ترتیب کے بعد دستیاب ہوئے، انھیں اکبر علی خاں نے اپنے مضمون ضمیمہ نسخہ عرشی، (نقوش نومبر ۱۹۶۳ء) میں جمع کر دیا۔ مالک رام کی تلامذۂ غالب شاگردوں کا جامع تذکرہ ہے۔ غالب پر مضامین کے چند مفید مجموعے ہیں۔ احوال غالب اور نقد غالب مرتبہ مختار الدین احمد، اردوئے معلی کے دو غالب نمبر مرتبہ خواجہ احمد فاروقی اور جھنگ کے محمد حیات خاں سیال کا مرتبہ ایک مجموعہ ہے۔ نقد غالب میں ایک معرکہ آرا تحقیقی مضمون قاضی عبدالودود کا 'غالب بحیثیت محقق' ہے۔

سید مسعود حسن رضوی نے اُردو کا شاہی اسٹیج میں واجد علی شاہ پر اور اُردو کا عوامی اسٹیج میں امانت پر عالمانہ تحقیق کی۔ عشرت رحمانی کی مرتبہ 'زہر عشق' اور عطاء اللہ پالوی کے تذکرۂ شوق میں نواب مرزا شوق پر تحقیق کی داد دی گئی ہے۔ ماسٹر رام چندر پر ڈاکٹر سیدہ جعفر اور صدیق الرحمان قدوائی کے دو تحقیقی مقالے چھپ گئے ہیں۔ امیر مینائی پر ڈاکٹر ابو محمد سحر کا مقالہ 'مطالعہ امیر' پی ایچ ڈی کے اچھے مقالوں میں شمار کیا جائے گا۔ راقم الحروف نے امیر کی ایک طویل مثنوی کارنامہ عشرت دریافت کر کے شائع کی۔ محمد حسین آزاد پر ڈاکٹر اسلم فرخی کا تحقیقی مقالہ انجمن ترقی اردو پاکستان نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی کا مقالہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ آزاد پر سید مسعود حسن رضوی کا آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، خاصے کی چیز ہے۔ حالی پر صالحہ عابد حسین، شجاعت علی سندیلوی اور ڈاکٹر عبدالقیوم کی کتابیں آ چکی ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے 'حالی کا ذہنی ارتقاء' پر پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ دونوں کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے شبلی کی حیات معاشقہ میں رازِ درونِ پردہ کو آشکار کیا۔ مشتاق حسین نے باقیات شبلی میں وہ کچھ چیزیں سمیٹ لی ہیں جو اب تک کسی مجموعے میں نہ آئی تھیں۔ سرشار پر لطیف حسین ادیب اور پریم پال اشک کی کتابیں بنیادی طور پر تنقیدی ہیں۔ لیکن کچھ نہ کچھ حصے تحقیقی بھی ہیں۔ درگا سہائے سرور پر ڈاکٹر حکم چند نیر نے بہت اچھا مقالہ لکھا ہے جو فی الوقت زیر طبع ہے۔

بھوپال کے آفاق احمد نے مہدی افادی کے تقریباً چار سو غیر مطبوعہ خطوط حاصل کئے۔ لیکن انہیں شائع نہ کیا۔ ان میں سے جو خطوط بیگم مہدی کے نام تھے وہ ان کے مطالبے پر واپس دے دیئے۔ انھیں کو ڈاکٹر محمود آلہی نے 'صحیفۂ محبت' کے نام سے ترتیب دیا۔ اُردو کے مکتوب نگاروں میں غالب، مہدی اور خواجہ احمد فاروقی کی شوخی و رنگینی گفتار ہمیشہ دامن دل کھینچا کی ہے۔ ان مکاتیب کا ذکر نہیں جو پوسٹ کرنے کی غرض سے نہیں لکھے جاتے۔ کاش مہدی کے بقیہ خطوط بھی مرتب ہو کر سامنے آجائیں۔
رسوا پر ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری کی قابل قدر تحقیق کے بعد ڈاکٹر آدم شیخ کا مقالہ بھی آگیا ہے۔ پریم چند پر قمر رئیس نے مفصل تحقیق کر کے اُن کے ناولوں کی ترتیب کی مختلف منزلوں کا پتہ لگایا۔ حال میں مدن گوپال کی قابل قدر کتاب 'قلم کا مزدور' اُردو میں چھپ گئی ہے۔

اقبال پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اُردو کے کسی ادیب پر نہیں لکھی گئیں۔ ملک نذیر احمد کی ضخیم کتاب کلید اقبال ایسی کتابوں اور مضامین کی ببلیوگرافی ہے اقبال کی سوانح میں عبدالمجید سالک کی 'ذکر اقبال' سب سے اہم ہے۔ دوسری دلچسپ اور نہایت مفید معلومات کی حامل کتاب فقیر وحید الدین کی روزگار فقیر دو حصوں میں ہے۔ اقبال کی متفرق تحریریں تلاش و تدقیق کے بعد غلام رسول مہر نے سرود رفتہ میں اور بشیر احمد ڈار نے 'انوار اقبال' میں جمع کر دی ہیں۔ اوّل الذکر منظومات پر اور دوسری بیشتر نثر پر مشتمل ہے

اختر شیرانی پر دکرم یونی ورسٹی کے ڈاکٹر یونس حسنی کا مقالہ قابلِ ذکر ہے۔ جگر پر ڈاکٹر محمد اسلام کا ضخیم مقالہ چھپ گیا ہے۔

ابوالکلام آزاد پر کئی حضرات پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ لیکن کسی کی تحقیق نے ملبوسِ طباعت نہیں پہنا۔ ڈاکٹر شرافت مرزا نے اپنے مقالہ میں مولانا کی بعض بے نامی تحریروں کی نشان دہی کی ہے جس میں مولانا کی شخصیت کے بعض نئے گوشے کھل کر سامنے آتے ہیں۔ آزاد کے حالات پر ایک اہم کتاب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ذکرِ آزاد ہے۔ رسالہ "اردو ادب" کا آزاد نمبر ایک مفید تحقیقی دستاویز ہے۔ اس سے ہٹ کر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے 'اردو ادب' میں آزاد کا اشاریہ بالاقساط چھپوانا شروع کیا۔ ساہتیہ اکادمی ان کی تمام تصانیف کو حواشی کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ الہلال اور البلاغ کے مضامین اور اداریوں کے بارے میں اتفاق رائے نہیں کہ کون سے مولانا آزاد کے رشحاتِ قلم ہیں کون سے دوسروں کے۔

اغلاط کی نشان دہی

بقول مولوی عبدالحق غلطی ہمیشہ تحقیق کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ چونکہ تحقیق کا کام صداقت کی تلاش ہے۔ اس لئے تحقیقی کارناموں کے اغلاط کی نشان دہی بھی وہی مقصد سر انجام دیتی ہے جو مثبت تحقیق۔ اس کام کے لیے بڑے مبلغ علم کی ضرورت ہے۔ قاضی عبدالودود اس فن کے ماہر ہیں۔ ان کے دو مجموعوں عیارستان اور اشتر و سوزن میں یہی کچھ ہے۔ "غالب بہ حیثیت محقق" اور عبدالحق بہ حیثیت محقق ہیں غالب اور مولوی عبدالحق کی رگوں میں نشتر تک گھونپے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے مقالے دلّی کا دبستانِ شاعری' اور ڈاکٹر اختر اورینوی کے مقالے 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء' پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔ اس رنگ میں ان کے کامیاب مقلد رشید حسن خاں ہیں جن کی تیغ قلم ان کے نام کئی فتوحات لکھ چکی ہے۔ ڈاکٹر زور کی مرتبہ "اردو شاعری کا انتخاب"، علیگڑھ تاریخ ادب اردو اور اردو رباعیوں کا انتخاب مرتبہ سردار جعفری پر انہوں نے سیر حاصل مضامین لکھے ہیں اور اغلاط کی نشان دہی کی ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کے لیے انھوں نے جو متون ترتیب دیے ہیں ان پر بھی اس قسم کے اعتراض کئے جاتے ہیں۔

لسانیات اور حوالے کی کتابیں

لسانیات

اردو ادب کے علاوہ اردو زبان بھی محققوں پر اپنا حق رکھتی ہے۔ آزادی کے بعد ذیل کی کتابوں میں اردو کی لسانی تحقیق کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا انگریزی رسالہ 'اردو لفظ کا صوتی و صوتیاتی مطالعہ'، ڈاکٹر شوکت سبزواری کی، 'اردو زبان کا ارتقاء'، اور 'داستانِ زبانِ اردو'، رسالہ 'اردوئے معلیٰ' دلّی کا لسانیات نمبر۔ گوپی چند نارنگ کی انگریزی کتاب 'اردو کی کرخنداری بولی'، اور اردو کتابچہ 'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'، مولوی امتیاز علی عرشی کی 'اردو اور افغان' جس میں اردو پر پشتو کا اثر دکھایا گیا ہے۔ اردو نامہ کراچی کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہ بنیادی طور پر لسانیات کا رسالہ ہے۔ مختلف رسالوں میں لسانیاتی موضوعات پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر شوکت سبزواری، سہیل بخاری، راقم الحروف اور دوسروں نے کئی مضامین لکھے۔ ان میں سہیل بخاری کے مضامین نے ایجادِ بندہ کو ایک نئی بلندی عطا کی ہے۔

اردو میں ڈگری کے لیے لسانی موضوعات کا لیا جانا لسانیات کے فروغ کے لیے فالِ نیک ہے۔ دلّی اور علی گڑھ میں اس طرح کے کئی موضوعات پر کام ہو رہا ہے۔ علی گڑھ سے اسلم رضوی کو اردو کی صوتی اور صوتیاتی ساخت پر اور مس نیر اقبال کو اردو قواعد نویسی پر ڈگری ملی ہے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں مہرالنسا صاحبہ نے دکنی اردو کی قواعد کا تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے ایک نہایت مفصل اور بالاستیعاب تحقیق کی تکمیل کی ہے۔ راقم الحروف نے اردو عروض پر غور و خوض کر کے چھ مضامین لکھے ہیں محمد اسحاق صدیقی کی کتاب فنِ تحریر کی تاریخ، اپنے شعبہ کی معلومات کا خزینہ ہے۔

تحقیق کے سلسلے میں لفظ و معنی کی تحقیق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لغت نگاری یہی کرتی ہے۔ فرہنگِ اثر میں اثر مرحوم نے نوراللغات کے اغلاط کی نشان دہی کی۔ نجیب اشرف ندوی صاحب نے لغاتِ گجری ترتیب دے کر قدیم اردو کی تفہیم میں ایک اہم خدمت انجام دی۔ کاش کوئی دکنی لغت بھی لکھ دے۔ سنتے ہیں یہ حیدر آباد میں زیرِ ترتیب ہے۔ مولوی عبدالحق

کی لغت کبیر اُردو رسالہ اُردو میں بالاقساط چھپ رہی ہے۔ وہ اُسے 'ب' تک مرتب کر پائے ہیں۔ دلّی یونی ورسٹی کا شعبہ اُردو ایک اردو ہندی لغت مرتب کر رہا ہے۔ مہذب لکھنوی کی مہذب اللغات کی چار جلدیں آچکی ہیں۔ لیکن لغات نگاری کا حرفِ آخر ترقی اُردو بورڈ پاکستان کی وہ عظیم لغت ہے جس کی قسطیں مسلسل اُردو نامہ میں چھپتی رہتی ہیں۔ اس تاریخ ساز شاہکار کی تکمیل کے بعد اُردو فخر کر سکے گی۔

مخصوص لغات میں سیّد مسعود الحسن رضوی کی فرہنگِ امثال اور مولانا امتیاز علی عرشی کی فرہنگِ غالب قابلِ ذکر ہیں۔ دو لسانی لغات میں ذیل کے کام سامنے آئے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو ہند کی اُردو ہندی لغت: ظ انصاری کی روسی اُردو لغت اور اُردو روسی لغت۔ حیدرآباد کی تلگو اُردو لغت اور اُردو تلگو لغت۔ روسی اور تلگو کی لغات بہت مختصر ہیں۔ محمود نیازی کی کتاب "تلمیحات" بھی حوالے کا مفید کام ہے لیکن کسی قدر تشنہ ہے۔ بعض اہم تلمیحات مثلاً خوابِ زلیخا اس میں سے غیر حاضر ہیں۔

فہرستِ کتب :-

تحقیق کرنے والوں کے لیے مختلف کتب خانوں کے مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں اولین ضروریات میں سے ہیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری کی اُردو اور فارسی مخطوطات کی فہرستیں بڑے بڑے تحقیقی مقالوں پر بھاری ہیں۔ ہمارے ملک میں اردو مخطوطات کے اچھے ذخیرے ہیں لیکن ابھی تک ان میں سے بیشتر کی فہرستیں شائع نہیں ہوئیں۔ آزادی کے بعد نصیر الدین ہاشمی نے سالار جنگ اور آصفیہ لائبریری کی وضاحتی فہرستیں مرتب کیں لیکن وہ اغلاط سے خالی نہیں۔ ادارہ ادبیات اُردو کے مخطوطات اور مطبوعات کی فہرست کی چند جلدیں شائع ہوئیں لیکن ان میں سے بیشتر وضاحتی نہیں۔ خدابخش لائبریری کے منتخب مخطوطات کی ایک فہرست نوادر کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ عرشی صاحب نے اسٹیٹ لائبریری رام پور کے عربی مخطوطات کی فہرست شائع کر دی ہے۔ وہ فہرستِ مخطوطاتِ اردو بھی تیار کر رہے ہیں۔ جس کی پہلی جلد مکمل ہے۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست کی پہلی دو جلدیں چھپ گئی ہیں۔ ان کے مرتب افسر امروہوی نے بڑی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔ انجمن نے اپنے عربی فارسی مخطوطات کی اجمالی فہرست بھی شائع کر دی ہے۔ اس انجمن نے اردو کتابوں کی قاموس شائع کرنے کا ہفت خوانی منصوبہ بنایا۔ ۱۲ ہزار مذہبی کتب کی فہرست پر مشتمل قاموس الکتب جلد اول شائع ہو گئی ہے۔ بقیہ جلدوں کا کوئی ذکر سننے میں نہیں آتا۔ نیشنل لائبریری کلکتہ کو ملک میں چھپی ہوئی ہر کتاب کی ایک جلد بھیجی جاتی ہے لائبریری نے شعبہ اردو کی کتابوں کی فہرستیں قومی کتابیات کے نام سے شائع کی ہیں۔ میرے سامنے ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۲ء کی فہرستیں ہیں۔ معلوم نہیں اس کے بعد بھی کوئی فہرست شائع ہوئی کہ نہیں۔

تحقیقی رسائل

کسی زبان میں تحقیق کا مذاق کتنا پختہ ہو چکا ہے یہ اس کے تحقیقی رسائل سے معلوم ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں طبعی اور سماجی سائنسوں کے ایسے تحقیقی رسائل نکلتے ہیں جن میں ایک مضمون چھپ جانے سے اس علم کی دُنیا میں مقالہ نگار کا مقام محفوظ ہو جاتا ہے۔ جو قوم معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہو وہ علمی اعتبار سے بھی پسماندہ رہ جاتی ہے۔ اہلِ اُردو اس لحاظ سے گردِ پسِ کارواں ہیں۔ اردو میں عالمی معیار کا کوئی تحقیقی رسالہ پھل پھول نہیں سکتا۔ گو یہاں ہر اچھے ادبی رسالے میں تحقیقی مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسے رسالے نہ ہونے کے برابر ہیں جو تحقیق کے لیے مخصوص ہوں۔ اورینٹل کالج میگزین، معاصر، نوائے ادب، تحریر دہلی صحیفہ اردو اور اُردو نامہ بنیادی طور پر تحقیقی رسالے ہیں معاصر غالباً بند ہو چکا ہے اُردوئے ادب علی گڑھ رفتہ رفتہ تحقیق سے کٹ کر تخلیق کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوتا جا رہا ہے۔ مالک رام نے سہ ماہی رسالہ تحریر تحقیق کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ لیکن ہمارے ترقی پذیر ملک میں جہاں عام ادبی رسالوں کی جان کو بھی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہاں تحقیقی رسالہ تو ہر دم ڈیماکلس کی تلوار کے تلے رہتا ہے۔

دلّی یونی ورسٹی کا رسالہ اردوئے معلیٰ اور عثمانیہ یونی ورسٹی کا قدیم اُردو نام کے لیے رسالے ہیں لیکن در اصل مستقل تحقیقی کتابیں

ہیں چناں چہ دونوں میں کئی قدیم مخطوطات کے متن مرتب کر کے شامل کیے گئے۔ رسالوں سے ملتی جلتی وہ یادگاری جلدیں ہیں۔ جو بعض علماء کو ان کی خدمات کے اعتراف میں پیش کی جاتی ہیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں کیمبرج میں مشہور مستشرق براؤن کو مشرقی تحقیقی مقالات کی جو جلد پیش کی گئی تھی وہ میری نظر سے گزر چکی ہے۔ مالک رام کی مرتبہ نذرِ عرشی اور نذرِ ذاکر میری رائے میں ارمغانِ براؤن سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ ہندی میں پرشوتم داس ٹنڈن کو دیا گیا راج رشی ابھی نندن گرنتھ مضامین کے معیار کے لحاظ سے خوب تھا، لیکن اس میں لکھنے والے سب کے سب اہلِ ہندی تھے۔ مالک رام نے نہ صرف اردو بلکہ یورپی مستشرقین سے بھی مضامین حاصل کیے، اور اس طرح اردو کے یادگاری ارمغانوں کو عالمی معیار پر لا کر چھوڑا۔

کتابوں کی فہرست کی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ اہم رسائل کے مضامین کے اشاریے ہیں۔ رسالہ اردو نے اس سلسلے میں بڑا اچھا منصوبہ بنایا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۶۳ء تک کے اپنے پرچوں میں شائع شدہ مضامین کا اشاریہ چھ قسطوں میں چھاپا۔ پہلی قسط اپریل سنہ ۱۹۶۶ء کے پرچے میں آئی ابھی یہ سلسلہ باقی ہے تکمیل کے بعد اسے کتابی شکل دے دی جائے گی۔ اس رسالے نے اردو کے دوسرے اہم ادبی رسائل مثلاً مخزن، زمانہ، ادیب اور دل گداز وغیرہ کے اشاریے مرتب کرنے کا بھی منصوبہ بنایا ہے۔ نوائے ادب نے سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۵۹ء تک اپنے دس سالہ شماروں کا اشاریہ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء کے پرچے میں دیا۔ ہم عصر رسالوں کے مضامین کا اشاریہ نوائے ادب اور قومی زبان کراچی کے ہر شمارے کا لازمی جزو ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی یونی ورسٹی اردو کے تمام اہم ادبی رسالوں کا اشاریہ مرتب کرنے کا کام اپنے ذمہ لے۔

آزادی کے بعد کے اکیس سالوں میں کی جانے والی اردو تحقیق کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے۔ یقینی ہے کہ میری کم نظری کے باعث کچھ اہم کاموں کا تذکرہ نظر انداز ہو گیا ہو گا۔ یہ فہرست سازی بعض شاعرانہ طبائع کو مکدر کر سکتی ہے لیکن میرے لیے یہ ایک نہایت دلکش داستان ہے میں اردو تحقیق کے اس پھیلاؤ کو دیکھ کر ایک امنگ، ایک نشہ محسوس کرتا ہوں۔ ایک طرف میرا یہ عقیدہ ہے کہ اغلاط کی نشان دہی کرنا بھی حقیقت کی کھوج میں اتنا ہی مفید ہے، جتنا خود تحقیق کرنا، دوسری طرف میں اس تحقیر و تضحیک سے خوش نہیں جو ہمارے بعض بزرگوں کی تحریروں میں اپنے سے کم علم اور کم عمر محققوں کے لیے ظاہر کی جاتی ہے۔ میرا مبلغِ علم کم ہے۔ میرا تحقیق کا معیار قاضی عبدالودود، سید مسعود حسن رضوی اور مالک رام صاحب کی طرح بلند نہیں اس لیے لغزشوں اور غلطیوں کے باوجود میں نئے تحقیق کرنے والوں کے کاموں کو نہایت قابلِ قدر سمجھتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ کام نہ کرنے میں ایک عیب ہے اور کام کرنے میں سو عیب۔ کتنا دل گردہ ہے ان نوجوان محققوں کا جو اس اصول سے ترساں نہ ہو کر کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر بے عیب کام کی کوشش میں گھلتے رہیں تو امکان یہ ہے کہ کوئی کام ہو ہی نہ سکے گا۔

آزادی کے بعد اردو تحقیق کے باب میں جو کام ہوا ہے وہ نہ صرف اطمینان بخش ہے بلکہ امید افزا ہے۔ ساقط المعیار کاموں کے انبار میں معیاری کارناموں کی تعداد بھی قابلِ قدر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں مقدار کے ساتھ ساتھ معیار بھی بہتر ہو گا۔

اردو زبان آزادی کے بعد (ص سے آگے)

نہیں ہوا، میرے خیال میں اردو گیت ابھی اس نسل کا منتظر ہے جو سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہوئی ہے۔

مختصراً یہ کہ [illegible] کے بعد کی اردو میں ان تمام میلانات کے بیج ملتے ہیں جن کو بار آور ہونے کے لیے غالباً تین چار دہوں کی ضرورت ہے لیکن ان کے بار آور ہونے کا تعلق ہندوستان میں اردو کے مستقبل اور بقا پر منحصر ہے اور اردو کے مستقبل کا قیاس موجودہ نسل پر نہ کیجیے جو ۱۹۴۷ء سے قبل کی نسل ہے اس کا اس نئی نسل کی نسبت سے کیجیے، جو ہندی کے علاقوں میں ہندی پنجاب میں پنجابی، اور دکن میں مراٹھی اور تلیگو پڑھ رہی ہے۔ وہ کیسی اردو لکھے گی۔ اس کا اندازہ دشوار ہے۔ یہ زبان تاریخ کے ایک بڑے سیل اور انقلاب کے ایک بحرِ پُر آشوب کی زد پر ہے۔

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا۔

محمد حسن



۱۹۴۷ء کے بعد

ادبی تنقید

۱۹۴۷ء کے بعد کی تنقید تین استفہامیوں سے ہو کر گذری ہے۔

پہلا استفہامیہ ادب کی منظریت اور مطلقیت سے متعلق تھا یعنی ادبی تنقید کو کس حد تک ادب پارے کے اندرونی تجزیے، تفہیم اور باز آفرینی پر زور دینا چاہیۓ اور اس عمل میں ادب کا رشتہ دانش کے دوسرے شعبوں اور انسانی زندگی کے دیگر عوامل سے کہاں کہاں اور کس نوعیت سے پیدا ہوتا ہے اور زندگی کا عرفان اور علم و دانش کی آگاہیاں کس طرح ادبی شعور، تنقیدی بصیرت اور فنی عرفان میں معاون یا مضر ثابت ہوتی ہیں۔

دوسرا استفہامیہ تاریخیت اور تاثر آفرینی کے متعلق تھا یعنی ادبی تنقید کا ماضی سے کیا رشتہ ہے اور تنقید ادب میں جن اقدار کی جستجو اور جن خوبیوں یا خامیوں کی پرکھ کا کام سرانجام دیتی ہے اس میں روایت کا درجہ کیا ہے گویا آج کا لمحے کا مطالعہ محض ایک تاثر، ایک تجربے کی حیثیت سے کیا جائے یا اسے انسانی کارناموں اور ناکامیوں کے طویل سلسلے کی کڑی سمجھا جائے یہ لمحہ جو ادب میں شاہکار بن کر سامنے آتا ہے قطرۂ شبنم ہے یا مالا کا موتی اور اس کا رشتہ اپنے خالق اور اس کے عصر ہی سے نہیں بلکہ پوری تہذیبی وراثت سے کیا اور کیسا ہے؟

تیسرا استفہامیہ خود نقاد کی ذات کی بازیافت کے متعلق تھا یعنی اس ذات کا رشتہ عصری مذاقِ سلیم سے کس نوعیت کا ہے اور خود تخلیقی فن کار کی ذات سے اس کا نباہ کن شرائط پر اور کس نہج سے ہوتا ہے کیا تنقید تخلیقی فن کار اور تنقید نگار کی شخصیتوں کا تصادم ہے یا سمجھوتہ یا ایک پر دوسرے کی فتح اور اسی سلسلے کے سوالوں میں سائنٹفک یا معروضی نظریۂ تنقید کا امکان یا عدم امکان اور تنقید میں نجی لب و لہجے اور انشایۓ کے رنگ کے جواز اور عدم جواز کے سارے مسائل بھی آجاتے ہیں۔

یہ تینوں استفہامیے شاید ۱۹۴۷ء سے قبل بھی موجود تھے لیکن اس دور کی تنقید نے انھیں جس طرح بے محابا اور برملا پیش کر دیا ہے وہ شاید اس کا منفرد کارنامہ بھی ہے اور کمزوری بھی ہے۔ پہلا استفہامیہ ترقی پسند تنقید کے زیر اثر پیدا ہوا تھا جس سے ہماری ادبی تنقید نے ایک اہم سبق سیکھا تھا یعنی ادب میں نفس مضمون یا خیال کی بنیادی اہمیت ہے اور خیال کے رشتے سماج اور عصری زندگی سے جا کر ملتے ہیں۔ لہٰذا ادبی شہ پارے کے مطالعے کے لۓ اس کو جنم دینے والے عہد اور اس کے فکری، تہذیبی اور جذباتی محرکات و عوامل کو سمجھنا ضروری ہے۔ گویا ہر ادبی شہ پارہ اپنے دور کے پس منظر ہی میں سمجھا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ جسے ہم فرد کی نجی داستان یا ذاتی تجربے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی عصری زندگی کی دھوپ

چھاؤں جلوہ دکھاتی ہے۔ اس شعور نے ہماری تنقید میں سماجی پس منظر کے تذکرے کی لے تیز کر دی تاریخی واقعات کی تفصیل، افراد و معاشرے کے مطالعے میں پیش لفظ کی حیثیت اختیار کرنے لگی۔ یہ بات اہم ہے کہ تنقید کے اس مکتبہ خیال کی سبھی اہم کتابیں پچھلے بیس برس میں لکھی گئی ہیں۔ مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، سجاد ظہیر، ممتاز حسین، سردار جعفری کی تحریروں کا بیشتر حصہ اسی دور میں لکھا گیا اور کتابی شکل میں سامنے آیا۔ یہ سب ادب کو سماجی اظہار اور سماجی اثر آفرینی کا ذریعہ مانتے تھے لیکن ترقی پسند تنقید کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ اس کی بنیاد سماجی اور تہذیبی تاریخ پر ہے اور ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی تاریخ مرتب ہی نہیں ہوئی لہٰذا ان ناکافی شواہد سے جو نتائج نکالے جائیں گے وہ غیر تسلی بخش یا گمراہ کن ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان میں جاگیرداری کی نوعیت کیا تھی اور سرمایہ داری کا عروج کب سے اور کیوں کر ہوا طبقاتی تقسیم کی شکل کیا تھی اور ان طبقوں کی تہذیبی وراثت کس انداز سے اثر پذیر اور اثر انداز ہوئی۔ ان سوالوں کے جواب صرف ادبی دائرے میں رہ کر ممکن نہ تھے اور عمرانی مطالعے کے لئے ان موضوعات پر نئے سرے سے تحقیق کا حق ادا کرنا ضروری تھا اسی بنا پر ہماری تحقیقی اور تنقیدی کتابوں میں تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے ابواب واقعات کی فہرست تو بن گئے مگر ان سے ادبی ذہن کی اثر پذیری کے بارے میں صحیح متعلقہ نتائج نہیں نکالے جا سکے۔

اس قوس کے دوسرے سرے پر ادبی شہ پاروں کی مطلقیت کے قائل وہ نقاد تھے جن کے ہاں پس منظر کا وجود محض فرضی تھا۔ ان کی نظریں فن پارے کی اندرونی تشکیل اور تجزیے پر جمی ہوئی تھیں ان میں سائنٹفک تنقید کے علم بردار بھی تھے اور تاثراتی تنقید کے حامی بھی۔ وہ بھی جو اپنے طور پر ادبی اصول اور ضابطے بناتے اور ان پر پورے ادبی کارناموں کا جائزہ لیتے رہے تھے اور وہ بھی جو تقابلی تنقید کی مدد سے مختلف ادیبوں کے مزاج اور ان کے اسالیب فکر و بیان کا محاکمہ کرتے رہے ان میں رشید احمد صدیقی بھی ہیں اور فراق گورکھپوری بھی۔ ایک کے نزدیک ادب عصری زندگی کی اعلیٰ ترین تہذیبی لطافتوں کا مظہر ہے دوسرے کے نزدیک ہر شعر تجربے کی ایک نئی تہہ اور لب و لہجہ کا ایک نیا موڑ۔ پھر اسی شاہراہ پر آگے کلیم الدین احمد، آل احمد سرور اور خورشید الاسلام ملتے ہیں۔

تخلیق دراصل تین سطحوں پر وجود میں آتی ہے وہ اپنے مصنف کی ذات کا اظہار بھی ہوتی ہے عصری شعور کی آواز بھی اور اس دور سے ابھرنے والی آفاقی اقدار کی گونج بھی۔ اس لئے ہر دور کے سنجیدہ ادب کا مطالعہ لازمی طور پر مصنف کا مطالعہ (تحقیق)، سیرت اور نفسیات کی مدد سے ممکن ہے) بھی ہے۔ عصر کا مطالعہ بھی ہے۔ (جو عمرانیات، اقتصادیات اور سماجی علوم کے ذریعے ممکن ہے) اور آفاقی اقدار کا مطالعہ بھی (جو جمالیات، اور تاریخ ادب کی روشنی میں ممکن ہے) جن نقادوں نے عصر سے زیادہ فرد اور آفاقی اقدار پر زور دیا ہے ان میں کچھ ایسے تھے جن کی ذات میں اجتماعیت کا آہنگ اور آگہی تھی اور اپنی تاثراتی تنقید میں بھی وہ تاثر کی وسعت جامعیت اور رنگارنگی کو فراموش نہ کر سکے۔

اس منزل پر شاید یہ ضروری ہے کہ اس دور میں ہمارے تنقیدی سرمائے پر گہرے مغربی اثرات کا تذکرہ کیا جائے جن میں فرانسیسی اور انگریزی نقادوں کے اثرات خاص طور پر نمایاں ہوئے ہیں ان میں مثبت اور منفی دونوں اثرات نمایاں تھے ایک طرف کلیم الدین احمد مغربی نقادوں کے بعض اصول اختیار کر کے انھیں پوری قطعیت اور قدرے میکانکی دیانتداری سے استعمال کرتے ہیں۔ اور عملی تنقید کے بعض انوکھے نمونے وجود میں آتے ہیں۔ دوسری طرف ٹی ایس ایلیٹ کے حوالے تنقیدی تحریروں میں ابھرنے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں جہاں تنقید کو توسیع ذات کی کوشش کے طور پر پیش کیا گیا وہاں اسے محاکمے اور تصفیے کے بجائے محض ترتیب مقدمات بھی قرار دیا گیا جس میں تنقید نگار فیصلہ نہیں دیتا صرف متعلقہ شواہد اور تجزیے میں مدد دینے والے حقائق و آراء کو معنویت کے ساتھ مرتب کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ سائنٹفک تنقید کا نشوونما لائق اعتنا طور پر نہیں ہو سکا اور مغربی اثرات سے جہاں ہمیں تجزیے کا نیا شعور ملا وہاں بنے بنائے اصول اور ضوابط کو میکانکی طور پر برتنے کے نتیجے میں اپنے ادبی مزاج اور تہذیبی روایات سے بےخبری کے باعث بعض نقاد گمراہ کن اور ادھوری سچائیوں تک پہنچے۔ پھر اصطلاحات کی زبان کو قطعیت درکار ہے اور اصطلاحات

کے مفاہیم کے غیر متعین ہونے کی بنا پر تنقید بین الاقوامی شعور سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکی۔

دوسرے استفہامیے یعنی ماضی کی دریافت کے راستے سے ادبی تنقید تحقیق کی اہمیت کے نئے شعور تک پہنچی۔ ادبی تنقید کو اگر کسی دور کے ادب کو ایک تسلسل کی شکل میں دیکھنا اور پرکھنا ہے تو لازم ہے کہ پہلے محاکمے کے لیے صحیح شواہد اور تفصیلات جمع کی جائیں۔ تنقید کو اگر محض رائے زنی بننے سے گریز کرنا ہے تو سب سے پہلے جس مصنف کے کلام کا محاکمہ درکار ہے اس کا صحیح متن حاصل کرنا ناگزیر ہوگا اس کے حالات زندگی کی دریافت اس کے مزاج اس کی وراثت، علمی اور ادبی استعداد اس کے دور کا معاشرہ غرض اس کی شخصیت کو پہچاننے کے لیے تحقیق سے مدد لینی ہوگی۔ اور پھر تنقید کے ایسے اصول و ضوابط بھی مرتب کرنے ہوں گے جن میں آفاقی ذوق جمال کی شائستگی تو ہو مگر یہ اصول مانگے کا اجالا نہ بن جائیں جن سے ہمارے ادب کی پرکھ میں مدد ملنے کے بجائے رنگین شیشے کا کام دینے لگیں اور حقیقتوں کو مسخ کر دے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس دور میں ایسی متعدد تصانیف شائع ہوئی ہیں جو تحقیق و تنقید دونوں کی سرحدوں پر ہیں اور جنہوں نے تنقیدی محاکمے کے لیے تحقیق کی مدد لینا ضروری خیال کیا ہے۔

ان میں خصوصیت کے ساتھ مختلف ادوار اور شخصیتوں کے تنقیدی محاکمے قابلِ ذکر ہیں۔ غالبیات اور اقبالیات اُردو تنقید کے مستقل عنوانات ہیں۔ ان میں اس دور نے میریات کا اضافہ کیا البتہ غالب پر ہندوستان میں غالب شناسی، نقد غالب اور غالب (خورشید الاسلام) کے علاوہ تنقیدی نقطہ نظر سے کوئی اہم کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اقبال پر پچھلے بیس سال میں ہندوستان میں تنقیدی حیثیت سے کوئی وقیع کتاب نہیں چھپی البتہ میر پر پہلی بار اتنی توجہ صرف کی گئی۔ ہندوستان میں میر، حیات اور شاعری، حدیث میر، دلی کالج میگزین کا میر نمبر۔ دیوان میر (مرتبہ سردار جعفری) اور کلیات میر کی اشاعت اور پاکستان میں نقد میر۔ عبارت بریلوی کی مرتبہ کلیات اور محمد حسن عسکری کا مرتبہ انتخاب اس توجہ کے غماز ہیں۔ قدیم ادب کی تشکیل نو کے سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی مرزا محمد رفیع سودا، ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی ذوق حیات وانتقاد اور ڈاکٹر قمر رئیس کی پریم چند کا تنقیدی مطالعہ اہم ہیں۔

تاریخی تسلسل کے بڑھتے ہوئے شعور کی ایک اور مثال عبدالقادر سروری کی اردو کی ادبی تاریخ ڈاکٹر اعجاز حسین کی آزادی کے بعد اُردو ادب اور علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی شکل میں سامنے آئی ہے عبدالقادر سروری نے ادبی میلانات کو پورے تہذیبی اور تاریخی مدوجزر کا حصہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے عصری ادب کے مختلف میلانات کا دستاویزی جائزہ لیا ہے یعنی تجزیے سے زیادہ انہیں محفوظ کر لینے کی کوشش کی ہے

علی گڑھ تاریخ ادب اردو "تغیر پذیر ادب کو بدلتے ہوئے مگر مسلسل تہذیبی ارتقاء کی روشنی میں پرکھتی ہے" مگر یہ تینوں کوششیں خام مواد اور تجزیاتی بصیرت کی کمی کی بدولت ابتدائی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔

اس دور کے تنقیدی میلانات کا اندازہ ان مباحث سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو ادبی حلقوں میں زیر بحث رہے ہیں ان میں بعض ماضی کی دریافت سے متعلق معلوم ہوں گے۔ مگر ان کی کڑیاں دراصل عصری میلانات سے ملتی ہیں ان مسائل میں ادب عالیہ سے متعلق رویہ ادب میں جمود۔ غزل کا مستقبل۔ قطعہ اور رباعی۔ نئے ادبی تقاضے اظہار ترسیل اور ابلاغ پر بحثیں بھی شامل ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ ان میں دو مسائل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک ماضی کے سرمایے سے عصری ادب کی بصیرت کے رشتوں کی بنیاد قائم کرنے کی جستجو اور اقدار کے تعین کے لیے نئے علم و آگہی کی روشنی میں معروضی معیاروں کی تلاش۔

پہلے مسئلے نے ہماری تنقید کی ادبی و غیر ادبی بالفاظ دیگر، علمی فلسفیانہ اور تہذیبی اقدار کے باہمی رشتے کی نوعیت کی طرف رہبری کی۔ کیا ادب واقعی محض انفرادی کیفیات کی عکاسی ہے؟ اگر یہ صحیح ہے

تو ان کیفیات کی تشکیل میں فرد کی نسلی وراثت اور ماحول اس کے گرد وپیش اور اس کے ذہن اور جذبے، روایت اور تجربے کا کیا حصہ ہوتا ہے۔ اور اگر ہوتا ہے تو پھر جسے عرف عام میں ذاتی تاثر کہا جاتا ہے اس کا کتنا حصہ ذاتی کہا جا سکتا ہے اور کتنا ایسا ہے جس میں اجتماعی آہنگ موجود ہے پھر جسے تاثر کہتے ہیں اس میں خارجی محرکات کا کتنا عمل دخل ہے اور اعصابی ردعمل کے ساتھ کتنا حصہ تجربہ و فلسفے کا، عقیدے اور تفکر کا، جذبے یا تخیل کا شامل ہوتا ہے؟ کیا شاعرانہ تاثر سے تعبیر کی جانے والی شے محض تاثر ہی ہے یا اعصابی ردعمل، جذباتی رویے، ذہنی انتقاد اور تخیل کی رنگ آمیزی سے مل کر ظہور میں آنے والے مرکب کا نام ہے؟ کیا ادب محض اظہار ذات ہے یا ذاتی تجربے کے ادب میں ظاہر ہونے کے لئے معنویت شرط ہے؟ ان مباحث نے ایک طرف تو نظریاتی تنقید کی طرف متوجہ کیا اور دوسری طرف فلسفیانہ تنقید کے میلان کو متعارف کرنے میں مدد دی فلسفیانہ تنقید کا یہ میلان ہنوز ابتدائی دور میں ہے اور اس کا تفصیلی جائزہ لینا قبل از وقت ہوگا۔ البتہ نظریاتی تنقید کے مختصر سے سرمائے میں تھوڑا بہت اضافہ ہوا ہے۔

نظریاتی طور پر ادب اور تنقید کو عصری آگہی اور تہذیبی تانے بانے سے الگ کر کے دیکھنے کا میلان ہندوستان کے تنقید نگاروں میں بہت کم اور پاکستان میں بہت زیادہ ابھرا ہے۔ ہندوستان میں اس کی نمائندگی کلیم الدین احمد اور پچھلے چند مہینوں سے آل احمد سرور کی تحریروں میں ملتی ہے کلیم الدین احمد ادب کے دائرے میں رہ کر ادبی شہ پارے کو جانچنا، تولنا اور پرکھنا چاہتے ہیں۔ اور نظریاتی طور پر تقابلی تنقید کے اصولوں کو سامنے رکھ کر جذبات کی شدت اور والہانہ کیفیت سے بھی زیادہ ترتیب، ربط، جامعیت اور مسلسل پرواز پر زور دیتے ہیں اور انھیں دانش عصر سے بہت کچھ الگ کر کے دیکھتے ہیں جس کے نمونے عملی تنقید میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں پاکستان میں گو نظریاتی تنقید کی مثالیں عابد علی عابد کی کتاب اور ممتاز حسین کے بعض مضامین ہی میں ملتی ہیں محمد حسن عسکری کا نظریہ تنقید تضادات سے خالی نہیں (مگر ان کی تحریروں کی مدد سے اگر کوئی ایک تصویر بنائی جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ دراصل دوہرے وجود کے قائل ہیں ایک فطری جبلتوں سے بنا ہوا آدمی دوسرا تہذیب کے سانچے میں ڈھلا ہوا انسان اور ان کے نزدیک علم و دانش کے اکثر ذخیرے انسان کے حق میں اور آدمی کے خلاف سرگرم عمل ہوتے ہیں اور ادب اسی آدمی کی، فطری جبلتوں سے تشکیل پائے ہوئے آدمی کی وہ آواز ہے جو انسان کے علم الرغم بلند کر رہا ہے۔ اور اگر اس آواز کو سمجھا جا سکتا ہے تو اس کی ذات کے بلکہ ادبی محاورے کے دائرے میں رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے)

پاکستان میں تنقید کا دوسرا رُخ پورے آدمی کی تلاش اردو شاعری کے مزاج کی تحلیل اور اسے **Myth** اور **Arch Type** کی مدد سے سمجھنے کی شکل میں ظاہر ہوا۔

معروضیت کی تلاش میں ہمارے نقاد البتہ دو بنیادی مراحل تک پہنچے۔ گو ان کا حل ہنوز پوری طرح ممکن نہ ہو سکا۔ ایک تنقیدی اصطلاحوں کی صحیح یا متعین معنوں کی تلاش کا مسئلہ ہے اور دوسرا ادبی مباحث کے تصفیے کے لئے کسی مشترک معیار کی دریافت کا سوال۔ جہاں تک تنقیدی اصطلاحوں کا تعلق ہے ہمارے سرمائے میں یا مغربی اور خصوصاً انگریزی اصطلاحوں کے ترجمے ہیں جن کی شکل اور مفہوم دونوں غیر متعین ہیں۔ جذبے کا لفظ **Sensation** کے لئے بھی مستعمل ہے **Emotion** اور **Sentiment** کے لئے بھی اسی طرح مستعمل الفاظ اور اصطلاحیں بھی برابر مختلف اور کبھی کبھی متضاد معنوں میں برتی جا رہی ہیں ان کے علاوہ جو اصطلاحیں ہیں وہ یا ایجاد بندہ ہیں یا تذکرہ نویسی کے دور کی یادگار ہیں جو کبھی مخصوص اور متعین مفہوم رکھتی تھیں مگر اب اس پس منظر سے دور ہو کر غیر متعین سی ہوگئی ہیں اس ضمن میں مسیح الزماں کی مختصر کتاب "اردو تنقید کی تاریخ" کا ابتدائی کاوش کے سوا اور کوئی مفید کام نظر نہیں آتا۔

معروضی معیار کی تلاش میں بعض نقادوں نے ایسے **Verifiable** جانچ اور پرکھے جانے والے مواد کی تلاش شروع کی جسے نتائج نکالنے اور محاکمے تک پہنچنے میں سند کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اسی راستے سے ہو کر ہمارے بعض نقاد تحقیق کی اہمیت اور ضرورت کو پہچاننے لگے یہ تحقیق محض ادبی یا سوانحی نہیں تھی۔ بلکہ اس کا رشتہ تمام عمرانی علوم

سے ملتا ہے۔

(۳)

تیسرا استفہامیہ نقاد کی ذات کی تلاش ہے معروضیت تنقید کو زیادہ سے زیادہ غیر شخصی اور اصولی بنانے پر اصرار کرتی رہی ہے بینٹ بیو کا طریقہ کار نقاد کو معمل میں بیٹھے سائینس داں کی طرح غیر جانبدار اور اسی قدر غیر شخصی دیکھنا چاہتا ہے کیوں کہ اصل معاملہ محاکمے کا نہیں تفہیم کا ہے اور تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب تفہیم کا جویا اپنی ذات اور اپنے تاثرات و تعصبات کو بھلا کر اپنے کو تخلیقی فن کار کے تابع کر دے گویا معاملہ ایک شخصیت اور دوسری شخصیت کا نہیں عکس اور آئینے کا ہے اور آئینہ خود اپنی کوئی تصویر نہیں رکھتا اس نیم دائرے کے بالکل دوسرے سرے پر وہ نقاد ہیں جن کے نزدیک تخلیقی فن کار کی تفہیم صرف نقاد کی اپنی ذات بلکہ اسی کے تاثرات و تجربات کے آئینے ہی میں ممکن ہے یہاں تنقید تفہیم محض نہیں رہ جاتی۔ کیفیت کی باز آفرینی بن جاتی ہے۔ اور نقاد نہ صرف تخلیقی فن کار سے روحانی ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے بلکہ اس کے تخلیقی تجربے میں نہ سہی تو کم سے کم اس کی کیفیت اور مستی میں ضرور شریک ہونا چاہتا ہے اور اسی کیفیت اور مستی کی اپنی ذات کے پورے جادو کے ساتھ باز آفرینی کرتا ہے۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ تاثراتی تنقید کے دو امام رشید احمد صدیقی اور فراق گورکھپوری ہیں اور اس ضمن میں کچھ دور آگے چل کر خورشید الاسلام کا نام آتا ہے ان کی تاثراتی تنقیدیں کڑھی ہوئی شخصیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں محض تعصب یا تاثر نہیں بلکہ ادب میں تہذیب رسم عاشقی کے آداب موجود ہیں اور اسی وجہ سے یہ جواہر پارے انشائیے نہیں، گہری اور ہمہ جہت بصیرت کے نمونے بن گئے ہیں۔

چند سال پہلے تنقید کے لب و لہجے کو انشائیہ یا چلتے ہوئے صحافتی چٹخارے دار مضمون کے لب و لہجے میں تبدیل کرنے کی کوشش بھی نمایاں ہوئی ہے۔ یہاں نقاد کی شخصیت چیختی چنگھاڑتی کچھ اس طمطراق سے نمودار ہوتی ہے کہ تخلیقی فن کار یا فن پارے کا وجود اس کے جادو سے ایسی کھونٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے جس پر نقاد اپنے لفظوں کے بھڑکیلے لبادے لٹکائے گا یا اپنے چٹ پٹے جملوں کی اوڑھنی سکھانے کے لئے ڈال دے گا۔ یہ انداز تحریر نیا ہے، کیوں کہ مجنوں گورکھپوری تک واحد متکلم کا استعمال تنقید میں گناہ نہ سہی تو مستحسن بھی نہیں سمجھا گیا۔ جہاں نقاد کی ذات بولتی ہے۔ وہاں اس کی معروضیت اصول پسندی اور اس کا علمی لب و لہجہ مجروح ہونے لگتا ہے۔ البتہ پچھلے بیس برس میں تنقید رائے زنی سے قریب آئی ہے۔ اور اس پر انشائیہ کا رنگ غالب آنے کا اندیشہ ضرور پیدا ہوا ہے۔ ان چند برسوں میں ناقد طرز تحریر کے علمی نہ ہونے کی معذرت بھی ضروری نہیں جانتا اور مسخرا یا اسٹنٹ باز کہلائے جانے کا خطرہ مول لے کر بھی "ذہن میں اضطراب پیدا کرنے والا" اسلوب اختیار کرتا ہے اور کبھی کبھی "کرخنداری کی زبان" میں تنقید کے سنجیدہ علمی مسائل کو ادا کرنے پر فخر بھی کرتا ہے۔

(۴)

بیس سال کے تنقیدی سرمایے کے بنیادی میلانات کا یہ جائزہ اور تنقید کی پوری اور جامع تصویر پیش نہیں کرتا۔ ایک طرف تو نظریات اور معیاروں کا تعین نہیں ہوا ہے دوسری طرف ہماری عملی تنقید بھی اکثر صورتوں میں لے دے کر شاعری ہی کی تنقید رہی ہے۔ ناول اور افسانہ، انشائیہ اور نثری اسلوب کی رمز شناسی ابھی عام نہیں ہوئی ہے۔ اصطلاحوں کے معنی متعین نہیں ہیں۔ اور ماضی کے ادب عالیہ کی تنقید کے سلسلے میں ضروری مواد اور وسائل ہمیں میسر نہیں ہیں جس کی وجہ سے محاکمہ قیاس یا تعصب بن سکتا ہے۔ پھر ہمارے تنقیدی سرمایے میں ہنوز اعلیٰ سنجیدگی کی کمی ہے۔ تنقید رسالے کا مضمون اور اخبار کا اداریہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان دونوں کے آداب اور انداز مختلف ہیں۔ تنقید نہ اشتہار ہے نہ تنقیص، بلکہ ایک سنجیدہ علمی مشغلہ ہے۔ جس کے ساتھ تمسخر نہیں کیا جا سکتا جو اسے محض ہنسنے، بولنے پگڑی اچھالنے یا پھبتی کسنے یا قصیدہ پڑھنے کا بہانہ بنانا چاہتے ہیں وہ تنقید کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتے۔ بلکہ اس کی رسوائی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

پھر ہماری تنقید میں ہنوز ہماری سرزمین اور ہماری ادبی اقدار اور ادبی مزاج کی بو باس کم ہے۔ علم اور تہذیب بے شک عالمگیر ہیں۔ حسن جہاں ہو انسانیت کا کھویا ہوا گنگن ہے۔ مگر ہر ادب کی اپنی بصیرت

(بقیہ ص ۶۶ پر)

دیوندر اسر

اُردو ناول کے بیس سال



اُردو کے نثری ادب میں جو مرکزی مقام افسانے کو حاصل ہے وہ ناول کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس امر کے باوجود کہ ناول افسانے کے مقابلے میں زیادہ مقبول صنفِ ادب ہے اور ناول کے قارئین کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ ناول کی "ماس ریڈرشپ" ہے۔ اور جیسا کہ ہر مقبول "ماس میڈیا" کے ساتھ ہوتا ہے۔ ناول کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے مارکیٹ میں ہر قسم کے غیر معیاری اور نیم معیاری ناولوں کی بھرمار ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ناول ایسے ہیں جنہیں ادب کے دائرے میں شامل کرنا ادب کی تحقیر کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے مارکیٹ میں جنسی تلذذ تشدد قتل و غارت اور مار دھاڑ سے بھرپور نیم ادبی فلمی اور جاسوسی ناولوں کی بہتات ہے۔ ان حالات میں کسی معیاری ناول کی اشاعت جو ادبی بھی ہو اور قابلِ مطالعہ بھی ایک "خوشگوار حادثہ" ہی سمجھا جانا چاہئے۔

اردو کے بیشتر ناول نگار بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ ایسے ہیں جو ناول کو ایک ادبی صنف کے طور پر کم اس کے کمرشل پہلو کے لئے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ناول نگاری ان کے لئے ادبی مہم نہیں تجارتی تجویز ہے اور ناول نگاری ایک تبدیلی ہے جس کا انجام صحت مند کم، مہلک زیادہ ثابت ہوا۔ ناول نگار اور ناول دونوں کے لئے۔ ایسے ناولوں کو پڑھ کر اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ناول چند افسانوں کو مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے یا کسی افسانے کو طول دے دیا گیا ہے۔ افسانے کو طویل کر دیا تو ناولٹ بن گیا۔ افسانوں کو ایک مرکزی کردار کے ذریعہ جوڑ کر پھیلا دیا تو ناول تخلیق ہو گیا۔

اُردو میں جدید ناول کی نشو و نما بھی نئے افسانے کی طرح روایت اور تجربے کی باہمی آمیزش (اور آویزش) میں ہوئی۔ (یہاں "جدید" اور "نیا" ہم عصر کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں) اُردو کے نئے افسانے کی پرورش مغربی ادب کی تحریکوں کے گہوارے میں ہوئی۔ مغرب کی فنی تحریکوں کا مجموعی اثر ہمارے ادب پر تو پڑا ہی، لیکن کچھ ادیبوں کا اثر ہمارے ادیبوں نے انفرادی طور پر قبول کیا۔ افسانے کے مقابلے میں ناول میں جدید ذہن اور جدید ادبی تحریکوں کی عکاسی بہت کم ملتی ہے۔ تکنیک کے نئے نئے تجربے بھی شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ ناول نگاروں نے افسانے کے شعبے میں جس تخلیقی صلاحیت اور انفرادی اپج کا ثبوت دیا اس کا دھندلا سا عکس ہی ان کے ناولوں میں ملتا ہے۔ اس کا ایک باعث شاید یہ ہے کہ افسانے کا کینوس محدود ہونے کے باعث ادیب مختلف افسانوں میں موضوع اور ہیئت کے نئے نئے تجربے کر سکتے ہیں اور ناکامی

کی صورت میں خطرہ بھی زیادہ نہیں۔ لیکن چند مثالوں کو چھوڑ کر جب بھی انہوں نے ناول کی تخلیق کی انہوں نے روایتی طرز کو ہی ترجیح دی جس کے باعث نئی زمین کی تلاش کے بجائے "فارمولا" کے محفوظ اصول پر عمل کیا گیا۔ اس لئے ناول کے شعبے میں جتنے اہم تجربے مغرب میں ہوئے ہیں، ان کی ہلکی سی جھلک بھی ہمارے ناولوں میں نہیں۔ سوائے شعور کا بہاؤ کی تکنیک کے، لیکن یہ تکنیک بھی اب قبل از جدید ہو کر روایت میں شامل ہو چکی ہے مغرب میں نت نئی تحریکیں ابھریں۔ اینگری ینگ مین، بیٹس ، وجودیت پرستی لغویت کا ادب یا ایلن راب گرے کے تجدیدی ناول۔ اس معنی میں اردو کا ہم عصر ناول جدید نہیں۔

سوال یہ نہیں کہ ہمارے ناول نگار مغربی ادب کی جدید تحریکوں سے متاثر کیوں نہیں یا انہیں اپنے ادب میں پیش کیوں نہیں کرتے۔ بلکہ یہ ہے کہ جس ذہنی سفر کو مغربی ادیبوں نے طے کیا ہے۔ اس تک ہماری رسائی کیوں نہیں جبکہ تہذیبی اور سماج کے نشوونما کے فرق کے باوجود "جدید ذہن" ہمہ گیر نفسیاتی پیٹرن کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اور اس معنی میں یہ ہمارے دور کا اجتماعی شعور بن چکا ہے۔ ہمارے ناول نگار جدید ذہن کے اثر کو مشرقی انداز فکر، منفرد شخصیت اور مزاج اور ذاتی اپج میں سمو کر "جدید ہندوستانی ناول" کی تخلیق کرنے میں اکثر کیوں ناکام ہوئے مثال کے طور پر وقت کے تصور کو ہی لیجئے۔ یہ تصور قرۃ العین حیدر اور احمد علی کے ناولوں تک ہی کیوں محدود ہے جب کہ مغرب میں مارسل پروست ، ورجینیا ولف اور جیمس جوائس جیسے باشعور ادیبوں برگساں جیسے فلسفی اور آئین اسٹائن جیسے سائنسدانوں نے مختلف پہلوؤں سے غور و فکر کے بعد انسان تصور کو کائنات کے اسرار و رموز سے روشناس کرایا ہے۔ وقت کا تصور ہندوستانی فلسفے میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا دائرہ حیات و موت کے دائرے سے بھی پرے آفاقی شعور Cosmic Consciousness تک جا پہنچتا ہے جس کی جانب موجودہ دور میں اروندگھوش نے اپنے نظریہ فوق الشعور میں اشارہ کیا ہے اور جس کی جانب مغرب کے ماہرین نفسیات، فلسفی، اور سائنسداں دھیرے دھیرے بڑھ رہے ہیں۔ ہندوستان کا Integrated نفس کا نظریہ تحلیل نفسی پر حاوی ہو رہا ہے۔ مشرق و مغرب کی ذہنی حدیں مٹ رہی ہیں۔ لیکن جیسے ہمارے ہاں خبر ہی نہیں پہنچی نہ مغرب کی نہ مشرق کی۔ اس لئے جدید اردو ناول فکری سطح پر کافی پسماندہ ہے اور یہ پسماندگی بھی ایک روایت بن چکی ہے۔

اردو ناول کی تاریخ ویسے بھی زیادہ پرانی نہیں۔ مولوی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا محمد ہادی رسوا۔ اور عبدالحلیم شرر کے ناول جدید ناول کا پیش خیمہ ہیں۔ گزشتہ بیس برس کے اردو ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان ناموں کو دہرانے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ہم عصر ناول نگار، انفرادی نفسیات اور سماجی عوامل سے واقف ہونے کے باوجود بھی ایک بھی ایسا کردار تخلیق نہیں کر سکے۔ جو امراؤ جان ادا یا خوجی کی طرح لافانی کردار بن جائے۔ اسی طرح پریم چند کے گئودان کے ہیرو "ہوری" کے بعد اردو ناول میں ایسا نمائندہ کردار تخلیق نہیں ہوا جو اپنے دور کے حالات اور سماجی زندگی کا سمبل بن سکے۔

پریم چند نے اردو ناول کو "ہوری" جیسے بھرپور کردار سے ہی روشناس نہیں کرایا بلکہ ناول کو نام نہاد تاریخی رومانیت پرستی سے بھی آزاد کیا لیکن اصلاحی جذبے کی فراوانی کے باعث پریم چند بھی اپنے ناولوں کے فنی پہلوؤں کی مکمل نشوونما نہیں کر سکے اور یہ کمی آج بھی ان ناولوں میں نظر آتی ہے جو پریم چند کی روایت کو لے کر آگے بڑھے ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے قریب قریب تمام ناول نہ صرف آدرش، حقیقت پسندی کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اپنے اسلوب بیان میں بھی روایتی طرز کے حامل ہیں۔ راہ عمل ہو یا یادوں کے چراغ اسی روایت میں پرورش پاتے ہیں۔ پریم چند کے ناولوں پر ٹالسٹائی کا اثر غالب تھا جبکہ یورپ کے جدید ناول نگاروں نے ٹالسٹائی کے ہم عصر دستوفسکی سے اثر قبول کیا۔ دو ہم عصر ادیبوں سے الگ الگ اثر لینے والے ادیب اس باعث "روایت پرست" اور "جدید" کے دائروں میں بٹ جاتے ہیں۔

اردو میں نئے ناول کا آغاز صحیح معنی میں ترقی پسند تحریک سے ہوا جس کی نشوونما آزادی کے بعد ہوئی۔ اور ناول بحیثیت ایک ادبی صنف کے تسلیم اور مقبول ہوا۔ نیا ناول دیہی زندگی کے بجائے شہری

زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ شہری زندگی بھی وہ جو پریم چند کے دور کی شہری زندگی سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ پریم چند کے دور کی شہری زندگی قصبے کی زندگی کی ہی وسعت تھی۔ بلونت سنگھ، جمیلہ ہاشمی، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے کچھ ناول گاؤں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں لیکن ان کا اندازِ فکر کردار نگاری، اسلوب بیان، "ذہنی فضا" اُردو ناول میں نئے دور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن پریم چند کے ناولوں کی آدرش حقیقت نگاری اور انسانیت اپنی اور بدلی فارم میں بھی برقرار رہی لیکن یہ روایت کرشن چندر کے ناولوں میں مارکسیت کے زیر اثر سماجی حقیقت نگاری اور طبقاتی شعور کی صورت میں نمو پذیر ہوئی۔ آدرش اور حقیقت کے سنگم کی روایت میں نئے ناول نے رومانیت کو بھی شامل کر دیا اور مقصدیت پر فن کا پردہ ڈال دیا۔

حقیقت پرستی کی روایت نئے ناول میں پریم چند کے ناولوں کے علاوہ مغرب کی حقیقت پرستی کے راستے سے بھی شامل ہوئی۔ مغرب کی حقیقت پرستی (زیادہ تر فطرت نگاری کی شکل میں) اس کا سب سے گہرا اثر عزیز احمد نے قبول کیا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری میں آدرش اور اخلاق اقدار کی تکمیل کی خواہش شامل تھی۔ لیکن عزیز احمد کے ناولوں میں آدرش کی تکمیل کے بجائے نفسیاتی فطرت نگاری کا عنصر زیادہ غالب ہے اس کا باعث فرانسیسی فطرت نگار ادیبوں سے عزیز احمد کا متاثر ہونا ہے "ہوس" "گریز"، "آگ"، "مرمر اور خون"، اور "ایسی بلندی اور ایسی پستی"۔ اس نفسیاتی صداقت کو پیش کرتے ہیں۔ عزیز احمد فرائڈ کے نظریہ جنس سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ اور وہ جنس کا ذہنی اور جسمانی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

ہم عصر ناول میں آدرش، حقیقت، رومانیت، فن کا جمالیاتی احساس، طبقاتی شعور اور جنس و لاشعور کے عناصر باہم گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ بیشتر ناول حقیقت اور رومان کے امتزاج سے جنم لیتے ہیں۔ کرشن چندر کے ناول اس کا ثبوت ہیں۔ آزادی سے قبل شائع شدہ کرشن چندر کا ناول "شکست" اور اوپندر ناتھ اشک کا "ستاروں کے کھیل" اسی امتزاج کو پیش کرتے ہیں۔ "ستاروں کے کھیل" نوعمر رومانیت اور "شکست" نوعمر رومانی افسردگی کی اچھی مثالیں ہیں۔ یہ امر کافی دلچسپ ہے کہ "شکست" "ستاروں کے کھیل" اور عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر" ترقی پسند ناول نہیں جب کہ تینوں ناول نگار ترقی پسند تحریک سے منسلک رہے ہیں۔ "ٹیڑھی لکیر" جنسی کجرویوں اور ہم جنسی رشتوں پر مبنی ہے جسے مسلم سماج کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

بلونت سنگھ کے ناول "رات، چاند اور چور" پر حقیقت کے بجائے رومانیت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ یہ ناول حقیقت کو رومانی نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے اس کے برعکس راجندر سنگھ بیدی کے ناول "ایک چادر میلی سی" پر رومان کے بجائے حقیقت حاوی ہے۔ ناول کے بعض حصوں میں مبالغہ آمیزی کا احساس ضرور ہوتا ہے اور اس کا انجام دانستہ طور پر "ڈرامائی" بنایا گیا ہے۔ اس کے باوجود کردار نگاری اور جذباتی کشمکش کی ترجمانی کے باعث یہ ناول حقیقت سے زیادہ حقیقی ہے۔ بیدی کے فن کی جڑیں ہندوستانی تہذیب اور معاشرے میں کافی گہری ہیں۔ وہ انسانی جذبات اور تیز و تند ذہنی کیفیات کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ اور یہ بات ایک چادر میلی سی کے مطالعے سے بخوبی عیاں ہو جاتی ہے۔ "ایک چادر میلی سی" جذبات کی ہیجان انگیز کیفیت اور داخلی کشمکش کی ہلکے اور گہرے رنگوں میں تصویر کشی کرنے میں کامیاب ہے۔ بیدی اپنے ارد گرد کی زندگی میں غصے جھلاہٹ، غم، دکھ درد، اور نفرت اور قربانی اور پیار کو ایک **Insider** کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کے فن میں فلسفۂ حیات اور انسانی نفسیات، کردار اور پلاٹ کے تانے میں بن کر سامنے آتے ہیں۔ "ایک چادر میلی سی" میں بیدی نے انسانی کردار کی پیچ در پیچ شخصیت، جذبات، اور زندگی کے جذبات اقدار کی شکست و ریخت اور لاشعور کی قوت کو زندہ کردار نگاری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ یہ ناول زندگی کا مرقع ہے۔ بیدی کی فنی مہارت اور فنی احتیاط، ویژن کی گہرائی تخلیقی خلوص اس ناول کو نہ صرف کامیاب ہی بناتے ہیں۔ بلکہ اہم ادبی دستاویز بھی بنا دیتے ہیں۔ روزمرہ کے معمولی واقعات اور احساسات کو فن کی بلندی تک لے جانا اور ان میں انسانی دکھ درد کی منہ بولتی تصویریں پیش کرنا بیدی کے فن کا کمال ہے یہی احساس احمد علی کے ناول "دلی کی ایک شام" پڑھ کر ہوتا ہے۔ جو انگریزی میں تو آزادی سے قبل شائع ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا اردو

ترجمہ آزادی کے بعد شائع ہوا ہے۔ ترجمہ خود مصنف نے نہیں کیا لیکن اسمیں اوریجنل ناول کا سا تاثر موجود ہے۔

شوکت صدیقی نے ناول کو ایک سنجیدہ طرزِ فن کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بیدی کے ساتھ شوکت صدیقی کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ بیدی کی طرح ہی شوکت صدیقی سماجی شعور رکھتے ہیں اور زندگی کی کردار نگاری کے قایل ہیں۔ "خدا کی بستی" اکھڑے ہوئے لوگوں کی ٹکڑے ٹکڑے زندگی کو اور کرداروں کے غم و یاس کو نہایت چابک دستی سے پیش کرتا ہے۔ ان کا دوسرا ناول "کمیلی" بھی ایک کامیاب ناول ہے

یہی فنی شعور خدیجہ مستور کے "ناول" آنگن میں موجود ہے۔ خدیجہ مستور نے حیات کو ایک مکمل اکائی کے روپ میں دیکھا ہے۔ اور پھر اس کے مختلف حصوں پر نظر ڈالی ہے اور غیر ضروری جزیات کو چھوڑ کر ان مختلف حصوں کو ایک فنی اکائی میں منظم کر دیا ہے۔ یہی باعث ہے کہ "آنگن" افسانوں کا مجموعہ نہیں ناول ہے۔ "آنگن" انسان کے نازک ترین رشتوں کو تہذیبی اور سماجی پس منظر میں متحرک طور پر پیش کرنے میں کامیاب ثابت ہوا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار عالیہ اور جمی عام کرداروں کی طرح سپاٹ نہیں اور وہ پورے ناول پر حاوی ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاشِ بہاراں" کا بڑا چرچا رہا۔ "تلاش بہاراں" ناول کی تکنیک کا بھرم قائم کرتا ہے۔ جس میں ایک کردار کے شعور کے ذریعے واقعات کو ایک مربوط ڈھانچے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کا ہیرو "کردار" بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اینٹی ہیرو ہے بلکہ اس لئے کہ وہ نمو پانے سے قاصر ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا دوسرا ناول "داغِ فراق" بھی اس طرز کی نمائندگی کرتا ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں کا ذکر چل پڑا تو واجدہ تبسم کے "شہر ممنوع" اور رضیہ سجاد ظہیر کے "پھول اور سموم"، "سمن" اور "سرِ شام" اور رضیہ فصیح احمد کے "آبلہ پا" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ "مسلم معاشرت" کے ٹائیپ ناول ہیں۔ لیکن رضیہ سجاد ظہیر کے ناول کسی حد تک مختلف ہیں اور ان کا سماجی شعور عصمت چغتائی کے ناول "معصوم" سے زیادہ قریب ہے۔

آج کل دہلی (اردو نمبر)

اردو میں خالص رومانی نقطۂ نظر سے بھی ناول لکھے گئے ہیں جن کی ادبی اہمیت مسلم نہیں۔ لیکن انھیں وقتی طور پر ادبی ناول کا درجہ مل گیا ہے اے حمید کے ناول کرشن چندر کے رومانی نقطہ نظر سے متاثر ہیں لیکن ان میں سماجی پروٹسٹ اور طبقاتی شعور کی کمی ہے۔ الفاظ کی جادوگری ہے حقیقت کی تلخی نہیں۔ رومانی ناولوں کی اپنی الگ روایت ہے اور یہ روایت اتنی مستحکم ہے کہ غلام عباس اور اشفاق احمد جیسے کہنہ مشق اور باشعور افسانہ نگار بھی جب ناول کی طرف راغب ہوئے تو انہوں نے رومانیت کی روایت کو ہی سینے سے لگایا۔ غلام عباس کا ناول "محبت روتی ہے" اور اشفاق احمد کے ناول "رومان بہار" زہریلا حسن، خالص رومانی

اردو ادب میں مارکسیت اور فرائڈین نفسیات کا اثر قریب قریب ایک ہی دور میں ہوا۔ اس لئے سماجی اور جنسی آزادی کی تحریک ناولوں میں ساتھ ساتھ رہی۔ ناول نگاروں نے سیاسی جبر اور سماجی پسماندگی معاشی عدم مساوات اور جنسی گھٹن اور کجروی کے خلاف آواز اٹھائی۔ جمہوریت، سماجی انصاف اور مساوات اور آزادی کی اقدار کی اشاعت ہوئی۔ سیاسی، سماجی اور طبقاتی مسائل کے ساتھ ساتھ ہمارے ناول نگاروں نے جنس کو بھی حقیقت پسند نظریے سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس ذہنی پس منظر کے باعث ناول میں جنسی سماجی اور نفسیاتی حقیقت نگاری اور بین الاقوامی نقطہ نظر کو اہمیت ملی۔

جن ناول نگاروں نے طبقاتی کشمکش جنسی ناآسودگی اور پروٹسٹ پر زور دیا ان میں کرشن چندر کا نام پیش پیش ہے۔ کرشن چندر کے بیشتر ناول ان ہی عناصر سے ترتیب پاتے ہیں۔ ناول نگاروں میں سے سب سے زیادہ ناول کرشن چندر نے تحریر کیے ہیں۔ "آسمان روشن ہے"۔ "ایک عورت ہزار دیوانے"، "ایک وائلن سمندر کے کنارے" "چاندی کا گھاؤ"۔ "دل کی وادیاں سو گئیں"۔ "غدار"۔ "ایک گدھا نیفا میں"، "گدھے کی سرگزشت"، وغیرہ۔ ان ناولوں میں رومان اور حقیقت، حسن اور انقلاب طبقاتی کشمکش۔ اور جنسی جذبے سب ایک دوسرے میں خلط ملط نظر آتے ہیں۔ یہ ناول جذبات کو تو چھو لیتے ہیں۔ لیکن انسانی ذہن

احمد جمال پاشا



اردو میں طنز و مزاح آزادی کے بعد

اردو میں طنز و مزاح کا آزادی کے بعد جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان ظریفوں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جو آزادی کے ساتھ ہمیں ملے یا آزادی سے پہلے میدانِ ظرافت میں اہم کارنامے انجام دے چکے تھے اور آزادی کے آنے کے ساتھ ہم سے آملے۔

اردو نظم میں ظریفؔ، ہند، جوشؔ، بوم، احمق پھپھوندی، شادؔ عارفی، سید محمد جعفری، ناصر، اسد ملتانی، مجید لاہوری۔ فرقت کاکوروی اور نثر میں عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، پطرس، رشید احمد صدیقی فلک پیما، سالک، سندباد جہازی، تمکین کاظمی، چودھری محمد علی ردولوی، منٹو، شفیق الرحمان اور کنہیا لال کپور ان میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کئی ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔

کاروانِ ظرافت کے قدیم سالاروں میں اب رشید احمد صدیقی شفیق الرحمان، فرقت کاکوروی۔ سید محمد جعفری، کنہیا لال کپور، آوارہ حیدرآبادی، فکر تونسوی، اور بھارت چند کھنہ ہمارے ساتھ ہیں۔

رشید احمد صدیقی آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی اردو نثر میں سب سے بہتر اور برتر طنز نگار تسلیم کیے گئے۔ اور کیے جاتے ہیں۔ یوں تو رشید احمد صدیقی صاحب کو بخشوانے کے لیے ان کا شاہکار مضمون "ارہر کا کھیت" یا ان کے معرکۃ الآرا مضامین کا مجموعہ "مضامینِ رشید" بہت کافی تھا۔ مگر انہوں نے "خنداں" لکھ کر اردو ظرافت کو خاکہ نگاری کی ایک نئی راہ دکھائی۔ "خنداں" کے خاکے جتنے ہلکے پھلکے ہیں۔ "گنج ہائے گراں مایہ"، "ذاکر صاحب" اور "ہم نفسانِ رفتہ" کے خاکے اتنے ہی وقیع اور پرشکوہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ "مضامینِ رشید" کے بعد جہاں رشید احمد صدیقی کے طنز اور خیالات میں گہرائی آتی گئی وہاں ان کی شوخی اور خوش طبعی میں کمی ہوتی گئی۔ "مضامینِ رشید کے مصنف اور "عزیزانِ ندوہ" کے مصنف "ارہر کا کھیت" لکھنے والے اور "سرگزشت عہدِ گل"۔ اور مضامین رشید ایک طنز و مزاح نگار کے شاہکار ہیں۔ "عزیزانِ ندوہ" اور "سرگزشت عہدِ گل" یا بعد کے مضامین ایک مفکر اور فلسفی کے خیال پارے ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی مقابلہ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ رشید احمد صدیقی، بہترین طنز نگار، مزاح نگار، خاکہ نگار، مرقع نگار، اور سوانح نگار ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ "آشفتہ بیانی میری" سے بہتر نمونہ ہمارے ادب میں نہیں ملتا۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ عمر

تجربے، مشق اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ظرافت، سنجیدگی میں بدلتی چلی گئی۔ ان کی تازہ تحریریں انہیں ایک بیدار مغز مفکر کے روپ میں تو ضرور پیش کرتی ہیں مگر مضامین رشید والی تہ دار ظرافت اور لطیف ترین طنز کا ان میں کوئی بھی پرتو نہیں ہوتا۔ جذبہ پر عقل و استدلال کی یہ برتری اردو ادب کے لئے فال نیک ہو تو ہو مگر اردو ظرافت کے لئے محرومی کے سوا کچھ نہیں۔ پھر بھی رشید احمد صدیقی نے اردو ادب کو طنز و مزاح سے جتنا مالا مال کیا ہے اور اُسے جو بلندیاں اور وسعتیں عطا کی ہیں۔ اُن تک نئے ظریفوں میں نہ کوئی پہنچا اور نہ اس راہ پر گامزن نظر آتا ہے۔

شفیق الرحمان اردو طنز و مزاح میں خالص ظرافت کے امام ہیں "کرنیں"، "لہریں"، "پچھتاوے"، "مد و جزر"، "شگوفے"، "حماقتیں" "مزید حماقتیں"، اور "منظر و پس منظر" وغیرہ ان کے رومانی اور مزاحیہ مضامین و افسانوں کے مجموعے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شفیق الرحمان کے یہاں مزاح پیدا کرنے کے لئے لطائف کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مگر اردو یا کسی دوسری ترقی یافتہ زبان کا کون ایسا مزاح نگار ہے جس کے یہاں لطائف کا اہتمام نہ ہو۔ خود اردو میں کیا مرزا غالب کے یہاں لطائف نہیں ملتے یا رشید احمد صدیقی کے یہاں لطائف کا اہتمام نہیں ملتا۔ شفیق الرحمان کے یہاں لطائف کو کھپانے کا جو سلیقہ ہے۔ اس کی مثال ہمیں اردو ظرافت میں دوسری جگہ نہیں ملتی۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ شفیق الرحمان کی ظرافت میں مقصدیت نہیں ملتی۔ "تزک نادری ... " برساتی" اور ان کے دوسرے شاہکار مضامین، افسانوں اور تحریفوں کو بے مقصد نہیں قرار دیا جا سکتا۔

شفیق الرحمان کے یہاں زندگی اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ آتی ہے۔ ان کے یہاں فکر جہاں بھی ہے اور غم جہاں بھی۔ چھوٹے اور بڑے مسائل کی نشان دہی بھی ہے اور زندگی کی ناہمواریوں پر خوشنما طنز بھی۔

شفیق الرحمان کی اردو مزاح میں وہی اہمیت اور حیثیت ہے جو اردو طنز میں رشید احمد صدیقی کی۔ ان کا اصل میدان پیروڈی ہے" "تزک نادری" ان کی بڑی شاندار پیروڈی ہے۔ ان کے ہر مجموعہ میں پیروڈی کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ "حاتم طائی بے تصویر" "قصہ علی بابا کا" "ایک دن کا ذکر ہے" اور "چوتھا درویش" وغیرہ ان کی بہت ہی اعلا درجہ کی پیروڈیاں ہیں۔

"شیطان" شفیق الرحمان کا مزاحیہ کردار ہے۔ اردو کے دوسرے مزاحیہ کرداروں سے یہ اس لئے ممتاز اور نمایاں ہے کہ نہ اس میں مرزا جی کی حماقتیں ہیں اور نہ وہ مضحکہ خیزی جو اردو کے بیشتر مزاحیہ کرداروں کو مزاحیہ سے زیادہ احمق کردار کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

فرقت کاکوروی کا اصل میدان تحریف ہے "ملاوا" اور "نارسا" کی پیروڈیاں اپنی تمام افراط و تفریط کے باوجود ہمیشہ خاصے کی چیز سمجھی جائیں گی۔ خطوط غالب کی تحریف میں بھی یہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی نظم "ڈائننگ ہال"، "انکم ٹیکس" اور "فیملی پلاننگ" بھی ان کی تحریف کے اچھے نمونے ہیں۔

سید محمد جعفری بلاشبہ اکبر اور ظریف کے بعد اردو کے سب سے بڑے طنزیہ و مزاحیہ شاعر ہیں۔

سید محمد جعفری کی مزاحیہ، طنزیہ اور تحریفی نظموں میں بلا کی آمد، بے ساختگی اور روانی ہوتی ہے۔ ان کی نظم "کلرک" "وزیروں کی نماز"، "پرانا کوٹ"، "بھنگیوں کی ہڑتال"، "مردم شماری" "ایبسٹریکٹ آرٹ"، "جب لاد چلے گا بنجارا"، "کاغذ کا مرثیہ"، "آٹے کی بوری"، "یو۔ این۔ او"، "بوٹ ڈیز" اور "آپ ٹو ڈیٹ" وغیرہ ہماری ظریفانہ شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

کنہیا لال کپور ہمارے اہم طنز نگار ہیں۔ ان کے طنز میں ظرافت کی چاشنی کی وجہ سے بڑی خوشگواری ہوتی ہے۔ اس میں مقصدیت ہوتی ہے۔ اور کوئی نہ کوئی مسئلہ یا بات بھی۔

کنہیا لال کپور طنز کو وقیع اور آبدار بنانے سے زیادہ اس کو چٹ پٹا اور مقبول عام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بہت شستہ اور رواں زبان استعمال کرتے ہیں۔

کپور کے افسانے مضامین اور خاکے زیادہ تر کسی لطیف

مسئلہ یا بات کے گرد گھومتے ہیں اور "ٹاپ کیرکٹر" کی تلاش میں زیادہ رہتے ہیں۔

"سنگ وخشت" کپور کے سب سے نمائندہ مضامین کا مجموعہ ہے اس میں "مرزا غالب جدید شعراء کی مجلس میں" ان کی بہت شاہکار تحریف ہے۔

"سنگ وخشت" کے بعد "شیشہ وتیشہ"، "چنگ ورباب"، "بال وپر"، "نرم گرم"، "گردِ کارواں" اور "طلوعِ سحر" ان کے طنزیہ مزاحیہ مضامین اور افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔

کپور کے بعد کے مجموعوں میں ان کے چٹ پٹے مضامین شامل ہیں۔ مگر ان میں "سنگ وخشت" کی تیزی اور نشتریت بتدریج کم ہوتی گئی۔ ان کے ہلکے پھلکے خاکوں میں بھی فن سے انکساری کا اظہار ملتا ہے۔

اردو طنز نگاروں میں کپور ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے خوبصورت طنزیہ مضامین بھی ان کے مجموعوں میں خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ فکر تونسوی خالص طنز نگار ہیں۔ روزنامہ "ملاپ" میں یہ مزاحیہ کالم "پیاز کے چھلکے" بھی لکھتے ہیں۔ روزانہ کالم میں عوام کی بول چال اور ان کی زبان میں خیالات کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ ان کا "پیاز کے چھلکے" عوام میں بہت مقبول ہے۔ ان کا شمار اردو کے ممتاز کالم نگاروں میں ہے مگر ان کی روزمرہ کی صحافت نے ان کے ادب کو متاثر کیا ہے فکر کے پاس گہرا سماجی شعور ہے۔ مسائل پر گہری نظر ہے مگر طنز نگاری میں جو زبان یہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ ادب سے زیادہ ان کو صحافت سے قریب رکھتی ہے جن مضامین میں بھی انھوں نے صحت زبان کا اہتمام کیا ہے وہ ان کی انشا پردازی کے بہت اچھے نمونے ہیں۔

آوارہ حیدرآبادی کو زبان وبیان پر قدرت ہے "اپنی موج میں" ان کے شگفتہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اپنی موج میں جدھر جاتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ انھیں بیگماتی زبان پر قدرت حاصل ہے، ان کے خاکے ماماؤں، اصیلوں اور مغلانیوں کے جیتے جاگتے اور ہنستے بولتے مرقعے ہیں۔

بھارت چند کھنہ ہمارے پرانے مزاح نگار ہیں۔ "ٹھنڈی بجلیاں" ان کی مزاح نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

آزادی کے بعد اردو طنز ومزاح میں جو مزاح نگار سامنے آئے ان میں نظم میں واہی، رئیس امروہوی، اے ڈی اظہر، دلاور فگار اور سید ضمیر جعفری بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

رضا نقوی واہی واقعی اردو کی طنزیہ، مزاحیہ شاعری کے جدید تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہیں ان کے طنز ومزاح کے امتزاج میں توازن اور ظرافت کو برتنے کا ایک خاص سلیقہ ہے۔

واہی کی زمانے، عصری تقاضوں، مسائل اور عالمگیر ناہمواریوں پر بڑی گہری نظر ہے۔ واہی مذاق اڑانا ہنسنا اور ہنسانا جانتے ہیں۔ یہ آدابِ محفل کی نزاکتوں، تہذیب، متانت اور شائستگی کے طور طریقوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے طنز میں تلخی، پھکڑ پن ابتذال اور ناخوشگواری کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ طنز ومزاح کے حسین امتزاج سے یہ اپنے کلام میں خوشگواری برقرار رکھتے ہیں۔ "واہیات" "طنز وتبسم"، اور "زخم اور مرہم" ان کے باغ وبہار مجموعے ہیں "پروگرام" "نقاد"، "بیڈی گرل"، "لیبر لیڈر"، "پی ایچ ڈی"، "پروفیسر نامہ"، "لیڈری کا نسخہ"، "ریل کا سفر"، "ماہر فن"، اور "لال فیتہ" وغیرہ ان کی نظموں کے بہت کامیاب نمونے ہیں۔ واہی کا طنزیہ اور مزاحیہ کلام اردو ظرافت میں بہت خوشگوار اضافہ ہے۔

ضمیر جعفری بہت ہی کامیاب مزاحیہ شاعر ہیں۔ ان کی زبان بہت رواں شستہ اور منجھی ہوئی ہے۔

ضمیر جعفری کی نظم "زنانہ اسمبلی" انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

ضمیر جعفری کو مزاح پر پوری قدرت حاصل ہے۔ مہذب اور متوازن ظرافت کے فن پر پورے طور پر حاوی اور کامیاب ہیں۔

آزادی کے بعد اردو نثر میں جو مزاح نگار سامنے آئے ان میں ابراہیم جلیس، مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا، وزیر آغا، محمد خالد اختر، ابن انشا، مسعود مفتی، امجد حسین، یوسف ناظم، اور شفیع عقیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابراہیم جلیس کے یہاں شروع میں طنز کی لے بہت تیز تھی۔ "کالا چور" "ایک ملک دو کہانی"، "نیکی کر تھانے جا" اور "اوپر شیروانی اور اندر پریشانی" میں بتدریج طنز کم ہوتا گیا اور مزاح کی فراوانی ہوتی گئی۔

ان کی مزاحیہ تحریروں میں طنز و مزاح کی خوشگوار آمیزش نے ان کی ظرافت کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی بہت ممتاز طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کی ظرافت، رشید احمد صدیقی اور پطرس کے فن کے حسین امتزاج پیش کرتی ہے مگر ان کی منزل شاید ان دونوں سے بھی آگے ہے۔ اور ان کی اپنی انفرادیت ہی ہے۔ "چراغ تلے" مشتاق احمد یوسفی کے باغ و بہار مضامین کا مجموعہ ہے۔

وزیر آغا اردو کے اہم ترین انشائیہ نگار ہیں۔ "خیال پارے" اور "چوری سے یاری تک" کے انشائیے ان کی انشا نگاری کے بہت اچھے نمونے ہیں۔

محمد خالد اختر، ابنِ انشا، شفیع عقیل، مسعود مفتی۔ یوسف ناظم اور امجد حسین نے اردو ظرافت کے بہت اچھے نمونے پیش کیے ہیں، خاص طور پر ابن انشا میں طباعی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کا مضمون "استاد مرحوم" ان کی ظرافت کا بہت ہی بلند پایہ نمونہ ہے۔

ان کے بعد بساطِ ظرافت پر جلوہ گر ہونے والوں میں مجتبیٰ حسین، ماہ منیر خاں، قاضی غلام محمد، تخلص بھوپالی، اسلم عظیم آبادی، نظیر صدیقی، سید نجم الحسن رضوی، رفیق خاور۔ تمنا مظفر پوری، پرکاش پنڈت، احمد مشکور، برق یوسفی اور ضمیر دہلوی ہیں۔ مجتبیٰ حسین، تخلص بھوپالی، نجم الحسن اور برق یوسفی نے ظرافت کے بہت اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔

مجتبیٰ حسین بڑے تیکھے اور چوکھے مزاح نگار ہیں۔ "تکلف برطرف" ان کے مزاحیہ مضامین کا بہت ہی شگفتہ مجموعہ ہے۔ "تکیہ کلام" ان کا شاہکار ظرافت ہے۔ یہ خالص مزاح نگار ہیں۔

تخلص بھوپالی بہت ہی بے باک طنز نگار ہیں۔ سید نجم الحسن رضوی کی زبان اور ظرافت دونوں میں بڑی بے ساختگی ہوتی ہے۔ ماہ منیر خاں اپنے خاکوں میں ظرافت کا سامان اپنے گرد و پیش سے کرتے ہیں۔ قاضی غلام محمد کو تحریف میں خاص ملکہ ہے۔ "حرفِ شیریں" ان کی مزاحیہ شاعری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

اسلم عظیم آبادی، نظیر صدیقی اور ضمیر دہلوی کے انشائیے اور رفیق خاور کے "فکاہیے"، اردو ظرافت میں نئے تجربات کی مثال ہیں۔ اسلم عظیم آبادی اپنے انشائیوں کو "قلم کاری" اور نظیر صدیقی اپنے مضامین کو "انشائیہ" کہتے ہیں۔

خواتین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مزاح نگار نہیں ہو سکتیں۔ اس سلسلے میں اکثر دلچسپ بحثیں بھی چلیں۔ آزادی کے بعد جو ظرافت ہمارے سامنے آئی اس میں خواتین کا بھی حصہ ہے، زینت ساجدہ، صفیہ اریب، سرور جمال، شفیقہ فرحت اور ثریا پروین کے مزاحیہ مضامین اور انشائیے۔ ثریا پروین اور وحیدہ نسیم کی مزاحیہ نظمیں اور پیروڈیاں اردو ظرافت میں ایک نئے اور خوشگوار باب کا اضافہ کرتی ہیں۔

سنجیدہ ادیب بھی گاہے گاہے طنز و مزاح پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ جس کی اچھی مثال منٹو، عصمت، کرشن، خواجہ، قدرت اللہ شہاب، ڈاکٹر محمد حسن، راجندر سنگھ بیدی، جیلانی بانو، رضیہ سجاد ظہیر اور غلام عباس وغیرہ کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریریں ہیں۔

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح میں جہاں صحافتی مزاح میں وقتی اور ہنگامی مسائل کی ترجمانی کی گئی، وہاں ہمارے مزاح نگار نئے سماج کے نئے کردار، نئے موضوعات، اور حادثات کو اپنی گرفت میں لانے کے بجائے زیادہ تر میر صاحب، مرزا صاحب، خاں صاحب اور نواب صاحب اور منشی جی کو پیش کرتے رہے اور ایسے کردار پیش کیے گئے جو از کار رفتہ ہو چکے ہیں یا وجود نہیں رکھتے یا ان کی نمائندہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود طنز و مزاح نے خاصی ترقی کی۔ ظرافت میں نئے اور کامیاب تجربے ہوئے، رسائل و اخبارات میں مزاحیہ کالم کا چلن بڑھا اور مزاحیہ تحریروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

صدیق الرحمٰن قدوائی



۱۹۴۷ء کے بعد اردو نظم

آزادی کے بعد وجود میں آنے والا
والا ادب، قبل آزادی کے ادب کی ہی ایک نئی اور ترقی یافتہ شکل ہے آج کی نظم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تاریخی تسلسل کو ذہن میں رکھا جائے اوران کڑیوں کو تلاش کیا جائے جوان دو زمانوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں،
آزادی سے قبل اردو نظم (۲)
محوروں اقبال اور جوش کے گرد گھوم رہی تھی۔ نئے ادب اور ترقی پسند تحریک نے نظم کی روایت کو ایک نیا موڑ دیا۔ بدلتے ہوئے معاشرے میں فرد اور سماج کے پیچیدہ تر ہوتے ہوئے رشتوں اور ان سے پیدا ہونے والی نئی الجھنوں کی بدولت شاعرانہ ادراک و احساس اور اس کے اظہار کی صورتوں میں زبردست تبدیلیاں نمودار ہوئیں آزاد نظم کا فروغ، نئے اسالیب اظہار نئی شعری علامتیں اور ایک بدلی ہوئی زبان، ساتھ ہی ساتھ نئے موضوعات جن کو چھونا تو درکنار اُن کی سمت بڑھتے ہوئے بھی تخیل کے پر جلتے تھے اب اردو نظم کے مزاج کا مانوس اور مقبول حصہ بن گئے۔ شاعری میں کلاسیکی روایات سے بغاوت محض بعض شاعروں کی ندرت فکر اور طباعی کا ہی کرشمہ نہیں تھی۔ یہ رجحان سماجی سطح پر برپا ہونے والی بے شمار بغاوتوں کا ایک تسلسل تھا فیض، مجاز، اختر شیرانی، میراجی، راشد کی نظم کے حُسن کا سب سے بڑا راز اس بغاوت میں پنہاں ہے۔ دیہاتوں سے شہروں کی طرف یلغار، مدتوں کی بسی بسائی بستیوں کا منتقل ہونا خاندانوں کا ٹوٹنا اور بکھرنا۔ نئے کارخانوں کا وجود میں آنا اور صنعتی نظام کا آہستہ آہستہ صدیوں کے بنے بنائے جاگیردارانہ نظام پر چھا جانا یہ سب ہماری زندگی میں ایک بے اندازہ اور بے پناہ تبدیلیوں کے امکانات لے کر آئے۔ اس تبدیلی کی تیز رفتاری نے جذبہ و فکر کی دنیا میں ایک حشر برپا کر دیا۔ یہ ہمارے دور کے حساس انسانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا، اور شاعر نے اسے جس طرح قبول کیا اس کا ثبوت اس دور کی نظم ہے۔

پچھلے دور میں نظم میں بڑے اہم اور قابل قدر تجربات کیے گئے میراجی، راشد، فیض، سردار جعفری اور اختر الایمان نے نظم میں جن روایات کی بنیاد ڈالی تھی، نئے شاعروں نے انھیں نئی وسعت اور نئی معنویت دی۔ چناں چہ آج تکنیک کے اعتبار سے میراجی اور راشد اور فکر احساس کے اعتبار سے فیض اور اختر الایمان کی آوازوں کی گونج زیادہ سنائی دیتی ہے۔

آزادی کے بعد سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معا سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کی بدولت ادب کی سطح پر بھی نمایا

اور اہم تبدیلیاں نمودار ہوئیں ——— ہمارا شاعر جو شکست زنداں کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب اس خواب کی تعبیر سے دو چار ہوا۔ تقسیم ملک نے شاعر کے ضمیر کو بے چین کر دیا۔ یہاں پہلی بار شاعر نے محسوس کیا کہ کبھی بادۂ و ساغر کے بغیر بھی اسے اپنی بات کہنی چاہیے۔ چنانچہ اس زمانہ میں غزل نما نظموں اور نظم نما غزلوں کا ایک بے پناہ ذخیرہ سامنے آگیا۔ جگر جیسا شاعر اب کہنے لگا۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

جدید اردو نظم ترقی پسند تحریک کی بہت کچھ مرہون منت ہے گو کہ یہ تحریک آزادی کے چند سال بعد انتشار کا شکار ہو گئی۔ مگر ترقی پسند شاعروں کا ایک گروہ جو اس پندرہ برس کے عرصے میں ابھرا تھا۔ وہ خاموش نہیں ہوا۔ ان کے ادبی رول میں بہت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ترقی پسندوں کے اس طبقے میں دو قسم کے شاعر نظر آتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی اٹھان بڑے زور اور گھن گرج کے ساتھ ہوئی تھی مگر جو بہت جلد کلاسیکیت کے حصار یا رومانیت کے خول میں واپس لوٹ گئے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو مارکسزم کو مانتا تھا مگر جس نے پارٹی ڈسپلن کی مار سے بچنے کے لئے اپنی شاعری کو اپنے خلوص ایمان کی سوگند بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ان شاعروں کو ایک عرصے تک اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ ان کی شاعری میں نقارے اور بگل کی گونج نہیں تھی مگر ترقی پسندوں کا یہ طبقہ جس کے سب سے ممتاز شاعر اختر الایمان ہیں آج زیادہ مقبول ہے ——— ترقی پسندوں کا ایک المیہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے شاعروں کی بدولت ایک زمانے میں ترقی پسندی اور پست شاعری ایک ہی شے کے دو نام ہو کر رہ گئے۔ چناں چہ آج کا شاعر اپنے آپ کو اس ترقی پسندی سے ممتاز کرنے کے لئے ترقی پسندی کو ہی رد کرنے لگا۔ حالاں کہ خود اس کی شاعری کا خمیر ترقی پسندی کے دیئے ہوئے ورثہ سے اٹھا ہے۔ فکری اور فنی اعتبار سے فیض کی نظم "تنہائی"، "مجاز کی "آوارہ" اور جذبی کی "موت" آج بھی اتنی ہی جدید ہیں جتنی کہ کبھی تھیں ترقی پسندوں کی اس طرح کی نہ جانے کتنی تخلیقات ہیں جو اس تسلسل کی نشاندہی کرتی ہیں جو آج کی شاعری اور ترقی پسندی کے دور کی شاعری میں فطری طور پر موجود ہے۔ ایک جذباتی رو ہے جو ان کی تہہ میں نظر آتی ہے۔ اور یہ رو ہے ادبی، تہذیبی، اور سماجی سطح پر باغیانہ جرأتِ فکر و احساس کی رو۔

حال میں ان رجحانات کو اقلیدس کی اصطلاحوں، خط مستقیم اور خط منحنی کے تحت تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر میرے خیال میں اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ شاعر کی شخصیت سماج سے الگ نہیں بلکہ سماجی حقیقت کا ایک جزء ہے وہ شاعر جو اپنی شخصیت اور اپنے زمانے کے درمیان "من تو شدم تو من شدی" کا رشتہ قائم نہیں کر سکتے۔ مگر اپنے آپ کو سماج کا فعال فرد بنانے کی تمنا میں شاعری کو میکانکی طور پر سماجی تبدیلی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی شاعری کا وہ حصہ جسے ترقی پسند حصہ سمجھا یا کہا جاتا ہے یقیناً اچھے شاعری کے معیاروں پر کبھی پورا نہیں اترے گا، اور معمولی درجہ کی شاعری ہونے کی وجہ تہذیبی سطح پر وہ انقلابی رول بھی ادا نہیں کر سکے گا جس کی اس سے امید کی جاتی ہے۔ دوسری قسم کی شاعری وہ ہے جس میں شاعر کی تخلیقی فکر اور اس کا سماجی شعور دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ہمکنار ہو جاتے ہیں، کہ اس کے ہاں داخلی و خارجی حقائق کی دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اپنا غم زمانے کا غم ہوتا ہے اور زمانے کا غم اس کے اپنے دل کا کرب و اضطراب بن جاتا ہے۔ فیض اور اختر الایمان کے گروہ کے شاعروں کو (یا جنہیں خط منحنی کا شاعر کہا جاتا ہے) اسی رجحان کے نمائندہ ہیں۔ پہلے رجحان کی نمائندگی ہند و پاکستان اور ہند و چین کی لڑائی کے سلسلے میں وجود میں آنے والی شاعری کرتی ہے۔ قومی یکجہتی، بھاکڑا ڈیم، لیڈروں کی موت پر مرثیوں سے لے کر فیملی پلاننگ تک کے موضوعات کی شاعری سب اسی ذیل میں آتی ہے۔

جدید نظم نے مغرب کی تکنیک اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے فکری رجحانات کو بھی اپنایا ہے۔ عالمی ادب کے مطالعے سے نئی چیزیں سیکھنا، ہر لحظہ بہتر اقدار کی تلاش کرنا اور انھیں پاکر اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرنا صحت اور زندگی کی علامت ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر ذہنی کاہلی اور سہل پسندی بھی اس بات پر مجبور کرتی ہے، کہ دوسرے ملکوں کے فلسفیوں کے افکار کو (خواہ ان کے جنم دینے والے ہی ان سے دستبردار کیوں نہ ہو چکے ہوں) اس وجہ سے قبول کر لیا جائے کہ وہ کچھ نئے نئے سے لگتے ہیں۔ جیسا کہ وجودیت کا فلسفہ جس کا جنم دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ میں ہوا تھا۔ اردو کے بعض شاعروں کے یہاں جب ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ پہنچا تو اردو دانشور جن میں سے بیشتر کبھی ترقی پسند ہوا کرتے تھے اس طوفان میں بہتے ہوئے نظر آنے لگے۔ مگر عظمتوں کو اپنے سر زبردستی اوڑھنے کا بہانہ خواہ ترقی پسندی کو بنایا جائے یا وجودیت کو بالآخر شاعری کے مرتبے کا تعین تو اس حقیقت کے پیش نظر ہی ہوتا ہے کہ شاعر کے یہاں فکری اور فلسفیانہ خلوص کتنا ہے اور اس کی شخصیت کے واسطے سے اس کے فن پر اس کا کوئی صحت مند اثر پڑا ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ نظم جو موجودہ حالات سے بے اطمینانی پر مبنی ہے اور جس کے پیچھے ایک بہتر زندگی کے لیے سماجی زندگی کی فعال تمنا کام کر رہی ہے وہ خواہ ابدیت کے شوق سے بے نیاز شاعر کی ہی تخلیق کیوں نہ ہو۔ نہ صرف آج کی عظیم شاعری ہے بلکہ اس کی عظمتوں پر پڑے ہوئے وقت کے پردے ہر دور میں اٹھتے چلے جائیں گے۔

اس دور کی نظم میں چند الفاظ کی تکرار جا بجا ملتی ہے۔ شہر، سایہ، سورج، دھوپ، آئینہ، عکس۔ اور اس طرح کے بہت سے الفاظ نئی شاعری کی جانی پہچانی علامتیں ہیں۔ جو آج کے حساس انسان کے روحانی کرب و اضطراب کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً شہر ہمارے موجودہ سماج کی علامت ہے۔ ——— صنعتی زندگی کی اعصاب شکن ہما ہمی اسکے جنم دیئے ہوئے تہذیبی بحران اور اس کے اجتماعی ظلم و جبر کی بدولت فرد کی انفرادیت کی پامالی کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے۔ جہاں انسانی رشتہ بہیمانہ کشاکش پر مبنی ہیں۔ جہاں انسان اپنا اصلی چہرہ کھو چکا ہے۔ اس کی ذات خود اس کے سائے کی طرح جھوٹی، بے حقیقت، بے معنی، بلکہ کبھی کبھی ڈراؤنی بھیانک اور قابلِ نفریں نظر آتی ہے۔ یہاں سورج روشنی کی علامت نہیں۔ بلکہ سیاہ پوشی ہے۔ اور دھوپ جھلسا دینے والی، نگاہوں کو سلب کر لینے والی آتش بار شعاعوں کا نام ہے۔

جدید نظم کی یہ علامتیں آج کے شاعر کے ایک مخصوص رویے کا پتہ دیتی ہیں۔ جو بنیادی طور پر باغیانہ اور اسی لئے قابل قدر ہے۔ مگر اسی کے ضمیمے کے طور پر بعض شاعروں کے ہاں منفیت پرستی کا رجحان بھی ابھر ہے انکے ہاں اپنے گرد و پیش سے بے چینی تو ہے مگر یہ بے چینی انھیں بغاوت سے زیادہ دنیا و مافیہا سے منہ موڑ لینے کی طرف زیادہ مائل کرتی ہے۔ یہ رجحان قرون وسطیٰ کی خانقاہیت سے بہت زیادہ قریب ہے۔ مگر شاید نئی شاعری کا یہ موڈ دیرپا نہیں۔ بلکہ ایک عارضی، اضطراری کیفیت کا اظہار ہے۔ جو ہر حساس فن کار اور دانش ور کی فکری دجذباتی نشو نما میں کسی نہ کسی اسٹیج پر ضرور غالب نظر آتی ہے۔ ادھر چند برسوں میں اردو شاعری کے اس عارضی موڈ کو ایک فلسفہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ کوشش لاحاصل ہے مگر اس اعتبار سے خطرناک بھی ہے کہ وہ شاعر کے فن اور پڑھنے والوں کے مذاق دونوں کو برباد بھی کر سکتی ہے

فرد کی تنہائی، سماج کی ساری قوتوں کا اس کے خلاف صف آرا ہونا، شہری زندگی کی افراتفری جہاں کوئی کسی کا ساتھی نہیں باہمی ر... اور، صدیوں کی پالی پوسی انسانی شرافتوں کا اچانک ہوا میں تحلیل ہو جانا فرد کا ایک بے جان مشین کے پرزے کی طرح چکر کھانا اور ایسا لگنا کہ جیسے ہماری آپ کی تقدیر اور زمانے کی ہر شے کی تکمیل، کسی ان جانی بے درد اور اندھی قوت کے ہاتھ میں ہے۔ ایک بٹن کے دبنے کی دیر ہے کہ نیوکلیائی طاقت انسانی زندگی کو فنا کر دے گی، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے اور کائنات کا ذرہ ذرہ بھسم ہو جائے گا۔ شخصیتوں کا بے رحم طاقتوں کے بوجھ تلے کچلا جانا اور ہر شے کا خاتمہ دکھائی دینے لگنا، آج کے شاعر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اس کے کہنے کے مطابق زبان، ابلاغ اور ترسیل کی دقتیں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ باہمی رشتے ختم ہو گئے ہیں۔ ایک فرد دوسرے فرد

سے اس قدر دور ہو گیا ہے کہ کسی کی آواز کی گونج دوسرے تک پہنچے تو پہنچے اس کی بات کسی تک نہیں پہنچ سکتی، ایسی صورت میں فنکار کا فن اس کے جذبات کا ادھورا اظہار بھی نہیں کر سکے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زبان اور وہ شعری سانچے جو صدیوں کے تجربات نے جنم دیئے تھے اب جامد شے بن گئے ہیں۔ یہ وہ پتھر ہیں جن کی رگوں سے لہو شرار بن کر صرف اس وقت ٹپک سکتا ہے جب فن کار کے احساس کی گرمی ان کی تسلیم شدہ اور جانی بوجھی صورتوں کو پگھلا کر اُن کے نئے ہیولے تعمیر کرنے چاہئیں اس کی بات اگر کوئی سمجھے تو یہ سمجھنے والے کی توفیق و تقدیر پہ ہے۔ شاعر کو اس سے غرض نہیں کہ اُسے کوئی سمجھنے والا ہے یا نہیں۔ اس زبان کے نہ سمجھنے والوں کو اکثر یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہ تو مستقبل کی زبان اور مستقبل کی نظم جنم لے رہی ہے۔ آپ ماضی کے آدمی ہیں۔ اتفاقاً حال میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے یہ زبان آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے اور ابلاغ کی دقتوں کا یہی سبب ہے۔ گویا کہ ہمارے جدید شاعروں کا یہ طبقہ مستقبل کی شاعری کو جنم دے رہا ہے۔ وہ مستقبل خود اس کے فلسفے کے مطابق بڑا تاریک ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شاعر جو آج کی شہری زندگی کی ہماہمی سے سہمے ہوئے ہیں۔ اور نیلی، لال، ہری روشنیاں انکی آنکھوں کو چکا چوند کئے دے رہی ہیں۔ وہ بھلا مستقبل کی تاب کیسے لا سکیں گے۔ جہاں مشینیں آج سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں گی۔ جب مسائل آج سے زیادہ گمبھیر ہوں گے اور انسان کو سماجی رشتوں کے تعین میں اور زیادہ الجھنوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ گاؤں کی سادہ پرسکون اور خاموش زندگی کو شہروں میں نہ پا کر اپنے وہم و گمان کی دنیا میں سمٹ جانے والے ذہنوں اور ان کی تخلیقات کو بربادی سے بچانے والی قوت جس سے وہ محروم ہیں وہ کہاں سے آئے گی۔ اس کا جواب ان شاعروں کے ہاں نہ جانے کیا ہوگا۔ میرے نزدیک تو ہر دور کی زندگی مادی اور روحانی طور پر انسانی ذہن کو چیلنج کرتی رہی ہے اس چیلنج کو قبول کر کے انسانوں کو اس کشاکش کا مقابلہ کرنے کی ذہنی جذباتی اور روحانی صلابت عطا کرنے کا کام فنون لطیفہ اور شعر و ادب نے انجام دیا ہے۔ اور عظیم ادب خواہ وہ کسی عہد کا ہو وہی ثابت ہوا ہے جو جذباتی طور پر اپنے عہد کا مسیحا اور نئے عہد کا پیغامبر ہو۔ دراصل یہی داخلی جذباتی رو ہے جو ایک عہد کی شاعری کو اس عہد سے بلند کر کے ہر عہد کی شاعری بنا دیتی ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

یہ پچھلی صدی کا شعر ہے۔ مگر اس کی معنویت کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے نئے پن نے اسے آج کا شعر بنا دیا ہے۔ مستقبل کی شاعری حال سے روٹھ کر پیدا نہیں ہو سکتی۔

آج کی نظم کو نئے دور کے چند چیلنج درپیش ہیں۔ ترسیل کے نئے وسائل ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما نے چند نئی سمتوں کو روشن کیا ہے۔ اور اکثر یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ "یہ شیطانی قوتیں" فنون لطیفہ خصوصاً شعر و ادب کی دشمن ہیں۔ سائنس کے اور ستم ہی کیا کم تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس نے انسان کی خلوتوں تک بھی چھاپہ مار کر شاعروں اور ادیبوں کے لئے سارے راستے بند کر دیئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ شرفائے ادب کی محلبوں میں ان شاعروں اور ادیبوں کو برادری سے باہر سمجھا جاتا ہے جنہوں نے سینما کے میڈیم کو اپنا لیا اور اپنی شاعری کو چھپے ہوئے لفظوں سے زیادہ مغنیوں کی آوازوں اور رنگین پردوں کے ذریعے سننے اور دیکھنے والوں تک پہنچایا۔ ان نئے وسائل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کو ان طبقوں تک پہنچایا جو پڑھے لکھے نہ ہونے کی بنا پر اس سے محروم تھے۔ آج کے شاعر کو ان وسائل سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ شیکسپیئر کے منظوم ڈرامے اسٹیج پر پیش کئے جانے کے باوجود ادب کا بہترین شاہکار پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ان وسائل کا شعر و ادب سے کس طرح ناتہ مضبوط کیا جائے۔ فلمی شاعروں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا بڑھتا چرچا یہ کہہ کر ختم نہیں کیا جا سکتا کہ جرمن کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔"

اس زمانے میں طویل نظموں میں بھی بڑے اچھے اور کامیاب تجربے لئے گئے۔ ساغر کی "انارکلی" کے بعض حصے بڑے دلکش ہیں۔ گو کہ اس میں جگہ جگہ ناہمواری اور غیر ضروری طوالت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لمبائی چوڑائی کی نسبت سے ہی

اگر گہرائی بھی ہوتی تو یہ بڑی کامیاب نظم تھی ۔ ساحر کی طویل نظم "پرچھائیاں" نہ معلوم کیوں طویل ہو گئی؟ مختصر ہوتی تو شاید اچھا ہوتا۔ اس کے بعض حصوں پر ترقی پسندی کے اس دور کی چھاپ ہے۔ جب نظم کہنا اپنے سماجی شعور کے اظہار کے لئے بہت ضروری ہوا کرتا تھا ۔ مگر سردار جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" کے بعد سب سے زیادہ چونکا دینے والی طویل نظم عمیق حنفی کی "سندباد" ہے۔ یہ نظم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے مگر مرکزی خیال ایک ہے اور وہ یہ آج کا انسان خود اپنی سرزمین پر اس طرح گزرتا ہے جیسے کہ سندباد نئی سرزمینوں سے گزرا تھا۔ یہ سندباد دراصل غالب کا غریب شہر یا COLIN WILSON کا OUTSIDER ہے۔ نظم کی اوپری سطح پر ششدر ہونے کی کیفیت اور حیرانی کی ایک شفاف چادر پھیلی ہوئی ہے۔ جو اپنی تہ میں درد و کرب میں ڈوبے ہوئے طنز کی ایک دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ نظم کے ہر ٹکڑے کے سر کلاسیکی اشعار، دوہوں ، مقولوں اور آیتوں سے جوڑے گئے ہیں۔ جس کا مقصد انسانی روح کے اضطراب کو ایک ایسی وحدت کے روپ میں پیش کرنا ہے جو زماں و مکاں سے بلند ہے اور جو ہر پُر آشوب زمانے میں نمودار ہوتی ہے ۔ میرے خیال میں یہ ایک کامیاب اور فکر انگیز تجربہ ہے جس سے مستقبل کی اردو نظم کی سمتوں کی نشان دہی ہوتی ہے مگر عمیق حنفی کی ساری شاعری کے سیاق و سباق میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو یہ خطرہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ کہیں وہ بھی بالآخر اپنی ذات کے نہاں خانے میں سمٹ سمٹا کر غائب نہ ہو جائیں۔

کلیم الدین احمد کی نظمیں تکنیک کے اعتبار سے تازہ اور دلکش ہیں۔ یہاں تخیل کی تازگی ملتی ہے۔ مگر جنسی تلذذ پر ضرورت سے زیادہ زور اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ نظمیں صرف چونکا دینے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جنس آج کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر اس قدر چونکا جائے ۔

آزادی کے بعد ایک اور اہم تبدیلی نظم کا غزل کے اثر سے آزاد ہونا ہے۔ اس دور کے سب سے اہم شاعر جنھوں نے نظم کو نئی سمتوں سے آشنا کرایا، سردار جعفری، اختر الایمان اور مخدوم ہیں۔

انسان کے دکھ پر افسردہ ہونے کا جذبہ ملتا ہے۔ سردار جعفری کی نظم، انیس کی نازک خیالی، اقبال کی مرعوب کن معنویت، اور جوش کی رومانیت سے مرکب ہے ان کے ہاں تشبیہات، استعارات اور حسین الفاظ کے ذریعے نظم کی آرائش پر زیادہ زور ہے مگر آزاد نظم کو جو میراجی اور راشد کی ابہام پرستی اور لاشعور طرز اظہار کی بدولت صرف محدود حلقے تک پہنچ سکی تھی۔ اُسے سردار جعفری کے تجربات کی بدولت مقبولیت ملی

———— مخدوم اور اختر الایمان

نے اپنی ڈگر الگ بنائی، گو کہ ان کے اسلوب کا سلسلہ فیض سے جا کر ملتا ہے۔ اختر الایمان کی نظم کے حسن کا اصل سبب ہے کہ انھوں نے کلاسیکیت کے شکوہ اور رومانیت کی رنگینی سے آزاد ہو کر زندگی کے کھردرے پن کا شاعرانہ عرفان حاصل کیا وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس طلسم کو توڑ کہ اردو میں تغزل اور رومانیت کے بغیر اچھی شاعری ممکن نہیں۔ مخدوم کی نظم کا سب سے زیادہ اہم پہلو اس کی غنائی دلکشی ہے۔ ان کے ہاں آزاد نظم نے اپنے اندر چھپی ہوئی موسیقیت کو پالیا۔ مخدوم ایک جلے پہچانے مارکسی شاعر ہیں اور ان چند شاعروں میں ہیں جن پر مارکسیت کی ترویج و اشاعت کے لئے شاعری کے جمالیاتی مزاج کو مجروح کرنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اُن کے ہاں اب رومانیت کی لَے بڑھتی جا رہی ہے ان کے علاوہ ان شاعروں میں جو ۱۹۴۷ء کے بعد بہت مقبول ہوئے مگر آہستہ آہستہ روپوش ہونے لگے۔ کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، وامق جونپوری اہم شاعر تھے۔ وامق کی تقسیم ملک کے بارے میں نظمیں بہت مقبول ہوئیں۔ کیفی اعظمی کی خاموشی بہت عرصے کے بعد ٹوٹی ہے اور ادھر ان کی بڑی دلکش نظمیں رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ وحید اختر، شاذ تمکنت باقر مہدی، شہاب جعفری، معصوم رضا راہی نے بھی اچھی نظمیں کہی ہیں۔ ان کے ہاں تازگی، فکر انگیزی، اپنے آپ کو دریافت کرنے، اپنے گرد و پیش کو سمجھنے، اپنے دور کے

شعر منثور کی روایت اردو میں شاید اس لئے زیادہ نہیں پنپ سکی کہ خود ہماری نثر اپنے حسن و زیبائش کے لئے شعر کی مرہونِ منت رہی ہے ہمارا ادب پر مجموعی طور پر شاعری کے غلبے اور شاعری

پر غزل کے اقتدار نے ہمیشہ شاعری کو نثر کے اثر سے بچائے رکھا ہے۔ نثر کے آہنگ کو اگر شاعری کی بارگاہ میں بہت باریابی ہوئی تو وہ سہل ممتنع کی شکل میں تھی۔ آزادی کے بعد نثری منثور کی بھی داغ بیل پڑی۔ اس صنف میں ابھی تک کوئی چونکا دینے والی نظم تخلیق نہیں کی گئی گو کہ سجاد ظہیر کی نظموں کو جو اُن کے مجموعۂ کلام "پگھلا نیلم" میں شائع ہوئی ہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس تجربے کی عمر اتنی کم ہے کہ اس پر تفصیلی بحث کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔

آزادی کے بعد کی نظم نے اس وہم کو توڑا کہ ایمائیت صرف غزل ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور نظم میں شاعر چونکہ اپنے خیال کا بے محابا اظہار کر سکتا ہے۔ اس لئے اُسے ایسے سہاروں کی ضرورت ہی کیا اس دور کے شاعروں کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نظم کی اپنی ایک دنیا الگ تعمیر کی۔ چناں چہ آج اقبال کی وضع کی ہوئی علامتوں یا جوش کے گرجتے ہوئے الفاظ کو جمع کر کے ایک اچھی نظم کہنا ممکن نہیں۔ آج کے شاعر کو اپنی فکر اور اپنے تاثر پر اعتماد ہے اور اسی بنا پر نئے پیکر تراشنے نئے IMAGES تخلیق کرنے اور نئے الفاظ اور نئی علامتوں کا چھپا ہوا نغمہ دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آج کی شاعری کا یہ نیا فنی کردار اس بات کا بھی ثبوت ہے۔ کہ آج کا شاعر اشیاء اور مظاہر کے نئے رشتوں اور انسانی زندگی پر ان کے عمل اور ردِ عمل سے وجود میں آنے والے اثرات کا نیا عرفان و ادراک رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں ندا فاضلی کی ایک مختصر نظم "کچی دیواریں" پیش کروں گا۔ بدلتے ہوئے نظام پرانے نظام کو سہارا دینے والی فرسودہ قوتوں کا رول۔ مگر تبدیلی کا اٹل اور ناگزیر ہونا اس نظم کا موضوع ہے۔ پرانی تنقیدی زبان میں ایک خارجی موضوع ہے مگر شاعر نے اسے خارج سے تھوڑی دیر کے لئے بڑا کر دیا ہے۔

کچی دیواریں ——— ندا فاضلی

میری ماں ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
ادھر اُدھر سے مٹی لا کر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو
بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
بیچاری کتنا ڈرتی ہے۔

میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رک پائیں گی؟
جب کوئی بادل گرجے گا۔
ہر ہر کرتی ڈھ جائیں گی!!!

(ہماری زبان ۔ علی گڑھ)

یہ اور اس قسم کی بہت سی نظموں کا پچھلے چند برسوں میں وجود میں آنا اردو نظم میں ایک نئے اور خوشگوار رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔ بُری شاعری ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے۔ بُرے شاعروں کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ کوئی چاہے تو افلاطون بن کر انھیں اپنی مثالی ریاست سے نکال کر بھی دیکھ لے وہ بُری شاعری پھر بھی کرتے رہیں گے۔ مگر بُرا شاعر ہونا اتنی بری بات نہیں جتنی کہ بُرا شاعر ہونے کے باوجود بُرا شاعر نہ سمجھا جانا۔ اس کا خطرہ تو ہر زمانے میں رہا ہے۔ مگر ایسے زمانے میں جب ہر شے تحلیل ہو رہی ہو۔ بنے بنائے ٹھوس سانچے ان دیکھی حرارت سے بے اندازہ تیزی کے ساتھ پگھل رہے ہوں تو یہ خطرہ اور بڑھ جاتا ہے۔ چناں چہ آج یہ خطرہ پہلے سے زیادہ ہے۔ آزاد نظم کی مقبولیت، نظم میں جرأت فکر اور آزادیٔ اظہار کے نئے امکانات بامعنی تجربات کا ذریعہ اور تخلیقی فکر کی آزمائش کا پیمانہ سمجھے جانے کے بجائے کم مایہ اور کور ذوق شاعروں کے ہاں ہر طرح کی چھوٹ اور دنیا بھر کی خرافات کی اجازت سمجھ لئے جاتے ہیں اس قسم کی چیزوں کو شاعری صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بعض رسائل میں اتفاق سے نظم کے صفحات پر چھپ جاتی ہیں۔ شاعری کے اس حصے پر شاعری کے ذیل میں نہیں، "پرنٹنگ پریس" کے نقصانات

(بقیہ ص ۶۷ پر)

پیمانے پر انتظام کیا گیا۔

اس وقت تک انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند کو یونیورسٹیوں کی جو تعداد موصول ہوئی ہے اس کے مطابق چالیس کے قریب یونیورسٹیاں ایسی ہیں جہاں بی اے، ایم اے اور ریسرچ کے معیار پر تعلیم دی جا رہی ہے اگرچہ اس عظیم ملک کی لاتعداد یونی ورسٹیوں کے مقابلہ میں یہ تعداد بہت مختصر ہے مگر اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ یہ تعداد بھی اس بیس سالہ آزادی کے بعد حاصل ہوئی ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو کچھ اس طرح ہوگا۔

۱۔ وہ یونی ورسٹیاں جہاں اُردو کی تعلیم آزادی سے پہلے بھی تھی مثلاً علی گڑھ، عثمانیہ، پٹنہ۔

۲۔ وہ یونی ورسٹیاں جہاں اگرچہ اُردو کی تعلیم تو تھی مگر اُردو کا شعبہ، فارسی یا عربی سے منسلک تھا۔ مثلاً دہلی، الہ آباد۔ لکھنؤ سری نگر، میسور۔

۳۔ وہ یونی ورسٹیاں جہاں آزادی کے بعد اُردو کے شعبے قائم کئے گئے۔ مثلاً گورکھپور۔ جموں۔

۴۔ وہ یونی ورسٹیاں جہاں صرف ملحقہ کالجوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ یونی ورسٹی میں اس کا انتظام نہیں ہے مثلاً ناگپور، آگرہ۔

مگر آزادی کے بعد نمایاں تبدیلی ہوئی اور اُردو کے مستقل شعبے قائم کردیے گئے اور پروفیسر کے عہدے کا قیام عمل میں آیا جس کی مثال دہلی، الہ آباد، اور لکھنؤ ہیں۔ آزادی کے بعد جہاں شعبے قائم ہوئے وہاں اگرچہ بعض جگہ پروفیسروں کا تقرر نہیں ہوا۔ مگر ریڈر صدر شعبے کی حیثیت سے بخوبی کام انجام دے رہے ہیں۔ اسی بنا پر خیال ہوتا ہے کہ اکثر یونی ورسٹیوں میں ہمارے پروفیسروں کی علمی صلاحیت محض انتظامی معاملات کی نذر ہو جاتی ہے اور وہ لوگ علم و ادب کی دُنیا میں جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملتا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شعبے میں پروفیسر اور اس کی ایما سے دوسرے ساتھیوں کے درمیان ایسی تقسیم کار ہونا چاہئے جس سے شعبہ کے کام کا بار صرف ایک شخص کے کندھے پر نہ پڑ کے رہ جائے۔

اگرچہ نئے شعبوں کے قائم ہو جانے سے طلبہ کو سہولتیں تو فراہم ہوگئیں مگر اُن کی تعداد میں کماحقہٗ اضافہ نہیں ہوا۔ اس کا سبب غالباً ملک کے بدلے ہوئے سیاسی حالات ہیں۔ دوسری طرف یہ احساس ہے کہ نوکریوں میں صرف ان مضامین کی گنجائش ہے جو ٹیکنیکل ہیں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے ہمارے ملک میں ڈاکٹر اور انجنیر تک بے روزگار ہیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ بے روزگاری کا تعلق کسی مضمون یا فن سے نہیں ہے بلکہ یہ ملک کا ایک اہم مسئلہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے قومی سطح پر کام ہونا چاہئے۔ اور ہو رہا ہے۔

تمام ہندوستان کی یونی ورسٹیوں کے اعداد و شمار فراہم نہیں ہو سکے ہیں۔ جو اعداد فراہم ہو سکے ہیں وہ درج کئے جاتے ہیں۔

بی اے: ۶۶-۱۹۶۵ء

			۱۳۹
دہلی	۱۰۰	وکرم	۷۵۲
علی گڑھ	۱۸۰	گورکھ پور	۱۵۹
میسور	۱۷۵	پٹنہ	۹۵
الہ آباد	۱۳۵	اودے پور	۹
لکھنؤ	۶۹	بمبئی	۶
	۱۳۹		۱۰۶۰

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ گوالیار اور اندور کے کسی کالج میں اُردو کی تعلیم نہیں ہے۔ البتہ بی اے میں پرائیوٹ طلبہ شریک ہو سکتے ہیں۔ بمبئی نے اُردو کے لئے مخصوص مراعات نہیں دی ہیں بسدھارتھ کالج۔ صوفیہ کالج۔ اور نیشنل کالج میں اُردو یہ

حیثیت ضمنی مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی میں اگرچہ ام اے اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے مگر پرائیوٹ طلبہ کی خاصی تعداد اس میں شریک ہوتی ہے۔

اسی طرح ام اے کی تعلیم، پٹنہ، علی گڑھ، عثمانیہ، وکرم، کشمیر، الہ آباد اور لکھنؤ میں اطمینان بخش کہی جاسکتی ہے کہ یہاں پر ہر سال خاصی تعداد میں طلبا اردو ام اے کلاس میں داخلہ لیتے ہیں۔

ام اے سال اول و دوم ۱۹۶۳-۶۴ء

دہلی	۳۸	گورکھپور	۱۷
علی گڑھ	۱۲	پٹنہ	۶۰
الہ آباد	۱۰	کشمیر	۱۳
بمبئی	۳۰	لکھنو	۱۷[1]
وکرم	۲۶		

یونی ورسٹیوں میں غیر معمولی اضافہ ریسرچ میں ہوا ہے پہلے جب کہ یونی ورسٹیوں میں چند گنتی کے ریسرچ اسکالر ہوتے تھے۔ اب ہر شعبہ میں کئی کئی موجود ہیں اور ریسرچ کے ان طلباء کے غیر معمولی اضافہ کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو زندگی کی دوڑ اتنی شدید اور تیز ہے کہ ام اے پاس کی حیثیت ضمنی رہ گئی ہے۔ دوسرے اب انسانی ذہن تحقیق اور تلاش کی طرف زیادہ مائل ہوگیا ہے اس تحقیق میں قدیم نسخوں کی بازیافت بھی شامل ہے اور اپنے مشاہیر ادب کے کارناموں کا جائزہ اور تخمینہ بھی۔ اپنے ادب اور اصناف ادب کی تدوین اور تاریخ کی بازیافت بھی شامل ہے اس کا اندازہ ذیل کے مختصر جدول سے کیا جاسکتا ہے۔

ریسرچ اسکالر

	پی ایچ ڈی	ڈی لٹ		پی ایچ ڈی	ڈی لٹ
دہلی	۳۰	۳	علی گڑھ	۲۴	۔
الہ آباد	۸	۴	لکھنؤ	۱۵	۔
پٹنہ	۱۴	۱	کشمیر	۹[2]	۔
				۱۰۰	

یہ تعداد صرف موجودہ اشخاص سے متعلق ہے اس بیس سال

---

[1]۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نئی دہلی سے حاصل شدہ اطلاع کے مطابق ۶۷-۱۹۶۸ء میں ایم اے اردو (سال اول دوم) کے طلباء کی مجموعی تعداد ۳۷۲ ہے۔ پچھلے سالوں کی تعداد اس طرح ہے۔

۱۹۶۱-۶۲ء	۲۵۵
۱۹۶۲-۶۳ء	۲۵۰
۱۹۶۳-۶۴ء	۲۵۰
۱۹۶۴-۶۵ء	۳۳۱
۱۹۶۵-۶۶ء	۳۳۱

مصنف نے جو تعداد بتائی ہے وہ کمیشن کے اعداد و شمار سے مختلف ہے۔ آج کل دہلی (اردو نمبر)

[2]۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن سے حاصل کردہ اعداد اس طرح ہیں۔ اس میں ڈی لٹ کے اسکالر شامل نہیں ہیں۔

۱۹۶۱-۶۲ء	۵۴
۱۹۶۲-۶۳ء	۵۸
۱۹۶۳-۶۴ء	۷۲
۱۹۶۴-۶۵ء	۹۵
۱۹۶۵-۶۶ء	۸۴
۱۹۶۶-۶۷ء	۱۰۴

(ادارہ)

ہیں جن لوگوں نے ڈگریاں لے لیں اور اپنے مقالات داخل کر دیئے ان کی تعداد ان کے علاوہ ہے[۱] اردو کی تعلیم کے سلسلے میں ضرورت اور زمانے کے لحاظ سے کئی نئی قسم کے کورس بھی شروع کیے گئے ہیں دہلی یونی ورسٹی میں مخطوطات شناسی کا ایک نیا کورس جاری کیا گیا۔ اس کورس میں فن تحریر اور مختلف طرز ہائے خط کی تاریخ متنی تنقید کے اصول۔ اصلی اور جعلی دستاویزوں کی شناخت۔ یہ کورس تھیوری کے ساتھ پریکٹیکل تحقیقات پر بھی مشتمل ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کا ابھی طلبہ کو اندازہ نہیں ہے۔ مگر جب اس کا احساس ہوگا تو وہ اندازہ کریں گے۔ کہ اس فن کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔

اس کورس کے ساتھ غالباً ام لٹ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ مدت سے ایک ایسے کورس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو ریسرچ کے طلبہ کو اصول و ضوابط کی تعلیم اور مشق بہم پہنچا سکے۔ چناں چہ دہلی یونی ورسٹی نے اس ضرورت کو سمجھا اور گذشتہ سال سے دو سالہ ام لٹ کورس شروع کیا ہے جو طلبہ صرف اصول تحقیق کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا چاہیں وہ ایک سال بعد سرٹیفکٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ام لٹ کی سند کے لیے ان کو دو سال کی مدت پوری کرنی ہوگی۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ آج جب کہ دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ اور ایک ملک کا دوسرے ملک سے وہی رشتہ ہے جو شہر کے ایک محلہ کا دوسرے سے۔ باہمی ربط اور تعلق کیوں کر پیدا ہو۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ایک دوسرے کی زبان سیکھی جائے۔ چناں چہ ہر یونی ورسٹی میں مختلف زبانوں کے (ملکی اور غیر ملکی) سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس شروع ہو چکے ہیں اور دہلی، حیدرآباد، لکھنؤ، جامعہ ملیہ میں غیر ملکی اور اردو نہ جاننے والے ملکی طلبا کو اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ دہلی یونی ورسٹی میں جن غیر ملکی طلبہ نے اردو سیکھی ان میں امریکہ، روس، فرانس۔ عرب اور اٹلی وغیرہ کے طالب علم تھے۔ ایک مستقل سیکشن روسی طلبہ کے لئے ہے

جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ تعلیم اور زبان کا اصل مقصد اشخاص، جماعتوں، صوبوں اور ملکوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہے یہ بات زبانوں کی واقفیت سے بہم پہونچائی جاسکتی ہے۔

---

۱ یو جی سی کے مطابق اس وقت ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں اردو کے اساتذہ کی تعداد یہ ہے (بعض یونی ورسٹیوں میں عربی فارسی کے اردو کے شعبے ملے جلے ہیں لہذا اس تعداد میں وہ بھی شامل ہیں۔)

پروفیسر	ریڈر	لکچرر	ٹیوٹر	میزان
۲۱	۳۹	۱۶۲	۴	۲۶۶

یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی تجویز ہے کہ چوتھے پلان کی مدت میں مختلف یونی ورسٹیوں میں مندرجہ ذیل تقرر کیے جائیں اور مالی امداد دی جائے۔

الہ آباد — ا ریڈر — ۵ ہزار روپے (کتابوں کے لئے)
لکھنؤ (شعبہ اردو فارسی) ۲ لکچرر — ۱۰ ہزار روپے (" ")
دہلی — ا ریڈر ا لکچرر — ۱۰ ہزار روپے (" ")
جموں کشمیر — ا پروفیسر۔ ۲ لکچرر — ۲۰ ہزار روپے (" ")
۱½ لاکھ " (عمارت کے لیے)
بنارس (شعبہ عربی/فارسی/اردو) ا ریڈر ا لکچرر — ۱۰ ہزار روپے (کتابوں کے لیے)
گورکھپور — — ۱۰ ہزار روپے (" ")
مگدھ یونی ورسٹی (گیا) ا ریڈر ۲ لکچرر — ۳ ہزار روپے (سامان کے لیے)
میسور — — ۲۰ ہزار (کتابوں کے لئے)
سری وینکٹیشور — — ۲۵ ہزار روپے (" ")
علی گڑھ — ا ریڈر — ۱۰ ہزار روپے (" ")

(ادارہ)

اور اس سے آگے بڑھ کر ہم ان کے ادب کے ذریعے سے کلچر تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس رجحان کے تحت ادب کا تقابلی مطالعہ کے عنوان سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے اپنے یہاں ایک پرچہ رکھا ہے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی نے اپنے یہاں لسانیات کا ایک علیحدہ شعبہ بھی قائم کیا ہے جس سے اردو کو بھی فائدہ ہوگا۔

اب تک جو کچھ کہا گیا اس کا تعلق تدریس سے تھا۔ مگر تعلیم کا دائرہ اس قدر محدود نہیں ہے کہ وہ تدریس پر قناعت کرے۔ اچھے استاد اور اچھی تعلیم کے لیے اچھے لغات۔ اچھی نصاب کی کتابیں ناگزیر ہیں۔ ہمارا وہ سرمایہ جو مخطوطات کی صورت میں کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا ہے۔ اس کی اشاعت۔ ایک ایسی مکمل تاریخ ادب کی ترتیب جو ہم کو سماج اور ملک و ادب کے باہمی رشتے میں منسلک کر سکے۔ ان سب کی مجموعی اور انفرادی طور پر اہمیت مسلم ہے۔ غنی کشمیری نے لکھا تھا۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

یہی حال ہمارے مخطوطات کا ہے جو یورپ کے گوداموں میں دفن تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آزادی کی دین ہے کہ ہم کو اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ قدیم مخطوطات کی اشاعت کو جامعاتی سطح پر ایک مستقل حیثیت دے دی گئی ہے۔ چناں چہ اس سلسلہ میں نمایاں کام دہلی اور حیدرآباد میں ہو رہا ہے۔ دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو سے جو قدیم مخطوطات شائع ہوئے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

قائم	دیوان قائم	فضلی	کربل کتھا (دہ مجلس)
سوز	دیوان سوز	میر حسن	گنج خوبی
ممنون	دیوان ممنون	سرور	تذکرہ سرور
			دہلی اردو اخبار

اس کے علاوہ عثمانیہ یونی ورسٹی نے دکنیات کے سلسلہ میں بڑا مفید کام کیا ہے۔

معظم بیجاپوری	دیوان معظم بیجاپوری	}	داستان مہر افروز و دل بر
سید اول	کشف الوجود	غواصی	مینا ستونتی
		افضل	بکٹ کہانی

اردو ادب اور تدریس میں تاریخ اور لغت کی جس قدر اہمیت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں چنانچہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے اپنے طویل پروگرام میں تاریخ ادب (از اول تا امروز) کو نمایاں جگہ دی ہے اور اس کی ایک جلد قدیم تاریخ ادب سے متعلق شائع ہو چکی ہے[1] دہلی یونی ورسٹی نے اردو ہندی لغت کی تیاری کا کام عرصہ سے شروع کر رکھا ہے[2] امید ہے کہ اس کی پہلی جلد منظر عام پر آجائے گی۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جا رہا ہے، علمی اور ادبی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں اور اسی لحاظ سے اردو والوں کے کاموں میں بھی زیادتی ہوتی جا رہی ہے۔ تعلیم، تدریس، نصاب، تحقیق کے مسائل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اسی خیال سے انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی بنیاد پڑی اور اس کی دو کانفرنسیں دہلی اور سرینگر (کشمیر) میں ہو چکی ہیں۔ یہ کانفرنسیں خالصتاً علمی مسائل پر غور و فکر کے لیے منعقد ہوئیں اور مختلف ریاستوں کی یونی ورسٹیوں کے اساتذہ یک جا ہوئے اور اردو کی تعلیم سے متعلق مختلف مسائل پر بھی غور کیا گیا جس سے بڑے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

---

[1] اس کے لئے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے دوسرے پلان میں ایک لاکھ روپے کی امداد دی تھی۔ اس تاریخ کی تیاری میں جو بھی رقم خرچ ہوگی۔ یو جی سی مہیا کرے گی۔

[2] یہ کام بھی یو جی سی کی امداد سے ہو رہا ہے۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ ہے۔ ان یونی ورسٹیوں کا جہاں اردو کے لئے کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کہیں یاران تیز گام ہیں اور کہیں ہمراہیان سست رفتار۔ مگر اول الذکر سے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تیز رفتاری میں قدم سنبھال کر چلیں اور آخر الذکر سے یہ کہنا ہے کہ رفتار ذرا تیز کریں اس لئے کہ زمانہ کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔ ابھی ہم کو بہت کچھ کرنا ہے اور ہر کام کے لئے حکومت کی مدد کا ہی منتظر نہیں رہنا ہے۔ جو کام ہونے چاہئیں۔ اُن کی تفصیل میں گئے بغیر ذیل میں صرف عنوانات پیش کر دیئے ہیں۔

۱۔ بعض مرکزی یونی ورسٹیوں میں Deptt. of Advance Studies in Urdu قائم کرنا ہے تاکہ ہم اپنا دائرہ وسیع تر کر سکیں

۲۔ ایک ایسی لائبریری قائم کرنا ہے جہاں تمام اردو مخطوطات کے عکس یکجا کئے جا سکیں تاکہ طالب علم کو ایک ایک مخطوطہ کے لئے مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔

۳۔ ابھی ام اے اور ریسرچ کے معیار کو بلند کرنا ہے تاکہ موجودہ بھیڑ چال اس کی حیثیت کو پست نہ کر دے (۴) یو جی سی کی طرف سے ایک خبرنامہ شائع ہو جس میں مختلف یونی ورسٹیوں میں ہونے والے کام کا تذکرہ ہو۔

۵۔ ایک ایسے شعبے کے قیام کی ضرورت ہے جو تراجم کے مسائل پیش کر سکے اور وہ اعلیٰ حقائق جو دوسری زبانوں کا سرمایہ ہیں ترجمے کے باعث اردو میں بھی عام ہوں۔

۶۔ تعلیمی درسگاہوں کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔ اس کی حیثیت ایک خود مختار ریاست کی ہو۔ جہاں اچھے استاد، اچھے طالب علم۔ اچھے شہری اور اچھے ماہرِ فن پیدا ہوں۔

۷۔ آج جب کہ ملک میں تعلیمی نظام کی از سر نو تشکیل ہو رہی ہے۔ وہ دیواریں جو بوسیدہ ہو چکی تھیں ان کو مسمار کیا جا رہا ہے۔ ہر شخص کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دینے کی سہولت کا بار بار اعلان کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں ایک اُردو یونی ورسٹی کے قیام کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اس سے ایک طرف یہ فائدہ ہوگا کہ وہ ہماری مشترکہ تہذیب اور ملکی اتحاد کو قائم رکھے گی۔ اور دوسری طرف ان کا ناتا تمام زبانوں سے ہوگا۔ وہ مختلف علوم و فنون کے لئے نصاب تیار کرے گی۔ اصطلاحات اور وضع اصطلاحات کا دائرہ وسیع ہوگا۔[1]

---

[1] اس مضمون میں دوسری معلومات کے علاوہ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کے خبرناموں اور پہلی کانفرنس منعقدہ دہلی ۱۹۶۶ء کے مطامین سے مدد لی گئی ہے۔

اردو صحافت (بقیہ صفحہ ۸۴ سے آگے)

نیوز پرنٹ اور سرکاری اشتہارات کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حکومت چھوٹے چھوٹے اخباروں کی ضرورتوں کا بطور خاص خیال رکھتی ہے چھوٹے اخبارات سے متعلق کمیشن نے بڑی کارآمد سفارشیں کی ہیں۔ اور ضخامت کے لحاظ سے قیمت کے تعین کے اصول کی سفارش کی ہے۔ پریس کانسل بھی ایک اہم مقصد کو پورا کرتی ہے۔ اور مستقبل میں بڑی مفید خدمت انجام دے گی۔ جس سے چھوٹے اخبارات (اس زمرے میں اردو کے ۹۰ فیصدی اخبارات آتے ہیں) کو فائدہ پہنچے گا۔

روز بروز تعلیمی سہولتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ملک میں جمہوری نظام قائم ہے۔ اور تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے۔ مستقبل بڑے وسیع امکانات کا حامل ہے ملک کی معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ قوت خرید میں بھی اضافہ ہوگا۔ لہذا ہندوستان میں اردو صحافت کا مستقبل بڑا شاندار ہے

نند کشور وکرم

اُردو صحافت

آزادی کے بعد

نپولین نے غلط نہیں کہا تھا کہ دشمن کی ایک ہزار سنگینوں کے مقابلے میں تین مخالف اخباروں سے زیادہ خوف کھانا چاہیے. جمہوری نظام میں اس کی اہمیت تو پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے کیوں کہ اخبارات اور رسائل عوام کو باشعور بناتے ہیں اور رائے عامہ کو متاثر کرتے ہیں. اردو اخبارات کو ان کی اہمیت کے پیش نظر ہی Fourth Estate کہا گیا ہے. ہندوستان کے دستور میں آزادی تحریر کا حق دیا گیا ہے جس سے ہمارے اخبارات پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہیں. وہ بڑی بے خوفی سے حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہیں، غلط فیصلوں کو منسوخ کراتے ہیں. اور عوام میں سیاسی شعور پیدا کر کے انھیں ایک کار آمد شہری بننے میں مدد دیتے ہیں۔

آزادی کے بعد تعلیم کے پھیلاؤ، خوش حالی، ملکی اور غیر ملکی مسائل سے روز افزوں دلچسپی، طباعت کی سہولت اور سب سے بڑھ کر ضرورت نے اخباروں اور رسالوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔

آزادی کے بعد اردو صحافت نے غیر معمولی ترقی کی ہے صرف رسائل و اخبار کی اشاعت و تعداد میں ہی اضافہ نہیں ہوا بلکہ معیار و ترتیب میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

جب ہمارے ملک کو آزادی حاصل ہوئی اس وقت اردو صحافت کا آغاز ہوئے ۱۲۵ سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا. اس مدت میں بہت سے قابلِ ذکر اخبار و جرائد شائع ہوئے اور ایسے ایسے ممتاز اور نامور صحافی اس میدان میں آئے جنھوں نے اپنی ذہانت قابلیت اور انفرادیت سے اردو صحافت کو چار چاند لگانے کے ساتھ ساتھ اپنی عظمت کا بھی سکہ منوایا. ان سب باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو ترقی اردو صحافت نے ان حالیہ بیس برسوں میں کی ہے وہ گزشتہ سوا سو سال کی طویل مدت میں بھی ممکن نہیں ہو سکی تھی۔

اُردو صحافت کا ماضی بہت ہی روشن اور شاندار رہا ہے اور اسے مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، سید جالب، مولانا غلام رسول مہر، مہاشہ کرشن اور مہاشہ خوشحال چند وغیرہ ایسے ممتاز اور جلیل القدر صحافی نصیب ہوئے جنھوں نے اپنا زورِ قلم آزادی وطن کی خاطر وقف کیا، عوام کو فرسودہ رسوم و قیود سے آزاد کرانے کے لئے ہدفِ ملامت بنے، برطانوی استبداد سے ٹکر لی اور ایک ایسی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے .. جس نے بالآخر ملک کو آزادی سے ہمکنار کیا۔



مہاشے کرشن (لاہور) سابق ایڈیٹر "پرتاپ"

۱ یوں تو ہمارے ملک کی ہر زبان کی طرح اُردو صحافت بھی انگریزی صحافت سے متاثر ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی انفرادیت واہمیت کو ہمیشہ قائم رکھا اور اپنے لئے ایک الگ راستہ منتخب کیا۔

اس کے علاوہ اُردو صحافت نے ورثے میں ملی اپنی اقدار کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو صحافت میں عرصہ دراز تک خبروں اور اداریوں کی نسبت ادبی اور علمی مضامین کو زیادہ اہمیت دی جاتی رہی ہے روزنامہ زمیندار، ہمدرد اور پیام کے صفحۂ اوّل پر اہم خبروں کے بجائے علمی ادبی اور تاریخی مضامین چھپتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی پہلے صفحے کی زینت رہیں۔ اسی طرح ایک طویل مدت تک اداریہ نویسی مضمون نویسی تک محدود رہی۔ ۱

۱۹۴۷ء میں اردو اخبارات عموماً دو گروپوں میں منقسم تھے۔ ایک گروپ قوم پرست اخباروں کا تھا اور دوسرا دو قومی نظریے کا ترجمان مگر یہ بھی صحیح ہے کہ دو قومی نظریئے کے حامی اخبارات کے مقابلے میں قوم پرست اخباروں کی تعداد زیادہ تھی تقسیم ملک کے بعد مسلم لیگ کی پالیسی کی حمایت کرنے والے اکثر اخبار ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے یا پھر بند ہو گئے۔ اس طرح بہت سے اخبارات نقلِ وطن کر کے ہندوستان بھی آئے۔

آزادی کے وقت اور اس کے بعد مختلف ریاستوں میں اردو اخباروں کی تعداد کیا تھی۔ اس کا ایک مختصر سا جائزہ نیچے درج کیا جارہا ہے

لالہ لاجپت رائے کے اخبار "بندے ماترم" کی لاہور میں بہت دھوم تھی مگر دہلی آکر اس کی وہ آن بان باقی نہ رہی۔ کچھ مدت تک بے قاعدگی سے شائع ہونے کے بعد یہ تاریخی روزنامہ ختم ہو کر رہ گیا۔ آزادی سے پہلے دہلی کے پرانے صحافی اور کانگریسی رہنما رام لال ورما کے اخبار "ہندو" کا بہت شہرہ تھا۔ مگر آزادی کے بعد یہ اخبار بہت دنوں تک زندہ نہ رہ سکا کچھ عرصہ بعد مشہور صحافی اور کانگریسی رہنما گوپی ناتھ امن کی ادارت میں ایک قوم پرست اور جمہوریت نواز روزنامے "سنسار" کا اجرا ہوا مگر یہ اپنی انفرادیت اور قوم پرستی کے باوجود زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا۔ سناتن دھرمی اخبار "ویر بھارت" کا لاہور کے نامی گرامی روزناموں میں شمار ہوتا تھا مگر اسے ہندوستان کی آب و ہوا شاید راس نہ آئی اور وہ بھی باقاعدگی اور بے قاعدگی سے چھپتے چھپتے آخر کار ختم ہو کر رہ گیا۔ مولانا ظفر علی خاں کے شریک کار اور مشہور قوم پرست صحافی مولانا عبدالباقی نے جو اُردو کے بڑے پڑھے لکھے اور ممتاز صحافیوں میں تھے۔



حیات اللہ انصاری ایڈیٹر "قومی آواز" لکھنؤ

مولانا عبدالوحید صدیقی کے اشتراک سے نئی دنیا کا اجرا کیا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اس اخبار سے علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے جمہوریت اور سیکولرازم کا ترجمان "پیام وطن" نکالا جو اقتصادی بحران کا شکار ہو کر ۱۹۵۹ء میں بند ہو گیا۔ "پیام وطن" کی طرح نئی دنیا بھی بعد میں بند ہو گیا۔ اور آج کل مولانا عبدالوحید صدیقی ماہنامہ "ہما" اور "ہدیٰ" نکال رہے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں جالندھر سے کمیونسٹ پارٹی نے "نیا زمانہ" کا اجرا کیا مگر بعد ازاں وہ اسے جاری نہ رکھ سکی اور اسے بند کر دیا۔

اردو صحافت کی یہ ایک خصوصیت رہی ہے کہ اس میں اخبارات بند ہونے اور نکلنے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ لیکن بند ہونے والے اخبارات کے مقابلے میں نئے اخبارات کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پہلے پرتاپ اور ملاپ صرف لاہور سے شائع ہوتے تھے۔ لیکن اب پرتاپ جالندھر اور دہلی سے اور ملاپ دہلی جالندھر اور حیدر آباد سے شائع ہو رہا ہے۔

تقسیم سے پیشتر متحدہ ہندوستان سے ۹۰[1] روزانہ اخبار شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے ۲۸ اس علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو بعد میں پاکستان کے حصہ میں آیا۔ یعنی ہندوستانی علاقے سے صرف ۶۲ روزنامے نکلتے تھے۔ جب کہ آج ۸۳[2] روزنامے شائع ہوتے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں جمیعتہ العلماء ہند نے "الجمیعتہ" کا آغاز کیا۔ جو دہلی سے مشہور صحافی محمد عثمان فارقلیط کی ادارت میں باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں جماعت اسلامی کے سہ روزہ اخبار "دعوت" نے روزنامے کی شکل اختیار کر لی۔ جمنا داس اختر کچھ عرصہ تک روزنامہ تیج کی ادارت سے وابستہ رہے لیکن بعد ازاں انھوں نے ہفتہ وار "سویرا" کا اجرا کیا۔ جو ۱۹۶۰ء میں روزنامہ کی شکل اختیار کر گیا۔ ۱۹۶۵ء میں سید انیس الرحمن نے دہلی سے روزانہ "ملک و ملت" جاری کیا اب حال ہی میں جن سنگھ کے افکار و خیالات کا ترجمان "اردو بازار" شائع ہونا شروع ہوا ہے۔

تقسیم ملک سے پہلے مشرقی پنجاب اردو اخباروں کی اشاعت کے لحاظ سے پسماندہ تھا۔ اگرچہ اُس وقت پنجاب سے "زمیندار" "امروز" "احسان" "شہباز" "پرتاپ" "ملاپ" "نوائے وقت" "اجیت" "آزاد" "بیر بھارت" "ویر بھارت" "شمس" "بندے ماترم" "جے ہند" "منشور" "رنجیت" اور "الفضل" لگ بھگ ڈیڑھ درجن روزانہ اخبار شائع ہو رہے تھے۔ مگر ان میں سے صرف مؤخر الذکر ہی مشرقی پنجاب (قادیان) سے شائع ہوتا تھا۔ اور اسکی اہمیت مقامی اور محدود تھی۔ دراصل اس وقت لاہور اردو اخبار و رسائل کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اور روزانہ شمس (ملتان) کے علاوہ باقی سب اخبار وہیں سے شائع ہوتے تھے۔ جب پنجاب تقسیم ہو گیا تو مشرقی پنجاب سے کوئی روزانہ اخبار شائع نہ ہوتا تھا لیکن بعد آزادی بہت سے مہاجر اخبار جالندھر یا امرت سر سے چھپنے لگے۔ ۱۹۴۹ء میں پرتاپ اور ملاپ نے دہلی کے ساتھ ہی جالندھر سے بھی اپنے ایڈیشن شائع کرنے شروع کر دیئے۔ ان سے ایک سال پیشتر لالہ جگت نارائن ممبر پارلیمنٹ نے جالندھر سے ہند سماچار نکالنا شروع کر دیا تھا جو اب اشاعت کے اعتبار سے پنجاب کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار ہے۔

۱۹۶۱ء میں جالندھر سے ایک اور اردو روزنامے "پردیپ" کا اجرا ہوا۔ پنجاب میں اردو پڑھنے والے اب بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ ان اخبارات کے علاوہ اس وقت پنجاب سے بیر بھارت، ایوننگ نیوز، راجدھانی ٹائمز، صداقت، رجحان، اور ترجمان بھی شائع ہو رہے ہیں۔

آبادی کے لحاظ سے اتر پردیش ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اور یہاں اردو جاننے والوں کی تعداد بھی دوسرے صوبوں کی نسبت زیادہ ہے۔ لیکن یہاں آبادی کے لحاظ سے بہت کم اخبار و رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے یہاں سے لگ بھگ ایک درجن اخبار شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے اب صرف پیغام ناظم اور قومی آواز ہی موجود ہیں۔ باقی سب اخبار آزادی کے بعد کی دین ہیں۔ اس وقت وہاں سے مذکورہ بالا اخبارات کے علاوہ سیاست جدید، استقامت، آزاد، غبار راہ، صبح شام ہندوستان اور قائد شائع ہو رہے ہیں۔

بہار میں تقسیم کے بعد صرف ایک ہی روزنامہ "صدائے عام" باقی رہ گیا تھا جو سید نظیر حیدر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اب اس کے ایڈیٹر رضی حیدر ہیں۔ قیام آزادی کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۹۴۸ء میں مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی نے پٹنہ سے "ساتھی" کا اجرا کیا۔ اڑھائی برس تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے بعد انہوں نے

---

۱ انڈین پریس ڈائرکٹری ۱۹۴۷ء

۲ پریس رجسٹرار آف انڈیا کی ساتویں رپورٹ ۱۹۶۷ء

یہ اخبار غلام سرور کے ہاتھوں فروخت کردیا۔ ۱۹۵۳ء میں غلام سرور نے بھی اس اخبار کو فروخت کردیا اور کچھ دنوں کے بعد سنگم کا اجرا کیا۔ "د سائتھی" اسوقت سمیع ندوی اور خالد رشید کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

مہاراشٹر (بمبئی) اردو اخبارات کا ایک بڑا مرکز رہا ہے۔ آزادی سے پہلے اجمل، الہلال، ہمارا ہندوستان، ہلال، ہندوستان، انقلاب، اقبال، خلافت، اتحاد، اور مسلم اس صوبہ سے شائع ہوتے تھے اب ان میں سے صرف چار اخبار انقلاب، ہندوستان، خلافت اور اجمل ہی باقی رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نئے اخبار بھی منظر عام پر آگئے ہیں جنھوں نے بند ہونے والے یا پاکستان ہجرت کرنے والے اخبارات کی کمی پوری کردی ہے۔ چار پرانے روزناموں کے علاوہ اب وہاں سے "اردو ٹائمز" "قیادت" "آج" "حیات ملت" اور اردو رپورٹر بھی شائع ہو رہے ہیں

ریاست جموں و کشمیر میں آزادی سے پہلے شخصی حکومت کی وجہ سے آزادی تحریر و تقریر کیلئے فضا سازگار نہ تھی۔ اس لئے وہاں صحافت کا آغاز دیر سے ہوا۔ اور مہاراجہ کے عہد میں کچھ اخبار و رسائل منظر عام پر آئے مگر وہ پوری طرح پنپ نہیں رہے تھے۔ جب ملک آزاد ہوا تو حالات بالکل بدل گئے۔ اور وہاں سے متعدد اخبارات و رسائل شائع ہونے لگے۔ جو مختلف نظریات و افکار کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کشمیر میں اسوقت خدمت، آفتاب، سندیش، نیا سنسار، قومی آواز، اجالا، مارتنڈ، امارت، اور مزدور ۹ اخبار چھپ رہے ہیں۔ ان میں سے صرف تین مارتنڈ خدمت اور سندیش آزادی سے پہلے کے ہیں۔ اور باقی آزادی کے بعد نکلنا شروع ہوئے

مغربی بنگال میں روزناموں کے سلسلہ میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ پہلے وہاں سے "عصر جدید" الہلال، اور آزاد ہند شائع ہوتے تھے۔ مگر اب وہاں سے چھ اخبار شائع ہو رہے ہیں: عصر جدید روزانہ ہند، آبشار، آزاد ہند، غازی، اور امروز۔

مدھیہ پردیش میں اکثریت کی زبان ہندی ہے۔ مگر کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی آبادی موجود ہے اس پردیش میں بھوپال ایک ایسا شہر ہے جو اردو مرکز میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں سے بہت سے اخبار و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ اسوقت اس علاقہ سے افکار ندیم اور سفیر مالوہ تین روزنامے اہل اردو کی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔

آزادی کے بعد جس ریاست نے اردو صحافت و ادب کے میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ وہ ہے میسور۔ قیام آزادی سے پیشتر وہاں سے الکلام اور اقبال صرف دو روزنامے شائع ہوتے تھے۔ مگر اب یہاں اردو کا چلن وسیع پیمانے پر ہے۔ اس وقت اس جگہ سے چھ روزنامے آزاد، سلطان، سالار، کرناٹک ٹائمز، نوائے شام، پاسبان اور الکلام شائع ہو رہے ہیں

تقسیم ملک سے پہلے ریاست حیدرآباد کا شمار بھی اردو کے بڑے مرکزوں میں ہوتا تھا۔ اُن دنوں وہاں سے حمایت دکن، الاثر، میزان صبح وطن، مشیر دکن، نظام گزٹ، پاسبان، پیام، رعیت، صحیفہ، سلطنت، صبح دکن، تاج تنظیم، وقت، اور پاسبان لگ بھگ ڈیڑھ درجن روزانہ اخبار چھپ رہے تھے۔ اتنے اخبار پنجاب کے علاوہ اور کسی جگہ سے شائع نہیں ہوتے تھے۔ اس علاقے سے جواب آندھرا پردیش کے



عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست حیدرآباد

نام سے موسوم ہے۔ آزادی کے بعد روزناموں کی تعداد میں زبردست

کمی واقع ہوئی ہے۔ اب پرانے اخبارات میں سے صرف نظام گزٹ اور مشیرِ دکن باقی رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ سیاست، انگارے، ملاپ اور رہنمائے دکن نئے اخبار ہیں۔

مدراس میں آزادی سے پہلے بھی صرف ایک ہی روزنامہ "مسلمان" موجود تھا۔ جو ۱۹۲۷ء میں چھپنا شروع ہوا تھا۔ اور آج چالیس سال بعد بھی یہی واحد روزنامہ اس صوبے سے شائع ہو رہا ہے۔

آسام، ہریانہ، راجستھان، گجرات، کیرالہ، اور اڑیسہ چھ ایسی ریاستیں ہیں۔ جہاں سے اردو کا کوئی روزنامہ شائع نہیں ہو رہا لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ ان علاقوں میں اردو اخبارات و رسائل کی مانگ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان علاقوں میں ایسے وسائل نہیں ہیں کہ وہاں سے روزانہ اخبار نکالا جا سکے۔ نیز اردو طباعت کیساتھ ساتھ خبر رسانی اور اشتہارات کی سہولتیں بھی ان علاقوں میں قدرے کم ہیں۔ اس کے علاوہ ان پردیشوں کی ضرورت پڑوسی پردیشوں سے نکلنے والے اخبارات سے پوری ہوتی رہی ہے۔ آسام کی ضرورت مغربی بنگال سے نکلنے والے اخبارات سے پوری ہوتی ہے۔ جبکہ اڑیسہ کا اردو خواں طبقہ مغربی بنگال اور بہار کے اخبارات سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ راجستھان میں پنجاب دہلی اور بمبئی کے روزنامے پہنچ جاتے ہیں۔ ہریانہ جو پہلے پنجاب کا ہی ایک حصہ تھا۔ وہاں سے ابھی کوئی روزنامہ شائع نہیں ہوتا۔ لیکن توقع ہے کہ مستقبل قریب میں اس پردیش کی یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ بہرحال ابھی تک دہلی اور پنجاب کے اخبار اس کی ضرورت پوری کر رہے ہیں

اردو صحافیوں میں دیوان سنگھ مفتون ایک انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا شمار ملک کے بے باک اور نڈر صحافیوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے ہفتہ وار ریاست کو ہمہ گیر شہرت حاصل تھی۔ یہ ممتاز جریدہ عوام میں ہی نہیں بلکہ ریاستی راجاؤں اور نوابوں میں بھی بے حد مقبول تھا مگر آزادی کے بعد یہ رسالہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ لاہور کا مقبول ہفتہ وار پارس ہجرت کے کچھ عرصہ بعد تک دہلی سے باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا لیکن بعد ازاں لالہ کرم چند کی وفات کے ساتھ ہی اس کی بھی موت ہو گئی۔ شمع کے مالک و مدیر یوسف دہلوی نے دہلی سے



دیوان سنگھ مفتون سابق ایڈیٹر ریاست دہلی

ایک مصور ہفتہ وار آئینہ کا اجرا کیا جس کی ادارت کے فرائض ظ۔ انصاری سرانجام دیتے رہے۔ اپنی طرز کا یہ خوبصورت جریدہ اپنے گٹ اپ، تقالوں، فیچروں، اور مضامین کی وجہ سے بہت جلد اردو قارئین میں مقبول ہو گیا تھا لیکن تھوڑی مدت بعد ملازمین اور مالکان کے جھگڑے کی وجہ سے بند ہو کر رہ گیا۔ بعد ازاں ظ۔ انصاری نے بمبئی سے آئینہ کا از سرِ نو اجرا کیا تھا۔ مگر یہ جاری نہ رہ سکا۔ دہلی سے مولانا عبدالوحید صدیقی نے ایک ہفت روزہ "ہمت" نکالا تھا مگر وہ بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ روزانہ تیج نے ایک عمدہ گیٹ اپ کا ہفتہ وار اخبار "فلم آرٹ" نکالا تھا۔ مگر وہ بھی زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا۔ مشہور صحافی مولانا عبدالباقی نے دہلی سے ایک معیاری اور دیدہ زیب ہفتہ وار "کاروانِ وطن" کا اجرا کیا تھا جس سے اردو قارئین کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں مگر باقی صاحب کی موت کے بعد ہی یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ متعدد ہفتہ وار اخبار اس بیس برس کے عرصہ میں شائع ہوئے اور بند ہو گئے۔ پھر بھی اسوقت بہت سے ممتاز اور قابلِ ذکر ہفتہ وار جریدے ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہو رہے ہیں بمبئی سے انگریزی ہفت روزہ بلٹز کا اب اردو ایڈیشن

بھی شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت اس کے ایڈیٹر اختر حسن ہیں۔
اسی طرح دہلی سے صاحبزادہ ممتحن فاروقی کا ہفت روزہ 'پیام مشرق' اور سید انیس الرحمٰن کا پرچم ہند اور میر مشتاق کا ایشیا باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اسوقت ہندوستان سے ساڑھے تین سو ہفتہ وار اخبار چھپ رہے ہیں۔ جبکہ متحدہ ہندوستان میں صرف اڑھائی سو ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے تھے۔ اسوقت شائع ہونے والے ہفت روزوں میں مذکورہ بالا کے علاوہ ہماری زبان (علیگڑھ) سرفراز (لکھنؤ) حیات (دہلی) شرارے (حیدرآباد) شعور (حیدرآباد) للکار (دہلی) اجالا (کلکتہ) قلم (کلکتہ) چترا (دہلی) ہند (جالندھر) جگت (دہلی) کارواں (بنگلور) نشیمن (بنگلور) کہکشاں (بمبئی) مورچہ (گیا) قومی تنظیم (پٹنہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان بن جانے سے ہم ادب لطیف' ادبی دنیا' عالمگیر' ساقی' ہمایوں ایسے بلند پایہ اور ممتاز رسائل سے محروم ہو گئے ہیں لیکن اس کے باوجود اردو رسائل کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اور بہت سے معیاری اور ممتاز رسائل ہمارے ملک سے شائع ہوئے ہیں۔
متحدہ ہندوستان سے صرف پونے دو سو جرائد چھپتے تھے۔ جبکہ آج ان کی تعداد ۴۰۰ کے قریب ہے۔ اس تعداد میں وہ رسائل شامل نہیں۔ جو گذشتہ بیس سال کے دوران عالم وجود میں آئے اور کچھ عرصہ تک شائع ہونے کے بعد بند ہو گئے۔



خوشتر گرامی
ایڈیٹر
'بیسویں صدی' دہلی

بہرحال اسوقت ہندوستان سے علمی' ادبی' مذہبی' دینی' نفسیاتی' جنسیاتی' فلمی ہر موضوع کے جرائد کی اشاعت ہو رہی ہے۔ گفتگو' اردو ادب' معارف' برہان' شیرازہ' بیسویں صدی' شمع' آستانہ' بانو' ہما' شاعر' صبح' صبح نو' تحریر' صبا' تحریک' کھلونا' مولوی' دین دنیا' سب رس' کتاب' شب خون' نیا دور' مریخ اور پاسبان ان لاتعداد رسائل میں سے چند ہیں جنہیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد اردو اخبارات و رسائل نے جو غیر معمولی ترقی کی ہے اس کا اندازہ پریس رپورٹ کی رجسٹرار سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں وہ پریس رجسٹرار کی ساتویں رپورٹ سے لئے گئے ہیں جس میں ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک کے اعداد درج ہیں۔ تعداد اشاعت (سرکولیشن) کے متعلق پریس رجسٹرار نے صراحت کر دی ہے کہ یہ اعداد اخباروں نے خود بھجوائے ہیں۔ اور ان کے پاس ان کی جانچ پڑتال کا کوئی وسیلہ نہیں ہے موازنے کے خیال سے ۱۹۴۷ (قبل تقسیم) کے اعداد بھی دیئے گئے ہیں۔

	روزآنہ	ہفتہ وار	ماہنامہ و دیگر رسائل	سرکولیشن
۱۹۴۷	۹۰	۲۸۸	۱۷۰	اعداد دستیاب نہ ہوسکے
۳۱ دسمبر ۶۶ء	۸۳	۳۴۱	۳۶۱	۳۱ء۹ لاکھ

آزادی سے قبل کسی روزنامے کی اشاعت ۱۰ ہزار سے زائد نہ تھی۔ مگر اب کئی روزنامے دس ہزار سے زائد شائع ہو رہے ہیں۔ اور بعض کی اشاعت ۳۰ ہزار سے زائد ہے۔ روزنامہ پرتاپ نئی دلی اور جالندھر کی مشترکہ اشاعت ۴۸ ہزار سے زیادہ ہے۔ اور ملاپ جالندھر' دہلی اور حیدرآباد کی مشترکہ اشاعت ۴۵ ہزار کے قریب ہے۔ اس طرح دیگر رسائل کی اشاعت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ شمع کی اشاعت ۷۰ ہزار کے قریب بتائی گئی ہے۔



یوسف دہلوی
مدیر اعلیٰ 'شمع' نئی دہلی



رنبیر
ایڈیٹر ملاپ نئی دہلی

چند کثیر الاشاعت اخباروں اور رسالوں کے اعداد جنکی اشاعت دس ہزار سے زائد ہے۔ نیچے درج کئے گئے ہیں۔

اخبار

پرتاپ نئی دلی	۳۲۲۷۵	کل ۴۸۱۹۲
پرتاپ جالندھر	۱۵۹۵۷	
ملاپ نئی دھلی	۲۶۴۶۶	کل ۴۴۳۵۶
ملاپ جالندھر	۱۳۳۹۴	
،، حیدرآباد	۴۴۹۶	
ہندسماچار جالندھر	۱۷۶۲۳	
پردیپ جالندھر	۱۱۰۹۶	
صدائے عام پٹنہ	۱۰۲۵۰	
انقلاب بمبئی	۱۰۷۶۴	

رسائل

ہفتہ وار بلٹز بمبئی	۱۴۳۰۸	
ہفتہ وار نشیمن بنگلور	۱۰۱۸۴	
ماہنامہ شمع نئی دہلی	۶۹۳۳۳	
آستانہ دہلی	۵۲۲۵۰	
بیسویں صدی نئی دہلی	۲۲۹۵۸	
ہما ،،	۱۶۲۳۳	
دین دنیا ،،	۱۹۶۶۸	
مولوی نئی دہلی	۱۲۸۷۵	(اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد جن رسائل

آج کل دہلی (اردو نمبر)

کا اجراء ہوا ان کی تعداد نہیں دی جاسکی ہے۔)

صرف اخبارات و جرائد کی اشاعت میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ ان کے معیار اور گٹ اپ میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ مگر ابھی اس طرف مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اردو اخباروں اور رسائل کی تعداد اور ان کی اشاعت بڑی حوصلہ افزا ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی حالات اطمینان بخش نہیں۔ اردو رسائل کی طباعت و کتابت کا معیار بلند ہوا ہے۔ مگر زیادہ تر روزنامے صوری حسن سے یکسر عاری ہیں۔ لیتھو کی خراب چھپائی ادنی کتابت صفحوں کی ترتیب کے ساتھ ساتھ خبروں کے پیش کرنے کا ڈھنگ اداریتی تحریر سبھی کچھ توجہ طلب ہے۔

اردو کے بہت کم اخبار ہیں جو ٹیلی پرنٹر کے ذریعے خبریں حاصل کرتے ہیں۔ یا جن کے نامہ نگار بیرون ملک تو کیا ملک کے مختلف حصوں میں بھی ہوں۔ تصویریں کارٹون نیوز فیچر تصویری فیچر سے اردو اخباروں کی اکثریت خالی ہوتی ہے۔ عام طور پر اردو اخبار ۴ صفحے کا ہوتا ہے جس پر موٹی موٹی شاہ سرخیاں بہت ساری جگہ گھیر لیتی ہیں۔ اخباروں میں زود نویس کاتبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عام طور سے اچھے کاتب اخباروں میں کام نہیں کرتے وہ کتابیں لکھتے ہیں۔ پھر کاپیاں جوڑنے میں احتیاط نہیں برتی جاتی۔ بقیہ صفحہ فلاں پر شاید ہی نظر آتا ہے۔ پروف ریڈنگ کی طرف بہت کم اخباروں میں توجہ دی جاتی ہے لہذا ایسی خامیاں جو محض توجہ اور محنت سے دور کی جاسکتی ہیں۔ ان کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا جاتا۔

اخبار نکالنے کے محرکات الگ الگ ہوتے ہیں۔ اردو اخبارات زیادہ تر افراد کے ہاتھوں میں ہیں۔ اور افراد کے اپنے مقاصد اور مصالح ہوتے ہیں "اخبار اس لئے نہیں نکالا جاتا کہ ان کی کوئی ضرورت ہے۔ اس لئے بھی نہیں کہ کسی نقطہ نظر یا اظہار خیال کی ضرورت ہے، بلکہ اس لئے نکالا جاتا ہے کہ کوئی ایسا شخص جس کے پاس سرمایہ ہے وہ حصول اقتدار کا خواب دیکھتا ہے" اور ملکی معاملات میں دخل در معقولات کرنا چاہتا ہے۔ جس کا وہ کسی اور صورت میں اہل نہیں ہے ایسی صورت میں قدرتی امر ہے کہ عوامی مفاد ذاتی مفاد پر قربان ہو جائے

سیاسی مقاصد کے تحت مختلف سیاسی پارٹیوں کا اپنا اپنا آرگن ہے یہ اخبارات پارٹی کے مفادات کیلئے نکالے گئے ہیں۔ لہذا اپنی پارٹی کے مقاصد

ع۱ ایم۔ چلاپتی راؤ۔ پریس ان انڈیا۔

کو پورا کرتے ہیں۔

مگر زیادہ تر اخبار ایسے ہیں۔ جو آزاد پالیسی رکھتے ہیں، اور وہ ملکی وغیر ملکی مسائل پر حسب توفیق روشنی ڈالتے ہیں۔ اکثر اخباروں کے اداریے سے پڑھنے والوں کو کوئی روشنی نہیں ملتی بلکہ اکثر صورتوں میں وہ اپنے پڑھنے والوں کو غیر ضروری باتوں میں الجھا دیتے ہیں یا جذباتیت سے کام لے کر اُن میں اشتعال پیدا کرتے ہیں۔ اور بعض اخبار فرقہ پرستی، نفاق اور منافرت کی تشہیر کرتے ہیں۔ ہر پیشے کے لئے قابلیت اور اہلیت کے کچھ معیار ہوتے ہیں۔ مگر صحافی بننے کے لئے صرف ہاتھ میں قلم ہونا کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

یہی وہ کمیاں ہیں جن کی وجہ سے پڑھا لکھا اور سنجیدہ طبقہ اردو اخبار نہیں خریدتا۔ جن علاقوں میں اردو کے اچھے اخبارات ہیں یقیناً وہاں ان کی مانگ ہے۔ اور ایسے اخبارات کی اشاعت اطمینان بخش ہے۔

پریس رجسٹرار کی رپورٹ (۱۹۶۷) کے مطابق ہندوستان سے اردو کے ۸۳ روزنامہ نکل رہے ہیں جن کی مجموعی اشاعت ۸٫۳ لاکھ ہے۔ ہفتہ وار رسالوں کی تعداد ۳۴۱ اور تعداد اشاعت ۱۹٫۳ لاکھ اور دیگر رسائل کی تعداد ۳۶۱ اور سرکولیشن ۴٫۳ لاکھ یعنی مجموعی اشاعت ۳۱٫۹ لاکھ ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ایسے لوگوں کی تعداد جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ۲ کروڑ ۳۳ لاکھ ۵ سو ۱۸ ہے۔ (ان میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جن کی مادری زبان تلگو پنجابی یا اور کوئی زبان ہے مگر جو اردو اخبارات اور رسائل خریدتے اور پڑھتے ہیں)۔ اب اس کے مقابلہ میں اردو کے اخبارات ورسائل کے مجموعی سرکولیشن کو دیکھا جائے تو یہ صورت بڑی غیر اطمینان بخش معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اردو اخباروں کو بہتر بنایا جائے تو اُن کی اشاعت میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ انگریزی کی تعلیم اور اثر روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔ اور کم ہوتا جائیگا۔ اس خلاء کو پُر کرنے کیلئے اردو اخباروں کو بڑی حد تک اپنے معیار (صوری اور معنوی) کو بلند کرنا ہوگا۔ ورنہ اسکی جگہ دوسری زبانوں کے اخبار لے لیں گے۔ کیونکہ اب کوئی ایسا طبقہ وجود میں نہیں آرہا ہے۔ جو صرف اردو ہی جانتا ہو۔ بلکہ دو لسانی طبقہ پیدا ہو رہا ہے جو اردو کے ساتھ ساتھ اپنی علاقائی زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ معیار کی بلندی کے لئے سرمایہ ضروری ہے۔ اور سرمائے کی فراہمی اشتہار اور سرکولیشن کے ذریعے ہی ممکن ہے بڑی بڑی کمپنیاں چھوٹے اخبارات کو اشتہار نہیں دیتیں۔ جو مقامی اشتہارات شائع ہوتے ہیں وہ اکثر بھائی چارے کے ناتے معمولی نرخوں پر شائع کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے اخباروں کو فی الحال بڑے پیمانے پر اشتہارات ملنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کی صنعتی ترقی ابھی اتنی نہیں ہوئی ہے اور صنعتیں بڑے بڑے شہروں میں مرکوز ہیں۔ لہٰذا آمدنی کا ذریعہ سرکولیشن میں اضافہ ہی ہو سکتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ مقامی دلچسپی کی خبریں شائع کی جائیں۔ رسل ورسائل کی بڑھتی ہوئی سہولتوں سے بھی تعداد اشاعت میں اضافہ ممکن ہے۔ اردو اخبارات اور رسائل کی بڑی رکاوٹ اس کے ایجنٹ ہیں۔ ایجنٹوں میں اکثر ایسے لوگ ہیں۔ جو باقاعدگی سے اخباروں کو ترسیل زر نہیں کرتے۔ بعض اچھے اخباروں اور رسالوں کے بند ہونے کی وجہ یہی بتائی گئی ہے کہ ایجنٹوں نے روپیہ نہیں بھیجا۔ ایجنٹ زر ضمانت جمع کرانے سے عام طور پر گھبراتے ہیں۔ جن سے اخباروں کے مفاد کی حفاظت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایجنٹ زیادہ محنت نہیں کرتے۔ جتنے اخبار آسانی سے بک جاتے ہیں وہ بیچ دیتے ہیں بکری بڑھانے کے سلسلہ میں کوئی خاص کد و کاوش نہیں کرتے۔ اخباروں کا رابطہ اپنے پڑھنے والوں سے ایجنٹوں اور نامہ نگاروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اخباروں کے ایجنٹ بڑا مفید کام انجام دے سکتے ہیں اور پڑھنے والوں سے رابطہ قائم کرکے اور ان کے ردعمل و تاثرات کا پتہ لگا کر وہ اخباروں کے مدیر کو مفید مشورے دے سکتے ہیں۔

اردو اخبار ورسائل کا دوسرا کمزور پہلو اُن کا انتظامی پہلو ہے۔ چھوٹے چھوٹے اخبارات میں ایک ہی شخص مالک مدیر مترجم منیجر سبھی کچھ ہوتا ہے ظاہر ہے ہر شخص نیاز فتح پوری یا عبدالباقی نہیں ہو سکتا کہ وقت ضرورت سارا رسالہ خود لکھ ڈالے۔ اس صورت میں بھی انتظامی پہلو توجہ طلب رہ جاتا ہے۔ جہاں کہیں سرکولیشن منیجر ہیں وہ بھی کاروبار کے جدید طریقوں

کو نہیں اپناتے۔ یا مالی مشکلات کی وجہ سے نہیں اپنا پاتے۔ کتنے اخبار ہیں جن کے ریٹ کارڈ (نرخنامہ اشتہارات) ہیں۔ اور اگر ہیں۔ تو وہ خوبصورت اور دیدہ زیب طریقہ سے شائع کئے گئے ہیں۔ کتنے اخبارات و رسائل ہیں جن کے پاس ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں اور لائبریریوں کے مکمل پتے ہیں۔ ہر کاروبار کے کچھ اصول اور ضابطے ہیں اور بغیر ان کو اپنائے ہوئے کامیابی ناممکن ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو اخباروں اور رسائل کے اجراء کو کاروبار نہیں اردو کی خدمت سمجھا جائے۔ لیکن پھر صلے پر اصرار کیوں ہو۔ جن اخباروں اور رسالوں نے کاروباری طریقوں کو پیش نظر رکھا ہے اور انتظامی شعبے کی اچھی طرح نگرانی کی ہے انہوں نے اس میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اگر اردو کے ان مشہور و معروف ادیبوں نے جنہوں نے رسالے نکالے اور ناکام رہے۔ ایک اچھا بزنس منیجر رکھ لیا ہوتا اور خود کو صرف ادارتی معاملات تک محدود رکھا ہوتا تو یقیناً نتائج دوسرے ہوتے۔

ادبی کتابوں کی طرح ادبی رسالوں کے فروخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ گو کہ اب کتاب "شب خون" اور "گفتگو" کے اجراء کے بعد یہ بات بھی محل نظر ہے۔ بہرحال اس سلسلہ میں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ ہمارے ادبی رسالوں کا ایک مخصوص پیٹرن کیوں بن گیا ہے۔ یعنی چند مقالے افسانے نظمیں "غزلیں اور تبصرے یہ پیٹرن پڑھنے والوں میں مقبول نہیں ہے۔ کچھ ادبی رسالے ایسے شائع ہونے چاہئیں جن میں صرف کہانیاں نظمیں یا مقالے ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں "ادبی تبصرے" کا اجراء فال نیک ہے۔

کھیل کود سے متعلق ایک، عورتوں کے لئے دو، تین" اور بچوں کے لئے پانچ چھ رسالے نکلتے ہیں۔ مثلاً صنعت و حرفت تجارت اور زراعت سے متعلق رسالے کیوں نہیں نکلتے۔ امریکہ کے ایک اخبار نے اپنے حلقہ کے ایسے تمام افراد کی فہرست شائع کی تھی جنہیں انکم ٹیکس کے نئے قانون کے تحت ریلیف مل سکتی تھی۔ اور یہ فہرست اس اخبار نے اشتہارات نقصان کر کے شائع کی۔ مگر اس سے اتنی آمدنی ہوئی کہ جو اشتہار سے ممکن نہ تھی۔ اسی طرح تجارت، زراعت سے متعلق بیسیوں مسائل ہیں جن کی طرف رہنمائی کی جا سکتی ہے اور پڑھنے والوں کو مفید مشورے دیئے جا سکتے ہیں۔ جب بھی کوئی نیا رسالہ نکلتا ہے۔ تو وہ ادبی ہی ہوتا ہے۔ اور اس پیٹرن کا حامل ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اب ڈائجسٹ کی مقبولیت نے کچھ تنوع پیدا کیا ہے۔ مگر یہاں پھر ایک "ٹائپ" وجود میں آ گیا ہے۔ اور ایک ڈائجسٹ دوسرے ڈائجسٹ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لہٰذا ایک حد کے بعد ان کی اشاعت بھی بڑھ نہ سکے گی۔ ضرورت ہے کہ نقالی سے قطع نظر کر کے جدت پسندی اور تنوع سے کام لیا جائے۔ اور نئے میدانوں کی تلاش کی جائے۔ حالیہ برسوں میں جن افراد یا اداروں نے مناسب سرمائے اور نئے پن کے ساتھ کسی رسالے کا اجراء کیا ہے۔ خاصے کامیاب ہوئے ہیں۔ اردو کتابیں ہوں یا رسالے محض ہمدردی کے طور پر یا اردو کی خدمت کے خیال سے نہیں خریدے یا بیچے جا سکتے۔ ان میں اتنی کشش اور خوبی ہونی چاہئے۔ کہ وہ اپنے کو خرید وا سکیں۔

حکومت ہند نے چھوٹے اخبارات و رسائل کی مدد کے سلسلے میں متعدد اقدامات کئے ان کا ایک اجمالی خاکہ بھی اس سلسلہ کی ایک ضروری کڑی ہے۔

آزادی کے بعد پریس کمیشن کا قیام اور پریس رجسٹرار کا تقرر وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت تھی۔ پریس رجسٹرار کے تقرر سے ہندوستان کی پوری صحافتی تاریخ مرتب ہو گئی ہے اور بڑے بیش بہا اعداد و شمار دستیاب ہوئے ہیں۔ اس دفتر سے ہر سال ایک ضخیم رپورٹ شائع ہوتی ہے۔ جو ایک لحاظ سے ایک برس کی مکمل صحافتی تاریخ ہوتی ہے جس میں اخبارات و رسائل سے متعلق تمام ضروری جانکاری درج ہوتی ہے۔

اردو صحافت کی ترقی و ترویج کا ذکر کرتے ہوئے پریس انفارمیشن بیورو کے شعبۂ اردو کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آزادی سے پیشتر اخبارات کو خبروں کے معاملے میں سرکاری طور پر کوئی قابل ذکر مدد نہ ملتی تھی اور صرف ایک اخبار اطلاعات ہی سرکاری خبروں کا محدود وسیلہ تھا۔ آزادی کے بعد اس خبرنامے کو بند کر کے اطلاعات فراہم کرنے کے لئے پریس انفارمیشن بیورو کا اردو سیکشن قائم کیا گیا جو صرف سرکاری سرگرمیوں کا ہی ترجمان نہیں بلکہ اردو اخبارات و رسائل کا زبردست معاون و مددگار ہے۔ یہ ادارہ حکومت اور اردو پریس کے درمیان ایک اہم کڑی ہے۔ اہم سرکاری خبروں کے علاوہ یہ محکمہ آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقی کی تصاویر اور فیچر کے ساتھ ساتھ ادبی سماجی اور سیاسی مسائل سے متعلق دلچسپ اور کارآمد مضامین بھی فراہم کرتا ہے۔

(بقیہ ص ۷۵ پر)

ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت اور کاروبار

آزادی کے بعد

شہباز حسین

کسی فرد، گروہ یا قوم کی ذہنی حالت، تہذیبی کیفیت اور ارتقا کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کیسی کتابیں پڑھتی ہے صحت مند معاشرے میں ادب کی اعلیٰ قدریں پروان چڑھتی ہیں اور صالح ادب کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اردو کتابوں کا مسئلہ بھی معاشیات کے اصول طلب اور رسد کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔ بہرحال اس بنیادی بات سے صرف نظر کرتے ہوئے اس مضمون میں اردو کتابوں کی اشاعت اور کاروبار کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے جس کا مقصد یہ جاننا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت اور فروخت کی کیا صورت ہے اور آبادی اور تعلیم میں عام اضافے کے اردو پر کیا اثر پڑے ہیں۔ یہ کاروبار کن مسائل و مشکلات سے دوچار ہے اور کس طرح ان کو دور کیا جا سکتا ہے۔

یہ جائزہ کسی لحاظ سے مکمل نہیں ہے کیوں کہ اس کے لئے جتنے وقت، محنت اور وسائل کی ضرورت تھی، وہ مہیا نہ کر سکے بڑی حد تک اردو کے ناشروں نے بھی تعاون نہیں کیا۔ بہرحال میرا مقصد یہ تھا کہ اس سلسلے میں چند ایسے امور کی نشاندہی ہو جائے جن کی طرف ناشروں، اردو تنظیموں اور اردو کے ہمدردوں کو بطور خاص توجہ دینی چاہیے۔

جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ ناشروں سے خط و کتابت اور مقامی ناشروں سے تبادلۂ خیالات کے بعد کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے اردو کے دوسرے مرکزوں کے حالات مختلف ہوں بہرحال جو عمومی باتیں کہی گئی ہیں وہ بڑی حد تک تمام ناشروں پر صادق آتی ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت اور کاروبار کا جائزہ ایک بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ خصوصاً جبکہ معلومات حاصل کرنے کے ذرائع نہیں کے برابر ہیں۔ اس سلسلے میں راقم الحروف نے اردو کے تقریباً ڈیڑھ سو ناشروں کو (اتنے ہی پتے ہم اکھٹے کر سکے) ایک گشتی مراسلہ بھیجا تھا، جن میں مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب طلب کیے گئے تھے۔

۱۔ گزشتہ بیس سال میں آپ کے ادارے کی جانب سے کتنی کتابیں شائع کی گئیں۔؟

۲۔ کتنی جلدیں فروخت ہوئیں؛ صحیح تعداد کا تعین مشکل ہو تو اندازاً لکھیے۔

۳۔ کون سی صنف زیادہ مقبول ہے ؛

۴۔ آپ کے خیال میں اردو کتابیں کم بکنے کی وجہ کیا ہے ؟ صورت کی بہتری کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔؟

۵۔ مصنف کو رائلٹی دیئے بغیر (خصوصاً پاکستانی مصنفوں کی) کتابوں کی اشاعت کی وبا، عام ہے۔ اس کو کس طرح روکا جا سکتا ہے ؟

۶۔ ہندوستان کی کس ریاست میں اردو کی کتابوں کی کھپت سب سے زیادہ ہوتی ہے ؟ ترتیب وار تین ریاستوں کے نام لکھئے۔

۷۔ کیا پاکٹ بک کتابوں کی اشاعت سے معیاری اور ضخیم کتابوں کی مانگ کم ہو گئی ہے۔؟ کیا پاکٹ بک کتابوں کی اشاعت کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے ؟ ہاں اور نہیں دونوں صورتوں میں دلائل دیجئے۔

۸۔ کیا آپ کا ادارہ اردو کی درسی کتابیں بھی شائع کرتا ہے ؟ اگر کرتا ہے تو اردو کی درسی کتابوں کی مانگ میں اضافہ یا کمی ہوئی ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں بہت کم جوابات موصول ہوئے (تقریباً ۱۵ فیصد) بار بار یاد دہانیوں کے باوجود شمالی اور جنوبی ہند کے بعض بڑے بڑے اداروں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہرحال، مختلف فہرست کتب کے مقابلے اور موازنے اور ناشروں کی بھیجی ہوئی فہرستوں کی بنیاد پر ہم نے جو اندازہ لگایا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو میں لگ بھگ دس ہزار کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں نظموں اور غزلوں کے مجموعے، افسانے ناول، ڈرامے، تحقیق و تنقید، مذہبی کتابیں، بچوں کی کتابیں اور درسی کتابیں سبھی شامل ہیں۔ کتابچوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر روز اردو کی تقریباً ۲ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ملک میں خواندگی کے اوسط کے مقابلے میں یہ تعداد حوصلہ افزا کہی جا سکتی ہے۔ مگر اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اردو کی جو کتابیں شائع ہوئی ہوں یا آئندہ شائع ہوں ان کی ایک مکمل اور مستند فہرست تیار کی جائے۔ یوں تو پریس اینڈ رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۹۰ء کی دفعہ ۹ کے تحت یہ ضروری ہے کہ جو کتاب شائع ہو اشاعت کے تیس دنوں کے اندر اس کی جلدیں افسر مجاز کو بھیجدی جائیں جو اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں نے مقرر کئے ہیں۔ نہ بھیجنے کی صورت میں ۵۰ روپے کا جرمانہ رکھا گیا ہے مگر پبلشر اس کی پوری طرح پیروی نہیں کرتے۔ ہم نے ایک دو جگہوں کے پریس آفیسروں سے معلومات حاصل کی تو معلوم ہوا کہ بڑی کم تعداد میں کتابیں ان کو بھیجی جاتی ہیں۔ اس طرح The Delivery of Books and News-paper (Public Libraries) Act 1954. کی دفعہ ۳ کے تحت نیشنل لائبریری کلکتہ اور تین دیگر لائبریریوں (۱) کونی مارا لائبریری مدراس (۲) پارلیامنٹ لائبریری، نئی دہلی اور (۳) بمبئی کی ایک لائبریری کو مطبوعہ کتاب کی ایک ایک جلد بلاقیمت بھیجنا لازمی ہے۔ اس قانون پر عمل نہ کرنے والوں کے لئے بھی پچاس روپے کا جرمانہ رکھا گیا ہے مگر ان لائبریریوں کو کتنی کتابیں بھیجی جاتی ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ ابھی نیشنل لائبریری کلکتہ نے ANNUAL VOLUME شائع کیا ہے جس میں ۱۹۶۲ء میں موصول ہونے والی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ (صفحہ ۳۷۲-۳۶۶) اور اس میں اردو کے عنوان سے جو اندراجات ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ اردو ایسیز کی کتابیں ۴، اردو ڈرامہ ایک، اردو ناول اور مختصر افسانوں کے مجموعے ۲۴۔ نظموں اور غزلوں کے مجموعے ۴۰۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لائبریریوں کو بھی ہر شائع شدہ کتاب نہیں بھیجی جاتی۔

اردو کی کتابیں اداروں سے زیادہ افراد شائع کرتے ہیں۔ اکثر ایسی کتابیں اپنے حلقے تک محدود رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسی صورت نہیں ہے جس سے یہ صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکے کہ گزشتہ ۲۰ سال میں اردو کی کتنی کتابیں شائع ہوئیں۔ کسی ادارے کو یہ مفید اور ضروری کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔

ہمارا دوسرا سوال تھا کہ کتنی جلدیں فروخت ہوئیں۔ ناشروں کے جواب سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ایک کتاب کا ایڈیشن عام طور سے ۲ سے ۳ سال کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ایڈیشن عام طور سے ایک ہزار کا ہوتا ہے جس میں ۷، ۸ سو کاپیاں فروخت ہوتی ہیں۔ باقی جلدیں ادموں، تبصرہ کے لئے رسالوں اور ممتاز افراد کو تحفتاً بھیجی جاتی ہیں۔ مشہور مصنفوں کی کتابیں ایک سال کے اندر بک جاتی ہیں۔ پاکٹ بک کتابوں کا ایک ایڈیشن ۲ سے ۵ ہزار تک کا ہوتا ہے اور ان کی نکاسی

ایک سال کے اندر رہ جاتی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ملا کہ مذہبی کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ اس کے بعد تفریحی جاسوسی اور جنسی کتابیں آتی ہیں۔ جہاں تک ادبی کتابوں کا تعلق ہے شاعری کے مجموعے اب بھی سرِ فہرست ہیں اس کے بعد ناولوں کا نمبر ہے پھر تنقید، افسانہ اور تحقیق کا۔ علمی موضوعات مثلاً سیاسیات، سماجیات، تاریخ اور دیگر سماجی علم کی کتابیں کم بکتی ہیں

چوتھا سوال یہ تھا کہ آپ کے خیال میں اردو کی کتابیں کم بکنے کی وجہ کیا ہے؟ اور صورتِ حال کی بہتری کی اور کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اس کے جوابات یہ ہیں۔

۱۔ "اُردو کو نظر انداز کرنے اور تعلیمی سہولتیں مہیا نہ کرنے کی وجہ سے اُردو پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔

۲۔ "یہ ایک ایسی علاقائی زبان ہے جس کا کوئی علاقہ مقرر نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں بہتری کی کوئی صورت ممکن نہیں"۔

ایک ناشر نے اس سوال پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جسے ہم نقل کر رہے ہیں:

"اردو کتابوں کی فروخت کم ہونے میں ناشرین اور خریدار دونوں کی کمزوریوں کا ہاتھ ہے۔ عام طور پر اُردو کتابوں کے ناشر مالی اعتبار سے کچھ زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔ وہ اگر کسی نہ کسی طرح کوئی کتاب شائع کر بھی دیتے ہیں تو پوری طرح اس کی پبلسٹی نہیں کر پاتے۔ جس کے نتیجے میں اچھی اچھی کتابیں بھی گوشۂ گمنامی میں پڑی رہ جاتی ہیں۔ اس قسم کے ناشروں میں کچھ ایسے ہیں جن کو اگر آگے چل کر مالی طور پر بے فکری ہو جائے تو ان میں قناعت کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور وہ مزید ترقی کے لئے کوشش نہیں کرتے۔ دوسری قسم کے ناشرین وہ ہیں جو دوسری زبانوں میں کتابیں شائع کرتے ہیں اور اگر اس دوران کوئی اردو کی کتاب ان کی نظر میں تجارتی نقطۂ نظر سے مفید معلوم ہوتی ہے تو اسے بھی شائع کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے لئے مناسب اور کافی پبلسٹی کرتے ہیں۔ ان کے پاس سے کتاب نسبتاً جلدی ختم ہو جاتی ہے ہندستان کا سب سے بڑا اردو کا اشاعتی ادارہ "منشی نولکشور بکڈپو لکھنؤ" جو اب راجہ رام کمار بکڈپو، اور تیج کمار بکڈپو نامی دو اداروں میں تقسیم ہو چکا ہے وہ بھی اُردو کے بارے میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ وہاں سے اب صرف ان ہی کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں جو عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ ان کتابوں کی بڑی تعداد مذہبی کتابوں اور قصے کہانیوں پر مشتمل ہے۔

"ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے ناشر فراخدلی کے ساتھ اُردو کتابوں کی اشاعت میں حصہ لیں۔ اُن کی کتابت وطباعت کا معیار بلند کریں (بعض کتابیں جن کی مختلف زبانوں میں ایڈیشن تیار ہوئے ہیں ان کے اُردو ایڈیشن کی ادنےٰ کتابت و طباعت بعض نفیس مزاج خریداروں کو خریدنے سے باز رکھتی ہے) اور ان کی کافی پبلسٹی کریں۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے ناشرین کو حکومت سے قرضے اور دوسری سہولیات مہیا کی جائیں تاکہ وہ مضبوطی کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں اور اپنی خواہش کے مطابق اعلیٰ علمی و ادبی کتابیں شائع کر سکیں۔

"خریدار بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم لائبریریاں ہیں جو اپنے ماحول اور پڑھنے والوں کے ذوق کے مطابق کتابیں خریدتی ہیں۔ جو لائبریریاں کالجوں اور اسکولوں سے متعلق ہیں۔ وہ تو صرف ان مخصوص مضامین کی کتابیں خریدتی ہیں جو ان تعلیمی اداروں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ چونکہ ذریعہ تعلیم اردو نہیں ہے اس لئے اردو کی صرف وہی کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ (اگر اس کالج یا اسکول میں اُردو کا شعبہ ہو) جو اردو ادب سے متعلق ہوں۔ اور افسوس یہ ہے کہ جدید علوم پر اُردو میں کتابوں کا زبردست قحط ہے۔ پبلک لائبریریز کے متعلق مجھے یہ کہنے کے لئے معاف فرمائیے کہ لائبریری کی انتظامیہ کی مرضی پر ہی اُردو کتابوں کے عدم یا وجود کا انحصار ہوتا ہے۔

"دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو ذاتی شوق کی بنا پر کتابیں خریدتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ خاص طور پر اُردو خواں حضرات میں ایسے لوگ اکا دکا ہی ملیں گے۔ جو اپنی روزمرّہ کی ضروریات سے فارغ ہو کر کتابیں خریدنے کے لئے رقم نکال سکیں۔ جو لوگ مالی اعتبار سے خوش حال ہیں، اُن سب میں علمی ذوق نہیں۔ کیوں کہ ان میں بڑی تعداد کاروباری اور تجارت پیشہ حضرات کی ہے۔ جو کتابیں پڑھنے کے بجائے "عملی" ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں پھر جو طبقہ مالی لحاظ سے بھی

فارغ البال ہے اور علمی ذوق بھی رکھتا ہے اور اسے اعلیٰ معیاری کتابیں میسر نہیں آتیں۔ وہ اُردو کتابیں خریدنے کے بجائے ان موضوعات پر دوسری زبانوں کی (بلکہ انگریزی کی) کتابیں خریدتا ہے جن سے اس کی علمی تشنگی کی تسکین ہوجاتی ہے۔ اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو صرف اُردو جانتے ہیں۔ یا بہرصورت یا بطور ہمدردی اُردو کی ہی کتابیں خریدنا چاہتے ہیں۔ اور اُن کے ہی تعاون سے اُردو کتابوں کا پورا کاروبار چل رہا ہے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ اور یہ طبقہ بھی اسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو اس وقت چل رہی ہے۔ اور کچھ عرصہ بعد ختم ہوجائے گی۔ آنے والی نسل کا بہت بڑا حصّہ اُردو سے ناواقف ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں اُردو تعلیم کو رواج دیا جائے۔ اور اُردو پڑھنے لکھنے اور بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ یہ کام حکومت کے تعاون کے بغیر ناممکن ہے۔"

۴۔ لوگ پڑھنے کے شوقین نہیں ہیں۔ خرید کر پڑھنے والے تو اور بھی کم ہیں۔

۵۔ ادب سے دلچسپی کا فقدان ہے۔ سطحی اور غیر مفید رسالے اور کتابیں خوبصورت گٹ اپ و آرائش کی وجہ سے نکل جاتی ہیں۔ خواہ موضوع کچھ ہو اس لئے کتاب کا صوری حسن دل کش ہونا چاہیے۔ کتابیں خوبصورت چھاپی جائیں۔

۶۔ "اُردو داں طبقہ مالی طور پر کمزور ہے۔

۷۔ "جب کتابیں مانگنے سے یا لائبریری سے آسانی سے مل جاتی ہیں تو خریدنے کی کیا ضرورت۔

۸۔ "مسلمانوں کے نسبتاً خوش حال طبقے کا ایک حصہ پاکستان چلا گیا کتابوں کی کھپت کا بڑا علاقہ (مغربی پنجاب) پاکستان کا حصّہ بن گیا۔ کتابیں پاکستان جانا بند ہوگئیں۔

۹۔ بیرونی ممالک خصوصاً امریکہ۔ روس، انگلستان وغیرہ سے روابط کی کمی۔ (اُردو کتابوں کی کھپت کے لحاظ سے)

۱۰۔ حالات حاضرہ اور عوام کے مسائل سے متعلق کتابیں شائع نہیں کی جاتیں۔

۱۱۔" یہ کہنا کہ اُردو کتابیں کم فروخت ہوتی ہیں یا اردو زبان کو زوال ہو رہا ہے غلط ہے۔ آزادی کے بعد سے ملک نے تعلیم کے میدان میں کافی ترقی کی ہے۔ میرے اکثر اعزّہ کلکتہ، کان پور، اور دہلی میں ناشر ہیں۔ بٹوارے کے بعد اُن کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ بلکہ ترقی آئی ہے۔"

جہاں تک اُردو کتابوں کے فروخت ہونے کا سوال ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آزادی کے بعد اُردو کتابوں اور اردو رسالوں کی اشاعت اور بکری میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ آزادی کے بعد ملک میں تعلیم کا پھیلاؤ اور ہر ریاست میں تعلیمی سہولتوں میں بے حد اضافہ ہے۔ پہلے اگر دس بچے تعلیم حاصل کرتے تھے تو اب پچاس بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہر جگہ اردو تعلیم کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان پچاس بچوں میں سے پچیس بچے اُردو نہیں پڑھ پا رہے۔ مگر پہلے کے پانچ کے مقابلے میں اب ان کی تعداد ۲۵ ضرور ہوگئی ہے۔ جس کا اندازہ لسانی کمشنر کی آٹھویں رپورٹ سے ہوسکتا ہے۔ کمشنر نے بہت سے ایسے امور کی طرف متعلقہ ریاستی حکومتوں کی توجہ دلائی ہے جو اردو تعلیم کے سلسلے میں مشکلات پیدا کر رہی ہیں اور ریاستی حکومتیں اس سلسلے میں ضروری اقدامات کر رہی ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق اردو ذریعہ تعلیم سے ابتدائی درجے میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

۱۔	اترپردیش (۱۹۶۴-۶۵ء)	۱؎ ۱۱۸۹۲۰
۲۔	بہار (۱۹۶۳-۶۴ء)	۲۹۴۸۱۵
۳۔	آندھرا	۱۵۳۷۶۵
۴۔	میسور	۲۴۵۸۸۳
۵۔	مہاراشٹر	۲۵۴۸۸۲
		۱۰۶۸۲۶۵

۱؎ یہ تعداد صرف ۳۹ ضلعوں کی ہے۔

ان ریاستوں کے علاوہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں اُردو میڈیم ہے یا صرف اُردو (بطور مضمون) پڑھنے والے بچوں کی تعداد خاصی ہوتی جب کئی لاکھ بچے اُردو پڑھ رہے ہیں تو حالات سے غیر مطمئن ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے۔

جو بچے ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد پیدا ہوئے وہ اس وقت ۱۷-۲۱ کے Age Group میں ہوں گے۔ (ایسے بچے جو اس وقت کتابیں رسالے پڑھنے کے قابل ہیں) اس عمر کے نوجوان تفریحی، رومانی، اور فلمی رسالے اور اس قسم کی کتابیں پسند کرتے ہیں اور ایسا مواد لاکھوں کی تعداد میں چھپتا اور بکتا ہے۔ لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ آزادی کے بعد کی نسل اُردو سے نابلد ہے۔ اردو کتابوں کی بکری کے سلسلے میں مسئلہ صرف یہ ہے کہ علمی و ادبی کتابوں کی بکری اتنی نہیں جتنی ہونی چاہئے۔ لہٰذا قوتِ خرید کی کمی کو بھی جواز کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ادبی رسائل تفریحی رسائل کے مقابلے میں کافی سستے ہیں مگر خریدے نہیں جاتے۔ اس لئے اصل مسئلہ یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے ذوق کو اس طرح سنوارا جائے کہ وہ اچھی اور معیاری کتابوں کا مطالعہ کریں۔ قوتِ خرید کے سلسلے میں یہ بات بھی ہے کہ اُردو داں طبقے کی قوتِ خرید کسی اور لسانی گروہ کے مقابلے میں بطورِ خاص کم نہیں کہی جا سکتی۔ یعنی بنگلہ* اور تامل بولنے اور پڑھنے والوں کے مقابلے میں اُردو والوں کی قوتِ خرید بطورِ خاص کم ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ملک کی معاشی حالت تمام لسانی گروہوں پر یکساں طور پر اثر انداز ہے۔

اردو کتابوں کی اشاعت بڑا غیر اہم بلکہ ایک بڑا سہل کام سمجھا جاتا ہے۔ جس کی جیب میں پانچ سات سو روپیہ ہوئے وہ اپنے افکارِ عالیہ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کے لئے بے چین سا ہو جاتا ہے اب جو رطب و یابس چھپ جائے وہ سب کیسے بک سکتا ہے اور بکنا بھی نہیں چاہئے۔ آجکل صاحبِ کتاب یا صاحبِ دیوان بننے کا شوق انتہا کو پہنچا ہوا ہے جس سے ملاقات ہوتی ہے وہ ناشر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس صورتِ حال سے ناشر بھی خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مصنف کے پیسے سے کتابیں شائع کرتے ہیں۔ اور اس کو اپنا احسان مند بناتے ہیں۔ رائلٹی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے لہٰذا کتابوں کی اندھا دھند اشاعت بھی صورتِ حال کو بگاڑنے کی ذمہ دار ہے۔

ہندوستان میں اُردو لائبریریاں کتنی ہیں۔ اس کی مکمل فہرست اُردو کے بڑے سے بڑے ناشر کے پاس نہیں ہے یہ اندازہ بڑی حد تک درست ہوگا۔ کہ سارے ملک میں چھوٹی بڑی دو تین ہزار صرف اردو کی لائبریریاں ہیں۔ ان میں اگر ایک ہزار کی مالی حالت درست سمجھ لی جائے اور ان سے ناشرین کا صحیح رابطہ قائم ہو جائے تو سنجیدہ کتابوں کی بکری میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

یونی ورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں اُردو اساتذہ کی تعداد کتنی ہے۔ اس کا بھی اندازہ کرنا چاہئے۔ ان کی مجموعی تعداد دو ہزار سے کم نہ ہوگی۔ آنرز اور ایم اے کے طلبا کی تعداد بھی قابلِ لحاظ ہے اس طبقہ سے بھی رابطہ ہونا چاہئے۔ کیوں کہ ادبی کتابیں اس طبقے کے درمیان بھی خاصی تعداد میں فروخت ہونی چاہئیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ادیب یا شاعر کتابیں اساتذہ کو مفت مہیا کرتے ہیں کیوں کہ اس حسن و سلوک کے بدلے وہ اچھے ریویو، یا رائے اور یونی ورسٹیوں اور کالجوں کی لائبریری کے لئے کتابوں کی خریداری کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس کے دو نقصان ہوتے ہیں۔ ایک تو ادبی دیانتداری پر آنچ آتی ہے اور پھر مفت کتابیں حاصل کرنے کا چسکا لگ جاتا ہے۔ جو کتابوں کی خریداری کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔

اُردو کی کتابوں کی بکری پر اثر انداز ہونے والی ایک چیز اور

* بحث گفتگو میں ایک بنگالی ادیب نے کہا کہ ہمارے یہاں شادیوں کے موقع پر Complete Works of Rabindra Nath Tagore یا Sarat Chander Chatterjee تحفے کے طور پر دینے کا رواج ہے جن کی قیمتیں ۱، ۲ سو روپے ہوتی ہیں۔

ہے اور وہ یہ ہے کہ اُردو کا پڑھا لکھا طبقہ انگریزی بھی جانتا ہے اور یہ طبقہ ایک حد تک خوش حال بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے وہ علمی، سائینسی اور دیگر علوم کے مطالعہ کا شوقین ہے تو وہ انگریزی کی کتابیں خریدتا یا پڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں ان علوم پر کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تھوڑی تعداد میں درسی کتابیں البتہ ہیں جو ظاہر ہے طلباء کی ضرورتوں کے پیش نظر لکھی گئی ہیں۔ یہی حال اخباروں اور رسالوں کا بھی ہے۔ ایسا طبقہ جو صرف اُردو جانتا ہے وہ خالص علمی موضوعات میں کم دلچسپی رکھتا ہے اور طبائع کے لحاظ سے وہ یا تو مذہبی لٹریچر پڑھتا ہے یا تفریحی۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں قسم کی کتابوں کی خاصی مانگ ہے۔ گذشتہ دس پندرہ سال میں جو پڑھا لکھا طبقہ تیار ہوا ہے۔ وہ انگریزی کی ناقص تعلیم کی وجہ سے ہندوستانی زبانوں کی طرف راغب ہو رہا ہے۔ تفریحی رسائل اور کتابوں کی اشاعت میں غیر معمولی اضافے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔

آزادی کے بعد جو معاشرہ تشکیل پذیر ہو رہا ہے ابھی اس نے کوئی قطعی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ پرانے اقدار کی شکست و ریخت تو ہو رہی ہے مگر نئے اقدار ابھی بن نہیں پائے ہیں۔ تعلیم کا طریقہ یکسر بدل گیا ہے پہلے ابتدائی تعلیم گھر پر دی جاتی تھی اور فارسی اور عربی کی تعلیم ضروری تھی۔ گھریلو ماحول علمی و ادبی تھا۔ خاندان مشترک تھے۔ اور علمی ذوق عام تھا جس سے بچوں کی ابتدا ہی سے مناسب ذہنی تربیت ہو جاتی تھی۔ اور وہ اپنے کلاسیکی سرمائے سے کم عمری میں ہی تھوڑی بہت شناسائی حاصل کر لیتے تھے۔ اب پڑھائی کنڈر گارٹن سے شروع ہوتی ہے۔ فارسی کی تعلیم ختم ہو گئی ہے۔ گھریلو ماحول بدل گیا ہے اور مشترک خاندان بڑی حد تک بکھر چکا ہے لہٰذا بچے اردو تو پڑھ لیتے ہیں مگر ان میں صحیح ادبی ذوق پیدا نہیں ہو پاتا۔

اُردو کتابوں کی طباعت اور گٹ اپ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔ اچھے سے اچھے ادارے کی طرف سے شائع شدہ کتابوں میں غلط نامے موجود رہتے ہیں۔ پروف ریڈنگ کی غلطیاں عام ملتی ہیں۔ کتابت معیاری نہیں ہوتی۔ اور کاغذ اور ڈسٹ کور وغیرہ کی خوبصورتی یا دلکشی پر توجہ نہیں دی جاتی۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُردو کتابوں کی اشاعت ۶۰ فی صدی افراد اور ۴۰ فی صد اداروں کے ہاتھوں میں ہے۔ لوگ کتابیں چھاپ تو لیتے ہیں مگر ان کے پاس اس کی نکاسی کے ذرائع نہیں ہوتے لہٰذا بعض اچھی کتابیں بھی پبلسٹی کے نہ ہونے کے باعث خریداروں تک پہنچ نہیں پاتیں۔ اس سے یہ غلط تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کی کتابیں نہیں بکتیں۔ لہٰذا اگر اُردو کی کتابوں کی اشاعت کو تسلی بخش بنانا ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ افراد چاہے اپنے خرچ سے کتابیں چھپوائیں۔ مگر اُن کی نکاسی کے لیے اچھے ادارے کی مدد ضرور لیں۔

اداروں کا حال بھی تسلی بخش نہیں۔ دہلی میں اُردو کے چند بڑے ناشر ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے خاصی تعداد میں ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی تال میل نہیں۔ کسی کے پاس اردو لائبریریوں، اداروں، انجمنوں، اور اہل ذوق حضرات کی فہرست نہیں ہے۔ انگریزی کتابوں کے ناشر اکثر جوابی کارڈ کے ذریعے اپنے کتابوں کے چھپنے کی اطلاع لوگوں کو دیتے رہتے ہیں۔ اردو ناشروں کو بھی یہ طریقہ اپنانا چاہیئے۔ اور کثیر الاشاعت اخباروں اور رسالوں میں کتابوں کے اشتہار باقاعدگی سے دینا چاہئیں۔ اُردو رسالوں میں بھائی چارے کے ناتے کچھ ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کے اشتہار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر تجارتی لحاظ سے یہ منافع بخش نہیں ہوتے۔ اس طرح اردو کی کتابیں وہی لوگ خرید پاتے ہیں جو اس کے لئے خاصی کاوش کرتے ہیں۔ دہلی کے ایک ناشر کو جب یہ مشورہ دیا گیا کہ چونکہ اب اُردو کی کتابوں کی ہندوستان سے باہر بھی کافی مانگ ہے اس لئے کیوں نہیں آپ کوئی ایسی صورت کرتے جس سے انگلینڈ، امریکہ، کناڈا ماریشس اور افریقہ وغیرہ، جہاں اُردو پڑھنے والے خاصی تعداد میں ہیں وہاں اُردو کتابوں کی نکاسی کا انتظام ہو جائے۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ یہ ہے۔ "اس میں بڑی مشکلیں ہیں۔ ہمارے پاس انگریزی کا ٹائپ رائٹر نہیں ہے ٹائپسٹ نہیں ہے بینک کے ذریعے کس طرح کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔ باہر کے ملکوں میں یہاں سے کتابیں بھیجنے کا کیا قاعدہ ہے اور وہاں سے رقم کس طرح آتی ہے اور وصول کی جاتی ہے میں ان تمام باتوں سے ناواقف ہوں اور نہ ہی میں ان جھمیلوں میں پڑنا چاہتا ہوں۔ میں اکیلا آدمی ہوں خود

منیجر ہوں خود ہی پیکر اور دفتری، یہیں کتابوں کی الٹ پھیر سے روزی مل جاتی ہے مصیبت میں کون پڑے"۔ یہ صرف ایک ناشر کا جواب نہیں ہے بلکہ عام صورت حال یہی ہے۔ دہلی میں ہونے کی وجہ سے اکثر احباب مجھے لکھتے ہیں کہ فلاں کتاب بھیج دیجیوں کہ ناشر کو خط لکھنے کے باوجود کتاب نہیں آتی ہے۔

اُردو کی کتابوں کے چند بڑے مرکز ہیں۔ دہلی، حیدرآباد، بمبئی، پٹنہ، بھوپال اور لکھنؤ۔ ان جگہوں کے ناشروں کا آپس میں کوئی تال میل نہیں ہے۔ دہلی کے چند ناشروں نے شکایت کی کہ حیدرآباد کے ناشر بار بار طلب کرنے کے باوجود اپنی کتابیں نہیں بھجواتے۔ لہٰذا اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اُردو کے ناشروں کی ایک کل ہند انجمن قائم کی جائے اس سے کئی اور کام کئے جا سکتے ہیں جنکی طرف آگے چلکر اشارہ کیا جائے گا

اُردو کتابوں کی قیمت مقرر کرنے اور کمیشن دینے کا مسئلہ بھی توجہ چاہتا ہے۔ زیادہ تر ناشر یہ کہتے ہیں کہ اب چونکہ بڑی بڑی کتابوں کی خریدار صرف لائبریریاں رہ گئی ہیں۔ اس لئے زیادہ قیمت رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ ڈھائی تین سو کاپیاں لائبریریوں میں بک جاتی ہیں۔ زیادہ قیمت ہونے کی وجہ سے ڈھائی تین سو کاپیوں کی بکری سے پورے ایڈیشن کی لاگت وصول ہو جاتی ہے۔ اور جو سو پچاس جلدیں اور بک جاتی ہیں تو وہ منافع بن جاتی ہیں۔ اس سے قطع نظر یہ ضروری ہے کہ قیمت کو مناسب حدود میں رکھا جائے۔ کیوں کہ بکری پر اس کا بھی خاصا اثر پڑتا ہے۔ پاکٹ بک کتابوں کی بکری کی ایک وجہ ان کی ارزانی ہے

اُردو کتابوں کی دوکانیں بھی توجہ چاہتی ہیں۔ عام طور پر ان کی تزئین اور سجاوٹ پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ دکان خواہ کسی چیز کی ہو تجارتی اصول اور قاعدے تو برتنے چاہئیں۔

پانچواں سوال مصنفوں کو رائلٹی دیئے بغیر یا پاکستان کے مصنفوں کی اجازت کے بغیر کتابیں شائع کرنے سے متعلق تھا اس وبا سے اُردو کتابوں کی تجارت پر بڑا برا اثر پڑ رہا ہے۔ آپ اُردو بازار (دہلی) میں جائیے تو اکثر دکانوں میں آپکو پاکستانی مصنفوں کی تازہ چھپی ہوئی کتابیں ملیں گی۔ اب تو ہندوستانی مصنفوں کی کتابیں بھی شائع ہونے لگی ہیں۔ ایسی ہی شکایت ہندوستانی ناشر بھی کرتے ہیں کہ ان کی کتابیں پاکستانی ناشر بھی شائع کر دیتے ہیں۔ اس مسئلے پر اخباروں اور رسالوں میں برابر لکھا گیا ہے۔ مگر اب تک کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جا سکا جس سے اس کو روکا جا سکے۔

کاپی رائٹ ایکٹ کے بین الاقوامی کنونشن پر ہندوستان اور پاکستان دونوں نے دستخط کئے ہیں۔ اور اس ایکٹ کی خلاف ورزی جرم ہے مگر غالباً اب تک ہندوستان یا پاکستان کے کسی مصنف نے اس قانون کا سہارا نہیں لیا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ خود مصنف اس ملک میں جاکر قانونی کارروائی کرے جہاں کاپی رائٹ کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ بلکہ اس کا کوئی ایجنٹ یا قانونی مشیر اس کی طرف سے قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ ہندمیں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عابد حسین اور قرۃ العین حیدر صاحبہ کی کتابیں ان کی اجازت اور علم کے بغیر چھپیں۔ انجمن ترقی اُردو، ہند کی تیار کردہ بڑی ڈکشنری بھی چھپ گئی۔ مگر ان ہندوستانی ادیبوں نے بھی ناشروں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں قانون کی مدد لی جائے۔ ادیب یہ کہتے ہیں۔ کہ مجرم کا پتہ لگانا آسان کام نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایسے کام کرنے والے غلط پتہ دیتے ہیں۔ یا بعض صورتوں میں اصل ایڈیشن کی نقل فوٹو آفسیٹ کے ذریعے کرتے ہیں۔ ممکن ہے پریس کا نام بھی غلط دیتے ہوں۔ اسٹاک کہیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی مقدمہ کرنا چاہے تو نوٹس یا سمن کا اجرا کس نام پر کرے۔ ایک کتاب پر پتہ دیا ہوا ہے "طارق پبلیکیشنز دہلی ۔۶" اب آپ ساری دلی میں ڈھونڈئیے۔ طارق پبلیکیشنز کا کوئی نام و نشان نہیں ملے گا۔ اس لئے عدالتی کارروائی ممکن نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ناجائز طور پر شائع شدہ کتابوں پر ناشر کا نام فرضی یا نامکمل ہوتا ہے۔ مگر آپ اُردو بازار میں ناشروں سے پوچھئے۔ تو وہ ساری تفصیل بتا دیتے ہیں کہ فلاں کتاب فلاں نے شائع کی ہے، فلاں پریس میں چھپی ہے۔ جلد بندی فلاں جگہ ہوئی ہے۔ اور بعض صورتوں میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں جگہ

کتاب کا اسٹاک رکھا ہوا ہے۔ اور پولیس کی مدد سے بڑی آسانی سے وہ کتابیں دستیاب کی جاسکتی ہیں۔ مگر عام طور پر ادیب شاعر اس امر کی طرف توجہ نہیں کرتے جس کی وجہ سے یہ وبا بہت عام ہوگئی ہے اور دوسرے ناشروں نے اسے ایک منافع بخش کاروبار سمجھ کر شروع کردیا ہے کیوں کہ انھوں نے دیکھ لیا ہے کہ فلاں فلاں یہ کام کر رہے ہیں اور انہیں کوئی روکنے اور ٹوکنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی ناشر ہندوستانی ادیب کا ناول شائع کرنے کے مقابلے میں کسی پاکستانی ناول کا چوری کا ایڈیشن شائع کرنا زیادہ منافع بخش سمجھتا ہے۔ پھر ہندوستانی ادیبوں کو ناشر کہاں سے ملیں۔

کاپی رائٹ ایکٹ ۱۹۵۷ء میں درج ہے کہ ایسی کتابوں کو چھاپنا اور فروخت کرنے کی غرض سے دکان میں رکھنا بھی جرم ہے۔ قانون میں صراحت موجود ہے کہ ایسی ناجائز چھپی ہوئی تمام کتابوں کو اصل مصنف کی ملکیت سمجھا جائے گا۔ کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت ایک REGIRTRAR OF COPY RIGHT کا تقرر کیا گیا ہے جس کا دفتر وزارت تعلیم میں ہے ایک کاپی رائٹ بورڈ کی تشکیل کی گئی ہے جس کا چیرمین ایک ایسا شخص ہوگا جو سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کا جج مقرر کیے جانے کا اہل ہو اور اس کے کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ ۸ ممبر ہوسکتے ہیں۔ اس دفتر میں کاپی رائٹ کا ایک رجسٹر ہوتا ہے۔ جس میں کاپی رائٹ کی تمام تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔ اور مقررہ فارم پر درخواست دینے پر مناسب چھان بین کے بعد کاپی رائٹ سے متعلق تمام تفصیلات اس رجسٹر میں درج کردی جاتی ہیں۔ درخواست کے ساتھ مقررہ فیس بھی ادا کرنی ہوتی ہے۔ اس رجسٹر کی باضابطہ نقل کاپی رائٹ کا مکمل ثبوت سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کی موجودگی میں دوسرا ثبوت مہیا کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک پاکستانی مصنفوں کا تعلق ہے ان سے اجازت حاصل کرکے کسی انجمن یا ادارے کو قانونی چارہ جوئی ضرور کرنی چاہیے۔ اگر قانونی موشگافیوں کی وجہ سے پوری کامیابی نہ ہو تو اس سلسلے میں حکومت سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اور قانون میں حسب ضرورت تبدیلی یا ترمیم کرائی جاسکتی ہے۔ فی الحال اگر کوئی ناشر کاپی رائٹ ایکٹ کا اردو ترجمہ شائع کردے تو یہ ایک مفید کام ہوگا۔

بعض ایسے واقعات بھی سننے میں آئے کہ کچھ ناشروں نے مشہور مصنفوں کے نام سے دوسروں سے ناول لکھوائے اور انہیں شائع کر ڈالا۔ عام خریدار یہ نہیں سمجھ سکتا ہے کہ یہ تصنیف اصل مصنف کی ہے یا نقلی کی۔ مگر اس طرح کی ساری باتیں عام لوگوں کو پہلے ہی معلوم نہ ہوں مگر ناشروں کو معلوم ہوتی ہیں۔

ناجائز کتابوں کی اشاعت کا دوسرا مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ چوں کہ ناشر مصنف کو رائلٹی نہیں دیتا۔ اس لیے اس کی لاگت کم ہوتی ہے مگر وہ قیمت زیادہ رکھتا ہے۔ مثلاً قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" جو اس وقت بازار میں مل رہا ہے وہ ان کی اجازت اور علم کے بغیر چھپا ہے۔ اس کی قیمت بارہ روپے رکھی گئی ہے اور ناشر دکان داروں کو ۵۰ فیصد کمیشن دیتا ہے جبکہ عام طور پر ۳۳ فیصد کمیشن ملتا ہے دکاندار انہی کتابوں کو فروخت کرنے کی زیادہ کوشش کرتا ہے جس پر اسے زیادہ کمیشن ملتا ہے ـــــ پہلے محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز تھا اب اردو کتابوں کے کاروبار میں سب کچھ جائز ہے اور صورت حال روز بروز بدتر ہوتی جارہی ہے۔ قانونی چارہ جوئی سے قطع نظر اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے ناشر جن کی اکثریت ان بداعمالیوں کی مرتکب نہیں ہے۔ اپنے طور پر اس کے تدارک کے لیے کچھ کریں اور اس کی سب سے اچھی صورت یہ ہوگی، کہ اردو ناشروں کی ایک کل ہند انجمن فوراً قائم کریں۔ اب اگر اردو کے ناشروں کی انجمن ہوتی تو اس طرح کی کتابوں کی اشاعت یا کم از کم ان کی بکری کی مخالفت کرا دیتی۔ مصنف کی اجازت سے اپنی طرف سے یہ کتابیں شائع کرتی کیونکہ وہی کتابیں ناجائز طور پر چھاپی جاتی ہیں جن کی مانگ ہوتی ہے۔

اردو کتابوں کی کھپت کس ریاست میں زیادہ ہوتی ہے اس کا جواب مختلف ناشروں نے مختلف دیا ہے۔ مگر زیادہ تر ناشروں نے ان ریاستوں کے نام لیے ہیں۔ مہاراشٹر، آندھرا، جموں وکشمیر بہار، پنجاب، دہلی، میسور، اور یوپی (تعجب ہے کہ کسی ناشر نے اردو کتابوں کی کھپت کے لحاظ سے یوپی کو پہلا نمبر نہیں دیا ہے) دوسری ریاستوں کے اضلاع یا علاقوں کا نام بھی لیا گیا ہے۔

پاکٹ بک کتابوں کے متعلق متضاد رائیں موصول ہوئیں۔ پاکٹ بک کتابوں کے خلاف عام طور پر یہ کہا گیا ہے۔ صحت متن کی طرف سے بے توجہی، جو کتاب ایک یا دو روپے میں بک جاتی ہے اس کتاب کو پانچ چھ روپے میں کون خرید ے گا۔ سستے اور تفریحی ادب کی باآسانی دستیابی جس سے ذوق سلیم متاثر ہوتا ہے۔ موافقت میں یہ کہا گیا ہے اردو پڑھنے والوں کی مالی حالت کے پیش نظر پاکٹ بک ضروری ہیں۔ کتابیں سستی ہونے کی وجہ سے خرید کر (مانگ کر پڑھنے کی بجائے) پڑھنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ مطالعے کا شوق پیدا ہوگا۔ جو بعد میں ضخیم کتابوں کے مطالعے کی طرف بھی مائل کریگا۔ پاکٹ بک کتابوں کا حلقہ الگ ہے اور ضخیم کتابوں کا الگ۔ اسکول اور کالج کی لائبریریاں پاکٹ بک کتابیں نہیں خریدتیں۔ لہٰذا پاکٹ بک کتابوں کی اشاعت سے ضخیم کتابوں کی مانگ پر کوئی برا اثر نہیں پڑ سکتا۔ مجلد کتابوں کا ایک ایڈیشن ایک ہزار کا ہوتا ہے پاکٹ بک کا دو سے پانچ ہزار تک کا۔ اس سے اُردو کی کتابیں وسیع حلقہ تک پہنچتی ہیں۔ لوگوں میں خریدنے اور پڑھنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ ثبوت میں ان کتابوں کے نام لئے گئے ہیں۔ دیوان غالب ایک لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہوئیں گلشن نندہ کے ناول کا ایک ایڈیشن ۱۰ ہزار۔ تلخیاں ساحر لدھیانوی ۲۵ ہزار۔ ہر زبان میں پاکٹ بک ایڈیشن چھپتے ہیں۔ لہٰذا اُردو میں انکی اشاعت کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے جس سے ضخیم کتابوں کی مانگ پر کوئی برا اثر پڑے ہمارا آخری سوال درسی کتابوں سے متعلق تھا۔ درسی کتابیں بڑے پیمانے پر مکتبہ جامعہ دہلی اور کتاب گھر میل وشارم (شمالی ارکاٹ) نے شائع کی ہیں۔ ان کا جواب یہ ہے ...... " اس وقت ملک کے مختلف صوبوں میں مکتبہ کی تقریباً ۵۵ کتابیں داخلِ نصاب ہیں۔ جو اب تک لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے صرف ابتدائی درجوں میں اضافہ (کتاب کی بکری میں) ہوا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں اُردو میں تعلیم کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے کمی ہوئی ہے۔"

کتاب گھر کی ۲۵ درسی کتابیں جنوبی ہند کی ریاستوں میں داخل نصاب ہیں۔

درسی کتابیں مختلف ریاستوں میں مختلف ہونے کی وجہ سے مقامی ناشروں کے ذریعے طبع کرائی جاتی ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمیں ہر جگہ کے ناشروں نے اطلاع نہیں بھیجی۔ لہٰذا اس سلسلے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ثانوی سطح پر اِن درسی کتابوں کی تیاری و اشاعت میں اکثر غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے اور بعض صورتوں میں اس کی ذمہ داری خود اُردو والوں پر عائد ہوتی ہے۔ بروقت کتابیں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے طلبا دوسری علاقائی زبان (جس سے وہ واقف ہوتے ہیں) کی کتابیں خرید لیتے ہیں۔ درسی کتابیں اب اکثر ریاستوں میں محکمہ تعلیم کے ذریعے تیار کرائی اور شائع کی جاتی ہیں۔ اس مسئلے کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ اس سلسلے میں جو مشکلات ہیں ان کا پتہ لگانا چاہئے۔ اور اس کے ازالے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر کسی طرح یہ ممکن ہو جائے کہ اُردو کی تمام درسی کتابیں (ابتدائی سے ثانوی جماعت تک) ہر ریاست میں ایک جیسی ہوں تو درسی کتابوں کے مسئلہ کو بڑی حد تک حل کیا جا سکتا ہے مختلف ریاستوں کے تعلیمی نصاب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ مثلاً تاریخ، جغرافیہ، حساب، سماجی علوم، اور سائنسی موضوعات کا نصاب بڑی حد تک یکساں ہے۔ اگر تمام ریاستوں کے لئے نہ سہی دو تین ریاستوں کے لئے بھی ایک ہی درسی کتاب ہو جائے تو بھی بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں کسی انجمن کو مختلف ریاستوں کے نصاب کا جائزہ لینا چاہئے۔ اور دیکھنا چاہئے کہ یہ صورت قابلِ عمل ہے یا نہیں۔ اتنا تو ضرور کیا جا سکتا ہے کہ کم سے کم اُردو کے ریڈر سارے ملک میں ایک ہوں اس سے تعلیمی معیار میں یکسانیت پیدا ہوگی۔ زیادہ تعداد میں چھپنے کی وجہ سے اُن کی چھپائی اچھی ہوگی۔ اور لاگت بھی کم آئے گی۔ ثانوی مدارج کے لئے درسی کتابوں کی تیاری اور ان کی طباعت فوری توجہ کی طالب ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ بات بڑے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں کتابوں کی اشاعت فروخت اور کاروبار میں بہت اضافہ ہوا ہے اور مزید اضافے کے بڑے امکانات ہیں۔ اس کاروبار کو افراد کی بجائے اگر ادارے اور بڑے ادارے جن کے پاس سرمایہ ہو، اور جو کاروبار کے جدید طریقوں کو اپنائیں وہ اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ تو یہ ایک بڑی منفعت بخش صورت ہوگی۔ ان کے لئے بھی اور اردو کے لئے بھی۔

ادارہ

اُردو کی ترقی کے لئے حکومت ہند کے اقدامات

اُردو ہندوستان کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ اسی لئے اسے دستور کے آٹھویں شیڈول میں شامل کیا گیا ہے اور اردو کی ترویج اور ترقی کے لئے حکومتِ ہند اور ریاستی حکومتیں متعدد اقدام کرتی رہتی ہیں۔ اُتر پردیش، بہار، دہلی، آندھرا پردیش، جموں وکشمیر وغیرہ کی ریاستوں نے اُردو مصنفوں کو انعامات، ادیبوں، شاعروں کو وظیفے اور اردو انجمنوں کی امداد اور اردو کتابوں اور رسالوں کی اشاعت جیسے متعدد اقدامات کے ذریعے اس زبان وادب کی ہمت افزائی کی ہے

حکومتِ ہند کی وزارت تعلیم نے اُردو کے مصنفوں، شاعروں اور اداروں کو مختلف طریقوں سے مدد دی ہے۔ جس کا ایک اجمالی خاکہ ہم پیش کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ایسے اقدامات اٹھائے گئے ہیں جو اردو کی ترویج واشاعت میں معاون ہیں۔ مگر بروقت اطلاع نہ ملنے کی وجہ سے ہم انھیں اس جائزے میں شامل نہ کر سکے

ذیل میں ایسے تہذیبی اداروں کے نام دئے گئے ہیں جنھیں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۷ء کے درمیان سالانہ یا مختلف اوقات میں امداد دی گئی۔ (اس کے بعد کے اعداد دستیاب نہ ہو سکے۔)

۱۔ اسلامک کلچرل بورڈ حیدر آباد ۵ ہزار سالانہ ۱۹۵۸-۱۹۶۶ء ۴۰ ہزار روپے

۲۔ ادارہ ادبیات اُردو۔ حیدر آباد ۱۹۶۷-۱۹۵۸ء - ۵۰ ہزار روپے

۳۔ شبلی اکیڈیمی۔ اعظم گڑھ ۱۹۶۷-۱۹۵۹ء - ۲۶ ہزار ۶ سو ۱۷ روپے

۴۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد " - ایک لاکھ ۳۱ ہزار ۴ سو تیرہ روپے

۵۔ انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ ۶۲-۱۹۶۱ء سے ۳۸ ہزار ۶ سو روپے سالانہ

(یہ امداد حکومتِ ہند کی مقرر کردہ، تارا چند کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر دی جا رہی ہے۔ ذیل میں ان اداروں اور افراد کی تفصیل ہے جنہیں ۵۹-۱۹۵۸ء سے ۶۷-۱۹۶۶ء کے درمیان مختلف کاموں کے لئے امداد دی گئی۔ (بعد کے اعداد دستیاب نہ ہو سکے۔)

۵۹-۱۹۵۸ء

اردو ہال ٹرسٹ حیدر آباد۔ تعمیر عمارت کے لئے ۵۰ ہزار روپے

الہ آباد لٹریری اینڈ کلچرل ایسوسی ایشن۔ کتابوں کی اشاعت کے لئے ۲۵ ہزار روپے

۶۰-۱۹۵۹ء

حکیم وہبی۔ حیدر آباد۔ تلسی رامائن کے اُردو ترجمے کے لئے ۲ ہزار روپے

انجمن ترقی اردو حیدر آباد۔ تلگو اُردو ڈکشنری کے لئے ۵ ہزار روپے

ادارہ ادبیات اُردو حیدر آباد۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا کیلئے ۲ ہزار روپے

اکبر میموریل کمیٹی الہ آباد۔ اکبر الہ آبادی کی تصانیف کی اشاعت کیلئے ۵ ہزار روپے

سید محمد مرزا مہذب لکھنؤ۔ عربی فارسی اور ہندی کی تصانیف کے اُردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے ۵ ہزار روپے

انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ۔ اُردو ڈکشنری کے لئے ۱۵ ہزار روپے

۶۱-۱۹۶۰ء

انجمن ترقی اُردو، حیدر آباد۔ تلگو اُردو ڈکشنری کے لئے ۵ ہزار روپے

مراٹھی ساہتیہ پریشد حیدر آباد۔ مراٹھی اُردو ڈکشنری کے لئے (اس میں دیگر کتابیں بھی شامل ہیں) ۹۶۲۵ روپے

اُردو ہال ٹرسٹ۔ حیدر آباد۔ (ٹرسٹ کی عمارت کی تعمیر کے لئے) ۲۵ ہزار روپے

حکومتِ پنجاب، اُردو پنجابی ڈکشنری کے لئے۔ پنجابی رسم الخط میں اُردو کتابوں کی اشاعت کے لئے ۳۵۲۹۳ ہزار روپے

انجمن ترقی اردو شاخ دہلی منتخب اُردو کہانیوں اور نظموں کی مجموعے کی اشاعت کے لئے ۱ ہزار روپے

فخر ندوی۔ دہلی — دیوان کی اشاعت کے لیے — ۶۰۰ روپے

۶۲-۱۹۶۱ء

مراٹھی ساہتیہ پریشد حیدرآباد — مراٹھی اردو ڈکشنری — ۹ ہزار روپے

انجمن اسلام بمبئی۔ — دیوان عزلت اور اردو کی قدیم لغت کی اشاعت کے لیے۔ — ۷ ہزار روپے

انجمن ترقی اُردو شاخ دہلی۔ — اُردو تحریروں کے انتخاب کی اشاعت کیلئے — ایک ہزار روپے

۶۳-۱۹۶۲ء

ڈاکٹر محمد حسن علی گڑھ (حال دہلی یونی ورسٹی) — مرزا رسوا کے تنقیدی — (مکمل نام درج نہیں ہے) — ۸۳۴ روپے

انجمن اردو — شاہ راہ (کتاب کا صحیح نام پڑھا نہیں گیا) (پورا نام درج نہیں ہے شاید مراد انجمن ترقی اُردو سے ہے) — ۲ ہزار روپے

رام کرشن مشن نئی دہلی۔ — سوامی وویکانند کی تصانیف کی اشاعت کیلئے — ۲۲ ہزار ۵ سو روپے

گورنمنٹ آف مدھیہ پردیش۔ — تاریخ فیروز شاہی — ۳۲ ہزار روپے

گورنمنٹ آف پنجاب۔ — اُردو اور پنجابی کی کتابوں کی اشاعت کیلئے — ۲۹۹۶۷

۶۴-۱۹۶۳ء

محمد حسین تسکین قریشی میرٹھ — متاع تسکین کی اشاعت کے لئے (مجموعہ کلام) — ۸ ۳۸ روپے

گورنمنٹ آف آندھرا پردیش۔ — اُردو تلگو ڈکشنری کے لیے — ۱۱ ہزار روپے

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ — نادر مخطوطات اور قدیم رسائل کی خریداری کے لیے — ۶ ہزار ۴ سو روپے

۶۵-۱۹۶۴ء

انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ۔ — نادر مخطوطات اور قدیم رسائل کی خریداری کے لیے — ۶ ہزار ۴ سو روپے

۶۶-۱۹۶۵ء

مظہر الحق میموریل بورڈ پٹنہ (بہار) — "روداد آشیانہ" اور "نغمۂ آشیانہ" کی جلدوں کی خریداری کے لیے — ۸۲۰ روپے

بیگم ذکیہ سلطانہ نیّر اردو نئی دہلی ۶۷-۱۹۶۶ء — "انارکلی" کی ۳ سو جلدوں کی خریداری — ۲۲۷۷ روپے

ڈاکٹر محمد حسن ریڈر اردو دہلی یونی ورسٹی — ۱۔ اردو شاعری کا پس منظر ۲۔ تذکروں کا تذکرہ اور ۳۔ کلیات سودا کی اشاعت کے لئے — ۸٫۶۴۳ روپے

مجلس اشاعت ادب دہلی۔ — مصحفی کے دیوان کی اشاعت کے لئے — ۲ ہزار "

تلگو اور اردو اکیڈمی آف سائنس حیدرآباد۔ — تلگو کی چار اور اردو کی دو کتابوں ۱۔ شہر حیدرآباد کی تاریخ ۲۔ مصر اور عرب قومیت کی تاریخ کی اشاعت کے لئے۔ — ۸ ۶۴۳ روپے

انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدرآباد — دو کتابوں۔ ۱۔ ہندوستان کی ثقافتی تاریخ اور ۲۔ اسلامی تہذیب کی بنیادیں کی اشاعت کے لیے — ۲۷۵۰ روپے

انجمن ترقی ہند، دہلی شاخ۔ — دہلی انجمن کے دفتر کے لیے زمین کی خریداری کے لیے — ۱۲۵۰۰ روپے

" " " " — منتخب اُردو افسانوں اور نظموں کی طباعت کے اخراجات کے لیے — ۵۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو ہند شاخ دہلی — "صبح" کے دو خاص نمبر "جواہر لال نہرو نمبر" اور "مولانا آزاد نمبر" کی اشاعت کے لیے — ۴ ہزار روپے

ایسی امداد ہر سال مالی سال میں دی جاتی ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء اور ۶۹-۱۹۶۸ء جو امداد دی گئی ہے۔ اس کے اعداد بر وقت دستیاب نہ ہو سکے۔ حال میں وزارتِ تعلیم نے انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر دفتر کی تعمیر کے لیے رعایتی شرح پر راؤز ایونیو نئی دہلی میں زمین دی ہے۔

حکومتِ ہند اور بعض ریاستی حکومتیں اُردو کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کو ماہانہ وظیفے دیتی ہیں۔ اور اُن کی کتابوں کی اشاعت کے لیے امداد دیتی ہیں۔ یا کافی تعداد میں اُن کی جلدیں خرید کر ان کی مدد کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں وزارتِ داخلہ کا وہ پریس نوٹ بھی قابلِ ذکر ہے جو ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو جاری کیا گیا تھا۔ اور جس میں واضح طور پر حکومتِ ہند کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ کہ اُردو ہماری قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اور اس کی تعلیم، ترویج اور ترقی کے لیے ہر ممکن سہولت ملنی چاہیے۔

ساہتیہ اکادمی، رابندر بھون، نئی دہلی اپنے قیام کے بعد ہی سے ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں کی ہمت افزائی کرتی ہے اور ادب کی ترقی کے لئے مختلف اقدامات کرتی ہے۔ ہر سال بہترین تخلیق پر

پانچ ہزار کا انعام[1] دینے سے علاوہ مختلف علاقائی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں کے شاہکار ہندوستانی زبانوں میں منتقل کیے جاتے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی نے اب تک ۳۱ کتابوں کا اُردو ترجمہ شائع کیا ہے جن میں بیشتر ایسی کتابیں ہیں جو ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ ترجمے اُردو کے مشہور ادیبوں نے کیے ہیں۔

اکادمی نے مالی امداد کے طور پر صرف ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد کو تذکرہ مخطوطات کی جلد سوم تا ششم کی طباعت کے لیے ۴ ہزار روپے دیئے ہیں اور گنجینۂ معانی مصنفہ تلوک چند محروم کی ۵۰ جلدیں خریدی ہیں جن کی قیمت ۹۰۰ روپے تھی۔ اکادمی کی کتابیں عمدہ ترجمے اور اچھی طباعت کے لیے ممتاز ہیں۔ مگر ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان کتابوں کی بکری نہایت غیر تسلی بخش ہے۔ اکادمی کی طرف سے مولانا آزاد کی تمام تصانیف کی اشاعت کا کام شروع کیا گیا ہے اور ترجمان القرآن (دو جلدیں) غبار خاطر اور تذکرے کی اشاعت ہو چکی ہے۔

ایک دوسرا ادارہ نیشنل بک ٹرسٹ ہے جو مختلف علاقائی زبانوں کی کتابیں بشمول اُردو شائع کرتا ہے۔ ان میں تراجم بھی ہیں۔ اس ادارے کا مقصد ایسی معیاری اور مفید کتابیں شائع کرنا ہے۔ جن کی اشاعت دوسرے ناشر تجارتی لحاظ سے منافع بخش نہیں سمجھتے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ادارہ صرف لاگت پر کتابیں فروخت کرتا ہے۔ اب تک اس ادارے کی طرف اُردو کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

پبلیکیشنز ڈویژن بھی اُردو کی کتابیں شائع کرتا ہے۔ معلوماتی کتابچوں کے علاوہ اس ادارے نے بچوں کی کتابیں، عام دلچسپی کی کتابیں اور ادبی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔

بچوں اور نوخواندہ افراد کے لیے کتابیں لکھوانے کے لیے ہر سال انعامی مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔ وزارتِ تعلیم بچوں کے لیے جو انعامی مقابلہ منعقد کرتی ہے اس میں بچوں کے دو AGE GROUP ۵ سے ۸ سال اور ۹ سے ۱۴ سال کے بچوں کے لیے شائع شدہ کتابیں یا مسودے طلب کیے جاتے ہیں۔ اس انعامی مقابلے میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۷ء تک ۱۳ مصنفوں کو انعام دیئے گئے ہیں۔ وزارتِ تعلیم کے تحت نوخواندہ افراد کی کتابوں کے لیے جو انعامی مقابلہ ہوتا ہے اس میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۷ء تک ۲۷ مصنفوں کو انعام دیا گیا ہے۔ دونوں گروپوں میں متعدد لکھنے والے ایسے ہیں جنہوں نے ایک سے زائد مرتبہ انعام حاصل کیا ہے۔ وزارتِ تعلیم کے تحت ہر دو سال پر یونسکو کی طرف سے انعامی مقابلہ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد بھی نوخواندہ افراد کے لیے مناسب کتابیں فراہم کرنا ہے۔ اب تک تین مصنفوں (کشور زیدی ۱۹۰۰ روپے، محمد اسحاق صدیقی ۱۱۰۰ روپے اور مصطفےٰ حسن رضوی ۹۴۹ روپے) کو یہ انعام مل چکا ہے۔ اس مقابلے میں انعام کی رقم متعین نہیں ہے۔

وزارتِ اجتماعی ترقی اور امداد باہمی کی طرف سے ہر سال ایک انعامی مقابلہ ہوتا ہے جس میں موضوعات دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس مقابلے کا مقصد یہ ہے کہ ملک میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں اور تعمیر و ترقی کے لیے جو اقدامات کیے جا رہے ہیں ان سے نوخواندہ افراد اور اجتماعی ترقی کے کاموں میں مصروف کارکنوں کو واقف کرایا جائے۔ اس وزارت کی طرف اب تک ۵ انعامی مقابلے ہو چکے ہیں۔ جن میں اُردو کے مصنفوں کو بھی انعام دیا گیا ہے۔ یہ تمام انعامات ایک ہزار روپے کے ہیں۔ ان کے علاوہ حکومت رائلٹی کے لیے ایک ہزار مزید ادا کرتی ہے۔ اور بعض صورتوں میں یہ کتابیں اور مسودے کی صورت میں اشاعت کے بعد ان کی جلدیں بڑی تعداد میں خرید لیتی ہے۔

حکومت ہند دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو کی ترقی کے لیے برابر قدم اٹھاتی رہتی ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

---

[1] اب تک اُردو کے ان ادیبوں و شاعروں کو ساہتیہ اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔ ظفر علی خاں، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی جگر مرادآبادی، سید مسعود حسن رضوی۔ فراق گورکھپوری۔ امتیاز علی عرشی۔ اختر الایمان، خواجہ غلام السیدین، آنند نرائن ملا۔ راجندر سنگھ بیدی، اور قرۃ العین حیدر۔


آجکل
ستمبر ۱۹۶۸ء
بھادر۔آشون شک سمت ۱۸۹۰
۶۰ پیسے



سائنس اور صنعتی تحقیق کی کونسل کی سلور جوبلی

۱۰ اگست ۱۹۶۸ء کو نئی دہلی کی نیشنل فزیکل لیبارٹری کے آڈیٹوریم میں سائنس اور صنعتی ریسرچ کونسل کی پچیسویں سالگرہ منائی گئی جس میں متعدد ملکی اور غیر ملکی سائنس دانوں نے شرکت کی۔ اس تاریخی تقریب کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے صدارتی خطبہ دیا۔

سائنس اور صنعتی ریسرچ کونسل کا قیام آج سے ۲۵ سال پیشتر ۱۹۴۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک اس ادارے نے سائنس اور صنعتی ترقی میں اہم اور نمایاں حصہ لیا ہے۔ متعدد قومی لیبارٹریاں اور تحقیقی ادارے اس کے تحت کام کر رہے ہیں۔ یہ ادارہ یونی ورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں ہونے والی سائنسی تحقیق میں امداد و اعانت بھی کرتا ہے۔ یہ ادارہ ان افراد کو وظائف بھی دیتا ہے جنہوں نے سائنسی تحقیق کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ غیر ممالک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جو ہندوستانی سائنس داں اور تکنیکی ماہر واپس آتے ہیں انھیں مناسب ملازمت اور کام کے حصول میں بھی مدد دیتا ہے

اس ادارے کے قیام کی بدولت ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی کو زبردست ترقی اور فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہمارے پنج سالہ منصوبوں میں سائنسی تحقیق کے لیے مختص کی جانے والی رقم میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے سنہ ۵۱-۱۹۵۰ میں سائنسی تحقیق پر ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے خرچ کیے گئے تھے جبکہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں اس پر ۱۱ کروڑ ۵۸ لاکھ روپے صرف کیے گئے تھے۔ گزشتہ ۲۵ برسوں میں سائنس کے شعبوں میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے اس کے نتیجے میں لیبارٹریوں اور تحقیقی اداروں کا ایک وسیع جال پھیل گیا ہے جو اطلاقی تحقیق، بنیادی تحقیق اور مخصوص شعبوں میں تحقیقی امور سرانجام دے رہے ہیں

سائنس اور صنعتی ریسرچ کونسل کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے کونسل کی جانب سے سرانجام دی گئی خدمات اور کارناموں کو سراہا۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے صدارتی خطبے کے دوران اعلان کیا کہ حکومت ہند کی سائنٹفک مشاورتی کمیٹی کی از سر نو تشکیل کی جائیگی اور یہ قدم تعلیمی کمیشن کی مفید سفارشات کی روشنی میں اٹھایا جا رہا ہے۔ اب کمیٹی کے ممبران کی تعداد بڑھادی جائے گی۔ نیز اس میں سائنس دانوں اور تکنیکی ماہرین کو بھی شامل کیا جائے گا۔

کونسل کی سلور جوبلی کے اس تاریخی اجتماع کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے علاوہ مرکزی وزیر تعلیم شری ترگن سین، یونیسکو کے جنرل سیکریٹری مسٹر رینی میہو اور ڈاکٹر اے راما سوامی مدلیار اور ڈاکٹر حسین ظہیر موجود تھے۔

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

جلد ۲۷ شمارہ ۲
ستمبر ۱۹۶۸ء
بھادر - آشون شک سمت ۱۸۹۰

ترتیب

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شرح چندہ

	فی پرچہ	ایک سال	دو سال	تین سال
ہندوستان	۶۰ پیسے	ساڑھے سات روپے	۱۲ روپے	۱۷ روپے
پاکستان	۶۰ پیسے (پاک)	ساڑھے سات روپے (پاک)	۱۲ روپے (پاک)	۱۷ روپے (پاک)
دیگر ممالک	۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ	۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر	۱۸ شلنگ یا ۲٫۷۵ ڈالر	۲۵ شلنگ ۶ پنس یا ۳٫۵۱ ڈالر

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی

مُلاحظات

ملی جلی، خوبصورت اور شاندار تہذیب کی تعمیر

۱۵ اگست کو ہر سال ہم اپنی آزادی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس دن جہاں ہم آزادی کی خوشی مناتے ہیں وہاں ہمارا ذہن ایسے تمام مسائل کی طرف جاتا ہے جن سے ہم دوچار ہیں اور جن کے حل ہونے پر ہماری خوشی اور خوشحالی کا انحصار ہے۔ لہٰذا یوم آزادی کے موقع پر اپنی تقریر میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی یہ سوال اٹھائے "آج کا دن ایسا ہے جب ہمیں شانتی سے سوچنا چاہیئے کہ ہم کہاں تک پہونچے ہیں، کدھر جا رہے ہیں۔ اور کہاں جانا ہے۔؟" ہماری منزل کیا ہے، یعنی ہمیں کہاں جانا ہے۔ موصوف نے خود اُس کی نشان دہی کی ہے: "دنیا کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں کروڑوں کی تعداد میں اس طرح لوگ بستے ہوں، اپنی اپنی مختلف زبانیں بولتے ہوں۔ جن میں اپنے پن کا پورا احساس بھی ہو اور جو جمہوری نظام کے ایک ہی سیاسی رشتے میں پروئے ہوئے ہوں۔ ہم جس انداز کی قومی تہذیب کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ کوشش بھی ایک انوکھے ڈھنگ کی ہے۔ الگ الگ زبانوں جدا جدا مذہبوں اور الگ الگ تہذیبوں سے ہم ایک خوبصورت اور شاندار تہذیب کو عملی شکل دینا چاہتے ہیں جس میں ہندوستانی تہذیب کی بھی نمایاں جھلک ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کام میں غیر معمولی دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے۔ انھیں نہ تو نظر انداز کرنا چاہیئے اور نہ ان کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر دکھانا چاہیئے۔"

اس منزل تک پہنچنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے "اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں اپنے ملک سے محبت اور عقیدت کا جذبہ اُجاگر کرنا ہے۔ لوگوں کو حب الوطنی کے جذبے پر ناز کرنا چاہیئے۔ جس کے سہارے وہ زبردست اور آگے لے جانے کی طاقت پیدا ہو سکتی ہے جس کی آج ہمیں بڑی سخت ضرورت ہے۔ ہمیں پھوٹ پیدا کرنے والے تمام عناصر کا پوری طاقت سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس سے پرانی روایتوں پر دھبہ آئے . . . آج ہمارے ملک میں قول و عمل میں بڑا فرق ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قومی زندگی کے ہر شعبے میں لوگ اپنے معیار سے گر گئے ہیں اور ضبط کی کمی بڑھتی جا رہی ہے۔ عدم تشدد ایک ایسی چیز ہے جو مہذب

برتاؤ اور انسانیت کے احترام کا سبق دیتی ہے عدم تشدد جمہوریت کی رُوح رواں ہے۔ تشدد جمہوریت کے مزاج کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں عدم تشدد، رواداری اور آپسی سوجھ بوجھ کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ اسلئے یہ جذبہ نہ صرف قومی زندگی کی قدروں کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ ہماری بقا کے لئے بھی لازمی ہے۔"

ہم اندھیرے سے نکل آئے ہیں

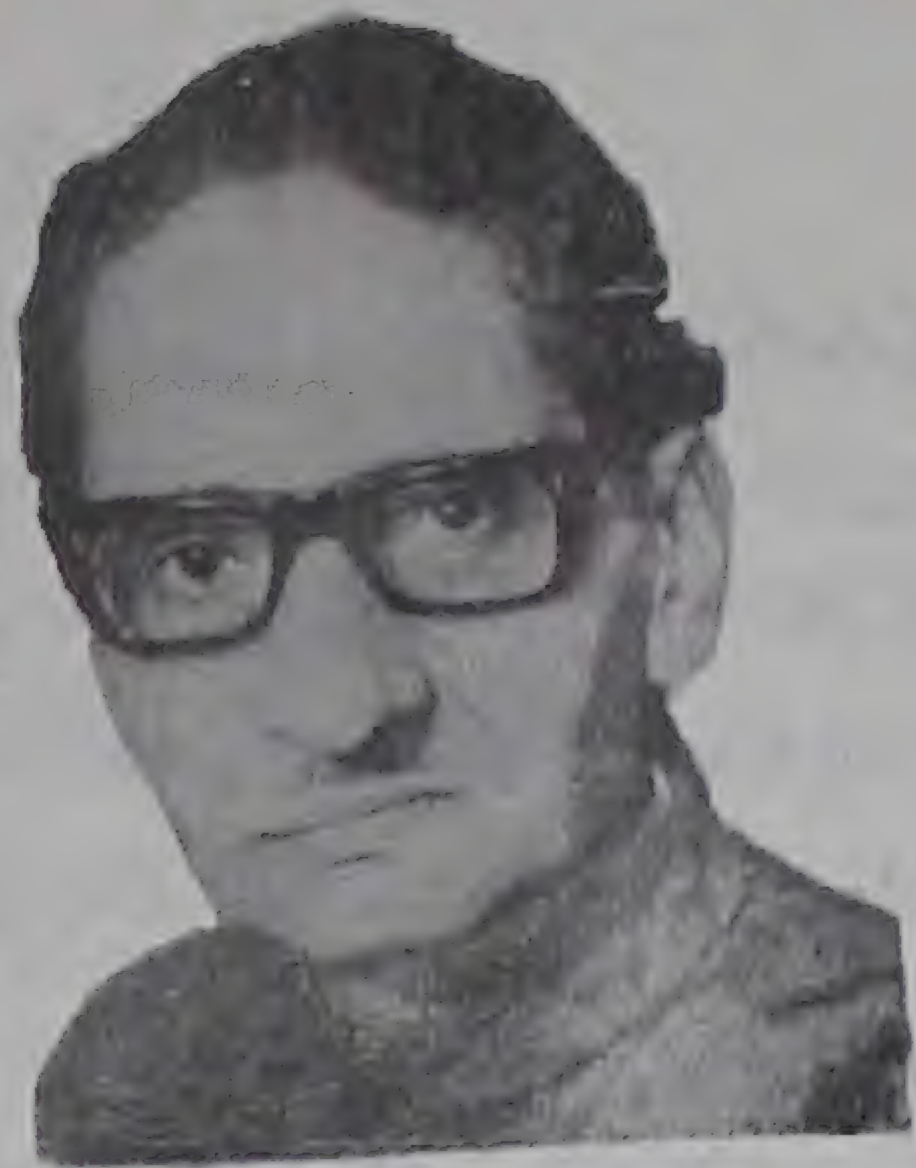
پندرہ اگست کی صبح کو لال قلعہ (دہلی) پر قومی پرچم لہراتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے آزادی کے ۲۱ برسوں کا جائزہ لیا۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں جو مشکلیں پیش آئیں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں اور جو ناکامیاں ہوئیں انھوں نے سبھی کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ انھوں نے اس بات پر بڑے دکھ کا اظہار کیا کہ بدھ، اکبر، اور گاندھی کی شاندار روایات والے ملک میں اب بھی تشدد اور فساد ہوتا ہے۔ اتنے بڑے ملک میں یہ قدرتی بات ہے کہ مختلف فرقوں میں مت بھید اور اختلاف رائے ہو، لیکن یہ سارے مسائل آپسی بات چیت کے ذریعے حل کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے ہر شہری کو اپنے فرض سے آگاہ کیا کہ وہ تشدد کو پھیلنے نہ دے اور نہ فسادات ہونے دے۔ آپ نے کہا: "زیادہ تر لوگ امن پسند ہیں اور تھوڑے سے لوگ گڑبڑ پھیلاتے ہیں۔ ۔۔۔ ان باتوں سے قطع نظر کچھ چھوٹی چیزیں بھی ہیں جیسے آپس میں بے اعتمادی اور شک و شبے پیدا کرنا جو اندر ہی اندر سماج کو گھن کی طرح کھانے لگتی ہیں۔ ان سب سے دیش برباد ہوتا ہے۔ آج ہم سب کو فیصلہ کرنا ہے کہ ہم ایسی باتیں ہرگز ہرگز برداشت نہیں کریں گے"۔ آپ نے قومی یک جہتی کونسل کے اجلاس اور اس کے فیصلوں کا ذکر کیا اور امید ظاہر کی کہ اس تنظیم کے ذریعے ملک میں امن، شانتی اور رواداری کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوگا۔

وزیر اعظم نے صاف کہا "ہم نے آپ سے اپنی خامیاں چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہم ہمیشہ یہ مانتے آئے ہیں کہ ساری باتیں عوام کے سامنے رکھنی چاہئیں۔ کیوں کہ ملک کی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب ملک میں اتحاد ہو۔"

وزیر اعظم نے ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بھی وضاحت کی۔ "ہندوستان کی پالیسی شروع سے یہی رہی ہے کہ ہم کسی گُٹ میں شامل نہ ہوں۔ اپنے فیصلے خود کریں" اس سلسلے میں انھوں نے پاکستان کو فوجی ہتھیار دینے کے رُوسی فیصلے پر دکھ کا اظہار کیا۔ مگر ساتھ ہی اس عزم اور حوصلے کا اظہار بھی کیا ہے جو ایک آزاد ملک کے شایانِ شان ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اس فیصلے سے ایک گھبرائے ہوئے یا غیر مطمئن یا ایک شکایتی ملک کا روپ نہیں اپنانا چاہیے۔ بلکہ اپنی حفاظت خود کرنی چاہیے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ ہماری دفاعی فوجیں ہر طرح سے اس قابل ہیں کہ وہ کسی بھی حملہ آور کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان پر امن بقائے باہم اور امن و سلامتی کی دیرینہ روایات کا بھی احترام کرتا ہے۔ اس جذبے کے تحت وزیر اعظم نے پاکستان سے جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی تجدید کی۔ آپ نے کہا۔ "پاکستان سے ہمارا کچھ جھگڑا رہا۔ ہم پڑوسی ہیں اور ہمارے آپس میں بہت سے رشتے ہیں۔ اس لئے ہمارا جھگڑا کچھ بڑھا۔ جیسے بھائیوں میں کبھی کبھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوتے پنڈت جواہر لال نہرو اور شری لال بہادر شاستری نے جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پیش کش کی اور آج میں پھر اس پیشکش کو دہراتی ہوں۔ کیوں کہ دونوں ملکوں کی بھلائی اور بہتری اسی میں ہے۔"

انھوں نے نوجوانوں سے خاص طور پر خطاب کیا۔ "نوجوان نئے ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ وہ مضبوط ہیں تو ہندوستان کا مستقبل محفوظ ہے۔ انھیں مصائب کا سامنا کرنا ہوگا۔ اُن کے سامنے پہاڑ کھڑے ہونگے۔ تو کیا وہ پہاڑ کو دیکھ کر بیٹھ جائیں گے؟ ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو اس پہاڑ پر چڑھیں یا اس کو چیر کر آگے بڑھیں۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہی ملک کو نئی منزل کی جانب لے جا سکتے ہیں۔ اور مجھے پوری امید ہے کہ وہ اس کام میں لگیں گے"۔ اس سال کی اچھی فصل کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ اتنی عمدہ پیداوار کسی جادو کے زور سے نہیں ہوئی بلکہ کسانوں کی محنت، سائنسدانوں کی کھوج اور حکومت کی امداد کا نتیجہ ہے۔ وزیر اعظم نے صحیح کہا کہ ہم اندھیرے سے نکل آئے ہیں اور منزل سے قریب تر ہیں۔

اعجاز صدیقی



غزل

زنجیرِ پا کے ساتھ ہی جھنکار بھی چلے
جب سر چلیں، تو فاصلۂ دار بھی چلے

پھر شب کے گیسوؤں میں پناہوں کی ہے تلاش
دن ڈھل چکا ہے، شام کے آثار بھی چلے

چلنے کا تذکرہ ہے تو ہاں تھوڑی دور تک
غم ناشناس ہی نہیں، غمخوار بھی چلے

اب کون رقص و رنگ کی محفل سجائے گا؟
اے پیرِ میکدہ، ترے مے خوار بھی چلے

کچھ دیر تو رُکیں غمِ دوراں کی چٹکیاں!
کچھ دیر قصۂ لب و رُخسار بھی چلے

گمراہیاں اُنہیں کے مقدر میں آئی ہیں
جن قافلوں میں قافلہ سالار بھی چلے

ہم دشتِ بیکسی کے ہیں راہی، ہمارے ساتھ
موجِ ہوائے کوچۂ دلدار بھی چلے

عرضِ متاعِ شوق پہ سب خود ہی بک گئے!
بازارِ غم میں جتنے خریدار بھی چلے

جب ہم رُکے، تو رُک گئے ہنگامہ ہائے شہر
جب ہم چلے، تو کوچہ و بازار بھی چلے

غربت میں غم گسار کسی کا کوئی تو ہو!
سایہ کے ساتھ ساتھ یہ دیوار بھی چلے

یہ بند آبجو، یہ سفینے رُکے رُکے
موجیں اگر ہوں تیز تو پتوار بھی چلے

اعجاز جتنی تیز چلیں غم کی آندھیاں
اُتنا ہی تُند نشۂ پندار بھی چلے

علی جواد زیدی

ایک دور کی یادگار



سراج لکھنوی

سراج ایک مٹتے ہوئے لکھنؤ کی یادگار تھے۔ آج سے کوئی پچہتر برس پہلے کے لکھنؤ میں انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ واجد علی شاہ کی جلا وطنی کو تقریباً چالیس سال بیت چکے تھے۔ پہلی جنگِ آزادی میں جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا، جانِ عالم پیا کا لکھنؤ تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ سبھی سجائی محفلیں اُجڑ چکی تھیں، چہچہے خاموشیوں میں بدل چکے تھے اور رنگینیوں اور سرمستیوں نے ماتمی لباس پہن لیا تھا۔ کتنے ہی جوان اور بوڑھے اپنے ہی خون میں نہا چکے تھے۔ انتقامی بہیمیت ننگا ناچ ناچ چکی تھی۔ سراج کے بزرگوں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور چوں کہ ان کے دادا شاہی میں دامنِ دولت سے وابستہ تھے اس لئے ان لوگوں نے اس انقلاب کو بڑی شدت سے محسوس بھی کیا تھا۔

سراج ۲۷ جولائی ۱۸۹۴ء کو اسی مرحوم لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا نواب قطب الدین احمد خاں کو نوابی اور خانی کے خطابات دربارِ اودھ سے ملے تھے اور یہ کسی اچھے منصب پر فائز تھے۔ ان کے والد نور الحسن نے بھی فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ اس ماحول میں جہاں ایک بے پروائی اور بے فکری و راحت پائی وہاں ماضی سے گہری الفت اور وضعداری بھی۔ رہی سہی کسر پیارے صاحب رشید کی شاگردی نے پوری کر دی۔ رشید لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو ہی نہیں اچھے غزل گو بھی تھے

انیس کی زبان کا دہلوی اور لکھنوی رچاؤ انھیں ورثے میں ملا تھا اور وضعداری اور رکھ رکھاؤ ان کے مخصوص ماحول کا عطیہ تھا۔ سراج نے والدین اور اُستاد دونوں ہی سے لکھنویت کی تمام خصوصیتیں پائیں اور اپنائیں۔

سراج کو بچپن میں لکھنے پڑھنے سے رغبت کم تھی۔ ان کے بچپن کے دوست ڈاکٹر محمد احمد نے زبردستی اِن کا داخلہ لکھنؤ کے چرچ مشن اسکول میں کرا دیا۔ سراج کی زندگی ہی میں یہ اسکول بند ہو گیا تھا۔ اب اس کی خوبصورت عمارت میں "نیشنل ہیرلڈ" "قومی آواز" اور "نوجیون" نامی اخباروں کا دفتر ہے لیکن گذرے زمانے کی بہت سی ادبی ثقافتی یادیں اِس اسکول سے وابستہ ہیں۔ اسی اسکول سے سراج نے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ (ہائی اسکول) کا امتحان پاس کیا۔ سراج دھن کے پکے تھے یا تو پڑھنے لکھنے سے بھاگتے تھے یا جو شوق پیدا ہوا تو پڑھنے لکھنے کے ہی ہو رہے۔ اسکول لیونگ کے بعد کیننگ کالج میں داخلہ ہوا۔ اسی زمانے میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی معاشی حالت بھی بگڑ چکی تھی اس لئے سراج ملازمت کی تلاش پر مجبور ہوئے۔ پہلی ملازمت سنٹرل اکسائز کے محکمے میں کی اور انسپکٹر ہو گئے۔ لیکن اُن کی تنہائی دوست طبیعت کو مارے مارے پھرنے کی یہ نوکری پسند نہ آئی اور چند ہی مہینوں کے بعد انھوں نے اس نوکری سے کنارا کر لیا۔ معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر

پھر کچہری میں نوکری کرنا پڑی۔ تھوڑے دنوں کے بعد رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز کے دفتر میں کلرکی کرنے لگے اور یہیں سے ۱۹۴۷ء میں پنشن پائی۔ کہاں نوابی اور کہاں کلرکی، زندگی کے یہی نشیب و فراز دل توڑ دیتے ہیں۔ زندگی کے دن تو شاد و ناشاد گزر جاتے ہیں، لیکن ظالم یادیں کب بخشتی ہیں۔ ہر یاد ایک نیا ٹھوکا لگاتی اور نیا نشتر چبھوتی ہے سراج کے شعروں میں ان ٹھوکوں اور نشتروں کو محسوس کیا جا سکتا ہے

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی اکیس برس زندہ رہے اور ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء کو چوہتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان چوہتر برسوں میں کوئی ستاون برس شعر کی خدمت میں گذارے اس طویل مدت میں انھوں نے بہت کچھ کہا، لیکن ایک مختصر سے مجموعہ "شعلہ آواز" کے سوا کتابی صورت میں کچھ اور شائع نہیں ہوا۔ متفرق نظمیں اور غزلیں رسائل و اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں اور یقیناً غیر مطبوعہ صورت میں بھی کچھ کلام ضرور ہوگا۔ سراج نے ۱۹۱۰ء سے شاعری شروع کی۔ ۱۹۱۵ء سے خاصا سلیقہ پیدا کر لیا۔ اسی زمانے میں پیارے صاحب رشید کی شاگردی اختیار کی اور انھیں سے علم عروض و قافیہ حاصل کیا۔ ۱۹۱۵ء میں پیارے صاحب رشید غزل گوئی ترک کر چکے تھے اور اپنے کو مذہبی شاعری کے لیے وقف کر دیا تھا۔ سراج کی دو چار غزلیں تو خود درست کیں لیکن اس کے بعد انھیں اپنے چھوٹے بھائی باقر صاحب حمید کے سپرد کر دیا۔ سراج ۱۹۲۲ء تک حمید لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے۔ باقر صاحب حمید کے انتقال کے بعد سراج نے کسی سے مشورہ سخن نہیں کیا۔ بلکہ خود استاد تسلیم کر لیے گئے۔

یوں تو سراج بڑے صلح کل اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ لمبے دبلے، — ان کی شیروانی اور کشتی نما ٹوپی۔ ان کی جسامت کے خطوط منحنی کو اور نمایاں کر دیتی تھی۔ باتیں بھی کرتے تو دبی زبان میں، شعر بھی سناتے تو لکھنؤ کے قدیم ترنم اور دھیرے سُروں میں۔ لیکن کٹرہ ابو تراب خاں کے ماحول میں پرورش پائے ہوئے ان رجحانات کے باوجود — کوئی چنگاری بھی شاید ان کے خاکستر میں تھی۔ ان کی شاعرانہ زندگی ہنگاموں سے خالی نہ تھی۔ اگرچہ مرزا ثاقب قزلباش کو اپنا بزرگ مانتے تھے لیکن



سراج لکھنوی

ان پر تنقیدیں بھی کیں۔ جگت موہن لعل رواں کے کلام پر بھی تیز تبصرے کیے۔ رواں کی طرف سے مرزا جعفر علی خاں اثر نے جواب دیے اور نوک جھونک کا سلسلہ کچھ دنوں چلتا رہا۔ جگر اور علامہ اقبال کی حمایت میں بھی یہ قلم بکف میدان میں آنکلے۔ نیاز فتح پوری نے جگر مرادآبادی پر جو اعتراضات کیے تھے، ان کے جواب میں سراج نے جگر کی طرفداری میں مضامین لکھے اسی طرح جب جوش ملسیانی نے "جراح" کے فرضی نام سے ڈاکٹر اقبال پر اعتراضات کرنا شروع کیے تو سراج نے قلم کی سپر سنبھالی۔ اس طرح سراج کے تنقیدی مضامین کا اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے۔ اسی سلسلے میں افقر موہانی سے مقدمہ بازی تک کی نوبت آئی۔ مگر بعد میں معاملہ رفت وگذشت ہوگیا۔

سراج نے لکھنؤی شاعری کے نشاۃ ثانیہ کا زمانہ دیکھا ہے۔ صفی، عزیز، ثاقب، آرزو، جلال، محشر، یگانہ، ناطق، وغیرہ کی وجہ سے یہاں کی ادبی زندگی میں بڑی چہل پہل تھی۔ ادبی انجمنیں مصروف عمل تھیں، مشاعرے ہوتے تھے، رسالے نکلتے تھے، بحثیں چھڑتی تھیں، چوٹیں چلتی تھیں، جماعتیں بنتی تھیں، تنقید کی صف آرائیاں ہوتی تھیں۔ سراج کے ساتھیوں میں حکیم آشفتہ، منظر لکھنوی، قدیر لکھنوی، اور کسی قدر بعد والوں میں آنند نرائن ملا، آل رضا رضا، شوکت تھانوی، امین سلونوی، آرزم لکھنوی اور صباح الدین عمر وغیرہ ان کی ادبی محفل کی رونق تھے۔ ان کے علاوہ

مرحوم رفیع احمد خاں، مولانا سید سبط حسن صاحب اور حکیم صاحب عالم قاسم سے بھی گہرے مراسم تھے وہ جوانوں میں ارم لکھنوی شاگرد آرزو، خاربارہ بنکوی، اور شمیم کرہانی کو پسند کرتے تھے۔ اس سب سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اُن کے دوستوں کا حلقہ درحقیقت علم و ادب کا حلقہ تھا اور شعر و سخن کا مرکز۔ اُن کا محور۔ حکام میں بھی انہیں سے زیادہ ملتے جو ادب کے دل دادہ تھے مثلاً سید صدیق حسن مرحوم، ذوالنورین مرحوم حبیب احمد صدیقی اور ڈاکٹر سمپورنانند۔ لیکن بے حد خود دار تھے ان کی زندگی تنگ دستی میں گزری لیکن انھوں نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ ویسے رسمی قسم کی قصیدہ گوئی بھی انہوں نے کی ہے جب کسی افسر کا تبادلہ ہوتا یا کسی کے استقبال میں جلسہ ہوتا تو دوستوں اور سائقیوں کے اصرار سے اس کے بارے میں کچھ کلمات خیر کہہ دیا کرتے تھے۔ لیکن مقصد دوستوں کی دلدہی ہوتی۔ طمع دنیا نہیں۔ دوستوں کے لئے وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ سچ پوچھئے تو دوست ہی ان کی کائنات تھے۔ انہیں کے جھرمٹ میں ہنستے اور چہچہاتے تھے۔ سید صدیق حسن راوی ہیں کہ دوستوں نے بعض اوقات ان سے دشمنوں جیسا سلوک کیا لیکن انہوں نے دوستوں کی کوتاہیوں سے یوں درگزر کیا جیسے انہیں کوئی تکلیف ہی نہ پہنچی ہو۔

سراج کو میں نے پہلے پہل کوئی ۳۲ برس پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت سراج چالیس برس کے ہو چکے تھے۔ دوستوں میں دوست اور شاعروں میں شاعر مگر چونکہ ان کے دوست بیشتر شاعر تھے، اسی لئے اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ دوستوں میں شاعر اور شاعروں میں دوست تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شاعروں کی ٹولیاں بن چکی تھیں اور غیر جانبداری بڑی کھینچا تانی ہوتی تھی۔ سراج نہ تو بالکل غیر جانبدار تھے اور نہ گروہ باز۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان پر دونوں طرف سے شہ پڑتی تھی۔ لیکن ان میں ایک خاندانی آن بان، ایک لکھنوی وضعداری، ایک شاعرانہ بے نیازی اور بے پروائی اور نفس کشی اور تیاگ کا ایک ناقابلِ تسخیر جذبہ ایسا تھا کہ وہ ساری زندگی باہمہ اور بے ہمہ بنے رہے۔ جبھی تو ایک طرف مولانا سبط حسن اور حکیم قاسم جیسے پرہیزگاروں سے ربط تھا اور دوسری طرف رفیع احمد خاں اور شوکت تھانوی جیسے بے باکوں سے۔ بات ربط تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ دونوں حلقوں میں اسی طرح گھل مل جاتے تھے جیسے اسی حلقے کے لئے بنے ہوں۔

جب میں نے ۱۹۴۷ء میں حکومت اترپردیش کے محکمہ اطلاعات میں شعبہ اردو کا چارج سنبھالا تو میرے رفیق قدیم صباح الدین عمر کی وجہ سے سراج سے اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ صباح الدین کو میں غائبانہ طور سے تو اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ نیاز فتح پوری کے نگار سے وابستہ تھے۔ قوم پروری اور نیاز غالباً ان دونوں رشتوں سے سراج ان کے قریب آئے ہوں گے۔ شوکت اور رفیع کی دوستی بھی مشترک رہی ہوگی۔ بہر حال، سراج اکثر دفتر کے اوقات میں یا دفتر کے بعد عمر صاحب سے ملنے کے لئے آتے تو مجھ سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ ہر بار ان کے غیر رسمی اور پرخلوص انداز کا ایک تازہ نقش میرے ذہن میں اُبھر آتا۔ مشاعروں یا مخصوص شعری صحبتوں میں بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ نہ رعونت نہ تکبر۔ خود سُناتے تو تعریف سے بے نیاز ہوتے۔ اور دوسروں کے اشعار سنتے تو دل کھول کر تعریف کرتے۔

سراج کے شاگردوں میں، اُن کے صاحبزادے معراج کے علاوہ میں صرف کمال احمد صدیقی کو جانتا ہوں۔ یقیناً ان کے اور شاگرد بھی ہوں گے، لیکن اُستادی شاگردوں کی تعداد پر نہیں بلکہ زبان کی قدرت اور مسائل عروض کے علم پر منحصر ہے۔

ماضی قریب تک لکھنؤ کے ٹکسالی ثقات اور اہلِ علم اُردو زبان کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف تھے۔ اُن میں جو ذمہ دار تھے وہ ادب کا بھی وسیع مطالعہ کرتے تھے اور دقائق زبان کا بھی۔ شاعروں نے بقائے زبان کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ اب سے بیس برس اُدھر کے لکھنوی مشاعروں میں شعرا یہ کہہ کر مجمعوں کو مخاطب کرتے تھے کہ "یہ شعر زبان میں عرض کیا ہے"۔ یعنی اس میں کوئی محاورہ یا روزمرہ بے تکلفی سے نظم کردیا ہے۔ آرزو صاحب کو ایک زمانے میں خیال ہوا کہ بہت سے محاوروں کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں تو انہوں نے محاورے روزمرے اور عوامی اصطلاحیں اپنے اشعار میں نظم کرنا شروع کیں۔ مثلاً ان کی غزل کے دو شعر:

عاشقی کچھ کھیل بچوں کا نہیں
جو سبھی چھو آئیں جا کر ڈھائیاں
عشق پر بھی چھا گئیں رعنائیاں
اُف تری توڑی ہوئی انگڑائیاں

اب ان میں "بچوں کا کھیل" "ڈھائیاں چھو آنا" توڑی ہوئی انگڑائی کو انھوں نے آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا۔ ایسی مثالیں لکھنوی شعراء کے یہاں بکثرت ملتی ہیں وہ ایسا ارادی طور پر کرتے تھے۔ سراج کے یہاں بھی بعض اوقات ایسے اشعار مل جاتے ہیں۔ متعلقہ مصرعے درج ذیل ہیں۔

ع یہ کس کے کشتگان ناز "میٹھی نیند سوتے ہیں"
ع "اب سے دور"، آہ وہ معصوم خیالی توبہ
ع "وہی ہوا" کہ "نظر لگ گئی" "زمانے کی
ع پھر کسی دن نہ چلے آیئے سمجھانے کو ؟
ع جسے قاتل کہیں ہم" اور" وہ قاتل نہ بن جائے
یہاں "اور" کے یہ معنی ہے "بھلا یہ ممکن ہے کہ"۔
ع کلیاں بھی "کچی نیند" سے بیدار ہو گئیں۔
ع وہ نظر گذر" کی شراب تھی جو چھلک گئی میرے جام سے
ع ذرا بھی جھوم کر اٹھے تو "لغزش" پاؤں پڑتی ہے"۔

ایسی مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں۔ اس دور میں جب کہ اُردو پر فارسیت نے دوبارہ یلغار کی تھی، اہلِ دلی میں داغ اور شاگردانِ داغ نے اور لکھنؤ والوں نے علی العموم محاورے اور روزمرے کی زبان کو اپنا کر اُردو کے عوامی مزاج کو باقی رکھا اگر خالص زبان کے یہ شیدائی نہ ہوتے تو شاید اُردو ایک کتابی زبان بن کر رہ جاتی۔ عوامی زبان سے وابستگی کا یہ اثر تھا کہ اہلِ لکھنؤ علی العموم تکرار اضافت کو بُرا سمجھتے ہیں اور جہاں تک ہو سکتا تھا بول چال کی زبان سے قریب تر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ غالب پرستی کے جوش میں بعض نااہل نقالوں نے جب یہ سمجھ لیا تھا کہ اضافت کی تکرار اور فارسی تراکیب کی بھرمار ہی حسنِ شعر ہے تو لکھنؤ والوں نے زبان کی اہمیت پر زور دے کر حسنِ زبان کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ جو اپنی جگہ پر خود ایک مستحسن عمل تھا۔

بعض لکھنوی محاورہ و روزمرہ سے ہر انحراف کو "دہقانیت" پر محمول کر کے اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن سراج کے زمانے تک آتے آتے اس کا احساس خاصا عام ہو چلا تھا کہ اُردو زبان پر کسی ایک خاص شہر کی چاہے وہ لکھنؤ ہی کیوں نہ ہو، اجارہ داری نہیں ہو سکتی چنانچہ سراج اپنے مجموعہ کلام "شعلۂ آواز" کے مقدمے میں اس کو واضح طور سے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اُردو زبان کے متعلق بعض حضرات کا اب بھی خیال ہے کہ ہماری بات چیت اس کی مٹھاس اور شائستگی چند محلّوں میں، زبان و محاورہ کی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ، خالص ہے اور اِن حدود کے باہر وہ باصطلاحِ عوام "نخالص" ہو جاتی ہے۔ بھلا وہ زبان ہی کیا جو صرف دہلی اور لکھنؤ کے چند محلّوں میں چکر کاٹتی رہے۔ وہی زبان لٹریچر کہلانے کی مستحق ہے جس میں عالمگیر صلاحیت ہو اور جو آفاقی طور سے مقبول ہو — اہل لکھنؤ اور اہلِ دہلی اب اس (اردو) کے تنہا وارث نہیں رہے۔ اب ملک کے ہر حصے میں ادیب، انشار پرداز اور شاعر اُردو زبان پر عبور حاصل کر چکے ہیں اور ہندوستان کے ہر گوشے میں یہ زبان ایک خاص حیثیت رکھتی ہے"۔

ویسے سراج نے کوئی انقلابی بات نہیں کی ہے۔ دوسرے بھی یہ کہتے آئے ہیں، لیکن کسی لکھنؤ والے نے اور وہ بھی کسی مانے ہوئے لکھنوی شاعر یا ادیب نے یہ بات اتنی قوت سے اس سے پہلے شاید ہی کہی ہو۔

سراج عہد قدیم کے مطعون لکھنوی غزل گویوں کے نمائندے نہیں ہیں۔ وہ اس دور کی یادگار ہیں جب رسوا، صفی، اور عزیز وغیرہ کی کوششوں کی بدولت غزل گوئی میں ایک دورِ تجدید شروع ہوا لکھنؤ کا دورِ انحطاط کی غزل گوئی جو دلی کی انحطاط پذیر غزل گوئی کا اگلا قدم تھی مشقِ سخن کا ایک سانچا اور زبان و بیان کے کرتب دکھانے کا ایک

ذریعہ رہ گئی تھی۔ مسدس، مثنوی، رباعی، قصیدہ، سلام و اسوخت وغیرہ کے عروج و رواجِ عام میں یہاں کی غزل، حلقۂ بیرون در بن گئی تھی۔ جن لوگوں نے غزل کو پھر ابھارا اُن میں صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، آرزوؔ، اثرؔ ہی کی طرح ذرا بعد میں آنے والے سراج کا نام بھی لیا جائے گا۔

لکھنوی اساتذہ کی اکثریت صاحبانِ علم پر مشتمل تھی۔ لکھنؤ علوم عربیہ کا بہت بڑا مرکز رہا ہے اور وہاں کی ادبی مجلسوں میں بھی علم و فن کے قدرداں بہت تھے۔ لکھنؤ کے عالم ادیب اور شاعر علمی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے اور بول چال کی زبان پر بھی۔ دونوں کا حسین امتزاج ان کے یہاں خاص طور سے نمایاں ہے۔ یہی نہیں کہ لکھنو والے اپنی زبان کو سینے سے لگائے رہے بلکہ انہوں نے اس پر حاکمانہ تصرف بھی کیا۔ انھوں نے نئی نئی ترکیبیں ایجاد کیں، بیان کے نئے نئے گوشے تراشے اس سلسلے میں بھی سراج کی کوششیں قابلِ ذکر ہیں۔ زبان و بیان کے معاملے میں سراج نے تفصیل سے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ یہاں اس کا ایک مجمل اقتباس اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ اس دور کے لکھنویوں کے خیالات پر روشنی پڑ سکے۔ سراج کا قول ہے۔

"میں کوشش کرتا ہوں کہ نظم میں نشست الفاظ، نثر سے قریب تر ہو۔ مفہوم واضح، صاف، اور مافی الضمیر آئنہ ہو۔ الفاظ کم سے کم اور معنی زیادہ سے زیادہ ہوں"۔

رہی محاورے سے قربت کی بات، تو یہ تو انہیں لکھنوی ہونے کی وجہ سے "بے سعی کئے حاصل ہے"۔ اسی کے ساتھ سراج جدت و ندرت کے دلدادہ ہیں اور "انداز بیان کی تازگی پر فریفتہ" — یہ دہرانے کی بات نہیں ہے کہ ایک مٹتا ہوا نقش اور پسپا ہوتا ہوا معیار ہے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انہیں ارباب قلم کی کوششوں سے ہماری زبان میں یہ وسعت مہیا ہوئی ہے کہ وہ جدید تر راستوں پر بے خوف و خطر چل سکے۔

اگرچہ سراج نے لکھا ہے کہ وہ زبان کے ساتھ فکری عنصر کو بھی ضروری سمجھتے ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ سراج کے یہاں فکری عنصر ہلکا ہے۔ انہوں نے اس کو تسلیم کیا ہے کہ "سماج کی اور زندگی کی تعمیر بھی شعر کا مقصد ہے، لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ "تعمیری مقاصد کے لئے غزل کے مقابلے میں نظم کا میدان زیادہ مناسب ہے اور نظموں کا سارا بوجھ غزلوں پر نہیں ڈالا جا سکتا۔" سراج بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اس لئے انہوں نے تعمیری مضامین کو حتی الوسع غزل سے دور رکھا ہے اگر کہیں بات آ ہی گئی ہے تو اشاروں، کنایوں میں، سماجی ہی نہیں سیاسی قسم کے مضامین بھی انہوں نے غزلوں میں نظم کئے ہیں۔ اس طرح استعاروں میں لپیٹ کر کہ ان پر مقصدیت کا گمان نہیں ہوتا۔ ہاں بعض اوقات یہ پردے اٹھ بھی جاتے ہیں۔

بھلائی روشنی کے سورج، پیام کیا دیں گے صبح نو کا
خدائے امروز بن کے بیٹھے ہیں اور کل کی خبر نہیں ہے

انسانیت کے خون سے ہولی تو کھیل لی
تاریخ باز پرس کرے گی بہار سے

یہ تقسیم گلستاں خوب تھی نام و نشاں بدلے !
قفس بدلے قفس سے آشیاں سے آشیاں بدلے

نہ پوچھو آہ یہ تعمیر کے علمبردار
نہ جانے کتنے نشانِ مزار کھو بیٹھے

ان اشعار سے سراج کے سیاسی اور سماجی معتقدات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اُن کی آواز میں ایک دبی ہوئی شکست خوردگی ایسی بھی ہے جس نے اُن سے مستقبل کا یقین چھین لیا ہے۔ اُن کی وابستگی زندگی اور اقدار زندگی سے رومانوی انداز کی ہے۔ جب بھی یہ طلسم ٹوٹتا ہے اور شیرازہ بکھرتا ہے تو وہ سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کا زخم خوردہ ضمیر کراہتا ہے اگرچہ وہ اس کاروبارِ زندگی میں گرفتار ہیں لیکن وہ یہاں رہنا نہیں چاہتے وہ تو دراصل عشق و محبت کی دنیا کے لئے بنے ہیں

چلنا ہے ساتھ ساتھ زمانے کے کیا کروں
رُخ پر ہوا کے بہتا چلا جا رہا ہوں میں

تو ہی پکار مرا نام لے کے اے غم عشق !
پڑا ہے وقت غمِ روزگار میں گم ہوں

ہمیں اس سلسلے میں سراج سے کوئی شکایت نہ کرنا چاہیئے انھوں نے تو خود غزل کے لیے چند مضامین اور موضوعات کو کم موزوں بتایا ہے۔ ہاں عشق و حسن کی بات جس میں مجاز و حقیقت دونوں آجاتے ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ اگرچہ یہ وہ موضوع ہے جس کے گرد تغزل کے مقررہ اصول صدیوں سے گردش کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا شاید ہی کوئی ایسا مضمون رہ گیا ہو جو نظم نہ ہوا ہو اور تکرار و توارد سے لے کر سرقے تک کے الزام کا مواد نہ بنا ہو۔ سراج نے اس مسئلے پر بھی اپنی رائے کھل کر دی ہے۔ اُن کے خیال میں " شاعری میں خیالات قرض لینا عیب نہیں بشرطیکہ اصل قرضہ معہ سود کے واپس کر دیا جائے۔ اور مقروضہ رقم سے کچھ پاس نہ رکھا جائے۔" اس اقرار کے بعد یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ سراج کے یہاں بازگشت کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن اس بات کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے کہ وہ گھسے پٹے مضامین میں بھی نیا پہلو یا طرزِ اظہار کا نیا گوشہ نکال لیتے ہیں۔ اب کچھ شعر سنیئے۔

جان سی شے کی مجھے عشق میں کچھ قدر نہیں
زندگی جیسے کہیں میں نے پڑی پائی ہے!

وہ گل ہوں وقت کی چٹکی جسے مسل بھی چکی
نہ جانے کس کا اُڑایا ہوا غبار ہوں میں

یہ نہ پوچھ پھول برسے کہ گری دلوں پہ بجلی
ذرا دیکھ آئینے میں کبھی اپنا مسکرانا

دیکھ رہے ہیں جس کو سب، اُس کی نظر ہے کس طرف
دیکھنے کی جو بات ہے وہ کوئی دیکھتا نہیں

دیکھیے تو اشک سے صبحِ تبسم کا سلوک
مہر کو اک قطرۂ شبنم سے ٹکرایا گیا

نظر جب تجھ سے ملتی ہے تو یہ محسوس کرتا ہوں
کہ جیسے میرے حصے کی قیامت آئی جاتی ہے

کبھی جلتے ہوئے آنسو، کبھی ٹھنڈی سانسیں
ہم سے جس طرح بنا، ہم نے تمہیں یاد کیا

رو دینے کو اکثر جی چاہا، ہنستا ہی رہا رویا تو نہیں
میں اور خیالِ ترکِ وفا، توبہ، توبہ، ایسا تو نہیں

یہ آدھی رات یہ کافر اندھیرا
نہ سوتا ہوں نہ جاگا جا رہا ہے

حسنِ پسِ حجاب کی شوخی تو دیکھیے
ہر دل میں اک چراغِ تمنا جلا دیا

سراج کی زبان دانی اُستادی کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ اُن کے یہاں شاعری سے احتراز کی ارادی کوشش کا احساس ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں فنی احتساب کی گرفت ڈھیلی بھی ہو جاتی تھی۔ یہ کیفیت استثنائی اور علی العموم ناقابلِ اعتنا ہے، لیکن اُن جیسے اُستاد کے یہاں اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ بعد میں سند نہ بن جائے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

اے چرخ کاش آگ لگے تیری چال میں
اک رُوح تھی ہر آرزوئے پائمال میں

مجھے یہاں "کاش" حشو معلوم ہوتا ہے۔ دعا اور آرزو کے مثبت اظہار کے لیے تو یہ موزوں ہے لیکن "آگ لگے" بد دعا کے موقع پر استعمال ہوتا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ اس لئے "کاش" کا استعمال بے سود ہے۔ اگر "چرخ کاش" کی جگہ صرف "آسمان" یا "چرخ پیر" جیسا فرسودہ ٹکڑا بھی ہوتا تو یہ بات پیدا نہ ہوتی۔

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے

جنبش ہے کس کے پردۂ حسن و جمال میں
اک برق ہے جو کوند رہی ہے خیال میں

مصرعہ اولیٰ میں "کس کے" کا ٹکڑا اس لیے زائد ہے کہ سوال کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے اگر "کس کے" کو "آج" سے بدل دیا جاتا تو شاید بہتر ہوتا

ایک شعر ہے۔

ویران سی ایک آبادی ٹوٹا سا ایک آئینہ
افسوس یہ وہ دل ہے تو جس کی تمنا ہے

کاش شاعر کے ذہن میں "افسوس" کی جگہ "اللہ" کا ٹکڑا آیا ہوتا، تو شعر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا اور لطفِ زبان بھی پیدا ہوتا۔

شاعر کا ایک شعر ہے۔

(بقیہ ص۲۱ پر)



خضر برنی

پھول والوں کی سیر

(۱)

گنگناتے، مسکراتے بڑھ چلو کچھ تیز گام
دعوتِ جشنِ بہاراں کا ہوا ہے اذنِ عام
کالے نیلے بادلوں کا ایک عالم چھا گیا
دوستو اب دل کے بہلانے کا موسم آگیا
سنسنائی کیفیت میں جاگ اٹھتا ہے خمار
رہ نہیں سکتے ہیں پھر خاموش خود ہی بادہ خوار
نکہتِ گل سے ہوا، ابرِ بہاراں کا سنگار
جھومتی شاخوں پہ دیکھیں چل کے جوبن کی بہار
زمزمہ سازی مسرت کی ہوائیں چل گئیں
گل فروشانِ چمن کی اب دعائیں پھل گئیں
یہ خنک اور تازہ جھونکے کیف و مستی سے ہیں چور
نکہت افزا سانس لیتی ہیں فضائیں دور دور
خوشنما گلشن میں زیرِ آسمانِ نیلگوں
چھاؤں رنگیں بادلوں کی ہر طرف افشاں ہے یوں
شام کی ہلکی سیاہی صبح کا رنگیں سماں!
جس کے دیکھے سے ہر اک شے ہو ہی جاتی ہے جواں

(۲)

کچھ سکونِ دل میسر ہو تو ہٹ جاتا ہے غم
یہ چند لمحوں کی خوشی حاصل اگر ہو بیش و کم
جاں فزا، اور روح پرور ہے بہاروں کا سماں
اک تبسم زار ہے یہ لالہ زاروں کا سماں
چین لینے ہی نہیں دیتی ہے غم کی کائنات
دل کے بہلانے سے آخر کچھ تو ملتی ہے نجات
قہقہوں سے گونج اٹھی ہے مسرت کی بہار
آج مہرولی، دلہن کے روپ میں ہے لالہ زار
مسکراتے ہیں یہاں شاداب نسرین و سمن
رقص پیرا ہیں شمیم یاسمن و نسترن
قومی یکجہتی سے روشن ایک عنواں ہو گیا
شیخ و پنڈت کو بھی سبر گل فروشاں ہو گیا
اتحادِ باہمی سے پھوٹ نکلی ہے کرن
ایک ہی گلشن کے غنچے ہیں چنبیلی، نسترن
دھوم سے میلہ لگا خواجہ کے اس دربار میں
نذر کرتے پھول لائے ہیں سب ہی سرکار میں

(۳)

گل بداماں ایک پنکھا پرچم تمہید شوق !!
جو فزوں کرتا ہے دل میں علم و فن کا اور ذوق
یہ ہے مقصودِ محبت یہ ہے بنیادِ کرم
حسرتوں کا ایک مخزن، آرزوؤں کا بھرم
ایک ماں کی منت کا یہ کرشمہ بن گیا
سچ تو یہ ہے راحتوں کا ایک چشمہ بن گیا
لے کے اس تحفے کو جس دم ماں چلی دربار میں
ایک لشکر ساتھ میں تھا، کوچہ و بازار میں
جبکہ مندر یوگ مایا کا نظر آنے لگا
پھول والوں کا یہ مجمع اس طرف جانے لگا
بھینٹ کرنے پھول مالا اُن کے دوارے آگئے
کر کے درشن اپنی دیوی کے سہارے پا گئے
بابِ خواجہ سے ملا اُس کی دعاؤں کو اثر
ہو گیا آزاد قید و بند سے لختِ جگر
اس نے مانگی تھی یہ منت خواجہ کے دربار میں
ساتھ میں نورِ نظر کو لاؤں گی سرکار میں
اک حقیقت جس کی یہ رنگین اک تحریر ہے
یہ حکایت اکبرِ ثانی کی اک تصویر ہے
ایک شہزادے کے باعث گل فشانی کی جھلک
اک حقیقت بن گئی ہے خود کہانی کی جھلک
یہ روایت اک رفاہِ عام ہو کر رہ گئی !
پھول والوں کے لیے انعام ہو کر رہ گئی !!
اک لگن سے جس کو منواتے تھے خود شاہ ظفر
اس میں ہوتا تھا شریکِ کار ہر فرد و بشر
بارہا نہرو اعظم بھی ہوئے ہیں ملتفت
جس میں خود شرکت کیا کرتے ہیں صدر مملکت
الغرض پھیلی ہوئی ہیں عیش کی پرچھائیاں
اک طرف گلکاریاں ہیں اک طرف رعنائیاں
شادکامی سے ہوئے مسرور سب پیر و جواں
رنج و کلفت کا نہیں ہے دور تک نام و نشاں
نونہالانِ گلستاں ہیں قطار اندر قطار
دے رہا ہے مژدۂ تعمیر دورِ روزگار

(۴)

یوں نظر آتی ہیں رنگیں ٹولیاں محوِ خرام !!
نیلگوں موجوں میں جیسے کشتیوں کا رقص عام !
یہ نمائش، یہ دکانیں، یہ سجاوٹ، یہ نکھار
دل کی اک گونہ مسرت کے ہوئے آئینہ دار
اک طرف تالاب میں موجوں کا پرچم دیکھئے
دور ناظر باغ اور جھرنے کا عالم دیکھئے
کچھ امیروں کے مکاں ہیں کچھ وزیروں کے مکاں
آج تک محلات شاہی کے نمایاں ہیں نشاں
سامنے بارہ دری، ملکہ زمانی کا ہے گھر
جس پہ اک میلہ لگا رہتا ہے ہر شام و سحر
ہے نہیں تخصیص کچھ شیخ و برہمن کی یہاں
سب کے سب ہیں جشن میں گویا برابر ہم زباں



جوگندر پال

قید و بند

دارالخلافہ کے نواح میں مرکزی جیل خانہ اپنی چاردیواری کے اندر رات کے گھٹے گھٹے اندھیرے میں اوندھا پڑا تھا اور اس کی روح سنگینوں سے بچ بچ کر بیرونی دروازے کی طرف آرہی تھی، کچھ اس طرح جیسے پہرے داروں کو روئی کے گالوں کے مانند رکھ رکھ کے نہ دکھائی دیتی تھی، نہ کھٹکے کے خیال ہوتا تھا لیکن یہاں گیٹ پر پہنچ کر اس اندھی اندھی روشنی میں وہ صاف نظر آنے لگی۔ پکڑی گئی۔ اس کی فرار کی نیت نے اس کی پرچھائیں بن کر اس کے پیچھے چھپ جانا چاہا مگر روشنی میں تو سب سے پہلے سیاہ پرچھائیں پر نظر پڑتی ہے۔

"رجیا سالا دوجی بار پکڑا گیا ہے۔ بھرادار"

دوسرے دن دو قیدی جیل کی عقبی دیوار پر ایک تازہ شگاف کی مرمت کر رہے تھے اور اُن سے کچھ فاصلے پر ایک گارڈ اُن کی جانب بیٹھ کے گنا چوس رہا تھا۔

"تو کیا ہوا" بھرادر کا اصلی نام سلطان تھا، لیکن وہ ہر چھوٹے بڑے کو برادر کہہ کر بلاتا تھا اس لیے خود بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ "اگر پاک پروردگار نہ پکڑے برادر تو انسانوں کی پکڑ دھکڑ سے کیا ہوتا ہے"

"کیا ہوتا ہے؟" کرتارے نے دیوار کے سوراخ میں ایک اینٹ جڑتے ہوئے باہر کی طرف جھانکا جہاں اس کا سایہ سوراخ کے عین سامنے دیوار کے سائے میں نگری ہوئی دھوپ میں بند تھا۔ "بندی کے بیل، بچے اور بیوی — سب باہر والے ہڑپ کر جاتے ہیں۔"

داڑھی مونچھ میں چھپا چھپا کرتارے کا خوفناک منہ اس طرح دکھائی دینے لگا، گویا سُرخ زمین پر میلی میلی گھاس سے ڈھکا ہوا سانپوں کا بِل! "پرچھکر نہ کرو برادر، سوا لاکھ دے کھالسے کو ایک بار باہر پونچ لینے دے پھر دیکھنا" کرتارے نے ایک اینٹ کو دوسری طرف دے مارا اور دونوں کو توڑ پھوڑ کر ہنسنے لگا۔ برادر بھی اس کی ہنسی میں کھل کر شامل ہوا۔ اور پھر وہ دونوں اپنی آواز کو سُن کر ڈر سے گئے۔ گارد اپنا گنا پھینک کر اُن کی جانب دوڑا۔

"کیوں برادر، کوئی پھساد کھڑا کرنے کا کھیال ہے؟" گارد نے اپنا دایاں ہاتھ پیچھے کر کے ڈنڈا کمر سے لٹکا لیا۔ تاکہ برادر کو غصہ نہ آجائے۔

ہاں! برادر ہنسا تو اس طرح لگا جیسے اس کا سارا چہرہ اپنے بائیں گال پر چاقو کے ہلتے ہوئے گہرے نشان کی طرف دیکھ دیکھ کر خوف سے بھاگ جانے کی سوچ رہا ہو — "یہاں اس دیوار سے باہر فساد دیوانہ وار ناچ ناچ کر اودھم مچا رہا تھا ——— اور ہم دونوں اُسے روک کر آرام سے کھڑے ہوئے کو کہہ رہے تھے۔

لا، ایک سگریٹ دے۔"

گارد نے اپنی جیب سے سگریٹ کا ایک ٹکڑا نکال کر اسے دیا۔"
برادر تم ہمورے گھر آئے ہو، اسی لئے تھوری سیوا کرتے ہیں۔ کل ہم بھی تمورے گھر آئیں گے۔ اور خوب دودھ لسی پئیں گے۔"

"ہاں، ہاں، خوب" برادر ماچس لینے کے لئے کھڑا ہونے لگا تو اس کے کپڑوں کے اندر لوہے کی بیڑیوں نے ذرا سی کھڑکھڑ کی۔" اور جب تم گھر آؤ گے برادر، تو ہم تمہیں ان سے بھی موٹی موٹی بیڑیوں میں ڈال دیں گے۔"
"اس پر ہمورا کیا دوش برادر؟ ہم تو کھد تاش کے گیارہویں پتے ہیں"
"پر درو گے، تم باہر جا کے کوئی اور کام وام کیوں نہیں کرتے، ادھر جیل میں —"

"سردارا۔" گارد نے کرتارے کو جواب دیا" بابا نے مرتے وکھت جمین نہ چھوڑی ہو تو باہر بھی جیل سے کم نہیں —"
پھر وہ اچانک چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا — جلدی جلدی اینٹیں لگاؤ سردار جی — اور برادر، تم ابھی تک سگریٹ پی رہے ہو۔ جیلر صاحب دیکھ لے گا۔ تو ساری موری سامت آ جائے گی۔

"تو کبھی اپنے گھر بھی جاندا ہے درو گے؟" کرتارے نے دیوار کے شگاف میں ایک اور اینٹ جوڑی تو برادر بھی مصروف نظر آنے کے لئے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ہاں ہر سال جاتا ہوں سردار جی۔ سال میں گیارہ ماس جیل اور ایک ماس گھر" وہ خوش ہو ہو کر انھیں سنانے لگا۔" میری لگائی بڑے مجے کی اورت ہے۔ میں گھر کی چوکھٹ پر کدم رکھتا ہوں تو چور چور چلانے لگتی ہے اور میرے گلے سے لگ کر جیبوں سے گیارہ ماس کی کمائی لوٹ لیتی ہے اور موہے بہت اچھی لگتی ہے — اینٹیں لگاؤ! — اینٹیں لگاؤ سردار جی" اس نے گویا یکبارگی اپنے گھر سے آواز دی۔ پھر بھاگا بھاگا ان کے پاس آ گیا اور اُن کی جانب دیکھ کر کہنے لگا:" ارے کیا گجب کرتا ہے برادر، جلدی جلدی کام کھتم کرو، سالی چھٹی ہو۔ تو ہے تو ادھر کا پرانا تجربا ہے۔ وہ ہمارا کالا بھوت جیلر ساب —"
کرتارے نے غصے سے جیلر کی خیالی شکل پر تھوکا تو اس کی داڑھی

لتھڑ گئی۔

"ہمارے یار رجب کا کیا حال ہے برادر؟"
"تمورے یار کی آج سالم تین گھنٹے پٹائی ہوتی رہی۔" گارد نے غیر شعوری طور پر اپنا ڈنڈا کمر سے ہٹا لیا اور گویا رجب کا درد محسوس کرنے کے لئے اُسے زور سے اپنی دائیں ران پر مار لیا —" اتنی پٹائی ہوئی کہ تمورے یار کی کم سے کم دس ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں گی۔ جندا رہا تو کید کے باکی دن چپ چاپ گجار دے گا۔"
کرتارے نے دو اور اینٹیں زور سے ٹکرا کر توڑ پھوڑ دیں۔
اور گارد خوف زدہ مسکراہٹ سے کہنے لگا:" برادر کسو دن تمورے یار سردارے کی بھی وہ ہی دشا ہو گی جو آج رجب کی ہوئی ہے۔"
"جا جا، اپنا کام کر، درو گے نہیں تو —"
"میں تو اپنا کام ہی کر رہا ہوں سردارا" گارد کو یاد آیا کہ وہ اپنا گنا پھینک کر ادھر چلا آیا تھا — تمورے بھا بڑے کی بات کہی ہے۔ کیوں برادر؟"
وہ گنا چوسنے کے لئے پھر اپنی پہلی جگہ کی طرف مڑ گیا لیکن راستے میں رک کر پھر گویا ہوا "تو ہمورے جیلر صاحب کو کھوب جانتا ہے سردارا، بگڑے ہوئے کیدی کو نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔ کوئی گڑبڑی کی ذمے دار کھد آپ ہی ہو گے۔ مجھ پر الجام نہ دینا۔ رجب کی مشکیں کسوا کر جیلر نے کال کوٹھری میں پھنکوا دیا ہے۔ اور وہاں کال کوٹھری میں ایک صندوک رکھا ہوا ہے جس میں دو کالے ناگ پھنکار پھنکار کر مار کھاتے ہوئے اپرادھی کے دباگ کو کاٹتے رہتے ہیں — کیوں برادر؟ —"
اس نے آگے بڑھ کر اپنا گنا اٹھا لیا۔
برادر کرتارے کو ٹھنڈا کرنے لگا "اس بے چارے پر غصہ کرنا لاحاصل ہے برادر"
"نہیں برادر اپنے سالے رجب کا حال سُن کر مجھے جرا جکر آ گیا تھا۔" کرتارا اپنے سر پہ جوڑا کھول کر اسے پھر کس کر باندھنے لگا۔" آؤ اب جلدی جلدی یہ اینٹیں جوڑ لیں۔"
"ہاں آؤ۔"

چند لمحات وہ چپ چاپ کام میں جُٹے رہے۔

"بھرادر"

"ہاں برادر"

"رجب ادھر بھاگہ (بھاگ) نکلتا تو سیدھا کیدھر جاندا؟"

"جہاں بھی جاتا برادر وہ اسے یہیں لے آتے۔ تم لوگ خوامخواہ جوانی کے جوش میں اپنے دوزخ کا بھی ستیاناس کر لیتے ہو۔"

"نہیں برادر، ستیاناس کا سوا ستیاناس کر کے ہی چین آندا ہے، میں اگر جیل سے بھاگ جاؤں تو سب سے پہلے ایسر پٹواری کے پُتر کے ٹوٹے کردوں، جس نے میری بی بی کے سنگ چھیڑ دکھائی کی تھی۔ پھر اپنی بی بی کے ٹوٹے کردوں جو میری کید پر مگر مچھاں دے آنسو بہاتی رہی، پر چھ ماس بھی نہ گجرے کے میرے بیلی، میرے بچپے کے اپنے اسی یار کے گھر جا بسی۔

"میں تو چور آدمی ہوں برادر۔ خدائی خدا کی ہے اسلئے میرے تیرے بھول کر اندھیرے میں جو شے ہاتھ لگے خدا کی دین سمجھ کر چُپکے سے استعمال کر لو۔ یہی خدا کی مرضی ہے —— لو، یہ اینٹ بھی جوڑ دو۔"

چند ثانئے وہ پھر چپ چاپ کام کرتے رہے۔

"ہاں بھرادر، کرتارے نے سر اُٹھایا جواب ٹھنڈا ہو کر مسکرا رہا تھا۔ تم ٹھیک کہندے ہو۔ میرا تیرا سب بکواس ہے۔ جر اجیل سے نکل جاؤں پھر میں بھی چین سے تماری تراں چور بنوں گا۔"

"سکھی رہوگے —— لو اب یہ آخری اینٹ بھی لگا لو" برادر کے لہجہ میں بڑے بھائی کی شفقت تھی: "یہاں آؤ برادر تو باہر کی دُنیا کو اپنے آپ پر بند کر لو اور باہر جاؤ تو یہاں کی دنیا کو ذہن سے خارج کر دو۔ اس طرح یہاں آنا جانا بڑا آسان ہو جاتا ہے نہ آنے کا قلق نہ جانے کی بے صبری۔"

"رجبے نے بلا وجہ اپنی ہڈیاں تڑوالیں۔ کام سے فارغ ہو کر کرتارے نے دیوار سے منہ موڑ لیا۔

"قید بھگتنے کا سلسلہ آتے آتے ہی آتا ہے برادر" برادر نے اُسے بتایا" اور تو اور جب مجھے بھی پہلی بار جیل ہوئی تھی تو ایک ایک دن عمر قید کی طرح لمبا معلوم ہوتا تھا۔ روز تڑکے نیا جنم، روز رات کو نئی موت، لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اے برادر تو مسلمان ہے، یار بار مرنے اور پیدا ہونے کا کفر اپنے سر لے گا تو اگلے جہاں میں بھی یہی جہنم ہوگا۔ اور تو —— تو برادر —— میرا یہ سوچنا تھا کہ اس پاک پروردگار کی رضا سے اس جہنم کی صعوبتوں نے میری طرف سے از خود منہ موڑ لیا۔

کرتارے نے برادر کے آخری فقرے سے الجھن محسوس کر کے سوچا کہ چنگے سے چنگا مسلمان اپنی ارلی بھارسی جتانے سے باج نہیں آندا" پر برادر میں اپنے رجبے کی بات کر رہا تھا۔ جیلر سالا بڑا جالم ہے۔ شیتان کا تُخم: ——"

"برادر ہر جہنم —— " برادر کرتارے کی الجھن دور کرنے کے لئے جہنم کا ترجمہ کرنے کے لئے رُک گیا —— نرک، نرک ہی ہوتا ہے۔

اسی دوران میں دوپہر کے کھانے سے پہلے دعا کی وارننگ بیل سُنکر گارد فوراً اُن کے پاس چلا آیا۔

"چلو برادر، رب کی حاضری بھرنے"۔ ایک سر پھرے ڈائرکٹر جنرل کار جیلز و یل فیئر نے اس جیل کا دورہ کیا تھا تو اس نے یہ تجویز کیا تھا کہ سماج کے ان پھوڑوں کا علاج آپریشن نہیں، ہومیو پیتھی ہے یعنی انھیں میٹھی میٹھی گولیاں دے کر ان کا خون صاف کرنا چاہئے۔

ڈائرکٹر جنرل نے جیلر کو ہدایت کرنے کے انداز میں یہ سوال کیا تھا کیا ان بدقسمت مجرموں کی اہم ترین ضرورت یہ نہیں کہ اُن کی آتما ئیں بول بول کر نیک بننے کی خواہش کریں۔ اس نے تجویز کیا تھا کہ جیلر ہر روز دوپہر کے کھانے سے بیشتر قیدیوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کر کے ان سے ایک ایسی پرارتھنا بلوائے جو ہر مذہب کے قیدی کے لئے سود مند ہو۔

"لیکن میں یہ پسند کروں گا —" جیلر نے اجازت طلب کرنے کے لئے کہا تھا —، کہ دعا کے وقت قیدیوں کے ارد گرد میری کل گارد موجود ہو۔"

" ہاں یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟" ڈائرکٹر جنرل نے ہنس کر جواب دیا تھا: "یہ تو قانون ہے کہ مجرم پھانسی سے پہلے اپنی آخری پرارتھنا بھی کر رہا ہو تو اس کے سر پر گارد موجود رہنی چاہیے۔"

برادر اور کرتارا سر جھکائے گارد کے آگے آگے چل رہے تھے۔

کرتارے کا تصور اُسے اپنے گاؤں کے تیئں پیپل کے گوردوارے میں لے گیا تھا جہاں دربار صاحب کا بھوگ پڑھ کے وہ اپنے دل میں یہ آواز بلند للکارا کرتا تھا۔ "راج کرے گا کھالسہ آکی رہے نہ کو۔ آکی رہے نہ کو —— آکی رہے نہ کو۔"

اس نے جھلا کر برادر کی طرف سر اٹھا لیا —— "برادر، کھالسہ بے چارا تو جیل میں گل سڑ رہا ہے۔ تو بھی دھرم ایمان والا پرش ہے۔ ذرا سوچ کر بتا کہ دھرم کرم کی پستکیں جھوٹ کیوں بول دی ہیں ؟"

" دھرم کی کتابوں میں لکھے ہوئے الفاظ جھوٹ نہیں بولتے برادر" برادر کا ایمان گویا ہوا۔

" جھوٹ ہماری زبان بولتی ہے۔ ابھی میری زبان توتلی تھی جب میرے آبا نے مجھے قرآن پاک حفظ کروائی تھی اس وقت میرے پڑھنے کا انداز بڑا غلط تھا مجھے ان الفاظ کے معنی بھی معلوم نہ تھے مگر لکھے ہوئے الفاظ کا کرشمہ دیکھو کہ میرا ننھا منھا انجان دل نورِ اسلام سے معمور تھا۔ پھر کیا ہوا برادر ؟ پھر کیا ہوا برادر میری زبان پختہ ہوتی گئی عربی کا تلفظ نہایت شستہ ہوتا گیا۔"

یوں معلوم ہونے لگا تھا کہ برادر کرتارے کی موجودگی سے غافل ہو کر خود کلامی کرنے لگا ہے "لیکن دین کا نور میرے دل و دماغ سے مدھم پڑتا گیا اور پھر کیا ہوا برادر ؟ —— میں چور بن گیا، اپنا چور، سب کا چور ——، اب یوں لگ رہا تھا کہ شیطان نے اس کی مشکیں کسوا کر اُسے رجب کی طرح کال کوٹھری میں پھنکوا دیا ہے، اور اس کے قریب ہی کال کوٹھری میں کالے ناگ پھنکار رہے ہیں ——

" برادر اب کے جیل سے چھٹی ہوئی تو میں چوری دوری ترک کر دوں گا —— صرف ایک بار چوری کروں گا، صرف ایک بار: تاکہ کسی طرح حج کی رقم بن جائے اور وہاں جا کے توبہ کر آؤں کہ آئندہ کبھی چوری نہ کروں گا —— نہیں برادر، میں ایک بار بھی چوری نہ کروں گا۔ چوری کی رقم سے حج کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ میں یہیں قبلہ کی طرف منہ کر کے جی ہی جی میں اپنے سب گناہ بخشواؤں گا۔"

کرتارا کچھ سمجھتے ہوئے، کچھ نہ سمجھتے ہوئے برادر کے منہ کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ "تم تو ہمارے پنڈ کے مولوی سے بھی اچھا لیکچر کر لیتے ہو برادر۔"

"نہیں برادر، اب میں جیل میں کبھی نہیں آؤں گا۔ شیطان کی پناہ کبھی نہیں آؤں گا۔ کبھی چوری نہ کروں گا —— توبہ !"

برادر نے اپنے دونوں کانوں کی لویں پکڑ کر تین بار توبہ کہا

" میں بھی یہی چاہتا ہوں برادر، مجھے بتاؤ میں کیا کہوں ؟"

" تم بھی اپنے کانوں کو پکڑ کر تین بار توبہ کہو"

" توبا —— توبا —— توبا ! —— "

اور سردار خوش ہو گیا اور اپنے گاؤں کے گرنتھی کی طرح بڑے وشواس سے گانے لگا۔

" راج کرے گا کھالسہ۔ آکی رہے نہ کو" اس کا ایمان لوٹ آیا تھا۔

وہ دعا کے میدان میں داخل ہوئے تو وارننگ بیل کے بعد دوسری گھنٹی بجنے میں صرف ایک دو منٹ باقی تھے۔ میدان کے درمیان سب قیدی جمع ہو چکے تھے۔ اور اُن کے اردگرد مسلح گارد صف آرا تھی وہ دونوں بھی اپنی نوع کے قیدیوں کی قطار میں گھس آئے۔ برادر نے اپنے ہمسایہ کے کان میں نہ جانے کیا ذرا سی بات کی کہ ایک سینیر گارد نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بڑی درشتی سے بولا "ایک تو اتنی دیر سے یہاں پہنچے ہو اور پھر صف میں کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہو۔" اور اس سے پہلے کہ برادر کوئی جواب دے پاتا، سینیر گارد نے اپنی مٹھی اس کے گریبان سے ہٹا کر ٹھوڑی کے نچلے حصہ پر جڑ دی۔

برادر کے دانتوں سے خون بہنے لگا۔ اور وہ اپنے آپ پر قابو پا کر صبر کی آیت دہرانے لگا۔ اِنّ اللّٰہ مع الصابرین

"تو مجھے اپنی عربی میں گالی دیتا ہے ؟" سینیر گارد کے منہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ " ہیں ؟ گالی ؟ یہ لے ایک اور ؟" اس نے برادر کی ٹھوڑی پر زور سے ایک اور جھٹکا دیا۔



ہندوستان کی ۵۴ کروڑ کی آبادی میں تقریباً پندرہ کروڑ افراد پڑھے لکھے ہیں۔ ابھی دو تہائی آبادی کے لئے تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔ خواندگی کا یہ تناسب (۳۰ فیصد) ہماری ۲۰ برس کی کوششوں کا نتیجہ ہے ملک کی آزادی کے وقت سو میں سے صرف بارہ افراد لکھ پڑھ سکتے تھے۔

ہمارا ملک ابھی معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ نہیں ہے اس لئے روزگار کے مواقع محدود ہیں۔ لہٰذا بعض افراد بے روزگاری کی وجہ سے تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں کیا ہم کوئی کاروبار اور کھیتی باڑی بھی تعلیم کے بغیر کر سکتے ہیں۔؟

تعلیم فرد کی شخصیت کو اُبھارتی اور نکھارتی ہے بلکہ صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے لہٰذا آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت تعلیم ہے خواندگی میں اضافے کا مسئلہ صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں ہے بلکہ دُنیا کے تمام نو آزاد ملکوں کے لئے بے حد اہم ہے کیوں کہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک ترقی کے دور میں اس لئے پیچھے رہ گئے ہیں کہ اُن کی تعلیمی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ غیر ملکی حکومت کے زمانے میں تعلیم کا اسی قدر انتظام کیا گیا جتنا حاکموں نے ضروری سمجھا۔

اب جبکہ دُنیا کے بیشتر ممالک آزاد ہیں تعلیم کی توسیع و ترقی پر زور دیا جارہا ہے۔ مگر اب بھی وہ سب کچھ نہیں کیا جا سکا ہے جو کرنا چاہئے۔ پھر بھی اپنے محدود وسائل کے اندر یہ ممالک جہالت اور توہمات کے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ اس پروگرام میں اقوام متحدہ اور اس کی مختلف تنظیمیں مختلف طریقوں سے امداد دے رہی ہیں۔

آج سے دو سال پہلے ۸ ستمبر کو تہران (ایران) میں تمام دنیا کے



اب لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم پر یکساں توجہ دی جارہی ہے

ممالک کے وزرائے تعلیم کی ایک عالمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہر سال اس تاریخ کو ساری دنیا میں خواندگی کا عالمی دن منایا جائے۔ اور تعلیم کی توسیع کی مختلف صورتیں اپنائی جائیں۔ اس فیصلے کے مطابق گزشتہ دو سال سے یہ دن منایا جا رہا ہے۔

ہمارا جمہوری ملک اس عالمی کانگرس سے پیشتر بھی تعلیم کی ترقی و توسیع کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ اور گذشتہ تین پنج سالہ منصوبوں کے دوران اس سلسلے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی جا چکی ہے

دو سو سال کی طویل غلامی کے بعد ہمیں آزادی نصیب ہوئی تو پڑھے لکھے افراد کی تعداد صرف ۱۲ فیصد تھی۔ بچوں اور نوجوانوں کی اکثریت تعلیم سے محروم تھی۔ چھ سے گیارہ برس کی عمر کے بچوں میں سے صرف ۲۵ فی صد



تعلیم بالغان کا ایک مرکز

اسکول جاتے تھے۔ گیارہ سے چودہ سال کی عمر کے گیارہ بچوں میں سے صرف ایک مڈل کا طالب علم تھا۔ اور ہائر سکنڈری امتحان پاس کرنے والوں کی تعداد صرف چار فی صد تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد تو بہت ہی کم تھی اور صرف اڑھائی لاکھ کے قریب طلبا اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

اگرچہ ملک کی ۸۰ فی صد آبادی گاؤں میں رہتی تھی مگر برطانوی عہد حکومت میں دیہی علاقوں میں اسکول بہت کم تھے۔ پسماندہ قبائلی علاقوں میں صرف گنے چنے اسکول تھے اور ہریجن بچوں کی تعداد بھی بہت



گاؤں کی عورتوں میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا

کم تھی۔ علاوہ بریں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی اوسط تعداد کم پڑھی لکھی تھی۔ نیز ان کے لئے اسکول بھی بہت کم تھے۔

ہمارے دستور میں درج ہدایتی اصولوں کے مطابق ۱۴ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کے لئے لازمی اور مفت تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے۔ ابھی ہم اس حد تک کامیابی حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن اس مختصر مدت میں اپنے محدود وسائل کے پیش نظر ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، وہ قابل فخر ہیں اس وقت درجہ اول سے درجہ پنجم تک کے طلبا کی تعداد



جموں وکشمیر میں ایک کنڈرگارٹن کلاس۔ اس ریاست میں بی اے تک تعلیم مفت ہے

کرتارا اپنے یار برادر کو ناحق پٹتا دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور بلا تامل آگے بڑھ کر سینیئر گارڈ کے منہ پر دو تین مکے جڑ دیئے "تو میرے یار کو بھرا دار کو بے بھول مارتا ہے؛ اب بتا! بتا اب!"

قیدیوں میں خوف و ہراس کی دبی دبی آوازیں اٹھنے لگیں۔ ساری گارڈ نے سنگینیں تان لیں اور اسی اثنا میں دو پیکر جیلر اور اس کی کاربن کاپی اسسٹنٹ جیلر پستول، پیٹی اور پالش شدہ بید سے لیس ہو کر دعا کے لئے پلیٹ فارم پر وارد ہوئے ان کے چہروں پر جھلاہٹ کا غلبہ تھا اور انھیں دیکھ کر قیدیوں کو آنے والے لمحات کی ہیبت سے دعا کے الفاظ بھولتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

جیلر کی پھٹی پھٹی دھمکی آمیز آواز سے سکوت ٹوٹا "ان دونوں ابراہیموں کو یہاں پلیٹ فارم کی ایک طرف کھڑا کر دو۔"

اور دعا شروع ہو گئی۔

"اے زمین و آسمان کے مالک! ہم بُرے ہیں ہمیں نیک بننے کی توفیق عطا کر!"

"زور سے کہو!" جیلر نے قیدیوں کو چابک مارنے کے انداز میں کہا "زور سے!"

اور اپنے آقا کا حکم منوانے کے لئے سکھ گارڈ نے اپنی آنکھوں کی دونالی بندوقوں سے گولیوں کی بارش شروع کر دی۔

"اے زمین و آسمان کے مالک!۔"

خدا کو محسوس ہو رہا ہو گا کہ سواستک اسٹین گنوں کا نشانہ بنی ہوئی یہودی قیدیوں کی بھولی بھٹکی بچی کھچی روحیں آخر آسمان کے دروازوں پر آ پہنچی ہیں۔

"اے زمین و آسمان کے مالک!"

"اے ہمارے باپ! ہمارے دلوں میں آزاد انسانوں کی سمجھ بوجھ پیدا کر!" اس کے بعد قیدیوں کے ہونٹ نہ جانے کیا کیا بولتے رہے لیکن اُن کے دل سے یہی صدا بلند ہوتی رہی۔ — آزاد! — آزاد! — آزاد! —"

اور پھر جیلر نے انھیں کڑک کر حکم دیا "خاموش!"

اور اس طرح سب قیدیوں کو پتہ چلا کہ دعا ختم ہو گئی ہے۔

"جاؤ! — تم ٹھہر جاؤ!" جیلر نے کرتارے اور برادر کو وہیں رُکا رہنے کو کہا۔

اور وہ سینیئر گارڈ بھی وہیں رُکا رہا جسے کرتارے نے ابھی پیٹا تھا اور باقی سب جیل برڈ دانہ دُنکا چگنے کے لئے جیل کے میس کی جانب ہو لئے۔

"سرکار" سینیئر گارڈ نے جیلر کو مخاطب کر کے اپنی رام کہانی شروع کی۔

"برادر اور کرتارا پریار تھنا شروع ہونے سے آدھا منٹ پہلے یہاں پہنچے اور برادر نے آتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔"

جب وہ اپنی کتھا سنا چکا تو جیلر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بید کو دوہرا کر کے گویا دل ہی دل میں ان دونوں کو دوہرا کیا اور اپنے لہجے میں ان کی ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز پیدا کر کے سینیئر گارڈ کو حکم سنایا "انھیں سیل میں ڈال دو، کھانا وانا بھی نہ دو اور جب میں کھانے سے فارغ ہو کر سہ پہر کو دفتر آؤں تو انھیں سزا کے لئے پیش کر دو۔ ڈسمس!"

اور سینیئر گارڈ نے سلیوٹ کر کے ان دونوں کو حوالات کی طرف ہانک لیا۔

"بھرادر!"

سہ پہر کو وہ دونوں حوالات میں بیٹھے پیشی کا انتظار کر رہے تھے۔

"ہاں بھرادر!"

"شیطان کا تُخم ہمیں کیا سزا سنائے گا!"

"زیادہ سے زیادہ مشکیں کسوا کر رجب کے ساتھ کال کوٹھری میں پھنکوا دے گا، اور کیا؟"

برادر کی ٹھوڑی اور گال پر چاقو کا نشان کسی چور کی چھری کی بجائے زیتون کی ٹہنی کی مانند اس کے چہرے پر پل رہا تھا "اس پاک پروردگار پر بھروسہ رکھو۔ اسی بہانے سے اپنے برادر کی خیر و عافیت معلوم ہو جائے گی۔"

"بھرادر، رجبے نے ٹھیک ہی کیتا۔ اگر پکڑا نہ جاندا تو اس نرک سے تو بچ جاندا"

ہاں برادر ــــ لیکن ہم نے برے اعمال کیے ہیں تو اسی حساب سے ہماری دوزخ سے رہائی ہوگی۔"

"میں تو چاہے ہاں کہہ بچاہے نیں۔ لیکن رجب کو کال کوٹھری سے نکل لینے دے۔ پھر ہم تینوں یہاں سے بھاگ نکلاں گے۔ تو نے نہ بھی کیتی بھرادر تو میں تجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کے لے بھاگوں گا" کچھ توقف کے بعد کرتارا گانے لگا۔

"راج کرے گا کھالسہ، آکی رہے نہ کو ــــ"

"چلو نکلو!" دفعتاً ایک گارڈ نے قفل میں چابی گھماتے ہوئے سلاخوں کے باہر سے بڑی کرخت آواز میں پکارا اور جب وہ جیلر کے دفتر کے کھلے دروازے پر پہنچے تو وہ انھیں کا منتظر بیٹھا تھا۔ "آجاؤ" جیلر نے انھیں اندر بلالیا "اور تم جاؤ۔" اس نے گارڈ سے کہا۔

جانتے ہو" جیلر نے اپنی کال کوٹھری کے صندوق کے کہاوتی ناگوں کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ "کہ میں تمھیں کیا سزا سُنا رہا ہوں؟"

وہ دونوں چپ چاپ اُس کا منہ تکتے رہے

"بولو!"

"ہمیں کیا معلوم برادر ــــ حضور"

"برادر حضور کے بچے، کام تو تم نے ایسا کیا ہے کہ تمہیں کال کوٹھری میں پھنکوا دوں۔ لیکن،" کالے ناگ کا تنا ہوا پھن ڈھیلا پڑ کر اچانک نیچے جھک گیا۔ ــ

"لیکن میں تمہیں معاف کر رہا ہوں"

دونوں ادھیڑوں نے تعجب سے جیلر کے ڈھیلے ڈھیلے چہرے پر نگاہ جمائی۔

"ایک شرط پر"۔ ناگ کا پھن پھر تن گیا۔ اس کاغذ پر تم دونوں دستخط کر دو۔"

اُن کا تعجب سراپا سوال بن گیا۔

"رجب مر گیا ہے!"

یہ سُنکر اُن کی گردنیں کندھوں سے اُچھل کر پھر اپنی جگہوں پر لوٹ آئیں ــــ

"اور میں یہ کیس تیار کر رہا ہوں کہ اس کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ قانون بھگوڑے قیدی کو پوری سزا نہیں دیتا اس لیے اسے قانون کے حوالے کرنے سے پہلے میں جی کھول کر اپنی گرمی نکال لیتا ہوں خواہ قیدی کی جان ہی کیوں نہ نکل جائے ــ"

برادر اور کرتار رجب کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ اور ان کے جسم لاشوں کی مانند جیلر کے سامنے ساکن ایستادہ تھے۔

لیکن اس کے لیے کاغذی کارروائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اگر تم میری بات مان لوگے تو میں بھی تمہارا خیال رکھوں گا۔ نہیں مانوگے تو کئی اور موجود ہیں۔" اپنی بات چیت کے ردعمل کا مطالعہ کرنے کے لیے وہ اُن کی جانب بغور دیکھنے لگا۔ "تم دونوں رجب کے دوست ہو۔ میں نے اس کاغذ پر تمہاری طرف سے تحریر کیا ہے کہ وہ بڑا خطرناک قیدی تھا۔ تم سب کو ہمیشہ بغاوت کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ یہاں سے بھاگ جانے کے لیے اُکسایا کرتا تھا۔"

یکبارگی برادر کی چور نظروں نے جھک کر محسوس کیا کہ جیلر کے پاؤں کے قریب سیاہ رسہ سا پڑا تھا اور چشم زدن میں اس نے جھک کر سیاہ رسے کا پتلا کنارہ پکڑ لیا اور اسے زور سے ہوا میں گھما کر دروازے کے باہر دے مارا۔

جیلر کی کال کوٹھری کے صندوق کا ایک کالا ناگ دفتر کے سامنے گارڈن میں گر کر تیز تیز کہیں غائب ہوگیا۔

جیلر ہانپنے لگا اور پھولے پھولے سانس سے اپنی کرسی سے اُٹھ کر برادر کے قریب آگیا۔

"مہربانی برادر"

اپنے آپ کو کھڑا رکھنے کا نااہل پاکر وہ دیوار کے قریب رکھی ہوئی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اس وقت تم جاؤ۔ میں اپنی بات کل صبح پوری کروں گا۔"

جیلر نے خوف کے غلبے سے آنکھیں بند کرلیں اور برادر اور کرتار اس کے دفتر سے باہر آگئے۔

"تو نے اس شیطان کی جان کیوں بچائی بھرادر؟ کیوں بچائی؟"

کرتارے کو برادر پر غصہ آرہا تھا۔

"میں کون بچانے والا ہوں برادر؟ اللہ نے آپ ہی بچا لیا کہ شیطان اپنے جہنم کی آگ میں سُلگتا رہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ خاموشی سے اپنے وارڈ کے راستے پر چلتے رہے پھر

(بقیہ ص ۳۱ پر)



جامعہ ملیہ (دہلی) دُوولے انسٹی ٹیوٹ کا ایک کلاس

۵ کروڑ بیس لاکھ ہے۔ درجہ ششم سے درجہ ہشتم تک کے طلبا، کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں سیکنڈری اسکولوں میں طلبا، کی تعداد ۵۰ لاکھ تھی۔ جب کہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں یہ تعداد صرف لاکھ تھی۔

بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بالغوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ شہری اور دیہی علاقوں میں بالغوں کی تعلیم کے مرکز کھولے گئے ہیں۔ مزدوروں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

پہلے کے مقابلے میں اب لڑکیاں کہیں زیادہ تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ پھر بھی بعض ریاستوں میں اُن کا تناسب خاطر خواہ نہیں ہے۔ حکومت ان تمام حالات سے باخبر ہے۔ اور مناسب اقدامات کرتی رہتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں اور تعلیم کے حصول کو اپنا فرض اولین سمجھیں۔ کیوں کہ اس میں صرف ملک کا ہی فائدہ نہیں ہے اپنا بھی فائدہ ہے۔

تعلیمی ترقیوں پر ایک نظر

	۱۹۴۸ء	۱۹۶۵
تعلیمی اداروں کی تعداد	۲ لاکھ ۲۰ ہزار	۵ لاکھ
اداروں میں طلبا، کی تعداد	۱ کروڑ ۸۰ لاکھ	۷ کروڑ
پرائمری اسکولوں میں طلبا، کی تعداد	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۵ کروڑ
سکنڈری اسکولوں میں طلبا، کی تعداد	۳۰ لاکھ	۱ کروڑ ۸۰ لا
کالجوں میں طلبا، کی تعداد	۲½ لاکھ	۱۵ لاکھ
تعلیم پر سالانہ خرچ	۶۰ کروڑ روپے	۶ ارب رو
فی کس خرچ	۲ روپے	۱۲ روپے
تعلیم یافتہ افراد کا تناسب	۱۲ فی صد	۳۰ فی صد

بقیہ سراج لکھنوی ص ۱۰ سے آگے

محبت اصل میں کیا چیز ہے خدا جانے
دہن میں جتنی زبانیں ہیں اتنے افسانے

دُوسرے مصرعے سے یہ پہلو نکل سکتا ہے دہن میں ایک سے زیادہ زبانیں ہیں۔ میرے خیال میں یہاں دہن کی جگہ "جہاں" کر دینا چاہیے۔

سراج کا ایک مصرع ہے

نظریئے اپنے بدلنے لگے سب اہلِ خرد

اصل لفظ "نَظَریہ" ہے۔ اگر عوام نظریہ بولیں تب بھی، سراج جیسے اُستاد کے لیے سند نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ سند استعمال عام سے نہیں بلکہ لغات کے استعمال عام سے ملتی ہے۔

پوری کتاب میں یہ چار پانچ مثالیں ناقابلِ توجہ ہیں۔ سراج کو زُبان و بیان پر عبور ہے۔ وہ بعض اوقات زبان و بیان کے معاملے میں تجربے بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ سہولت پسندی سے بھی کام لیتے ہیں پھر وہ کونسا اُستاد ہے جس سے کبھی لغزش نہ ہوتی ہو۔ لیکن اُستاد ہی کی لغزش پر نظر پڑتی ہے۔

سراج اور آثر پر لکھنوی شاعری کا ایک دَور ختم ہوتا ہے۔ یہ دونوں نہیں رہے تو وہاں سناٹا چھا گیا ہے۔ بڑے شعراء میں جوش ملیح آبادی اور اُن سے جواں تر شعراء میں آل رضا رضا رہ گئے ہیں۔ بے چارے قدیر صاحب لکھنوی مدتوں سے صاحبِ فراش ہیں اب لے دے کے آنند نرائن ملّا اور مہذب لکھنوی سے لکھنویت کا بھرم قائم ہے۔



ایشیائی ممالک میں جاپان اور ہندوستان کے سوا زیادہ تر ممالک ایسے ہیں جو سائنسی لحاظ سے کافی پسماندہ ہیں۔ ان کے اپنے وسائل اسکی اجازت نہیں دیتے کہ وہ کروڑوں روپے سائینسی ریسرچ پر صرف کرسکیں پھر اتنا انتظار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا سائینسی میدان میں تعاون واشتراک کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ اور اقوام متحدہ کی ایک تنظیم یونیسکو نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا اور ۱۹۶۳ء میں جنیوا میں ہونے والی ایک کانفرنس میں طے کیا گیا کہ مختلف علاقوں کی ترقی میں سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال پر غور کرنے کے لئے کانفرنسیں بلائی جائیں۔ اس سلسلے کی پہلی کانفرنس ۱۹۶۴ء میں لاگوس میں منعقد ہوئی جس میں افریقہ کے مسائل زیر غور آئے۔ دوسری کانفرنس ۱۹۶۵ء میں سینٹیا گو میں ہوئی جس میں لاطینی امریکہ کے مسائل پر غور و خوض کیا گیا۔ اس سلسلے کی تیسری کانفرنس نئی دہلی میں ۹ اگست سے ۲۰ اگست ۱۹۶۸ء تک منعقد ہوئی جس میں ایشیا کی ترقی میں سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال سے متعلق مسائل زیر بحث آئے۔ ۹ اگست ۱۹۶۸ء کو Conference on the application of Science and Technology in Asia (CASTASIA) کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس کانفرنس کے بنیادی اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا "اس کانفرنس میں جو تبادلہ خیال ہوگا۔ اس کا مقصد غریبی کو دور کرنا ہے تاکہ ایشیا کے لکھوکھا افراد کم سے کم وہ زندگی گذار سکیں جو انسان کا بنیادی حق ہے۔"

ہندوستان کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ان کامیابیوں کا ذکر کیا ہے جو اس میدان میں ہمارے ملک نے حاصل کی ہیں۔ آپ نے فرمایا ہم نے بہت سی سمتوں میں سائینسی اور تکنیکی صلاحیتیں بڑھائی ہیں اور اب ہمارا ارادہ ہے کہ ہندوستان کے سائنسی ڈھانچے کو بہتر بنائیں اور منصوبہ بندی اور ترقی کے عمل سے اس کا زیادہ گہرا رابطہ پیدا کریں ہمیں نہ صرف سائنس سے متعلق ایک واضح پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ہماری پالیسیوں میں سائینس کو مناسب جگہ حاصل ہو۔"

انھوں نے طب، علم الحساب، ہئیت اور علم طب، دھات سازی اور فن تعمیر میں ہندوستان اور دیگر ایشیائی ملکوں کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب عوام "اپنے حکمرانوں کے تموّل اور عیش و عشرت کے بوجھ کے تلے دب گئے تو ان میں ایجادات و انکشافات کی صلاحیتیں مفقود ہوگئیں۔ اور اس طرح اس برِ اعظم کی عظمت و شوکت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور

وہ زیادہ باعمل سرگرم اور حرکت پسند اقوام کے غلام بن گئے جنہوں نے نئی ایجادات و اختراعات کی تھیں ۔لہذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ صنعتی انقلاب کی وجہ سے یوروپی اقوام کو دنیا کے بہت سے ممالک پر سیاسی بالادستی حاصل ہوگئی اور نئے نئے ایمپائر وجود میں آئے۔

ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا: "کچھ مخصوص مسائل کے علاوہ ہمارے ملک میں ایسے مسائل موجود ہیں جو کسی بھی ترقی کرتے ہوئے ملک میں ہیں ۔ ہمارا ملک جتنا بڑا ہے اسی لحاظ سے یہ پروگرام بھی ہونا چاہئے ۔ اگر زراعت کے سلسلے میں کوئی تجرباتی اسکیم کسی گاؤں میں کامیاب ہوتی ہے تو مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس کا اطلاق ملک کے ۵½ لاکھ گاؤں پر کیا جائے ۔ اتنے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی ایک جمہوری نظام میں، جہاں ہر فیصلہ عوام کی بحث و مباحثہ کا موضوع ہوتا ہے، پیچیدگیوں میں اضافہ ہوتا ہے ۔بہر حال اپنی تمام کوششوں کے باوجود ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے سماج کو محض جزوی طور پر بدل سکے ہیں ۔ ہمارے ملک میں اس وقت ۵ لاکھ انجینئر ہیں۔ (آزادی کے بعد سے ۵ گنا اضافہ) مشینی اوزاروں کی پیداوار دوگنی ہوگئی ہے اب ہم ریلوے انجن، اسپات کی مصنوعات، الیکٹرانک کا سامان اور دوا کے لئے آئی سوٹوپ برآمد کرتے ہیں ۔چند مہینوں میں تاراپور (بمبئی) میں ہمارا ایٹمی بجلی گھر بھی چالو ہوجائے گا ۔ جو ہمارے تین ایٹمی بجلی گھروں میں سے پہلا ہوگا ۔ مگر اس کے باوجود ہمارے ملک کی اکثریت اپنا چولھا جلانے کے لئے سوکھی ٹہنیاں یا گوبر کے اُپلے استعمال کرتی ہے ۔ ہمارے خیال میں ہمارے ملک کی پسماندگی صرف بنیادی اور مصرفی اشیا رتیار کرنے والی صنعتوں کے قیام سے دور نہیں ہوگی ۔بلکہ اس کے لئے ہمیں اپنی کھیتی باڑی میں جدید ٹکنالوجی کو استعمال کرنا ہوگا ۔ہم نے زرعی تحقیق اور اس تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج کو بروئے کار لانے کی ہر کوشش کی ہمت افزائی کی ہے ۔ ہم نے سینچائی ۔ بڑے بڑے بند اور چھوٹے ذرائع جیسے ٹیوب ویل کو بڑی اہمیت دی ہے تاکہ کسان صرف بارش کے رحم و کرم پر نہ رہیں ۔ کیمیاوی کھاد اور زیادہ پیدا کرنے والے بیجوں جو ہمارے سائنس دانوں کی تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہیں، کے استعمال سے اس سال ہمارے ملک میں زبردست پیداوار ہوئی ہے ۔"

"ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ دوسرے سے مستعار لیا گیا یا اپنایا ہوا علم ترقی میں ممد و معاون نہیں بن سکتا ۔ہم صحیح معنوں میں اسی وقت اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں جب ہم اپنی صلاحیتوں کو بڑھائیں اور اپنے تکنکی مسائل کو خود حل کریں۔

جہاں تک ایشیائی ممالک میں آپسی تعاون و اشتراک کا تعلق ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ ہم نے اپنے تکنکی اور تربیتی اداروں میں ایشیا اور افریقہ کے بعض ملکوں کے طلباء کو داخل کیا ہے ۔انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ایشیائی ممالک ایکدوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں آپسی تعاون سے انھیں بڑا فائدہ پہنچے گا ۔ ہم دوستی اور اشتراک کے جذبے کے تحت ایسے تعاون کی دعوت دیتے ہیں ۔

مندوبین سے خطاب کرتے ہوئے وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگن سین نے کہا ۔"انسانی تاریخ میں تین طاقتیں ایسی رہی ہیں جو تبدیلی اور انقلاب کا باعث بنی ہیں ۔ وہ ہیں ۔مذہب، صنعتی انقلاب اور اشتراکی انقلاب ، انقلاب اور تبدیلی کے ان تین زبردست عوامل میں اب ہم چوتھے کا اضافہ کر سکتے ہیں اور وہ چوتھی چیز ہے سائنس اور ٹکنالوجی"

"ایشیائی ممالک کا ایک زبردست مسئلہ ان کے مرد، عورتوں اور بچوں کی زبردست تعداد ہے ۔جب تک کہ ایک مجموعی اور بھرپور اور پرخلوص عمل کے ذریعے سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق قومی پالیسی کا ان لاکھوں افراد کی زندگیوں پر اطلاق نہیں کیا جائے گا ۔اس وقت تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے غربت اور افلاس کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا ہے"۔

یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر رینی میہوے نے اس پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے جس کے تحت یہ کانفرنس ہوئی کہا ۔زیادہ تر ترقی پذیر ممالک کو جو مدد دی جاتی ہے وہ اس صورت میں ہوتی ہے کہ انھیں سیدھے سیدھے تکنکی جانکاری حاصل کرا دی جاتی ہے ۔ اور ساتھ میں کچھ ساز و سامان دے دیا جاتا ہے ۔ بلاشبہ بعض اوقات فوری طور پر عمل درآمد کے لئے یہ طریقہ مفید ہوتا ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ترقی پذیر اقوام کے لئے ایسی امداد بہت زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوتی ۔ ایسی مدد سے یہ اقوام اس علم کا اچھی طرح امتزاج نہیں کر پاتی ہیں ۔اور نہ ہی وہ ذہنی اور سماجی فضا پیدا ہوتی ہے جو ایسے علم یا ایجادات کی پیش رو ہوتی ہے ۔"

اس بارہ روزہ کانفرنس میں ۲۵ ملکوں کے نمایندے شریک ہوئے مندوبین کی کل تعداد ۱۱۷ تھی ۔ ۳۵ مبصر بھی شریک تھے ۔

(بقیہ ص ۳۶ پر)

کشمیر کا

قدرت نے وادیٔ کشمیر کو دلفریب مناظر، اچھی آب وہوا عمدہ پھلوں اور خوبصورت پھولوں سے سرفراز کیا ہے۔ مجموعی طور پر شاید ہی کسی خطۂ زمین کو یہ سب خوبیاں میسّر ہوں گی۔ اس کے چاندی لٹاتے ہوئے چشمے اور آبشار، سونا اگلتے ہوئے کھیت، میلوں پھیلی ہوئی جھیلیں، دلکش مرغزار، اور طرح طرح کے رنگین پھولوں سے بھرے ہوئے باغ اپنے حُسن دلکشی اور نوعیت میں یکتا ہیں۔

کشمیر کا ہر موسم دلکشی اور دلفریبی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ ستمبر سے موسم خزاں کا آغاز ہوتا ہے۔ اور چنار کے پتے سرخ ہوجاتے ہیں اور پتے جھڑنے لگتے ہیں۔ پتوں سے بے نیاز دیودار ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے فطرت نے جگہ جگہ ستون گاڑ دیئے ہوں۔ پامپور جو زعفران کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل کرچکا ہے۔ سارا سال عموماً غیر دلچسپ مقام رہتا ہے مگر اس موسم میں یہ انتہائی دلچسپ بن جاتا ہے۔ کیوں کہ اس علاقے میں زعفران کے پھول اس موسم میں کھلتے ہیں جس کی وجہ سے سارا علاقہ معطر ہو اٹھتا ہے۔ اور پیلے کھیتوں کی وجہ سے ایسا موسم ہوتا ہے۔ جیسے قدرت نے اس وادی میں پیلے رنگ کا قالین بچھا دیا ہو۔

گلاب، گل داؤدی، ایسٹر، سورج مکھی جیسے پھول اس موسم میں کھلتے ہیں۔

پھولوں کے ساتھ ساتھ اس موسم میں پھلوں کی بھی کثرت ہوتی ہے مختلف اقسام کے سیبوں کے علاوہ، آلوچہ، ناخ، بگوگوشہ، بہی انگور۔ اخروٹ، انار ایسے متعدد پھل اسی موسم میں پائے جاتے ہیں۔

اسی زمانے میں دھان کی فصل پک کر تیار ہوجاتی ہے اور کٹائی شروع ہوجاتی ہے۔ موسم سرما کی آمد کے پیش نظر سردی سے بچنے کی تیاریاں



سیب ▲

▼ دھان کے پھول





گلِ وا

موسم خزاں

اسی زمانے میں دھان کی فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے اور شروع ہو جاتی ہے۔ موسم سرما کی آمد کے پیش نظر سردی سے بچنے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ خوشگوار موسمِ خزاں کے بعد موسمِ سرما میں پڑنے والی برف اور شدید سردی کے پیشِ نظر ایندھن بڑی تعداد میں اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔

دھان کی فصل کاٹی جا چکی ہے اور کھلیان میں رکھی گئی ہے۔



زبیر رضوی

غزل

کبھی خرد سے کبھی دل سے دوستی کرلی
نہ پوچھ کیسے بسر ہم نے زندگی کرلی

اندھیری رات کا منظر بھی خوب تھا لیکن
تم آگئے تو چراغوں میں روشنی کرلی

لئے پھرے ہیں بہت تم کو دل کی گلیوں میں
اس ایک بات پہ دُنیا نے دشمنی کرلی

حضورِ دوست عجب حادثہ ہوا یارو
ہر ایک حرفِ شکایت نے خودکشی کرلی

تمہارا جسم ہے جاڑوں کا سرد سنّاٹا
حرارتوں سے کہاں تم نے دوستی کرلی

ہر اک موڑ پہ خنجر بکف تھی تنہائی
غریبِ شہر نے گھبرا کے خودکشی کرلی

دادخواہ

نیم کی اک شاخ
پہلی بار
تاریکی میں تنہائی کی نوحہ گر ہوئی ہے۔
رات آنکھوں میں شکستہ خواب لے کر جاگ اُٹھی ہے
درد میں ڈوبی ہوئی آواز کی سامع بنی ہے
ہر طرف ماحول خاموشی کے پہلو میں سمٹ
کر سو رہا ہے۔
میرا کمرہ جاگتا ہے
آخری صفحات اپنی ڈائری کے لکھتے لکھتے
رو دیا ہوں
موم بتی کی پلک سے ٹوٹ کر آنسو گرا ہے
سوچتا ہوں۔ درد کی اس قتل گہہ میں
کون کس سے داد کا طالب ہوا ہے

نورُشاہ

ایک پھول گلاب کا



شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بھولا بسرا منظر گھوم گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ۔۔ " دیکھئے بابو جی گلاب کا پھول اپنے کوٹ میں نہ لگایا کریں۔"

اس نے حیران ہو کر پوچھا ۔ " کیوں مٹھو میاں ؟ "

بس اب مٹھو میاں کیا جواب دیتا۔ خاموش رہا۔ ویسے مجھے باتیں بنانا آتی ہیں۔ ویسے میں ہر بات کو سمجھتا ہوں۔ کیا ہوا اگر ان پڑھ ہوں۔ ویسے ہوں تو ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ۔ کیا ہوا جو اچھا گھرانہ نہ رہا۔ دیکھتے دیکھتے میرے جیسے اور بھی کئی فقیر ہو گئے۔ چپراسی بن جانے سے خاندانی بُو باس تو نہیں جاتی۔ کیا ہوا۔ اگر میری شادی نہ ہوئی، ہمارے خاندان کے مردوں نے تو تین تین شادیاں کی تھیں۔ زمین جائداد نہ رہی۔ سر پر اپنوں کا سایہ نہ رہا تو کیا برسوں پرانی خاندانی وجاہت ملیامیٹ ہو گئی۔ پیار کی بھوک ختم ہو گئی۔ جوانی میں بڑھاپا آ سکتا ہے لیکن وہ اندر کے پیار کی حس کو تو فنا نہیں کر سکتا۔ مٹھو میاں بننے سے تو میں بوڑھا نہیں ہو گیا۔ اب تک زندگی میں بوڑھاپے کا احساس مجھ میں صرف ایک بار جاگا تھا۔ جب میں نیا نیا چپراسی بھرتی ہوا تھا اور دفتر کی ایک خوبصورت الھڑ سی لڑکی نے مجھے مٹھو چاچا کہہ کر پکارا تھا ۔۔ میں نے ترنگ میں آکر صاف صاف کہہ دیا تھا۔

" میرا نام مٹھو چاچا نہیں۔ چاچا بننے سے پہلے دو تین بچوں کا باپ بننا چاہتا ہوں، اس لئے مجھے مٹھو رام کہہ کر پکاریئے یا مٹھو میاں۔ حالانکہ میاں کا لقب بھی مجھے پسند نہیں۔ البتہ اگر چاہو تو مٹھو جی کہہ کر پکار سکتی ہو ہاں، مٹھو جی ۔۔"

لیکن یہ آخری فقرہ میں نے اس لڑکی سے نہیں کہا تھا صرف اپنے من میں سوچا تھا۔ تب میں کچھ باتیں بابو لوگوں اور بابو چھوکریوں سے کہہ دیتا تھا، من میں سوچتا نہیں تھا اور کچھ باتیں اپنے من میں سوچتا تھا کہہ نہیں پاتا تھا۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ اگر بابو مٹھو رام ہوتا تو دوسری بات تھی لیکن مٹھو میاں ایک چپراسی کی خاکی وردی میں یہ سب کچھ بھلا کیسے زبان پر لاتا۔ خیر جانے دیجیے۔ بات شام بابو اور گلاب کے پھول کی تھی۔ میں اپنے اندر کے میاں مٹھو کی ٹیں ٹیں درمیان میں لے آیا۔ بے کار سی کھوکھلی باتیں۔!

کیوں جی ۔۔۔ لڑکی سرو قد کی ہو ۔۔ گورا چھریرا بدن ہو۔ دمکتا ہوا جسم ہو، پھول سے نازک، چاند سے حسین اور جب کالے کالے لانبے لانبے بال لہرا لہرا کر بکھر جانے لگتے ہوں اور جیسے ساری کائنات پر رات چھانے لگتی ہو ۔۔ تو کیا اُسے خوبصورت کہا جا سکتا ہے۔ رانی کی بات کر رہا ہوں۔ میرے پہلے دفتر میں کلرک تھی۔ جہاں صرف دس بارہ چھوٹے بڑے بابو تھے۔ میرے نئے دفتر میں تو بہت زیادہ عملہ ہے۔

سب کے سب غریب ہیں۔ اپنی اپنی مجبوریوں میں اُلجھتے رہتے ہیں۔ زمانہ مہنگا ہوگیا ہے۔ جینا مشکل ہوگیا ہے، پہلے والے دفتر کی بات کہاں؟

ہاں تو شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول لگا دیکھا۔ تو پرانے دفتر کی ایک بھولی بسری یاد آگئی۔ وہ کمرہ یاد آگیا جس میں رانی بیٹھتی تھی۔ بھولا بابو اور سعید بابو بیٹھا کرتے تھے۔ دفتر میں دو تین کمرے اور بھی تھے۔ ایک ہیڈ کلرک کاظمی صاحب کا کمرہ تھا اور باقی دوسرے چھوٹے موٹے بابو لوگوں کے۔ لیکن زیادہ چہل پہل رانی ہی کے کمرے میں رہتی۔ ایسی چہل پہل جو صرف اشاروں اور سرگوشیوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ زبانیں عموماً خاموش رہتیں، آنکھیں باتیں کرتیں۔ ایسی چہل پہل میں ہر کوئی ایک دوسرے سے بے خبر اور بے نیاز رانی کو اپنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر کوئی اس جستجو میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی تگ و دو میں تھا۔ کاظمی صاحب بھی اپنی ادھیڑ مریل سی عمر میں رانی کی طرف کھنچا جا رہا تھا اس کا قصور نہ تھا بیوی کے سوا اسے کسی دوسری عورت کا قرب حاصل نہیں ہوا تھا۔ ہوا بھی کبھی ایسا حادثہ تو پسینے چھوٹ گئے۔ بیوی سامنے آگئی۔ کاظمی صاحب اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا، جس طرح اس عمر میں عام طور پر مرد ڈرتے ہیں۔ لیکن رانی کی بات اور تھی۔ وہ دفتر میں معمولی کلرک تھی۔ ہر گھڑی ہیڈ کلرک سے واسطہ پڑتا۔ بار بار اُسے بلوایا جاتا۔ دوسرے سمجھتے سرکاری کام کے لئے بلایا جاتا ہے۔ لیکن میں سب جانتا تھا۔ ہاں تو کہہ رہا تھا کہ سب بابو لوگ چھوٹے بڑے، بیاہے، بن بیاہے رانی کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ رانی ایک پھول تھی، ایک رس بھری بھی۔ میں دیکھتا رہتا۔ بینائی ذرا کم تھی۔ صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ صاف صاف دیکھنے کے لئے میں نے عینک چڑھالی اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ بھولا بابو کے سوا اور کوئی میرے ساتھ سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ سب مجھے گھور گھور کر دیکھتے، جیسے میں چپراسی نہیں، خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔ لیکن بھولا بابو کی بات دوسری ہی تھی۔ وہ نام اور شکل کا ہی بھولا نہ تھا۔ اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ، خاموش اور گمبھیر چہرے پر گہری اداسی کی جھلک لئے ہوئے سنجیدگی، آواز میں پیاری مٹھاس، باتیں کرتے وقت آنکھیں خود بخود جھک جاتیں۔ ہنستے وقت تو چہرے پر شوخی آجاتی ہے لیکن بھولا بابو کی ہنسی میں سنجیدگی تھی۔ سنجیدگی جس میں ساری دُنیا کی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ اور خاندانی شرافت کی قدروں کا پاس بھی۔ عمر میں سب سے چھوٹا تھا۔ سب سے زیادہ محنتی تھا، خوبصورت اور معصوم تھا۔ جوانی کی ایک خاص عمر میں گہری سنجیدگی اور معمر خاموشی انسان کو روگی بنا دیتی ہے۔ اپنے بزرگ ایسا ہی کہا کرتے تھے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سنجیدہ اور گمبھیر رہتے ہوئے بھی اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اپنا کام ختم کرکے دوسروں کا کام کر دیتا۔ رانی نئی تھی اچھے گھر کی لڑکی تھی۔ بے سہارا تھی۔ کلرک بن گئی۔ کلرکی میں کام کم ہوتا ہے اور مغز کھپائی زیادہ۔ وہ مغز کھپائی کی عادی نہ تھی۔ خاموش طبع تھی کسی کو اپنا دُکھ درد بتاتی بھی نہ تھی۔ بتاتی بھی کیسے؟ وہاں چاہنے والے تو بہتے لیکن ڈر کے مارے خاموش بیٹھے صرف تاکتے رہتے۔ دل میں چور ہو تو محبت بھی چور نظروں سے ہی کی جاتی ہے۔ اپنے محلے کے مولوی اللہ رکھا کہا کرتے تھے اور سچ ہی کہا کرتے تھے لیکن بھولا بابو کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ایک دو بار رانی کو پریشان پایا تو اُسے اپنے پاس بلایا۔

"دیکھئے آپ جتنا کام آرام اور آسانی سے پانچ بجے تک کر سکتی ہیں وہ کر لیا کریں۔ باقی کام میں سنبھال لیا کروں گا۔ احسان نہیں کر رہا ہوں۔ یہ انسانی فرض ہے۔ پریشان ہو کر رونا اپنی کمزوری کا مظاہرہ کرنا ہے جو گناہ سے بدتر ہے۔"

رانی نے اپنی جھکی ہوئی نظروں سے بھولا بابو کو دیکھا۔ جیسے جس فرشتے کی اُسے تلاش تھی وہ اپنے پاس ہی بیٹھا مل گیا ہو۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اپنی خوشی کا اندازہ میں اپنی اُداسی سے لگاتا ہوں۔ اُداس ہو جاؤں تو سمجھ لیتا ہوں کہ آج بہت خوش ہوں۔ کچھ پا لیا ہے اور اس کے بارے میں خاموشی سے سوچنا چاہتا ہوں۔ بھولا بابو اور رانی کو ایک دوسرے کے قریب آمنے سامنے دیکھا تو اُداس ہوگیا اور پھر تو میں روز ہی اُداس رہنے لگا۔ اب دونوں کھل کر باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا بھی لیتے۔ چند ہی دنوں میں مجھے معلوم ہونے لگا کہ اُداس میں ہی ہیں

سمجھا۔ جیسے دوسرے تمہیں دیکھتے ہیں۔ میں نے ویسے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ میں دوسرے سابقی کلرکوں کی طرح تمہیں بھی ایک کلرک ساتھی سمجھتا ہوں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا، ہنسنا، مسکرانا، سہارا بننا ہم سب کا فرض ہے۔ احسان نہیں جس کا بدلہ ایسی ویسی محبت سے چکایا جائے اگر تم میرے دل کی محبت اور پیار کی بات پوچھتی ہو تو مجھے محبت ہے اور جنون کی حد تک ہے اور . . . . "

رانی چیخی۔

" میں بھی تو محبت . . . . "

بھولا بابو نے اپنی بات جاری رکھی ۔" ہاں میں بھی محبت کی ہی بات کر رہا ہوں، مجھے محبت ہے اور آخری حدوں تک . . . . . "

رانی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

" بھولا بابو "

" ہاں ــــ لیکن وہ محبت صرف اپنی . . . صرف اپنی بیوی سے ہے "

" بیوی ؟ "

" ہاں بیوی جو تمہاری جیسی ہی ایک لڑکی ہے۔ خوبصورت اور معصوم ہے رانی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، ایسا ہو جاتا ہے۔ لیکن ہونا نہیں چاہئے کہ درد دل ــــ

دروازہ کھٹاک سے کھلا۔ میں دیوار سے لگ گیا۔ رانی بجلی کی طرح سیڑھیوں کی جانب لپکی۔ گلاب کا پھول ردی کی ٹوکری کے پاس پڑا تھا۔ میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھایا۔ دفتر بند کرتے وقت میں نے بھولا بابو سے پوچھا۔

" یہ سب ٹھیک ہے لیکن ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کیونکہ آج تک، اب تک میں سب کچھ دیکھتا آیا ہوں، سنتا آیا ہوں۔

بھولا بابو کے چہرے پر وہی پرانی گمبھیر مسکراہٹ تھی اس نے مدھم سُر میں پوچھا۔

" کیا ؟ "

" سب ٹھیک ہے لیکن یہ بیچارا ایک پھول گلاب کا "

اس نے پھول میرے ہاتھوں سے لے کر اپنے کوٹ میں لگا لیا اور سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

" اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ہمارے گھر میں جب سے گلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں میری بیوی ہر روز میرے کوٹ میں ایک پھول لگا دیتی ہے۔ اگر رانی خود ہی کوٹ سے پھول اتارے اور اس کی کہانی بنا ڈالے تو اس میں میرا کیا قصور ــــ ؟

میں خاموش ہو گیا۔

اور دوسرے دن ان بڑے صاحب کو سلام کر کے نئے دفتر میں تبادلہ کرا لیا۔ آج بہت مدت کے بعد شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں بھولا بابو اور رانی یاد آ گئے۔ حالانکہ نئے دفتر میں شام بابو تو ضرور ہے بالکل بھولا بابو کا دوسرا روپ لیکن رانی کوئی نہیں ــــ !!!

بقیہ قیدوبند ص ۱۸ سے آگے

برادر نے ذرا رک رک کر تارے سے کہا: " ظلم کی حد یہ ہے برادر کہ ظالم آدمی اپنے بدن کو بھی ایک جیل ہی بنا لیتا ہے "

" کس کی بات کر رہے ہو برادار ؟ "

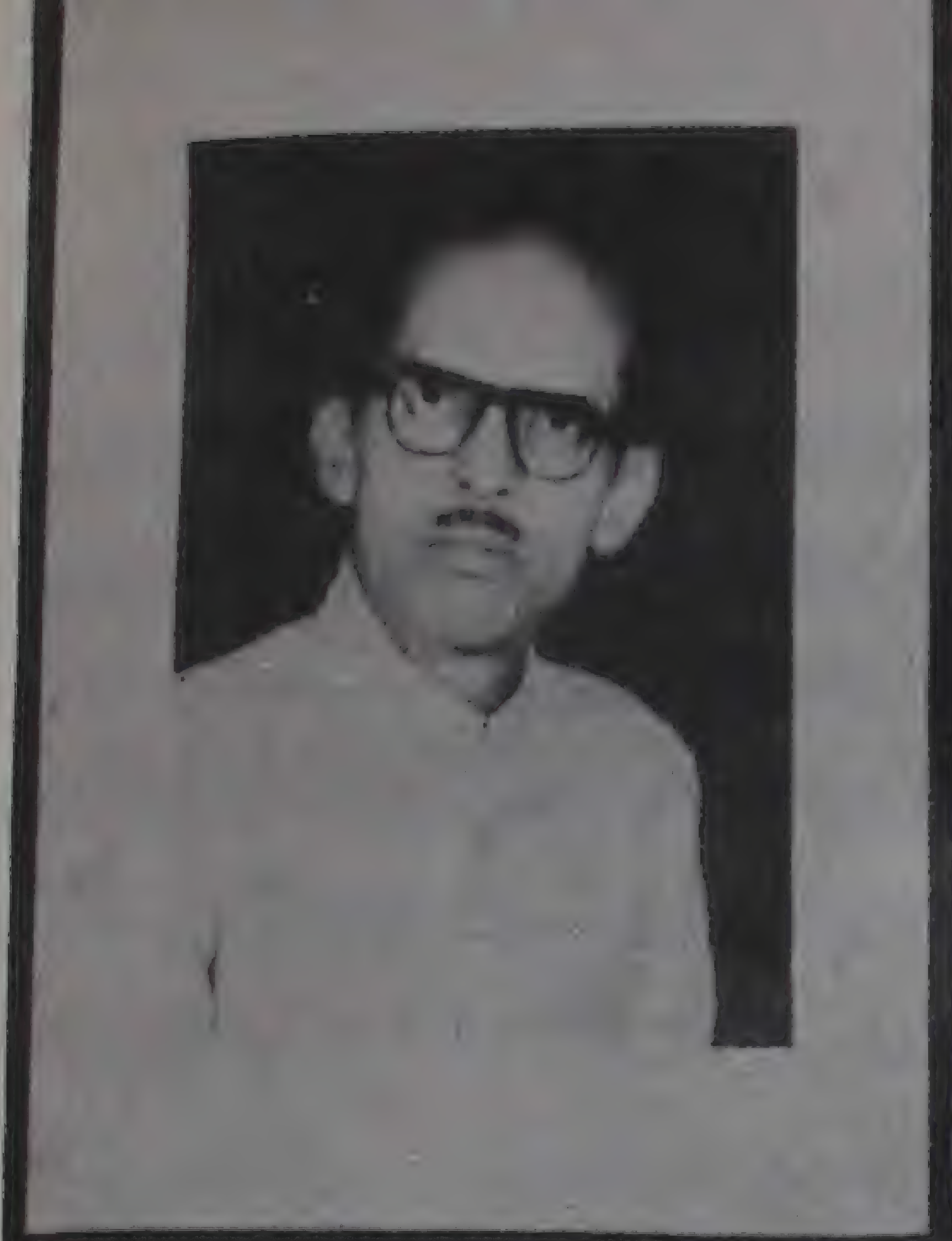
" اس ظالم جیلر کی، اور کس کی ؟ اس کا جسم اس کے لئے جیل خانہ ہی تو ہے ــــ اور کتنا تنگ جیل خانہ ! "

برادر پھر چلتے چلتے رک گیا ــــ " بس اس کی پوری ماپ کا ایک تابوت !! "

ــــ اور ذرا غور کرو برادر، کہ خدا نے سزا کیا دی ہے۔ مرنے تک اُسے اپنا یہ سالم جیل خانہ اٹھا اٹھا کر چلنا پڑے گا۔ ذرا سوچو برادر، یہ عمر قید نہیں ؟ "

" مجھے تو بار بار اپنے رجے کا خیال آ رہا ہے۔ "

" وہ بے چارہ تو تنہا ہی قیدی برادر ــ تیری، میری طرح۔ خدا نے رحمت کی ہے کہ پوری قید بھگتنے سے پہلے ہی رہائی پا گیا ہے ! "



میکش غازی پوری

پانچواں بچہ

گھر کے آنگن میں ایک اُداسی تھی

عشق کے گیت، پیار کے نغمے
زندگی کی تمام رنگینی
رہ گئی تھی سمٹ کے مجلس میں
فکر — ہر فکرِ غم سے تھی آزاد
ذہن آسودہ تھا، نظر مسرور
نور و نکہت کی تھی فراوانی
انجمن قہقہوں سے تھی آباد
قہقہے تھے حیات میں — لیکن
صرف محدود بند کمرے تک
دو گھڑی کو بدن کے ہونٹوں پر
مسکراہٹ کے دیپ جلتے تھے۔
نفس کی دھوپ کی تمازت سے
پھر پسینے میں ڈوب جاتے تھے
ابر آسودگی برستا تھا۔
تھیں میسر مسرتیں پھر بھی
آبشاروں کی روح پیاسی تھی
گھر کے آنگن میں اک اُداسی تھی
گھر کا آنگن اُداس رہتا تھا۔

گھر کا آنگن اُداس رہتا تھا
دفعتاً زیست کے گلستاں میں
ایک نورس کلی نظر آئی
مسکراہٹ لبوں پہ دوڑ گئی
پیار کمرہ سے آیا آنگن تک
ننھے ننھے حسین قدموں کے
چمکے نقش و نگار معصومی
گھٹنوں چلنے کے نشان ابھرے
گھر کے آنگن کی صاف چادر پر
ہو گئی دُور اُداسی آنگن کی

ہو گئی دُور اُداسی آنگن کی
رقص میں کائناتِ شوق آئی

دُوسرے بابو لوگ بھی اُداس رہنے لگے ہیں۔ حالانکہ ان اُداسیوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بھولا بابو بدل رہا تھا۔ اس کی باتیں بدل رہی تھیں۔ اس کی مسکراہٹیں بدل رہی تھیں۔ ایک عجیب سی نئی سی تبدیلی عیاں ہو رہی تھی سنجیدگی کے گہرے بادل چھٹنے لگے تھے لیکن اس کی تبدیلی اتنی تعجب خیز نہ تھی جتنی کہ رانی۔ اب وہ ایک مسکراتی ہوئی کلی بن رہی تھی۔ ہر ایک سے باتیں کرتی جیسے اس کی اکیلی تنہا زندگی کو کوئی خوبصورت سہارا مل گیا ہو۔ بھولا بابو کی تبدیلی جہاں سب کو کھلنے جا رہی تھی وہاں رانی کی تبدیلی سب کے لئے ایک شگفتہ بہار بن رہی تھی اور بہار کی آمد پر سواگت کی تیاریاں ہر ایک چہرے اور لباس سے ظاہر تھیں۔

اُن ہی دنوں ان تبدیلیوں کے چکر میں ایک خاص بات ہوئی۔ وہ یہ کہ اب بھولا بابو کے کوٹ میں گلاب کا ایک پھول بھی دکھائی دینے لگا۔ ویسے تو عام سی بات تھی لیکن وہ عام سی بات خاص یوں ہو گئی کہ لنچ تک گلاب کا پھول بھولا بابو کے کوٹ میں لگا رہتا اور اس کے بعد رانی کی انگلیوں میں چلا جاتا۔ میں نے دیکھا حسب فطرت اُداس ہو گیا۔ دوسروں نے بھی دیکھا حسب عادت جل گئے۔ ایک دن میں نے کاظمی صاحب کے تیور بھی بدلے ہوئے دیکھے۔ کہیں اس نے بھی گلاب کا پھول بھولا بابو کے کوٹ سے اُتر کر رانی کے ہاتھوں میں پہنچتے دیکھا تھا۔ فوراً حکم ہوا کہ بھولا بابو کی میز اس کے خاص کمرے میں لگا دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور میز خاص کمرے میں لگا دی گئی۔ بھولا بابو کے لئے کوئی فرق نہ پڑا۔ اب وہ کاظمی صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتا۔ صرف اتنا سا فرق پڑا کہ پہلے کاظمی صاحب دن میں کوئی درجن بار رانی کو اپنے کمرے میں بلواتا تھا۔ اب درجن بار خود ہی رانی سے ملنے دوسرے کمرے میں جاتا۔

لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چلا۔ ایک دن اس نے بھولا بابو سے کہا کہ میرے کمرے میں بیٹھنے سے تم نے کافی بقایا کام ختم کر دیا۔ وہ بے چارہ صرف منہ دیکھتا رہ گیا۔

کاظمی صاحب نے پھر کہا —" دفتر میں لائٹ کام کس کے پاس ہے۔"

بھولا بابو نے جواب دیا —" لائٹ کام تو رانی کو ہی دے رکھا ہے۔ نئی نئی سیکھ رہی ہے۔ ہر وقت بے وقت اس کا ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہے۔"

کاظمی صاحب نے ایک لمبی بدبودار سانس چھوڑی۔

"ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔"

بھولا بابو چونکا :" آپ کا مطلب ہے رانی کا ہاتھ بٹایا جائے"

کاظمی صاحب نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اپنے دل کی بات نکالی —" ہاں ایسا ہی خیال ہے۔ تمہارے پاس اپنا ہی کام بہت ہے۔ وہ میرے کمرے میں بیٹھا کرے گی۔ میں اُسے سمجھا دیا کروں گا۔"

بھولا بابو کی میز اپنے پہلے والے کمرے میں آ گئی گمبھیر سی مسکراہٹ لئے وہ پرانے سے نئے کمرے میں گیا تھا۔ وہی مسکراہٹ لئے پھر نئے سے پرانے کمرے میں آ گیا۔ اس کے لئے تو کوئی فرق نہ پڑا لیکن اس آنے جانے کے دوران میری اُداسیاں کافور ہو گئیں۔ شاید میرے اندر کے مٹھو رام کی خوشی مر گئی تھی اور رانی بھی شاید خوش نہ تھی۔ کاظمی صاحب کے کمرے میں اُسے گھٹن سی محسوس ہوئی۔ سروس کا معاملہ ہے۔ گھٹن ہو چاہے تازگی کام کرنا ہی پڑتا ہے آج یہاں بیٹھ کر، کل وہاں بیٹھ کر۔ مجھے خود کئی دفتر آج تک بدلنے پڑے ہیں دوسروں کے دل کا حال تو نہیں جانتا لیکن مجھے رانی کی گھٹن کو دیکھ کر بہت کوفت ہوئی اور میں اُسے برداشت نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک کھوئی ہوئی لڑکی ہو۔ تنکے کا سہارا ملا تھا۔ وہ تنکا ہی ٹوٹ گیا۔ حالانکہ اب اسے ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ کاظمی صاحب کا سہارا۔ وہ بڑے پیار سے اُسے کام سمجھاتا۔ ایک بات جانے کیوں میں محسوس کر رہا تھا کہ کام سمجھاتے سکھاتے کاظمی صاحب بُری طرح رانی پر جھک جاتا جیسے اُسے نوچ کھانے کی سوچ رہا ہو۔ وہ رانی سے بھونڈے مذاق کرتا اور رانی سب کچھ جانتے ہوئے بھی مسکراتی رہتی۔ بالکل گاؤں کی الہڑ جاہل لڑکیوں کی طرح جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ جیسے جانتی تو ہو اچھی طرح لیکن ....

رانی کے کاظمی صاحب کے کمرے میں چلے جانے سے دوسرے بابو خاموش ہو گئے تھے۔ بھولا بابو سے چڑنے لگے تھے کہ خشک زندگی میں اچانک شبنمی پھوار کا لمس حاصل ہوا تھا اس کی بدولت چھن گیا۔

بھولا بابو کے لیے تو کوئی خاص فرق نہ پڑا تھا لیکن اُن سب کی زندگی بے کیف اور بے رونق ہوگئی تھی۔ امیدیں بندھ کر ٹوٹ گئیں تھیں۔ دوسری دفتری کہانیوں کی طرح وہ بھی ایک کہانی تھی جن کی ابتدا روز ہوتی لیکن انتہا تک کبھی نہ پہنچتیں۔ میرے خیال میں رانی کی کہانی بھی ویسی ہی کہانیوں میں سے تھی۔ لیکن اس کی ابتدا جتنی خاموشی سے آہستہ سے ہوئی۔ اتنی جلدی اس کا انجام بھی ہوگا، میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ بات معمولی سی تھی کاظمی صاحب ابھی اپنے خیالوں کے آدھے ہی راستے میں تھا کہ اس کے چہیتے کلرک سعید بابو نے سب کی طرف سے شکایت کی کہ رانی اور بھولا بابو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور محبت کی پینگیں بڑھائی بھی جاتی ہیں دفتری اوقات میں۔ دونوں کا ذاتی معاملہ ضرور ہے لیکن دفتر میں دوسروں کے لئے بے چینی اور شکایت کا موجب ہے۔ کاظمی صاحب نے سُنا تو اس کا ادھیڑ عمر دل اور دماغ ہل ہی گیا۔ چہرہ زرد ہوگیا۔ اس نے اپنے طور پر جو بات درمیان میں ہی ختم کردی تھی وہ ختم ہونے کے بجائے مکمل ہورہی تھی یا یہ تکمیل تک پہنچنے والی تھی۔ رانی اس وقت میرے ساتھ دروازے کے پاس کھڑی تھی اور ساری باتیں سُن رہی تھی۔ میں نے سوچا قصہ ختم ہوگیا ہمیشہ کے لئے میری اُداسیوں کو چھٹکارا ملا۔ لیکن تعجب ہوا شام کو پانچ بجے کے بعد، دونوں دفتر میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ رانی ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہوگئی اور دبی زبان میں پوچھا۔

" آپ نے کبھی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا ہے؟"

بھولا بابو نے اپنی زندگی کا پہلا بھرپور قہقہہ لگایا۔

" میں تو حال کا آدمی ہوں۔ مستقبل دور ہے۔ ایک لمبی چھلانگ کی ضرورت ہے اور میں ایک کمزور انسان ہوں۔ لیکن . . . . "

رانی نے بات کاٹ دی

" حال کے آدمی ضرور ہیں لیکن اپنے حال سے بے خبر ہیں۔"

بھولا رام نے اپنے بھولے پن کا ثبوت دیا

" میں اپنے حال سے باخبر ہوں۔ مجھے اپنے ایک ایک لمحہ کا علم ہے۔"

" کبھی اپنے آس پاس کے ماحول کو پرکھنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں؟"

" میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ دفتر میں فائلیں۔ گھر میں گھر۔ ایک دفتر اور ایک گھر اور ایک . . . . . "

" اور میں "

" ہاں تم ضرور ہو۔ جس میں ایک دوسرے کا سہارا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

رانی نے بھاری آواز میں کہا۔

" آپ کے پاس دل ہے لیکن دھڑکن نہیں۔ دماغ ہے لیکن . . .

" میرے پاس دل کی دھڑکنیں بھی ہیں۔ دماغ کی سوچیں بھی ہیں یہ غلط فہمی تمہیں کیسے ہوئی۔ اس طرح کی باتیں کرنے کی آج ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی۔ میرا دل کسی کے لئے دھڑکتا بھی ہے اور کسی کے لئے سوچتا بھی ہے۔ اگر نہ سوچتا تو میں . . . . "

" اگر آپ کا دل کسی کے لئے دھڑکتا، دماغ کسی کے لئے سوچتا تو مجھے یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی۔"

" تمہیں کاظمی صاحب نے کچھ کہا ہے۔"

" سب ہی کچھ نہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں بھی کہہ رہی ہوں لیکن آپ بت بنے بیٹھے ہیں۔ دوسرے سب کچھ جان گئے۔ آپ بھولے ہی بنے رہے۔"

" اصل بات کیا ہے "

رانی جیسے رو رہی تھی۔

" مجھے آپ کا سہارا ملتا تو ہم نے کبھی کی نوکری چھوڑ دی ہوتی۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ سہارا قائم رہے۔ چاہتی ہوں کہ ہم دونوں . . . .

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ میں دروازے کے پاس دم بخود بیٹھا تھا۔ بھولا بابو نے رُک رُک کر بات شروع کی۔

" دیکھو رانی! تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں بے سمجھ ہوں کیونکہ میرے لئے یہ سب کچھ نیا ہے۔ میرے ساتھ ایسی کبھی نہیں بیتی۔ تم نے میرے سہارے کو کچھ اور ہی سمجھا۔ میری مدد کو کسی اور ہی رنگ میں لیا، جو دوسرے تمہیں سمجھتے ہیں میں نے ویسا تمہیں کبھی بھی نہیں

گھر میں رونق کا بول بالا ہوا
ہر طرف پیار کا اُجالا ہوا
ارماں اُس کا طواف کرنے لگے
آرزوئیں نثار ہونے لگیں
صبح روشن تھی شام رنگیں تھی
مرکزِ ہر نگاہ تھی وہ کلی
اُس کی بے معنی مسکراہٹ پر
مامتا لوٹ لوٹ جاتی تھی
چھوٹی چھوٹی غلافی آنکھوں میں
ڈورے کاجل کے ڈالے رکھتی تھی
باپ کی شفقتوں کی ایک فراک
مامتا کی دعاؤں کا جمپر
روز و شب اس کے جسم پر رہتا
گھر کے آنگن کے سرد ہونٹوں پر
موجزن گرمئ تبسم تھی۔
گھر کا آنگن بھی مسکراتا تھا
اب اُداسی نہیں تھی آنگن میں

اب اُداسی نہیں تھی آنگن میں
کچھ دنوں بعد ایک اور کلی
گلشنِ آرزو میں پھر مہکی
مسکرایا پھر اک نیا غنچہ
اس کے بعد ایک اور پھول آیا

اور جب پانچواں شگوفہ کھلا
عشق کے گیت پیار کے نغمے
زندگی کے تمام منصوبے
جیسے اک ریت کی عمارت ہوں
کیسے بارِ گراں کفالت کا
آخر اُٹھے سوال اُٹھنے لگا
خرچ نے اپنے پاؤں پھیلائے
زندگی کا سکون لٹنے لگا۔
اُڑ گیا خوابِ عیش آنکھوں سے
زیست کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔
وقت کی دھوپ تھی کچھ اتنی تیز
جھیل ممتا کی خشک ہونے لگی
تنگ ہوتا ہوا نظر آیا
گھر کی آسودگی کا پیراہن
شکن آئی دعا کے جمپر پر
شفقتوں کی فراک چھوٹی ہوئی۔
بے وطن، بے دیار ہونے لگی
تن کی شادابی من کی خوشحالی
اپنے گھر کا وہ خوشنما آنگن
ننھے ننھے قدم کی آہٹ کا
رات دن انتظار تھا جس کو
غم تنہائی بار تھا جس کو
آجکل پھر اُداس رہتا ہے — گھر کے آنگن میں پھر اُداسی ہے

رحمٰن حمیدی

بغداد

وجہ تسمیہ:۔ نوشیروانِ عادل کے محل کے قریب ایک باغ تھا جس میں بیٹھ کر نوشیرواں مقدمات کی سماعت اور انصاف کیا کرتا تھا اسی بنا پر وہ باغ داد یعنی انصاف کا باغ مشہور ہو گیا۔ اور پھر چند سال کے اندر عرفِ عام میں باغ، داد سے تبدیل ہو کر بغداد ہو گیا[1]

ابوجعفر منصور نے یاشیمہ[3] کو دارالسلطنت کے لیے منتخب کیا لیکن راوندیہ[2] کی بغاوت اور اہلِ کوفہ کی غداری نے اُسے پریشانی میں ڈال دیا۔ اس نے طویل جستجو اور اراکین سلطنت کے اصرار پر مختصر سی آبادی کو دارالسلطنت کے لیے منتخب کیا تھا۔ چنانچہ راہبوں سے بغداد کی کل زمین مناسب قیمت پر خرید کر منصور نے خود اپنے ہاتھ سے ۱۴۵ھ میں سنگِ بنیاد رکھا اور اسی وقت قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی ان الارض للّٰہ یورثہا من یشاء من عبادہٖ یعنی زمین کل خدا کی ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے۔

نیچے کی بنیاد پچاس ہاتھ چوڑی رکھی گئی لیکن سطح ارض پر آ کر صرف بیس ہاتھ عرض رکھا گیا۔ وہ اینٹیں جن سے شہر پناہ کی دیوار تعمیر ہوئی ایک مربع گز تھیں اور ایک اینٹ کا وزن سوا سولہ رطل (تقریباً اٹھاون سیر) تھا۔ اس عظیم الشان شہر کے بازاروں، فصیلوں، خندقوں، دروازوں اور باغات کی تعمیر میں روزانہ پچاس ہزار معمار اور مزدور کام کرتے تھے۔۔ شہر پناہ کے چار دروازے تھے اور ہر دروازے

۱؎ رائل سیرز آف اسلام ۲؎ منصور کے عہد کا ایک گروہ تھا جو عقیدہ تناسخ کا قائل تھا اسلامی روایات کی بیخ کنی اس گروہ کا بنیادی معقد تھا
۳؎ کوفہ کے نزدیک ایک چھوٹی سی آبادی کا نام ہے ۔



بغداد کا ایک منظر

ے ایک دوسرے کی مسافت ایک میل[1] تھی نئی آبادی کے ساتھ بغداد کا نام تبدیل کرکے "مدینۃ الاسلام" رکھا گیا لیکن یہ نام عام زبان پر رائج نہیں ہوا بلکہ صرف سرکاری دفاتر اور تصنیفات میں مروج ہو کر رہ گیا۔ اکثر سیاحوں کا کہنا ہے یہ دنیا کا وہ شہر ہے جس کی آبادی بالکل دائرہ نما ہے۔

خلیفہ ابوجعفر منصور نے خاص طور سے ایوانِ خلافت، جامع مسجد، قصر الذہب، قصر الخلد اور قبۃ الخضرا کی عمارت تعمیر کرائی تھی۔ مذکورہ عمارتوں میں سب سے زیادہ بلند ہی قبۃ الخضرا کی تھی جس کی اونچائی تقریباً ۸۰ گز تھی ان عمارتوں کی تعمیر پر کُل دو کروڑ[2] درہم کا صرفہ ہوا۔ خلیفہ منصور کے جانشین مہدی نے دار الخلافہ کو دجلہ کے مشرقی جانب کی طرف تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے دجلہ درمیان شہر میں آگیا اور بغداد کی حسن و رعنائی اور دُگنا ہو گئی۔

خلیفہ المقتدر باللہ، جو ۲۹۵ھ میں تخت نشین ہوا تھا، نے "دار الشجرۃ" تعمیر کروایا جس کے صحن میں ایک وسیع حوض تھا اس حوض میں سونے کا ایک درخت تھا جس میں سونے اور چاندی کی اٹھارہ موٹی موٹی شاخیں تھیں، ہر شاخ میں بہت سی ٹہنیاں تھیں ہر شاخ میں نادر و نایاب جواہرات کو تراش کر اس طرح مزین کیا گیا تھا کہ حقیقی پھولوں اور پھلوں کا گمان ہوتا تھا؛ ٹہنیوں اور شاخوں پر طلائی پرندے اس ترکیب سے آویزاں تھے کہ ہوا کی رفتار پر بھی اپنے ذاتی نغمات سے خوش الحانی کرتے تھے، حوض کے دونوں جانب پندرہ مصنوعی سوار تھے، جو نہایت عمدہ دیبا و حریر کی وردیوں میں ملبوس مزین زریں تلواریں لئے اس طرح حرکت پذیر تھے کہ ہر سوار اپنے مد مقابل کے سوار پر حملہ آور ہے[3]۔

---

[1] ابن خلدون۔ تعمیر بغداد کے سلسلہ میں ابن خلدون میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے عہدۂ قضا کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا اسی لئے منصور نے بطور سزا امام موصوف کو تعمیر کے لئے اینٹ اور چونے کے انتظام کا کام دے دیا

[2] نجوم زاھرۃ :۔ نوٹ:۔ مصارف تعمیر میں بہت زیادہ اختلاف ہے چند مورخین کا بیان ہے کہ صرف ۴۰ لاکھ ۸۳ ہزار درہم خرچ ہوا

[3] رائل ہیروز آف اسلام



امام ابوحنیفہ کا مقبرہ

بغداد کی اہمیت اسلامی تاریخ میں نہ صرف اس وجہ سے ہے کہ یہاں عباسی خاندان کے ۳۷ خلفاء نے سیاست و حکمرانی کی داد پائی ہے بلکہ مذہب اسلام کی ایسی جلیل القدر ہستیاں مدفون ہیں جن کی عالمانہ صلاحیت کا سکہ ساری دنیا پر قائم ہے۔ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کا مقبرہ بغداد کے محلہ اعظمیہ میں ہے۔ قبر مبارک کی جالی پر اللہ تعالیٰ کے ۹۹ اسمار حسنیٰ پنسل سے لکھے ہوئے ہیں۔

قطب العصر امام الاولیا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ



حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا روضہ



امام موسیٰ کاظم اور امام محمد الجواد کے مزارات

کا مزار مبارک اسی شہر میں ہے۔ موصوف کا مزار صبح اور عشار کی نماز کے بعد زائرین کے لئے کھلتا ہے۔ ہزاروں لوگ روزانہ زیارت کے لئے آتے ہیں۔

مذکورہ بزرگانِ دین کے علاوہ یہاں امام موسیٰ کاظم رح امام احمد بن حنبل رح حضرت جنید رح امام ابو یوسف رح شیخ شبلی رح معروف کرخی رح وغیرہم کا مزار مقدس بھی ہے۔

ٹ رائل سیروز آف اسلام

ایشیائی ترقی کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کا استعمال

بقیہ صہ ۲۳ سے آگے

مسٹر ربنی مہیو نے ایشیائی ممالک کے جن مخصوص مسائل کا ذکر کیا ان میں سائنس کی تعلیم، اساتذہ کی کمی، اور ملکی زبانوں میں مناسب کتابوں کی کمی کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کانفرنس جو اہم فیصلے کرے گی متعلقہ ممالک ان پر پوری سرگرمی سے عمل کریں گے تاکہ اُن کا مستقبل درخشاں و تابناک ہو۔

گنجفہ صہ ۴۳ سے آگے

فرش کے چاروں طرف کھلاڑی بیٹھتے ہیں۔ اوّل تو چھوٹی چھوٹی ۹۶ گول فردوں کو ہتھیلی میں سنبھالے رکھنا ہی آسان کام نہیں۔ پھر ایک ایک فرد اس طرح بانٹی جاتی ہے کہ بغیر کھلے پھسلتی ہوئی سیدھی دوسرے کھلاڑی تک پہنچ جائے۔ اس کے لئے خاص مشق کی ضرورت ہے۔ اسی طرح یہ بھانپنا کہ دوسرا کھلاڑی کیا پتّے لے کر رہ گیا ہے آسان کام نہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ تاش کی طرح گنجفہ چکنے کارڈوں پر چھپا ہوا نہیں ہوتا اور گہرے آئیل کلرز سے پینٹ ہونے کی وجہ سے نقش کافی اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر بھی بند پتّے کو صرف ٹٹول کر صحیح اندازہ کرنا کیا پتہ ہے۔ خالہ جی کا گھر نہیں۔ یہ تو ماہر کھلاڑیوں کے بس کا ہی روگ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو ہوا ایک آرٹ۔ بچّے نہ تو گنجفہ ہاتھ میں سنبھال سکیں نہ ٹھیک طرح پتّے بانٹ سکیں نہ اُن میں اتنی سوجھ بوجھ کہ کتنے پتّے لے کر رہیں۔ کتنے نمبرے کر پیش کریں۔ کب اور پتّہ لینا چاہئے۔ کب نہیں۔ تو آخر انھیں اس کھیل سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تو عرض ہے کہ اُن کے لئے بھی اس میں گنجائش ہے۔ فرض کیجئے میرا بچہ میرے پاس بیٹھا ہے A تاش بانٹ رہا ہے۔ بچہ B کے آگے ایک پیسہ رکھ دیتا ہے۔ اگر B وہ بازی جیت جائے۔ خواہ اُسے پیسہ ملنا ہو یا نہ ہو مگر A بچے کو ایک پیسہ اپنے پاس (اُن ۱۶ میں سے نہیں جو وہ گنجفہ کھیلنے کے لئے لے کر بیٹھا ہے) دے دے گا اور بچے کے پاس ا کی جگہ ۲ پیسے ہو گئے۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ اگر کوئی اور تاش جیت لے تو بچے کا پیسہ صحیح سلامت واپس آجاتا ہے ہاں اگر A تاش جیت لے تو بچے کا پیسہ ہضم۔ اُسے "گلم" کہتے ہیں۔

میں نے کوشش تو کی ہے کہ اس کھیل کی پوری تفصیل بیان کر دوں شاید پڑھنے والوں کو لطف بھی آئے۔ مگر عرض ہے کہ اصل لطف تو کھیلنے ہی میں آتا ہے

میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا۔ کہ جو اصطلاحات یا کھیل کا جو طریقہ میں نے لکھا ہے وہ مستند ہے۔ بلکہ جس طرح میں نے یہ کھیل کھیلا ہے۔ دیکھا ہے یا سُنا ہے وہی میں نے بیان کیا ہے۔

ویریندر اگروال

ضرورت کے مطابق اجرت

مرکزی سرکار کے ملازمین کی مجلس عاملہ نے سفارش کی ہے کہ ہندوستانی محنت کشوں کے پندرھویں اجلاس کے ذریعہ مقرر اصولوں اور ضابطوں کے مطابق کم از کم اجرت ۲۰۰ روپے مقرر کی جانی چاہیئے گزشتہ دو برس میں لیبر بورڈ نے عام طور پر کم از کم ۱۷۹ روپے اجرت کی سفارش کی ہے جب کہ مرکزی سرکار کے ملازمین کو ہر ماہ کم از کم ۱۳۵ روپے تنخواہ دی جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کو بہت سی سہولیات مثلاً کوارٹر یا مکان کا کرایہ، سٹی الاؤنس، بچوں کی تعلیم کا الاونس، علاج معالجے کی سہولتیں اور رخصت پر گھر جانے کی صورت میں سفر خرچ میں رعایت وغیرہ حاصل ہیں۔ اگر ان سہولیات کا اندازہ روپوں میں لگایا جائے تو سرکاری ملازمین کی تنخواہ ۲۰۰ روپے سے کم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی محنت کشوں کے پندرھویں اجلاس میں کی گئی سفارشوں کو نہ تو دوسرے تنخواہ کمیشن اور نہ لیبر بورڈوں نے ہی مناسب اور جائز قرار دیا ہے۔

تنخواہ میں ۲۰۰ روپے سے کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازمین کی تنخواہ میں اگر ایک روپیہ فی کس کے حساب سے اضافہ کیا جائے تو سال میں تین کروڑ پچاس لاکھ روپے کا خرچ بڑھ جائے گا۔ اور اگر تنخواہ میں اضافہ ۶۵ روپے فی کس ہو تو سرکاری خرچ میں ۲۲۸ کروڑ روپے سالانہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ اگر مرکزی حکومت پردیش سرکاروں، نیم سرکاری تنظیموں، میونسپل کمیٹیوں اور سرکاری حلقوں کے کارخانوں کے سبھی ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے تو سالانہ ۶۷۶ کروڑ روپے مزید خرچ کرنے پڑیں گے۔

قابلِ غور سوال یہ ہے کہ مرکزی اور پردیش سرکاریں اس تنخواہ میں اضافے کی وجہ سے روپیہ کہاں سے فراہم کریں گی۔ اس کے لیے یا تو ٹیکس بڑھانے ہوں گے یا بڑے پیمانے پر خسارے کے بجٹ کا سہارا لینا ہوگا۔ ان دونوں کا براہِ راست اثر قیمتوں پر پڑے گا اور سرکاری ملازمین کو جو زیادہ مہنگائی بھتہ ملے گا وہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے جلد بے اثر ہو جائے گا۔ سرکاری ملازمین کا فائدہ اسی میں ہے کہ نہ تو ٹیکس بڑھائے جائیں اور نہ ہی خسارے کا بجٹ بنایا جائے اس سے قیمتوں میں اضافہ ہوگا جس سے بچت کرنے کی صلاحیت اور روزگار کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ جس کے ذریعے معاشی اور سماجی تحفظ کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے — اس کے علاوہ اگر غیر سرکاری صنعتوں کی مالی حالت کو نظر انداز کر کے ۲۰۰ روپے کم از کم تنخواہ دینے پر زور دیا گیا تو بلاشبہ ان صنعتوں میں مال کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اور غیر ممالک میں ہمارے خریداروں کو زیادہ قیمت دے کر ہمارا مال خریدنا پڑے گا جس سے برآمد بڑھانے کی کوششوں کو بھی دھکا لگے گا۔ اور اس کا اثر ہماری بین الاقوامی تجارت پر پڑے گا۔ اس طرح سرکاری حلقے کی صنعتیں جنھیں کافی منافع نہیں ہو رہا ہے اس سلسلے میں انہیں کچھ وقت لگے گا۔ ان پر مزید مالی بوجھ ڈالنے سے زبردست نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ چوں کہ ان صنعتوں کو موجودہ حالات میں بند کرنا ممکن نہیں لہٰذا ان نقصانات کو پورا کرنے کے لیے مزید ٹیکس لگانے ہوں گے۔ عام طور پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ محنت کشوں کے رہن سہن کا معیار اونچا کرنے کے لیے اُن کی اجرت بڑھانا بہت ضروری ہے مگر بہتر یہی ہوگا کہ مرکزی سرکار کے ملازمین کی کنفڈریشن مکان اور ٹرانسپورٹ کی سہولیات کی مانگ کرے تاکہ ملازمین کی کارکردگی میں اضافہ ہو پوری قوم کے تئیں اپنا فرض سمجھنے کا یہی مناسب موقع ہے اور اگر ہم متحد ہو کر ایسے پروگرام تیار کریں جس سے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی اپنی صلاحیت بڑھانے میں مدد ملے تو بلاشبہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو زیادہ موثر ڈھنگ سے پورا کر سکیں گے۔

محمد وصی

استاد اور سماج



آج کل تعلیم کے معیار سے عام طور پر بے اطمینانی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بچوں کے آداب و اخلاق اور عادات و اطوار سے متعلق بھی بے اطمینانی پائی جاتی ہے اور اس کی ذمہ داری استاد کے سر ڈالی جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ شکایتیں بجا اور کچھ بے جا بھی ہیں۔ جہاں تک عام معلومات کا تعلق ہے یہ کہنا درست ہوگا کہ آج کا بچہ پہلے کے بچوں کے مقابلے میں زیادہ جانتا ہے۔ پہلے جن باتوں کا ذکر ساتویں یا آٹھویں جماعتوں میں ہوتا تھا۔ اب وہ باتیں چہارم کے نصاب میں شامل ہیں۔ آج دوسری جماعت کا بچہ مقامی جغرافیہ اور تاریخ کی موٹی موٹی باتیں جانتا ہے اور چہارم کا طالب علم ہندوستان کے مختلف پردیشوں کے جغرافیائی حالات اور وہاں کے لوگوں کی عام زندگی سے واقف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول اور حالات بدل چکے ہیں۔

بچوں کو معمولی حساب لگانے کے لیے کاغذ پنسل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں پر زور کم دیا جاتا ہے جن کی ضرورت روز مرہ کے کاموں میں پڑتی تھی۔ آدھے اور پونے کے پہاڑے معمولی کاروبار کے لیے زیادہ ضروری ہیں مگر کم ہی بچوں کو یاد ہوتے ہیں۔ سادے پہاڑے جن کی ہر وقت ضرورت پڑتی ہے بچوں کو پختگی سے یاد نہیں کرائے جاتے۔ زبانی حساب کی مشق ضرورت سے کم ہے۔ لیکن اس کی ذمہ داری استاد پر نہیں ہے۔ نصاب ماہرین بناتے ہیں۔ استاد کا کام بنائے ہوئے نصاب کو پڑھانا ہے۔

بچوں کے عادات و اطوار اور اخلاق و کردار کو سنوارنا بلاشبہ تعلیم کا ایک جزو ہے۔ بچوں کے کردار کو سنوارنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ علم اور عمل۔ اسکول کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو ضروری علم دے اور ایسے حالات پیدا کرے جہاں بچوں کو اپنے علم کو بروئے کار لانے کے مواقع ملیں۔ پہلا کام تو مدرسہ کر رہا ہے مگر دوسرے کی طرف خاطر خواہ توجہ دینی ہے۔ اس کام کے لئے استاد کو کچھ خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ مثلاً خود اس کا کردار بلند ہو، عادات و اطوار مثالی ہوں بچے سے محبت ہو، رہنمائی کی صلاحیت ہو اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اسے اپنے کام سے رغبت ہو۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ بچوں کی عادات پر پورے معاشرے کا کردار بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

استاد سے جو توقعات وابستہ کی جاتی ہیں انھیں اچھے سے اچھا استاد اس وقت تک پورا نہیں کر سکتا جب تک ایسے حالات نہ پیدا کئے جائیں جن میں وہ اپنا کام کامیابی سے کر سکے۔ اگر کسی درجے میں ۵۰، ۶۰ بچے ہوں تو استاد ان بچوں کی طرف کیا توجہ کر سکے گا؟ انھیں کیا سکھائے گا۔ وہ کم ساز و سامان سے کام چلا سکتا ہے، کم تنخواہ پر بھی اچھا کام کر سکتا ہے مگر بچوں کی کثیر تعداد اس کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

استاد کی کارگزاری پر اس بات کا بھی اثر پڑتا ہے کہ اسے سماج کیا درجہ دیتا ہے۔ استاد کی آج وہ عزت نہیں ہے، جو پہلے تھی۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے یوم اساتذہ کے موقع پر دیئے گئے اپنے پیغام میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے "استاد کو ہمیشہ وہ عزت نہیں ملتی جو اس کا حق ہے" انھوں نے مزید کہا " اساتذہ پر علم کی راہ روشن کرنے اور نئی نسل کو پروان چڑھانے کا فریضہ عائد ہے۔ ان کی مالی حالت اسی حد تک بہتر ہوگی جس حد تک کہ ملک کی معاشی ترقی ہوگی۔ لیکن ان کی فلاح و بہبود کا مسئلہ ہمیشہ ہماری توجہ کا مرکز بنا رہے گا۔"

بہر حال یہ اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام کے معیار کو بلند کریں تاکہ آنے والی نسل صحیح طور سے پروان چڑھے اور ان قدروں کو عزیز سمجھے جنکی واقعی قدر کرنی چاہئے۔

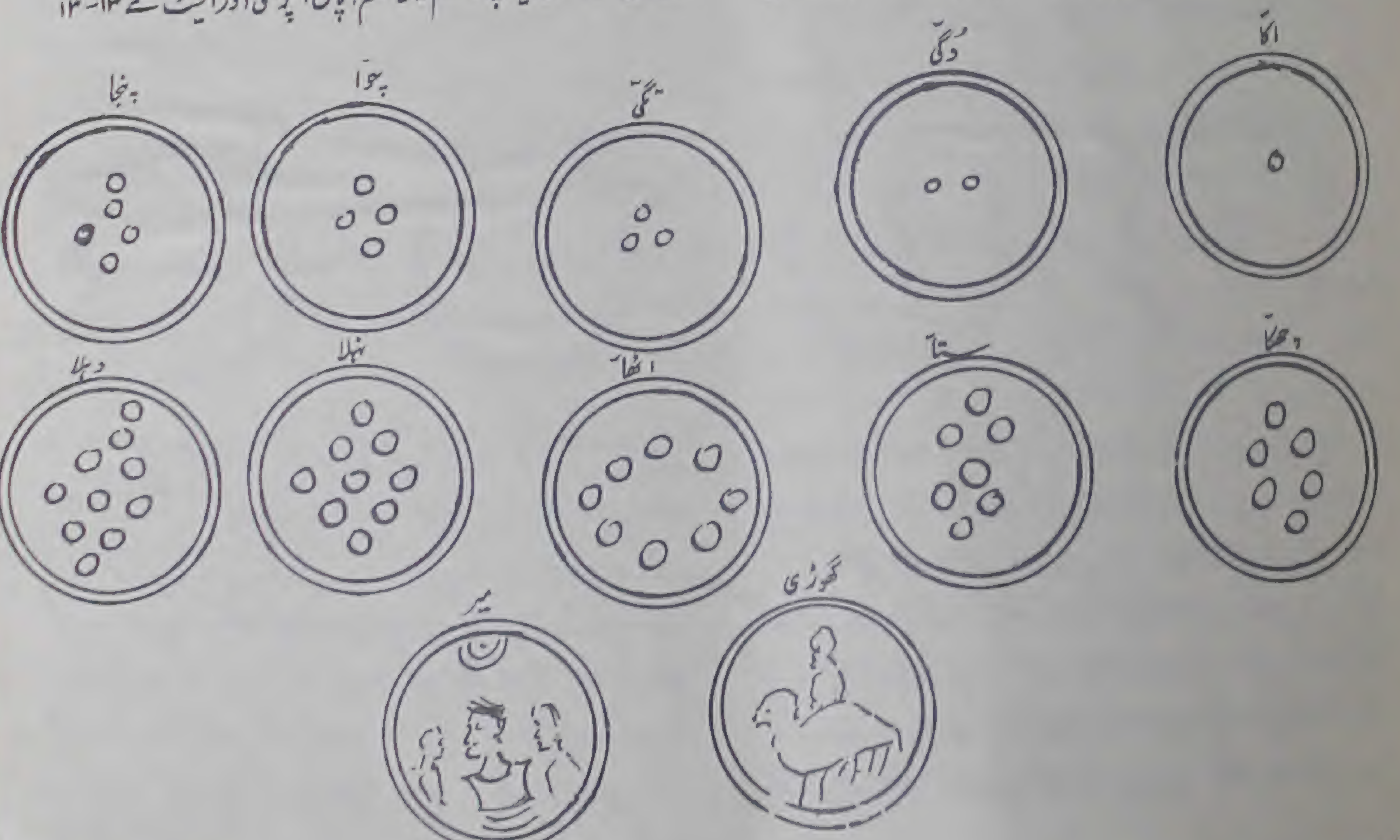
جگدیشور دیال دیش



گنجفہ

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ ریڈیو پر گنجفہ کے متعلق میں نے ایک مختصر سا مضمون سُنایا۔ تو اس کے بعد کتنے ہی لوگوں نے مجھ سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ گنجفہ کہاں ملتا ہے اور کیسے کھیلا جاتا ہے۔ تعجب اس وجہ سے ہوا کہ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ جو کھیل کچھ برس پہلے تک دلی میں اتنا مقبول تھا۔ اس سے کتنے لوگ ناواقف ہیں۔ شطرنج تو خیر۔ معلوم ہوتا ہے۔ بہت پرانا کھیل ہے اور دُنیا کے قریب سب ہی ملکوں میں کھیلا جاتا ہے۔ مگر چوپڑ (چوسر) اور گنجفہ تو میرے خیال سے ہم عمر ہیں۔ چوپڑ آج بھی کھیلی جاتی ہے۔ گنجفہ کو نہ معلوم کیوں لوگ بھول گئے۔ حالاں کہ یہ کھیل انتہائی دلچسپ ہے۔

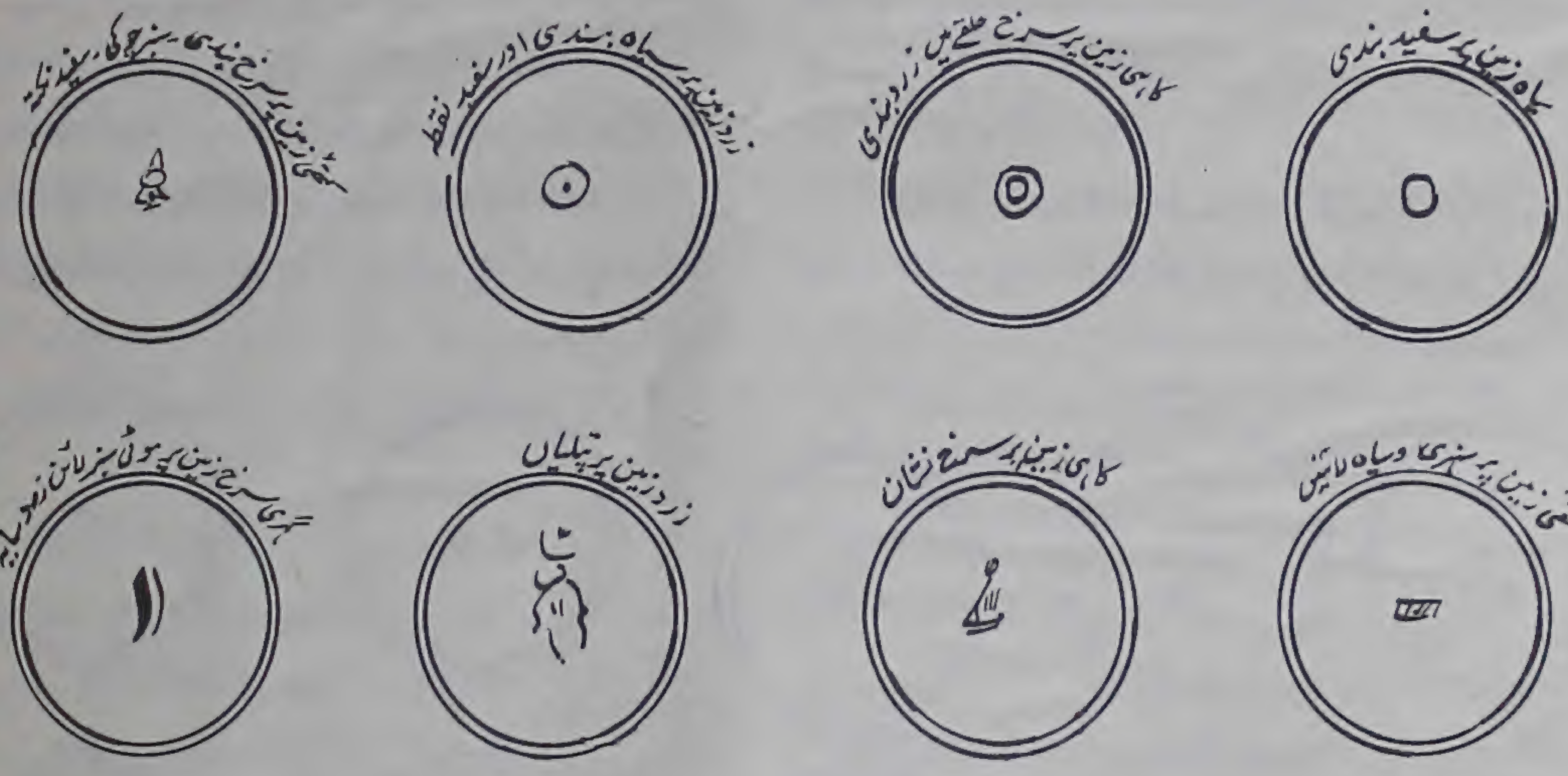
گنجفہ کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راجستھان کی "پیداوار" ہے جس طرح تاش میں چار قسم یعنی حکم، پان، چڑی اور اینٹ کے ۱۳-۱۳



یعنی کل ۵۲ پتے ہوتے ہیں۔ اسی طرح گنجفہ میں ۸ قسم کی بارہ بارہ یعنی کل ۹۶ گول گول ٹکلیاں ہوتی ہیں۔ انھیں "فرد" کہتے ہیں۔ یہ کاغذ کے گود ے (PAPIER MACHE) سے بنائی جاتی ہیں اور پھر ان پر تیل کے رنگوں (OIL COLOURS) سے نقاشی کی جاتی ہے اور سچ پوچھئے تو یہ نقاشی راجستھانی آرٹ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ فردوں کی پشت پر تو سرخ زمین پر سفید گھیرا بنا ہوا ہوتا ہے اور دوسری طرف ایک سے دس تک اور بجائے بیگم اور بادشاہ کے "گھوڑی" اور "میر" بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ فردیں ۸ مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ اور پہچان کے لئے اوّل تو رنگ مختلف ہوتا ہے۔ پھر جو نشان بنے ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

ایک دو بکس گنجفہ کے منگاؤں۔ ایک بار میں گنجفہ خرید رہا تھا کہ ایک غیر ملکی سیاح بھی ادھر آنکلا۔ پہلے تو غور سے دیکھتا رہا پھر مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے اور جب میں نے بتایا کہ یہ PLAYING CARDS ہیں PAPIER MACHE کے بنے ہیں اور سب HAND PAINTED ہیں۔ تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ دام پوچھے تو میں نے دوکاندار سے کہا کہ بھئی بتا قیمت۔ لہٰذا اس نے بھی انگریزی جھاڑدی "ONE RUPEES SIR" وہ بدیشی اور بھی حیران ہوا کہ ہاتھ کی پینٹنگ اور اتنی سستی۔ مجھ سے پوچھا کہ اس میں کتنے کارڈ ہیں اور میرے بتانے پر کہ چھیانوے کارڈ ہیں۔ خوشی خوشی ۹۶ روپے دوکاندار کے حوالے کئے اور ایک بکس لے کر چلتا بنا۔ اس وقت تو خیر مجھے تعجب ہوا ہی۔ لیکن اب یہ واقعہ حقیقت بن گیا ہے۔ جے پور میں اب گنجفہ، سنا ہے ملتا



فرد جتنی چھوٹی ہو۔ اتنا ہی گنجفہ بڑھیا سمجھا جاتا ہے عموماً فرد کا سائز بڑھیا قسم کے گنجفے میں ۵۰ پیسے کے سکے کے برابر اور عام قسم کے گنجفوں میں ایک روپے کے سکے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سب فردیں کچی لکڑی کے ایک مستطیل بکس میں رکھی ہوتی ہیں۔ بکس پر بھی تیل کے رنگوں سے نقاشی کی جاتی ہے جنگ سے پہلے ایک اچھے گنجفہ کا بکس ایک روپے میں اور معمولی قسم کا دس بارہ آنے میں مل جاتا تھا۔ ہاں اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ناممکن بات تھی کہ میں جے پور جاؤں اور منجملہ اور چیزوں کے

ہی نہیں۔ سوائے مادھو پور میں ایک دو بنانے والے رہ گئے ہیں اور معلوم ہوا کہ ۱۰۰ روپے سے کم میں گنجفہ کا بکس دستیاب نہیں ہوتا۔

اس کھیل میں جتنے کھلاڑی چاہیں حصہ لے سکتے ہیں۔ پانچ یا چھ کھلاڑی ہوں تو کھیل خوب جمتا ہے۔ کھیل کے لئے بیٹھنے کا فرشی انتظام ہوتا ہے نیچے گدا اور اوپر سفید چادر بچھا کر "پھڑ" تیار کی جاتی ہے۔ چاروں طرف کھلاڑی بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے تمام فردوں کو فرش پر خوب ملایا جاتا ہے۔ تاکہ سلسلے سے لگے ہوئے پتے الگ الگ ہو جائیں۔ شگون کے طور پر سب

کھلاڑی پتوں کو ملانے میں ساتھ دیتے ہیں اور "فال" دیکھنے کے لیے دو یا تین فردیں اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ پھر انھیں اکٹھا کر کے کوئی بھی کھلاڑی (عموماً سب سے بزرگ) سب کے آگے دو دو فردیں ڈالتا ہے۔ ان میں جس کھلاڑی کے پاس سب سے اچھے پتے ہوں وہ کھیل شروع کرتا ہے اور ایک پیسہ "گوٹ" کا دینا پڑتا ہے جو گنجفہ کے خالی بکس میں ڈال دیا جاتا ہے ہاں یہ بتانا میں بھول ہی گیا کہ ہار جیت کے خیال سے نہیں بلکہ اس لیے کہ کھیل میں دلچسپی بنی رہے۔ ہر کھلاڑی چار آنے کے ایک ایک پیسے کے سکے لے کر بیٹھتا ہے۔ ہاں جو لوگ دوسرے خیال سے گنجفہ کھیلتے تھے وہ بجائے پیسوں کے اکنیاں۔ دوّنیاں۔ چوّنیاں۔ اٹھنیاں، حتیٰ کہ ۱۶-۱۶ روپے سے بھی کھیلتے تھے۔

اب کھیل شروع ہوتا ہے۔ اگر کھیلنے والے کم ہوں تو بجائے ۸ تاشوں کے ۴۔ ۵ یا ۶ قسم کے پتوں سے کھیلتے تھے۔ بانٹنے والا گنجفہ کی پوری گڈی بائیں ہاتھ میں لے کر نیچے سے ایک ایک فرد نکال کر ہر کھلاڑی کے آگے اُلٹی یعنی ڈھکی ڈالتا جاتا ہے۔ اپنے آگے چاہے تو کھلا پتہ بھی ڈال سکتا ہے۔ پہلے پتہ داہنے ہاتھ پر بیٹھے کھلاڑی کو دیا جاتا ہے۔ پھر اس سے اگلے کھلاڑی کو۔ پھر اُس سے اگلے کھلاڑی کو۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ایک راؤنڈ پورا ہونے پر پھر پہلے کھلاڑی کو ایک پتہ کھلا دیا جاتا ہے۔ ان دونوں پتوں کو دیکھ کر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے اور پتہ لینا چاہیے یا نہیں۔ کھیل میں شامل رہنے کے لیے اُسے زیادہ سے زیادہ ۱۶ نمبر درکار ہوتے ہیں اس کے لیے وہ جتنے چاہے پتے مانگ سکتا ہے۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ یا ۱۶ نمبر ہو جانے پر وہ کہے گا۔ کہ "میں رہ گیا" اور اپنے پتے سنبھال کر رکھ لے گا۔ اسی طرح بانٹنے والا دوسرے کھلاڑی کو پتے دے گا۔ اگر اس کے پتوں کا جوڑ ۱۶ سے زیادہ ہو گیا تو وہ کہے گا کہ "میں گیا" اور اپنے پتے رکھ دے گا۔ اب اس کے بعد اگلے کھلاڑی کا نمبر آتا ہے اور آخر میں خود بانٹنے والے کا۔ فرض کیجیے کہ بانٹنے والے کے پتوں کا جوڑ ۱۵ ہوتا ہے اور اس کا اندازہ ہے کہ اور "رہنے" والوں کے پتے اس سے ہلکے ہیں تو وہ کہے گا "۱۵ سے بیش" (بیش غالباً پیش کی بگڑی ہوئی شکل ہے) اور اب سب اپنے اپنے پتے دکھا دیں گے۔ اگر کسی اور کھلاڑی کے پاس ۱۶ نمبر کے پتے ہیں تو گنجفہ سنبھال لے گا۔ اور اس صورت میں کسی کو کچھ دینا لینا نہیں ہوتا۔ اور اگر بانٹنے والے کے پتے ہی سب سے اچھے ہوئے تو وہ ہر ایک کھلاڑی سے ایک ایک پیسہ بھی وصول کرے گا۔ اور وہی دوبارہ پتے بانٹے گا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بانٹنے والے کے پاس بھی پندرہ نمبر کے پتے ہیں اور کسی اور کھلاڑی کے پاس ۶+۵+۴ = ۱۵ ہیں۔ دوسرے کے پاس ۸+۷ = ۱۵۔ تو دوسرا جیتا مانا جائے گا۔ اور اگر اتفاق سے دونوں کے پاس یکساں پتے ہیں تو پہلا کھلاڑی جیتے گا۔ یہاں یہ اور بتا دوں کہ گھوڑی کے گیارہ نمبر اور میر کے ۱۲ نمبر مانے جاتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے پتوں کا فیصلہ اس طرح کیا جاتا ہے۔

درجہ	۱۶	۱۵	۱۴
۱۔ اوّل	میر + ۴	میر + ۳	میر + ۲
۲۔ دوم	گھوڑی + ۵	گھوڑی + ۴	گھوڑی + ۳
۳ سوم	۱۰ + ۶	۱۰ + ۵	۱۰ + ۴
۴۔ چہارم	۹ + ۷	۹ + ۶	۹ + ۵
۵ پنجم	۸ + ۸	۸ + ۷	۸ + ۶

ایسا بھی ہوتا ہے کہ اور سب کھلاڑی ایک ایک کر کے پتے پھینک دیتے ہیں اور صرف بانٹنے والا رہ جاتا ہے۔ اُس کے پاس اکا۔ دُگی۔ تگی اور چوا یا پنجا ہے تو اُسے اور پتہ لینے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیوں کہ اگر بڑا سے بڑا پتہ یعنی میر بھی اس کے پاس اور آجاوے تو بھی اس کے پتے جیتنے والے رہتے ہیں۔ یہ نہ معلوم کیوں؟ "بنے" کہلاتی ہے۔ فرض کیجیے بانٹنے والے کے پاس اکا ہے تو اکے کی "بنے" تو ہے ہی، مگر اُسے حق ہے کہ یہ کہہ کر ایک پتہ اور لے لے کہ "اکے کی بمے بشرط دوّن" اور اتفاق سے ایک اکا اور نکل آوے تو وہ پتے پر دوّن کہلائے گی اور وہ ہر کھلاڑی سے دو دو پیسے وصول کرے گا۔ اگر کوئی اور پتہ نکل آئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاں صرف اکے کے ساتھ یہ رعایت ہے کہ کسی بھی کھلاڑی کی دوّن ہو جائے تو وہ یہ کہہ کر کہ ایک پتہ اور لے سکتا ہے کہ "اکے کی دوّن بشرط تگون" مطلب یہ کہ دوّن تو ہے ہی اگر ایک اکا اور آجاتا ہے تو "تگون" ہو جائے گی۔ عام کھلاڑی کو "تگون" کے دو پیسے ملتے ہیں اور بانٹنے والے کو یعنی "پتے پر تگون" کے ہر کھلاڑی سے تین تین پیسے ملتے ہیں۔ اور بانٹنے والے کو یعنی "پتے پر تگون" کے ہر کھلاڑی سے تین تین پیسے ملتے ہیں۔

ایک چیز اور، فرض کیجیے کل پانچ کھلاڑی کھیل رہے ہیں شروع

کے تین اپنے اپنے پتے پھینک چکے ہیں اب صرف آخری کھلاڑی اور بانٹنے والا رہ جاتے ہیں تو وہ بڑے پش و پنج کی حالت ہوتی ہے پش و پنج کو ہی لیجئے۔ آخری کھلاڑی کے پاس پہلا پتہ چھکا ہے۔ دوسرا پتہ اُسے پنجا ملتا ہے۔ کل ۱۱ ہوئے۔ اسے حق ہے کہ ایسی مجبوری کی صورت میں وہ ۱۱ رہ جائے۔ اُسے یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک پتہ اور مانگ لے۔ اور پتہ لینے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس بڑا پتہ آجائے اور اُسے بھی اپنے پتے پھینکنے پڑیں۔ ایسی حالت میں چاروناچار وہ ۱۱" رہ جاتا ہے۔ یا بانٹنے والے سے کہتا ہے کہ اگلا پتہ" دکھاؤ۔ بند پتوں ہی میں وہ آخری پتے" کو ٹٹول کر دیکھتا ہے۔ اگر اس کے اندازے کے مطابق اگلا پتہ چھکا یا اس سے کم ہے تو وہ مانگ لے گا۔ ورنہ، رہ جائے گا"۔ یہ ذرا تجربے کی بات ہے۔ ہر کھلاڑی کے بس کی بات نہیں ہے۔ خیر وہ گیارہ رہ گیا۔ اب بانٹنے والے کے پاس فرض کیجیے" ستا ہے۔ دوسرا پتہ" چوا کھلتا ہے۔ یہ تو وہ جانتا ہے کہ آخری کھلاڑی کے پتے ہلکے ہیں۔ لیکن اس کے لیے بھی موقعے سوچ بچار کا ہوتا ہے وہ بھی نیچے کا پتہ ٹٹول کر کہتا ہے اگر پتہ بڑا معلوم ہو تب تو وہ گیارہ سے بیٹ کر دیتا ہے۔ ورنہ نیا پتہ لیتا ہے۔ اگر دُگی۔ تگی۔ چوا یا پنجا آگئے" تب تو اس کے پوبارہ ہیں ہی۔ اور اگر قسمت سے چھکا آگیا۔ تو ہتے پر نقش ہو جاتا ہے۔ اگر چھکے سے بڑا پتہ آیا تو وہ گیا" اور ۱۱ رہنے والا آخری کھلاڑی جیت گیا۔ یہ نوٹ کرنا چاہیے کہ ۱۱۔۱۲ یا ۱۳ تک کوئی بھی کھلاڑی مجبوری سے ہی " رہتا" ہے۔ ورنہ کم سے کم" ۱۴" رہنا" چاہیے

دوسری صورت یہ ہے کہ پہلا کھلاڑی دو یا تین پتے لے کر " رہ گیا" دوسرا کھلاڑی بھی رہ جاتا ہے۔ تیسرا اور چوتھا بھی۔ بانٹنے والے کے لیے "یہ صورت حال بھی بڑی نازک ہوتی" ہے۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ پہلا یا دوسرا کھلاڑی ہرگز ۱۳۔۱۴ نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی" رہا" ہوگا۔ بانٹنے والے کے پاس فرض کیجیے" پہلا پتہ اٹھا ہے اور دوسرا پتہ" چھکا ہے تو اچھا کھلاڑی ایسے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ہرگز" ۱۴ " سے بیٹ نہیں کرے گا۔ وہ باقی کھلاڑیوں سے کہے گا کہ " پائے دو" یعنی ایک ایک پتہ دکھاؤ۔ ہر کھلاڑی کو ایک پتہ تو بند ملتا ہی ہے باقی پتوں میں سے کوئی بھی ایک پتہ وہ دکھا دے گا اور کوشش کرے گا کہ ہلکا پتہ دکھائے۔ تاکہ کھیلنے والا مغالطے میں رہے۔ اور اگر پائے نہلے۔ دہلے یا گھوڑی یا میر کے ہیں تب بھی وہ ۱۶ سے کم پر مطمئن نہیں ہوگا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پہلا یا دوسرا کھلاڑی ۱۴ لے کر نہیں" رہ" سکتا اور جب پہلے دو کھلاڑی رہ چکے ہیں تو تیسرا اور چوتھا کھلاڑی بھی جب تک اس کے پاس بہت اچھے پتے نہ ہوں نہیں" رہے گا" لہٰذا مجبوراً وہ ایک پتہ اور کھینچے گا۔ اگر قسمت سے تگی" نکل آئی اور "ہتے پر نقش" ہوگیا تو زہے نصیب۔ ورنہ جس کے پتے بڑے ہوں گے۔ وہ تاش لے لے گا۔ دین۔ لین کچھ نہ ہوگا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ایک پتہ تو ہر کھلاڑی کو مل گیا۔ مگر دوسرا پتہ سب کو ملنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہ تب ہوتا ہے جبکہ کسی کھلاڑی کا "نقش" ہو جاوے۔ یا" دون"،" تگون یا " سہہر" یا" گلبھر" آجاوے۔ تو وہ تاش لے لے گا۔ باقی سب کھلاڑی اپنا اپنا پتہ واپس دیدیں گے۔ اس صورت میں لین دین صرف بانٹنے والے یا جیتنے والے میں ہوتا ہے۔ معمولی نقش" پر کچھ نہیں ملتا۔ اگر "نقش ہم رنگ" ہو تو جیتنے والا کہتا ہے "نقش ہم رنگ پیسہ لاؤ سنگ"۔ اگر" دون" ہے تب بھی ایک پیسہ۔ تگون پر دو پیسے اور" سہہر" پر تین پیسے ملتے ہیں۔ البتہ اگر بانٹنے والے کے پاس یہی چیزیں آویں تو اُسے دوگنی رقم ملتی ہے۔ اوہ! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ " نقش"۔ سہہر" "گلبھر" کیا بلا ہیں۔ تو واقعی مجھے پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ بہرکیف۔ اب لیجیے:

نقش (i) دو یا دو سے زیادہ پتوں کا جوڑا ۱۷ ہونے پر نقش کہلاتا ہے۔

(ii) صرف دو پتوں کا جوڑا ۲۱ ہو تو وہ بھی نقش کہلاتا ہے۔

نقش ہم رنگ صرف دو پتوں کا جوڑا ۱۷ یا ۲۱ ہو اور دونوں پتے ایک ہی رنگ کے ہوں تو یہ

"نقش ہم رنگ" کہلاتا ہے۔

دُون اِکا۔ میر۔ گھوڑی۔ دہلا یا نہلا۔ اگر دو آجاویں تو یہ "دون" کہلائے گی۔ کچھ کھیلنے والے دُگّی کی بھی "دون" مانتے ہیں۔

سہر تین ستے۔ سہر کہلاتے ہیں۔

گُلبصر دو میر اور ایک اِکا۔ دو گھوڑیاں اور ایک اِکا۔ دو دہلے اور ایک اِکا۔ دو نہلے اور ایک اِکا۔ مطلب یہ کہ جن تینوں کی دُون مانی جاتی ہے۔ اُن کے ساتھ اگر اکا آجائے تو یہ گُلبصر" کہلاتی ہے۔ ہاں دو اٹھوں کے ساتھ اگر اِکا آجاوے تو حالاں کہ ان کا جوڑ ۱۷ ہوتا ہے۔ اور یہ "نقش" کے پتے ہوتے ہیں۔ مگر یہ گلبصر کہلاتی ہے "گلبصر" چونکہ نقش سے بڑھیا چیز ہے۔ اس لیے یہ کھیلنے والے کی ہوشیاری پر منحصر ہے۔ کہ وہ نقش کہہ کر بیش کرتا ہے یا گلبصر کہہ کر

گدھے جتوائی میر اور گھوڑی دونوں بڑھیا پتے ہیں۔ مگر دونوں ایک ساتھ آجاویں تو بیکار ہوجاتے ہیں۔ اور انھیں نفرت سے "گدھے جتوائی" کہا جاتا ہے

لاٹھی لاٹھی کے ۱۶ دو اٹھوں کے ۱۶ کو لاٹھی لاٹھی کے سولہ" کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ یہ مجھے خود نہیں معلوم۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ ہر کھلاڑی صرف ۱۶ پیسے لے کر بیٹھتا ہے۔ خواہ پیسے ہوں یا اکنیاں۔ دُونیاں۔ چونیاں۔ اٹھنیاں یا روپے مگر یہ ضروری ہے کہ ہر کھلاڑی کے پاس رقم یکساں ہو۔ ایک کھلاڑی کی قسمت ساتھ نہیں دیتی اور ایک ایک کر کے تمام پیسے نکل جاتے ہیں۔ مگر مزا یہ ہے کہ وہ کھلاڑی کھیل سے نہیں نکلے گا۔ یوں سمجھیے کہ A کے پاس پیسے ختم ہوجاتے ہیں اور B کے پاس ہتھے پر "دُون" آجاتی ہے۔ A پیسے نہیں دے سکتا اور B کا دو پیسے کا مقروض ہوجاتا ہے۔ مگر آئندہ جب بھی کبھی وہ B سے تاش لے گا، تو وہ قرض خود بخود اُتر جائے گا۔ اس صورت کو کہا جاتا ہے۔ "ہاتھ لیے برابر ہوئے" اسی دوران A بازی جیتتا رہے اور اُس پر رقم اکھٹی ہوجائے تب بھی وہ نقد ادائیگی B کو نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ اگر A کے پاس "ہتھے پر نقش" آوے تو وہ — حالانکہ B کا دو پیسے کا مقروض ہے۔ تب بھی اوروں کی طرح B سے بھی وہ پیسہ وصول کرے گا۔ یہ جیت قرض کی رقم سے وضع نہیں کی جاسکتی۔ یعنی دن رات کھیلے جائیے۔ کم از کم ناداری کی وجہ سے کسی کھلاڑی کو الگ کیا نہیں جاسکتا۔

جب کوئی کھلاڑی لگاتار کئی ہاتھ جیت لے۔ یا ویسے ہی ذرا کھیل کا رُخ بدلنے کے لئے۔ بانٹنے والا بجائے ایک ایک پتہ دینے کے ہر کھلاڑی کو دو دو پتے بند دیتا ہے۔ اُسے "دو فردہ" کہتے ہیں اب نمبروار ہر کھلاڑی اپنے پتے کھولتا جاتا ہے اور جس کے پتے سب سے اچھے ہوں گے۔ وہ بازی جیتے گا۔ اس میں شرط یہ ہے کہ فرض کیجیے کہ پہلے کھلاڑی کے پاس ۱۴ ہیں۔ دوسرے کے پاس "گدھا جتوائی" تیسرے کے پاس "نقش" چوتھے کے پاس "گلبصر" اور بانٹنے والے کے پاس "دون" آتی ہے۔ تو حالانکہ "گلبصر" اور "دون" "نقش" سے بڑے ہیں۔ پھر بھی تاش نقش والے کھلاڑی کو ملے گی۔ کھیل کے اختتام پر تین تین یا پانچ پانچ پتے ایک ساتھ بانٹ دیئے جاتے ہیں۔ اس صورت میں بعض جگہ تو یہ دیکھا کہ جس کے پتوں کا ٹوٹل سب سے زیادہ ہوا اُسے جیتا مانتے ہیں۔ بعض جگہ یہ ہوتا ہے کہ پانچ پتوں میں سے اپنی پسند کے کوئی بھی دو یا تین پتے جن سے نقش، دون سہر یا گلبصر بنے وہ رکھ کر باقی پتے پھینک دیں۔ سب سے آخر میں تاش جس کھلاڑی کے پاس جاتی ہے "گوٹ" کا پیسہ اُسے مل جاتا ہے

گنجفہ کھیلنا بھی ایک آرٹ ہے۔ اول تو تاش بانٹنے ہی کو لیجیے یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ فرش پر گدا اور چاندنی بچھا کر گنجفہ کھیلتے ہیں۔ مزا یہ کہ چاندانی سفید براق ہو اور شکن کا نام نہ ہو۔ ہر کھلاڑی چاندنی کو کھینچ کر دبائے بیٹھا رہتا ہے تاکہ وہ تنی رہے۔

بقیہ ص ۳۶ پر

نئی کتابیں

سورج کا شہر

مصنف : شہاب جعفری

ناشر : ممتاز دارالشعر ۔ ۸/۱۰ ماڈل ٹاؤن دہلی ۹

قیمت : چھ روپے

۱۹۴۷ء کے بعد اردو شاعروں کی ایک نئی نسل سامنے آئی ہے جس کے متعلق یہ خیال درست ہے کہ وہ اپنے طرزِ احساس اور فنی طریقِ کار کے اعتبار سے ماضی قریب کے شعراء سے الگ ہے لیکن ہمارے بعض سکہ بند نقادوں کا یہ فرمانا کہ یہ نسل اپنی روایت سے بیگانہ ہے اور اس کے یہاں اردو شاعری کا تسلسل ٹوٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے درست نہیں. میری ناچیز رائے میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ہمارے یہاں شاعروں کی جو نسل پروان چڑھی اور جس نے اپنے شعری اکتسابات کو نئی شاعری یا ترقی پسند شاعری کا نام دیا اس کے یہاں روایت کی طرف سے عام طور پر ایک جارحانہ رویہ ضرور ملتا ہے. بغاوت اور انقلاب اس دور کا مقبول نعرہ تھا جس نے زندگی کی دوسری قدروں کے علاوہ شعر و ادب کی قدروں سے انحراف کو ضروری قرار دیا. پرانی اردو شاعری جاگیردارانہ اور زوال پذیر معاشرے کا ورثہ قرار پائی، غزل کو بے وقت کی راگنی قرار دیا گیا، عشقیہ اور جمالیاتی تجربات "غمِ دوراں" کی قربان گاہ کی نذر ہوئے اور غمِ دوراں " سمٹتے سمٹتے ہنگامی اور سیاسی مسائل کے مترادف قرار پایا. بعض اس طلسم سے نکلے تو ہئیت پرستی اور تجرباتی نظموں کے اسیر ہو کر رہ گئے. میرا خیال ہے کہ آزادی کے بعد جو نئی پود پروان چڑھی ہے. اس نے ماضی قریب کی اس "روایت" سے انحراف کیا ہے. اور اردو شاعری کی وسیع تر روایت سے پھر ایک بار اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ہے جو زندگی کو بحیثیت کل دیکھتی ہے اور ہنگامی محرکات سے آگے بڑھ کر زیادہ گہرے اور دور رس اثرات کو اپنے فن کا محور قرار دیتی ہے۔ یہ شاعر روائتی نہیں ہیں. لیکن روایت کے جاندار عناصر کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتے ہیں. یہ شاعر جدید دور کے مسائل کا اِدراک رکھتے ہیں لیکن محض "جدت پسندی" کو نئی شاعری کی علامت نہیں قرار دیتے. یہ فن کے "نامیاتی" اور متحرک تصور میں یقین رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں اُن کی شاعری نئی اور تازہ تر بھی ہے. شہاب جعفری اس گروہ کے ایک نمائندہ فرد ہیں۔

شہاب ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اردو کی کلاسیکی شاعری کا گہرا اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور اس سے اس کا بہترین رس نچوڑنے کی کوشش کی ہے بلکہ ہندوستان کی تہذیب، اس کی دیو مالا اور اس کے افکار کا علم حاصل کر کے اسے اپنی شخصیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے. "سورج کا شہر" گزشتہ چند برسوں میں شائع ہونے والے مجموعوں کے درمیان اس اعتبار سے بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ ایک بھرپور اور مکمل مجموعہ ہے اور ہر

اعتبار سے اس میں تنوع اور رنگا رنگی ملتی ہے۔ نظم، غزل، رباعی، گیت، بھجن، فردیات، منظوم ڈرامہ، غرض شاعر نے مختلف اوقات میں مختلف سانچوں کو برتنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے مسلسل ریاض کیا ہے۔

شہاب کی غزل میں ولی، میر، سودا، درد، نظیر، آتش ناسخ، غالب، مومن، یگانہ، اور فراق کی غزل کے قابلِ توجہ عناصر ایک کیمیاوی عمل سے جذب ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور شاعر کے خود اپنے مزاج کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ جو نئے ماحول اور نئی تہذیب کی گرفت میں ہے۔

اس مجموعے کے چند منتخب اشعار ہیں۔

میں بھی صحرا ہوں مجھے سنگ سمجھنے والو
اپنی آواز سے کرتے چلو سیراب مجھے

شام ہوتی ہے تو اک اجنبی دستک کے سوا
دل سے پہروں کوئی آواز ابھرتی بھی نہیں

کوئی دن کو جدا ہو جاؤ ہم سے
بہت دن سے یہ دل بے آرزو ہے

کوئی ایسا بھی نہیں جس پہ گماں ہو تیرا
تیری صورت کے کئی عکس اتارے دل میں

عزیزو تم کو کیا دوں، سچ ہے اک مدت میں لوٹا ہوں
تمہاری نذر ہیں کچھ تجربے غربت میں جینے کے

زوالِ نشہ میں نیندیں پکارتی ہیں کسے
وہ خواب بھول گیا ہوں، وہ خواب لاساتی

ابھی اور کیا جنوں ہے، مرا عزم مجھے بتا دو
تمہیں پا کے بھی تو اکثر کمی رہ گئی ہے یا نہیں

رہِ حیات میں محرومیوں کا حال نہ پوچھ
چراغِ شام میں بھی روشنی نہیں ہوتی

نگاہِ شوق نے کل شب یہ معجزہ دیکھا
کہ کائنات حسیں تھی ترے بدن کی طرح

آتی ہے زنداں میں اس پردہ نشیں کی یاد بھی
مجھ اسیرِ غم کی خاطر پا برہنہ سر کھلے

زندگی کیا خبر کہاں لے جائے
تم مرا انتظار مت کرنا

تجھ کو بھی دیکھا ہم آزادوں نے اے راہِ فرار
دل کو کھینچے ہے کوئی، اب اپنے گھر جائیں گے ہم

دُنیا میں کئی کام تھے آشفتہ سروں کو
مت عیب لگاؤ کوئی ان بے ہنروں کو

سلسلہ دار وہ تہیں محرمِ زنجیر نہیں
جس کو شکوہ ہو مرا عہدِ جنوں یاد کرے

شہاب کی نظمیں موجودہ دور کے فرد کا المیہ پیش کرتی ہیں یہ نظمیں صرف احساسات کے پردے پر نہیں اُبھاری گئی ہیں۔ بلکہ ان میں فکر کی آمیزش سے معنویت کی تہیں پیدا کی گئی ہیں۔ اس مجموعے کے دیباچہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا نے "سورج" کو شاعر کی بنیادی علامت قرار دیا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ "سورج کا شہر" "ذرے کی موت" "خدا کی واپسی" "معاہدہ" "ماحصل" "خوابِ تکمیل" "نروان سے آگے" "سر راہے" "شہر انا میں" "تلاش" اور "گہرے بندھن" اس مجموعے کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں بیانیہ

یا پیامیہ انداز کے بجائے کہیں خود کلامی کہیں خود کردار نگاری، کہیں ڈرامائی کیفیت کہیں فضا اور منظرت کی رمزیت ملتی ہے اس لئے ان میں شاعری کی کوئی ایک آواز نہیں بلکہ بیک وقت کئی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ شہاب کی اس نوع کی نظمیں اپنے اندر بڑے امکانات رکھتی ہیں اور توقع ہے کہ آئندہ ان میں کئی اور جہتیں پیدا ہوں گی۔ البتہ منظوم تمثیل "یہ میری دنیا یہ میری جنت" میں شہاب کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے، اس تمثیل میں حرکت اور روانی کے بجائے ٹھہراؤ کی کیفیت ملتی ہے اور پوری تمثیل میں کوئی ایسا نقطۂ عروج نہیں پیدا ہوتا جو اسے کسی خاص سمت میں موڑ سکے اس تمثیل پر اقبال اور جوش (حرف آخر والے) کی منظومات کا اثر زیادہ قوی ہے، نئے طرزِ احساس، نئے ادراک اور نئے لہجے سے یہ تمثیل خاصی دور رہ گئی ہے شہاب کی تمثیل نگاری کا جوہر اُن کی دوسری نظموں میں زیادہ نکھرا ہے

مجموعی طور پر "سورج کا شہر" اس دور کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے اور ایک ایسے شاعر کو سامنے لاتا ہے جس کی شخصیت اور شاعری کی جڑیں گہری اور جس کے فن کی بنیادیں استوار ہیں۔ وہ ان شاعروں میں نہیں جو ہماری شاعری کے ایوان میں ہر دس پانچ سال کے بعد داخل ہوتے ہیں اور اپنی جدت اور ندرت سے قارئین کو چونکا یا سہما کر بہت جلد ایسے غائب ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کا نام سوچنے کے لئے حافظے پر زور دینا پڑتا ہے۔ شہاب نے مسلسل بیس سال کی ریاضت اور مشقِ سخن کے بعد اپنی شاعرانہ شخصیت اور فنی کردار کو دریافت کیا ہے۔ یہ شخصیت مستحکم اور یہ فنی کردار دیرپا قدروں کا حامل ہے۔

(خلیل الرحمن اعظمی)

تلاش و توازن

مصنف : ڈاکٹر قمر رئیس

ناشر : خرام پبلیکیشنز۔ حوض قاضی دلی

ضخامت : ۲۵۶ صفحات ۔ قیمت : ساڑھے چھ روپے

"تلاش و توازن" ڈاکٹر قمر رئیس کے گیارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے بیشتر مضامین مطبوعہ ہیں اور ان میں سے ایک نشریہ اور ایک تبصرہ ہے۔ نشریہ آزاد انصاری پر اور تبصرہ شاذ تمکنت کے مجموعہ تراشیدہ پر ہے۔

دو تین مضامین کے علاوہ باقی تمام ناول اور افسانے کے فن پر بڑے بھرپور انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔

یوں تو تمام مضامین ڈاکٹر قمر رئیس کے منفرد اسلوب اور بے لاگ تنقیدی شعور کے بجا طور پر آئینہ دار اور اُن کے صاف ستھرے ذہن کے عکاس ہیں، مگر "آزاد انصاری" پر نشریہ اور "تراشیدہ" پر تبصرہ دونوں ہی کافی حد تک تشنگی کا احساس دلاتے ہیں۔ اگر انہیں اس خوبصورت تنقیدی مجموعہ میں شامل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔

" جدید ازبکی شاعری " جہاں ازبکستان کی ادبی اور تہذیبی تحریکات کا آئینہ دار ہے۔ وہاں "پیروڈی کا فن" میں پیروڈی کی تکنیک پر روشنی ڈالتے اور اس کے پس منظر کو نمایاں کرتے ہوئے مصنف کی کم گوئی آڑے نہیں آتی، البتہ راجہ مہدی علی خاں کی پیروڈیوں پر خاموشی قدرے گراں گذرتی ہے۔ مگر "افسانہ نگار ندیم" جہاں قمر رئیس کی دیدہ وری اور نکتہ سنجی کا ترجمان ہے وہاں پریم چند کی کہانیوں کا مطالعہ اُن کے تحقیقی شعور کا پتہ دیتا ہے۔

بحیثیت مجموعی تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ڈاکٹر قمر رئیس کی بالغ نظری، پختہ شعور اور سلجھے ہوئے اسلوب کا حامل ہے۔ کتابت وطباعت معیاری، کاغذ اچھا اور جلد پختہ ہے۔

(پریم پال اشک)

اُردو شاعری میں تاج محل

مرتبہ : شجاع خاور۔ ناشر اُردو پبلیکیشنز دہلی ۶

قیمت : ایک روپیہ ۵۷ پیسے

شجاع خاور نے اس مجموعے میں "تاج محل" پر اُردو کے چالیس شعراء کا کلام مختصر تبصرہ و تنقید کے ساتھ پیش کیا ہے انہوں نے نہ صرف ایک جدت پیدا کی ہے بلکہ اپنے مذاقِ شعر و سخن کا اچھا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

اس مجموعے میں سب سے پیاری نظم ساحر کی وہ مشہور نظم ہے جس کا مقطع تاج محل کا خیال آنے پر ہر اُردو داں کے دماغ میں گونجنے لگتا

ہے. وہ نظم اپنی نظریاتی انتہا پسندی کے باوجود اس مجموعہ میں بڑی نمایاں حیثیت کی حامل ہے کئی دوسری نظمیں ہیں جو مجموعی اعتبار سے یا اپنے دلکش بند یا ترکیب کی وجہ سے قاری کے ذہن و دماغ پر چھا جاتی ہیں. مضمون آفرینی اور پرواز تخیل اس مجموعے کی کئی نظموں میں نمایاں ہے.

تشبیہات کی بھرمار ہے. کسی نے تاج کو خواب مرمریں کہا ہے تو کسی نے چراغ طور کی تنویر. کسی نے اسے انسانی عظمت کے نشان سے تعبیر دی ہے تو کسی نے جنون کا شہکار کہہ کر پکارا ہے.

اور کئی شعر تو واقعی بڑے اچھے ہیں.

شلاً آگیا ہے کھنچ کے ایک نقطے میں ہندوستان دیکھ — بیتاب
جسم ابیض آسماں نے بخشا ہے الہام کو — احمد حسین خاں
تو نقش آرزو ہے مجسم زمین پر — وجد
جیسے انگڑائیاں کرنوں کی مجسم ہو جائیں
جیسے بہتی ہوئی چاندی میں کنول کا پرتو
جیسے کلیاں جو سر شام سمٹ کر سو جائیں — فارغ بخاری
کاہش ہستی کا اک ڈھلکا ہوا آنسو ہے تو — اختر
چاندنی رات میں بہکا ہوا رنگین خیال
وقت کے حسن گریزاں کو گرفتار کیا — وارث کرمانی
جیسے برگ گل سے ہیرے کا محل ترشا ہوا — مہدی نظمی

ساحر کے علاوہ کئی شاعروں نے تاج کا تجزیہ انقلابی آہنگ سے کرنے کی کوشش کی ہے. اس کوشش میں وہ ناکامیاب رہے ہیں اس لئے کہ تاج کو کسی دور سے وابستہ کرنا یا کسی نظام زندگی کا پابند بنانا ظلم ہوگا. "تاج تہذیب انسانی کے عروج کی داستان کا ایک دلکش اور زریں باب ہے جسے مہدی نظمی اس شعر میں یوں کہتے ہیں.

جو اثاثہ فن کا ہے ورثہ بنی آدم کا ہے
تاج جتنا ہے میرا اتنا ہی کل آدم کا ہے

کئی نظموں میں بڑی شعریت ہے. سلام کی نظم اپنے ڈرامائی لب ولہجہ کی وجہ سے متاثر کرتی. پریم پال اشک کی نغمگی نہیں بھلائی جا سکتی.

اردو زبان اور تاج محل دونوں ایک ہی ثقافت کے مظہر ہیں اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ شاید اردو میں اس موضوع پر تمام دوسری زبانوں سے زیادہ کہا گیا ہے. کئی کمزور نظموں کے باوجود یہ مجموعہ قابل قدر ہے اور اس لائق ہے کہ ارباب ذوق کی نظر سے گذرے.

(شہاب الدین)

پیکر درخشاں

مصنف: محمد رفیع الدین پیکر خادمی محمدوی
ناشر: صدیق بکڈپو لکھنو — صفحات ۱۲۸
قیمت: دو روپے

نوجوان شاعر پیکر خادمی کے ابتدائی دور کے کلام پر مشتمل یہ مجموعہ ابھی حال میں شائع ہوا ہے اگرچہ اس میں نظم، غزل، قطعہ، رباعی، قریب قریب سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے مگر حصہ نظم خصوصاً زیادہ پُراثر ہے شاعر کے دل میں جذبہ حب الوطن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ان کی دلی تمنا ہے کہ ؎

عنادل کو چمن موجوں کو بحر بے کراں دینا؛
ہمارے دل کو یارب الفت ہندوستاں دینا

آتش عشق وطن رکھ کے مرے سینے میں
جنبش دامن رحمت سے ہوا دے یارب

پروف ریڈنگ کے ساتھ ساتھ اگر ٹائٹل کو دیدہ زیب بنانے کی طرف توجہ دی جاتی تو کتاب کا حسن بڑھ جاتا. بہرحال جو اصحاب اردو شاعری میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ مجموعہ کلام دلچسپی کا باعث ہوگا.

گل صحرا

گل صحرا طالب جے پوری کے مجموعہ کلام کا نام ہے جس میں غم عشق کے ساتھ ساتھ غم روزگار بھی نمایاں ہے. اس میں وہ تمام خواص موجود ہیں جو اچھی شاعری کے لئے لازمی ہیں. ۱۸ نظموں اور ۵۰ غزلوں پر مشتمل اس تصنیف میں متانت شائستگی و پختگی کے ساتھ ساتھ فکری پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا چند اشعار ملاحظہ فرمایئے. ؎

ہم بھی آزاد سہی، آپ بھی آزاد سہی؛ ناصیہ سائی سے آزاد نہیں ہے کوئی
طالب الجھن کے دم سے ہے توقیر زندگی؛ رکھتے ہیں اپنے سر کو جو ہر آستاں سے دور

اس شعری مجموعے میں بہت سی کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں جو قاری کو بری طرح کھٹکتی ہیں. کاش وہ اس کی طرف توجہ دیتے. صفحات سو قیمت ۲ روپے. ملنے کا پتہ: طالب جے پوری، ہیسٹنگز روڈ الہ آباد

یہ میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی شادی ہوئے، دو برس ہونے کو آتے ہیں — اور جب اُن سے یہ پُوچھا گیا کہ بچّوں کے بارے میں اُن کا کیا خیال ہے ؟ تو بیوی نے کہا "ابھی ہم اِس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ابھی ہمیں بچّہ نہیں چاہیئے۔ بچّوں کو پیار، وقت اور توجّہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر اُن پر پیسے بھی کتنے خرچ ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے بچّے اِن ساری سہولتوں سے محرُوم رہیں۔"

خاوند نے کہا: "اور ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم کم سے کم کچھ عرصہ تو اُلجھنوں اور گھریلو جھنجھٹوں میں پڑے بغیر ہنسی خوشی دِن گزاریں۔ اِسی لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے یہاں پہلا بچّہ جبھی ہوگا جب ہم اس کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے خود کو پُوری طرح تیار پائیں گے — ہاں، ہم سچ مُچ بڑے خُوش ہیں۔"



یہ خُوش ہیں —

اور آپ ؟



davp 68/197

پھول والوں کی سیر



مہرولی (دہلی) میں ہر سال "پھول والوں کی سیر" کا میلہ بڑی دھوم دھام
سے منایا جاتا ہے جس میں ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے ہیں
تصویر میں پھولوں سے بنے ہوئے پنکھے لے جائے جا رہے ہیں جو یوگ مایا کے مندر اور
اور خواجہ قطب الدین کے مزار پر چڑھائے جاتے ہیں۔



۱۵ اگست ۱۹۶۸ء کو یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی
لال قلعہ (دھلی) پر پرچم کشائی کے بعد عوام سے خطاب کر رھی ھیں

Vol. 27 No. 2 AJKAL (Monthly) September 1968

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N. Delhi-1
Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd. No. D. 509

آجکل

اکتوبر ۱۹۶۸ء
اشون۔ کارتک شک سمت ۱۸۹۰
۶۰ پیسے



۲۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو نیتا جی نے سنگاپور میں آزاد ہندوستان کی عارضی حکومت کے قیام کا اعلان کیا

ذیل میں اس کے کچھ اقتباسات دیئے گئے ہیں

ہندوستان میں برطانوی حکمرانوں نے عیاری اور پھوٹ کی پالیسی کے باعث ہندوستان کو افلاس اور موت کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کو اب ان سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں اور برطانوی حکمرانوں کی بنیادیں اب ہندوستان میں بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اس ناخوش گوار دور کی آخری علامت کو بھی ختم کرنے کے لئے اب محض ایک شعلے کی ضرورت ہے۔ آزاد ہند فوج کو ہندوستان کی شہری آبادی کے علاوہ برطانیہ کی طرف سے قائم ہندوستانی فوج کے کثیر حصے کی پرجوش حمایت حاصل ہونے کا یقین اور غیر ممالک کے بہادر اور ناقابل تسخیر ساتھیوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔ اس کے باوجود آزاد ہند فوج کو سب سے زیادہ بھروسہ اپنی قوت پر ہی ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ اپنے تاریخی رول کو پورا کرے گی۔۔ اب جبکہ ہم منزلِ آزادی کے قریب پہنچ چکے ہیں ہندوستانیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ایک عارضی حکومت قائم کریں اور اس کے جھنڈے تلے آزادی کی آخری جد و جہد کا آغاز کریں لیکن ہندوستان میں اس وقت تمام رہنما جیلوں میں ہیں اور وہاں لوگ غیر مسلح ہیں۔ اس لئے ان حالات میں ہندوستان میں عارضی حکومت قائم کرنا اور اس کے جھنڈے تلے مسلح جد و جہد کا آغاز کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے مشرقی ایشیا میں انڈین انڈی پنڈنس لیگ جسے ہندوستان میں اور غیر ممالک میں رہنے والے تمام محب وطن ہندوستانیوں کی حمایت حاصل ہے کا یہ فرض ہے کہ وہ ہند کی عارضی حکومت قائم کرنے اور آزاد ہند فوج کی مدد سے آزادی کی آخری جنگ لڑنے کی ذمہ داری قبول کرے۔

مشرقی ایشیا میں انڈین انڈی پنڈنس لیگ کی طرف سے آزاد ہندوستان کی عارضی حکومت میں شامل کئے جانے کے بعد ہم پوری ذمہ داری سے اپنے فرائض کو سنبھال رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ مادر وطن کی آزادی کی جد و جہد میں خدا ہم پر اپنا کرم کرے اور ہمارے مسلح ساتھی اس امر کا عہد کرتے ہیں کہ ہم مادر وطن کی آزادی، بہبود اور اقوام عالم میں اس کا سر بلند کرنے کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگا دیں گے۔



عارضی حکومت انگریزوں اور ان کے ساتھیوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے لئے جد و جہد کا آغاز کرے گی اور ان کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے بعد عارضی حکومت ہندوستان کے لوگوں کی مرضی کے مطابق آزاد ہندوستان کی مستقل قومی حکومت کا قیام عمل میں لائے گی جب تک انگریزوں اور ان کے ساتھیوں کے اقتدار کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اور آزاد ہندوستان کی مستقل قومی حکومت قائم نہیں ہو جاتی، تب تک عارضی حکومت ایک ٹرسٹی کے طور پر ملک کے نظم و نسق کو چلائے گی۔

عارضی حکومت اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ اسے ہر ہندوستانی کی وفاداری حاصل ہے اور اسے دعویٰ کرنے کا حق بھی پہنچتا ہے، یہ حکومت تمام شہریوں کو مذہبی آزادی، اور مساوی حقوق و مساوی مواقع کی ضمانت دیتی ہے۔ یہ اپنے اس پکے ارادے کا اعلان کرتی ہے کہ یہ تمام قوم کی خوش حالی اور مسرت کے لئے کام کرے گی غیر ملکی حکومت نے قوم کے مختلف طبقوں میں چالاکی سے جو تفرقات پیدا کئے ہیں، ان سے بالاتر ہو کر قوم کے تمام افراد سے مساوی سلوک کرے گی ـــــــ خدا کے نام پر، گزشتہ نسلوں کے نام پر جنہوں نے ہندوستان کے لوگوں کو ایک قوم کی صورت میں یکجا کیا، اور ان شہیدوں کے نام پر جنہوں نے بہادری اور قربانی کی روایات ہمارے لئے ورثے میں چھوڑی ہیں، ہم ہندوستانیوں سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمارے جھنڈے تلے جمع ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لئے جد و جہد کریں۔ ہم ان سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف آخری جد و جہد کا آغاز بہادری اور مستقل مزاجی سے کریں اور اس امر کا مکمل یقین رکھیں کہ آخر کار فتح انہی کی ہو گی۔ یہ جد و جہد تب تک جاری رہنی چاہئے جب تک کہ دشمن کو ہندوستان سے باہر نہ نکال دیا جائے اور ہندوستانی قوم آزاد نہ ہو جائے۔

ترتیب

جلد ۲۷ نمبر ۳

آشون اگارتک شک سمت ۱۸۹۰

اکتوبر ۱۹۶۸ء

مضامین کیلئے خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر "آج کل" (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

شرح چندہ

سالانہ چندہ	ہندوستان میں	سات روپے
	پاکستان میں	سات روپے (پاک)
	دیگر ممالک سے	۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ	ہندوستان میں	۶۰ پیسے
	پاکستان میں	۶۰ پیسے (پاک)
	دیگر ممالک سے	ا شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

ہر برس ۲۴ اکتوبر کو دنیا بھر میں یوم اقوام متحدہ منایا جاتا ہے۔ ۱۹۴۵ میں اپنے قیام کے بعد سے اقوام متحدہ نے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں تاریخ اور واقعات شاہد ہیں کہ ماضی میں امنِ عالم کئی بار معرض خطر میں پڑا۔ متعدد بار ایسے نازک لمحے بھی گذرے کہ دنیا جنگ کے دہانے پر کھڑی دکھائی پڑی۔ لیکن اقوام متحدہ کی دانشمندی اور کوششوں سے صورتِ حال ہمیشہ قابو میں رہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اقوام متحدہ نے موجودہ نسل کو عالمی جنگ سے محفوظ رکھا ہے اور یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

آج تمام بنی نوع انسان کا ایک ہی مشترکہ نصب العین ایک ایسے مستقبل کی تعمیر ہے، جس میں انسان اپنے وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے گا، جس میں امیر اور غریب لوگوں اور قوموں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہ ہوگا اور جس میں وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ امن اور رواداری سے رہنا سیکھے گا۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے اقوام متحدہ اور اس کے خصوصی اداروں نے بڑا کام کیا ہے اور ابھی یہ کام جاری ہے۔

ہمارے صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے اقوام متحدہ کے بارے میں بجا فرمایا ہے۔ "اقوام متحدہ اس دھرتی پر امن اور خوشحالی کا واحد ذریعہ ہے"

---

۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو گاندھی جی کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب کا آغاز گاندھی جی کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم اور ایک کتاب "مہاتما گاندھی ہنڈرڈ ائیرز" کے اجراء سے ہوا۔ گاندھی جی کی صد سالہ سالگرہ کی یہ تقریب ہندوستان کے علاوہ دنیا بھر میں سارا سال منائی جائے گی۔ اس موقع پر "آج کل" گاندھی جی کے فکر و فلسفہ پر مضامین اور منظومات شائع کرے گا۔ زیرِ نظر شمارے میں والی آسی کا مضمون اردو شاعری میں مہاتما گاندھی کی شخصیت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے نیز "آج کل" اکتوبر ۱۹۶۹ء میں گاندھی نمبر شائع کرے گا۔

---

۲۱ اکتوبر کو آزاد ہند کی عارضی حکومت کے قیام کی سلور جوبلی منائی جا رہی ہے۔ اس موقع پر پبلی کیشنز ڈویژن ایک خاص کتاب "آزادی کے پیش رو" شائع کر رہا ہے۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے جس جرأت کردار، اور ایثار سے کام لیا ہے اور جو قربانیاں دیں وہ اپنی مثال آپ ہیں امید ہے زیر نظر شمارے میں نیتا جی سبھاش چندر بوس پر جناب شاہ نواز صاحب' جناب انصار ہرونانی صاحب کے مضمون قارئین کی خصوصی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

اُردو کے مایۂ ناز ادیب اور محقق پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا ۵ ستمبر ۶۸ء کو بعمر ۶۸ سال بمبئی میں ان کی رہائش گاہ اندھیری میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم یکم نومبر ۱۹۰۰ء کو چاندہ ضلع (مہاراشٹر) کے گاؤں آرموری میں پیدا ہوئے تھے۔

ندوی صاحب ایک متبحر عالم، ایک صاحب طرز ادیب، ایک بلند پایہ محقق اور ایک بڑے اچھے انسان تھے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو جس خلوص محنت اور لگن سے انھوں نے پروان چڑھایا اور اس ادارے نے جو مفید خدمات انجام دی ہیں اُن سے ہمیشہ ان کا نام زندہ رہے گا۔ ان کے سہ ماہی رسالے "نوائے ادب" نے اُردو زبان و ادب کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا ایک خاص مضمون ہم نومبر کے آج کل میں شائع کر رہے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

۲۰ اکتوبر

دیکھ کر اپنے پڑوسی کا چلن آج کے دن
نیند سے جاگ اُٹھا میرا وطن آج کے دن
بن کے غفلت جو رہی سولہ برس پیروں میں
توڑ دی ہم نے وہ زنجیرِ کہن آج کے دن
اپنی تنظیم کا جو عزم تھا کام آ ہی گیا
ورنہ صیاد کی زد میں تھا چمن آج کے دن
ترے ممنون ہیں ہم، تو نے سبق ہم کو دیا
چین! اے ماہرِ تزویر و فتن آج کے دن
خواہ کانٹے تھے کہ پتے تھے وہ شاخیں تھیں کہ گل
ڈھل گیا ایک اکائی میں چمن آج کے دن
آبرو اپنی یقینی تھی، وطن کے جانباز
باندھ کر نکلے سروں سے جو کفن آج کے دن

دیس نے بدلا جو اندازِ نظر آج کے دن
مل گئی منزلِ مقصودِ سفر آج کے دن
ہم نے اپنوں کو بھی غیروں کو بھی پہچان لیا
ہم سے ٹکرائے تھے جب برق و شرر آج کے دن
اک ذرا غور سے جب خاکِ وطن کو دیکھا
ذرۂ خاک تھا لعل اور گہر آج کے دن
کارخانے تھے کہ افواج کہ کھیتی کا سوال
جاگ اُٹھا اک نیا اندازِ نظر آج کے دن
تریپورہ ہو کہ ہو گجرات، دکن ہو کہ ہو لیہہ
سب کا تھا ایک ہی مقصودِ سفر آج کے دن
ہم نے کچھ قوت و تنظیم بڑھائی کہ نہیں
دیکھتی ہے ہمیں گاندھی کی نظر آج کے دن

والی آسی



اردو شاعری میں مہاتما گاندھی کی شخصیت

تاریخ انسانی زندگی کی ایک ایسی مکمل کہانی ہے جس میں انسان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اہم راز مضمر ہیں۔ اس کہانی کے خاکوں میں سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ادبی ترقی اور تنزلی کے رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں کے عروج و زوال کی صحیح اور سچی تصویر کشی ہمیں تاریخ ہی کے صفحات میں ملتی ہے وقت گزر جاتا ہے، حکومتیں پامال ہو جاتی ہیں، شخصیتیں فنا ہو کر صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتی ہیں مگر تاریخ رہ جاتی ہے۔

تاریخ جس طرح سیاسیات، اقتصادیات، انسانی تہذیب اور سماج سے متعلق ہے، اسی طرح تاریخ کو شعر و ادب سے بھی ایک گہرا ربط ہے جس کے ارتقاء کی کہانی بہت طویل اور بہت دلچسپ ہے۔ اہم اور تاریخی شخصیتوں سے متعلق اردو شاعری کے خزانے میں بھی بہت کچھ ہے مگر اس کی مثالیں عربی اور فارسی کی شاعری میں بہت ملتی ہیں۔ اکثر تو اہم اور تاریخی واقعات اور شخصیتیں عموماً افسانوی اور تلمیحی روپ دھار کر شعر و ادب میں یوں داخل ہو گئی ہیں کہ ان کے تاریخی اور ادبی کردار بالکل مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ بقول پروفیسر سید احتشام حسین۔

"شاعرانہ اور تاریخی انداز نظر میں بڑا فرق ہوتا ہے تاریخ حقیقتوں کا واقعاتی بیان ہے جو اسباب و علل کے رشتہ ہیں۔ شاعری حقائق کا جذباتی اظہار ہے جس میں مثالی اور داخلی تصورات سموئے ہوئے ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں تاریخی افراد کا شاعرانہ بیان بہت کم ہے..."

اردو شاعری میں تاریخی حقائق کا بیان نہ ہونے کے برابر ہوتے ہوئے بھی تاریخی واقعات و افراد کی نشان دہی ضرور ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ملا وجہی (جو قطب شاہی دور کا ایک مشہور، مستند اور باکمال شاعر گزرا ہے) کی معرکتہ الآرا مثنوی "قطب مشتری" ہی کو لے لیجیے۔ جس میں قطب شاہ کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ مثنوی کم و بیش دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں قطب شاہی دور کی تہذیب و تمدن کی منہ بولتی تصویریں نظر آتی ہیں جو اپنے ماحول کی عکاسی بھی کرتی ہیں اور تاریخی حقائق کا پتہ بھی دیتی ہیں۔

اردو شاعری میں آج تقریباً پانچ سو برس پہلے سے کبھی مثنوی کے رنگ روپ میں اور کبھی قصیدے کے چہرے مہرے میں جستہ جستہ اشعار ہمیں تاریخی حقائق کی غمازی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کے بعد بھی اہم تاریخی شخصیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان تاریخی اور اہم شخصیتوں میں بہادر شاہ ظفر، ٹیپو سلطان، سراج الدولہ، مہارانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپی، احمد اللہ شاہ شہیدؒ، بیگم حضرت محل وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں کہ اردو شاعری نے ان کی رہنمائی کا اعلی الاعلان اعتراف کیا ہے اور گزشتہ صدی کی اردو شاعری تو تاریخی اور واقعاتی انداز بیان کے لیے ایک سنگ میل کی سی حیثیت رکھتی ہے، یہ ہی صدی ہے جب ہندوستان میں جنگ آزادی کی رو تیز ہوئی اور اسی صدی نے ہم کو گوپال

کرشن گوکھلے، لوک مانیہ تلک، مولانا محمود الحسن، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، پنڈت مدن موہن مالوی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، بھگت سنگھ مولانا حسرت موہانی، چندر شیکھر آزاد، ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو مولانا محمد علی جوہر، رام پرشاد بسمل، سی۔ آر۔ داس، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، اشفاق اللہ خاں اور مہاتما گاندھی جیسی قوم پرست مخلص، جانباز، محب وطن اور عظیم و اہم تاریخی شخصیتیں عطا کیں۔

یوں تو اُردو شاعری نے ان سب ہی حضرات کو خوش آمدید کہا لیکن جو احترام و عزت پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کو ملی وہ اُردو شاعری میں مذہبی کرداروں سے قطع نظر کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی کا تذکرہ اُردو شاعری میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے سے بھی ملنے لگتا ہے۔

افقِ ہندوستان پر موہن داس کرم چند گاندھی جو بعد میں مہاتما گاندھی کہلائے ۱۸۶۹ء میں طلوع ہوئے جس کی کرنیں جنوبی افریقہ سے انگلستان تک پھیل کر ہندوستان کے تاریک سے تاریک گوشہ کو بقعۂ نور بنا گئیں۔ گاندھی جی کی پرخلوص، پُر درد اور پُرسوز آواز ہمیں ایک عرصہ بعد متاثر کر سکی ——— ایک بے راہ رو قوم کو راہ راست پر لگا گئی۔ ایک بے حس و بے جان جسم میں احساس عزت و حمیت بیدار کر گئی۔

مہاتما گاندھی کوئی شاعر، فلسفی، جادوگر، دولت مند یا خاندانی وجاہت کے مالک نہ تھے کہ ان کی ایک ہی آواز پر پوری ہندوستانی قوم لبیک کہہ اٹھتی، بلکہ وہ تو عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ جو ایک ہندوستانی برادری کا سندیسہ لے کر اٹھے تھے اپنے دل میں بے پناہ خدمت کا جذبہ لئے ہوئے میدانِ عمل میں آئے تھے ان کی اسی ادا نے لاکھوں کے من موہ لئے تھے ——— انسانیت کے رستے ہوئے زخم پر اُن کی دلنواز شخصیت مرہم بن کر چھا گئی۔ ان کی عظمت کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ انسانوں کی صف میں وہ ایک ایسے عظیم انسان تھے جو راست بازی، دیانت داری پابندیٔ وقت، نکتہ سنجی، دقیق نظری، ہمہ گیر دانش مندی، رسائی ذہن، ہمدردانہ معاملہ فہمی، لامتناہی قوت برداشت، عجز و انکساری، بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے محبت، عفو پسندی، پاکیزگیٔ نفس، صبر اور عدم تشدد جیسی بے انتہا خوبیوں سے مالا مال تھے۔ ہندوستان کے چپے چپے کو اُن سے نسبت ہے۔ یہاں کے ذرّے ذرّے میں ان کی ہی تعلیم کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آزاد ہندوستان انھیں کے خوابوں کی حسین تعبیر ہے۔ یہاں کی رواداری، جذبۂ اخوت اور سیاست انھیں کی ذات سے عبارت ہے اور یہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے

مہاتما گاندھی کی ذات سے متعلق دوسری چیزوں کے علاوہ یہاں کے شعر و ادب کو بھی ان سے ایک خاص تعلق ہے اس کا بیّن ثبوت ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کی وہ قابلِ قدر تصنیفات ہیں جو ان کی زندگی کے ہر گوشہ، ہر پہلو اور ہر دور کی نمایندگی کرتی ہیں۔ ان تمام تصنیفات کو ہم "گاندھیائی ادب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

دوسری اہم زبانوں کے شعر و ادب کی طرح اردو اس میدان میں بھی پیچھے نظر نہیں آتی بلکہ اس نے گاندھیائی ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافے کئے۔ اس اضافے میں نثر کے لعل و جواہر بھی ہیں اور منظومات کے دُرِ نایاب بھی۔ یہاں ہم کو نثری سرمائے سے بحث نہیں ہے بلکہ ہم کو صرف انہی نظموں کا تجزیہ کرنا ہے جو شہید حریت مہاتما گاندھی کی زندگی میں ان کے کارناموں سے متعلق اور اُن کے بعد انھیں خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کی گئی ہیں

گاندھی جی سے متعلق نظموں کے لئے اردو شاعری میں کوئی خاص صنف مقرر نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر لکھی جانے والی نظمیں ترکیب بند ترجیع بند، مخمس، مسدس، رباعی، قطعہ، قصیدہ، مرثیہ اور آزاد نظم کے انداز میں ملتی ہیں اور اکثر تو گاندھی جی سے متعلق جستہ جستہ اشعار غزلوں میں بھی مل جاتے ہیں۔ لہٰذا اس موضوع کو کوئی خاص نام علاوہ "گاندھیائی ادب" کے نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ ان نظموں کو ہم تین حصوں میں تقسیم ضرور کر سکتے ہیں۔

اوّل وہ نظمیں جو مہاتما گاندھی کی زندگی میں مختلف مواقع پر لکھی گئی ہیں دوئم وہ نظمیں جو اُن کے المناک سانحۂ شہادت پر لکھی گئی ہیں۔ سوئم وہ نظمیں جو اب اُن کی تعلیمات، پیغامات سے متعلق لکھی جا رہی ہیں۔

اوّل الذکر قسم کی نظموں میں زیادہ تر اشعار ایسے ملتے ہیں جس میں گاندھی جی کی تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ ان کی عملی جد و جہد کو بھی سراہا گیا ہے۔ یہ نظمیں ہر چند کہ قصیدہ جیسی معلوم ہوتی ہیں، تاہم اس میں غلو کا شائبہ تک نہیں ملتا ہے۔

دوسری قسم کی نظموں پر مرثیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے، انہیں مراثی بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ان کا تعلق اُن کے دل سوز سانحۂ شہادت سے ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظمیں محض کسی وقتی یا جذباتی تاثر کی بنا پر نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ یہ احساس شدید ان نظموں

میں ملتا ہے کہ گاندھی جی کی شہادت کوئی شخصی یا انفرادی نقصان نہیں بلکہ ملکی و قومی نقصان ہے۔ جا بجا اس کا اظہار کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی عمر کے عزیز ترین لمحے بھی نذر آزادی کر دیے۔

مندرجہ بالا اقسام کی نظموں کے بعد جو نظمیں ہمارے سامنے آتی ہیں، اُن میں کہیں مہاتما گاندھی کی تعلیمات، کہیں ان کے نصب العین، کہیں اُن کے پیغام اور کہیں ان کے فلسفۂ حیات کو اُجاگر کیا گیا ہے جنہیں دیکھ کر قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان کی تعلیمات، ان کا نصب العین، ان کا پیغام اور اُن کا فلسفۂ حیات، لافانی اور آفاقی درجہ رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا تینوں قسموں کی نظموں کے چند اقتباسات یہاں مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی نظم جو "ہوم رول" سے متعلق ہے ملاحظہ فرمائیں جس میں شاعر ہوم رول کی پرزور حمایت کرتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے ؎

ہمارے واسطے زنجیر و طوق، گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اکبر الٰہ آبادی، باوجودیکہ "گورنمنٹ بہادر" کے ملازم ہیں یوں حق کے اظہار میں پکار اٹھتے ہیں ؎

انقلاب آیا نئی دُنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا اب دورِ گاندھی نامہ ہے

دوسری جگہ گاندھی جی کے بے انتہا عزم و استقلال کو سراہتے ہوئے اپنے جوہرِ خاص یعنی مزاح کی رنگ آمیزی کرتے ہوئے اور حکومت پر طنز کے نشتر چلاتے ہوئے کہتے ہیں ؎

آ گئے تمہارے رنگ کسی کا نہیں جما
جے ہو تمہاری اے مرے گاندھی مہاتما
لینے کے تم نہیں ہو گورنمنٹ کی مدد
چورن کو کیا ضرور پیپرمنٹ کی مدد

طنز و مزاح کی دو دھاری تلوار یوں چلتی ہے کہ "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"، چناں چہ دل کی آواز اشعار کے قالب میں ڈھل کر یوں نکلتی ہے۔

کوچۂ سروسِ انگلش میں رہے ہم ساکن
جاہ و زرہی کی تمنا میں کٹے زیست کے دن
وعظِ گاندھی سے بدل سکتے تھے کیوں کر باطن
"عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن!
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے"

ایک جگہ گاندھی جی کے صبر و تحمل اور عدم تشدد کو سراہتے ہوئے اپنے خاص انداز میں کہتے ہیں ؎

لشکرِ گاندھی کو ہتھیاروں کی حاجت کچھ نہیں
ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہیے

تنہا اکبر الٰہ آبادی ہی ایک ایسے شاعر نظر آتے ہیں، جنہوں نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ گاندھی جی سے متعلق کہا ہے، چناں چہ گاندھی جی کے انتقال کے بعد الٰہ آباد سے "کتابستان" نے اکبر الٰہ آبادی کی ایک مستقل تصنیف جو "گاندھی نامہ" کے نام سے موسوم ہے، شائع کر دی۔ آخر کار اکبر الٰہ آبادی نے اپنے عجز اور اپنی مجبوری کا اظہار یوں کر ہی دیا کہ ؎

مدخولۂ گورنمنٹ اکبرؔ اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

مشہور، مستند اور منفرد شاعر و صحافی مولانا ظفر علی خاں "ایڈیٹر زمیندار" لاہور، گاندھی جی کی مدح میں یوں رطب اللساں نظر آتے ہیں اور اپنی نظم "گاندھی جی بارڈولی سے پہلے" میں یوں فرماتے ہیں ؎

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادیٔ حیات کا سامان کر دیا!!
پروردگار نے کہ ہے وہ منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

قسمت نے ڈال کر اُسے قیدِ فرنگ میں
ہندوستاں کے جسم کو بے جان کر دیا

جاتے ہی اس کے ملک کی صورت بدل گئی
انساں نے اپنے آپ کو حیوان کر دیا

ڈاکٹر سر محمد اقبال، جن کے متعلق خود گاندھی جی نے اپنے دوست محمد حسین صاحب کو ایک خط میں یوں لکھا ہے — "ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستاں ہمارا" پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور یارودہ جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اسی نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے۔ اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے —" ہر چند کہ اقبال کے سیاسی نظریئے سے گاندھی جی کی مماثلت نہ تھی تاہم وہ بھی گاندھی جی کو "مردِ پختہ کار، اور حق اندیش و باصفا" کہے بغیر نہ رہ سکے ؎

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کمزور کی کمند ہے دنیا میں تار سا
نازک یہ سلطنت صفت برگِ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
بولا یہ بات سن کے کمالِ وقار سے
وہ مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا
خارا حریفِ سعیٔ ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ است دُربنِ دنداں خلال را

صرف اردو ہی نہیں بلکہ فارسی میں بھی اردو کے مشہور صاحب طرز شاعر ڈاکٹر رادھے شیام احقر نے ۱۹۳۲ء میں ایک نظم "فقیر برہنہ" کے عنوان سے اس وقت لکھی تھی جب گاندھی جی بہ حیثیت نمائندہ ہندوستان، انگلینڈ گئے تھے یہ نظم ایک خاص کیفیت اور جاذبیت رکھتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ختم شد آں دورِ ادبار و مصیبت ہائے ہند
قصۂ طولانیٔ غم ہا بہ پایاں می رود
در سیاست انقلابے آں چنیں آمد پدید
یک "فقیرِ برہنہ" در پیشِ خاقاں می رود
آں فقیر آں عیسیٔ دوراں کہ از انفاسِ او
چوں وظائف برزبانِ پاک بازاں می رود
احقرش گوید دعا تا باز آید کامیاب
آمیں آمیں برزبانِ خیر خواہاں می رود

اس کے بعد مائل ملیح آبادی کی نظم "گاندھی جی کے روزہ ختم کرنے پر" بھی اسی زمانے کی اچھی نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے، جو پونا میں گاندھی جی کے برت ختم ہونے پر اظہارِ مسرت اور خراجِ عقیدت کے طور پر لکھی گئی ہے۔ یہ نظم اندازِ بیان کی جو انفرادیت اور نیاپن لئے ہوئے ہے وہ اس طرح کی اور دوسری نظموں میں نہیں ہے۔ دو ایک بند ملاحظہ فرمائیں ؎

خدا کا شکر کہ جانِ وطن کی جان بچی
خدا کا شکر کہ روحِ چمن کی جان بچی
وطن کے زیب دہِ انجمن کی جان بچی
خدا کا شکر کہ مردِ کہن کی جان بچی
وہ مرد جس نے زمانے کو کپکپا ڈالا
وہ، جس کے عزم نے انگلینڈ کو ہلا ڈالا
تو ہندوؤں ہی کا خالی مہاتما تو نہیں
تو شودروں ہی کے جینے کا آسرا تو نہیں
فقط امیروں کی کشتی کا ناخدا تو نہیں
فریبِ بندہ و آقا میں مبتلا تو نہیں
وطن کے پھول بھی تیرے ہیں خار بھی تیرے
سفید بھی ہیں ترے رنگ دار بھی تیرے

پہلی قسم کی نظموں کے بعد دوسری قسم کی نظموں میں سب سے پہلے گاندھی جی کے سانحۂ شہادت پر جوش ملیح آبادی کی معرکہ آرا نظم ..... "السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام" کے چند بند بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں، جوش کی تیغِ قلم بھی اس المناک واقع پر بے نیام ہوکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوں بہا وصول کرنے نکلی ہے اور فصاحت و بلاغت تابعداروں کی طرح پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہے ؎

اے زمیں کی جیب کے آئینۂ الماس بار
اے فلک کی بزم کے مہرِ درخشانِ بہار
اے وطن کی سرزمیں کے آسمانِ ذی وقار

اے زمانے کی صدف کے گوہرِ انجم شکار
اے صفائی موج کے لعلِ درخشاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام
جادۂ حق پر درخشاں ہیں ترے نقشِ قدم
پر فشاں ہے آسمانِ عدل پر تیرا علم
اے حسینؓ ابنِ علیؓ کے پیروِ قدسی حشم
اے یزیدِ عصرِ نو کے کشتۂ ذوقِ ستم
اے صلیبِ تازہ کے عیسیٰ دوراں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام
تو ہی اک دانائے کامل بزمِ نادانی میں تھا
روشنی کا تو منارہ بحرِ طغیانی میں تھا
تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا
نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا
اے غرورِ ہند و فخرِ مسلماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

لیلائے غزل کا متوالا، حلقۂ گیسوئے یار کا اسیر شاعر جگر مراد آبادی بھی اپنے رہنما کے غم میں یوں گریہ کناں ہو کر پکار اٹھا ؎

ہزار در ہزار ہیں اگرچہ رہبرانِ ملک
مگر وہ پیرِ نوجواں وہ ایک مردِ صف شکن
وہی مہاتما وہی شہیدِ امن و آشتی
پریم جس کی زندگی خلوص جس کا پیرہن
وہی ستارے ہیں مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند
وہی ہے انجمن مگر کہاں وہ صدرِ انجمن

اور پنڈت آنند نرائن ملّا حیرت و استعجاب کے عالم میں گھبرا کر ہجومِ غم والم میں یوں کہہ اٹھتے ہیں ؎

مشرق کا دیا گل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سُن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لو تھرّاتی ہے!
اتر دکھن پورب پچھم ہر سمت سے ایک چیخ آتی ہے!
نوعِ انساں کاندھوں پہ لئے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے
آکاش کے تارے بجھتے ہیں دھرتی سے دھواں سا اٹھتا ہے
دنیا کو یہ لگتا ہے جیسے سر سے کوئی سایہ اٹھتا ہے
کچھ دیر کو نبضِ عالم بھی چلتے چلتے رک جاتی ہے
ہر ملک کا پرچم گرتا ہے ہر قوم کو ہچکی آتی ہے
تہذیبِ جہاں تھرّاتی ہے تاریخِ بشر شرماتی ہے
موت اپنے کئے پر خود جیسے دل ہی دل میں پچھتاتی ہے
انساں وہ اٹھا جس کا ثانی صدیوں میں بھی دنیا جن نہ سکی
مورت وہ مٹی نقاش سے بھی جو بن کے دوبارہ بن نہ سکی
جب ناخنِ حکمت ہی ٹوٹے دشوار کو آساں کون کرے
جب خشک ہوا ابرِ باراں شاخوں کو گل افشاں کون کرے
جب شعلۂ مینا سرد ہو خود جاموں کو فروزاں کون کرے
جب سورج ہی گل ہو جائے تاروں میں چراغاں کون کرے
ناشاد وطن افسوس تری قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا
انگلی کو پکڑ کر چلتے تھے جس کی وہی رہبر چھوٹ گیا

علامہ جمیل مظہری یوں نوحہ کناں ہوتے ہوئے حیرت زدہ ہو کر کہہ اٹھتے ہیں ؎

یہ کیا ہوا کہ اندھیرا سا چھا گیا اک بار
اداس ہو گئیں سڑکیں اجڑ گئے بازار
بڑھا رہی ہیں عروسانِ ہند اپنا سنگار
ٹھہر گئی ہے سرِ راہ وقت کی رفتار
سکوتِ شام میں اک رنگِ بے کسی کیوں ہے
یہ آج نبضِ تمدن رکی رکی کیوں ہے
آل دیکھ سیاست کے انقلابوں کا
کہ اٹھ رہا ہے جنازہ ہمارے خوابوں کا
ہوائے تند سے بادل گھرا عذابوں کا
سیاہ ہو گیا دل خانماں خرابوں کا
سروں سے اٹھ گیا ظلِ ہمائے گاندھی جی
صدائیں آتی ہیں پیہم کہ ہائے گاندھی جی

مجاز اپنی رندی و سرمستی کے عالم میں بھی اس المناک سانحہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس عالم میں بھی کہہ اٹھتے ہیں ؎

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا
برہم ہے زلفِ کفر تو ایماں ہے سرنگوں
وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا
اب کافری میں رسم و رہِ دلبری نہیں
ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا
باچشمِ نم ہے آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا
خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

مہاتما گاندھی کے سانحۂ شہادت پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں، یوں تو سب سے بڑا سوز و گداز و درد و اثر ہے لیکن جو مقبولیت شمیم کرہانی کی نظم "جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے" کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور کو نہ حاصل ہو سکی ـــــ اس نظم میں جو تڑپ، نشتریت اور جاذبیت ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس دردناک واقعہ کا بیان جس روانی اور سلاست کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں کیا گیا ہے، وہ ایک دردمند دل پر اثر کرنے کو بہت ہے۔ استعارات اور تشبیہات سے دامن بچا کر لکھی گئی اس طویل نظم کو پڑھ کر قاری اپنے ذہن کو تھکا ہوا محسوس نہیں کرتا بلکہ رنج و غم کا وہ تاثر اس کے ذہن میں پیدا ہوتا جو رقت طاری کر دیتا ہے۔ نمونہ کے طور پر اس سہلِ ممتنع نظم کے چند بند پیش کئے جا رہے ہیں، ملاحظہ ہوں ؎

ابھی اٹھ کے آئے ہیں بزمِ دعا سے
وطن کے لئے لو لگا کر خدا سے
ٹپکتی ہے روحانیت سی فضا سے
چلی آتی ہے رام کی دھن ہوا سے
دکھی آتما شانتی پا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے
یہ گھیرے ہے کیوں رونے والوں کی ٹولی
خدا را سناؤ نہ منحوس بولی
بھلا کون مارے گا باپو کو گولی
کوئی باپ کے خون سے کھیلے گا ہولی
عبث مادرِ ہند شرما گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے
ابھی سندھ باچشمِ نم تک رہا ہے
لئے دل میں پنجاب غم تک رہا ہے
ابھی وار دھا دم بہ دم تک رہا ہے
ابھی راستہ آشرم تک رہا ہے
مسافر کو رستے میں نیند آ گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے
وہ پربت وہ بحرِ رواں سو رہا ہے
وہ پیری کا عزمِ جواں سو رہا ہے
وہ امنِ جہاں کا نشاں سو رہا ہے
وہ آزاد ہندوستاں سو رہا ہے
اسے اٹھ کا سحر مجھ کو بتلا گئی ہے
جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے

مندرجہ بالا نظموں کے علاوہ دوسرے مشاہیر شعرا میں حبیب احمد صدیقی، امین سلونوی، اسلم لکھنوی، احمر جے پوری، وامق جونپوری، سلام مچھلی شہری، عارف عباسی، ڈاکٹر سلام سندیلوی، عرش ملسیانی، نذیر بنارسی، نواب دہلوی، آسی رام نگری، بسمل سعیدی، انگر مشتاق، ساجد صدیقی، سیدہ اختر، مظفر شاہجہاں پوری، کمال احمد صدیقی، مطرب سلطان نظامی، ندرت کانپوری، اور قادر صدیقی وغیرہ کی نظمیں بھی گاندھی جی کی شہادت پر لکھی اچھی نظموں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

تیسری قسم کی نظمیں وہ ہیں جو گاندھی جی کے بعد ان کی تعلیمات اور حیات پر لکھی گئی ہیں۔ اس قسم کی بعض نظمیں گاندھیائی ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس ذیل میں نواب جعفر علی خاں اثر، تلوک چند محروم، سراج لکھنوی، ابوالفضل شمس لکھنوی، میلا رام وفا، آل احمد سرور، انور صابری، ساغر نظامی، جگن ناتھ آزاد، اختر جمال، منظر سلیم، جاوید لطیفی کی نظمیں خصوصی توجہ چاہتی ہیں۔ چند اقتباسات بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی فرماتے ہیں ؎

انسانیت ہے کارواں

گاندھی امیرِ کارواں
وہ تھا امر وہ ہے امر
پھر کیوں کہو باپو کہاں؟ باپو کہاں؟
ہم میں ہے گو ہم میں نہیں
وہ سرگروہِ عازماں!
وہ نازشِ روحانیاں
صدق و صفا کا پاسباں
انسانیت کا رازداں
بالائے ہر سود و زیاں
گاندھی عمل اور قول سے
گیتا کا سچا ترجماں
مایا کہو پرکرتی یا شکتی کہو
سب پر تھا یکساں حکمراں
گاندھی امیرِ کارواں

تلوک چند محروم سے

بھٹکتا پھر رہا ہے دشتِ آتشناک میں انساں
لپک کر ہر طرف شعلوں سے شعلے آن ملتے ہیں
جہاں تو لے کے جانا چاہتا تھا آدمیت کو!
وہاں صدق و صفا مہر و وفا کے پھول کھلتے ہیں

سراج لکھنوی سے

خدا گواہ کہ پتلا ہے تو شرافت کا
جہاں میں چلتا ہے "سکہ" تری صداقت کا
بشر کہیں کہ تجھے دیوتا محبت کا
زفرق تابہ قدم آئینہ حقیقت کا
نہ تجھ کو دیکھا ہو جس نے وہ آج سے دیکھے
یہ شرط ہے کہ نگاہِ سراج سے دیکھے

آل احمد سرور سے

تیرے ہی دم قدم سے بیاباں مہک گئے
اپنے گلوں میں جو بھی ہے تیری بہار ہے
صدق و صفا کو تجھ سے ملی چشمِ معتبر
امن و اماں کا دہر میں تجھ سے وقار ہے
صدیوں کی پائمالی کا خاموش درد و غم
عزمِ جواں سے تیرے خروشِ بہار ہے
کل تھا جو سامراج کا قصرِ بلند بام
دھندلا سا آج ایک نشانِ مزار ہے
تو نے ہمارے رندوں کے شوقِ فضول کو
اپنے نفس سے جراءتِ رندانہ کردیا
دہقاں پہ رازِ کج کلہی فاش کردیا
افلاس کا مزاج بھی شاہانہ کردیا

ساغر نظامی سے

ہزار انجمِ رخشاں نچوڑ کر تو نے
شبِ سیہ کو کیا مطلعِ سحر تو نے
ہر اک شعاع تھی جس کی ہزار مشرقِ نور
سنائی رات کو اس صبح کی خبر تو نے
فغانِ نیم شبی کو نئی تڑپ بخشی
دعا کی بے اثری کو دیا اثر تو نے
دلِ زمانہ دھڑکتا رہے گا صدیوں تک
لہو سے ثبت کیا نقش کالحجر تو نے

جگن ناتھ آزاد سے

آیا وہ مستِ خواب غلاموں کے دیس میں
بیداری حیات کی دنیا لئے ہوئے
اس نے طلسم توڑ دیا سامراج کا
انساں کی عظمتوں کا سہارا لئے ہوئے
وہ پیکرِ نحیف وہ اک ناتواں سا جسم
آدم کی قوتوں کا سہارا لئے ہوئے
ہندوستاں کی خشک زمینوں پہ پھر گیا
سینے میں اپنے عزم کا دریا لئے ہوئے

مندرجہ بالا نظموں کے علاوہ عمرؔ انصاری کی نظم " بوڑھا مالی " ایک خاص انفرادیت اور اہمیت کی حامل ہے ۔ اس نظم کا " ڈاکومینٹری " اندازِ بیان اس کی جان ہے اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے کہ مہاتما گاندھی کی جیتی جاگتی تصویر قاری کے سامنے پھر جاتی ہے ۔ اس نظم میں جو بہاؤ ہے وہ اس قسم کی دوسری نظموں میں نہیں ملتا ہے ۔ اس پوری نظم میں عطف و اضافات سے یکسر گریز کیا گیا ہے ۔ نہ کہیں معنی کا ابہام ہے اور نہ کہیں الفاظ کا گورکھ دھندا ، یہی وجہ ہے جو اس نظم کو اس قسم کی دوسری نظموں میں ممتاز کرتی ہے ۔ گاندھی پر لکھی جانے والی اس قسم کی نظموں میں یہ ایک قابلِ قدر اور یادگار اضافہ ہے ۔ نمونہ کے طور پر چند بند یہاں نقل کئے جا رہے ہیں ؎

ہے بادل اس کی اہنسا کا برسا ہے جو ساری دنیا پر
اک ہاتھ میں اس کے قرآں تھا اک ہاتھ اس کا گیتا پر
کچھ رام رحیم کے ناموں میں تھا فرق نہ اس کی مالا پر
سب دن تھے عیدِ ملن کے دن سب راتیں تھیں دیوالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

یہ گیتا اس کی گیتا ہے یہ چرخا اس کا چرخا ہے
وہ سامنے اس کا مندر ہے یہ سامنے اس کی کٹیا ہے
یہ اس کا قلم اور کاغذ ہے وہ عینک دھوتی کرتا ہے
یہ پھول ہیں اس کی پوجا کے وہ شمع ہے اس کی تھالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

سائے میں ترنگے جھنڈے کے جب چور تھکن سے ہوتا تھا
خواب اس کے جاگا کرتے تھے وہ جتنی دیر بھی سوتا تھا
جب پھول کوئی کمھلاتا تھا تو پہروں بیٹھ کے روتا تھا
اور رو کے دعائیں کرتا تھا اس گلشن کی خوشحالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی ، ان کی حیات ، ان کی تعلیمات اور ان کے آفاقی پیغام کو عام کرنے میں اردو کی یہ نظمیں بہت ممد و معاون ثابت ہوئیں ۔ یہ نظمیں اگر ایک طرف ایک خاص نظریہ کی ترجمانی کرتی ہیں تو دوسری طرف اردو کی مقصدی شاعری میں گرانقدر اضافہ بھی کرتی ہیں ۔ مندرجہ بالا شعراء کے علاوہ سالکؔ لکھنوی ، کمال احمد صدیقی ، شفا گوالیاری ، نثار اٹاوی ، عزیز وارثی ، بسملؔ الٰہ آبادی ، وشوا ناتھ درد ، واحد پریمی ، شادؔ سورتی ، راجندر بہادر موجؔ ، ساحرؔ ہوشیار پوری ، راجندر سوزؔ ، حیات وارثی ، رساؔ جاودانی ، ڈاکٹر ممتاز خوشتر کھنڈوی اور اردو کے دوسرے بہت سے مشاہیر شعراء کی بھی اس موضوع کی اچھی نظمیں شمار کی جا سکتی ہیں ۔

مہاتما گاندھی پر لکھی جانے والی اردو کی یہ نظمیں محض کسی جذباتی یا وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں یہی وجہ ہے کہ یہ نظمیں اب سے پچاس برس پہلے اور اس کے بعد کا زمانہ رکھنے کے باوجود بھی زندہ و پائندہ ہیں ، مدّت کا یہ خلیج ان کی مقبولیت میں رکاوٹ نہیں بلکہ ماضی کی کڑیاں حال سے ملاتا ہے ۔ چنانچہ یہ نظمیں آج بھی پکار پکار کر انسانی بھائی چارہ ، امن و سلامتی ، فرقہ وارانہ رواداری ، اتحاد باہمی اور اہنسا و شانتی کا پیغام دے رہی ہیں ۔

بقیہ عرش ملسیانی

ملائک دست بستہ عرش و کرسی لطف آمادہ
محمدؐ صدرِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

اگر پہلے سے نہ معلوم ہو تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا کہ یہ امیر خسرو کی نعتیہ غزل کے اشعار ہیں یا عرش کے " (باقی)



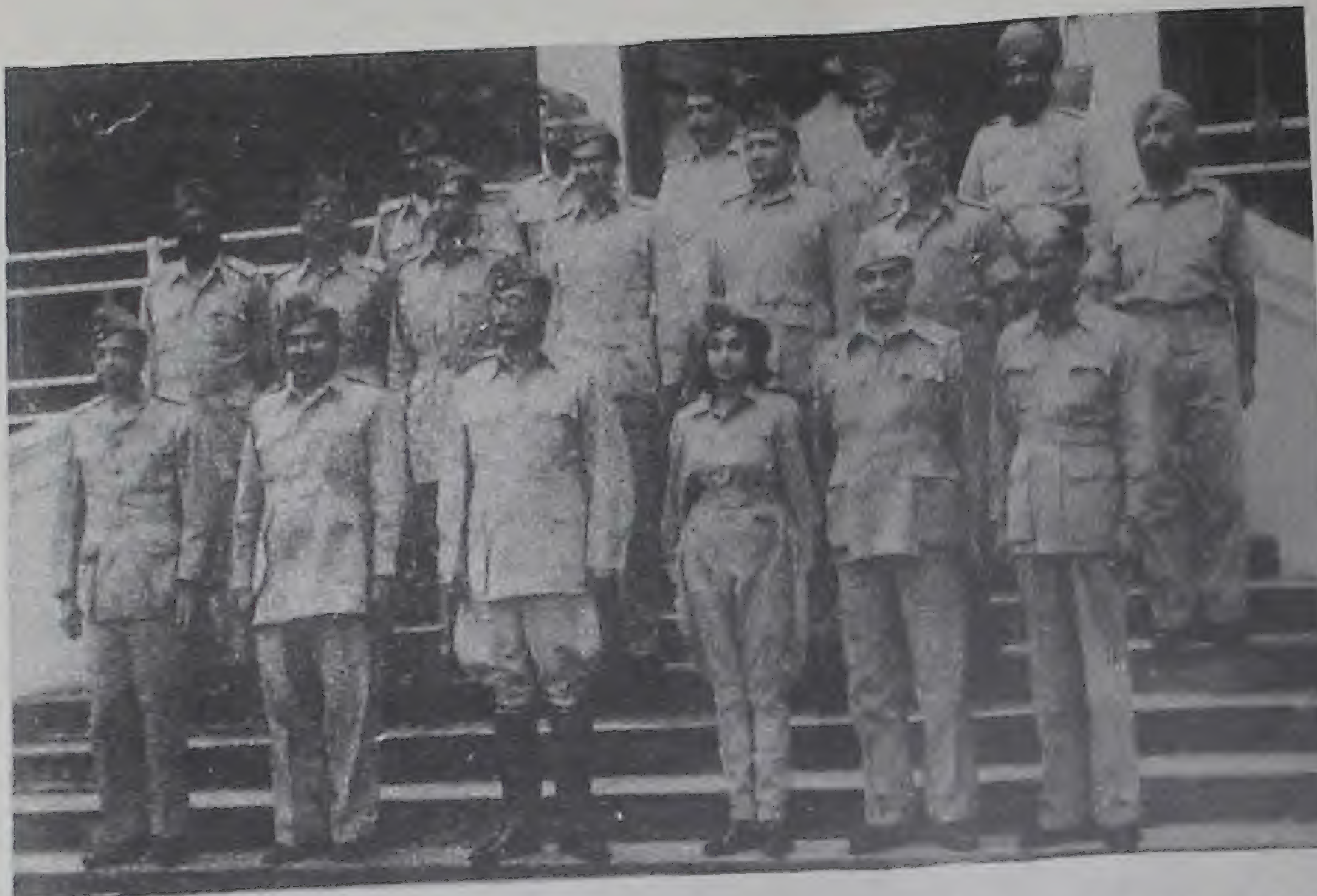
شاہ نواز خاں

نیتاجی اور آزاد ہند فوج

شروع نومبر ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔ نیتاجی نے حال ہی میں سنگاپور میں آزاد ہند حکومت قائم کی تھی۔ اور آزاد ہند سنگھ اور آزاد ہند فوج کی تنظیم میں سرگرم عمل تھے۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی۔ اور جاپانی فوجیں پہلی کامیابی کے بعد ملایا اور برما میں اپنی فتوحات کو مستحکم بنانے اور دوسرے بڑے حملے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے اگلے دستے دریائے چندوِن کے مشرقی کنارے پر پہنچ چکے تھے، اور ان کی آنکھیں امپھال اور کوہیما پر لگی ہوئی تھیں۔ ان دنوں جاپانیوں کا سب سے بڑا مرکز سنگاپور میں تھا۔ اور جنوب مشرقی ایشیا میں ان کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل کاؤنٹ تیرا اوچی تھے ـــــ

ایک دن کاؤنٹ تیرا اوچی نے نیتاجی کو کھانے پر مدعو کیا۔ نیتاجی رانی جھانسی پلٹن کی کمانڈر لکشمی سوامی ناتھن اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ جاپانی کمانڈر انچیف نے بڑے احترام اور خلوص کے ساتھ نیتاجی کا استقبال کیا اور کھانا کھانے کے بعد وہ ہمیں ایک دوسرے کمرے میں لے گئے۔ جہاں محاذ جنگ کے بہت سے نقشے لگے ہوئے تھے۔ وہاں انہوں نے نیتاجی کو اپنی فوجی اسکیم سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ "نیتاجی! اب جاپانی فوج انگریزوں پر حملہ کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے بالکل تیار ہے اور آگے بڑھنے کے لئے صرف آپ کے حکم کی منتظر ہے ـــــ

نیتاجی نے حیران ہو کر پوچھا "لیکن اس اسکیم میں آپ نے آزاد ہند فوج کا کوئی ذکر نہیں کیا، اس حملے میں اس کا کیا حصہ ہوگا؟" کاؤنٹ تیرا اوچی نے جواب دیا کہ اس حملے میں صرف جاپانی فوج انگریزی فوج پر حملہ کر کے اسے شکست فاش دے گی اور بعد میں جب ہم آزاد ہندوستان میں داخل ہوں گے تب آزاد ہند فوج کام میں لائی جائے گی۔ پھر کچھ سنجیدگی سے سوچنے کے بعد جاپانی سپہ سالار نے کہا۔ نیتاجی حقیقت تو یہ ہے کہ آزاد ہند فوج انگریزوں کی تنخواہ دار فوج تھی جس میں حب الوطنی کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ تو صرف معمولی تنخواہ کی خاطر انگریزوں کے لئے لڑتی تھی۔ دوسرے یہ کہ آزاد ہند فوج انگریزوں کے سکھائے ہوئے ڈھنگ سے لڑنے کی عادی ہے اور وہ تمام سہولتیں جو انگریز اپنی فوجوں کو لڑائی کے میدان میں دیتے ہیں، ہم نہیں دے سکتے۔ ہمارے فوجی سپاہی تو سخت سے سخت صعوبتیں جھیلنے اور بھوک اور پیاس کا مقابلہ کرنے کے عادی ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزی سپاہ آرام پسند ہے۔ اس لئے آزاد ہند فوج وہ تکلیفیں برداشت نہیں کر سکے گی جس کی جاپانی فوج عادی ہے۔ ہمیں آزاد ہند فوج کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف آپ کی ذاتی ہمدردی اور ہمنوائی کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہم ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کو یہ یقین دلا سکیں کہ ہمارا مقصد ملک گیری نہیں بلکہ ایمانداری سے ہندوستان کو آزاد کرانا ہے۔ اور ہندوستان کو آزاد کرانا ہمارے لئے اس لئے ضروری ہے کہ جب تک ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گا، وہ جاپان اور جنوب مشرقی ایشیا کی سلامتی کے لئے مستقل خطرہ بنا رہے گا۔ نیتاجی نے یہ ساری باتیں سن کر جواب دیا۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے۔ وہ درست ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اگر یہ جنگ فی الحقیقت ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ تو اس میں نہ صرف آزاد ہند فوج کو حصہ ہی لینا ہے، بلکہ آزاد ہند فوج کا سب سے اگلے دستوں میں شامل ہونا بھی ضروری ہے تاکہ مادر وطن کی پاکیزہ سرزمین پر خون کے جو



نیتاجی سبھاش چندر بوس آزاد ہند کی عارضی حکومت کے وزیروں اور مشیروں کے ساتھ

پہلے قطرے گریں۔ وہ اس کے اپنے سپوتوں کے ہوں" نیتاجی نے بڑے سخت لہجے میں کہا "فیلڈ مارشل میں اس آزادی کو جو دوسروں کی قربانیوں سے حاصل ہو غلامی سے بدتر سمجھتا ہوں، اس لئے اس حملے میں سب سے آگے آزاد ہند فوج ہوگی" جاپانی کمانڈر انچیف نے نیتاجی کی بات مان لی اور ان سے درخواست کی کہ سب سے پہلے وہ ایک بریگیڈ کا انتخاب کریں جو لڑائی میں حصہ لے۔ اور اگر وہ کامیاب ثابت ہو تو بعد میں باقی آزاد ہند فوج کو محاذ پر روانہ کیا جائے۔ آزاد ہند فوج کی کل تعداد ۳۰ ہزار کے قریب تھی۔ اس میں سے تین ہزار سپاہیوں کا انتخاب کرکے انہوں نے سبھاش بریگیڈ بنائی۔ اور اس کو کمانڈ کرنے کی عزت مجھے بخشی۔ میرے علاوہ اس بریگیڈ میں مندرجہ ذیل افسران تھے۔

۱۔ کرنل ٹھاکر
۲۔ کرنل محبوب احمد
۳۔ میجر رام سروپ
۴۔ کرنل پتری سری راتوری
۵۔ کرنل ون سنگھ
۶۔ میجر پدم سنگھ

میدانِ جنگ میں پہونچنے کے چند دن بعد ہی جاپانی کمانڈر انچیف نے نیتاجی کو مبارکباد دی اور کہا کہ آزاد ہند فوج لڑائی کے مصائب برداشت کر سکتی ہے اور میدانِ جنگ میں جاپانی فوج سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ اس کے بعد نیتاجی نے نمبر ا ڈویژن جنرل محمد زماں کیانی کی کمان میں امپھال کے مورچے پر بھیجی۔ اس ڈویژن میں تین بریگیڈ تھے سبھاش بریگیڈ جس کا کمانڈر راقم الحروف تھا۔ گاندھی بریگیڈ کمانڈر عنایت کیانی آزاد بریگیڈ۔ کمانڈر گلزار سنگھ۔ ان تینوں بریگیڈوں نے امپھال کے مورچے پر بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور ہزاروں نوجوانوں نے جس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی شامل تھے، مادرِ وطن کی آزادی کے لئے خوشی خوشی اپنی جانیں قربان کردیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۴ء کے آغاز میں جب دوسری جنگِ عظیم پورے شباب پر تھی اور فاتح جاپانی فوجیں ہندوستان کی مشرقی سرحدوں پر دریائے چندون کے کنارے حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ آزاد ہند فوج کا اگلا فوجی ہیڈ کوارٹر رنگون پہنچ چکا تھا اور آزاد ہند فوج کا پہلا لڑاکا دستہ "سبھاش بریگیڈ" تیزی سے سب سے اگلے مورچے پر اپنی جگہ لینے کے لئے بڑھ رہا تھا۔

چند دنوں کے بعد نیتاجی بذریعہ ہوائی جہاز رنگون کے ہوائی اڈے "منگلاڈون" پر پہنچے، جہاں ان کا بحیثیت صدر اور بانی آزاد ہند حکومت شاہانہ استقبال کیا گیا۔ ایک طرف تو ان کی سلامی کے لئے جاپانی، بری اور آزاد ہند



نیتاجی سبھاش چندر بوس
رانی جھانسی رجمنٹ
کا معائنہ کرتے ہوئے

فوج کے فوجی دستے کھڑے تھے۔ دوسری جانب برما کے صدر باموا اور ان کے وزراء، جاپانی فوجوں کے کمانڈر انچیف، مختلف ممالک کے سفیر اور ممتاز شہری کھڑے تھے۔

ہوائی اڈے کے باہر برما میں رہنے والے ہندوستانی اور برمی مرد عورتیں اور بچے سب بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ہوائی اڈے سے لے کر نیتاجی کی قیام گاہ تک کا راستہ دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ اور فضا "نیتاجی زندہ باد" "آزاد ہند زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ لوگوں کی نظریں آنے والے عظیم مہمان کے انتظار میں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس اثنا میں دور آسمان میں ایک بڑا ہوائی جہاز آتا ہوا دکھائی دیا جس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے محافظ لڑاکا ہوائی جہاز پرواز کر رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ وہ کسی بیش قیمت امانت کو بڑی حفاظت اور ہوشیاری کے ساتھ لا رہے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ ہوائی جہاز ہوائی اڈے پر آپہنچا اور ممتاز حاضرین کے پاس آکر رک گیا۔ جونہی ہوائی جہاز کا دروازہ کھلا اور نیتاجی دکھائی دیئے، توپوں نے گولے چلا کر سلامی دی۔ ہوائی جہاز کی سیڑھیوں کے قریب برمی صدر باموا نے سب سے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور بعد میں سب حاضرین سے تعارف کرایا۔

نیتاجی نے ممتاز حاضرین سے یکے بعد دیگرے مصافحہ کیا اور اس کے بعد وہ فوجی دستوں کی سلامی لینے کے لئے چل دیئے۔ ممتاز حاضرین قریب ہی ایک شاندار شامیانے میں جاکر نیتاجی کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں چہ مگوئیاں شروع ہوگئیں کہ ہوائی اڈے سے روانگی کے بعد نیتاجی کا کیا پروگرام ہوگا۔

صدر باموا اور ان کے وزراء کا خیال تھا کہ اپنی قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے نیتاجی ان کی قیام گاہ پر جائیں گے۔

جاپانی کمانڈر انچیف کا خیال تھا کہ سب سے پہلے نیتاجی ان کے ہاں جائیں گے کیونکہ برما میں فوجی حکومت تھی اور وہ فاتح فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔

جاپانی سفیر کا خیال تھا کہ سب سے پہلے نیتاجی ان کے ہاں جائیں گے کیونکہ وہ جاپان حکومت کے سیاسی نمائندہ تھے۔ بہرحال سب اپنی اپنی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔ جب نیتاجی فوجی دستوں کی سلامی لینے کے بعد شامیانے میں آئے تو صدر باموا نے نیتاجی سے ان کا پروگرام دریافت کیا کہ وہ اپنی قیامگاہ پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے کس سے ملاقات کرنے جائیں گے۔ نیتاجی نے فوراً جواب دیا کہ رنگون میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کا شہنشاہ

(بقیہ ص۲۳ پر)

انصار ہروانی



نیتاجی کی کچھ یادیں

مجھے نیتاجی سبھاش چندر بوس کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا کافی موقع ملا۔ ہندوستان کی جن شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا، اُن میں نیتاجی کا نام میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ یادش بخیر! ۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا جب برطانوی وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستان کے قوم پرستوں کو یہ چیلنج دیا کہ برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کے ہر اُس مطالبے کو منظور کرنے کو تیار ہے جسے ہندو اور مسلمان اور مختلف سیاسی جماعتیں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، مسلم کانفرنس، ہندو مہاسبھا۔ انڈین لبرل پارٹی متحدہ طور پر پیش کریں۔

چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے ایک کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں مقرر کی جسمیں مختلف جماعتوں سے گفت وشنید کے بعد ہندوستان کے آئین میں تبدیلی کے لئے ایک رپورٹ پیش کی، جو نہرو رپورٹ کے نام سے موسوم ہے۔ اس سلسلے میں مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین اور مذہبی فرقوں کے رہبروں کی ایک کنونشن لکھنؤ میں بلائی گئی۔ اس کنونشن کا انعقاد لکھنؤ کے قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں کیا گیا جو کبھی شاہان اودھ کی تفریح اور نشاط کیلئے استعمال ہوتی تھی

آل پارٹیز کنونشن کے تمام انتظامات پنڈت جواہر لال نہرو کے سپرد تھے اور انہوں نے لکھنؤ کے اسکولوں اور کالجوں سے رضاکاروں کی بھرتی کی تھی گو کہ میری عمر بہت کم تھی پھر بھی مجھے اجازت دی گئی کہ میں سیوادل کے رضاکار کی یونیفارم پہن کر کنونشن کے مندوبین کی خدمت کرسکوں

اس کنونشن کی صدارت اس زمانے کے صدر کانگریس ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے فرمائی۔ چونکہ رضاکاروں میں میری عمر سب سے کم تھی۔ اس لئے میرے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ ڈاکٹر انصاری کے کاغذات اور پیغامات ڈائس سے دوسرے مندوبین تک پہنچاؤں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس کنونشن میں ہندوستان کے بزرگ اور نوجوان قائدین نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیا جن میں مسز اینی بسنیٹ، سری نواس شاستری، پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ کے نام قابلِ ذکر ہیں ـــــــــ

نوجوانوں کی نمائندگی پنڈت جواہر لال نہرو، شری سبھاش چندر بوس مسٹر کے. ایف. ناریمان، ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ کر رہے تھے۔ قائدین کے اجتماع میں سبھاش بابو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اور میں اپنی زندگی میں ہمیشہ ان سے متاثر رہا۔ ظاہر ہے اس جلسے میں میں نے سبھاش بابو کو دور سے دیکھا تھا مگر میری پہلی ملاقات ان سے دہلی میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں گاندھی جی اور برطانوی وائسرائے لارڈ اروِن کے درمیان گفت وشنید ہو رہی تھی اور سبھاش بابو کی بے چین طبیعت سخت پریشان تھی۔ یہ سوچ کر کہ کانگریس اور برطانوی سرکار کے درمیان مکمل آزادی سے کم پر کہیں سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ یہ ۱۹۳۱ء کا زمانہ تھا اور میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں علی گڈھ سے چند طلباء کے ساتھ ان کے پاس حاضر ہوا تھا اور انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم اپنی یونیورسٹی کو واپس جائیں اور طلباء کو منظم کریں۔ تاکہ ہندوستان کے طلباء ملک کے کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ شانہ بشانہ تحریک آزادی میں حصہ لے سکیں۔

۱۹۳۱ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک سبھاش بابو کی پوری زندگی یا تو جیلوں میں گزری یا جلاوطنی میں ـــــ برما کی قید وبند کے بعد آپ آسٹریلیا جلاوطن ہوگئے۔ جلاوطنی

ے زمانے میں میں نے آپ کو کئی خطوط لکھے۔ اور آپ نے مجھے ہدایت کی کہ ہندوستان میں ایک آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی جائے جس کا نصب العین ہندوستان کی مکمل آزادی ہو اور جو ہندوستان کے طلباء میں انقلابی جذبہ پیدا کرسکیں۔ اس سلسلہ میں لکھنؤ میں ۱۹۳۶ء میں ایک آل انڈیا اسٹوڈینٹس کانفرنس منعقد کی گئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ طلباء کی ایک متحدہ جماعت آل انڈیا اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے نام سے بنائی جائے جو طلباء میں انقلابی تحریک کی روح رواں ہو۔ سبھاش بابو ہندوستان کے باہر تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں اس کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا اور صدارت مسٹر محمد علی جناح نے کی۔ شاید یہ آخری موقعہ تھا۔ جب نہرو اور جناح ایک پلیٹ فارم پر آئے۔

سبھاش بابو ابھی جلاوطنی میں تھے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۳۷ء میں آپ کو ہری پورہ کانگریس کا صدر منتخب کیا۔ برطانوی سامراج کو ہندوستانی مطالبات کے سامنے جھکنا پڑا اور سبھاش بابو کو ہندوستان واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ ہندوستان واپسی پر بحیثیت صدر کانگریس سبھاش بابو نے طلباء اور نوجوانوں کی تحریک میں کافی دلچسپی لی۔ اس زمانے میں میں آل انڈیا اسٹوڈینٹس فیڈریشن کا جنرل سکریٹری تھا۔ ان کے طوفانی دوروں میں اکثر مجھے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ وہ جہاں جاتے تھے وہاں ان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ نہ صرف طلباء اور نوجوانوں کے عام جلسوں کو خطاب کریں بلکہ وہ چاہتے تھے۔ کہ ان سے ملیں۔ گفت و شنید کریں۔ انکی سنیں اور اپنی سنائیں۔ وہ جب طلباء کے مجمع میں ہوتے تھے۔ تو ان میں گھل مل جاتے تھے۔۔۔۔

اس زمانے میں نیتاجی نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا اور کوشش کی کہ کانگریس انقلابی راستہ پر گامزن ہو جائے۔ اس سلسلہ میں سبھاش بابو اور ان کے کچھ ساتھیوں میں کافی اختلاف پیدا ہو گئے۔ جب کانگریس کی صدارت کا ایک سال مکمل ہونے لگا۔ تو ملک کے نوجوان اور طلباء کی تحریکوں کے رہبروں نے سبھاش بابو سے درخواست کی کہ وہ پھر کانگریس کی صدارت کے لئے کھڑے ہوں۔ سبھاش بابو نے اپنے نوجوان ساتھیوں کی تجویز کو منظور کر لیا۔ سبھاش بابو کے اس فیصلہ نے کانگریس کو دو جماعتوں میں بانٹ دیا۔ ایک جماعت اعتدال پسندوں کی تھی جس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل، شری بھولا بھائی ڈیسائی، چکرورتی راجگوپال آچاریہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری جماعت انتہا پسندوں کی بن گئی۔ جن میں سبھاش بابو کے علاوہ ایم۔ این۔ رائے۔ آچاریہ نریندر دیو، شری جے پرکاش نرائن نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

کانگریس کے صدارتی انتخاب نے ملک میں کافی ہل چل پیدا کر دی۔ سبھاش بابو بہت بھاری اکثریت سے کانگریس کے دوبارہ صدر منتخب ہوئے سبھاش بابو کے انتخاب نے سبھاش بابو اور گاندھی جی کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ تری پورہ کانگریس سیشن کے بعد ان اختلافات نے ایک ناگوار صورت اختیار کر لی اور سبھاش بابو کو کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ تری پورہ سیشن کے زمانے میں سبھاش بابو سخت علیل تھے اور پنڈال میں سٹریچر پر لائے جاتے تھے۔ جس پر لیٹ کر وہ تقریر کیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں نیتاجی سبھاش بابو اپنے پرانے اعتدال پسند ساتھیوں سے بالکل علیحدہ ہو گئے۔ اور نوجوان انتہا پسندوں اور انقلابیوں کے قریب تر آ گئے اور انہوں نے فارورڈ بلاک کی بنیاد ڈالی۔ جس کا نعرہ تھا "سمجھوتے کی باتیں بند کرو، آزادی کی لڑائی شروع کرو"، سبھاش بابو کہا کرتے تھے کہ "میرے پاس میرے ساتھیوں کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے صرف فاقہ اور موت"۔۔۔۔ لیکن اس کے انعام میں ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے جسکی قیمت دنیا کی کوئی قربانی پورا نہیں کر سکتی۔

اس زمانے میں ہٹلر نے فرانس اور برطانیہ پر حملہ کیا جس نے دنیا کے حالات کافی بدل دیئے۔ برطانوی سرکار نے ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے مختلف لیڈروں سے گفت و شنید شروع کی تاکہ ہندوستان اس جنگ میں غیر مشروط طور سے برطانیہ کی حمایت کرے۔ اس سلسلے میں لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے سبھاش بابو کو بھی دہلی میں مدعو کیا۔ اس زمانے میں میں زیادہ تر سبھاش بابو کے ساتھ رہتا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وائسریگل لاج سے واپسی پر انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے لارڈ لنلتھگو سے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان مکمل آزادی سے کم کسی چیز پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا اور ان کا عقیدہ ہے، کہ برطانیہ کی مصیبت ہندوستان کی برتریت کی ضامن ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ پھر ملک کا دورہ کیا۔ رام گڈھ میں ایک مرتبہ پھر مخالف کانفرنس منعقد کی جس نے یہ فیصلہ کیا کہ "ہندوستان جنگ میں برطانیہ کے ساتھ تعاون نہیں کرے گا بلکہ جنگ کے حالات سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ کے خلاف اپنی جدوجہد کو جاری رکھے گا۔

اس زمانے میں مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ تحریک زوروں پر تھی۔ مسلمانوں میں محمد علی جناح کا اثر و اقتدار بڑھ رہا تھا۔ کانگریس کے اعتدال پسند لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ اگر برطانیہ کے خلاف کوئی جدوجہد شروع کی گئی تو شر پسند عناصر برطانوی سرکار کی حمایت سے اسکو فرقہ وارانہ فسادات میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ سبھاش بابو اس رائے سے بالکل متفق نہیں تھے۔ چنانچہ کلکتے میں انہوں نے

ہالول مانومینٹ (بلیک ہول) کو ہٹانے کے لئے ستیہ گرہ شروع کیا اور اعلان کیا کہ وہ بنگال کے آخری مسلمان تاجدار کی ناموس بچانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں بنگال میں حکومت مسلم لیگ کی تھی۔ مگر مسلمان عوام کی ہمدردیاں سبھاش بابو کے ساتھ تھیں۔

ظاہر ہے اس تحریک کا جو نتیجہ ہونا تھا ہوا۔ سبھاش بابو کو قید و بند کی صورت دیکھنی پڑی۔ مگر وہ جیل میں بھی خاموش نہ بیٹھے۔ وہاں سے بھی وہ ہم سب کو ہدایتیں بھیجتے تھے کہ ہم نوجوانوں اور طالب العلموں کو کس طریقے سے برطانوی سامراج شاہی کے خلاف منظم کریں۔ سبھاش بابو کی بے چین ہستی جیل میں زیادہ دیر چین سے نہ بیٹھ سکی۔ انہوں نے وائسرائے گورنر بنگال اور بنگال کے وزیر اعظم مولوی ابوالقاسم فضل الحق کو خطوط لکھے کہ ان کی موجودگی اس زمانۂ جنگ میں ان کے ساتھیوں کے ساتھ ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں آپ نے بھوک ہڑتال شروع کی اور یہ اعلان کیا کہ "اپنی جان دیدیں گے مگر برطانوی جیل میں خاموش نہ بیٹھیں گے"، چند دن کے فاقے کے بعد آپ کی حالت غیر ہوگئی اور مولوی فضل الحق نے آپ کی رہائی کی سفارش کر دی۔

رہا ہونے کے بعد آپ اپنے مکان نمبر ۳۸ ایلگن روڈ پر آگئے۔ آپ نے اپنے سب ساتھیوں کو کلکتے بلایا اور ان سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔

مجھے آج بھی یاد ہے جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ایک مسہری پر لیٹے ہوئے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ "افکار ہندوستان کے لئے انقلابی حالات سازگار ہو رہے ہیں اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہارے ایسے لوگ ہر حالت میں جیل سے باہر رہیں اور آنے والے انقلابی حالات کا فائدہ اٹھا سکیں"۔ وہ کافی کمزور تھے۔ اس لئے میں نے ان سے زیادہ دیر تک باتیں کرنا مناسب نہ سمجھا اور لکھنؤ واپس آگیا۔

لکھنؤ پہنچنے کے چند ہی دنوں کے بعد یہ خبر ملی کہ "سبھاش بابو غائب ہوگئے ہیں"۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کلکتے کی یہ ملاقات ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ سبھاش بابو کے غائب ہونے کے بعد میں بھی گرفتار ہوگیا۔ باوجود نظر بندی کے ان کے روم، برلن، ٹوکیو، سنگاپور، ملایا، کوہیما اور امپھل کے کارناموں کو عقیدت اور فخر کے ساتھ سنتا رہا۔ یہ خبر کہ سبھاش بابو جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ایک ہوائی حادثہ کا شکار ہوگئے۔ میرے لئے نہایت وحشتناک تھی۔

سبھاش بابو ہندوستان کے ان نیتاؤں میں ہیں۔ جن کو ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ اور مجھے ساری زندگی یہ فخر رہے گا کہ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

آج کل دہلی

احمد ہمیش



گھڑیاں،
چلتے چلتے رک جاتی ہیں
ڈائل،
کبھی چمکتے نہیں
دُھند کی انجانی سمتوں میں
بکھرے ہوؤں کو ڈھونڈھے کون
رستے، جو کھو جاتے ہیں
ملتے نہیں
یہیں کہیں پر، نام تھا میرا
یہیں کہیں آکاش کا کونا
اُن گلیوں میں جالتا ہے
جن کی خاک میں
میں نے اپنا خون گنوایا
پانی کا سب کھیل تھا لیکن
میں نے اُس کو دُنیا جانا
تیرنے والے، سب ڈوب گئے
مایا کی گہرائی میں
میرے پھٹے ہوئے کپڑے اور بستر
میری کتابیں اور آئینے
سب کچھ، تم نے چھین لیا
پھر یہ جھوٹا بلاوا کیوں
گئے دنوں کا جادو
آنگن،
کھڑکی سے جھانکتی آنکھیں
میں نے کچھ مانگا تو نہیں
میرا رستہ مت روکو
میرے پاؤں میں جنم جنم کے چکر
میرا گھر، محور پر بنا دو

رام لعل



مجھے پہچانو

نئی کالونی میں اپنا کلینک کھولے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہاں ایک روز اچانک شوی سے ملاقات ہوگئی۔ شوی تو اس کے بچپن کا نام تھا۔ میں نے اُسے اسی نام سے مخاطب کیا تو لمحہ بھر کے لئے وہ حیران سی کھڑی رہ گئی۔ پھر بولی۔ "میں مسز اگروال ہوں۔ تین روز سے اس کلینک کے باہر ڈاکٹر ریوتی سرن سکسینہ کی نیم پلیٹ دیکھتی ہوئی گذر جاتی ہوں۔ دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی یہ تم ہی ہو گے! کیوں کہ مجھے یاد تھا تم نے یونیورسٹی چھوڑ کر میڈیکل میں داخلہ لے لیا تھا۔ لیکن صبح تمہارا کلینک بند کیوں ملتا ہے؟ آج تو میں طے کر کے صبح کے بجائے شام کو آئی ہوں کہ تم سے ملاقات کر کے ہی جاؤں گی!"

دس سال کے بعد بھی وہ وہی شوی تھی۔ بڑی اپنائیت سے مجھے تُم تُم کہہ کر مخاطب کرنے والی! اپنے قدرتی طور پر سرخ اور انتہائی **Sensual** ہونٹوں کو بار بار دانتوں تلے دبا کر پھوٹتی ہوئی اندرونی خوشی کو روکتی ہوئی سی! میں سمجھ گیا وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے! لیکن بڑی کوشش سے سنجیدہ اور پرسکون نظر آنے کی کوشش میں بھی ہے۔ تیس سال کی ایک شادی شدہ عورت کو اپنے ماضی کے کسی بوائے فرینڈ سے اچانک ملاقات ہو جانے پر ایسا ہی نظر آنا چاہیئے تھا!

میں نے اُسے بتایا "صبح تو ایک ہاسپٹل میں نوکری کرنے جاتا ہوں اور دوپہر مریضوں کے یہاں جایا کرتا ہوں۔ شام کو بس دو ہی گھنٹوں کے لئے اپنے کلینک میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

اس کے بعد جیسا کہ مجھے توقع تھی اس نے مجھ سے میرے گذشتہ زمانے کے بارے میں بھی پوچھا جو کوئی دس برسوں پر پھیلا ہوا تھا۔ یونیورسٹی سے میڈیکل کالج۔ پھر کچھ عرصہ کے لئے ایک ڈسٹرکٹ ہاسپٹل میں کمپلسری سروس۔ اس کے بعد ملٹری کی سروس اور اسی دوران میں ٹانگ پر گولی کھا جانے سے ایک مستقل لنگ لے کر ریٹائرمنٹ! میں نے ذرا چل کر اُسے اپنے لنگڑے پن کا احساس کرایا تو اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ آگئی۔

اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے اُن سے یہی معلوم ہوا کہ اُس پر بھی کئی حادثات گذر چکے تھے۔ اس نے کہا — "میں اپنے بچے کو دکھانے کے لئے ساتھ لے آئی ہوں کئی روز سے بالکل اسکول نہیں جاتا ہے ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتا ہے۔ کبھی پیٹ درد کا کبھی سر درد کا کلاس میں اس کی حاضری چوپٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ سب سے ہوشیار لڑکا یہی تھا اپنی کلاس میں۔ اب سب سے پیچھے بھی یہی رہ گیا ہے۔"

اس نے بچے کو اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ وہ کلینک کے اندر آیا ہی نہیں تھا۔

اس نے باہر جا کر اُسے پکارا — "میٹو! میٹو!!"

میٹو پارک کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ اُسے پکڑ کر لے آئی میں نے اُسے پیار سے اپنے پاس بلایا۔ — آؤ بھئی میٹو! میرے پاس آجاؤ ذرا!"

وہ بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ پانچ سال کا۔ شوی نے بھی اسے میرے پاس آنے کے لئے پچکارا۔ "جاؤ بیٹے! اپنے انکل کے پاس نہیں جاؤ گے؟

ڈاکٹر صاحب تمہارے انکل بھی ہیں!"

میٹو بہت جھجکتے ہوئے میرے پاس آیا۔ اُس کا اچھی طرح معائنہ کرکے میں نے شوی کو بتایا۔ اس کا تو گلا خراب ہے۔ دیکھو اس کے کتنے بڑے بڑے ٹانسلز ہیں! بخار نہیں آتا اسے؟ کچھ روز کے لیے اس کا اسکول جانا بند کر دو۔ کیوں میٹو! تمہیں اسکول سے ایک ویک کی چھٹی دلوا دوں؟ کون سے اسکول میں پڑھتے ہو؟ تمہاری پرنسپل کے نام ایک لیٹر لکھے دیتا ہوں۔"

چھٹی کا نام سن کر میٹو خوش ہو گیا۔ اس نے اپنی ممی کی طرف بڑی فخریہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے ایک انجکشن لگایا تب بھی وہ بالکل نہ رویا کیوں کہ اب اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ میں اُسے اسکول سے نجات دلوا دوں گا اور انجکشن کے بعد تو اُسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے کی بھی مکمل آزادی ہو گی!۔

انجکشن لگوا کر وہ سچ مچ باہر بھاگ گیا۔ میں نے شوی سے کہا۔"دیکھو میٹو کہیں دور نہ نکل جائے۔"

"فکر مت کرو۔ گم نہیں ہو گا: ہمارا گھر بالکل پاس ہی ہے۔ بیس تیس گز کی دُوری پر ———— لیکن ڈاکٹر سکسینہ، میں تمہیں کبھی اپنے گھر انوائیٹ نہیں کر سکوں گی۔"

وہ اچانک چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے بسی سی جھلک اٹھی جو کسی اندرونی کرب سے ملوث تھی۔ کچھ لمحوں تک ہم دونوں ہی خاموش سے بیٹھے رہ گئے۔ خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیے۔ لیکن ہمارے درمیان ماضی کا کوئی مشترکہ رومان حائل نہیں تھا اگرچہ ہم دونوں نے ایک ہی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ یوں وہ خاصی قبول صورت تھی لیکن اس نے کسی کو بھی لفٹ نہیں دی تھی۔ میں نے بھی کبھی پیش قدمی نہیں کی تھی۔ بس اسے دیکھ دیکھ کر ہی خوش ہو لیتا ہوں۔ کسی خوبصورت چہرے کو دور سے دیکھ کر اگر کوئی خوشی مل سکتی ہے تو وہ مجھے حاصل رہی تھی۔ میں بس اسی ٹائپ کا لڑکا تھا اس زمانے میں۔ کئی لڑکے میری عجیب فطرت پر ہنسا بھی کرتے تھے۔

یاد آیا کالج کے زمانے میں ایک لڑکا شوی کے پیچھے بری طرح پڑ گیا تھا۔ منیش نام تھا اس کا۔ ایک بار تو اس نے شوی کو اٹھا لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔ کسی سے جیپ مانگ کر لے آیا تھا۔ لیکن ناکام رہا۔ پھر اس نے شوی کے خلاف ایک اور اسکینڈل کھڑا کرنے کے لیے مرن برت رکھ لیا۔ یونیورسٹی کی دیواروں پر جگہ جگہ لکھوا دیا اگر شوی نے اس کے ساتھ التفات نہ برتا تو وہ اپنی جان ہی دے دے گا! اس حرکت پر منیش کو یونیورسٹی سے ہی نکال دیا گیا۔ شوی کے بارے میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ وہ بے حد مغرور ہے۔ اس کے غرور سے انتقام لینے کے لیے منیش نے ایک بار اس پر تیزاب سے بھری ہوئی شیشی بھی پھینکی۔ عجیب ضدی واقع ہوا تھا وہ بھی: لیکن شوی کی خوش قسمتی سے تیزاب کی شیشی اس کے پاس سے ہو کر دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ اس طرح وہ بال بال بچ گئی۔ ورنہ آج شاید وہ زندہ بھی نہ ہوتی: ہوتی تو وہ بے حد بدصورت ہو گئی ہوتی۔

اچانک مجھے یہ بھی یاد آ گیا وہ منیش بھی تو اگروال ہی تھا: شوی نے تھوڑی دیر پہلے خود کو مسز اگروال بتایا تھا۔ میں نے کہا ————

"تم اگروال فیملی میں جانے سے بچ نہیں سکیں نا۔؟ اُس منیش کی حرکتیں تو مجھے ابھی تک یاد ہیں: تمہیں بھی بھولی نہیں ہوں گی:"

شوی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا کر بولی۔"میں اس سے بچ کر جا بھی کہاں سکتی تھی: اسی کے ساتھ تو شادی ہوئی ہے میری!"

"ارے!!" میں چونک اٹھا۔ تو منیش کا بچہ اتنی لمبی جدوجہد کے بعد اُسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا! شوی سے کہا۔"اچھا اچھا تم منیش کی ہی وائف ہو! خوب! کیا کرتا ہے وہ؟ میں اس سے فوراً ملوں گا؟ وہ مجھ سے مل کر خوش ہو گا نا!"

شوی کی آنکھوں سے اچانک افسردگی چھلک پڑی۔ بولی۔"کیا کرو گے اس سے مل کر! ملو گے تو تمہیں بہت دکھ ہو گا۔ ہو سکتا ہے مجھ پر غصہ بھی آئے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں سمجھی تھی جس آدمی نے مجھے حاصل کرنے کے لیے جی جان کی بازی لگا رکھی ہے وہ مجھے پا کر بہت خوش ہو گا۔ میرے ساتھ ہمیشہ محبت سے پیش آئے گا۔ لیکن ہمارے تین چار سال ہی ہنسی سے گذر سکے! اس کے بعد تو ہمارا گھر تو میدان جنگ رہنے لگا! گالی گلوچ، مار پٹائی ہی اب تک روزمرہ کا معمول ہے۔ غصے کی حالت میں جو چیز بھی اس کے ہاتھ میں آ جاتی ہے اُسے مجھ پر دے مارتا ہے وہ برتن، کراکری کوئی بھی چیز محفوظ نہیں ہے ہمارے گھر میں!"

شوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جنہیں اس نے جلدی سے پونچھ ڈالا۔ اور پھر باہر کو دیکھنے لگی۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی اور مریض نہیں تھا اس لیے میں بڑے اطمینان سے اس کی آپ بیتی سنتا رہا۔ اس نے مجھ سے کوئی بھی بات نہ چھپائی۔ سب کچھ بلا تکلف بیان کر دیا۔

"منیش کے پیچھے پیچھے پھرنے سے عاجز آ کر میں نے ہار مان لی تھی۔

اس سے مجبوراً ملنا جلنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اس سے شادی کر لینے کے لئے کہا تو اس نے انکار نہ کیا۔ لیکن اس شادی کے لئے میرے ماں باپ رضامند نہیں ہو سکتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ وہ منیش سے کس قدر نفرت کرتے تھے۔ شادی کر لینے کے بعد ہی میں منیش کو ساتھ لے کر اپنے گھر گئی تو میرا خیال تھا کہ ڈیڈی اور ممی مجھے معاف کر دیں گے۔ منیش کو بھی قبول کر لیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ڈیڈی تو یہ صدمہ برداشت ہی نہ کر سکے! دل کے مریض تو پہلے سے تھے ہی! اب ایک ہی جھٹکے میں چل بسے۔ میری ممی اس غم سے پاگل ہو گئیں! اس نے بیوہ ہو جانے کے لئے مجھ ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ سب کے سامنے مجھے سخت بُرا بھلا کہا۔ میں سمجھتی تھی کہ دھیرے دھیرے وہ نارمل ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ ابھی تک مجھے گالیاں دیتی پھرتی ہے۔ جہاں میں مل جاتی ہوں مجھے پکڑ کر کوسنے لگتی ہے۔ میں اس کے پاس کبھی نہیں جا سکتی۔ اس کے تو سامنے ہونے سے ہی ڈرتی ہوں:"

شوبی نے رو رو کر یہ بھی بتایا: "ایک ٹریجڈی اور بھی ہوئی۔ منیش کو اچانک یہ شک ہو گیا ہے کہ مٹو اس کی اصلی اولاد نہیں ہے! میں اسے کیسے یقین دلاؤں! اس کے اس رویے نے میری زندگی کو نرازک بنا دیا ہے!"

یہ کہتے کہتے اس نے اپنی پیٹھ پر سے ساڑی اور بلاؤز ہٹا کر جلد پر پڑے ہوئے گہرے گہرے داغ دکھائے، کالے اور بھورے۔ انھیں دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ شوبی بولی ۔"اولاد سے تو باپ کی خوشبو پھوٹ کر نکلتی ہے! باپ کا خون اپنی اولاد کے لئے ابلتا کیوں نہیں؟ مجھے اپنی مار کا غم نہیں ہے لیکن میرا جی اس بات پر ہر دم کٹتا رہتا ہے کہ منیش مٹو کو کیوں مارتا ہے؟ وہ نہیں چاہتا کہ جس کمرے میں ہم سوئیں وہیں پر مٹو بھی سوئے! لیکن مٹو تو ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے الگ نہیں ہوتا۔ رات کو بھی میرے ساتھ ہی لپٹ کر سوتا ہے۔ منیش اسے اکثر میرے سینے سے نوچ کر الگ کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مٹو زور زور سے چیخ اٹھتا ہے۔ باپ کا غصے سے لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ کتنی بار رو رو کر اس سے پوچھ چکا ہے ۔"پاپا، مجھے کیوں مارتے ہو؟ کیا تم میرے پاپا نہیں ہو؟"

شوبی کی چیخیں نکل نکل گئیں۔ کتنی دیر تک منہ پر ہاتھ رکھے روتی رہی۔ جب اس کی سسکیاں ذرا تھمیں تو پھر کہنے لگی — میں ڈرتی رہتی ہوں کہ کسی دن وہ مٹو کو جان سے مار ہی نہ ڈالے! کیا کروں؟ مٹو کو کہاں چھپا کر رکھوں"

اچانک وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی "اوہ! کتنی دیر ہو گئی ہے! منیش دفتر سے آ چکا ہوگا۔ کہیں مٹو بھی گھر نہ پہنچ گیا ہو! میں باپ بیٹے کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی! اس بات کو سوچتے ہی میری آتما پھڑپھڑانے لگتی ہے!" یہ کہہ کر اس نے میز پر سے دوا کی پڑیاں اٹھالیں۔ اور میرے سامنے پانچ کا نوٹ رکھ دیا۔ میں نے نوٹ اسے واپس کر دیا۔ بنا کسی تبصرے کے۔ اس نے بھی پیسے دینے کے لئے ضد نہ کی اور وہ سر جھکا کر باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں کتنی دیر تک گم سم سا بیٹھا رہ گیا۔ ایک پہاڑ کے نیچے دبا ہوا سا۔ شوبی کے دکھوں کا انت کیا ہوگا! کسی دن تنگ آکر وہ جان ہی نہ دے دے!

مرد کسی لڑکی کو اپنے ماضی میں ایک بار محبت کی نظر سے دیکھ لیتا ہے تو پھر وہ اُس کے دل سے کبھی دور نہیں ہوتی۔ پھر وہ جہاں بھی اُسے مل جاتی ہے۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر، اس کی ہمدردی پھر سے حاصل کر لیتی ہے۔ اگر وہ مصیبت زدہ ہوتی ہے تو مرد اس کے لئے صرف ایک ہی حل سوچ سکتا ہے۔ وہ کسی بھی طرح اس کے آغوش میں چلی آئے۔ جہاں وہ ہر مصیبت سے محفوظ ہو جائے گی۔ ایسا سوچنا اگرچہ محض جذباتیت پر مبنی ہوتا ہے بالکل غلط بھی ہوتا ہے۔ غیر منطقی بھی۔ لیکن مرد سوچتا اسی طرح سے ہی ہے۔

میں نے بھی اسی قسم کی کئی باتیں سوچیں۔ سوچ سوچ کر انھیں ناقابل عمل بھی قرار دے دیا اور اس الجھن سے نکلنے کے لئے پھر کوئی دوسرا حل تلاش کرنے لگا۔ آنکھیں بند کر کے اس طرح بیٹھے بیٹھے مجھے کافی دیر ہو گئی۔ وقت کے گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اچانک میں نے آنکھیں کھولیں۔ اور گھر جانے کے لئے اٹھا تو سامنے کرسی کے پیچھے ایک بچے کو کھڑا ہوا پایا، جو کین کی جالی میں سے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

وہ مٹو تھا! ابھی تک گھر نہیں گیا تھا۔ نو بج رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اس کے پاس جا کر پوچھا۔ "مٹو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کب سے کھڑے ہو؟ گھر کیوں نہیں گئے؟ تمہاری ممی تو بہت دیر ہوئی۔ گھر چلی بھی گئیں!"

لیکن وہ میری باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ کوئی جواب بھی نہ دیا۔ اسی طرح کرسی کی پشت کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے پکڑے سر اٹھا کر مجھے گھورتا رہا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں گھر نہ لوٹنے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ اپنی ماں سے بچھڑنے کا بھی کوئی ملال نہیں تھا۔ وہاں تو بس ایک قسم کی بغاوت کی جھلک تھی۔ گھر واپس نہ جانے کی معصوم اور پیاری سی بغاوت۔

میں نے اسے اٹھا کر کرسی پر کھڑا کر دیا۔ اس طرح اس کا پورا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگے۔ اس کے سنہرے بال ماتھے پر جھک آئے تھے۔ اس کے گالوں ہاتھوں اور

بوٹوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ اس کی نیکر کی جیبوں میں چھوٹے چھوٹے سنگریزے بھرے ہوئے تھے انھیں میں نے نکلوا کر باہر پھینک دیا۔ اس کے گالوں کو پیار سے تھپتھپا کر کہا۔ "اگر پتھر بھروگے تو جیبیں پھٹ نہیں جائیں گی؟"

وہ بڑے اعتماد سے میری طرف دیکھنے لگا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔ میں نے تولیے سے اس کا ہاتھ منہ پونچھ دیا، اور بغل کے اسٹور سے اس کے لیے بسکٹ لینے چلا گیا۔ واپس آیا تو اُسے میز پر چڑھ کر اسٹیتھوسکوپ کو گلے میں ڈال کر اسی سے کھیلتے ہوئے پایا۔ میرے ہاتھ میں بسکٹ دیکھ کر فوراً ہاتھ بڑھا دیا

میں نے اس سے پوچھا۔ "میٹو، گھر جاؤ گے؟ ممی کے پاس!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مزے سے کچر کچر بسکٹ کھاتا رہا۔

یہ سوچ کر میں پریشان ہونے لگا کہ شوبی اس کے بغیر گھبرا رہی ہوگی۔ مینش تو غالباً خوش ہی ہوگا کہ ناجائز اولاد سے اس کی اپنے آپ ہی گلو خلاصی ہو گئی!

مجھے اُن کا گھر معلوم نہیں تھا۔ میٹو سے پھر کہا۔ "چلو میٹو" اب گھر چلیں اپنا گھر ڈھونڈ لوگے نا!"

میرے اصرار پر پہلی بار میٹو کی آنکھوں میں خوف کی جھلک دکھائی دی۔ گھر جانے کے ذکر سے ہی وہ چونک گیا۔ لیکن اُسے گھر پہونچانا بہت ضروری تھا — میں اُسے پچکار کر باہر لے گیا۔ کلنک بند کر دیا اُسے اپنی اسکوٹر پر آگے کھڑا کر کے کہا۔ "تم کتنے اچھے ہو میٹو! مجھے اپنا گھر دکھاؤ گے نا! میں تمہارے گھر جاؤں گا۔ تمہاری ممی سے ملوں گا۔ تمہاری ممی کتنی اچھی ہے! تمہیں دیکھ کر کتنی خوش ہوگی! اپنے میٹو کو دیکھ کر گلے سے لگا لے گی! کہے گی۔ آہا! میرا پیارا میٹو آگیا! میرا میٹو آگیا!! لو اب ہم تمہارے گھر چل ہی رہے ہیں! چلیں نا!"

لیکن میٹو نے کوئی جواب نہ دیا۔ گھر جانے کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی خفگی پیدا ہو جاتی تھی۔ فطری معصوم خفگی جس کے سامنے میں نے خود کو نادم بھی محسوس کیا۔ جیسے اُسے گھر لے جا کر میں اس کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہوں مجھے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس احساس سے مجھے بڑا دھکا لگا۔ لیکن میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

سکوٹر اسٹارٹ کر کے میں اُسے سامنے کی گلی میں لے گیا۔ گلی بہت دور تک گئی ہوئی تھی۔ دونوں طرف مکانات تھے جن میں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ شوبی نے کہا تھا اُن کا گھر بہت دور نہیں ہے بیس تیس گز کے ہی فاصلے پر ہے۔ اندازے سے بیس تیس گز جا کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کسی بھی ایسے مکان کے بارے میں یقین نہ ہو سکا کہ شوبی اور مینش اسی میں رہتے ہوں گے۔ میٹو سے پھر پوچھا لیکن اس نے تو چپ سادھ رکھی تھی!

گلی کے دو چکر لگائے۔ ایک مکان کے دروازے پر دستک بھی دے دی۔ لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ راستے میں دو آدمیوں سے بھی پوچھا لیکن وہاں مینش اگروال کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ایک صاحب جو اس گلی سے اچھی طرح واقف تھے بڑے وثوق سے بتانے لگے۔ "اس گلی میں تو اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا ہے!"

میرے لیے یہ ایک اور صدمہ تھا۔ حیرت میں مبتلا کر دینے والا۔ میٹو کو میں کس کے حوالے کروں؟ اسے گھر لے جاؤں۔ تب بھی شوبی اور مینش کی تلاش کا مسئلہ ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ شوبی کو خود ہی میرے پاس چلے آنا چاہیے تھا۔ میٹو کے بارے میں آکر پوچھنا چاہیے تھا۔ میں نے پھر کلنک کی طرف اسکوٹر گھما دی۔ ممکن ہے وہ آ بھی گئی ہو!

اب ہم پھر کلنک میں تھے۔ میٹو اور میں کلنک میں واپس آکر میٹو بہت خوش نظر آیا۔ فرش پر اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ دواؤں سے بھری ہوئی شیشے کی الماریوں پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیر تا۔ بار بار شیشے کے ساتھ اپنی ناک چپکا کر اپنے عکس کو گھورا کبھی کبھی سر گھما کر میری جانب اس طرح دیکھا کہیں میں نے اپنا فیصلہ بدل تو نہیں لیا۔ اُسے پھر گھر پہنچانے کے لیے باہر تو نہیں لے جاؤں گا!

اچانک مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ دس بج چکے تھے۔ میٹو کی بھوک کا بھی خیال آیا لیکن میں نے اُسے کافی بسکٹ کھلا دیئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہاں اس قدر خوش تھا کہ اُسے شاید بھوک محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے لیے اور بھی بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔

کیا میٹو کو اب گھر لے جاؤں! پیچھے سے شوبی اُسے تلاش کرتی ہوئی کسی بھی وقت آ سکتی تھی! اس نے اپنے بچے کو کتنا کوسا ہوگا۔ مجھے یقین تھا میٹو کو غائب کر دینے کے لیے اسی کو ملزم ٹھہرایا ہوگا۔

میں میٹو کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ کلنک کے اندر ہی۔ مجھے اپنے ساتھ ٹہلتا دیکھ کر اس نے پہلے تو حیرانی دکھائی۔ پھر وہ مسکرا دیا۔ میں نے اُسے انگلی پکڑ لینے کے لیے کہا تو اس نے فوراً پکڑ لی اور ایک الماری کی طرف اشارا کر کے پوچھا۔ — "انکل اس میں کیا ہے؟"

میں نے اُسے بتایا — "اس میں دوا ہے۔"

اس نے یہ اطلاع ایک عجیب سے احساس برتری کے ساتھ

نکلی اور پھر ایک اور الماری کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "اس میں کیا ہے؟"

"اس میں بھی دوا ہے۔"

اب وہ کچھ لمحوں تک خاموش رہا۔ کچھ سوچتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا — "اب کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو یہی دوا کھانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے؟"

"ہاں اسی دوا کے کھانے سے وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

چلتے چلتے اس نے پھر ایک اور اشارہ کر دیا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ واشس بین ہے۔ جب ہاتھ منہ میلے ہو جاتے ہیں تو ٹونٹی کھول کر پانی سے دھو لیتے ہیں۔"

واشس بین تک اس کا قد نہیں پہنچتا تھا وہ اس کے سامنے رک کر بولا "مجھے دکھایئے۔"

میں نے اسے اٹھا کر واشس بین دکھایا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر میرے بازوؤں سے اتر کر ننھے ننھے قدموں سے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ اس کی خواہش ہوئی کہ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگوں۔ جب میں نے ویسا ہی کیا تو وہ بھاگ کر پارٹیشن کے پیچھے چلا گیا اور میرے پہونچنے سے پہلے ہی ایگزامنیش ٹیبل پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔ نرم نرم گدّے پر اپنی انگلیاں کھبا کر بولا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ گدّا ہے۔ اس پر لیٹتے ہیں۔"

یہ سُن کر اس نے مزید خوشی دکھائی اور بولا "میں لیٹ جاؤں"۔

"لیٹ جاؤ۔"

وہ جلدی سے تکیئے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ پہلے تو دائیں بائیں کروٹیں بدلیں پھر چھت پر نظر جما کر بولا — "وہ پنکھا چلتا ہے؟"

"ہاں چلتا ہے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر پنکھا آن کر دیا۔ ہم دونوں ایک سی ہی خوشی سے سرشار ہو رہے تھے۔ وہ میرے اچھے سلوک سے زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرتا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی بھوک کا احساس کر کے اسے بسکٹ لا دیئے۔ "لو کھاؤ۔ بھوک لگی ہے نا"۔

اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور میرے ہاتھ سے بسکٹوں کا ڈبہ لے لیا۔ میں نے اپنے دونوں بازوؤں کے سہارے اس پر قریب قریب جھک کر کہا — "مجھے بھی بھوک لگی ہے! مجھے نہیں کھلاؤ گے؟"

اس نے میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہا ہوں میں! جب میں نے دیر تک اپنا منہ کھلا رکھا تو اس نے ہنس کر ایک بسکٹ میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ جلدی جلدی بسکٹ چبا کر میں نے ایک اور مانگا تو اس نے دوسرا بسکٹ دینے سے پہلے پوچھا "مجھے پاپا کے پاس تو نہیں لے جایئے گا؟"

اس کی آنکھوں میں پھر ایک خوف سا بھر گیا۔ میں نے ایک ہی لمحے کے اندر سوچ لیا۔ یہ بچہ میرے پاس بھی رہ سکتا ہے! اُسے بتایا — "نہیں! کبھی نہیں لے جاؤں گا۔"

وہ خوش ہو اٹھا۔ اس نے بسکٹ میرے منہ میں دے دیا اور کہا۔ "اب کھایئے نا!"

میں نے جلدی جلدی بسکٹ چبا کر نگلا اور اس سے پوچھا "میٹو تمہیں پاپا اچھے نہیں لگتے؟"

اس نے اداس ہو کر جواب دیا — "مجھے پیار نہیں کرتے!"

"وہ پیار کریں تو جاؤ گے اُن کے پاس؟"

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ جیسے یقین ہی نہ کر سکا ہو کہ پاپا اسے کبھی پیار بھی کرے گا!

میں نے پھر پوچھا — اچھا ممی کے پاس تو جاؤ گے؟ "چلو"

اس نے منہ میں بسکٹ بھرتے ہوئے کہا — "ممی نے کہا تھا تم انکل کے پاس رہنا! میں بھی آ جاؤں گی!"

میں یکایک چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "کیا تمہیں ممی نے یہاں بھیجا تھا۔ میرے پاس تمہیں ممی چھوڑ کر گئی تھی۔"

اس نے اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے کہا: "ہاں۔ ممی مجھے دروازے کے پاس تھول کے تلے گئی تھی!"

مجھے ایسی امید نہیں تھی شوبی سے! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ بھی سکتی تھی۔ میں تو اس کی ہر مشکل آسان کرنے کے لئے تیار تھا۔ اگر وہ چاہتی تو میں میٹو کو اپنا بیٹا بھی مان سکتا تھا۔ محض اس کی مصیبت ختم کرنے کے لیے! یہ سوچ کر اگرچہ مجھے ایک گدگدی بھی محسوس ہوئی!

میں کتنی دیر تک کلنک کے اندر سخت بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ شوبی کی حرکت کے متعلق سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا۔ جب وہ خود ہی میٹو کو خود ہی یہاں چھوڑ گئی ہے، تو پریشان کیوں ہو رہی ہو گی۔ اسے ڈھونڈتی ہوئی پھر یہاں کیوں آئے گی؟ اب وہ کل ہی میٹو کو دیکھنے آئے گی! میں نے ناحق اتنا سمے برباد کیا! میٹو کو گھر ہی لے کر چلا گیا ہوتا۔ اس وقت تک وہ وہاں مزے سے سو رہا ہوتا!

اب میں فوراً ہی میٹو کو گھر لے جانے کے لیے تیار ہو اٹھا۔ جلدی سے

اندر گیا تاکہ اُسے اٹھا کر باہر لے جاؤں۔ لیکن وہ تو گہری نیند میں تھا بسکٹوں کا ڈبہ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے۔ نیند میں بھی وہ بہت پیارا لگا۔ میں نے اس کے ماتھے پر گرے ہوئے بال پیچھے کو ہٹائے اور فیصلہ کر لیا کہ اب وہ رات بھر یہیں سوئے گا اور میں بھی دوسری میز کو خالی کر کے لیٹ رہوں گا۔

جب میں اسکوٹر کو اندر لانے کے لئے باہر نکلا تو اندھیرے میں اچانک دو پرچھائیاں میرے سامنے اُبھریں۔ آگے پیچھے چلتی ہوئی میرے پاس آکر رک گئیں۔ اُن میں سے ایک نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا — کیا آپ ڈاکٹر سکسینہ ہیں؟ میرا بچہ آپ ہی کے پاس ہے؟"

میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ وہ مینش تھا جب اُسے کلنک کے اندر روشنی میں لے آیا تو اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کتنا بدل چکا تھا، ادھیڑ مرجھایا ہوا، کھچڑی بال۔ اس نے بھی مجھے حیران ہو کر دیکھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو بے اختیار لپٹا لیا لیکن وہ ایک ہی لمحے کے بعد میرے بازوؤں میں سے نکل کر پارٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ میٹو کو ایک نظر فوراً دیکھ لینے کے لئے —!

تب تک شوبی بھی اندر آگئی۔ اُس نے بہت دھیرے سے مسکرا کر بتایا "آج مینش بہت تڑپا ہے! جب بالکل بے قابو ہونے لگا تب ہی میں اُسے یہاں لے کر آگئی۔"

اُس کی آنکھوں میں فتحمندی کی مسرت تھی لیکن وہ بھی میرے پاس زیادہ دیر تک نہ رکی بینش کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئی۔ باپ بیٹے کی ملاقات کا تماشا دیکھنے کے لئے!

مینش اتنی جلدی بدل جائے گا۔ مجھے یقین نہ تھا۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ وہ سچ مچ میٹو کو سینے سے لگا کر بار بار پیار کر رہا تھا۔ اسے جگا رہا تھا۔ یہ کہہ کہہ کر "میں تمہارا پاپا ہوں بیٹے! مجھے پہچانو! آنکھیں تو کھولو!"

بقیہ نملی

اور اس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے تھے۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ زردی سی بکھری بکھری سی مسکراہٹ! میں حیرت میں ڈوبا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

اور مسز رمیش ساڑھی کے پلو سے آنکھیں صاف کر رہی تھی

بقیہ: آزاد ہند فوج

بہادر شاہ ظفر دفن ہے۔ میں سب سے پہلے ان کے مزار پر خراجِ عقیدت پیش کرنے جاؤں گا۔ تمام حاضرین نے نیتا جی کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور پھر اپنی قیام گاہ پر پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد نیتا جی بہادر شاہ ظفر کے مزار پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

کتنا پرکیف تھا وہ منظر جب ہندوستان کی موجودہ جنگ آزادی کا متوالا ہیرو سبھاش چندر بوس ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے رہنما بہادر شاہ ظفر کے مزار پر ان کی دعائیں لینے کے لئے کھڑا تھا۔ ہندوستان کے آخری شہنشاہ کا مزار صرف ایک معمولی مٹی کا ڈھیر تھا، جس کی برسوں سے کسی نے دیکھ بھال نہ کی تھی۔ مزار کی یہ خستہ حالت دیکھ کر نیتا جی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے اور ان کی زبان سے بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر نکلا۔

" غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی
تختِ لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی

یہ شعر پڑھنے کے بعد انہوں نے فرمایا۔ اے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے شہنشاہ میں سبھاش چندر بوس عہد کرتا ہوں کہ میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تیغ تختِ لندن تک چلاؤں گا اور جو کام آپ نے شروع کیا تھا، اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ اور جس دلی کے لال قلعے سے آپ نے جنگ آزادی کا پرچم بلند کیا تھا۔ اس لال قلعے پر ہندوستان کا قومی جھنڈا لہرا کر دم لوں گا۔

اس موقع پر انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہندوستان آزاد ہوگا تو بہادر شاہ ظفر کی قبر کو پورے فوجی اعزاز اور احترام کے ساتھ دلی کے لال قلعے میں منتقل کیا جائے گا۔ جہاں ان کی شایانِ شان مقبرہ تعمیر کرایا جائے گا —— جو ہندوستان کی آنے والی نسلوں کو ہمیشہ یہ بات یاد دلاتا رہے گا کہ "یہ ملک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، جینیوں، پارسیوں، سب کی یکساں قربانیوں سے آزاد ہوا ہے اور سبھوں کو مل کر اس کی حفاظت کرنی ہے۔"

نیتا جی زندہ باد — آزاد ہند فوج زندہ باد



ادارہ

دوستی اور خیرسگالی کا دورہ

لاطینی امریکہ کے ممالک کی معاشی ترقی اور بین الاقوامی تجارت میں اُن کے حصّے سے ہندوستان کی خاصی دلچسپی وابستہ ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان ہی کی طرح اِن ممالک کی معیشتیں بھی ترقی پذیر ہیں۔ یہ ممالک بالعموم اشیائے خوردنی، معدنی تیل اور کچّا صنعتی مال برآمد اور مشینیں، کچّا مال، نیم تیار مال درآمد کرتے ہیں ــــ آزادی کے بعد سے ہندوستان نے اِن ممالک کے ساتھ دوستانہ اور تجارتی تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی ہے اس غرض سے ۱۹۵۵ء میں ہندوستان کے وزیر اعظم شری جواہرلال نہرو جنوبی امریکہ کے بعض ممالک کے دَورے پر تشریف لے گئے تھے، ہندوستان نے ان میں سے بعض ملکوں میں اپنے دفتر کھولے ہیں۔ ہندوستان اور ان ممالک کے درمیان تجارت کو بڑھاوا دینے کے لئے تجارتی اقتصادی معاہدے کئے گئے اور تال میل کے شعبوں میں توسیع کی گئی ہے۔

آبادی سے قطع نظر ہندوستان اور لاطینی امریکی ممالک تقریباً ایک جیسے حالات میں، اقتصادی ترقی کے ایک سے مراحل سے گذر رہے ہیں۔ "گروپ،،" اور اقوام متحدہ کی تجارت اور ترقی سے متعلق دوسری کانفرنس میں بھی ہندوستان اور ان ممالک کے درمیان تعاون اور تال میل بڑھا ہے۔

تجارتی تعلقات کو بڑھاوا دینے کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور لاطینی امریکی ممالک نے اقتصادی اور سماجی ترقی کے شعبوں میں اپنی تکنیکی جانکاری اور ہنرمندی کو یکجا کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ اقتصادی تال میل کا یہ کام شروع ہو چکا ہے۔ ایک ہندوستانی فرم کولمبیا میں ٹوئسٹ ڈرلز تیار کرنے کا ایک کارخانہ قائم کر رہی ہے۔ اس کارخانہ کے لئے مشینیں اور تکنیکی جانکاری یہ ہندوستانی فرم ہی مہیا کرے گی۔ توقع ہے کہ ہندوستان کی اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن یوروگوائے ریلوے کی ترقی وجدیدکاری کے پروگرام میں ہاتھ بٹائے گی۔ بعض ہندوستانی فرمیں جنوبی امریکہ کے ممالک کے طلب کئے ہوئے ٹینڈر بھر رہی ہیں۔ اور ایک ہندوستانی فرم کا پرزوں کی سپلائی کا ٹینڈر ارجنٹائنا ریلوے کے زیرِ غور ہے۔

ہندوستان اوران ممالک کے درمیان مختلف اقتصادی شعبوں میں تکنیکی جانکاری اور تجربات کو یکجا کرنے اور مفید کاموں میں لگانے کی

بڑی گنجائش ہے۔ اس ضمن میں برازیل کے وزیرِ خارجہ کا یہ بیان قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان اور برازیل دونوں کو ایک جیسے مسائل درپیش ہیں اور تجارتی تعلقات اور تکنیکی تال میل سے دونوں ممالک فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور یہی بات لاطینی امریکہ کے دوسرے ممالک کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

تجارتی تعلقات اور اقتصادی تال میل کے علاوہ ایک شعبہ اور بھی ہے، جس میں ہندوستان اور لاطینی امریکہ کے ممالک برابر کی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور یہ شعبہ ہے ثقافتی تال میل کا۔

ہندوستان کی وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا لاطینی امریکہ کے ممالک کا حالیہ دورہ بھی اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ شریمتی اندرا گاندھی کے پروگرام میں برازیل، یوروگوائے، ارجنٹائنا، چلی، وینیزویلا ٹرینیڈاڈ اور ٹوباگو اور گویانہ کا دورہ شامل ہے۔ وزیرِ اعظم کو پیرو کے دورے پر بھی جانا تھا، لیکن وہاں کے سیاسی حالات میں تبدیلیوں کے پیشِ نظر وزیرِ اعظم نے پیرو کا دورہ منسوخ کر دیا۔

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے دورے کا آغاز ۲۳ ستمبر کو برازیل سے کیا۔ رقبے کے اعتبار سے دنیا کا پانچواں بڑا ملک برازیل بھارت کی طرح ایک زراعتی ملک ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ بھارت اور برازیل کے تعلقات بڑے خوشگوار اور دوستانہ ہیں۔ برازیل میں لوگ مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، اور ٹیگور کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ برازیل اور ہندوستان کے اچھے ثقافتی تعلقات کی ایک بین مثال یہ ہے کہ بمبئی میں ۱۹۶۴ء میں منعقدہ بین الاقوامی یوکرسٹک کانگرس میں برازیل کے دو سو نمائندے شریک ہوئے تھے۔ ہندوستان اور برازیل کے درمیان ایک تجارتی معاہدے پر فروری ۱۹۶۸ء میں دستخط ہوئے تھے۔

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور برازیل کے صدر مسٹر آرتھر ڈا کاسٹا ری سلوا کی طرف سے جو مشترکہ اعلانیہ جاری کیا گیا، اس میں دونوں ملکوں نے اپنے تعلقات کو وسعت دینے کی باہمی خواہش کا



وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی ریو ڈی جینرو (برازیل) میں گمنام سپاہی کے مقبرے پر پھول چڑھا رہی ہیں

اظہار کیا ہے اور اس پختہ ارادے کا اظہار کیا ہے کہ دونوں ملک ثقافت سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبوں میں باہمی تال میل بڑھائیں گے۔ جیسا کہ اعلانیئے میں کہا گیا ہے، دونوں ملکوں کے درمیان براہ راست بحری تعلق اور نیوکلیائی توانائی کے پرامن استعمال کے باب میں اشتراک عمل کو آسان بنانے کے لئے مستقبل قریب میں ایک معاہدہ کیا جائے گا۔ دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے اس کا اعادہ کیا کہ دنیا کے ملکوں کو آج جو بڑا کام درپیش ہے وہ امن کے تحفظ، عالمی مفاہمت کے فروغ اور سودمند باہمی تعاون روا رکھنے کا ہے۔

برازیل کے چار روزہ سرکاری دورے کے اختتام پر جب وزیر اعظم اندرا گاندھی، ۲۲ ستمبر کو یوروگوائے کے دوروزہ سرکاری



سانتیاگو (چلی) میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو گارڈ آف آنر پیش کیا جا رہا ہے

دورے پر "گلابوں کے شہر" مونٹی ویڈیو پہونچیں تو وہاں اُن کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ شریمتی اندرا گاندھی نے یوروگوائے کی پارلیمان کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان نے ہمیشہ پرامن بقائے باہم کے لئے کام کیا اور ہمیشہ اپنے خیرسگالی کے حلقے کو توسیع دینے کی کوشش کی ہے۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر کے دوران یوروگوائے کو جمہوریت کی ایک عظیم آزمائش گاہ



بوئنس ایرس (ارجنٹائنا) میں دی گئی ایک دعوت میں شریمتی اندرا گاندھی ایک مہمان کی ایک ماہ کی بچی کی طرف متوجہ ہیں، جس کا نام ان کے نام کی رعایت سے اندرا ٹیلر رکھا گیا ہے۔

قرار دیا۔ ایک مشترکہ اعلانیہ میں، ہندوستان اور یوروگوائے کے رہنماؤں نے اس حقیقت کو بھی محسوس کیا کہ دونوں ملکوں کو ترقی کے ضمن میں ایک جیسے مسائل درپیش ہیں۔ اور دونوں ملک تجارت و ترقی سے متعلق اقوام متحدہ کی دوسری کانفرنس منعقدہ نئی دہلی میں واضح کئے ہوئے خطوط پر عالمی اقتصادی روابط کو استوار کرنے میں یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔

یوروگوائے کے دورے کے بعد وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۹ ستمبر کو ارجنٹائنا کے دورے پر بوئنس آئرس پہنچیں جہاں ان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ ارجنٹائنا لاطینی امریکہ کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ اس کا رقبہ ہندوستان کے رقبے سے تقریباً ۳۰۰،۰۰۰ مربع میل زیادہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس اس کی آبادی بھارت کی آبادی سے بہت کم یعنی کل ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے۔

شریمتی اندرا گاندھی اور ارجنٹائنا کے صدر اونگانیا نے جو مشترکہ بیان جاری کیا، اس میں دونوں رہنما اس بات پر متفق ہیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی اور تجارتی رابطوں اور دوستانہ سیاسی

تعلقات کو مضبوط بنایا جانا چاہیے۔ دونوں رہنماؤں نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی معاہدہ جلد طے ہو جانا چاہیے اور ۱۹۶۶ء کے تجارتی معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ارجنٹائنا کے صدر کو ہندوستان کے سرکاری دورے کی دعوت دی، جو انھوں نے منظور کرلی۔

ارجنٹائنا کے دورے کے دوران شریمتی اندرا گاندھی نے حکومت کے رہنماؤں کے علاوہ ارجنٹائنا کے بعض شاعروں، صحافیوں اور ناشروں سے ملاقات بھی کی۔

ارجنٹائنا کے دورے کے بعد وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی چلی کے دورے پر سانتیاگو پہنچیں، جہاں ان کا بے مثال سواگت کیا گیا۔ چلی لاطینی امریکہ کے چھوٹے ممالک میں سے ایک ہے۔ کسی بھی مقام پر اس کی چوڑائی ۱۱۰ میل سے زیادہ نہیں۔ اس کی کل آبادی ۸۷ لاکھ ہے۔

چلی کے صدر کی طرف سے دی گئی ایک دعوت میں تقریر کرتے ہوئے شریمتی گاندھی نے، کہا کہ میں آدھی دنیا کا سفر طے کر کے یہاں آئی ہوں تاکہ ہند اور چلی کے تعلقات کو مضبوط بناؤں۔ اس ملک کے بارے میں زیادہ واقفیت حاصل کروں اور یہاں کے لوگوں کو ہندوستان اور اس کے مستقبل کے بارے میں بتاؤں۔ ہندوستان اور چلی کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے شریمتی اندرا گاندھی نے کہا کہ اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں میں دونوں ملک ایک دوسرے سے مل کر کام کرتے ہیں اور ان کی پالیسی ایک سی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ترقی پذیر ممالک کے درمیان تعاون ان کو مضبوط اور اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ غیر ملکی دباؤ کا مقابلہ کر سکیں۔

ان کے علاوہ وزیر اعظم نے کولمبیا، وینزویلا، ٹرینیڈاڈ اور ٹوباگو کا دورہ کیا جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اور اس طرح وزیر اعظم اندرا گاندھی کا لاطینی امریکی ممالک کا دوستی اور خیر سگالی کا دورہ اختتام پہونچا۔ امید ہے یہ ان ممالک سے مزید بہتر تجارتی ثقافتی تعلقات کا پیش خیمہ بنے گا۔



غزل

علیم اللہ حالی

اے شب تجھے سلام کہ اب تیرگی کو کہہ سے
پیدا کبھی نہ ہوگی کوئی صبحِ انتظار
صحنِ حیات میں نہ کھلیں گے وفا کے پھول
غنچوں کو گدگدائے گا نہ اب نغمۂ ہزار
خونِ غمِ حیات نہ اب رنگ لائے گا
پھوٹے گی اب نہ بطنِ خزاں سے کبھی بہار
گردابِ غم نہ بحرِ جنوں سے اُٹھے گا پھر
ہر موجِ مضطرب ہے اب آسودۂ کنار
اب دورِ آہِ نیم شبی کس کو یاد ہے
ہے رسم و راہِ ربطِ کہن آج بے وقار
کس کے لئے کریدکے ڈھونڈھوں ہزار بار
خاکسترِ جگر میں کوئی گرمیٔ شرار
ہم سے وداعِ تیرگیٔ شب نہ پوچھیے
کس سے کہیں کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
زنجیرِ نارسائی میں ہر نالہ ہے اسیر
ہر باتِ عہدِ شوق کی نامعتبر گئی
صحرائے درد کس کا ہے آج منتظر
اب اہلِ غم کی جرأتِ آشفتہ سر گئی
کیا ہوگئیں خرد کی وہ نا اعتباریاں!
وہ وحشتوں کی حوصلہ مندی کدھر گئی
سب غم غلط تھے عہدِ تعلق کے آج تک
دل کی شکایتِ نگہ، مختصر گئی
کیا جانیے بلائے وفا کس کے سر گئی
یہ رات آخری تھی سو وہ بھی گزر گئی



خلیل الرحمن اعظمی

دیکھنے والا کوئی ملے تو دل کے داغ دکھاؤں
یہ نگری اندھوں کی نگری، کس کو کیا سمجھاؤں

نام نہیں ہے کوئی کسی کا، روپ نہیں ہے کوئی کسی کا
میں کس کا سایہ ہوں کس کے سائے سے ٹکراؤں

سستے داموں بیچ رہے ہیں اپنے آپ کو کتنے لوگ
میں کیا اپنا مول بتاؤں، کیا کہہ کر چلاؤں

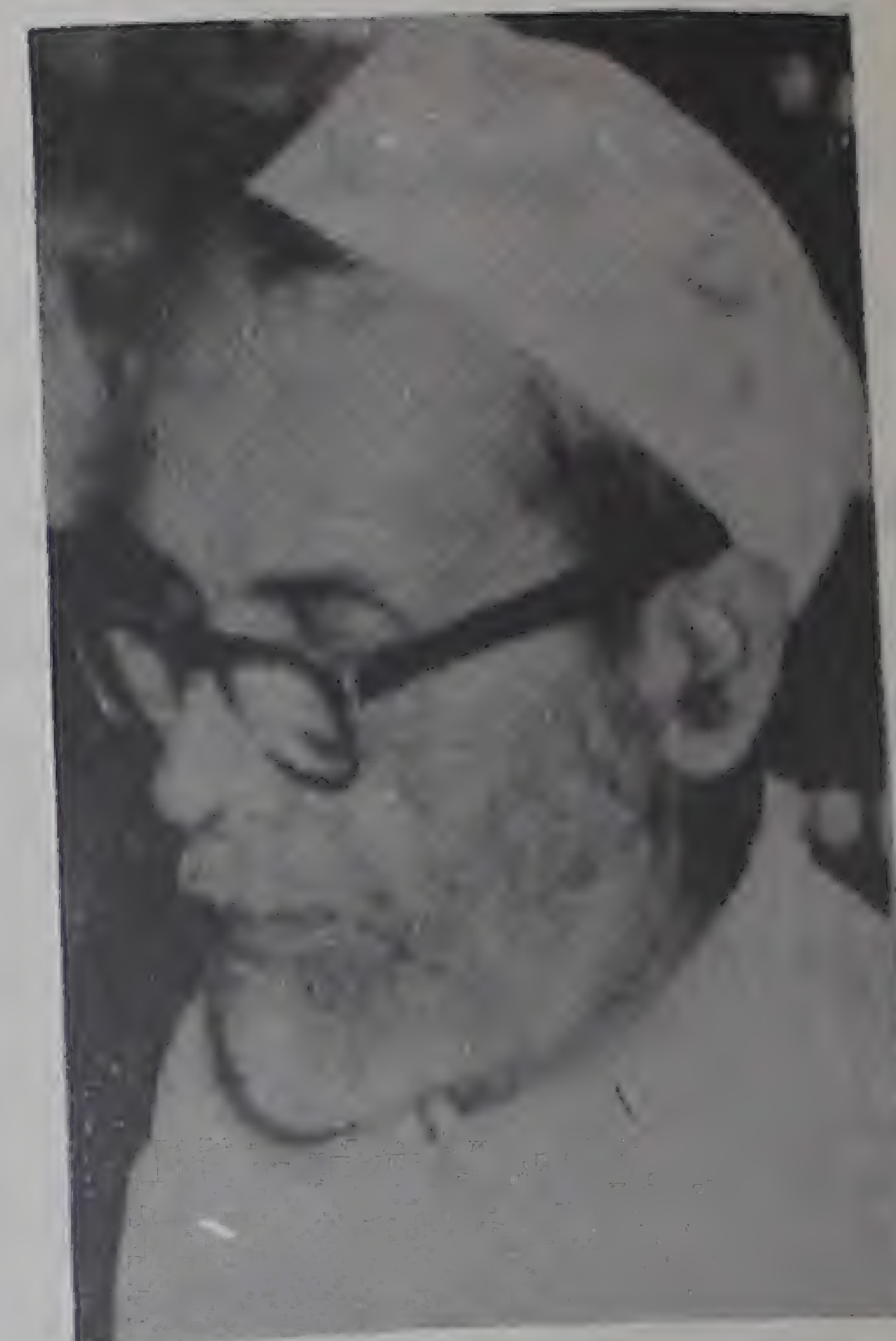
اپنے سپید و سیہ کا مالک ایک طرح سے میں بھی ہوں
دن میں سمیٹوں اپنے آپ کو، راتوں میں بکھراؤں

اپنے ہوں یا غیر ہوں سب کا اندر سے ہے ایک سا حال
کس کس کے میں بھید چھپاؤں، کس کی ہنسی اڑاؤں

پیاسی بستی، پیاسا جنگل، پیاسی چڑیا، پیاسا پیڑ
میں بھٹکا آوارہ بادل کس کی پیاس بجھاؤں

جیون کے ساگر میں اونچی نیچی لہریں اٹھتی ہیں
سپنوں کی یہ ٹوٹی پھوٹی ناؤ کہاں لے جاؤں

صباح الدین عبد الرحمٰن



عرش ملسیانی

مولانا محمد علی جوہر نے اپنی شاعری کے متعلق کسی موقع پر کہا تھا کہ وہ شاعری کی گود میں نہ صرف پلے ہیں بلکہ شاعری کی توند پر کھیلتے رہے ہیں۔ ان کا اشارہ داغ کی طرف تھا جب داغ رام پور کے دربار میں ملازم تھے تو اس وقت مولانا محمد علی محض بچے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ داغ کے یہاں جاتے تو داغ اپنی محبت اور شفقت میں ان کو لیٹے لیٹے اپنے سے چمٹا لیتے۔

یہی بات عرش ملسیانی کے متعلق کہی جا سکتی ہے کہ وہ شاعری کی گود میں صرف پلے نہیں بلکہ اس کی توند پر کھیلتے رہے ہیں۔ ان کے والد بزرگوار پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی اُردو کے بڑے قادر الکلام شاعر ہیں ان کی پیدائش ضلع جالندھر میں ہوئی، وہ مستقل طور پر اسی ضلع کے ایک قصبہ نکودر میں مقیم رہے لکھنؤ اور دہلی سے دور رہنے کے باوجود اُردو زبان پر بڑی قدرت حاصل کی

وہ جب انیس سال کے تھے تو حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے ان کے بعض مدّاح حضرات کا خیال ہے کہ اُن کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جن پر کلامِ داغ کا مغالطہ ہوتا ہے۔ ان کے کچھ ایسے بھی معتقد ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان کے کلام کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ داغ، امیر نسیم اور ظہیر کی خوش بیانیوں سے سرور حاصل ہو رہا ہے۔

نکودر جیسے مقام میں رہ کر اربابِ نظر کو اپنی طرف نہ صرف مائل کیا بلکہ اپنے فن کا لوہا بھی منوا لیا۔ بیخود دہلوی نے بڑی فراخدلی سے ان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فصاحت ان کے سامنے پانی بھرتی ہے بلاغت ان کے اشعار پر فدا ہوتی ہے۔ طبیعت ان کی پر بہار ہے۔ شعر کی بندش ٹھوس اور پائیدار ہے۔ بہت مضبوط شعر کہتے ہیں۔ نیاز فتحپوری نے لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھا کہ جناب جوش ملسیانی ہمارے ماضی اور حال کی آبرو اور مستقبل کے سنگ میل ہیں۔ جوش ملسیانی کا جادو جوش ملیح آبادی کے سر پر بھی چڑھ کر بولا جب انھوں نے یہ لکھ کر داد دی کہ حضرت جوش پنجابی ہیں، آپ نہ کبھی دہلی میں رہے اور نہ کبھی لکھنؤ میں، لیکن زبان کے دونوں مرکزوں اور اہلِ زبان کی صحبتوں سے کوسوں دور رہنے کے باوجود آپ کی زبان اس قدر پاکیزہ اور رواں، اور آپ کی فنی معلومات اس قدر استوار اور پختہ ہیں کہ آپ کو نہایت آسانی کے ساتھ اساتذہ اہلِ زبان کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

خراجِ تحسین کی یہ فراوانی کہہ رہی ہے کہ حضرت جوش ملسیانی نے لکھنؤ اور دہلی کو اپنے سامنے لا کر جھکا دیا۔ ایسے ہی لائق باپ کے لائق بیٹے حضرت بالمکند عرش ملسیانی ہیں اور یہ کہنا صحیح ہے کہ حضرت جوش ملسیانی کی بہترین نظم حضرت عرش ملسیانی ہیں۔

عرش ملسیانی اس وقت عمر میں ساٹھ کے قریب ہوں گے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ انھوں نے اوورسیری کی تعلیم پائی تھی، کچھ دن اوورسیر بھی رہے لیکن اب اوورسیروں اور انجینیروں کی وردی کو ان کے مال خانے میں رکھ کر شاعروں کی صفِ اوّل میں جگہ پائے ہوئے ہیں اور اہلِ نظر سے اپنے فکر و فن کی داد پا رہے ہیں۔ ان سے زیادہ اُن کے والد بزرگوار کو خوشی ہوتی ہوگی، جب اُن کی نظر سے گذرتا ہوگا کہ

"عرش ملسیانی کا کلام نہایت سنجیدہ، نہایت رنگین اور بہت جوان ہے۔ فن اور زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔"

——— فراق گورکھپوری

"عرش صاحب کو شاعری کا ذوق ورثے میں ملا ہے اور ایک مستحق کی حیثیت سے ملا ہے۔ وہ ان شعراء میں نہیں جو علم سے بے نیاز ہو کر شاعری کرتے ہیں بلکہ اُن کا شمار ان پڑھے لکھے وسیع المطالعہ شعراء میں ہے جو لغت، عروض اور معانی وغیرہ کے نکات سے بھی واقف ہیں"

——— نیاز فتحپوری

"جیسا اثر اور لوچ عرش کی غزل میں ہے ویسا ہی زور اور دقت نظر اُن کی نظموں میں ہے . . . . زبان اور محاورے کی دل آویزی، اسلوب کی چستی، تخیل کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی اور حسنِ ادا اُن کے کلام کے خاص اوصاف ہیں"

——— برج موہن دتاتریہ کیفی

"عرش صاحب سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں، فن کی پابندی کا سختی کے ساتھ لحاظ کرتے ہیں اور معائب شعری سے دور رہتے ہیں اُن کی شاعری میں روح اور بیان میں حرارت پائی جاتی ہے"

——— جوش ملیح آبادی

عرش کے مداح ان کی عظمت کا راز اس میں بتاتے ہیں کہ وہ ان بلندیوں پر پہنچ کر شعر کہتے ہیں جہاں فطری شاعری کا علم لہراتا ہے اور حقیقی شعریت کی بجلیاں چمکتی ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے دلوں کی دھڑکنوں اور ذہنوں کے ارتعاش کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ہندوستان کے عوام کے دکھ اور درد کے ساتھی ہیں۔ دوسری طرف اپنی شاعری کے نغمہ و ترنم سے انسان کے احساسِ جمال کو بھی بیدار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں توازن، اعتدال اور کیفیات کا ٹھہراؤ ہے۔

عرش صاحب کے کلام کے تین مجموعے اس وقت میرے سامنے ہیں، ہفت رنگ، چنگ و رباب اور آہنگ حجاز۔[1] پہلے دونوں مجموعوں میں ان کی نظموں اور غزلوں کے علاوہ اُن کے کچھ گیت بھی ہیں۔ اُن کے معاصر ممتاز شاعروں میں شاید ہی کسی نے گیت لکھے ہوں لیکن وہ نظمیں لکھتے لکھتے گیت بھی لکھنے لگے ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ قدرت کی طرف سے ذوق شعری کی طرح ان کو نغمہ و ترنم کا بھی عطیہ ملا ہے اور جب اُن پر جمالیاتی احساسات کے کیف آفریں جذبات طاری ہوتے ہیں، تو وہ ان کو صرف غزلوں اور نظموں میں محدود رکھنے کے بجائے ان کا اظہار مترنم گیتوں میں بھی کرتے ہیں۔ جن میں ان کو ذاتی طور پر وہی لذت محسوس ہوتی ہے۔ جو کسی مطرب کو اپنے بانگ بربط اور آوازِ نے میں ہوتی ہے۔ انہوں نے ان گیتوں کے ذریعہ کلیوں کے گھونگھٹ کھولے ہیں۔ پریتم پیارے کو جگایا ہے۔ آنکھوں سے امرت چھلکایا ہے۔ پریم سے پریم کا گیت سنایا ہے پریم کی لے میں تان اڑائی ہے۔ پائل کی جھنکار سے من پر تلوار بھی چلائی ہے من کو من سے جوڑا ہے۔ گھنگھور گھٹا میں پریتم کا روپ پیکا یا ہے اور من میں اسی کا پریم جما کر دکھایا ہے۔ پیارا پیارا دیس کا نغمہ بھی گایا ہے۔ ان گیتوں میں بڑا سریلا پن اور رسیلا پن ہے، جن کو مترنم آواز میں سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نغموں کی مے پلا رہا ہے اور مست ہو کر سرمست بنا رہا ہے اور اسی کے ساتھ جانی پہچانی صداقتوں کو پیش کر کے جذبات میں ہلچل پیدا کر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جذبات کو زبان دے کر ہلچل پیدا کرنے ہی میں نغموں اور گیتوں کا سارا کھیل ہوا کرتا ہے اور یہی کھیل عرش کے گیتوں میں ہے۔

عرش صاحب نے بہت سی نظمیں بھی کہی ہیں۔ جن میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ یہ رومانی بھی ہیں اور جذباتی بھی۔ تفریحی بھی، اخلاقی بھی۔ سیاسی بھی اور فکری رنگ کی بھی۔

"آمد شباب"، "کلفٹن"، "میں کیوں بھول جاؤں"، "کل رات سے" "دورِ عیش" اور "دیہاتی دوشیزہ" وغیرہ ان کی رومانی نظمیں ہیں۔ ان کی نظم آمد شباب سے ظاہر ہے کہ ۱۹۳۰ء میں ان کے رخ پر سرخی اور طبیعت میں روانی آئی۔ اس کے دس برس کے بعد وہ کلفٹن کراچی کی سیر کو گئے، جہاں "اٹھتی ہوئی لہروں میں شفق عکس فگن تھی، نکھری ہوئی شام تھی، گل پوش حسینوں کا سیلاب تھا، مہ پاروں کے جمگھٹ تھے، نوخیز نوجوانیاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ لیکن اس کیف کی دنیا میں وہ بے کیف رہے۔ ان کے بربط دل پر پردۂ غم پڑا رہا۔ کیوں کہ ان کو اس وقت ایک کافرہ کی یاد آئی۔ اور

ع جب وہ نہیں جذبات کو پھر کون ابھارے

اس کافرہ کی یاد میں کلفٹن پر ان کے جذبات تو نہیں ابھرے، لیکن شاید اسی کافرہ ہی نے ان کی رومانی نظموں کا ایک کلفٹن آباد کر دیا ہے۔ غالبًا اسی کو اپنی نظم "میں کیوں بھول جاؤں" میں یاد کرتے ہیں۔ اس میں چشم میگون

---

[1] چوتھا مجموعہ شرارِ سنگ بھی شائع ہو چکا ہے۔ (مدیر)

کیف آور جوانی، حسن تبسم، لبِ سرخ کی گلفشانی، زبان نظر پر حیا کی کہانی، سینے کی دھڑکن، مجبور آنسو، چھپ چھپ کر آنسو بہانے، ایک دوسرے سے روٹھ جانے، کسی کا کسی کو ہنسی میں رُلانے، پھر محبت کے دن اور فرقت کی راتوں کی بڑی اچھی تصویر ملتی ہے، لیکن اس نظم کا خاتمہ فریب مقدر کی چیرہ دستی اور مرگِ تمنا پر ہوتا ہے۔ اس نے شاعر کے دل میں ایک کھٹک ایک کسک پیدا کر دی ہے جو ان کی شاعری کی جان ہے۔ اس نظم میں حسرت کی بعض غزلوں کی شان نظر آتی ہے مثلاً اس کا ایک بند یہ ہے۔

وہ سانسوں کی تیزی وہ سینوں کی دھڑکن
وہ دونوں کا چھپ چھپ کے آنسو بہانا
وہ تجدیدِ الفت کے سو سو بہانے
وہ اک دوسرے سے یونہیں روٹھ جانا
وہ ترکِ محبت کے الزام دے کر
کسی کا کسی کو ہنسی میں رُلانا

تو ہی مجھ سے کہدے کہ میں کیوں بھول جاؤں

البتہ فرق یہ ہے کہ حسرت کی غزلوں میں وہ خونِ تمنا اور حزن و ملال نہیں جو عرش کی مذکورہ بالا نظم کے خاتمے میں نظر آتا ہے لیکن خونِ تمنا کے بعد جو جھلاہٹ اور زندگی سے بیزاری پیدا ہوتی ہے، وہ عرش کی شاعری میں کہیں نہیں ملتی وہ ہر حال میں ایک شاعر رہتے ہیں جو زندگی کے ہر پہلو کو شاعرانہ لطافت ہی کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہیں۔

اردو میں اس وقت سب سے بڑے نظم گو جوش ملیح آبادی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ عرش اور جوش ملیح آبادی کا موازنہ مقصود نہیں، کیوں کہ جوش ملیح آبادی کی رومانی نظموں میں انسان کے جذبات، حسیات اور کیفیات کی جو نشاط و انبساط اور سرور و لذت سے بھری ہوئی مرقع نگاری ہے، وہ عرش کے یہاں نہیں۔ لیکن ان کی بعض نظمیں جوش ملیح آبادی کی ان نظموں سے معتبر ہیں جو مؤخر الذکر نے الفاظ، تشبیہات اور استعارات کا سہارا لے کر قلمبند کی ہیں۔ عرش کی ایک رومانی نظم "دیہاتی دوشیزہ" ہے۔ اس میں وہ جو کچھ واقعی دیکھتے ہیں، لکھتے چلے جاتے ہیں۔ خواہ مخواہ کی گلکاری بلکہ قلمکاری دکھا کر تصنع، تکلف اور آورد نہیں پیدا کرتے۔ بلکہ اپنی شاعری کے فطری بہاؤ اور رچاؤ سے تاثیر بھی پیدا کرتے جاتے ہیں اور اپنے طرزِ ادا کی سادگی میں بانکپن کا رنگ بھی۔

نہر کے پُل پہ کھڑا میں دیکھتا تھا یہ بہار
میرا دل تھا ایک کیفِ بے خودی سے ہم کنار
دیکھتا کیا ہوں کہ ایک دوشیزہ مجبورِ حجاب
غیرتِ حورانِ جنت پیکرِ حسن و شباب
آ رہی تھی نہر کی جانب ادا سے ناز سے
ہر قدم رکھتا تھا اس کا اک نئے انداز سے
حسن سادہ میں ادا بھی بانکپن کا رنگ بھی
کچھ یونہیں سیکھے ہوئے شرم و حیا کے ڈھنگ بھی
لب پہ سادہ سی ہنسی اور تن پہ سادہ سا لباس
بے حجابی سے بڑھی آتی تھی بے خوف و ہراس
سر بسر نہ آشنا شوخی کے ہر مفہوم سے
کچھ اگر واقف تو واقف شوخیٔ معصوم سے
حسن میں الھڑ طبیعت میں ذرا نادان سی
سادہ لوحی کا مرقع، بے سمجھ، انجان سی

اس مرقع نگاری میں عرش نے تشبیہات اور استعارات کا بھی سہارا لیا ہے لیکن اسی حد تک جتنی ان کی شاعرانہ لطافت گوارا کر سکی ہے۔ ایسی دوشیزہ کے بارے میں کہتے ہیں۔

شمع وہ جس پر شبستانوں کی رونق ہو نثار
کیف وہ جس کے لئے سو میکدے ہوں بے قرار
ناز وہ جس سے ربابِ حسن کی تکمیل ہو
شعر وہ جس سے کتابِ حسن کی تکمیل ہو

ان تشبیہات سے محظوظ کر کے فوراً ہی لکھتے ہیں۔

ایک بازو کے سہارے سے گھڑا تھامے ہوئے
دوسرے سے اوڑھنی کا ایک سرا تھامے ہوئے
نہر پر پہنچی، گھڑا بھر کر ذرا سستا گئی
تھک گئی یا سوچ کر کچھ خود بخود شرما گئی
مجھ کو دیکھا تو جبیں پر ایک بل سا آ گیا
اُف ری شانِ تمکنت میں خوف سے تھرا گیا

یہ نظم اس لئے پسند آنی چاہیے کہ شاعر نے اپنی مناعی دکھانے کی خاطر الفاظ کا کوئی جلوس آراستہ نہیں کیا ہے اور نہ تشبیہات و استعارات کے مینارے کے اوپر مینارے بنا کر اپنی شاعری کا پرچم لہرایا ہے جیسا کہ جوش ملیح آبادی اپنی بعض نظموں میں یہ سب کچھ کر کے اپنے ناظرین اور

سامعین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عرش نے اس نظم کو اسی طرح ختم کیا ہے جس طرح ایک رنگین نوا شاعر کو ختم کرنا چاہئے۔

اے نگیں خاتمِ نسوانیت صد آفریں
اے امینِ جوہرِ انسانیت صد آفریں
آفریں اے گوہرِ یکتائے عصمت آفریں
آفریں اے پیکرِ حسن و محبت آفریں
حسن تیرا گو رہینِ جلوہ سامانی نہیں
گو ترے رخسار پر پوڈر کی تابانی نہیں
تجھ میں شہری عورتوں کی گو نہیں آرائشیں
گو نہیں تجھ کو میسر ظاہری زیبائشیں
پر تو حسنِ حقیقت پھر بھی ترا حسن ہے
مایۂ حسنِ شرافت پھر بھی تیرا حسن ہے
مایۂ عفت ہے تو نسوانیت کی شان ہے
تجھ پہ ہر تقدیس ہر پاکیزگی قربان ہے
جھک نہیں سکتا کسی در پر ترا حسنِ غیور
تو سکھا سکتی ہے دُنیا کی نگاہوں کو شعور
سامنے تیرے عروجِ تختِ شاہی ہیچ ہے
ہیچ ہے تیری نظر میں کجکلاہی ہیچ ہے

عرش اپنی رومانی نظموں میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کرنے کی بھی مہارت رکھتے ہیں جس کی مثالیں ان کی نظموں "بیوہ کی فریاد"، "محبوب کا آخری خط" اور "سہاگن بیوہ" میں ملیں گی۔ جوش ملیح آبادی نے بھی ایک نظم "سہاگن بیوہ" کے عنوان سے لکھی ہے، جس میں انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ ایک عورت جس روز بیاہی گئی۔ اسی روز اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا اور یہ نئی نویلی دلہن چوتھی کا لباس پہنے شوہر کی جلتی ہوئی چتا کے پاس کھڑی ہے۔

عرش ملسیانی کی نظم "سہاگن بیوہ" میں جوش کی نظم کی طرح عمدہ منظر نگاری تو نہیں۔ الفاظ کی دھوم دھام بھی نہیں، درد و غم کا کوئی فلسفہ بھی نہیں۔ لیکن یہ اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ اس میں بہت ہی سادہ طریقہ پر ایک ایسی عورت کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جس کے شوہر نے اس کی موجودگی میں دوسری شادی کرلی ہے۔ اس کو دکھ ہے کہ اس کی وہ دولت لٹ چکی جس پر وہ اتراتی رہی۔ وہ کسی کے ہوچکے جن کو وہ اپناتی رہی، اس کی نوجوانی، اندوہ جوانی ہوچکی۔ اب اس کی مانگ کا سیندور سوزِ مجبوری کی آگ ہے۔ وہ شوہر کو اپنے گلستاں کی بہار، محبت کا دھن، زندگی کا پاس دار سمجھ کر رت جگے، ارمانوں کے طوفان، پہلی رات کے عہد و پیمان اور روٹھے ہوئے دل کی اداؤں کو یاد کرتی ہے اور شوہر رکھنے کے باوجود اپنے کو اس کے باغِ محبت کی بہاروں اور عشرت کے نظاروں سے محروم پاتی ہے۔ اسی لئے اپنے کو سہاگن بیوہ کہتی ہے۔ ان جذبات کو پیش کرنے میں شاعر نے کوئی شاعرانہ تکلف اور تصنع کو راہ نہیں دی ہے بلکہ ہندوستانی ماحول کی زندگی میں جو ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، ان کی صحیح تصویر کھینچ دی ہے۔ یہی اس کی جان ہے اور یہی اس نظم کو قابلِ پسند بناتی ہے۔

عرش کی نظموں میں "ریڈیو پر گانے والی"، "مغنیہ" اور "رقاصہ" وغیرہ تفریحی نظمیں ہیں جو شاعر نے اپنی جوانی دیوانی میں لکھی ہیں۔ ان میں بعض اشعار اور مصرعے ایسے ہیں جو معلوم نہیں محض دل لگی میں کہے گئے ہیں یا وہ دل کی لگی ہیں۔ مثلاً "دیہاتی دوشیزہ" کا آخری شعر یہ ہے۔

جا! مگر مڑ کر مرے اس دل کی بربادی کو دیکھ
مری مجبوری کو دیکھ اور اپنی آزادی کو دیکھ

"ریڈیو پر گانے والی" کے آخری شعر میں کہتے ہیں۔

مرے خیال کی دنیا میں ہے مقام ترا
پیامِ دید ہے میرے لئے کلام ترا

"مغنیہ" میں کہتے ہیں۔

ع جادو سے مری حسرتِ مردہ کو جلا دے
ع مرتا ہوں میں تیرے لئے جینے کی دعا دے
ع پھر دل میں مرے پریم کی اک آگ لگا دے

ایسے اشعار ایک شاعر بعض اوقات بے قابو ہو کر تفریحاً لکھ جاتا ہے جن کا تعلق حقیقت اور واقعیت سے کم ہوتا ہے۔ کیوں کہ شاعر حسن کی جلوہ سامانیوں، حسینوں کے دلبرانہ عشووں اور دلربایانہ اداؤں سے متاثر ہونے کا حق رکھتا ہے لیکن جس طرح اگلے شعراء کے بعض اشعار سے موجودہ دور کے سوانح نگار اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ میر کے سینے میں کوئی دل بلا کرتا تھا۔ مومن کی زندگی کی پردہ دری ایک پردہ نشین کے عشق

ہیں مرنے سے ہوئی۔ غالب کا دم ایک کافر صنم پر نکلا کرتا تھا، اور اسی کے تصور سے ان میں رعنائی خیال پیدا ہوئی تھی۔ اسی طرح ڈر ہے کہ آگے چل کر عرش کے سوانح نگار بھی ان کے بعض اشعار سے اسی قسم کی غلط فہمی نہ پھیلا دیں۔

عرش کی نظموں میں "درویش کی دنیا" "بازمانہ ساز" "کالج کے لڑکے" وغیرہ اخلاقی نظمیں ہیں۔ وہ اقرار خودی کے قائل ہیں جس کے بعد مقدر کی سیاہی خود بخود جاتی رہتی ہے۔ وہ پُر فریب، خوش نظری، خیال کے فرضی بتوں کی عشوہ گری کے قائل نہیں بلکہ ہر انسان کو خود نگری کا رہرو رہا ہونے کی تلقین اپنی نظم "بازمانہ ساز" میں کرتے ہیں۔

عرش نے سیاست اور حالات حاضرہ پر نظمیں کہہ کر اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ صرف شاعر کی ماورائی اور تخیلی دنیا ہی میں رہنا پسند نہیں کرتے، بلکہ جس دُنیا اور ماحول میں رہتے ہیں، اس کے واقعات سے لامحالہ متاثر ہوتے ہیں۔ رشوت کا بازار ہیں ان کا دل رویا ہے کہ یہ رشوت لینے والے پیلے کالے ناگ ہیں جو ہر طرف پھن پھیلائے پھرتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے دیش کی قسمت پھوٹ گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کے واقعات پر انھوں نے جو مسدس کہی ہے اس میں حالی کے رنگ کے ساتھ ان ہی کا درد دل اور سوز دل غالب ہے۔ جنگ کوریا پر ان کی نظم صفی لکھنوی کی یاد تازہ کرتی ہے "ایشیا کو چھوڑ دو" میں ایشیا والوں کے جذبات کی بڑی صحیح ترجمانی ہے۔ یورپ اور امریکہ دونوں مل کر ایشیا کو جس طرح اپنے تیر سیاست کا نخچیر بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی سچی تصویر اس نظم میں نظر آتی ہے۔ یہ مختصر ہے ذرا اور طویل ہوتی تو اس میں ایشیا والوں کے دلوں کی تیز دھڑکنیں اور بھی زیادہ تیز سنائی دیتیں۔ کیسی حقیقت بیان کی گئی ہے ؎

بن کے تاجر حرص کا دامن بہت پھیلا چکے
تیل بھی تم پی چکے اور کوئلہ بھی کھا چکے
کوئلہ کھا کھا کے ہم پر آگ بھی برسا چکے
اب تو گھر کی راہ لو چھوڑو یہ جنگ زرگری۔ ایشیا کی رہبری
لوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو۔ ایشیا کو چھوڑ دو

عرش کا اپنا بیان ہے کہ انہوں نے عظمت اولاد آدم اور انسان کی عام محبت کو اپنا یا ہے اور وہ امن کش فساد انگیزیوں اور جنگ آفرینیوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ "جہل کی رات" "کم ظرف دنیا" "غم ماحول" "اشتباہ" "اشرف المخلوق" جیسی فکری نظموں میں ان کے ان ہی خیالات کی لہریں موجزن ہیں۔ ان کو دکھ ہے کہ عقل کی صبح ابھی نمودار نہیں ہوئی ہے، جہل کی رات ابھی باقی ہے، انسانی ذہن میں ابھی فرسودہ خیالات ہیں۔ دہر کی گردن میں طوق روایات ہیں، انسان کی راہ میں وہم کے لاکھوں مقامات ہیں۔ خندۂ دلکش اور گلدستہ رنگین کے بجائے خنجر و تیغ سے مدارات ہوتی ہے۔ امن کے نام پر فسادات ہوتے ہیں۔ وہ معاشرت کے پرانے بت کو ضرور توڑ دینا چاہتے ہیں اور قدامت کے فرسودہ نظام کو بھی پسند نہیں کرتے لیکن روایت کے اسیر نہ ہونے کے باوجود اُن کی شاعری میں روایت کے عناصر مفقود بھی نہیں۔ ان کو خود اس کا اعتراف ہے کہ وہ روایت کے باعظمت پہلوؤں کے قائل ہیں۔

انھوں نے اپنے مسلمان ہموطنوں سے خیرسگالی کا جذبہ دکھانے کی خاطر اُن کے رسول کے لئے ویسی ہی نعتیں کہی ہیں جیسے کہ ایک مسلمان شاعر کہا کرتا ہے۔ کون مسلمان ہے جو ان کے ان پر کیف نعتیہ اشعار کی داد دل کھول کر نہ دیگا۔

تیرے عمل کے درس سے گرم ہے خون ہر بشر
حسن نمود زندگی، رنگ رخ حیات تو
شان بشر کا منتہا خالق دہر کا حبیب
مرد خدا پرست کا آئینۂ حیات تو

آخر میں کہتے ہیں۔

مدح سرائے مصطفٰے ہے تو عمل بھی چاہیئے
عرش جو ہو سکے تو ہو عزم میں پر ثبات تو

عرش کی ایک نعت اس ردیف اور قافیہ میں بھی ہے، جو مجلس سماع میں عام طور پر قوال امیر خسرو کی نعت کہہ کر گاتے ہیں اور سامعین کو مست کر دیتے ہیں۔ ان کی نعت کے دو چار شعر آپ بھی سن لیں

زباں افسانۂ دل بود شب جائے کہ من بودم
نظر نظارہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
نہ محفل دیدم و نے محفل آرائے دگر دیدم
اماں یک جان محفل بود شب جائے کہ من بودم
امید راحت عقبٰے فراغت از غم دنیا
مرا ہر لطف حاصل بود شب جائے کہ من بودم

(بقیہ صلا پر)

کرشن موہن



غزل

گھر بھر میں گونجتی ہیں تری شوخ گالیاں
مچلی ہوئی جوانی بجاتی ہے تالیاں !
ہے ایسے میرے دِل پہ تمناؤں کا ہجوم
نوشہ کو جیسے گھیر لیں البیلی سالیاں
بچپن کے رات دن تھے کیا رونق آفریں
وہ بامزہ شرارتیں، وہ گوشمالیاں
رقصاں ہیں دِل کی محفلِ رنگیں میں رات دن
کجرارے کارے، کارے حسیں نینوں والیاں
جیون کا رس بھی اِن میں ہے جوبن کا حس بھی ہے
یہ ہونٹ، انگبیں کی دلاویز، پیالیاں
یوں تیری نرم پلکیں ہیں آنکھوں پہ سایہ ریز
جیسے جھکی ہوں جھرنوں پہ سرسبز ڈالیاں
میری نگاہیں، تیرے حجاب وحیا کے طور
کرنوں کی تاک جھانک اور پتوں کی جالیاں
اپنی حیاتِ شوق میں، گھر کے سکون میں
ہنگامہ زا رہی ہیں تری بے خیالیاں
ہوگا طلوع کب مرا سورج، مرا سجن
بیری برہ کی بدلیاں چھائی ہیں کالیاں

چار مختصر نظمیں

تجدید

چڑھتا سورج، چمپئی کرنوں کی چھیڑ
اے محبت کی تڑپ
منجمد احساس کے بخیئے اُدھیڑ
زندگی تجدید ہے
جیسے صبحِ نو بہار
مسکرائے، لہلہائے، جھوم اُٹھے کوئی پیڑ

قلندر

ہر انسان کے من کے اندر
بیٹھا ہے اک چپلا بندر
لطف تو جب ہے
اِسکو ایماؤں پہ نچائے
من بن جائے ایک قلندر

قافیہ

میں نے سوچا کچھ اور سوچا کیا کروں
ہوگیا مجروح احساسِ لطیف
قافیے نے آدبوچا کیا کروں

لاشعور

شعور کے بحر میں جو ہیں لاشعور کے ان گنت جزیرے
سکون و آہنگ کے ذخیرے
یہ بستیاں شوخ آرزوؤں کی، یہ جہاں ننگے باسیوں کا
علاجِ تہذیبِ نو کی ذہنی اُداسیوں کا۔

حامدی کاشمیری



نملی

کمرے کی کھڑکی سے صبح کی تازہ دھوپ اندر آکر سفید دیوار پر تھرتھرا رہی تھی اور میں بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے، ٹانگوں پر رضائی اوڑھے سگریٹ پی رہا تھا۔ کمرہ آج خالی خالی سا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا بیڈ خالی تھا۔ دیواریں ننگی تھیں۔ کل شام تک یہ کمرہ کتنا بھرا بھرا سا تھا۔ چیزوں سے اٹا ہوا۔ کچھ چیزیں قرینے سے تھیں اور کچھ بکھری بکھری سی۔ میلے کپڑے، صاف کپڑے، جوتے، سینڈل، ہینڈ بیگ، کھلونے، ربڑ کی ایک بڑی گڑیا، بسکٹ کے ڈبے، کریم کی خالی شیشیاں، کاغذ کے پرزے، چھوٹا سا رنگین چھاتا، ربڑ کے بال، ابھی ابھی چیزوں کو سنبھال کر قرینے سے رکھا جاتا اور ابھی مسعود ایک ڈھیر سا لگا دیتا۔ ہر چیز کو اپنی جگہ سے ہٹاتا، تہس نہس کرتا، کمرے کو کباڑ خانہ بناتا اور پھر ممی کی ڈانٹ کھاتا۔ ڈانٹ کھا کر یا تو غصے میں چیزوں کو اور زیادہ الٹ پلٹ کرتا، یا چپکے سے کمرے سے باہر نکلتا اور نملی کے پاس جاتا اور ہم دونوں پھر کمرے کی تزئین میں لگ جاتے۔ لیکن آج سارا کمرہ لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی ویرانی کا احساس میرے دل کو کچوکے لگاتا رہا اور میں تیز تیز سگریٹ پیتا رہا۔

بیوی بچوں کے بغیر انسان کی زندگی کتنی اجاڑ اور بے معنی سی معلوم ہوتی ہے، آج کی صبح کتنی بے رنگ اور پھیکی پھیکی سی تھی، اور مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے وطن سے دور ہوں، اپنے گھر سے دور۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

میں دستک کو فوراً پہچان گیا، یہ نملی تھی۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ میں چپ رہا۔ لیکن وہ برابر دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ آخر تنگ آکر میں نے روکھے سے لہجے میں کہا، انجان بن کر۔

"کون ہو؟"

"میں ہوں نملی کھولو درواجا ماشود" نملی کی آواز بند دروازے کو چیر کر آرہی تھی،

"مسعود یہاں نہیں ہے —" میں نے بستر میں بیٹھے بیٹھے ہی جواب دیا۔

"ہاں ماشود ہے، کھولو درواجا، وہ نیچے لی ہے —" نملی ضد کر رہی تھی، یہ اس کی عادت تھی اور میں بے چینی اور

جھنجلاہٹ سی محسوس کرنے لگا۔ میں نے زور سے کہا۔

" نملی تم چلی جاؤ، مسعود کل گھر گیا ہے۔ ممی کے ساتھ۔"

" ماشود نی گیا، ماشود اپنا گھر میں ہے۔ ماشود کھولو دروا جا —"

نملی زور سے چیخ رہی تھی اور ساتھ ہی وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ میں اس کی ضد سے واقف تھا۔ روز صبح ہوتے ہی جب کہ ابھی ہم بستر ہی پر پڑے ہوتے، وہ آکر دروازہ کھٹکھٹاتی اور اس وقت تک برابر کھٹکھٹاتی جب تک میں بستر سے نکل کر دروازہ نہ کھولتا اور اگر مسعود کی آنکھ بھی تکرار اور سوال و جواب میں کھل جاتی تو پلکوں پر نیند کے بوجھ کے باوجود وہ نملی کا ساتھ دیتا دروازہ نہ کھولنے پر احتجاج کرتا اور مجھے دروازہ کھولنے میں مزید تامل کی گنجائش نہ رہتی، میں دروازہ کھول دیتا۔ اور نملی سیدھے مسعود کے بیڈ پر آجاتی اور وہ دونوں بہت شور مچاتے۔ ایک دوسرے کو گلے لگاتے —

" آہا ماشود!"

" نملی، نملی !!"

مسعود فوراً ممی سے بسکٹوں کا روز مرہ کا کوٹا حاصل کرتا اور نملی کے ساتھ مل کر کھاتا اور پھر دونوں کھیل میں مصروف ہو جاتے، شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے۔ یہ اُن کا روز مرہ کا معمول تھا اور نملی دو مہینوں سے ہمارے کمرے میں آرہی تھی اور ——

میں نے بستر سے نکل کر دروازہ کھول دیا۔

اور نملی ایک نئے پھول دار فراک میں دھلے ہوئے منہ کے ساتھ کمرے کے اندر آئی۔ تالی بجاتی ہوئی۔

وہ سیدھے دیوار کے ساتھ لگے بیڈ کی طرف گئی۔ لیکن چند قدم آگے جاکر رک گئی۔

" کہاں ہے ماشود —؟ وہ کمرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

" میں نے کہا نا، مسعود گھر گیا ہے۔ ممی کے ساتھ — وہ کل گیا!"

" نی نی یہ ماشود کا اپنا گھر ہے — وہ کہاں ہے؟" وہ احتجاج کرنے لگی۔ اور میں نے ٹیبل سے ٹوتھ پیسٹ اٹھایا اور برش پر پھیلانے لگا،

" ہاں ہاں! اچانک وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ تم نی کہتا وہ باتھ روم میں ہے — ہمارا ماشود —!" اور یہ کہہ کر وہ کمرے سے ملحق باتھ رُوم کے بند دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے لگی۔

" وہ باتھ روم میں نہیں ہے — لو، میں دروازہ کھولتا ہوں۔"

دروازہ کھل گیا۔ اور وہ بے تحاشا اندر چلی گئی،

میں اس کے ساتھ ہی کھڑا دانتوں پر برش پھیر رہا تھا۔

وہ پل بھر تک باتھ روم کو دیکھتی رہی۔ اس کا چھوٹا سا گول مٹول چہرہ اداس ہوگیا۔ اور وہ بڑبڑانے لگی۔

" ماشود نی ہے، وہ کہاں ہے؟" وہ مڑی، کمرے پر ایک اور نظر ڈال کر وہ کچھ سوچتی رہی۔ اچانک اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اور خوشی سے پکار اٹھی،

" ہاں ہاں ماشود نیچے ہے — ابھی لاتی ہوں —" یہ کہہ کر وہ ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

میں نے دروازہ بند کیا۔ اور باتھ روم میں داخل ہوا۔

میں ڈائننگ روم میں ٹیبل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ تنہا تنہا چپ چپ۔ مقبول نے چائے کا سامان لگایا تھا۔ اور اب وہ کچن میں مصروف تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ ٹیبل پر آج دوسری پیالیاں اوندھے منہ رکابیوں پر پڑی تھیں میں نے جلدی سے پہلا کپ خالی کیا اور دوسرا کپ بنانے لگا۔ آج چائے پینے میں کوئی لطف نہیں آرہا تھا۔ آج پیالی میں بیوی چینی نہیں ڈال رہی تھی اور نہ ہی چمچے سے چینی گھول رہی تھی۔ مسعود بھی وہاں نہ تھا۔ اور نہ ہی مسعود کے بغل میں نملی بیٹھی تھی۔ سارے ہنگامے خاموش ہو چکے تھے۔ مجھے پھر ایک بار شدت سے اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ اگر میں کل ان کے ساتھ ہی گھر روانہ ہوگیا ہوتا۔ تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن — لیکن مجھے انشورنس کا کافی کام کرنا تھا اور اس مہینہ میں تمام امور کو طے کرنا چاہتا تھا۔ تین مہینوں کے اس وقفہ میں دفتری امور سے نمٹنے کے علاوہ میں نے مسعود کو دلی کے ایک معروف چائلڈ سپیشلسٹ کو دکھایا تھا۔ اور اس کا باقاعدہ علاج کرایا تھا۔ ڈاکٹر ورما نے مسعود کے علاج معالجے میں ہمدردی اور شفقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہمارے شہر کے ہسپتال کے ڈاکٹروں کی رعونت سے اگر مریض کی حالت اور زیادہ خراب ہوتی ہے۔ تو تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ڈاکٹر ورما کتنی توجہ سے اس کا معائنہ کرتے رہے — پچھلے سال مارچ — ہاں مارچ کا

مہینہ ہی تو تھا۔ وہ بیمار پڑا۔ اور معمولی سے زکام نے رات کو دمہ کی شکل اختیار کی۔ اور ساری رات اس کا سینہ دھونکنی کی طرح ہلتا رہا کچھ دیر تک وہ میری گود میں رہا۔ اور اس کے سینے کے ہلنے سے میرا سارا جسم ہل رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے سارا مکان ہل رہا ہے۔ کتنی طویل رات تھی۔ پہاڑ کی طرح بھاری۔ نامعلوم اندیشے مجھے پریشان کر رہے تھے۔ اور صبح کی نرم روشنی میں جب لان میں شاخوں نے انگڑائی لی۔ اور غنچوں نے آنکھیں کھولیں تو اُسے قرار آیا۔ اور وہ گہری نیند سو گیا۔ اور پھر، بیماری کا یہ حملہ ہر مہینہ ہوتا رہا۔ اور ڈاکٹروں نے دوائیں کھلا کھلا کر اس کی قوت مدافعت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ ڈاکٹری علاج بھی کتنا INEXAET ہوتا ہے۔ ہر ڈاکٹر اپنی سمجھ اور علم کے مطابق نسخہ لکھ مارتا ہے۔ اور دو ڈاکٹروں کے ایرو نیچ میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ مولیئر نے اپنے کسی ڈرامے میں خوب لکھا ہے کہ انسان کی سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ وہ انسان کا علاج کرتا ہے۔

مقبول آیا۔

"صاب شام کے ٹیم پر گوشت پکانا ہے؟"

"جو تمہاری مرضی ——" میں ٹیبل سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ کچن سے ملحق دروازہ کھل گیا اور نملی دوڑتی ہوئی اندر آئی۔ وہ سیدھی میرے سامنے آئی اور پوچھنے لگی۔

"ماشود کہاں ہے؟ —— یہاں نی ہے، اوپر نی ہے۔ باغ میں نی ہے گیتا کے پاس لی ہے —— وہ کہاں گیا؟"

میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اس کی ابھرے ابھرے پپوٹوں میں پھنسی ہوئی گول گول چھوٹی چھوٹی آنکھیں بے چینی سے پھر رہی تھیں۔ اس کے غبارے کی طرح پھولے ہوئے چھوٹے سے گول سانولے چہرے پر تردد تھا۔ جیسے اسے اب گمان ہو رہا تھا کہ مسعود چلا گیا ہے —— بیچاری کو اپنے دوست کی جدائی شاق گزر رہی ہے۔ مسعود اطلاع دیئے بغیر نامعلوم طریقے پر وہاں سے چلدیا تھا۔ اور نملی کا چھوٹا سا ذہن پریشان تھا۔ یہ مسعود صبح سویرے پر لگا کر کہاں اڑ گیا؟ اُسکی یہ پریشانی اور اضطراب دیکھ کر مجھے اپنے غم کا احساس تیز ہوا۔ نملی تھوڑی دیر کے بعد گیتا اور دوسری ہمجولیوں کے ساتھ کھیلنے میں لگ جائے گی اور مسعود کو بھول جائے گی۔ میں نے اسے پھر سمجھایا۔ لیکن وہ مجھے ساکت آنکھوں کے ساتھ تکتی رہی۔

مقبول ٹیبل صاف کر رہا تھا۔

اور میں اوپر کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے کے لئے سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔

میں شام کو واپس لوٹا۔ تھکا تھکا سا، آج مجھے کام کے سلسلہ میں ہیڈ آفس جانا پڑا تھا۔ چائے میں نے دفتر ہی میں پی لی تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی میں بستر پر لیٹ گیا۔ اتنے میں نملی آگئی۔

"ماشود آیا؟" وہ بڑی بے تکلفی سے میرے سرہانے کے قریب آئی اور لمحہ بھر کے بعد اس کی نظر تپائی پر پڑی جس پر میں نے بازار سے خریدا ہوا ٹوتھ پیسٹ، صابون کی ایک ٹکیہ اور بلیڈ کا ایک پیکٹ رکھا تھا۔ وہ ان چیزوں کو الٹنے پلٹنے لگی۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب کو کور سے نکالا۔ کچھ سوچ کر اس نے اُسے تپائی پر رکھ دیا۔ اور بلیڈ کے پیکٹ کو کھولنے کی سعی کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"تم اچھا چیزیں لاتا ہے، ماشود کے لئے لاتا ہے نا، ہمالا پاپا لی لاتا، ممی لاتا ہے۔ ممی بہت اچھا ہے۔ ہمارے کو مارتا نہیں۔ پاپا مارتا ہے۔ تم ماشود کو نی مارتا۔ ماشود ہمالا ہے ——"

نملی —— نملی ——!" اتنے میں باہر سیڑھی سے نملی کی آیا کی آواز آئی۔ وہ دروازے پر آ کر رک گئی۔ آٹھ نو سال کی لڑکی، سیاہ فام، سیاہ چشم، ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس۔

"آؤ نملی پاپا بلاتے ہیں ——" آیا کی برچھی کی طرح تیز آواز سنتے ہی نملی کچھ کہے بغیر، مجھ پر ایک گہری سی نظر ڈال کر اس کے پیچھے ہولی۔

میں نملی کے پاپا کے بارے میں سوچنے لگا۔ مسٹر ریش۔ ان سے ہماری صرف ایک یا دو بار ہی ملاقات ہوئی تھی، وہ ریلوے میں ملازم تھے، اور زیادہ تر عدیم الفرصت ہی رہتے تھے۔ لمبے تڑنگے انسان، بند گلو کا شارٹ کوٹ پہنے، لمبی سی متحرک گردن، جس پر چھوٹا سا گول چہرہ یوں دکھائی دیتا، جیسے اس پر چپکا دیا گیا ہو۔ ان کی گول آنکھیں ان کے موٹے عینک میں ہمیشہ چھپی رہتیں۔ میرا مشاہدہ تھا کہ وہ ہم سے زیادہ ملنے جلنے کے روادار نہ تھے۔ ہم سے ملنے کے لئے انھیں کئی دیواروں کو پھاندنا تھا۔ مذہب،

رنگ، زبان اور اجنبیت کی دیواریں۔ اور ایسا کرنے کے لئے شاید ان کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ مسز رمیش البتہ کبھی کبھی ہمارے پاس آتی۔ اکہرے بدن کی ایک لمبے قد کی عورت، لمبی لمبی آنکھوں میں کالی راتوں کا جاگتا ہوا حسن لئے ہوئے۔ وہ پتلی پتلی باتیں کرتی۔ مدھم مدھم خوابناک لہجے میں، اس کا سانولا رنگ نیلے یا سفید رنگ کی ساڑھی میں نکھر اٹھتا۔ سانولے رنگ کی خوبرو عورت ——

صبح کو میں ابھی بستر ہی میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

میں فوراً پہچان گیا۔ یہ نملی ہے۔

"کھولو دروا جا، ماشود، میں نملی ہوں ——" وہ زور زور سے کہہ رہی تھی میں چپ چاپ لیٹا رہا۔ مجھے اکتاہٹ سی ہوئی۔ یہ بچے بعض اوقات مصیبت بن جاتے ہیں۔

نملی دروازہ بجاتی رہی۔

میں چپ سادھے لیٹا رہا۔

"نملی ——!" دفعتاً مسز رمیش کی آواز میرے کانوں تک آئی۔ وہ اوپر ہی آ رہی تھی۔

میں نے جھٹ رضائی پرے پھینک دی۔ اور پاؤں میں چپل پہن کر دروازے کی طرف لپکا اور فوراً چٹخنی کھولی۔

نملی دوڑ کر اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں امرود تھا۔

"یہ ماشود کے لئے ہے۔ بٹی لایا ہے۔ ماشود کہاں ہے؟" وہ پاگل کی طرح کمرے میں دیکھتی رہی۔ اور باہر مسز رمیش کی آواز نزدیک آ رہی تھی۔

"نملی، دیکھو ماشود یہاں نہیں ہے ——" میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وہ مجھے کریدتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تمہاری ممی بلاتی ہے نملی۔ دیکھو وہ آ رہی ہے ——"

"نی، وہ باجار گیا ہے"

مسز رمیش دروازے پر آ کر رک گئیں۔ انہوں نے نملی کو ڈانٹا

"نملی چلو پاپا بلاتے ہیں۔ فوراً انہیں وہاں میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اور اس نے مسکرا کر آداب کہا۔ اسکی مسکراہٹ بناوٹی تھی۔ نملی اس کے ساتھ گئی اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔

نملی تیسرے دن بھی صبح سویرے آئی۔

وہ چوتھے دن بھی آئی۔

اور برابر آٹھ دن تک آتی رہی۔

اس کے بعد وہ نہیں آئی۔ میں آفیشل ورک میں جٹا رہا۔ دن رات تیزی سے گزرتے رہے۔ اور دیکھتے دیکھتے پچیس دن بیت گئے

ایک رات خاصی گرمی پڑ رہی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور میں غیر ارادی طور پر نملی اور مسعود کے بارے میں سوچتا رہا۔ نملی صبح سویرے دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور زور زور سے پکارتی ہے۔

ماشود کھولو دروا جا، میں نملی ہوں" اور پھر وہ اندر آ جاتی ہے اور مسعود پلکوں پر نیند کا اڑتا ہوا غبار لے کر اس کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھتا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو گلے لگاتے ہیں۔

"آہا ماشود!"

نملی، نملی!"

اور دونوں ننھے ننھے ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہیں۔

مسعود اُسے بسکٹ کھلاتا ہے۔ اور نملی کبھی پکے ٹماٹر یا کبھی امرود لے آتی ہے اور دونوں مزے سے کھاتے ہیں۔

—— وہ دونوں مسعود کے پلنگ پر، جس پر مسعود کا بستر بچھا ہوا ہے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور نملی مسعود کو کہتی ہے: "ماشود، ہمالا ممی ٹرے سیکل لائے گا، ہم تم کو دے گا ماشود ——" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنستی ہے۔ اور مسعود کہتا ہے: "ہمارے گھر میں، ادھر ٹرے سیکل ہے۔ وہ میں چلاتا ہوں، وہ ٹیلر ٹرے سیکل ہے، سبھی کو بٹھاتا ہوں —— ٹی ٹی —— ٹی ٹی ——" وہ جیسے سچ مچ ٹرے سیکل چلانے لگتا ہے۔

"ہم کو نی بٹھاتا ماشود؟" نملی روٹھتی ہے۔

"ہاں، ہم کو بٹھائے گا ——" اور نملی خوش ہو کر تالی بجاتی ہے۔

وہ دونوں ہنس پڑتے ہیں۔ اور شور مچاتے ہیں۔

اتنے میں نملی کی نظر مسعود کی چھوٹی سرخ رنگ کے شنیل کی رضائی پر پڑتی ہے۔

"یہ کس کا ہے ماشود؟"

مسعود ٹکر ٹکر اُسے دیکھتا ہے۔

"یہ ماشود کا نی ہے"

"کس کا ہے ؟"

"یہ راج کمار کا ہے، تم راجکمار ہے ماشود، گورا گورا ـــــ اور میں مہارانی ہوں ـــــ" "تم مہارانی!" مسعود خوش ہو کے کہتا ہے، "اور میں راج کمار!"

دونوں قہقہے لگاتے ہیں۔

اور میں بیوی کی طرف دیکھتا ہوں۔ ہم دونوں مسکرا کے رہ جاتے ہیں ـــــ نملی مسعود سے روٹھی ہوئی ہے۔ مسعود کے ہاتھ میں دو ٹافیاں ہیں نملی ٹافی لینے سے انکار کرتی ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی۔ صرف سر ہلاتی ہے۔ انکار میں، مسعود روہانسا ہو گیا ہے۔ مجبور ہو کر اس نے مجھ سے رجوع کیا ہے

"ڈیڈی، نملی ٹافی نہیں کھاتی ـــــ"

"کیوں نہیں کھاتی، نملی لو نا ٹافی، مسعود نے تمہارے لئے رکھی ہے"

"ہم نی لے گا۔" وہ مسعود کی طرف پیٹھ کر کے بولتی ہے۔

"کیوں؟" میری دلچسپی بڑھ گئی ہے۔

"ماشود گیتا سے کھیلتا ہے"

مسعود تعجب سے کبھی نملی کو دیکھتا ہے اور کبھی مجھ کو،

"ہاں کھیلتا تو ہے"

"لیکن ہم نے گیتا کو گھر سے نکال دیا ـــــ"

"کیوں؟"

"اس نے ہمالا گڑیا چوری کیا"

"اچھا!"

"ہاں، وہ چور ہے ـــــ"

"چور ـــــ گیتا چور ہے ـــــ" مسعود پکار اٹھتا ہے۔ اور نملی اس کے ہاتھ سے ٹافی چھین کر منہ میں رکھ لیتی ہے۔

ـــــ اتوار کو مسعود نملی کے گھر سے بھاگ آتا ہے اور سیدھے میری گود میں آ بیٹھتا ہے۔ اس کا چہرہ اترا ہوا ہے۔

"کیوں بیٹے کیا بات ہے؟"

"ڈیڈی، میں مسعود ہوں نا؟"

"ہاں تو اس میں کیا شک ہے؟"

"لیکن نملی کا پاپا ہے نا؟"

"ہاں ہے تو ـــــ"

"وہ کہتا ہے۔ تمہارا مذہب دوسرا ہے"

"اچھا تو تم نے کیا کہا۔؟"

"میں نے کہا مذہب کیا ہوتا ہے؟ میں تو مسعود ہوں۔"

"تم نے ٹھیک کہا بیٹے۔"

"نملی نے بھی کہا ـــــ"

"کیا کہا؟"

"اس نے کہا، کہ مذہب کیا ہوتا ہے؟ یہ ہمالا ماشود ہے ـــــ"

سوموار کو میری بیوی اور مسعود آ رہے تھے مجھے آج ہی ان کا خط ملا تھا۔ بیوی نے لکھا تھا کہ مسعود کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اُسے بھوک بھی لگتی ہے۔ نملی کو وہ اب بھول چکا تھا۔ گھر پہنچنے کے پہلے دو تین دنوں تک وہ نملی کو بہت یاد کرتا رہا۔ صبح شام نملی کا ذکر، اُسے گیتا بھی یاد آتی رہی۔ لیکن اب وہ دلی کے سب دوستوں کو بھول چکا تھا ـــــ ادھر نملی بھی اب اسے بھول چکی تھی۔ وہ بھول کر بھی اب ہمارے فلیٹ میں نہ آتی۔ اور نہ ہی اس دوران میں نے مسز رمیش کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ بٹی بھی غائب تھی۔ یہ لوگ کہاں تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔

میں رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ مقبول نے سبزی خوب پکائی تھی وہ میرے سامنے ہی کھڑا تھا۔

"مقبول!"

"ہاں جی ـــــ"

"یہ نملی کہاں غائب ہو گئی۔ نظر ہی نہیں آتی۔"

"پتہ نہیں صاب"

"مسز رمیش کہاں ہے؟"

"گھر میں ہے"

"لیکن ـــــ"

"اُن کے گھر میں ڈاکٹر آیا تھا ـــــ"

"کب؟"

"آج شام کو، کل بھی میں نے دیکھا تھا۔ ان کے کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا تھا۔"

"پتہ نہیں کون بیمار ہے؟ شاید مسز رمیش ـــــ"

"وہ تو بھلی چنگی ہے۔"
"ممکن ہے مسٹر مینش ناٹھیک ہوں۔"
"میرا بھی یہی خیال ہے۔"
"لیکن انہوں نے ہم سے کہا تک نہیں۔"
"یہ نہیں کہتے، مسٹر مینش نے منع کیا ہے، بٹی کہتی تھی۔ پاپا بہت ڈانٹتے ہیں سبھوں کو، نملی کو زور سے پیٹا ہمارے یہاں آنے پر ——"
"عجیب آدمی ہیں وہ تو ——"
"مسز مینش بھی اسی لئے ہمارے پاس نہیں آتی۔ ڈرتی ہے بیچاری ——"
"اچھا تو یہ بات ہے، خیر چھوڑو۔ وہ نہیں آتے ہیں تو نہ سہی۔"
میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کیا۔ اور سنک میں ہاتھ صاف کرنے کے لئے کھڑا ہوا۔
مقبول نے آج میرے کمرے کی خوب صفائی کی تھی۔ چیزوں کو ٹھیک سے رکھا تھا۔ میں سات بجے کے قریب آیا تھا اور کمرے کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ کوٹ میں نے ہینگر پر ٹانگ دیا تھا۔ اور آج کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔
میں نے جھٹ سے دروازہ کھولا۔
سامنے مسز مینش تھی میلی سی ساڑی میں ملبوس، بال اُلجھے اُلجھے سے، اترے ہوئے چہرے پر رات کی تاریکی۔ اور آنکھوں میں لرزتے آنسو۔
"آپ؟ خیریت تو ہے؟"
"نملی بیمار ہے ——"
"نملی بیمار ہے۔؟ کب بیمار ہوئی ——"
"وہ دس بارہ دن سے بیمار ہے، اور آج —— وہ ——"
"لیکن آپ رو کیوں رہی ہیں۔؟"
"وہ بے ہوش ہو گئی ——"
"بے ہوش ہو گئی ہے ——" "ڈاکٹر کو نہیں بلایا؟"
"گھر میں کوئی نہیں؟"
میں نے مسز مینش کے ساتھ نیچے ان کے کمرے میں دوڑتا ہوا آیا۔ نملی پلنگ پر پڑی تھی۔ آنکھیں بند کئے ہوئے۔ وہ گلے تک ایک سفید چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ اُف ——! یہ نملی کی کیا حالت ہو گئی تھی! اسکی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ دائرے تھے۔ بجلی کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بے حد پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ صرف اندر کے دروازے سے بٹی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔
"نملی —— نملی دیکھو بیٹا نملی ——" وہ اب بھی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض تیز چل رہی تھی۔
"اچھا میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں ——"
ڈاکٹر نے نملی کو فوری دوائیں دینے کو کہا۔ اسے ایک انجکشن لگوایا۔ اور تب کہیں اس نے پلکیں کھولیں۔ مجھے اپنے سرہانے دیکھ کر اس نے میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اور برابر پلکیں جھپکاتی رہی۔
"نملی نملی، دیکھو بیٹا ——" میں اسے پیار سے کہتا رہا۔
نملی نے آنکھیں کھولیں۔ تو مسز مینش اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ اور اس نے نملی کے تپتے ماتھے کو چوما۔ بٹی کی سسکیاں بند ہوتیں۔
اور نملی کے پپڑی جمے سیاہ ہونٹوں پر ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی
وہ ہڈیوں کا ایک مختصر سا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔
معاً اس کی بے جان سی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی۔
"ما —— شو —— د آ گیا؟"
"ہاں بیٹی مسعود آ گیا ہے۔" میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔
مجھے دیکھ کر اسے فوراً مسعود کی یاد آ گئی تھی۔
جلد ہی اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ انجکشن اور دوا نے اپنی تاثیر دکھائی۔
ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ نملی ہوش میں آتے ہی سو جائے گی۔
"بھابی کب آ رہی ہیں؟" مسز مینش کے لہجے میں بیچارگی تھی۔
"کل آ رہی ہیں۔"
"اچھا؟ ماشود بھی آ رہا ہے نا؟"
"ہاں ہاں۔ اُسے پھر ڈاکٹری معائنہ کرانا ہے۔"
"نملی ماشود کو بہت یاد کرتی ہے ——" اس کے لہجے میں عجیب مجبوری تھی، ماشود نام اس کی زبان سے اترتا ہی نہیں —— ہم نے کہا وہ گھر گیا ہے۔ تو بہت روتی رہی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پاپا نے بہت ڈانٹ بتائی۔ لیکن یہ روتی

رہی۔ دس بارہ دن پہلے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ صرف ماشود کہتی رہی۔ پاپا نے تھپڑ مارا اور رات کو بخار آیا۔ اور پھر اس رات سے بخار اترتا ہی نہیں ۱۰۲ ڈگری فیور رہتا ہے —"

"اچھا تو یہ بات ہے؟" "مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل رہی ہے۔ اور سارا کمرہ گھوم رہا ہے۔

دوسرے دن میں دس بجے سٹیشن سے بیوی اور مسعود کو لے کر آیا کمرے میں سامان وغیرہ رکھوا کر میں مسعود کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھے نملی کے پاس لے گیا۔ بیوی کمرے میں سامان وغیرہ درست کرنے لگی۔

نملی کے سرہانے مسز رمیش بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں دوا کا چمچہ لئے ہوئے جیسے نملی پینے سے انکار کر رہی تھی۔

"نملی — نملی دیکھو مسعود آگیا ہے —" میں اس کے سرہانے آیا۔

نملی نے میری طرف دیکھا اور پھر مسعود کو دیکھا۔ معاً اس کے سیاہی مائل زرد چہرے پر ایک خفیف چمک سی آئی۔ جیسے راکھ کے ڈھیر میں چند چنگاریاں سلگ اٹھی ہوں۔"

"ما— شو— د آگیا؟" اس کے پپڑی جمے سیاہ ہونٹ تھرتھرائے۔

میں نے مسعود کو اس کے سرہانے کے قریب پلنگ پر بٹھایا۔ مسعود تعجب سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے۔ وہ نملی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ماشود —!" نملی نے اپنے دونوں کمزور اور نحیف ہاتھ اٹھائے۔ اس نے تکیے پر پڑے ہوئے سر کو دائیں بائیں جھٹک دیا۔ جیسے وہ اٹھنا چاہتی تھی۔

"تم لیٹی رہو بیٹی —" میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھ مسعود کی طرف بڑھائے۔ اور مسعود کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"ہمارا ماشود —!" اس کے ننھے سے سیاہ ہونٹ کانپ رہے تھے۔

(بقیہ ص ۲۳ پر)

"اردو نمبر" کے باب میں

اُردو نمبر کئی حیثیتوں سے قابلِ قدر ہے۔ اس میں شاید پہلی دفعہ علاوہ ادب کی رفتار کے زبان کی مقبولیت اور ہمہ گیری کے متعلق بہت کچھ معلومات ملتی ہیں۔ مجھے اُردو صحافت اور اُردو کتابوں کی اشاعت پر مضامین سے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مضمون میں تحقیق کے متعلق معلومات بھی دی ہیں۔ اور تحقیقی کارناموں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ تنقیدی مضامین بھی متوجہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون خیال انگیز ہے مگر آج کل میں مضمون زیادہ مفصل ہونا چاہیئے۔

—— آل احمد سرور

آپ نے پرچے کو اُردو والوں کے لیے بامقصد بنا دیا ہے۔ ابھی سارے مضامین پر نظر نہیں ڈال سکا ہوں لیکن چند بہت اچھے جائزے معلوم ہوئے۔

—— ڈاکٹر مسعود حسین خاں

'آج کل' کے اُردو نمبر میں شامل نہ ہونے کا بہت افسوس ہے۔ اچھا خاصہ نمبر نکال ڈالا آپ لوگوں نے۔

—— عمیق حنفی

"آج کل" "اردو نمبر" بہت پسند آیا۔ ڈاکٹر محمد حسن، دیوندر اسر، ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے مقالات بہت پسند آئے۔

—— احمد جمال پاشا

"آج کل" کا اُردو نمبر نظروں سے گزرا۔ تمام مضمون پڑھے اور ہر مضمون اپنی جگہ خوب ہے۔ لیکن شریف احمد صاحب کا مضمون "مختصر افسانہ آزادی کے بعد" پر مجھے کچھ اعتراض ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ مضمون نگار نے نرون کمار ورما جیسے افسانہ نگار کا حوالہ تک نہیں دیا جب کہ موصوف نے اردو ادب کو بہترین کہانیاں دی ہیں۔

—— بلو بیدل

اُردو داں حضرات اور محققین کے لئے اُردو نمبر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

—— منظور صدیقی

شارب ردولوی

نسیم عرفاں

بھگوت گیتا کا ایک ترجمہ

بھگوت گیتا دنیا کے مذہبی ادب میں بہت اہم اور قدیم ترین کتابوں میں ہے جو کہ فلسفۂ حیات پر ایک بیش قیمت صحیفہ کا درجہ رکھتی ہے جس نے عمل کی تحریک دی اور بے لوث عمل کو بہترین عبادت اور مقصدِ حیات قرار دیا۔ ویدانت کا فلسفہ ہند و فلسفہ میں بلند ترین مقام رکھتا ہے اور گیتا اس کی تعبیر و تشریح ہے۔ ویدانت ہمیں 'اَدْوَیت' یعنی وحدت الوجود کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی فلسفہ کو مختلف انداز میں مہابھارت کے موقع پر پیش کیا گیا ہے۔

گیتا میں فلسفۂ ویدانت کے علاوہ "سانکھ" اور "یوگ" کے فلسفہ کے اصول بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں گیتا میں 'ترے گن' یعنی تین صفات کا ذکر ملتا ہے۔ 'ستوگن' روشنی نور یا صفات علوی۔ 'رجوگن' جوش یا جذباتی صفات 'تموگن' تاریکی ظلمت یا صفاتِ سفلی۔ یہ قدرت کی تین صفات ہیں یہ ذہن انسانی میں خیر و شر کی کشمکش بن کر اسے کھینچتی رہتی ہیں۔ اس کشمکش سے نجات پانے اور گنوں کے بندھنوں کو توڑ عرفان الٰہی حاصل کرنے کے لئے دنیا کے تمام مذاہب اور پیغمبروں اور بزرگان دین نے مختلف راستے بتائے ہیں۔ گیتا میں اسی کشمکش سے ذہن انسانی کو نجات دلانے کے لئے ہدائتیں دی گئی ہیں اور کچھ راستے بتائے گئے ہیں۔ دنیا میں روح مادی وسائل میں اس طرح پھنس گئی ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود یعنی وصل محبوب حقیقی سے دور ہوتی جا رہی ہے اور دنیا کے بندھن اس پر مضبوط ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کے لئے گیتا میں تین راستوں پر چلنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اول 'کرم مارگ' یعنی راہِ عمل، دوسرا 'بھگتی مارگ' یعنی راہِ عشق، تیسرا 'گیان مارگ' یعنی راہِ عرفاں۔

'کرم مارگ' میں گیتا ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ عمل بہت اہم چیز ہے اس کا اثر انسان کی روح پر پڑتا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق وہ نجات کی راہ اور منازل طے کرتا ہے۔ گیتا کا مقصد عمل کی طاقت کو ابھارنا اور صحیح راستے پر لگانا ہے۔ اسی لئے گیتا میں 'نشکام کرم' یعنی بے لوث عمل پر زور دیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عمل کے وقت ذاتی اغراض یا اس کے نتیجہ کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ شکست و فتح سے غرض یا اس کے لئے پریشان و فکرمند ہونا انسان کا کام نہیں ہے۔ 'کرم مارگ' کی نہایت اہم تعلیم یہ بھی ہے کہ حق کی حمایت میں جو کچھ بھی سامنے آئے یا اس حمایت میں رکاوٹ ڈالے اس کو ختم کر دینا ہے۔ وہ خواہ خون کے رشتہ عزیز بھائی، پھوپھا، چچا اور قریب ترین اعزا ہوں یا دوست، ہر وقت کے ساتھی اور غمگسار ہوں۔ اپنے ضمیر پر اتنا قابو اور حق کی حمایت کی یہ تیاری یقیناً ایک زبردست اخلاقی تعلیم و بلند اور وقیع فلسفۂ حیات ہے۔

اس کے بعد بھگتی مارگ راہِ عشق ہے جس میں خدا سے محبّت

اور اسی کا دھیان کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ کیوں کہ اس محبت کے ذریعہ انسان جلد قربِ الٰہی حاصل کرسکتا ہے۔ دنیا کی لذتوں اور جہانِ فانی کی محبت بھی فانی ہے جس سے سوائے دکھ اور تکلیفوں کے کچھ نہیں ملے گا۔ دنیا کی محبت انسان کو اپنے طلسم میں گرفتار کرلیتی ہے اور وہ تمناؤں کے طلسمی سانپ میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ نکل نہیں سکتا۔ لیکن خدا کی محبت اسے اس طلسم سے نجات دلاسکتی ہے۔ اس لئے گیتا میں خلوصِ دل اور سچی محبت سے خدا کو یاد کرنے اور اسی سے عشق کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ گیتا میں بھگتی کے لئے نہ تو ذات پات کی کوئی قید ہے اور نہ عورت و مرد کی۔

تیسرا راستہ گیان مارگ، یعنی راہِ عرفاں کا ہے۔ عارف کے بہت سے اوصاف گیتا میں بیان کئے گئے ہیں اور عرفانِ الٰہی حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ دراصل گیتا کا فلسفہ ویدانت، سانکھ اور یوگ کی روح ہے جو بے لوث عمل اور عشقِ الٰہی کی تعلیم دیتا ہے۔ سری کرشن جی کی زبان سے ارجن کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ صرف ایک جنگ کو فتح کرنے کا گر یا کوئی معمولی درس نہیں ہے بلکہ دنیا کے لئے ایک پیغامِ عمل ہے۔ اس میں ایک جنگ نہیں بلکہ ان گنت جنگوں کو فتح کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ ایک جنگ تو ظاہری تھی جو کروکشیتر کے میدان میں ہوئی لیکن دیکھنے اور غور کرنے والی وہ سینکڑوں جنگیں تھیں جو دلوں اور ذہنوں میں ہو رہی تھی جس کی فتح کے لئے سری کرشن جی نے پورا ایک نظامِ حیات اور فلسفۂ حیات ترتیب دیا۔ یہ جنگ کوروں اور پانڈوں، اچھائی اور برائی۔ نفسِ مطمئنہ اور نفسِ امارہ، حق اور ناحق دل اور جذبات اور اپنے جسم کی اپنی روح سے جنگ تھی انہیں جنگوں کے لئے گیتا نے انسان کو تیار کیا ہے اور تعلیم دی ہے کہ انسان اپنے نفس کو ذاتِ الٰہی میں ضم کردے۔ یہ مقام انسان کو عشقِ حقیقی سے ہی مل سکتا ہے۔

یہ مختصر جائزہ جو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں نے گیتا کے فلسفہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے یا اس کی تعبیر و تشریح کی ہے۔ تراجم کا ذکر کرنے سے پہلے اس فلسفہ کے جائزہ کی ضرورت تھی تاکہ ترجموں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکے لیکن نہ میں صحیح معنوں میں اس قابل تھا اور نہ اس کا اہل۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے گیتا کے مطالعہ کے بعد جو کچھ مرتب ہوا تھا اس کو میں نے پیش کردیا ہے۔ اگر کہیں پر کسی کو اختلاف ہو تو میں معذرت کا خواستگار ہوں۔

گیتا دنیا کی چند کتابوں میں اور ہندوستان کی تنہا کتاب ہے جس کے ترجمے تقریباً دنیا کی ہر زبان میں ہوئے ہیں اور طرح طرح سے حکمائے فلسفہ اور علما ادب نے اس کے الفاظ کے پردوں میں پوشیدہ مفاہیم اور نکات کی تشریح و تعبیر کی ہے۔ ہندوستان میں اتنے ترجمے کسی اور کتاب کے نہیں ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک ایک زبان میں اس کے بیسوں ترجمے اور تفسیریں ہیں اردو میں اس کے ترجموں کی صحیح تعداد بتانا تو مشکل ہے لیکن جن نثری و منظوم ترجموں کی نشان دہی ہو چکی ہے اس کے پیش نظر ان کی تعداد ۲۶ ہے اس کے علاوہ بہت سے ترجمے ایسے ہیں جن کا اس زمانے میں لوگوں کو علم نہیں ہے [۵]

---

۵ جن تراجم کا مختلف ذرائع سے اب تک علم ہو چکا ہے اُن کے نام حسب ذیل ہیں۔

گیتا کا پہلا ترجمہ فارسی میں فیضی نے کیا جو کہ منظوم ہے اور آزاد ترجمہ ہے۔

نثری ترجمے:

۱۔ بھگوت گیتا — مترجمہ منشی کنہیا لال عرف الکھدھاری
(سب سے قدیم اردو ترجمہ اسی کو مانا گیا ہے)
۲۔ بھگوت گیتا — اردو ترجمہ از منشی شیام سندر لال
۳۔ سری بھگوت گیتا — مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور
۴۔ بھگوت گیتا — منشی دیبی پرشاد
۵۔ سری مد بھگوت گیتا — موسوم بہ فلسفۂ الوہیت — رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن
۶۔ سرچشمۂ عرفاں — منشی جگن ناتھ پرشاد عارف
۷۔ شری مد بھگوت گیتا رہسیہ — لوکمانیہ بال گنگادھر تلک
۸۔ شری مد بھگوت گیتا — ترجمہ از شانتی نرائن
۹۔ گیتا امرت معروف بہ اکسیر روح۔ از چودھری روشن لال ایم اے
۱۰۔ گیتا گیان معروف بہ روح معرف — " "
۱۱۔ گیان پرکاش معروف بہ نورِ ہدایت — " "

(سلسلہ صہ پر)

گیتا کا پہلا ترجمہ فارسی میں فیضی نے کیا جو کہ منظوم ہے اور آزاد ترجمہ ہے، یعنی اس میں ہر شعر کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ پورے پورے باب کے مفہوم کو فارسی میں نظم کر دیا گیا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ فیضی کا نہیں ہے، ناظم مسیح پانی پتی کا ہے۔ لیکن یہاں پر یہ بحث میرے حدود میں نہیں ہے۔ میرا موضوع حضرت منور لکھنوی کی بھگوت گیتا منظوم موسومہ نسیم عرفاں، کے ترجمہ کی

(سلسلہ ص ـــ سے آگے)

۱۲ ـــــ بھگوت گیتا (جس ترجمے کا ذکر گارساں دتاسی نے کیا ہے)

۱۳ ـــــ بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی ـــــ ترجمہ محمد اجمل خاں

منظوم ترجمے:

۱۴ ـــ بھگوت گیتا ـــ مخزنِ اسرار ـــ پنڈت دینا ناتھ مدن

۱۵ ـــ شریمد بھگوت گیتا ـــ معروف بہ غذائے روح پنڈت پربھو دیال عاشق لکھنوی۔

۱۶ ـــ بھگوت گیتا منظوم ـــ موسوم بہ نسیم عرفاں ـــ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی۔

۱۷ ـــ فلسفۂ گیتا ـــ سورج نرائن مہر دہلوی

۱۸ ـــ دل کی گیتا ـــ خواجہ دل محمد

۱۹ ـــ بھگوت گیتا ـــ خلیفہ عبدالحکیم

۲۰ ـــ بھگوت گیتا منظومۂ تمنا ـــ منشی رام سہائے تمنا لکھنوی

۲۱ ـــ گیتا ہندوستانی نظم میں ـــ ستیہ پرکاش مہتاب پسروری

۲۲ ـــ صدری گیتا ۔ بھگوت گیتائے منظوم ۔ لچھمن پرشاد صدر لکھنوی (فیضی کے فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ)

۲۳ ـــ بھگوت گیتا ـــ ترجمہ آثم مظفر نگری (فیضی کے فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ)

اس کے علاوہ بھی بعض ترجمے نظم و نثر میں ہوئے ہیں۔ مثلاً رائے بہادر شنکر دیال جج لکھنؤ اور رائے برج موہن دیال احقر لکھنوی نے مسدس میں ترجمہ کیا اور منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے نثر میں ترجمہ کیا ہے۔

اہمیت کا مطالعہ کرنا ہے۔ میں نے اردو اور انگریزی میں گیتا کے کئی ترجمے دیکھے ہیں اور اس مضمون کو قلمبند کرنے سے پہلے شعبۂ سنسکرت اور ہندی کے بعض ذمہ دار ساتھیوں کی مدد سے اصل گیتا کے مقابلے میں بعض ترجموں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کی روشنی میں اپنے اس جائزے کو پیش کر رہا ہوں۔

اردو شاعری میں بحر و قافیہ کی پابندی نے منظوم ترجمے کو اور بھی دشوار بنا دیا ہے۔ ان سب دشواریوں کے باوجود حضرت منور لکھنوی نے گیتا کا منظوم اور کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان کی اپنی زبان کے شعری محاسن بھی باقی رہے ہیں، انداز بیان کی ندرت بھی قائم رہی ہے اور فلسفیانہ مسائل کو بھی بیان کر دیا ہے۔ انہوں نے احتیاطاً ہر اشلوک کا ترجمہ چار اشعار میں کیا ہے تاکہ اس کا مطلب صراحت کے ساتھ واضح ہو سکے۔ کہیں کہیں انھوں نے ایک اشلوک کا ترجمہ دو بند میں کر دیا ہے تاکہ صحت کے سلسلہ میں شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ انھوں نے اپنے ترجمے میں سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس سلاست کے باوجود ترجمہ اچھا ہے اور دقیق مسائل ان کی رنگینیٔ کلام میں حارج یا مانع نہیں ہو سکے ہیں۔

یہاں پر ان کے ترجمے کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے میں بعض ترجموں کے کچھ حصے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی روشنی میں ان کی جگر کاوی، استادی اور مہارت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

دوسرے ادھیائے کا ۲۳ واں اور ۲۴ واں اشلوک ہے ؎

۲۳۔ نینم چھندنت شستراݨی نینم دہتی پاوکا
نہ چینم کلے دینتیاپو نہ شوشیت ماروتہ

۲۴۔ اچھے دویم اداہ یو یم
اکلے دو اشوشیہ ایوچہ
نتیا سروگتہ استھانُہ اچلویم سنانتہ

ان اشلوک کا ترجمہ نثر میں محمد اجمل خاں نے اس طرح کیا ہے۔

۲۳۔ نہ ہتھیار اسے زخمی کر سکتے ہیں نہ آگ اسے جلا سکتی ہے نہ پانی اسے تر کر سکتا ہے اور نہ ہوائیں اسے خشک کر سکتی ہیں۔

۲۴- نہ وہ قابلِ قطع ہے، نہ جلنے والی نہ خشک و تر ہونے والی شے ہے وہ دائمی ہے، ہر جگہ موجود ہے، مستقل ہے، غیر متحرک ہے اور قدیم ہے۔

دل محمد اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

۲۳ کٹے گی نہ تلوار سے آتما
جلے گی کہاں نار سے آتما
نہ گیلی ہو پانی لگانے سے یہ
نہ سوکھے ہوا میں سکھانے سے یہ
۲۴ نہ کٹ ہی سکے اور نہ جل ہی سکے
نہ سوکھے نہ پانی میں گل ہی سکے
قدیم اور اٹل بھی ہے دائم بھی ہے
محیطِ جہاں بھی ہے قائم بھی ہے

اب دیکھئے کہ منور لکھنوی نے کس خوبی کے ساتھ اس اشلوک کو نظم کیا ہے جس میں لہجے کی نرمی اصل بیان کی اس لطافت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو سنسکرت کی بلاغت میں پوشیدہ ہے۔ ساتھ ہی قابلِ غور وہ شعری مہارت اور استادی ہے جس کی وجہ سے ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے ؎

۲۳ اس کو کسی طور سے بھی ہتھیار
پہنچا سکتے نہیں کچھ آزار
ممکن یہ نہیں بہ زیرِ افلاک
آگ اس کو جلا کے کر سکے خاک
کچھ بھی اس پر اثر نہ ہو گا
پانی سے یہ ذرا تر نہ ہو گا
ممکن نہیں خشک ہو ہوا سے
محفوظ ہے یہ ہر اک بلا سے
۲۴ کٹنا اس کا محال تر ہے
گھٹنا اس کا محال تر ہے
جلنا اس کا نہیں ہے ممکن!
گلنا اس کا نہیں ہے ممکن!
خشکی کے اثر سے ہے یہ آزاد
نیرنگ دگر سے ہے یہ آزاد
ساکن ہمہ اوست جاودانی
لاجنب، قدیم غیر فانی

انسان کو مرگ کے خوف سے نجات دلانے اور روح کے جاوید ہونے کے فلسفہ کو جس انداز سے متذکرہ اشلوک میں پیش کیا گیا ہے، منور لکھنوی نے ترجمہ میں اس کے نفسِ مضمون میں فرق نہیں آنے دیا ہے۔ ان کے یہ بند ترجمہ بھی ہیں اور اپنے اندر تفسیر کے دفتر بھی لئے ہوئے ہیں۔ "نتیا سرو گتہ استھانُہ۔ اچلویم سناتنہ" کا ترجمہ واقعی قابلِ داد ہے۔

اس ادھیائے کا ۴۷ واں اشلوک ہے جس میں نشکام کرم کی تعلیم کا پورا فلسفہ سمو دیا گیا ہے ؎

۴۷ کرمنیہ نیوا اَدھیکار ستے
ما پھلیسو کداچنہ
ما کرم پھل ہے تُر بھو
ماتے سنگھ ست اکر منڑیں

تیرا کام عمل کرنا ہے۔ اس کے ثمرہ سے تجھے کوئی واسطہ نہیں۔ عمل کے ثمرہ کو اپنا مقصد نہ بنا۔ تاہم جامد و ساکت بھی نہ ہو جا۔ (ترجمہ محمد اجمل خاں)

دل محمد نے اس کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

تجھے کام کرنا ہے او مرد کار
نہیں اس کے پھل پر تجھے اختیار
کئے جا عمل اور نہ ڈھونڈ اس کا پھل
عمل کر عمل کر نہ ہو بے عمل

ستیہ پرکاش مہتاب اسکا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں ؎

تجھ کو مطلب چاہیئے بس اپنے کرموں سے سدا
کرم کے پھل کی تجھے تو فکر ہے بے فائدہ
کرم پھل کو اپنے دل میں کس لئے ہے سوچتا
کرم کا پھل ترک کرنا یوگ ہے سب سے بڑا

یوگ کا کر کے ارادہ کرم کا پھل بھول جا
تیری مکتی ہے اسی میں، اس میں ہے تیرا بھلا

منوّر لکھنوی نے اس کو اس طرح نظم کے پیرائے میں ڈھالا ہے ؎

تم کو تو فقط ہے کام سے کام
لازم نہیں ذکر و فکرِ انجام
پھر کام کے پھل سے لوث کیوں ہو
پھر اجرِ عمل سے لوث کیوں ہو
جب کام کے واسطے ہو تیار
پھل سے ہرگز نہ ہو سروکار
بے کار مگر کبھی نہ رہنا
دریا کی طرح مدام بہنا

ایک ایک لفظ کو دیکھئے کس طرح اصل مفہوم کو اپنی زبان پیش کیا گیا ہے۔ پھر پورے بند کی روانی اور تہہ نشین لہر کو محسوس کیجئے جو روح میں اترتی چلی جاتی ہے۔ آخر میں "پرسیدوے ویش جگن ناتھ" کے ساتھ اس مصرع کو پڑھئے ؏

اے حاضر کل کرم ہو مجھ پر

مجھے شاید کسی دعوے کا حق نہیں لیکن میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس سے بہتر اور پُر اثر ترجمہ اس کا میری نظر سے نہیں گذرا۔ "اے حاضر کل کرم ہو مجھ پر" میں جو دعائیہ انداز، لجاجت اور منت ہے وہ صرف یہی نہیں کہ پر اثر اور فصیح ترین ہے بلکہ اشلوک کی اصل روح عبد و معبود کے رشتہ کا جو تعلق ہے رحیم و کریم کی بارگاہ میں طالب رحم بندے کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ سب اس مصرع میں آگئی ہے۔

ترجمہ کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اگر ترجمے میں اس کا احساس ہو کہ زبردستی ثقیل اور غیر فصیح الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے تو وہ معنوی اعتبار سے کتنا ہی درست کیوں نہ ہو ترجمہ کے لحاظ سے اچھا نہیں کہا جائے گا کیوں کہ ترجمہ میں زبان و بیان کے حسن کا باقی رہنا بھی ضروری ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ منوّر لکھنوی کے ترجمہ میں ہر جگہ یہ حسن ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ زیادہ اشلوک ایسے ہیں جس میں یہ حسن ملتا ہے اور ترجمے کے پڑھتے وقت اصل کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ میں یہاں پر چند شعر نقل کرتا ہوں ان کے ساتھ میں نہ اصل سنسکرت متن دے رہا ہوں اور نہ دوسرے ترجمے تاکہ اسے پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس میں اصل کی صفات محسوس ہوتی ہیں یا نہیں۔ گیان وگیان یعنی علم معرفت کی تعلیم کے سلسلے میں ساتویں ادھیائے کے یہ اشلوک ملاحظہ کیجئے ؎

۷۔ یہ امر ہے طے شدہ دھننجے!
مجھ سے بڑھ کر نہیں کوئی شے
کچھ بھی مرے سوا نہیں ہے
میں ایک ہوں دوسرا نہیں ہے
جس طرح سے ہار میں گندھے ہوں
موتی اک تار میں گندھے ہوں
اسبابِ جہاں ہیں نظم مجھ میں
یہ کون و مکاں ہیں نظم مجھ میں

۸۔ خورشید میں نور، ماہ میں تاب
ہوں اے ارجن میں لذتِ آب
ہوں زبدۂ روزگار میں ہی
ویدوں میں ہوں اونکار میں ہی
میں ہی آواز ہوں خلاء میں
میرا ہی ظہور ہے صدا میں
مردوں میں ہوں مردمی کا جوہر
تابندہ مجھ ہی سے ہے یہ گوہر

جگہ کی تنگی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے کہ میں اور مثالیں نقل کر سکوں ورنہ بہت سے ایسے اشلوک نقل کئے جا سکتے ہیں جہاں منوّر لکھنوی کی استادی، چابک دستی، باریک بینی، اور زبان کی قدرت نے ترجمہ کو انداز بیان کی ندرت اور حسن و خوبی کے ساتھ اصل کے اتنا قریب کر دیا ہے کہ زبان سنسکرت کے علم کے بغیر اس لذت کو محسوس کرتی ہے۔

++++++++++







یہ دفتر میں سُپرنٹنڈنٹ ہیں۔ یہ ہمیشہ خُوش خُوش اور چاق چوبند دکھائی دیتی ہیں۔ کڑی محنت اور اچھّے کام کی بدولت آپ ٹائپسٹ سے ترقی کر کے اِس عہدے پر پہونچی ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ”میں اپنا کام خُوب دل لگا کر کرتی ہوں۔ اِس لئے کہ مجھے گھر بار یا بچّوں کی طرف سے کوئی فکر یا اُلجھن پریشان نہیں کرتی۔ میری اور میرے خاوند کی آمدنی سے ہمارے چھوٹے سے کُنبے کی سبھی ضرُورتیں بخوبی پُوری ہو جاتی ہیں۔ ہمارے تین بچّے ہیں۔ تینوں اچھی تعلیم پا رہے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی معقول سہولتیں حاصل ہیں۔ ہمارا تیسرا بچّہ چھ برس



پہلے ہوا تھا۔ اُسی وقت ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اب ہمارے یہاں اور بچّہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہاں، میں سچ مچ بڑی خُوش ہوں۔“

یہ خُوش ہیں —

اور آپ ؟



davp 68/215



شری لال بہادر شاستری کی ۶۵ ویں سالگرہ منانے کے لئے نئی دہلی میں یکم اکتوبر کو ایک جلسہ ہوا۔ شری شاستری کا یوم پیدائش ۲۔ اکتوبر ہے۔ اس موقع پر مرحوم کی تصویروں کی ایک خاص نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس میں ان کی زندگی کے مختلف ادوار دکھائے گئے تھے۔ اس تقریب میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بھی شرکت کی۔
آپ کی داہنی طرف شریمتی للتا شاستری تشریف فرما ہیں۔



AJKAL (Monthly)

Vol. 27 No. 3 October 1

Edited and Published by the Director, Pu cations Division, Patiala House, New Del Printed by The Asian Art Printers Pt. L Desh Bandhu Gupta Road, New Delh

Regd. No. D.

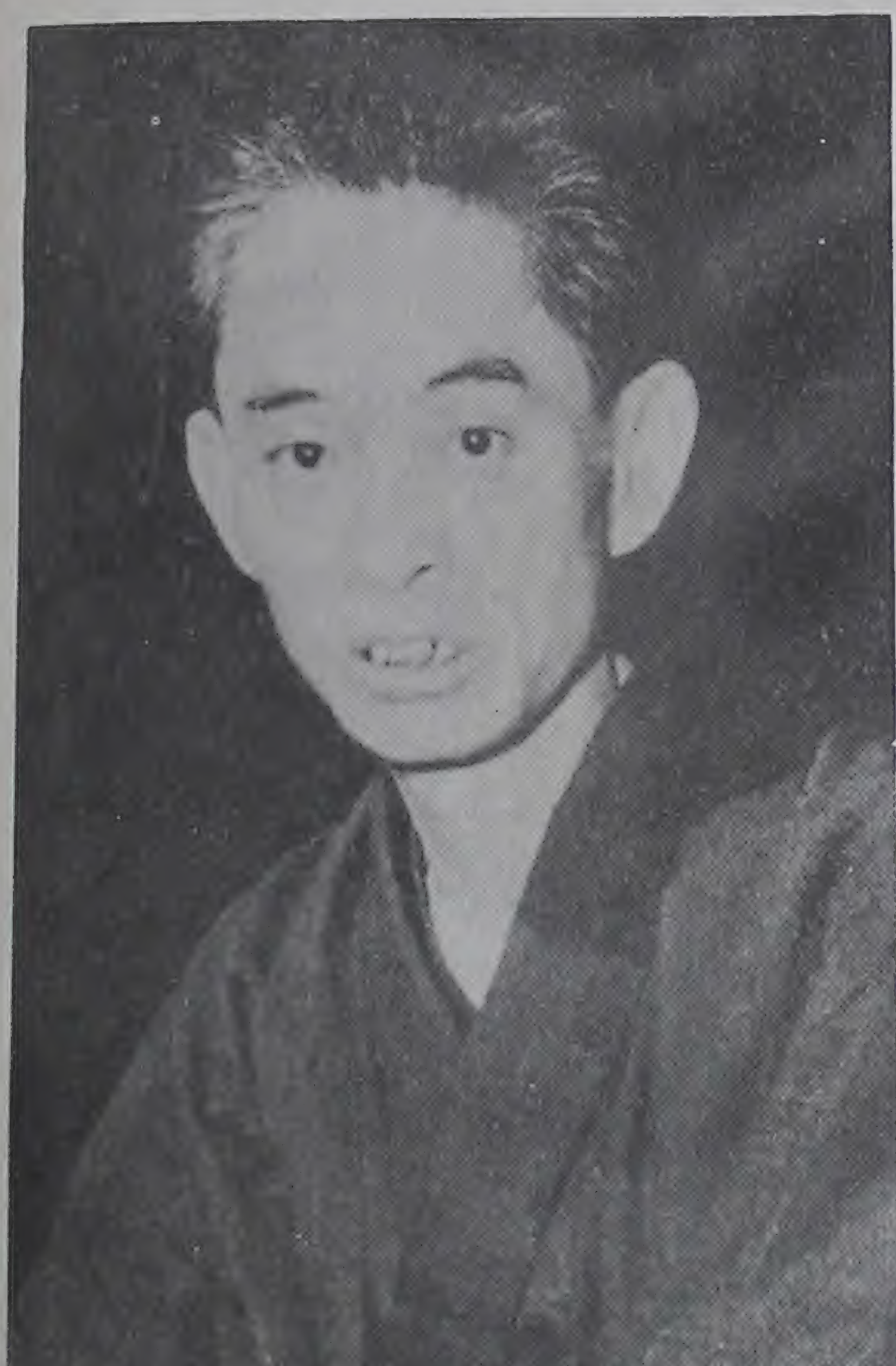
آجکل

اگرہائن شک سمنہ ۱۸۹۹



اس سال میڈیسن اور فزیالوجی کا نوبل انعام تین ڈاکٹروں کو مشترکہ طور پر دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ہندوستانی ڈاکٹر ہرگوبند کھورانہ ہیں۔ ڈاکٹر کھورانہ نے اپنے کیریئر کا آغاز بحیثیت کیمیا ساز کیا۔ ۵۲-۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصے میں ڈاکٹر کھورانہ نے نوبل انعام یافتہ سر الیگزینڈر ٹوڈ کے ساتھ کیمبرج میں کام کیا۔ موصوف نے اپنے طور پر تجربات پچھلی دہائی کے آخر میں شروع کئے۔ ڈاکٹر کھورانہ ان دنوں امریکہ کی وس کان سن یونی ورسٹی میں شعبۂ تحقیق کے ڈائرکٹر ہیں۔ اب آپ نے امریکی شہریت اختیار کر لی ہے۔





اس سال ادب کا نوبل انعام جاپانی ادیب و شاعر جناب یاسو ناری کواباتا کو اُن کے ناوِل "آسا کو ساکورے نیدان" پر دیا گیا ہے موصوف پہلے جاپانی ادیب ہیں جنھیں نوبل انعام مِلا ہے۔ یاسوناری کواباتا کا شمار جاپان کے اُن معدودے چند ادیبوں میں ہے، جن کے فن پارے غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ موصوف کی اہم تصانیف "یوکی گنی" (برف پوش دھرتی) اور "سیم بازورد" (ہزار کونجیں) بالترتیب آٹھ اور سات غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس ناوِل سے پیشتر کواباتا کے متعدد ناول اور افسانوں و نظموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

آپ جون ۱۸۹۹ء میں آسا کا میں پیدا ہوئے۔

ترتیب

اُردُو کا مقبول عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شمارہ ۴ —— جلد ۲۷
نومبر ۱۹۶۸ء
کارتک اگرہائن شک سمت ۱۸۹۰

	فی پرچہ	ایک سال	دو سال	تین سال
ہندوستان	۶۰ پیسے	۷ روپے	۱۲ روپے	۱۷ روپے
پاکستان	۶۰ پیسے (پاک)	۷ روپے (پاک)	۱۲ روپے (پاک)	۱۷ روپے (پاک)
دیگر ممالک	۱ شلنگ یا ۱۴ سینٹ	۱۰ شلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ ڈالر	۱۸ شلنگ ۲٫۷۵ ڈالر	۲۵ شلنگ ۶ پینس ۳٫۵۰ ڈالر

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

سری جواہر لال نہرو ہمارے اُن رہنماؤں میں سے ہیں جو محسنِ قوم کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ انھوں نے نہ صرف اس نسل کو متاثر کیا ہے جس میں وہ پلے اور بڑھے بلکہ ان نوجوان ذہنوں پر بھی اثر ڈالا ہے جنھوں نے انھیں صرف دور سے دیکھا یا ان کے افکار وخیالات کو کتابوں میں پڑھا ہے۔

ہمارے ملک میں تعمیر و ترقی اور اصلاح اور بہتری کے جو اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو ان کی ذاتی دلچسپی کے مرہونِ منت ہیں۔ ان کا نہایت اہم کارنامہ، قدامت پرستی اور توہم پرستی کے بُت کو توڑنا اور عقلیت اور سائنٹفک نقطۂ نظر کو فروغ دینا ہے۔ عمارت، سڑک اور بند کی تعمیر کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیم اور سائنسی تحقیق پر بھی زور دیا ہے کیوں کہ کسی چیز سے اچھا یا برا مصرف لینا انسان ہی کا کام ہے لہٰذا اصل مسئلہ انسانی ذہن کی صحیح تربیت ہی ہے۔ ہمارا ملک جن مسائل سے دوچار ہے ان میں معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ وسیع النظری اور رواداری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لسانی تنازعے، مذہبی اختلافات اور علاقائی عصبیت جیسے مسائل اپنے معاشی پہلو سے قطع نظر بڑی حد تک وسیع النظری اور کشادہ دلی سے حل کیے جا سکتے ہیں۔ جواہر لال نہرو نے صرف اس کی تعلیم ہی نہیں دی ہے بلکہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا ہے۔

ان کی شخصیت کا ایک دلکش پہلو بچوں سے ان کی بے پناہ شفقت بھی ہے۔ ان کی سالگرہ کا دن (۱۴ نومبر) بجا طور پر بچوں کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کچھ کیا گیا ہے مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مستقبل کے ان معماروں کی صحیح نشوونما ایک اہم ترین قومی مسئلہ ہے اور ان کی سالگرہ کا یہ دن ہر سال ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے۔

دفاعی لحاظ سے اپنی ضرورتوں کی تکمیل ہمارا اولین مقصد ہے کوئی بھی ملک اپنی آزادی اور علاقائی سالمیت کو اس وقت تک برقرار نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وہ اپنی حفاظت خود نہ کر سکے۔ اس لحاظ سے ہندوستان کے پہلے آبدوز شکن جہاز "نیل گری" کی تیاری نہ صرف ایک اہم ملکی ضرورت کی تکمیل ہے بلکہ ایک قابلِ فخر کارنامہ بھی ہے۔ یہ جنگی جہاز، سرکاری جہاز ساز کارخانے مزگاؤں میں تیار کیا گیا ہے۔ اب اس کو الیکٹرانک آلات سے لیس کیا جائے گا جن میں خود کار میزائل بھی شامل ہوں گے۔ اس جہاز کو پانی میں اتارنے کی رسم ادا کرتے ہوئے شریمتی اندرا گاندھی نے کہا کہ ہمارے لیے ایک مستعد اور چوکس بحری فوج ہونی ضروری ہے جو کہ ملک کے تین ہزار میل لمبے ساحلوں کی حفاظت کر سکے اور ہماری تیزی سے بڑھتی ہوئی تجارت اور تجارتی بیڑے کی بھی حفاظت کر سکے۔

آپ نے یہ بھی کہا کہ ہماری بحری طاقت بلکہ پوری دفاعی طاقت کسی کو دھمکانے کے لیے نہیں ہے۔ آپ نے اس توقع کا اظہار کیا کہ بحرِ ہند ہمیشہ بحرِ امن وسلامتی رہے گا۔ اور قوموں اور ملکوں کے درمیان امن و آشتی کا رابطہ بنا رہے گا۔

آج کل کے اُردو نمبر کو ہمارے قارئین نے جس طرح سراہا ہے اس سے ہماری بڑی ہمت افزائی ہوئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین آج کل کے بارے میں ذرا تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کریں ہم اس سلسلے میں چند سوالات درج کر رہے ہیں۔ آپ کے جواب کی روشنی میں ہم آج کل کو زیادہ دلچسپ معیاری، اور مفید بنانے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ 'آج کل' جس صورت میں شائع ہو رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں ؟

۲۔ 'آج کل' میں کون سی تبدیلیاں کی جائیں جو اس کی دلچسپی اور افادیت میں اضافے کا باعث ہوں ؟

۳۔ کیا عورتوں اور بچوں کے فیچرز کے لیے صفحات مخصوص کیے جائیں؟

۴۔ 'آج کل' کی کون سی چیزیں آپ کو پسند ہیں ؟

رسالے کے صوری پہلو (سرورق، صفحوں کی ترتیب وغیرہ) سے متعلق بھی اظہارِ خیال کیجیے۔ ہمیں آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔



غزل

توڑے شاید مُہرِ خموشی، دِل کی گرہیں کھولے ٹک
بیٹھے ہیں چُپ، آس لگائے، کاش وہ ہم سے بولے ٹک

بڑھنے لگے پھر شام کے سائے، جلنے لگے یادوں کے دیے!
دردِ محبت! مجھ سے لپٹ کر، تو بھی تڑپ لے، رو لے ٹک

دُنیا دُنیا حرص و ہوا ہے، آنسو کا کچھ مول نہیں!
دریا دریا رونے والے! دامن دل کا دھولے ٹک

دیکھوں اُن کی زُلف کا سایہ، کاش کبھو ایسا بھی ہو!
شام ڈھلے جب رات کی رانی، اپنا جُوڑا کھولے ٹک

میں بھی سمجھوں میرا بھی ہے اپنا کوئی دُنیا میں
جیون کی سنسان ڈگر میں، ساتھ مرے تو ہو لے ٹک

جام و سبو کی آگ میں کتنے پھول کھلے ہیں یادوں کے!
پیار کی اس البیلی رُت میں، بین کے تار سنجو لے ٹک

زہر بھری دُنیا سے یارو! چلنا ہے تو اس پاس چلو
شاید ہونٹوں کی اک جنبش، رس کانوں میں گھولے ٹک

رات کے مُبہم سنّاٹے میں، یادوں کی پرچھائیں میں!
رووے ہے رُت شبنم شبنم، پیاسے نین بھگولے ٹک

غم کی آنچ میں جب دِل پگھلا، جام بنا میخانے کا
بعد کو جام اُٹھانا، پہلے رُوح میں درد سمولے ٹک

شعر و سخن کے شہ پاروں میں رنگ ابھی کچھ بھرنا ہے
اے فن کار! تو اپنی پلکیں خونِ دل میں ڈبو لے ٹک

کیسے کیسے جیب و گریباں چاک ہوئے ہیں ساری رات!
صبحِ بہاراں نے تب جا کر، گھونگھٹ کے پٹ کھولے ٹک

کتنی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی ہیں جاوید
شاید وہ سپنے میں آویں، مُوند لے آنکھیں سو لے ٹک

جاوید وششٹ

شاہدہ غفران زیدی



جواہر لال نہرو کی جیل کے زمانے کی تصنیفات

کسی غلام ملک میں ایک محبِ وطن کی زندگی بڑی دشوار زندگی ہوتی ہے۔ اسے طرح طرح کی سختیاں جھیلنی ہوتی ہیں اور مختلف قسم کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن اِن سختیوں اور آزمائشوں کے نتیجہ میں اُسے کچھ حاصل بھی ہوتا ہے۔

اپنی جیل کی زندگی کے بارے میں پنڈت جی نے ایک جگہ خود لکھا ہے "یہاں کافی وقت اور دُنیا سے الگ تھلگ رہ کر اس کا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے" سری اربندو نے علی پور جیل کی اسیری کے زمانے میں "نارائن درشن" لکھی۔ لوکمانیہ تلک کو مانڈلے بھیجا گیا، تو انھوں نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب "گیتا راہسیہ" تصنیف کی اور مولانا آزاد نے قرآن شریف کی نہایت عالمانہ تفسیر لکھی۔ جواہر لال جی جیل میں پہنچے تو انھوں نے تنہائی کی اذیت سے بچنے کے لئے اپنی صاحبزادی اندرا جی کے نام خطوط لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، جن کی عمر اس وقت دس سال تھی۔ ان خطوط میں جواہر لال جی نے نہایت سادہ اور سلیس زبان میں دُنیا کے ابتدائی دور کا مختصر حال بیان کیا ہے۔

جنگ آزادی کے ایک جاں باز سپاہی ہونے کی حیثیت سے جب اُن کی اسیری کے سلسلے نے طوالت پکڑی تو خطوط کا یہ سلسلہ بھی دراز ہونے لگا۔ اور جیسے جیسے اندرا جی بلوغ کے مرحلے طے کرتی گئیں، خطوط کی معنویت بھی بڑھتی گئی۔

کسی مصنف کی صلاحیت بالآخر اس شخص کی اپنی صلاحیت ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے حقیقت ہم سے پوشیدہ رہ سکتی ہے لیکن بالآخر ہم یہ ماننے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی مصنف کی تخلیق خود اس کی شخصیت اور افکار کا آئینہ ہوتی ہے۔ وہ خود سے گریز کی کوشش کر سکتا ہے لیکن اس تمام پرواز کے بعد اس کو اپنے مرکز پر واپس آنا پڑتا ہے۔ اس کا پس منظر اس کا کردار اور اس کی تربیت اس کے لئے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں پھر بھی یہی وہ چیزیں ہیں جو باہم مل کر اس کی قومی زندگی کا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی شخصیت کے اخفاء کی خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، اس کی کوششوں کا اختتام اس کے اظہار پر ہی آکر ہوتا ہے۔

اس کلیہ کا اطلاق تمام فنکاروں پر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو ان پابندیوں سے آزاد رہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کوشش میں سوائے اس کے کہ ان کے مافی الضمیر اور اس کی تخلیق کے درمیان ایک دیوار حائل ہو جائے اور کچھ نہیں ہوتا۔ نتیجہ کے طور پر ان کی تخلیق صفائی اور وضاحتِ بیان سے محروم رہتی ہے جس کی بدولت اُسے خلوصِ بیان سے بھی محروم رہنا پڑتا ہے۔

بحیثیت مصنف جواہر لال نہرو جی کی ایک بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے اس حدِ فاصل کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ انسان اور بالآخر ایک مصنف کی حیثیت سے ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا خلوص ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کا بیان اُن کے افکار و خیالات کی آئینہ داری کرتا ہے۔

خلوص کے ساتھ ساتھ بات کے اندر زور اور وضاحت بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہ خصوصیات پنڈت جی کی تمام تصانیف میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے بیان میں قوت اور سادگی ہے جو پڑھنے والے کو نہ صرف یہ کہ متاثر کرتی ہے بلکہ اس تاثر کو برقرار بھی رکھتی ہے۔ اُن کی تحریرات کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر کسی کشمکش میں مبتلا نہ تھے۔

جہاں تک خلوص کا تعلق ہے اس سے شخصیت کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت خود پنڈت جی کی زندگی سے مل جاتا ہے۔ اسیری ہمیشہ سے انسان کے کردار کی ایک آزمائش سمجھی جاتی رہی ہے، ان جسمانی تکالیف اور اذیتوں کی بنا پر نہیں جو اس میں مضمر ہوتی ہیں، بلکہ اس بار کی وجہ سے جو انسان کے ذہنی توازن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک شخص کو اس کی روزمرہ کی سرگرمیوں اور اس کے ساتھیوں سے الگ کر کے اُسے تن تنہا اپنے وسائل اور خواہشات پر انحصار کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جبری بے عملی اس کے دماغ پر بہت بڑا بار بن جاتی ہے لیکن جواہر لال جی اپنی جیل کی زندگی میں اس قسم کی اذیت سے محفوظ رہے صرف اس لیے کہ ان کی شخصیت میں تخیل اور قوتِ ارادی کا امتزاج موجود تھا۔

پنڈت جی کی جیل کی تصانیف میں سے چار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سب سے پہلے وہ خطوط ہیں جو پنڈت جی نے اپنی صاحبزادی اندرا جی کے نام ۱۹۲۸ء میں لکھے، جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ ان کے بعد جو کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں ان میں "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" اور "آٹو بائیگرافی" اور "ڈسکوری آف انڈیا" شامل ہیں۔

جیل سے باہر پنڈت جی نے جو کچھ لکھا اس کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن ان کی جیل کی تحریرات بیشتر تاریخی نوعیت کی ہیں۔ پنڈت جی کوئی پیشہ ور مورخ نہیں تھے پھر بھی اُن کی تصانیف کو تاریخ میں صفِ اول کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہ کہ پنڈت جی نہ صرف تاریخ داں بلکہ تاریخ ساز بھی تھے اور ان کی کتابیں تاریخِ ہند اور تاریخِ عالم کو ایک دلچسپ کہانی کی صورت میں بیان کرنے کی پہلی اور کامیاب کوشش ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو ان کی تصنیفات کو پیشہ ور مورخین کی روکھی پھیکی اور غیر دلچسپ کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔ پنڈت جی کی ان تحریرات میں ان کے اعلیٰ جمالیاتی احساس اور نوعِ انسانی کے معاملات سے ان کی گہری دلچسپی کا حسین اور متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کی اوّلین تحریرات یعنی اندرا جی کے نام خطوط دُنیا کی ابتدائی نشو و نما کی کہانی ہے اس میں جہاں کہیں ارضیات یا حیاتیات کا تذکرہ ملتا ہے، اسے بھی ذاتی رنگ آمیزی کے ذریعہ نہایت شگفتہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے قلم کی بدولت اجرامِ فلکی کی طویل گردش ایک ایسی چیز بن جاتی ہے جس کا فوری تعلق ہماری توقعات یا خدشات سے ہے۔ پھر اسی طرح ہماری زندگی کی خوشیاں اور غمگینیاں کائنات کی عظیم تر زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے لگتی ہیں اور وقت کے تغیرات سے آزاد ہو کر دوام حاصل کرنے لگتی ہیں۔

"گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" اور اسی سلسلہ کی دوسری کڑی "ڈسکوری آف انڈیا" دُنیا اور فرد کے اسی ربطِ باہمی کی وضاحت کرتی ہیں: ڈسکوری آف انڈیا، تاریخی ادب کا ایک بڑا کارنامہ ہے اس میں کسی نئی حقیقت کا انکشاف نہیں کیا گیا ہے۔ کسی نئی بادشاہت کا پتہ نہیں لگایا گیا ہے، ہماری معلومات کے کسی خلاء کو پُر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ کسی ایسے مسئلے کا حل تلاش کیا گیا ہے جو تاریخِ ہند کے طلباء کے سامنے موجود ہے۔ اس کی ساری اہمیت اس بات میں ہے کہ اس کتاب میں ہندوستانی عوام کی ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک کے ارتقاء کی داستان نہایت دلنشیں پیرائے میں بیان کی گئی ہے اس طرح یہ کتاب صحیح معنوں میں تاریخ کا ایک کارنامہ بن جاتی ہے، نہ کہ حقائق اور واقعات اور مقامی جنگوں اور کشمکشوں کی تفصیلات کا ایک ایسا بے ربط اور غیر دلچسپ مجموعہ جس کا کوئی مرکزی مقصد ہی نہ ہو۔ "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" پنڈت جی کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اکتوبر ۱۹۳۰ء اور اگست ۱۹۳۳ء کے درمیان لکھے تھے۔ اس عرصہ میں پنڈت جی تین بار گرفتار ہوئے اور مختلف جیلوں میں رہے لیکن اس دوران ان کو زیادہ عرصہ نینی جیل میں رہنا پڑا۔

پنڈت جی خود کو نہ تو کوئی ادبی شخصیت سمجھتے تھے اور نہ مورخ۔ اس کے باوجود ان کے خطوط کا یہ ضخیم مجموعہ زبان کے اعتبار سے ایک فن کار کی تخلیق ہے اور ایک ایسے تاریخ داں کی جو بڑی حد تک خود تاریخ ساز بھی ہو۔ جوں جوں کوئی شخص ان خطوط کی ورق گردانی کرتا ہے وہ پنڈت جی کے مطالعہ کی وسعت اور غیر جانبداری، ان کی آسان اور دلنشیں نثر اور اُن کے پُرخلوص پیرایۂ بیان کا قائل ہو جاتا ہے۔

اس مجموعے کے آخری خط مورخہ ۹ اگست ۱۹۳۳ء سے پنڈت جی کے اندازِ فکر اور پیرایۂ بیان کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس عرصہ میں میں نے بے شمار خطوط لکھے ہیں اور سودیشی کاغذ

پر کتنی سود مندسی روشنائی پھیلائی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ میرا یہ کام کہاں تک قابلِ لحاظ ہے۔ کیا ان سب میں تمہارے لئے کوئی ایسا پیغام ہے جس نے تمہیں متاثر کیا ہو۔ تم یقیناً اثبات میں جواب دوگی کیوں کہ تم سمجھتی ہو کہ اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے جواب سے مجھے تکلیف ہوگی اور تم مجھ سے اس درجہ لگاؤ رکھتی ہو کہ ہرگز اس بات کو گوارا نہ کروگی لیکن تم انھیں خاطر میں لاؤ یا نہ لاؤ تم اس لذت کو مجھ سے نہیں چھین سکتیں جو ان دو برسوں کے دوران ان خطوں کے لکھنے میں مجھے نصیب ہوئی ہے۔

"گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" ہر اعتبار سے ایک عظیم کارنامہ ہے اور اپنے موضوع کے دائرے اور جامعیت کے اعتبار سے ایچ۔ جی۔ ویلز کی Out line of History سے مماثلت رکھتی ہے اس سے جواہر لال جی کے فلسفۂ حیات اور ان کے سیاسی نظریات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ "تاریخ عالم پر لکھے جانے والے یہ خطوط ، جو پنڈت جی نے اس زمانے میں لکھے تھے جبکہ وہ نسبتاً کم معروف تھے، نہرو کے بعد کی شخصیت یعنی ایک بین الاقوامی سیاست داں اور جدید ہندوستان کے معمار کے خطوط نظر آتے ہیں۔ پنڈت جی کی اس کسرِ نفسی کے باوجود" کہ یہ سطحی تحریرات ہیں جنہیں ایک باریک سے دھاگے کی مدد سے یکجا کر دیا گیا ہے"۔ یہ خطوط مربوط فلسفۂ تاریخ کے حامل ہیں۔

گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری میں پنڈت جی نے جو نظریۂ کائنات پیش کیا ہے اس کے اجزائے ترکیبی میں آفاقیت اور عقلیت خاص طور پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

ان کا نظریۂ تاریخ بہت جامع ہے۔ اس کا مرکزی خیال انسان کا دورِ وحشت سے نکل کر تہذیب سے ہم آغوش ہونا ہے۔ ان کی نظر میں تہذیب یعنی تعلیم، سائنس، آرٹ، انصاف، آزادی اور سماجی تعاون ـــ کی قدریں کسی ایک تمدن یا کسی ایک قوم کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ عالمگیر ہیں اور مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کی پیدا کی ہوتی ہیں۔ تہذیبیں ابھرتی اور گرتی ہیں۔ انھیں ترقی اور زوال دونوں نصیب ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے ختم ہوجانے کے بعد بھی وہ نسلِ انسانی کے لئے بہت کچھ چھوڑ جاتی ہیں۔

اس سے پتہ لگتا ہے کہ پنڈت جی کو کسی ایک قوم یا تمدن سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ اپنے وطن سے محبت کے باوجود ان کے ذہن میں کسی قسم کا ملکی یا نسلی تعصب نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے اور پھر ہو سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے مصر، چین اور روم کی قدیم تہذیبوں کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ تاریخی اعتبار سے ان کا نقطۂ نظر مقامی نہیں بلکہ عالمگیر ہے۔

ان کے نظریۂ کائنات کی دوسری کڑی عقلیت ہے۔ ہندوستان کا روایتی تصوف ان کے ہاں شاید اس لئے مفقود ہے کہ ان کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی۔ زندگی کا عقلی نظریہ سائنس، ٹیکنالوجی اور مذہب کی طرف ان کے رجحانات سے ظاہر ہے۔ وہ سائنس کو ذہن انسانی کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ لیکن صرف اسی وقت تک جب تک کہ سائنس کوئی تعمیری خدمت انجام دیتی ہے۔ انھیں یقین ہے کہ اگر سائنس سے صحیح طریقے پر کام لیا جائے تو یہ بنی نوع انسان کو مفلسی، بھوک، اور بیماری سے نجات دلا سکتی ہے۔ لیکن اسی سائنس کی مدد سے تباہ کن بم کے گولے اور دوسرے ہتھیار بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا بنی نوع انسان سائنس کو تعمیری مقصد کے لئے استعمال کرے گا یا تخریبی؟

جہاں تک سماجی اور اقتصادی مسائل کا تعلق ہے جن میں آزادی اور امنِ عالم بھی شامل ہیں، پنڈت جی انھیں عالمگیر نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ ان کے نزدیک محض جغرافیائی اصطلاحیں ہیں۔ ان کے نزدیک اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کون سی قوم یا کون سا علاقہ اپنے نصب العین کو حاصل کرتا ہے بلکہ یہ کہ نسل انسانی اپنے نصب العین کو حاصل کرتی ہے یا نہیں۔ آج کے مسائل عالمگیر ہیں اور انھیں عالمگیر پیمانے پر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

"آٹو بائیوگرافی" کو پنڈت جی کی تصنیفات میں بلند ترین مقام حاصل ہے "ڈسکوری آف انڈیا" کی طرح اسے بھی پنڈت جی نے صرف چند ماہ (جون ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء) میں نینی سینٹرل جیل میں مکمل کر لیا تھا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں پنڈت جی لکھتے ہیں:

"ان صفحات کو لکھنے کا اولین مقصد تو یہ ہے کہ میں کسی کام میں مصروف رہوں جو جیل کی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے اور ساتھ ہی ہندوستان کے گذشتہ واقعات کا جن سے مجھے علاقہ رہا ہے، جائزہ لوں۔ تاکہ ان کے متعلق بہتر طریقے پر سوچ سکوں۔ میں نے اس کام کو خود اپنے جائزے کے طور پر شروع کیا اور میرا یہ انداز قریب قریب آخر تک باقی رہا۔"

اس کتاب کے مطالعے سے ایک مصنف اور ایک انسان کی حیثیت سے جواہر لال جی کی بہت سی خصوصیات ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ آٹو بائیوگرافی اگرچہ ان کی اپنی زندگی کی داستان ہے لیکن اس نے قدرتی

طور پر قومی آزادی کی داستان کی صورت اختیار کرلی ہے۔ تحریک آزادی کی داستان کی حیثیت سے ابھی تک کوئی کتاب اس پر سبقت نہیں لے سکی ہے۔ یہ بعض ایسے مردوں اور عورتوں کے کرداروں کے ایک باقاعدے مطالعہ کی حیثیت سے ایک لاثانی کارنامہ ہے جنہوں نے اس اہم دور میں ہندوستانی تاریخ کی تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ پنڈت جی کے والد پنڈت موتی لال نہرو کا کردار پوری کتاب پر چھایا ہوا ہے۔ اس طرح بیٹے کی خود نوشت سوانح حیات، باپ کی سوانح حیات بن جاتی ہے۔ گاندھی جی کے بارے میں پنڈت جی کے خیالات سے پوری دُنیا واقف ہے۔ لیکن آٹو بائیگرافی میں پنڈت جی نے گاندھی جی کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ گاندھی جی کے ساتھ اپنے خیالات کا تجزیہ ان کا وہ انتہائی بصیرت افروز نفسیاتی مطالعہ ہے جو ہمیں جدید سیاسی ادب میں ملتا ہے۔

"ڈسکوری آف انڈیا" چھ سو صفحات پر مشتمل ہے جسے پنڈت جی نے صرف ۵ ماہ (اپریل سے ستمبر ۱۹۴۴ء) میں مکمل کر لیا تھا۔ اس کے مطالعے سے ہم پر مصنف کا ذہن منکشف ہوتا ہے اور ہماری نگاہیں مستقبل کی طرف دیکھنے لگتی ہیں۔ لیکن صرف اسی حالت میں جب کہ ہم اپنے ماضی پر ایک طویل اور پُرخلوص نگاہ ڈال چکے ہوتے ہیں دریا، پہاڑ، صحرا، چشمے، پوشیدہ وسعتیں بڑی بڑی شخصیتیں جن کا کسی زمانے میں طوطی بولتا تھا لیکن آج گوشۂ گمنامی میں پہنچ گئے ہیں۔ سلطنتوں کے زوال، بادشاہتوں کا خاتمہ، فکر و فن کے کارنامے، فنِ تعمیر کے لازوال نمونے اور ناٹک اور ڈرامہ جیسے شعبوں کی تخلیقات کا اس کتاب میں ایسے دل نشیں انداز میں ذکر کیا گیا ہے جس کی مثال کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے، پنڈت جی کی جیل کی تصانیف کا مرکزی خیال تاریخ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان کی کتابوں کو اپنی تاریخی معلومات میں اضافے کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ نہیں بلکہ ہم ایک بالکل مختلف وجہ سے ان کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اُن کو بار بار پڑھتے ہیں — اور وہ یہ ہے کہ ہم اُن کی شخصیت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے ذہن کی پرواز کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ ان کے فہم و فراست کی پیچ در پیچ حرکت کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ان کے احساسات کا اپنے احساسات سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔

وقار خلیل

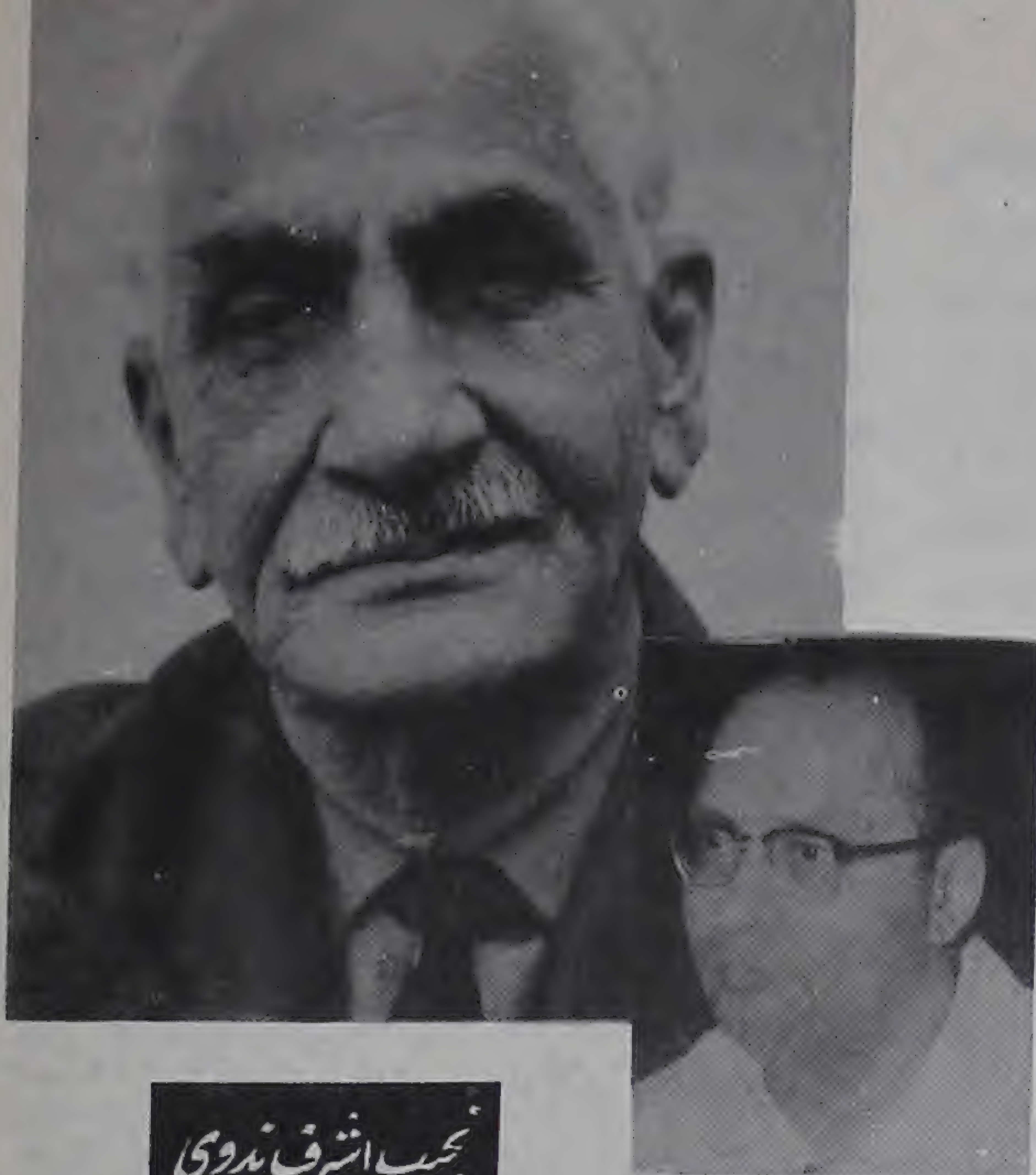
گلاب کا جشن



وفا کا پھول اسی سرزمیں پہ مہکا تھا
مہک گئی ارضِ جنوں، دیارِ خرد
وہ دن ہے آج کا دن، جس کی نیک ساعت میں
صلیبِ غم لیے
عیسیٰ نفس، رسولِ سحر
بنامِ صبح
شبانِ الم کے زنداں میں
نئی سحر کو فرارِ دوام بخش گیا:
گلابِ مہر و مساوات!
تری خوشبو سے
مہک رہی ہے نئی رہ گزرِ تمنا کی
ترے خیال کا پرتو، ترے خیال کا نور
یہ ماہ و مہر، یہ سیارگانِ دانش ہیں
کہ جن سے گلشنِ ہندوستاں عبارت ہے

ایک خط
چند یادیں

مسعود حسین خاں



نجیب اشرف ندوی

۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کی وہ سہ پہر اب میرے حافظ کا ایک نہ فنا ہونے والا حصہ بن گئی ہے، جب پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے جامعہ اردو، علی گڑھ کے حال اور مستقبل کی پرجوش گفتگو کے درمیان اچانک پہلو بدل کر مجھے یہ خبرِ بد سنائی کہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب کا ۵ ستمبر کو انتقال ہو گیا ہے۔ واقعہ سخت اور مرحوم مجھے اس قدر عزیز تھے کہ میرے منہ سے دفعتہً ایک نعرۂ یاس نکلا اور یقین نہ آیا۔ ان کا تحریر کردہ ۲۱ اگست کا آخری خط مجھے صرف چند روز قبل موصول ہوا تھا۔ جواب میرے لئے ایک صحیفۂ یاد بن گیا ہے۔ یہ خط انہوں نے مسلم یونی ورسٹی میں شعبۂ لسانیات کی صدارت کی تقرر کے سلسلے میں مجھے مبارکباد کے لئے لکھا تھا۔

مخدوم بندہ نواز بسلام نیاز

آپ کا پرخلوص تڑپا دینے والا گرامی نامہ ابھی ابھی ملا۔ آپ نے جس محبت سے یاد فرمایا ہے اس کو پڑھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ اللہ اللہ اب بھی ایک آدھ ایسی مسعود ہستیاں موجود ہیں جو بے غرضانہ محبت کا پیکر مجسم ہوتی ہیں۔ اللہ پاک آپ کو عمر صحت، بلند مقام، سکون و مسرت کی بہترین نعمتوں سے ہمیشہ سرفراز کرتا رہے، آمین۔

آپ کا تقرر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے لئے یقیناً اعزاز اور غیر معمولی یافت ہے مگر ڈر ہے کہ حیدرآباد کے حالات کہیں پھر ویسے ہی نہ ہو جائیں، جیسے آپ کے وہاں جانے کے وقت تھے۔ خداوند تعالیٰ وہاں کے لوگوں کے دلوں میں اس آگ کو جو آپ نے سلگائی تھی، ہمیشہ گرم تر، تیز تر، اور روشن تر رکھے آپ باور کیجئے کہ حیدرآباد نہ پہنچنے کا جتنا صدمہ ہے وہ، من دانم، دلِ من داند و داند دلِ من۔

اب معلوم نہیں کبھی حیدرآباد جا بھی سکوں گا یا نہیں۔ ادھر دس دنوں سے ایک نئی تکلیف شروع ہو گئی ہے۔ یعنی خونی بواسیر۔ اس سے کمزوری بڑھ گئی ہے، آج ایک Specialist کے پاس جا رہا ہوں، دیکھئے کیا کہتا ہے۔ میرا چھوٹا بچہ ستمبر کے آخر میں امریکہ سے واپس آ رہا ہے۔ اس کے آنے پر Prostrate gland کا آپریشن کرانے کا ارادہ ہے۔ اس مرض نے زندگی دوبھر کر دی ہے۔ دعا کیجئے کہ یہ Major آپریشن اس عمر اور کمزوری میں کامیاب ہو گیا تو انشاء اللہ آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا۔

تاریخ (ادب) اردو والی ابتدائی مجلس کے بعد پھر میں وہاں نہیں گیا ہوں۔ اگر کبھی بھی علی گڑھ آیا تو یقیناً آپ کی میزبانی کی عزت و مسرت

حاصل کروں گا۔ آپ تو بہر (حال) مئی میں بمبئی آئیں گے ہی، انشاء اللہ۔
امید ہے مزاجِ گرامی بہ عافیت ہوگا۔ محترمہ بیگم صاحبہ کو آداب اور بچوں کو دلی دعائیں۔
"قدیم اُردو" کا کیا ہوگا؟

طالبِ دعا
نجیب اشرف ندوی

مرحوم کا آخری خط اب میرے سامنے ہے، روز و شب کے سفید و سیاہ دریچے کھلتے جا رہے ہیں اور پچھلے چودہ پندرہ سال کے روابط و واقعات اس طرح گڈمڈ ہو کر ذہن کے سامنے آ رہے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا سرا کہاں سے اٹھاؤں۔ ان کی علم دوستی، علمی دوستی، دوست نوازی، شفقت اور نیکیاں سب ایک ایک کر کے آج یاد آ رہی ہیں۔

نجیب اشرف مرحوم سے علمی اور غائبانہ تعارف تو اپنی طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ وہ ان چند بزرگوں میں تھے جن کے علمی اور تحقیقی کارناموں کا سکہ نئی نسل کے ذہنوں پر عرصے سے بیٹھا ہوا تھا، لیکن ان سے میرا پہلا سابقہ ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ "تاریخ ادب اُردو" کی پہلی مجلس مشاورت کے وقت ہوا جب وہ علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ علی گڑھ میں ان کا قیام پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے یہاں تھا۔ رشید صاحب کے نامکمل مکان کے مردانہ حصے کے مشہور پھوس کے چھپر کے نیچے جہاں علماء ادبا اور طلبا کی ایک نسل بیٹھ چکی ہے) نجیب اشرف صاحب مجھے میٹنگ سے کھینچ کر لے آئے۔ اور کہنے لگے کہ علی گڑھ آنے کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ آپ سے استفادہ مقصود تھا۔ اس کے بعد اپنی تالیف لغت گجری، کا قلمی نسخہ اور مسودہ نکالا۔ اور بعض الفاظ کی تحقیق و تلاش میں منہمک ہو گئے میں ان کے ساتھ علمی مباحث میں ڈوب تو گیا لیکن رہ رہ کر میرے ذہن میں استفادہ کا لفظ کھٹکتا رہا۔ اور میں سوچتا رہا کہ جو شخص تاریخ، قدیم ادب اور اسلامیات میں خود اس قدر شہرت رکھتا ہے اور جس کی تصانیف اور تحریروں سے میں خود استفادہ کرتا رہا ہوں، وہ کس تکلف برطرف انداز میں ایک ایسے شخص سے جس نے اساتذہ اردو کی صف میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، ایسی نیازمندی کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ نجیب اشرف صاحب کے اس علمی انکسار میں کسی قسم کی انانیت کا دخل نہیں تھا۔

عام طور پر ایسے انکساری لفظوں کے پس منظر میں علمی نخوت و کبر کا ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے کہ اللہ اکبر! لیکن نجیب اشرف صاحب کی علمی زندگی کا یہ راز سربستہ تھا کہ آخر عمر تک حصولِ علم کی طالب علمانہ تڑپ ان کے اندر موجود رہی۔ انھیں اپنے چھوٹوں سے کوئی نئی بات سیکھنے میں کبھی عار نہیں رہا۔ اسی میں ان کی علمی بڑائی تھی۔

مجھے یہ تو معلوم ہے کہ میں مرحوم کی جانب کیوں کھنچا لیکن میرے لیے یہ بتانا ذرا دشوار ہے کہ انھوں نے مجھے اپنے ارادت مندوں میں لے کر کس لیے مفتخر کیا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ رفتہ رفتہ نصف ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ان کی اس نصف ملاقاتوں کے بیشتر نقوش میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں۔ میری جانب سے زیادہ تر علمی تقاضے ہوتے تھے، جنھیں مرحوم سے زیادہ خوش دلی کے ساتھ پورے کرنے میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ ان کی جانب سے مسلسل شفقت، حوصلہ افزائی اور ستائش ملتی۔

۱۹۵۴ء سے میرا تعلق لسانیات سمر اسکولوں سے ہو گیا جو کئی سال تک پونا میں منعقد ہوتے رہے۔ بمبئی کے راستے آنا جانا ہوتا۔ ہر دفعہ چند گھنٹوں کے لیے ان کے دفتر اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (انجمن حمایتِ اسلام) میں خود حاضری دیتا۔ ایک ملاقات میں میں نے "دیوانِ آبرو" کی تدوین و ترتیب میں دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا کہ دسنہ کی لائبریری کے نسخے کی نقل نہ ملنے کی وجہ سے معاملہ ٹھپ پڑا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ کون سی بات ہے میں نقل کیا اصل آپ کو منگوا دوں گا۔ مخطوطات کے سلسلے کے اکثر وعدوں کو میں اردو غزل کے وعدوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے بعد مجھے خیال بھی نہیں رہا کہ اچانک ایک دن انشورڈ رجسٹری کے ذریعے مجھے دسنہ کا نسخہ ملا اور نجیب صاحب کا خط جس میں لکھا تھا۔ کام کا آغاز کیجیے، نسخہ حاضر ہے۔ اسے جب تک جی چاہے رکھیے۔ اس نے میری حیرت میں اضافہ کر دیا اور یقین مانیے میرے دل میں گذرا کہ یہ بزرگ غالباً اپنے علمی ہوش و حواس میں نہیں ہیں، نہ صرف اپنی مِلک بلکہ دوسروں کے نایاب قلمی نسخے اپنی ذمہ داری پر منگا کر اس طرح حوالے کر دیتے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں میرا پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے مرحوم کی وابستگی بہت قدیم تھی، جو میرے وہاں پہنچنے کے بعد اور مستحکم ہو گئی۔ اس دوران میں وہ بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے کئی بار حیدر آباد بھی

تشریف لائے۔ روایتِ دیرینہ کے مطابق ان کا قیام نصیرالدین ہاشمی مرحوم کے یہاں رہتا۔ اس روایت کو انھوں نے ہاشمی صاحب کے انتقال کے بعد بھی قائم رکھا اور ان کے پسماندگان پر ایک لمحے کے لئے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ روابطِ قدیمی میں کسی طرح کا فرق پیدا ہوا ہے۔ انھوں نے یہ وضعداری میرے اصرار کے باوجود قائم رکھی۔ کہتے تھے کہ دن کو میری قید منظور ہے لیکن رین بسیرا وہیں ہوگا جہاں اب تک رہا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں حسنِ اتفاق سے پی ایچ ڈی کے زبانی امتحانات کے سلسلے میں بیک وقت نجیب اشرف صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب اور ضیا احمد بدایونی صاحب حیدرآباد پہنچ گئے۔ رشید صاحب اور ضیا احمد صاحب میرے یہاں مہمان تھے، نجیب اشرف صاحب حسبِ دستور ہاشمی مرحوم کے یہاں، لیکن دن بھر تینوں یکجا رہتے۔ اہلِ علم و فن کا یہ سنگم کم از کم میرے لئے ایک یادگار واقعہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن کا ماہر تھا لیکن سب کی افتادِ طبع علاحدہ تھی۔ ان بزرگوں کا باہمی رکھ رکھاؤ اور اختلافِ طبع کی وجہ سے باطنی کشاکش، دیدنی تھی۔ نجیب اشرف صاحب ان دنوں کچھ علیل تھے اس کے باوجود انھوں نے مجلس کی گرموشی اور گفتگو میں برابر کا حصہ لیا۔ میں نے کئی بار آرام کرنے کے لئے کہا ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا۔ میاں ایسے موقع بار بار تھوڑی ملتے ہیں۔ رشید صاحب کو حیدرآباد لاکر آپ ایک شاہین کو زیرِ دام لائے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے ہی کے بعد یہ ظاہر ہونے لگا کہ ان کی توانائی جواب دیتی جا رہی ہے۔ چنانچہ دورانِ گفتگو چپکے سے کھسک گئے۔ کچھ دیر کے بعد جب ڈرائنگ سے اٹھ کر میں اپنے سونے کے کمرے میں آیا تو دیکھا بایک شوٹ، دو جوتے میرے پلنگ پر دراز ہیں۔ میں ان کے اس اندازِ استراحت کو (جس کی مشق انھوں نے اپنے بمبئی کے دورانِ قیام میں بہم پہنچائی ہوگی) کبھی نہیں بھولوں گا۔ ان کی فطری معصومیت نیند کی غفلت میں نکھر آئی تھی۔ علمی انکسار کے بعد یہ فطری معصومیت سوتے جاگتے ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تھا۔ لیکن اپنی معصوم فطرت کے باوجود وہ دوم درجے کے آدمی یا گھٹیا حرکت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ ایک بار بھی ان سے اگر کوئی گھٹیا حرکت کر جائے تو اس کی شکایت انھیں ہمیشہ رہتی اور احباب کے سامنے لبوں پر لے آتے تھے۔ ان کا تعلق اس نسل سے تھا جو رسم و راہ میں حفظِ مراتب اور رکھ رکھاؤ کو مقدم جانتی تھی۔ دوم درجے کے حضرات اور حرکات سے جس کا انتقام بے اعتنائی تھا۔ وہ زود حس بھی تھے اور زود رنج بھی۔ لیکن ایک بار آپ اپنے رکھ رکھاؤ سے ان کا اعتماد حاصل کر لیں تو پھر محبت اور شفقت کی بے پایاں دولت مل سکتی تھی۔

اس نسل سے نبھاؤ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، خاص طور پر نئی نسل جو عمر اور تجربہ سے پیشتر اپنے کو محترم بنانا چاہتی ہے اور جب یہ اعزاز اسے نہیں ملتا تو اپنی انانیت کے تازیانے "اٹھتے بیٹھتے" لگانے پر مائل نظر آتی ہے۔

نجیب اشرف مرحوم نے اس قماش کی نئی نسل کی مجھ سے بارہا شکایت کی تھی۔ میرے خیال میں یہ ان کی زندگی کا المیہ بھی تھا۔ نئی نسل اُن سے اور وہ نئی نسل سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی جیسے انتہائی جدید شہر میں گذارا لیکن بنیادی طور پر وہ دارالمصنفین کے آدمی تھے۔ جہاں ان کی علمی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ شیروانی ترک کر کے انھوں نے سوٹ ضرور پہن لیا تھا لیکن وہ سوٹ بوٹ والے انسان نہیں تھے۔ ان کی شخصیت مشرق و مغرب کی ایک رزم گاہ تھی۔ زندگی کی ساری تلخیاں، اکتاہٹیں اور چوٹیں انھیں اسی رزم گاہ سے ملی تھیں۔ اس لئے جب بھی نئی نسل کا کوئی نمائندہ مشرقی وضعداری اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ان سے ملتا تو وہ اپنی رکی ہوئی محبت اور شفقت کے سارے خزانے اس پر لٹا دیتے۔

مجھے ان کے یہاں ایک دفعہ دو روز کے قیام کا موقع بھی ملا طبیعت نہایت نفاست پسند پائی تھی۔ قلبِ بمبئی سے تقریباً اٹھارہ میل دور "اندھیری" کے علاقے میں ذاتی مکان بنا لیا تھا جو بمبئی کی فلیٹ کی زندگی کے برعکس روش و چمن و سبزہ زار سے آراستہ تھا۔ اپنی اندھیری کی اس بود و باش پر اکثر خطوں میں صنعتِ ایہام سے کام لیتے۔ جب کسی مہمان کو اپنے یہاں قیام کی دعوت دیتے تو لکھتے یا کہتے کہ آپ کے آجانے سے اندھیری میں اجالا ہو جائے گا۔ لیکن میرے خیال میں اندھیری کا اجالا وہ خود تھے۔

نجیب اشرف مرحوم سے سیکڑوں طالب علموں اور استادوں نے استفادہ کیا۔ ان میں اکثر نے حسبِ روایت جدید اظہارِ تشکر کی ضرورت تک نہیں سمجھی۔ اکثر ان سے خفا اور شاکی بھی ہو گئے۔ وہ کام کرنے والے آدمی کی علمی مدد میں کبھی دریغ نہیں کرتے تھے البتہ نکمے کو صاف کہہ دیتے تھے کہ تحقیق ان کے بس کا روگ نہیں۔ انھیں اس سے زیادہ خوشی اور کسی بات میں نہیں ہوتی تھی کہ کسی علمی مانگ سے انھیں تگ و دو میں مبتلا کر دیا جائے۔ جب مجھے سرخیلِ دبستان بیجاپور، عبدل دہلوی کے "ابراہیم نامہ" کی تدوین کا خیال پیدا ہوا تو میں نے حسبِ معمول ان سے ذکر چھیڑا اور بتایا کہ عرصے سے اس کا سب سے قدیم اور نایاب نسخۂ خطی مہاراشٹر کی ایک چھوٹی سی سابق ریاست کے ایک کتب خانے میں پڑا ہوا ہے لیکن اس تک پہونچ صرف ایک صاحب کی ہے، جن تک میری پہنچ نہیں۔ فوراً

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

شردونے کمار ورما



شکست

میری بیوی کئی دنوں سے "فلم" دیکھنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اس لئے اس روز میں جلدی گھر آگیا تھا۔ بیوی خوش ہوگئی۔ اس نے ٹینو کو جو خرگوش کو پکڑنے کی کوشش میں پلنگ کے نیچے گھس گیا تھا۔ بچّہ کا پروگرام سنا کر جلدی سے باہر نکالا اور غسلخانے میں لے جاکر اس کا ہاتھ منہ دھلانے لگی۔ ٹینو تین سال کا ہے، لیکن اُسے چلتی پھرتی، بولتی، گاتی تصویریں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کئی باتیں اسے یاد رہ جاتی ہیں جنہیں جب وہ اپنی توتلی زبان میں دہراتا ہے تو ہم میاں بیوی خوب ہنستے ہیں۔ میری بیوی ٹینو کی باتیں ملنے جلنے والوں کو سُنا کر خوش ہوتی ہے اور فخر سے ٹینو کی طرف دیکھتی ہے۔ ہم اپنے چھوٹے سے پریوار میں بہت خوش اور سکھی ہیں۔ اور جب میں سوچتا ہوں کہ میرے سپنے سچ ہو رہے ہیں تو مجھے اپنی کامیاب زندگی پر مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ میری بیوی بھگوان کرشن کی تصویر پر پھول چڑھا کر دعا کے بعد کہتی ہے۔ "بھگوان، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، تو نے مجھے سب کچھ دیا ہے" اور میں جو ناستک ہوا کرتا تھا، دھیرے دھیرے آستک ہوا جا رہا ہوں۔

ٹینو کو نئے کپڑے پہنا کر، بال سنوار کر میری بیوی خود تیار ہونے لگی میں نے اسے ہری بنگلوری ساری پہننے کے لئے کہا۔ پچھلی شام میں وہ ساری اپنی شادی کی سالگرہ پر "تحفہ" لایا تھا۔ ہم دونوں کو وہ رنگ بے حد پسند تھا۔ اس کے پاس اسی رنگ کی ڈہوزی کی ہاتھ کی کڑھائی کی چپل بھی تھی۔ یوں بھی ساری میں میری بیوی کا صحت مند جسم بہت کھلتا ہے۔ اس کی شخصیت کا وقار اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

میں صحن میں بیٹھا ٹینو سے دن بھر کے کارنامے سن رہا تھا۔ وہ اس وقت مجھے خرگوش کے کانوں اور نرم بالوں والے جسم کے بارے میں، بھول بھول کر کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی سمے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا کھڑا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اُسے اندر بلا لیا۔ آتے ہی اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔

"میں لالہ سکھ دیال جی کا لڑکا ہوں۔ یہ تار دلی سے آیا ہے۔ کیس ملتوی کرانے کے لئے جو درخواست دی تھی وہ ٹری بیونل Tribunal نے ریجیکٹ کر دی ہے، اور کل پیشی ہے۔"

میں نے تار پڑھا۔

"پتا جی کہتے ہیں کہ آپ آج ہی فرنٹیر میل سے دلی چلے جائیں۔ وہ بیمار ہیں۔ یہ ڈھائی سو روپے بھی بھیجے ہیں۔ اس نے روپے جیب سے نکال کر دیئے۔ اور چلا گیا۔

میری بیوی برآمدے میں کھڑی سب کچھ سُن رہی تھی۔ وہ قدرے اُداس ہوگئی۔ "آج ہی جاؤ گے۔؟"

"ابھی — میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم میرا اٹیچی تیار کر دو، میں ذرا

لٹ لے آؤں"۔

سیٹ بک کروا کر جس وقت میں لوٹا، میری بیوی میرا سامان تیار کر چکی تھی ور خود ایک سوتی دھوتی پہنے کچن میں کام کر رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ کاش روزی لانے کے لیے گھر سے دور نہ جانا پڑتا۔

دھلی پہنچ کر میں اپنے مخصوص ہوٹل میں ٹھہرا۔ ناشتہ وغیرہ کر کے وقت پر ڈیوٹی کے دفتر پہنچ گیا۔ گھنٹہ بھر بعد میری باری آئی اور پندرہ بیس منٹ یں فارغ ہو گیا۔ اپیل منظور ہو گئی تھی۔ باہر آکر میں نے لالہ جی کو خوشخبری کا تار دیا ور نہایت ہلکے پن اور مسرت کے احساس سے آسمان کی طرف دیکھا۔

اسٹیشن جا کر واپسی کے لیے سیٹ بک کروائی اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ سارا دن کہاں اور کیسے گزاروں۔ گاڑی رات نو بجے جاتی تھی۔ ایک دوست کو فون کیا۔ پتہ چلا وہ دلی سے باہر گیا ہوا ہے۔ ایک قدرے اکانت سے ہوٹل میں کھانا کھایا اور باہر آکر شہر کی رونق دیکھنے لگا۔ ایک خالی ٹیکسی میرے قریب آکر رکی تو میں اس میں سوار ہو گیا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی مجھے خیال آیا کہ یونہی مارے مارے پھرنا فضول ہے۔ آرچنا سے مل لیا جائے۔ پھر تو یہ خیال میرے دل و دماغ پر حاوی ہوتا گیا۔ میں نے ڈرائیور کو اس کا پتہ دیا اور سگریٹ سلگایا۔

آرچنا سے کیوں ملوں، کیوں ملنا چاہتا ہوں میں اس سے، کیا یہ اپنی وفا شعار بیوی سے بے وفائی نہیں ہوگی۔ اس میں بے وفائی کی کیا بات ہے، اُسے تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے میری زندگی میں ایک لڑکی آئی تھی۔ ہمارے تعلقات جنسی نہیں تھے۔ اور آج بھی میں ارچنا کو اس ارادے سے نہیں ملنا چاہتا۔ لیکن کیوں ملنا چاہتا ہوں۔؟ امرتسر میں مجھے بھابی سے معلوم ہوا تھا کہ ارچنا سخت بیمار ہے اور وہ بمبئی سے دلی آگئی ہے۔ اپنے بھائی کے پاس۔ آرچنا دلی میں ہے — آرچنا دلّی میں ہے — وہی ارچنا جس کے ساتھ زندگی کے چند خوبصورت لمحے گذارے ہیں۔ اس کا حال تو معلوم کرنا ہی چاہئے۔ بیوی کو تو سب معلوم ہے۔ اس نے ایک دن خود ہی بات شروع کی تھی۔

"تم نے ارچنا سے شادی کیوں نہیں کر لی؟"

"وہی نہیں چاہتی تھی"

"کیوں — ؟"

"یہ اس نے کبھی نہیں بتایا"

"عجیب لڑکی ہوگی —!"

"ہاں، کچھ کچھ —"

ٹیکسی اپنی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ جوں جوں میں آرچنا کے گھر کے قریب آتا جا رہا تھا، ایک عجیب سا دکھ، عجیب سی اداسی میرے سارے وجود پر گہرے بادلوں کی طرح چھائی جا رہی تھی — وہ بیمار تھی۔ اُسے بچپن سے دمہ کی شکایت تھی اور یہ مرض اسے اپنی والدہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ اس خطرناک احساس نے کہ اسے دمہ جیسی لاعلاج بیماری ہے، اسے بجھا کر رکھ دیا تھا وہ چند منٹ کی گفتگو کے بعد بتانے لگتی کہ اُسے دمہ ہے جو کبھی ٹھیک نہیں ہوتا — اور جب یہ سن کر اس کے ملنے والے احتیاط سی برتنے لگتے تو وہ ہنستی۔ اُسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا۔ لیکن تنہائی میں گھنٹوں روتی رہتی کبھی کبھی اُسے جانے کیا ہو جاتا کہ علاج چھوڑ کر شدید قسم کی بدپرہیزی شروع کر دیتی۔ یہ دور جنونی کیفیت رکھتے تھے — یہ تمام باتیں مجھے اپنی بڑی بھابی سے گاہے بہ گاہے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ ارچنا کی بڑی بہن بھابی کے بھائی سے بیاہی تھی یا کبھی کبھی ان دوروں کی خبر مجھے اپنی ننہال سے مل جاتی۔ ارچنا کا مکان میری ننہال والی گلی کے بالکل سامنے ہی تھا۔ ایک جوان لڑکی کے بارے میں ایسی باتیں سن کر میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی اور نہ جانے کیوں بار بار دل میں یہ خیال آتا کہ مل کر اسے سمجھاؤں، اب من کو کریدتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ میں اپنے احساسِ برتری کی تسکین چاہتا تھا، اور یہ خیال اس وقت اور بھی شدت اختیار کر گیا جب اس کی شادی کی بات چل رہی تھی لڑکے والوں نے اسے پسند کر لیا تھا۔ اس کے سانولے رنگ میں بڑی نمکین سی کشش تھی۔ آنکھیں گہری، ساون کی گھٹاؤں کی سی، تب جسم بھی گداز اور صحت مند تھا۔ اس کی ماں خوش تھی ارچنا نے بھی باقاعدہ علاج شروع کر دیا تھا کہ ایک دن ان لوگوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لڑکی کو دمہ ہے اور کہ یہ بات اُن سے چھپا کر انہیں دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے — اس رات آرچنا نے شربت اور دوا کی شیشیاں کھڑکی سے نیچے پھینک دیں اور جی بھر کر بدپرہیزی کی۔ اس کی ماں بہت روئی، لیکن اس کی آنکھیں خشک رہیں۔

ایک شام وہ میری بھابی کے ساتھ ہمارے گھر آگئی۔ بھابی اسے میرے کمرے میں لے آئیں اور خود چائے وغیرہ کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے پڑھائی ترک کر دی ہے اور وہ سارا سارا دن گھر میں پڑی رہتی ہے۔ اس کی باتوں اور لہجے سے ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنا مذاق اڑا کر سننے والوں کو خود سے نفرت کرنے کے لیے اکسا رہی ہے۔ میں نے اس سے شاید جوش میں دو چار نصیحت جملے کہہ دیئے

سن کر وہ ایسے مسکرادی جیسے کسی بچے کو ٹال رہی ہو ۔۔۔

" ارچنا، تمہیں آگے پڑھنا چاہیئے ۔۔"

" کیا لابھ ہوگا ۔۔ ؟"

" گھر سے نکلنے کا موقعہ ملے گا۔ لوگوں سے ملوگی۔ دل بہلے گا۔ یوں بھی تعلیم زندگی میں کسی وقت بھی کام آسکتی ہے ۔۔"

" ہم ۔ وہ تو ہے ۔۔"

میں نے محسوس کیا، میری باتوں پر وہ سنجیدگی سے توجہ نہیں دے رہی۔ اس سے بُرا بھی لگا۔ لیکن اس کی بیماری کا خیال کر کے میں نے اپنے لہجے میں تلخی یا جھنجلاہٹ نہیں پیدا ہونے دی۔ اور بھی زیادہ ہمدردی اور نرمی سے کہا۔

" تم دنیا سے کترا کترا کے اپنے آپ میں سمٹنے لگی ہو۔ اس طرح انٹروورٹ (Introvert) ہو جانا خطرناک ہے۔ اس خول سے باہر نکلو۔ یہ دنیا بہت خوبصورت ہے ۔۔"

اس مرتبہ غور سے اس نے میری طرف دیکھا، جیسے میرے چہرے پر کچھ پڑھ رہی ہو ۔۔ اس سمے اس کی آنکھوں میں کریدنے والی ذہانت اور سنجیدگی کی چمک تھی۔ بہت کم چہروں پر میں نے ایسی آنکھیں دیکھی ہیں ۔ سوچنے والی، بولنے والی آنکھیں ۔۔ اس لمحہ میں اس کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ آہستہ، لیکن لہجے کی پختگی سے بولی۔

" میں نے ڈیل کارنیگی کی کتابیں پڑھی ہیں ۔۔"

مجھے اس کی بات پر غصہ آگیا، لیکن میں برداشت کر گیا۔

چند دنوں بعد مجھے بھابی سے معلوم ہوا کہ ارچنا نے ایک پرائیوٹ اکیڈمی میں داخلہ لے لیا ہے۔ اس کا ارادہ بی۔اے اور پھر ایم۔اے کرنے کا ہے۔ مجھے اس میں اپنی فتح نظر آئی اور نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اگر میں ارچنا سے تنہائی میں ملوں تو وہ ناراض نہیں ہوگی۔ اس وقت تو میں نے یہ خیال دماغ سے نکال دیا، لیکن ایک دن اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ خیال میرے ذہن سے نکلا نہیں تھا۔ ایک کونے میں دبک گیا تھا۔ پھر وہ خیال بڑھتے ہوئے میرے پورے وجود پر چھا گیا اور مجھے ایسا لگنے لگا کہ ارچنا سے ملے بغیر میں پاگل ہو جاؤں گا ۔۔ ان دنوں شاید فلمیں دیکھ کر اور دوستوں سے ان کے معاشقوں کی رنگین داستانیں سن کر کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ شدت اختیار کر گیا تھا اور ارچنا ہی ایک ایسی لڑکی تھی جس سے بہ آسانی ملاقات ہو سکتی تھی۔

جذبہ کی شدت سے مغلوب ہو کر ایک شام میں اکیڈمی جا پہنچا۔ وہ کلاس میں تھی میں نے چٹ بھیج کر اُسے باہر بلا لیا۔ کلاس میں پڑھانے والے شاستری کی نظروں سے بچنے کے لئے وہ سیڑھیوں میں آگئی۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا، اور وہ ڈھنگ سے گفتگو بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ میرا دل بھی دھک دھک کرنے لگا تھا۔ بہ مشکل تمام میں نے کہا

" میں تم سے ملنے آیا ہوں ۔"

" کیوں ۔۔ ؟"

" یہ باہر بتاؤں گا ۔"

" میں کیسے آسکتی ہوں، کوئی دیکھ لے گا ۔"

اس کے آخری الفاظ نے میری ہمت بندھا دی۔

" میں نیچے چائے والی دوکان پر انتظار کروں گا۔" کہہ کر اسے جواب کا موقع دیئے بغیر میں تیزی سے نیچے آگیا۔

آدھ گھنٹہ بعد وہ دوکان کے سامنے سے گذری۔ دوکان میں جھانک کر ٹھٹھکی اور آگے بڑھی۔ میں اُٹھ کر اس کے پیچھے ہولیا۔ ہم رکشا لے کر کمپنی باغ کے ایک اکانت سے گوشے میں جا بیٹھے۔ ہم وہاں کوئی پون گھنٹہ بیٹھے ہوں گے۔ اس دوران میں وہ جاؤں جاؤں، اور میں بیٹھو، بیٹھو، کہتا رہا۔ پھر وہ چلی گئی۔ اسی شام میں اپنی ننہال گیا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا۔ اسی اثنا میں ارچنا کھڑکی میں آئی۔ اور مجھے دیکھ کر مسکرادی، میں نے فوراً سلام کیا۔ ادھر سے جواب آیا، اور اس طرح ہماری محبت اور یا جو کچھ آپ کہیں شروع ہو گئی۔

اب ہم ہفتہ میں دو بار ضرور ملتے۔ ہم شہر سے باہر کھیتوں میں نکل جاتے نہر کے کنارے سیر کرتے یا باغ کی کسی خاموش کنج میں جا بیٹھتے۔ میں ہر ملاقات کے بعد اپنے دوست شرما کو کچا چٹھا سناتا۔ اس طرح مجھے ایک قسم کی ذہنی تسکین ہوتی تھی۔ ایک روز میں نے اُسے ارچنا دکھا بھی دی، اور جب اس نے ارچنا کی آنکھوں اور جسم کی تعریف کی تو میرے من میں ستارے سے جگمگا گئے۔ میں ان دنوں ارچنا کے حسن وشباب کی تعریف سننے کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ارچنا مجھے ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی تھی۔ میرے چند دوست تو شجر ممنوعہ کے سائے میں چند لمحے گزار چکے تھے شرما سے صلاح کر کے ایک دن میں نے ارچنا سے کہہ دیا۔

" آج کسی دوست کے ہاں چل کر بیٹھتے ہیں ۔"

اس نے بڑی گہری اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

" تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا ۔۔ "

" ہاں ۔۔ ہاں ۔۔" میں نے دل میں سرکتے خوف کی وجہ سے ذرا

زیادہ ہی زور سے کہا۔

"تو پھر دوستوں کو چھپ کر دکھانے اور ان کے ہاں جانے کا مطلب!"

"مجھے پسینہ آنے لگا۔ کھسیانے ہو کر چند جملے میں نے معذرت میں کہے اور کسی نہ کسی طرح وہ سلگتا ہوا لمحہ ٹل گیا۔ ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک دن نہر کے کنارے کنارے ٹہلتے وہ رک گئی اور پانی کو دیکھتی ہوئی بولی۔

"تمہیں معلوم ہے میں دمہ کی مریض ہوں۔"

"ہاں ——"

"اور یہ بھی جانتے ہو کہ یہ لاعلاج ہے۔"

اس کی آواز ہر طرح کے جذبات سے عاری اور نوکیلے سنگریزوں کی طرح سخت اور کھردری تھی۔ میرا دل ایک انجانے خوف سے لرز گیا۔ لیکن میں نے مضبوط آواز میں کہا۔

"تم ایسی باتیں کیوں کرنے لگی ہو ——؟"

"تاکہ تم کبھی یہ الزام نہ دو کہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا ہے ——"

اس کا لہجہ بڑا پھیکا اور سپاٹ تھا۔ میں نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

"مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو ——"

وہ مسکرا دی۔

اور مجھے احساس ہوا کہ میرا لہجہ روٹھے ہوئے محبوب کا سا تھا۔ غصے میں آئے عاشق کا نہیں۔ اس کے بعد میں قدرے "ڈرا ڈرا بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ میں بہت کوشش کرتا کہ ارچنا کو اس بات کا احساس نہ ہو لیکن اس کی موجودگی میں میرا حال اور بھی غیر ہونے لگتا۔ ارچنا کے قریب ہوتے ہوئے اس کا بوسہ لیتے ہوئے مجھے ایک دم خیال آتا کہ وہ دمہ کی دائمی مریض ہے اور اگر یہ مرض مجھے بھی لاحق ہو گیا تو —— اور میرے وجود پر برف سی پڑ جاتی۔ مجھے سینے ٹوریم کے پلنگ پر ایک مریض پڑا کھانستا نظر آتا۔ سیاہ رنگ جو کبھی ذرا سرخ تھا۔ اندر دھنسی ہوئی ویران آنکھیں، بجھے ہوئے کوئلوں سے پچکے ہوئے گال، ہڈیوں کا ڈھانچہ، سرہانے چارٹ آویزاں، جس کی ٹیڑھی لکیر مریض کی قبر کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میری روح اس منظر سے کانپ جاتی۔ —— اگر یہ لڑکی مجھے شادی پر مجبور کرے اور اس سے میں شادی کروں تو —— ہمارے بچے بھی دمے کے مریض ہوں گے۔ اور میرا گھر اسپتال بن کر رہ جائے گا۔ میں بے حد محتاط ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" ارچنا ایک دم چونکی ہوئی پوچھتی اور اس طرح میری طرف دیکھتی جیسے میں اسے قتل کرنے کی نیت سے آیا ہوں۔

آج شادی کے بعد میں سمجھ سکا ہوں کہ عورت ان معاملوں میں کتنی حساس ہوتی ہے۔

"کچھ نہیں ——" میں صاف جھوٹ بول جاتا۔

وہ مسکرا دیتی۔ اس مسکراہٹ میں زہر ہوتا جو میری رگ رگ میں سما جاتا اور میں وحشی ہو کر سوچتا کہ اس لڑکی کا گلا دبا دوں۔ لیکن میں بیٹھا رہتا۔ وہ مسکراتی رہتی اور میں اپنی ہی نظروں میں ننگا ہوتا چلا جاتا۔

دھیرے دھیرے مجھے احساس ہونے لگا کہ ارچنا کی باتوں اور ملاقاتوں میں وہ پہلی سی گرمی اور چاہ نہیں رہی تھی۔ وہ خود سے بھی بے نیاز اور لاپروا ہو گئی تھی۔ جیسے وہ اپنے نہیں، کسی اور کے جسم کا بوجھ اٹھائے پھر رہی ہو۔ وہ عجیب اکھڑی اکھڑی، بے مطلب باتیں کرتی۔ ان ملاقاتوں میں نہ اپنا پن تھا، نہ اجنبیت، نہ محبت کی گرمی، نہ سرد مہری۔ ہم اس طرح ساتھ ساتھ بیٹھے رہتے جیسے دو قبریں ہوں۔ مجھے اپنی جنت ہاتھوں سے جاتی محسوس ہوتی۔ اور میں ہر ممکن طریقے سے اسے بچانے کی کوشش کرتا۔ ان دنوں میں نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ جھوٹ بولے۔ ہماری ملاقاتوں کا درمیانی وقفہ طویل ہو گیا۔ اور وقت کم۔ میری پیاس بڑھتی گئی۔ اب جب میں اس سے ملتا میری نگاہیں اس کے جسم کو نگلتی رہتیں، اس مسافر کی طرح جو گاڑی سے کچھ چرانا چاہتا ہو اور گاڑی منزل مقصود پر پہنچنے سے خائف ہو۔ میں اسے طویل خط لکھتا، لیکن ڈھلتا ہوا سورج گرمی اور روشنی نہ دے سکا۔

ایک روز وہ بازار میں مل گئی۔ میں زبردستی اسے اپنے ساتھ باغ میں لے گیا۔ وہ اداس تھی اور بے معنی گفتگو کر رہی تھی میں بولتا رہا۔ اپنی وفا اور اس کی بے وفائی کے قصے دہراتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ جب میں تھک ہار کر خاموش ہو گیا تو وہ بولی

"تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ——"

مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے اندر ہی کہیں چھپی بیٹھی ہے۔ میں نے تھوک نگل کر کہا۔

"تم نہ کرتی ہو تو کچھ نہیں سکتا۔ اپنے بارے میں یقین دلا سکتا ہوں"

وہ مسکرا دی اور بولی

"تمہیں کبھی مجھ سے محبت نہیں تھی۔ صرف ہمدردی تھی۔ ترس کھا کر تم ایک بیمار لڑکی کو ڈھارس دینے چلے آئے تھے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اب تم خود ڈرنے لگے ہو۔"

"غلط" —— میں بھڑک اٹھا

"بہت کم لوگ اپنی کمزوری کا اعتراف کر سکتے ہیں —"

"تم شاید سائکولوجی، اور سائکولوجسٹ پڑھتی ہو۔"

وہ پھر مسکرائی —

"اگر تمہیں اس خیال سے تسکین ملتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تم میری محبت کا مذاق اڑا رہی ہو —"

"تمہیں محبت کبھی تھی ہی نہیں —"

"یہ غلط ہے —"

"ضد کرنے سے تم خود کو سچا ثابت نہیں کر سکتے۔"

"میں ثابت کر سکتا ہوں۔"

"کیا — ؟"

"یہی کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"کیسے — ؟"

"شادی کرکے —"

اس نے گہری، دل تک اتر جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا، میں یکبارگی لرز گیا۔ وہ مسکرائی۔ مجھے اس مسکراہٹ سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ بولی۔

"میں تم سے شادی نہیں کر سکتی —"

"کیوں — ؟"

"میری مرضی —"

"عورت ہمیشہ بے وفا رہی ہے —"

"ہاں —" وہ نہایت اطمینان سے بولی۔

میں نے جی کھول کر اسے برا بھلا کہا۔ عورت ذات پر حملے کیے۔ تواریخ اور لٹریچر سے بے وفا عورتوں کی مثالیں دیں وہ اس دوران میں ہنستی رہی۔ میں چاہتا تھا وہ بھی بھڑکے، لیکن وہ کسی دیوی کی طرح مسکراتی اور ہنستی رہی۔

اس واقعہ کے بعد ہم بہت دنوں تک نہیں مل سکے۔ پھر معلوم ہوا وہ بمبئی چلی گئی ہے۔ میری شادی ہو گئی۔ بچہ ہو گیا اور میں سب کچھ بھول کر نئی زندگی کی لطافتوں میں کھو گیا۔

بھائی نے ایک روز بتایا کہ ارچنا کی والدہ کا بمبئی میں انتقال ہو گیا ہے اور اب وہ اپنے بھائی کے ہاں دلّی میں ہے۔ میں نے افسوس کا خط لکھا اس میں اپنی بے لوث محبت اور اس کی بے وفائی کا ذکر بھی کر دیا۔ اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا اور وہ تقریباً میرے ذہن سے نکل گئی۔ جب کہیں چار دوست اپنے معاشقوں کا ذکر کرتے تو میرا سر غرور سے تن جاتا کہ میں بھی کسی سے کم نہیں۔ ایک لڑکی میری زندگی میں بھی آ چکی ہے۔

اور اس روز ٹیکسی میں بیٹھتے ہی مجھے اچانک اس کی یاد آ گئی تھی — میں کیوں اس سے ملنا چاہتا ہوں، کیا یہ بتانے کے لیے کہ میں ایک شاندار خوشگوار اور آرام دہ زندگی گذار رہا ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ بیوی ہے، بچہ ہے اور معقول آمدنی ہے۔ اس گھر میں وہ میرے بچے کی ماں بن کر رہ سکتی تھی وہ گھر، اس کی ہر چیز اس کی ہو سکتی تھی خود اس کی بے وقوفی اور ضد نے یہ سب کھویا تھا — آج اتنے برسوں کے بعد مل کر میں اپنی کامیاب زندگی کی چکاچوند سے اس کی آنکھیں خیرہ کر دینا چاہتا تھا۔ اس سے ان لمحات کا بدلہ لینا چاہتا تھا جب وہ مجھ پر ہنستی تھی — نہیں، میں تو اس کی مزاج پرسی کے لیے جا رہا تھا۔ وہ بیمار تھی۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔

ٹیکسی ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ ارچنا کے بھتیجے بھتیجیوں نے بتایا کہ وہ اپنی بہن کے ہاں چلی گئی ہے اور دروازہ بند کر لیا۔ ٹیکسی لے کر اس کی بہن کے گھر گیا۔ وہ مجھے اچانک وہاں دیکھ حیران رہ گئی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ارچنا نے نوکری کر لی ہے اور اب اس کے پاس رہتی ہے۔ بہانے سے میں نے ارچنا کے دفتر کا پتہ لیا۔ وہاں سے میں سیدھا ڈیفنس کالونی پہنچا۔

دفتر اوپر کی منزل میں تھا۔ دروازے پر کھڑا چپراسی مجھے صاحب کے پاس لے گیا۔ میں بڑے سے ہال سے گزر کر گیا تھا۔ جس میں بہت سے آدمی کام کر رہے تھے۔ ایک ونگ میں چند لڑکیاں ٹائپ کر رہی تھیں۔ انھیں میں ارچنا بھی تھی۔ وہ اسے سے مشین پر کاغذ چڑھا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ میں تیزی سے اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جو چپراسی نے میرے لیے کھولا تھا۔ اور جس پر کسی مسٹر سرانی کی نیم پلیٹ لگی تھی۔

اندر جا کر میں نے مینیجر یا جو کچھ بھی وہ تھا، سے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔ اس نے چپراسی کو بلا کر مس ارچنا دیوی کو بلانے کے لیے کہا میری طرف دیکھا اور سگریٹ پیش کر کے کام میں مصروف ہو گیا۔ چپراسی نے بتایا کہ وہ ضروری لیٹر نکال کر آتی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ آ گئی۔ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ گال پچک گئے تھے۔ آنکھوں میں زردی اور خشکی رچ گئی تھی۔ رنگ سیاہ ہو رہا تھا۔ اس نے سستی سی سوتی ساری پہن رکھی تھی۔ اور پیروں میں معمولی چپل تھے۔ مجھے دکھ سا

اس نے ہاتھ جوڑ کر نستے کی۔

میں نے شُدھ ہندی میں منیجر سے کہا کہ میں آرچنا کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور گوراشاہی انگریزی میں اپنے دفتر کے اصول سمجھا کر مجھے باہر انتظار کرنے کے لئے کہا۔ میں وزیٹرز روم میں جا بیٹھا اور رسالوں میں غوطے کھاتا رہا ـــ دفتر بند ہونے پر ارچنا آئی۔

"کیسا آدمی ہے تمہارا باس ـــ"!

وہ ہنسی۔

"تم اگر انگریزی میں بات کرتے تو چھٹی دے دیتا"

ہم ہنستے ہوئے نیچے آگئے۔

"چلیں ـــ؟" میں نے پوچھا

"کہاں ـــ ؟"

"اس وقت میں تمہارے شہر میں ہوں، جہاں کہو گی چل دوں گا"

"گھر چلتے ہیں ـــ"

"نہیں ـــ"

"تو پھر کہاں ـــ؟"

ارچنا کی ہم جولیاں بس اسٹاپ پر کھڑی تھیں۔ سب نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ میں نے ایک ٹیکسی اشارے سے روکی۔ ایک لڑکی نے ہاتھ ہلا کر ارچنا سے کہا۔

"وِشس یو لک ـــ"

"وہ سب ہنس دیں۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور سے انڈیا گیٹ چلنے کے لئے کہا اور ارچنا کی طرف دیکھا۔ اس سے ملنے سے پیشتر سوچا تھا کہ مل کر بہت سی باتیں کروں گا۔ اس کی سنوں گا اپنی کہوں گا۔ لیکن اس سے مل کر جیسے یہ سب کچھ فضول اور بے کار معلوم ہونے لگا۔ مجھے وہ ٹیکسی اور اس میں اپنا دونوں کا وجود ایک لطیفہ معلوم ہو رہا تھا ـــ آخر اس ملاقات کا مطلب۔ میں نے دل کو سمجھایا اور گفتگو کرنے پر آمادہ کیا لیکن الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ طبیعت میں الجھن اور بوجھ کا سا احساس بڑھنے لگا۔ اس سے بچنے کے لئے میں نے ارچنا کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کمزور، پتلا، ہاتھ، برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ مجھے اپنی بیوی کا گداز، گرم، جاندار ہاتھ یاد آیا۔ جس میں زندگی ہے۔ اس کی کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں بجتی ہیں۔ ارچنا کی کلائیاں سوکھی اور ویران تھیں اسے دیکھ کر گاؤں کی طرف جانے والی کسی پگڈنڈی کا خیال آیا، جس پر دھول اڑا کرتی ہے۔ مجھے جرم کا احساس ہوا اور میں باوجود کوشش کے اس سے نظر نہ ملا سکا۔

وہ بُت بنی بیٹھی رہی میں نے بایاں ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی چبھنے لگی ـــ اس نے کوئی حرکت نہیں کی ـــ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میرے اندر الفاظ گونج رہے تھے۔ کیا کہنا چاہتا تھا یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اگر یونہی خاموشی رہی تو میں اس کے قدموں پر سر رکھ کر رو دوں گا۔

"ارچنا ـــ!"

"ہوں ـــ؟"

میں پھر بھول گیا کہ کیا کہنا ہے، شاید کچھ تھا ہی نہیں کہنے کو۔ میں نے ہاتھ آگے سرکایا۔ اس کی چھاتی میرے ہاتھ تلے تھی۔ اور مجھے ایک پل کو ایسا لگا جیسے میں کسی قبرستان میں آگیا ہوں اور ایک تازہ کھودی ہوئی قبر کا ٹھنڈا اندھیرا مجھے نگلنا چاہتا ہے۔ اس ہاتھ سے میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اپنی طرف کیا، اس کی آنکھوں میں ٹھنڈی چتا کی سی کیفیت تھی۔

"اسی لئے آئے تھے ـــ"

اور مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے قطب مینار کی بلندی سے نیچے پھینک دیا ہو۔ میرا ہاتھ بے جان ہو کر لٹک گیا۔

ٹیکسی نے ہمیں انڈیا گیٹ پر اتار دیا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے ریسٹوراں میں جا بیٹھے۔ لوگ کھانے پینے میں مشغول تھے۔ بچے گھاس پر کھیل رہے تھے۔ ارچنا نے گھاس پر بیٹھنا پسند کیا۔ ہم نے سینڈوچیز اور کافی منگوائی۔ میں نے بات چلائی۔

"تم میری موجودگی، میرے ساتھ کو پسند نہیں کر رہیں، صرف برداشت کر رہی ہو ـــ"

"ایسی بات نہیں ـــ"

"تو پھر خاموش کیوں ہو ـــ"

"میرے پاس کہنے سننے کو ہے کیا ـــ"

میں نے نظریں جھکا لیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں زمین میں دھنسا چلا جا رہا ہوں۔ میں نے خود کو کھینچ کر باہر نکالا اور بولا۔

"تم نے نوکری کب کی ـــ"

"سال بھر ہو گیا ـــ"

"اچھا کیا اس طرح دل تو بہلا رہتا ہے ـــ"

(میں نے محسوس کیا کہ میری باتیں محض الفاظ ہیں۔ ان کی روح غائب ہے)

"ہاں — " وہ مسکرا دی۔ پھر بولی — "بہن پر بوجھ بن کر تو نہیں رہ سکتی۔ دلّی جیسے شہر میں گذارہ بھی نہیں ہوتا — "

"تم بھائی کے پاس کیوں نہیں رہتیں — ؟"

"تم نے رہنے جو نہیں دیا — "

"میں نے — ! — "

"تمہارے خط نے میرے لئے مصیبت کھڑی کر دی تھی — " اس نے راشٹرپتی بھون کی طرف دیکھا اور بولی — "اب تم مجھے خط کیوں لکھتے ہو، کیا ضرورت ہے اس کی۔ تم نے لکھا تھا میری محبت تمہارے دل میں ابھی تک تر و تازہ ہے — اور تمہاری بیوی کی محبت !" اس نے میری آنکھوں میں دیکھا —

میرے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا اس لئے گول کر گیا۔

"تمہیں اس سے تکلیف ہوئی ہے۔ تمہاری ذات کو نقصان پہنچا ہے تو مجھے افسوس ہے۔ میں اس کے لئے معافی مانگ سکتا ہوں۔"

"نہیں، نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اس نے بچوں کو دیکھا — پھر کہنے لگی — " وہ خط بھائی صاحب کے ہاتھ آ گیا تھا۔ بھابی نے وہ وہ باتیں بنائیں کہ توبہ۔ بھابی کہنے لگیں یہ کسی کے ساتھ بھاگنے کی تیاری کر رہی ہے۔ بھائی بولے تو مر جا تو اچھا ہے — آرچنا کا گلا رندھ گیا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

میری چھٹی حس نے بتایا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں نے آہستہ سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ پھپھک کر رندھی، اور آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولی۔

"میں نے ٹنکچر پیا لیکن مجھے موت بھی نہیں آئی — "

مجھے اپنے چاروں طرف ڈراوا، سرد اندھیرا پھیلا محسوس ہوا۔ دو عورتیں ہمیں غور سے دیکھتی گزر گئیں۔ میں نے ارچنا کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"ارچنا تم جو سزا دو میں بھگتنے کو تیار ہوں جو کہو کروں گا۔ بھگوان کے لئے رو و نہیں — "

"ارچنا نے آنسو پونچھ لئے —

"میں — میں کہنے یا سزا دینے والی کون ہوتی ہوں —

چلو چلیں — وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پل اداکر کے ہم باہر آ گئے اور نہر کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ شام گہری ہو چلی تھی۔ درختوں پر پنچھی اتر رہے تھے، اور فضا ان کے شور سے گونج رہی تھی فروری کی شام خنک ہو چلی تھی۔

ارچنا سردی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنی باریک دھوتی میں سمٹی جا رہی تھی اور ہمارے درمیان خاموشی کی دیوار بلند ہوتی جا رہی تھی۔

"دلی کو تو سرخ پتھروں کا شہر کہنا چاہیے۔"

"ہاں — "

"ہاں یہ مقبروں اور قدیم تواریخی عمارتوں کا شہر ہے — "

"ہاں — "

"یہ مقبروں اور قدیم تواریخی عمارتوں کا شہر ہے۔"

"ہاں — "

"اب دلی بہت پھیل گئی ہے۔"

"ہاں — "

میں نے چلتے چلتے سوچا کہ جب خاموشی کے بعد مرد اور عورت شہر پتھروں اور موسم کی باتیں کرنے لگیں تو انھیں فوراً جدا ہو جانا چاہیے۔ ورنہ بوریت بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے پاس کہنے سننے کو کچھ نہیں تھا۔ مجھے اپنی اس حرکت پر کہ میں بے کار ہی ارچنا سے ملنے چلا آیا، غصہ آنے لگا، جو دھیرے دھیرے رنج اور اُداسی میں بدل گیا۔ میں سوچنے لگا کہ میری بیوی میری منتظر ہوگی، نو بجے میں گاڑی میں سوار ہوں گا سونے سے پیشتر کوئی ہلکا پھلکا ناول پڑھوں گا یا اپنے ہم سفر سے بے معنی گفتگو کروں گا۔ اور سو جاؤں گا۔ صبح گھر جا پہنچوں گا — اور اب جا کر بیوی کے لئے کوئی ساری اور ٹینو کے لئے کھلونے خریدنا ہیں، ورنہ جب میں گھر پہنچ کر اٹیچی کھولوں گا تو وہ اس میں اپنے لئے کچھ نہ دیکھ کر اُداس ہو جائے گا۔

ارچنا اس وقت درختوں میں پھیلے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔ میں اس سے یہ بھی پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا وہ کیا سوچ رہی ہے۔ شاید وہ اپنے دفتر کے کام کے بارے میں سوچ رہی ہو کسی لیٹر کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ جو اسے کل جا کر ٹائپ کرنا ہے۔ اس کے ہاتھ میں جے بی منگا رام کی ٹافیوں کا خالی ڈبہ تھا، جس میں دفتر جانے والے گھر سے کھانا لایا کرتے ہیں۔ اس پر شارٹ ہینڈ کی نوٹ بک اور پٹ مین کی کتاب اور کنجی تھی۔ وہ شارٹ ہینڈ سیکھ رہی تھی تاکہ کوئی بہتر نوکری تلاش کر سکے۔

"اب چلیں — " میں نے کہا

ہم ٹیکسی لے کر جن پتھ پر آ گئے۔ وہاں سے بیوی کے لئے سینڈل اور ساری خریدی۔ ٹینو کے لئے کھلونے لئے اور ارچنا کے انکار کے باوجود

اس کے لئے شال خریدا۔ وہ اس اثنا میں بالکل خاموش اور کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی تھی۔ اس کی انگلیوں کی گرفت خالی ڈبے پر سخت ہو گئی تھی۔

"اب تمہیں گھر پہنچا دوں ——"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ ہم پھر ٹیکسی میں تھے۔ نئی دلی کی کشادہ سڑکوں پر روشنیوں کا سیلاب اُمڈ رہا تھا اور زندگی شور تھا، ہما ہمی تھی۔ کافی ہاؤس کے باہر چہل پہل تھی۔ ریگل میں کوئی نئی فلم ریلیز ہوئی تھی۔ انسانوں کا ہجوم بپھرے ہوئے دریا کی طرح ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اور ہم دونوں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ایک دوسرے سے فاصلے پر بیٹھے ہوئے کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا گھر پہونچ کر بیوی کو فلم دکھاؤں گا۔

"کیا سوچ رہی ہو —— ؟" میں نے ارچنا سے پوچھا

"کچھ نہیں ——"

اس کی آواز، اس کا لہجہ اس کی زندگی کی طرح خالی تھا۔ ارچنا کے گھر سے کچھ فاصلے پر میں نے ٹیکسی رکوائی۔ ہم دونوں اترے۔ ایک منٹ خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔ میں جلدی سے پچھلی سیٹ پر آ بیٹھا اور ڈرائیور کو اپنا ایڈریس دے کر پشت پر سر ٹکا دیا۔

جہاں ابھی ابھی ارچنا بیٹھی تھی، وہاں سیٹ پر ہلکا سا گڑھا بن گیا تھا —— میں نے آنکھیں موند لیں —— میں نے سوچا —— اچھا ہی کیا کہ بیوی اور بچے کے لئے چیزیں خریدتے ہوئے ارچنا کو بھی شال لے دیا، ورنہ اس کے دل پر کیا گزرتی"، اور شاید میرے دل پر بھی بوجھ بنا رہتا۔ ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ پتلی سی دھوتی میں سردی محسوس کرنے لگی تھی۔ میں نے اچھا ہی کیا۔

ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رک گئی، میں نے باہر نکل کر پیکٹ سنبھالے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شال والا پیکٹ بھی وہیں تھا۔ اور خاکی کاغذ پر ایک جگہ پانی سے دھبہ سا پڑ گیا تھا۔ جیسے کوئی اس پر روتا رہا ہو۔

دریا گنج کی ساری چہل پہل روشنیوں کے باوجود تاریکی میں ڈوب گئی۔

بقیہ ایک خط چند یادیں

کمر بستہ ہو گئے کہ اس کی نقل جس طرح ہو گی میرے لئے حاصل کریں گے۔ کئی سال کی مسلسل کاوش کے بعد بھی انھیں اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بات آئی گئی ہوئی، میں نے مایوس ہو کر اس کی تدوین کا خیال ترک کر دیا۔ اس واقعہ کے کئی سال کے بعد اچانک خط ملا کہ مطلوبہ مخطوطہ قابو میں آگیا ہے۔ ضرورت ہو تو اس کا فوٹو عکس بھیج دوں۔ یہ خبر سن کر میری مسرت اور حیرت کی انتہا نہیں رہی، فوراً منی آرڈر سے رقم روانہ کی اور چند ہفتوں میں مخطوطہ کا فوٹو عکس میرے ہاتھوں میں تھا۔ ابراہیم نامہ مرتب ہو کر اب طباعت کے آخری مراحل سے گزر رہا ہے لیکن اس کی اشاعت پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا انسان آج دنیا میں موجود نہیں! ان کو آخری خط میں میں نے خوشخبری سنائی تھی کہ اس کا پہلا نسخہ چند ہفتوں کے اندر ان کے ہاتھوں میں ہوگا۔

زندگی جبر و اختیار کا ایک معجونِ مرکب کہی جاتی ہے۔ اختیار ہوتا تو انسان اس کے جبری حصص کے پرخچے اڑا دیتا۔ وقت کے سیلِ رواں میں انفرادیت کی وہ لہریں جو اتفاقاً اس کے وجود سے آ ٹکراتی ہیں اور پھر تھوڑی دیر تک ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اسی کا نام رفاقت ہے۔ یہ رفاقت چند دنوں کی بھی ہو سکتی ہے اور چند سالوں کی بھی۔ نہ پوچھئے اس لہر کی کم نصیبی اور احساسِ تنہائی جو سیلِ زماں میں دور تک اور دیر تک چلتی رہے جس کے پیچھے رفاقت کے جنازے تیرتے ہوں اور آگے عدم کا دہانہ! ؎

گفتم از اہلِ فنا گر خبرے ہست بگوی
گفت ایں قافلہ بے گردِ رہ و بانگِ دراست

ہماری آگہی

وحید اختر

ہمارے پاس اور کیا ہے
زیست کو سنوارنے کا بے قرار حوصلہ
حیات و کائنات کو نئے معانی بخشنے کی جستجو،
طلب کے جام میں نگار مقصدوں کا کچھ لہو،
شکستِ خواب میں بھی خواب دیکھنے کی آرزو،
تمہارے اور سب کے واسطے کھلا ہے دِل کا زخم بے رفو،
نظر کی آگ لاکھ بجھنے پر بھی آفتاب خُو، زمین و آسمان جُو،
ہمارے پاس اور کیا ہے
خود سے اور اپنے خواب دیکھنے کے حوصلے سے عمر بھر نباہنے کا ولولہ

ہمیں دیا ہی کیا ہے زندگی نے
زخم کھانے، مرنے اور مر کے زندہ رہنے کے سِوا
مگر یہ ہم بھی جانتے ہیں
زخم کا شمار اور صرف بار بار موت کا حساب ہی نہیں ہے زندگی
جو ایک بار کُل کی کُل لکھی ہوئی مِلی ہے وہ کتاب ہی نہیں ہے زندگی
جو لمحہ لمحہ ٹوٹتا ہے جسم و جاں پہ، وہ عذاب ہی نہیں ہے زندگی!
فضائے بے کراں و بحرِ بے کنار بھی ہے، اک حباب ہی نہیں ہے زندگی
ہمیں ملا ہی کیا ہے آگہی سے
جہل کا فروغ، بے بصیرتی کا اوج دیکھ دیکھ کر سُلگنے کے سِوا
مگر یہ ہم بھی جانتے ہیں
روشنیِ طبع ان جہنموں کا قہر اور بلا نہیں، کچھ اور ہے
فروغ جہل اہلِ دہر کے لیے سزا نہیں، کچھ اور ہے
یہ بے بصیرتی کا اوج روشنی کا مدعا نہیں، کچھ اور ہے
سُلگتے رہنا، کچھ نہ کہنا، آگہی کا منتہا نہیں، کچھ اور ہے
ہم آگہی و زندگی کے رمز خوب جانتے ہیں نا قدان جستجو:
محققانِ مُردہ جُو! ـــــ مدرسانِ کہنہ خو!

تمہارے پاس اور کیا ہے
اقتدار کی ہوس ـــــ بلند کرسیوں کی تشنہ آرزو،
رٹے رٹائے کچھ سبق
کتاب، دوسرے جو تم کو لکھ کے دے گئے ہیں، اس کے کچھ ورق
وہ زندگی، جو رائیگاں، فضول عیش کی طلب
فروغِ جہل نے جو تم کو دی ہے بے بصیرتی کے ہاتھ سے، وہ اک سند
تمہارے پاس اور کیا ہے ـــــ مستعار فلسفے
جو میٹھی گولیوں کی طرح گھل سکیں
نہ منہ کا ذائقہ خراب ہو، نہ ہو زبان تلخ
تمہیں دیا ہی کیا ہے زندگی نے
دورِ کارزارِ وقت سے بھٹکتے رہنے، قبریں گننے،
اور دوسروں کے زخم کی ہنسی اڑاتے رہنے کے سِوا
تمہیں کوئی خبر نہیں ـــ کہ زخم کا شمار اور موت کا حساب بھی ہے زندگی
نئے سرے سے جس کو لکھنا ہے، وہ اک کتاب بھی ہے زندگی
نئے معانی کی تلاش میں جو لمحہ لمحہ ٹوٹتا ہے، وہ عذاب بھی ہے زندگی
جو ٹوٹ ٹوٹ کر بھی بار بار سر اٹھا سکے، وہ اک حباب بھی ہے زندگی؛
تمہیں ملا ہی کیا ہے آگہی سے
کھوکھلی شکستہ سیپیوں، چمکتے شوخ سنگریزوں کے سوا
تمہیں کوئی خبر نہیں ـــــ کہ روشنیِ طبع اپنی آگ کے جہنموں کا قہر ہے
فروغ جہل امتحانِ دہر ہے
ہوس کا اقتدار، اقتدار کی ہوس کا زہر ہے
خود اپنے دل کی بات کہنے کی اُمنگ خُوں کی ایک لہر ہے

ہمارے پاس کچھ نہیں ـــ تمہارے پاس سب سہی
مگر تمہارا سب کا سب نہ آج کو بدل سکا، نہ کل کے کام آئے گا
ہمارے پاس جو بھی ہے ـــ وہ آج کی ہے آگہی
ہم اپنی خود کتاب ہیں، ہم اپنے خود کتاب خواں
ہم آج لکھ سکیں اگر
تو آج ہی کی آگہی بنے گی کل کی زندگی

مرتضیٰ حسین بلگرامی



عبرت نامہ

نسیم آئی میرے قفس میں عبث
گلستاں سے دو پھول لائی نہیں

میرؔ

ہندوستان کی تاریخ بہادروں اور جی داروں سے بھری ہوئی ہے۔ ملک وملت کے جاں نثاروں اور فدائیوں کے نام صفحۂ تاریخ پر بکھرے پڑے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم نے تاریخ کے اس احسان واہم کام سے سبق نہیں لیا۔ اور جب انقلاب اندر انقلاب آیا تو ہم نے ان جاں نثاروں اور سرفروشوں کو فراموش کردیا، جنہوں نے ملک و وطن کے لئے قربانیاں دیں۔ اس کی عظمت اور آن بان کے لئے اپنی شمعِ حیات کی قدر نہ کی۔ ایسے فدائیوں میں ٹیپو سلطان، نواب بدیع الزماں آف بیربھوم، جبتندر ناتھ داس، راجہ رام نرائن موزوں، مہاراجہ موہن لال، علی وردی خاں، بھگت سنگھ، میر مدن اور سراج الدولہ جیسے سرفروش و وطن دوست کے نام نہایت فخر سے لئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایسی شخصیتیں ہیں جن سے ملک و وطن کے چراغ روشن ہیں۔ اور اندھیرے میں اُجالے کا باعث ہیں۔ لیکن آزادیٔ وطن کے بیس سال بعد ان کا نام کسی مجلس میں نہ لینا، ان کا ذکر نہ کرنا، ان کی فداکاری کے جذبے کی قدر نہ کرنا، ایک عجیب سے احساسِ کمتری کی بات معلوم ہوتی ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام؛ جو نظم کہی تھی، اس کا ایک مشہور انام مصرع ہے:

میر جعفر کی قسم، کیا دشمنِ حق تھا سراج؟

اس مصرعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج الدولہ کی موت کا غم ملک وملت کو عہدِ انگریزی میں ستاتا رہا اور حق کی یاد دلاتا رہا، لیکن افسوس آج صورتِ حال مختلف ہے۔ اقبال نے بھی اس عہد میں یہ بات کہی تھی

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن

لیکن آج وطنِ عزیز کے کسی شاعر یا کسی ادیب کے زبان و قلم سے اپنے وطن کے باکمالوں کے تذکرے نہیں نکل رہے ہیں اس عمل سے

جی کو ہے اضطراب بہت اب فراق میں

بالخصوص ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کی داستانِ حیات تو سبق آموز بھی ہے اور ایک تاریخ بھی۔ آج ہم سراج الدولہ کے دشمنوں اور ملک وملت سے عناد رکھنے والوں کے وہ حالات پیش کررہے ہیں، جو درسِ عبرت بھی ہیں اور اس بات کے شاہد بھی کہ فدائیانِ ملک سے غداری کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور دین میں بھی۔ قدرت سب کچھ نظر انداز کرسکتی ہے مگر ملک و قوم سے غداری کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ سراج الدولہ بلکہ ہندوستان سے غداری کرنے والے میر جعفر اور اس کی اولاد کا کیا حشر ہوا اس کی داستان دلچسپ بھی ہے اور ہوش ربا بھی جس کو تاریخ اپنے صفحات میں محفوظ کئے ہے۔ داستان طویل ہے مگر مختصر یہ ہے کہ میر جعفر پسر سید احمد غدارِ وطن غدارِ قوم، دشمنِ انسانیت کے بیٹے میرن کا نام ایسے سفاک اور ظالم اشخاص میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، جن پر نفرین کرنا عین عبادت ہے۔ یہ وہی میرن ہے جس نے بہادر، جری اور باعثِ شرف انسان سراج الدولہ کو اس حالت میں قتل کرایا جب کہ وہ باوضو ہوکر نماز دوگانہ ادا کرنے کا خواہاں

تھا۔ تاریخ نے کسی محسن کے ساتھ ایسی بدسلوکی روا ہوتے نہ دیکھی ہوگی، جیسی جعفر اور میرن نے کی۔ لیکن قدرت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو وہ عبرت کے ایسے سامان فراہم کر دیتی ہے۔ جس کی مثال ملنی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے۔

میر جعفر نے سراج الدولہ اور علی وردی خاں سے ہی غداری نہیں کی تھی بلکہ اس نے ملک و قوم اور اپنے عزیز وطن کے ساتھ بھی غداری کی اور غدار کی جو سزا قدرت کی جانب سے مقرر ہے، وہ اس کو (اور اس کے حواریوں کو) ملی کہ وہ ان لوگوں کی نگاہوں میں بھی معتوب اور روسیاہ ہوا جن کے لئے وہ جاسوسی اور قوم فروشی کر رہا تھا۔ چناں چہ قدرت نے اس کی موت ایک عجیب ذریعے سے مقدر کر دی تھی۔ اس کے ملازم خاص نند کمار نے اس کو عزق سے ناب کیا اور اسی حالت میں اس کو غسل دلا کر کام تمام کیا۔ لیکن باپ سے زیادہ عبرت ناک موت اس کے بیٹے میرن کی ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مرشد آباد سے بہت دور عظیم آباد (موجودہ پٹنہ) کے قریب جب میرن اپنی فوج کے ساتھ سفر کر رہا تھا کہ اچانک بارش نے آلیا اور وہ اسی جگہ خیمہ زن ہونے پر مجبور ہو گیا۔ رات کا وقت، بارش اپنے شباب پر تھی، رعد و برق اور بجلی کی کڑک سے ہوش اُڑے جا رہے تھے۔ تاریکی ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جیسے تیسے کر کے خیمے نصب کئے گئے اور میرن اپنے دو مصاحبوں ہمت خاں اور محمد خان کے ساتھ ایک بڑے عالی شان خیمے میں فروکش ہوا۔ ابھی لوگ بارش کی تندی و تیزی سے سراسیمہ تھے کہ بجلی کی کڑک نے آئے ہوئے ہوش غائب کر دیئے۔ آخر میرن خوف زدہ ہو کر قریب ایک چھوٹی سی چھولداری میں اپنی داشتہ اور قصہ گو و پاؤں دبانے والے اشخاص کے ساتھ چلا گیا کہ اچانک ایک خوف ناک آواز ہوئی اور بجلی اس زور سے کڑکی کہ سب حواس باختہ ہو گئے۔ لیکن قدرت کے معینہ وقت کے مطابق وہ بجلی میرن پر گری اور جلاتی ہوئی زمین کی تہہ تک پہنچ گئی۔ کچھ دیر بعد جب اس کے ہمراہیوں کو بجلی گرنے اور اس خیمہ کی تباہی کا علم ہوا تو وہ ادھر متوجہ ہوئے۔ دیکھا تو میرن کی لاش بستر پر پڑی ہے اور دو نوجوان نوکر بھی مردہ پڑے ہیں۔ بجلی نے میرن کے سر میں شگاف اور پشت و پیٹ پر سات ضربات شدید کے نشانات چھوڑے تھے۔ ضربات ایسی تھیں جیسے کوڑے لگائے گئے ہوں۔ تلوار کی حالت یہ تھی کہ وہ بھی شگاف زدہ تھی اور چارپائی چھلنی ہو گئی تھی، دراصل تلوار میرن کے سرہانے رکھی تھی، بجلی کا پہلا حملہ لوہے پر ہوا جس نے آفات کی فہرست طویل کر دی۔

یہ وہی میرن تھا جس کے حکم سے گھسیٹی بیگم اور سراج الدولہ کی ماں امینہ بیگم کو اس کے ایک معتمد نے سنسان مقام پر لے جا کر کہا کہ وضو کر کے نماز پڑھ لو۔ گھسیٹی بیگم خوف زدہ ہو کر آہ و بکا کرنے لگیں تو امینہ بیگم مادرِ سراج الدولہ نے اپنی بہن سے کہا کہ:

> خوف زدہ ہونا اور رونا کیسا؟ موت ایک دن آنی ہے، ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہماری رہائی کا سامان اس طرح کیا اور ہمارا بوجھ میر جعفر کے بیٹے میرن کے سر ڈال رہا ہے۔

تاریخ نے بہادر اور دلیر ماں کے یہ الفاظ اپنے صفحات میں محفوظ کر لئے ہیں۔ اس کے بعد دونوں بہنوں یعنی سراج الدولہ کی ماں اور خالہ نے وضو کیا، کپڑے بدلے اور خاک پاک کربلا اپنے ماتھے و سر پر ملی۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معذرت چاہی اور اس شقی کو حکم دیا کہ وہ اپنا فرض انجام دے۔ وہ شخص حیرت زدہ ہو کر یہ سارا تماشا دیکھ اور سن رہا تھا۔ اب جو اس نے یہ کیفیت دیکھی تو تلوار اٹھانے کے بجائے خود دریا میں کود پڑا۔ مگر اس کے دوسرے ساتھی نے، ان پاک بیبیوں کا کام تمام کر دیا اور ان کی نعش دریا میں پھینک دی۔ ادھر یہ تماشا ہو رہا تھا، اُدھر اسی وقت میرن پر بجلی گری اور اس کا کام تمام کرتی ہوئی زمین دوز ہو گئی۔ قدرت کے انتقام کی حد یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ جب لارڈ کلایو کو میرن کے مرنے کی اطلاع ملی تو اس نے حکم جاری کر دیا کہ اس کا پیٹ چاک کر کے انتڑیاں نکال دی جائیں اور لاش اس طرح اٹھائی بٹھائی جائے جیسے میرن مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ چناں چہ میرن کی لاش اس کے حکم کے مطابق ہاتھی پر رکھدی گئی اور اس کے پاؤں ہودے سے باہر نکال دیئے گئے۔ یعنی میرن بیمار ہے۔ یہ حادثہ ایسا ہی تھا جیسا نواب سراج الدولہ کے ساتھ میر جعفر نے کیا تھا۔ عبرت کا مقام ہے کہ اس کے بیٹے کی لاش کا بھی وہی حشر ہوا جو اپنے ولی نعمت اور آقا و مالک کے ساتھ اس نے کیا تھا۔ اب ویسا ہی سلوک اس کی زندگی میں اس کے بیٹے کے ساتھ ان لوگوں نے روا کیا جو اس کے دوست اور ہم نوا تھے۔ نہ صرف دوست بلکہ جن کی خاطر اس نے ملک و ملت سے غداری کی، حق کے بجائے باطل سے ساز باز کی اور اپنے ضمیر و اپنی زندگی کو مردہ و نجس بنا لیا۔ اس کے ساتھ نے اس کے اپنے خون کے ساتھ وہ عمل کیا جو حق و صداقت اور فدائی ملک و ملت کے ساتھ میر جعفر نے کیا تھا۔ خود میر جعفر کا حشر نہایت درجہ عبرت ناک ہے، اس کو اس کے داماد میر قاسم نے تخت و تاج سے محروم کرایا اور وہ مرشد آباد سے اپنی جان بچانے اور ترکِ استقامت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ آ

۴۹، سال کی عمر میں جذام جیسے گھناؤنے اور مہلک مرض میں گرفتار اور مقہور ہوکر اس دنیا کو اپنے ناپاک وجود سے پاک کر گیا۔ اس پر مرض کی شدت اس قدر ہوگئی تھی کہ وہ ہمہ وقت غرقِ مے ناب رہتا۔ ننگ کمار اُسے شراب پلا پلا کر مرض کی تکلیف سے غافل رکھتا۔ یہاں تک کہ اس کا کام تمام ہوا اور کسی ہندوستانی نے اس کی موت پر اظہار ہمدردی و افسوس نہیں کیا۔ اس سارے فتنے اور شورو شر کے بانی لارڈ کلائیو کا حشر بھی میر جعفر جیسے غدار کا ہوا۔ اس نے ہندوستان اور ہندوستانی قوم کی تباہی و غلامی میں جس حد تک حصہ لیا اس کا بدلہ قدرت کی طرف سے اُسے یہ ملا کہ خود اس کے ملک میں اس پر لعن طعن ہوئی اور غبن، بدسلوکی، عہد شکنی کے الزامات لگائے گئے۔ نیز اختیارات کو ناجائز طریقے سے استعمال کرنے اور انگریز قوم کو بدنام کرنے و رسوا کرنے کا الزام لگا کر مقدمہ چلا گیا۔ آخر میں ان حالات سے کلائیو اس قدر بددل ہوا کہ نومبر ۱۷۷۴ء میں اس نے لندن میں خودکشی کرلی جب کہ اس کو اس وقت نہ دولت کی کمی رہی تھی نہ جاہ و منصب کی۔ مگر خدا کے بندوں پر ناحق ظلم وستم ڈھانا، ستانا اور اذیت پہنچانا رائیگاں نہیں جاتا۔ چناں چہ جب قضا و قدر کا حکم ہوجاتا ہے تو میر جعفر، میرن اور کلائیو کا حشر ایک ہی جیسا ہوتا ہے اور بقول میر تقی میرؔ

ع ہم نے تو ناخنوں سے منہ سارا نوچ ڈالا
اب کو وہ کن دکھاوے رکھتا ہے گر ہنر کچھ

ورنہ نواب سراج الدولہ والیٔ بنگال کی موت جن حالات میں ہوئی وہ خود ایک سانحہ ہے۔ لیکن ایک بات جو ماں اور بیٹے کی موت میں مماثلت رکھتی ہے اس کو تاریخ نے اپنے صفحات میں قلمبند کرلیا ہے اور وہ یہ کہ جب سراج الدولہ گرفتار ہوکر مرشد آباد پہنچے تو ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کردیئے گئے۔ جب کچھ بدمعاش وحشیوں کی طرح دوڑ کر ان کی طرف آئے تو وہ سمجھ گئے کہ ان کا وقت آخر آگیا ہے۔ چناں چہ انھوں نے وضو کے لئے پانی طلب کیا تاکہ مرنے سے قبل اپنے خدا کے حضور نمازِ دوگانہ ادا کرلیں لیکن کسی کمین نے ان کے سر پر لوٹا اٹھا کر کھینچ مارا۔ وہ سجدے میں گرے تو محمدی بیگ نے تلوار سے وار کئے اور سراج الدولہ پھر سجدے سے سر نہ اٹھا سکے اور جان بحق تسلیم و رضا ہوگئے۔ ننگِ دین، ننگِ وطن، ننگِ اسلام میر جعفر کے حکم سے آزادی کے علمبردار اور شیرِ بنگال سراج الدولہ کی لاش ایک ہاتھی پر ڈال کر شہر بھر میں پھرائی گئی۔ جب ہاتھی سراج الدولہ کی ماں کے گھر کے قریب سے گزرنے لگا تو وہ معظمہ جو عبادتِ الٰہی میں مصروف و مشغول رہا کرتی تھیں، ہ دیکھا، نالہ و شیون اور گریہ و زاری کی آواز سن کر بے تاب ہوگئیں۔ دریافت

حال کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے چہیتے اور لاڈلے سراج الدولہ کی لاش گزر رہی ہے اور خلق الناس اس کے ماتم اور الم میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔
ماں کا دل یہ بات سنتے ہی ہوش میں آیا اور وہ اپنے لختِ دل، لختِ جگر کے استقبال کے لئے پابرہنہ و سر برہنہ گھر سے نکل پڑی۔ لاش کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر چومنے چاٹنے لگی۔ مرشد آباد کے باسیوں نے جب یہ روح فرسا منظر دیکھا تو اپنے ولی نعمت کی زبوں حالی پر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ آخر میر جعفر کے مصاحبِ خاص خادم حسین نے مداخلت کی اور سپاہیوں نے اردگرد کے لوگوں کو شدید ضربات کے بعد علیحدہ کیا اور نواب کی ماں کو بیٹے کی لاش سے جدا کر کے قریبی گھر میں مقفل کردیا۔ لیکن جب نواب کی وفات کی خبر عظیم آباد (پٹنہ) پہنچی تو میر حسن دہلوی کے تذکرے کے مطابق راجہ رام نرائن موزوں تخلص (جو صوبہ دار بھی تھے) نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، سر اور داڑھی پر راکھ ملی اور ننگے سر اور ننگے پیر دیوانہ وار بازار میں روتے پھرے۔ پیچھے ایک انبوہِ کثیر تھا۔ کوئی آنسو بہاتا تھا، کوئی سینہ کوبی کرتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے محرم کا تعزیہ نکل رہا ہے۔ اور یہ شعر جو خود ایک تاریخ بن گیا ہے۔ رام نرائن موزوں کی زبان پر تھا۔

ع غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

(رام نرائن موزوں)

یاد رکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ نواب سراج الدولہ نے اپنے قتل کے وقت بھی وضو کے لئے پانی طلب کیا اور ان کی ماں امینہ بیگم نے بھی قربِ خداوندی میں جاتے وقت (اپنے بیٹے سراج الدولہ کی طرح) ٹھیک تین سال بعد دریا کنارے وضو کیا، کپڑے بدلے، خاکِ پاک کربلا چہرے پر ملی اور نمازِ دوگانہ ادا کرنے کے بعد راہیِ ملکِ عدم ہوئیں۔ گویا ماں اور بیٹے ایک ہی مصلّے پر، ایک ہی جادہ پر گامزن رہے۔ اور وہ ہے حق و صداقت کا جادہ۔ ایک ۱۱۷۰ ہجری میں نیتِ وضو کے ساتھ ختم ہوا۔ دوسری باوضو ۱۱۷۳ھ میں تمام ہوئی۔ انجام ہو تو ایسا کہ زمانہ محرومِ زمانہ نہ کر سکے اور بقول میرؔ

ع قمری کا لہو پانی ہوا، ایک عشق میں!
آتا ہے اس کا خونِ جگر، آب جو کے ساتھ

اور وہ عشق ہے وطن کی محبت اور پاسداری کا۔!
ہندوستان اپنے اس جواں سال اور بہادر فرزند، دلیر فرماں روا،

(بقیہ ۲۸ پر)



غزلیں

وفا ملک پوری

نہ یہ چمن کے لئے ہے، نہ انجمن کے لئے
مری رگوں کا لہو ہے مرے وطن کے لئے

پھر اِن سے داد طلب ہے نگاہِ برقِ تپاں
جنہوں نے پھونک دیئے آشیاں چمن کے لئے

پھر اُن کو سازشِ گلچیں نے آزمایا ہے
وہ کج کلاہ جو مرتے ہیں بانکپن کے لئے

وصالِ دار و رسن بھی بڑی سعادت ہے
اگر نصیب ہو آزادیٔ وطن کے لئے

جنوں کے چاکِ گریباں پہ ہنس رہی ہے خرد
ترس نہ جائے کہیں یہ بھی پیرہن کے لئے

اسی کے رنگ سے ہے سرخیٔ شعورِ وفا
جو خون بن سکے غازہ رُخِ وطن کے لئے

نہ کام آئی محبت میں جب جبیں سائی
شعورِ عشق نے انداز تیشہ زن کے لئے

اُسی کو زندگیٔ جاوداں نصیب ہے، جو
جیئے وطن کے لئے اور مرے وطن کے لئے

لہو سے اپنے جلائیں گے ہم چراغ وفا
اگر نہیں ہے کوئی شمعِ انجمن کے لئے

جب ہاتھ سے اس کے بہ ادب جام لیا ہے
ساقی نے نگاہوں سے بڑا کام لیا ہے

حالات نے ڈھائی ہے جو بنیادِ محبت
اُمید نے گرتا ہوا گھر تھام لیا ہے

دو غم کے ستائے ہوئے معصوم دلوں نے
اک عشق پہ سو طرح کا الزام لیا ہے

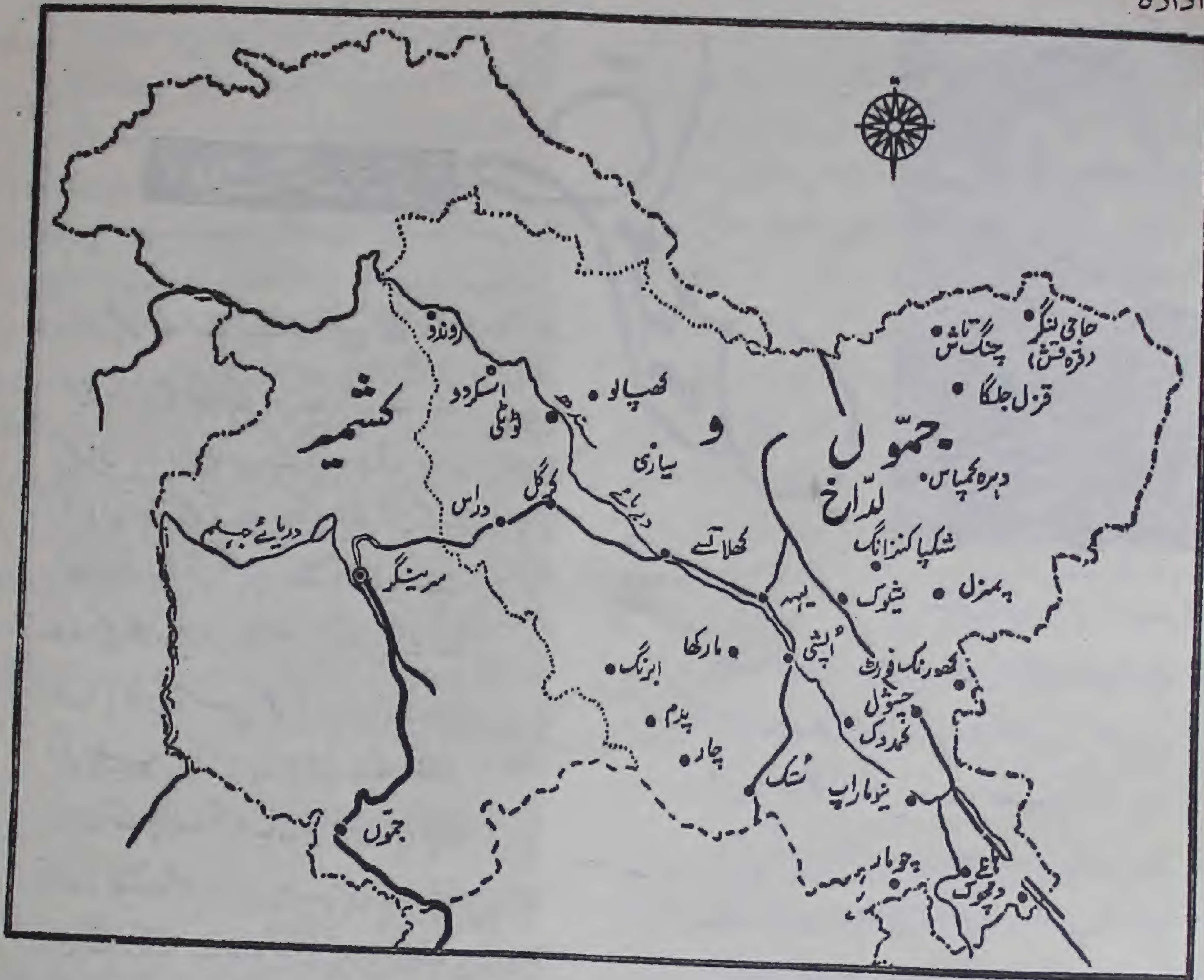
یا زلف کے سائے میں بھی بے چین رہے ہیں
یا ہم نے سرِ دار بھی آرام لیا ہے

بات آتی ہے اکثر دلِ برباد کی لیکن
بھولے سے بھی میں نے نہ ترا نام لیا ہے

کیا پوچھئے میرے دلِ برباد کا عالم!
اُس نے بھی سنا ہے تو جگر تھام لیا ہے

سینہ کو تپش، دِل کو خلش، آنکھ کو آنسو
آکر تری محفل میں یہ انعام لیا ہے

اک شمعِ وفا ہم نے سرِ راہ جلا کر
ظلمت کے پرستاروں سے انعام لیا ہے



لداخ

زمانۂ دراز سے لداخ بڑا پُراسرار علاقہ سمجھا جاتا رہا ہے اور
ماکش سیاحوں اور متجسس افراد کے لئے باعثِ کشش رہا
ہے۔ بہادر فوجی جرنلوں کی سرکردگی میں اکثر فوجیں بھی اس علاقے
ے گذری ہیں۔ حصولِ آزادی کے بعد لداخ الگ تھلگ نہیں رہ
ہے بلکہ ملک کے بقیہ حصے کے ساتھ اس کا رشتہ روز بروز
ضبوط ہوتا جارہا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کا یہ ضلع کم آباد
ے۔ اس ضلع میں ۲۵۹ گاؤں ہیں جن کی مجموعی آبادی ۸۸
زار ہے۔

لداخ کے رہنے والے کم از کم تین نسلی گروہوں سے تعلق
کھتے ہیں۔ دو نسلی گروہ آریاؤں کے ہیں جن کا تعلق گلگت کے
رڈس اور شمالی ہند کے مون سے ہے۔ تیسرا گروہ، جو تعداد
میں ان دونوں سے زیادہ ہے، منگولوں کی نسل سے تعلق
رکھتا ہے۔ تینوں کے میل جول سے رفتہ رفتہ اب ایسے لوگ یہاں آباد
ہیں جو زراعت پیشہ اور خانہ بدوش آریائی اور منگول دونوں نسلوں سے
تعلق رکھتے ہیں۔ لیہہ اور زانسکر تحصیل میں بودھوں کی کثرت ہے اور
کرگل تحصیل میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

اس علاقے میں سب سے پہلے آباد ہونے والے مون تھے۔ زیادہ
قرینہ اس امر کا ہے کہ یہ لوگ وادیٔ کشمیر سے آئے ہوں گے۔ پھر ڈارڈس
آئے۔ یہ لوگ اپنی جنگجویانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ممتاز تھے۔ زمانۂ قدیم کی
چٹانوں پر کھدی ہوئی تصویروں اور ان کے گیتوں میں شکار کی مہموں اور تیر
اندازی کی مختلف مہموں کا ذکر ہے۔ یہ دونوں قبیلے بودھ مت کے پیرو تھے۔
منگولوں کا گروہ دسویں صدی عیسوی میں آیا۔ ان کے زمانے میں وادیٔ کشمیر



ہمیس گومپا کا اندرونی منظر

سے لداخ کے گہرے اور سیاسی تعلقات قائم ہوئے۔

سولھویں صدی میں مشرقی ایشیا سے ترکوں نے لداخ پر حملہ کیا مگر پسپا کر دیئے گئے۔ سترھویں صدی میں انھوں نے پھر حملہ کیا اور اس بار بھی ناکام رہے۔ مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے بھی لداخ کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مغل فوجوں نے ۱۶ دن کے دشوار گذار سفر کے بعد ایک قلعہ فتح بھی کیا لیکن مغل فوج اس خیال سے واپس چلی آئی کہ کہیں برف میں نہ گھر جائے۔ ۱۶۶۴ء میں شہنشاہ اورنگ زیب اور لداخ کے راجہ کے درمیان گفت و شنید کے نتیجے میں لداخ نے مغل حکومت کی ماتحتی قبول کر لی اور لداخ مغل سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۱ء کے درمیان جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے لداخ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۴۶ء میں معاہدۂ امرتسر کے تحت کشمیر راجہ گلاب سنگھ کی عملداری میں آگیا۔ اس معاہدے کی رو سے نئی ریاست جموں و کشمیر حکومت برطانیہ کے زیرِ حفاظت آگئی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا اور اس کی فوجیں لداخ کی طرف بڑھیں تو لداخیوں نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا۔

چند برسوں کے بعد لداخ میں چینی چھپے چوری گھسنے لگے اور انھوں نے "اکسائی چِن کے علاقے" میں سڑک بنائی۔ ۱۹۵۹ء میں چینی سرکار نے پہلی بار یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان کی روایتی اور قدیم سرحدوں کو وہ تسلیم نہیں کرتی۔ حکومت ہند نے بار بار اس کی وضاحت کی ایک طرف لداخ اور دوسری طرف تبت اور سنکیانگ کی قدیم سرحد کو دونوں ملک کم سے کم ایک ہزار برسوں سے تسلیم کرتے آئے ہیں۔ مگر چینی اپنے دعویٰ باطل پر ڈٹے رہے اور انھوں نے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ہماری سرحدوں پر زبردست حملہ کر دیا۔ اسی وقت لداخی نوجوانوں نے ہندوستانی فوجوں کے ساتھ ساتھ حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دادِ شجاعت دی۔

لداخی خوش مزاج، ایماندار اور محنت کے عادی ہیں۔ طبعًا یہ لوگ امن پسند ہیں۔ قتل کے واقعات یہاں تقریبًا ناپید ہیں۔ معمولی قسم کی چوریاں کبھی کبھار سننے میں آتی ہیں۔

لداخ میں تبتی زبان سے واقف لوگوں کی تعداد کافی ہے۔ خواندگی کا تناسب کم ہے۔ ان کا رسمِ خط ساتویں صدی کی دیوناگری میں سے نکلا ہے۔

لداخیوں کا لباس سادہ لیکن رنگارنگ ہوتا ہے۔ سردی سے بچنے کے لیے، مرد موٹے موٹے اونی لبادے پہنتے ہیں۔ سر پر بھیڑ کی کھال کی ٹوپی ہوتی ہے جس کے پیچھے ایک چوڑی سی پٹی ہوتی ہے جو گردن اور کان کو ڈھانکنے کے لیے ہوتی ہے۔



لداخیوں کا چائے پینے کا مخصوص انداز

مرد زیور استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کمر سے کئی طرح کی چیزیں لٹکی ہوتی ہیں۔ جو سفر میں ان کے لئے ضروری ہوتی ہیں جیسے ایک دھار کا چاقو، چقماق، چائے اور تمباکو کا ایک تھیلہ، لوہے کا چمکدار پائپ اور چائے بنانے کا برتن۔ عورتیں ایک طرح کا جیکٹ پہنتی ہیں جس کے ساتھ دھاری دار اور لمبا پیٹی کوٹ ہوتا ہے جو گھٹنوں کے نیچے تک پہونچتا ہے۔ اس کے اوپر وہ بھیڑ کی کھال کا لبادہ پہنتی ہیں۔

لداخی موسیقی کے رسیا ہیں۔ ان کے تیوہار ناچ، گانے اور ڈرامے کے بغیر نامکمل سمجھے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ناچ گانا ایک لازمی چیز ہے۔ ان کی شادی بیاہ کی بعض رسمیں بڑی دلچسپ ہیں۔ مثلاً دلہا دلہن کو لینے اس کے گھر نہیں جاتا۔ دلہے کا باپ اور اس کے رشتہ دار دلہن کو لانے جاتے ہیں۔ بچے کی پیدائش کے موقعے پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔

لداخ مذہبی رواداری کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ ایک خاندان کے تین بھائی تین مختلف مذہبوں کو ماننے والے ہوسکتے ہیں۔ ایک بودھ مت کا پیرو، دوسرا مسلمان اور تیسرا عیسائی ہوسکتا ہے اور یہ تینوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ مگر لوگوں کی اکثریت بودھ مت کی پیرو ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا اہم گاؤں ہوگا جس میں بودھ خانقاہیں جنھیں یہ لوگ "گوپھا" کہتے ہیں، نہ ہوں۔ اور بودھ لاما نہ رہتے ہوں۔ لداخ میں ۱۶ خاص گوپھائیں ہیں۔ ہیمس گوپھا لداخ کا سب سے بڑا اور پرانا گوپھا ہے۔ یہ لیہہ (صدر مقام) سے ۲۵ میل دور اور سطح سمندر سے ۱۲ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ خانقاہ کے اندر مہاتما بدھ کا ایک بڑا سنہرا مجسمہ ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں کنول ہے اور گردن میں نکلس ہے۔ خانقاہ کی دیواریں، دیوتاؤں، بھکشوؤں اور سنتوں کی تصویروں سے مزین ہیں۔ بودھ راہبائیں "چومو" کہلاتی ہیں۔ ان بودھ خانقاہوں کا عوام کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہے۔ تقریباً ہر خاندان کا ایک لڑکا لاما ضرور بنتا ہے۔ ایسا لڑکا ۸ سال کی عمر کے بعد بودھ خانقاہ میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں اس کی تعلیم اور تربیت ہوتی ہے۔ انھیں بڑی سخت زندگی گذارنی پڑتی ہے اور کم سے کم ۲۵۳ باتوں کا عہد کرنا



شادی کی تقریب

اور اس پر قائم رہنا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی سخت ڈسپلن، تجرد اور منشیات سے مکمل پرہیز کی ہوتی ہے۔ لاما دو گروہوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ ایک گروہ دنیوی ضرورتوں جیسے گومپھا کی زمین کی کاشت، کرائے کی وصولی اور اپنے فرقے کے لیے صدقات کی وصولی وغیرہ کرتا ہے۔ دوسرا گروہ مذہبی رسمیں ادا کرنے کے لیے وقف ہوتا ہے۔ لاماؤں کی خوراک جو یا گیہوں ہوتی ہے۔ گوشت کھانے کی ممانعت بھی نہیں ہے۔ وہ شوربہ، دودھ اور چائے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

اس علاقے کے لوگوں کو قدرت نے حسن شناسی اور فنکاری کے جذبے سے مالا مال کیا ہے۔ گومپھا کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں اور کینوس اور کاغذ پر بنے ہوئے چتروں کو دیکھ کر منہ سے بے ساختہ کلمۂ تحسین نکل جاتا ہے۔ ملبک میں مہاتما بدھ کا ایک مجسمہ ہے جو ۱۰۰ فٹ اونچا ہے اور جسے ایک چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ اس مجسمے کے خدوخال اتنے دلکش ہیں کہ دیکھنے والا محو حیرت رہ جاتا ہے۔ اسی طرح لیہہ کے ایک گومپھا میں مہاتما بدھ کے مجسمے کے مختلف حصوں کا تناسب اور خاص طور سے آنکھ کا تاثر کچھ اس ڈھنگ سے دکھایا گیا ہے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔

سونا، چاندی ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے مجسمے نہ صرف گومپھاؤں کی زینت ہیں بلکہ نادر آرٹ گیلریوں کی بھی زینت ہیں۔ مجسمہ سازی کے علاوہ فن تعمیر میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ عظیم الشان گومپھاؤں کی ساخت اور تعمیر ان کے ماہر فن ہونے کی دلیل ہے۔ آرٹ کے تمام شعبوں میں ہندوستانی اثرات نمایاں ہیں۔ زیورات ہوں یا لکڑی پر کندہ کاری، چتر کاری ہو یا ساز سنگیت یا ناچ کی مدرائیں اُن پر ہندوستان کے اثرات صاف ظاہر ہیں۔

حالیہ برسوں میں لداخ کو ترقی دینے کے لیے بہت کچھ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام، سری نگر، لیہہ روڈ کی تعمیر ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار اس علاقے کی پہاڑیوں کا براہِ راست تعلق ملک کے بقیہ حصے سے پیدا ہوا ہے۔ یہ سڑک ملک کے بعض نہایت اونچے درّوں سے ہو کر گذرتی ہے۔ اس علاقے کی ترقی کے لیے، رسل و رسائل کی سہولتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں لہذا ڈیفنس سروسز، اجتماعی ترقی، تعمیر عامّہ کے محکمے اور سرحدی علاقوں میں سڑک بنانے والی تنظیم نے یہاں سڑکوں کا جال بچھا دیا ہے۔ اس وقت لداخ میں کوئی مشکل سے ہی ایسا اہم گاؤں ہوگا جس کو کسی نہ کسی قومی شاہ راہ سے ملایا نہ گیا ہو۔

لداخ میں سینچائی کے لیے نہریں کھودنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس کے باوجود پھیانگ میں نہر بنائی گئی ہے اور اسے نئے تعمیر شدہ آبی ذخیرے سے ملا دیا گیا ہے۔ رینپر پورہ کی نہر کے کچھ حصوں کو نئے سرے سے بنایا گیا ہے۔ وادیٔ چشول میں ایک نئی نہر بنائی گئی ہے اور پانی کا ذخیرہ رکھنے کے لیے ایک تالاب بھی بنایا گیا ہے تاکہ جو نئی زمینیں کاشت کے قابل بنائی گئی ہیں ان کو سیراب کیا جا سکے۔

گیہوں اور جو اس علاقے کی خاص فصلیں ہیں۔ یہاں دھان نہیں پیدا ہوتا۔ سری نگر لیہہ روڈ کی تعمیر سے اناج اور دیگر اشیائے ضرورت کو لداخ تک لانے میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ یہاں دکانوں میں ڈبے کا مکھن چینی، نمک، مختلف قسم کے چاول، صابن، بلیڈ، کپڑا، مٹی کا تیل غرضکہ ہر چیز بہ آسانی ملتی ہے۔ زیادہ تر چیزیں کوآپریٹو سٹور کے ذریعے مناسب داموں پر فروخت ہوتی ہیں۔

تاجور سامری



بچہ اور تعویز

ڈراما کے لوگ

۱۔ بچہ ۲۔ بچہ چور عورت ۳۔ اٹھائی گیرا ۴۔ خاوند ۵۔ بیوی ۶۔ گرہ کٹ
۷۔ چور ۸۔ ٹھگ ۹۔ بوڑھا ۱۰۔ ادھیڑ

[ایک بڑا سا پیڑ جس کے پاس سے تین راستے نکلتے ہیں۔ موسم بہار کی ڈھلتی دوپہر۔

ایک داڑھی والا اُٹھائی گیرا ایک بچے کو بغل میں دبائے تیز تیز داخل ہوتا ہے اور اکثر سر گھما کر پیچھے کو دیکھ لیتا ہے اس کے چہرے پر خوف ملی پریشانی ہے۔ سال بھر سے کم عمر کا سہما ہوا بچہ اس سے چمٹا ہوا ہے اسی وقت پیچھے سے ایک عورت تیزی سے دوڑتی ہوئی آتی ہے۔

عورت: رک جا رے موئے!! میرے بچے کو کہاں لئے جاتا ہے؟

اٹھائی گیرا: کیا شور مچا رہی ہے پاگل عورت! لوٹ جا کہے دیتا ہوں نقصان اٹھائے گی (بچے کو زور سے چمٹا لیتا ہے)

عورت: تجھ پر آسمان ٹوٹ پڑے۔ اُٹھائی گیرے! میرے بچے کو لوٹا دے مجھے (آگے بڑھتی ہے)

اُٹھائی گیرا: تو بچے کی ہوتی کیا ہے جو تجھے دوں؟؟

عورت: ہے بھگوان! اس ظالم کو کون سمجھائے؟ اے مورکھ میں ہی تو اس کی ماں ہوں۔ دیکھ میری چھاتیاں دودھ سے بھری ہیں... ایک پل ذرا حاجت کے لئے سڑک پر اسے بٹھا کر گئی تھی اور تو اسے اٹھا لایا... ہائے رے...

اٹھائی گیرا: کیوں بے کار بکے جاتی ہے۔ میں ہی اس بچے کا باپ ہوں... بے چارے کی ماں کو مرے ایک مہینہ ہو گیا ہے جس کٹھنائی سے اسے پالتا ہوں، میں ہی جانتا ہوں۔ میں ذرا دودھ والے کی دکان سے آدھ پاؤ بھر دودھ لینے کے لئے اسے پلیا کے پاس بٹھا کر گیا تھا۔ اگر میں فوراً نہ آ پہنچتا تو تو لے ہی گئی تھی۔ چور عورت اب کہے دیتا ہوں، مار مار کر بھُرکس نکال دوں گا... (اس پر عورت غصے میں آ کر آگے بڑھتی ہے)... پھر وہی بے حیائی — ہٹ جا — ہٹ جا مار بیٹھوں گا۔

عورت: تیرا خانہ خراب ہو موئے اُٹھائی گیرے... دیکھو میرا بچہ کب سے بھوکا ہے، معصوم کی بددعا سے بچ۔

بچے کو چھیننے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی بیچ میں بائیں طرف سے ایک شور سنائی دیتا ہے اور اُٹھائی گیرا خوف سے گھبرا جاتا ہے)

اُٹھائی گیرا: بے حیا عورت تو مار کھائے بنا نہیں رہے گی کہے دیتا ہوں لوٹ جا... اور میرے بچے کا خیال چھوڑ... ورنہ میں تھانے لے چلوں گا۔

عورت: واہ رے پاجی! کیا باتیں بناتا ہے۔ پلیس تھانہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔ دے میرے بچے کو۔ دیکھ وہ میری طرف کس پیار سے دیکھ رہا ہے۔

اُٹھائی گیرا: (بچے کو گلے لگا کر اور اس کے بازو سے بندھے بڑے سے تعویز کو ٹٹولتے ہوئے) میں جانتا ہوں تیری اس تعویز پر نظر ہے...

عورت: اب پتہ چلا تری نظر اصل میں اس تعویز پر ہی ہے۔ بے جا —

اس تعویز کو . . . لیکن میرا بچہ مجھے دے دے۔ اس تعویز سے بنا لینا
جا شداد۔ موئے تجھ کو کیا معلوم یہ تو سیتلا مائی کا ٹونا ہے۔ لے جا۔ آسے
لاڈے میرے بچے کو۔

اُٹھائی گیرا:۔ ارے کیا یہ سیتلا مائی کے ٹونے کا تعویز ہے جبھی کالے کپڑے میں بندھا ہے۔ مردار پہلے کیوں نہ بتایا مجھے۔ لے اپنے لاڈلے کو مجھے نہیں چاہئے۔ . . . .

[بچے کو زمین پر بٹھاکر درمیانی راستے پر تیز تیز چل پڑتا ہے اور موڑ میں غائب ہوجاتا ہے۔ عورت اس بچے کو اُٹھاتی ہے۔ تھوڑا سا پیار کرتی ہے اور بازو سے بندھے بٹے سے تعویز کو دیکھتی ہے اور اسے جلدی جلدی ٹٹولتی ہے۔ اسی وقت بائیں طرف سے خاوند، بیوی آتے ہیں۔ عورت گھبرا جاتی ہے۔]

عورت:۔ ارے یہ کون آرہا ہے۔ کہیں یہ میاں بیوی اُس محلے کے تو نہیں
(غور سے دیکھتی ہے)

بیوی: (خاوند سے) میں نے کہا۔ اتنا تیز کیوں چلتے ہو ـــ ذرا دیکھنا یہ کتنا پیارا بچہ ہے۔

خاوند: تو تجھے کیا ہے؟ وہ اپنی ماں کی گود میں ہے۔

بیوی: نہیں میں نے تو یونہی کہا۔ کاش بھگوان مجھے بھی دیتا۔ . . .
(عورت اُن کی باتوں کو سُن کر بھی بہری بیٹھی ہے۔)

خاوند: اب میں کیا کروں تجھے تو یہ مرض ہوگیا ہے، جہاں کسی کے بچے کو دیکھا لگی گھورنے۔

بیوی: اچھا چھوڑو ـــ ذرا اس پیڑ کے نیچے دم لے لو۔ سچ بُری طرح تھک گئی ہوں۔

خاوند: تھک تو میں بھی گیا ہوں، لیکن جانا ابھی بہت دور ہے۔ جان تو شام ہوجائے گی۔ اچھا، آؤ بیٹھو۔

(عورت اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ میاں، بیوی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر دم لینے لگتے ہیں۔ بیوی اپنی بغل میں دبائی گٹھڑی کو زمین پر رکھ کر بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔ عورت پاس آتی ہے۔)

عورت: بہنا، اک ذرا تکلیف دوں گی۔ مجھے حاجت نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ اس بچے کے لئے رُکی ہوئی تھی۔ ذرا . . .

بیوی: اچھا اچھا بچے کو ہمارے پاس بٹھا دو۔ ہم لوگ کچھ دیر تو رُکیں گے ہی اور رُک لیں گے۔

عورت: بھگوان تمہارا بھلا کرے۔

(بچے کو عورت کے پاس بٹھا کر درمیانی راستے ہی پر ہولیتی ہے اور موڑ میں غائب ہوجاتی ہے۔)

خاوند: بچہ تو واقعی بڑا سندر ہے۔ کیوں رے . . . گھونڈو! کیسے ہو؟
(وہ اُس کے گال کو انگلی سے چھوتا ہے۔ وہ مسکرا دیتا ہے)

بیوی: دیکھتے ہو، کتنی جلدی مانوس ہوگیا۔ بچہ تو بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔

خاوند: ٹھیک ہے لیکن بھگوان جس کا بچہ اسی کو سکھ . . . ایک دم کے لئے تو ہم رُکے ہیں۔ اتنی دیر کے لئے پریم بڑھانے سے کیا حاصل؟

بیوی: تم کیسے نردئی ہو۔ بچہ تو سب کا ہوتا ہے۔ لیکن تمہارا دل تو نہ جانے کیوں پتھر کا ہوگیا ہے۔

خاوند: وقت آدمی کو ایسا بناتا ہے میری اس میں کیا خطا۔ اچھا اب تیاری کرو چلنے کی سانجھ ہو رہی ہے۔

بیوی: ہائے رے تم کتنے کٹھور ہو۔ اچھا چلتی ہوں۔ لیکن اس بچے کو کس کے حوالے کیا جائے۔ اس کی ماں تو لوٹی نہیں اب تک۔ کیسی ماں ہے جو اتنے پیارے بچے سے اتنی دیر جدا رہ سکتی ہے؟

خاوند: (فکر مند ہو کر) ہاں وہ ابھی تک نہیں لوٹی۔ کیسی عورت ہے؟

بیوی: شاید وہ ادھر ہی کو جا رہی تھی۔ بچاری کو حاجت کے لئے رُکنا پڑا۔ میری مانو تو اسے ساتھ لے چلیں۔ لیکن تم دھیرے تھوڑی چلو گے!

خاوند: تمہارے دل کا سونا پن تمہیں کس بات پر آمادہ کر رہا ہے۔ نہیں بیٹھا رہنے دو بچے کو۔ آخر ماں لوٹے گی۔

بیوی: ہائے معصوم بچے کو اس طرح چھوڑ کر چل دوں ہا

خاوند: میں کہتا ہوں مورکھ نہ بنو۔ کوئی مصیبت آجائے گی۔ اور سنو۔ میں تو جانوں اس کے بازو پر بندھا کالا تعویز کسی ٹونے والا ہے۔

بیوی: لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) لیکن میں کہتی ہوں

یہ بچہ بہت پیارا ہے۔

خاوند: بچہ پیارا ضرور ہے لیکن ہے پرایا۔ چلو دیر نہ کرو

(اُسے ہلکا سا آگے کو دھکیل کر خود بھی آگے کو بڑھتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دونوں منظر سے ہٹ جاتے ہیں۔ بچہ اُدھر کو دیکھتا رہتا ہے)

بیوی: (بچے کو پیار کرتی ہوئی) میرے اچھے بچے تجھ سے جدا ہوتی ہوں۔ میں کیا کروں مجبور ہوں۔

خاوند:۔ اب چلوگی بھی کہ جمی رہوگی؟

(تھوڑی دیر بعد درمیانی راستے سے گرہ کٹ چور اور ٹھگ آتے ہیں۔ چور جوان ہے اور بابوؤں کے لباس میں گرہ کٹ اس سے ملتا جلتا ہے لیکن ٹھگ کوئی سیٹھ یا برہمن لگتا ہے اور دونوں سے بڑی عمر کا ہے۔)

ٹھگ: دوستو! میری مانو تو یہیں سے اپنی اپنی راہ بدل لو۔

چور: بہت اچھی تجویز ہے۔

گرہ کٹ: پھر انتظار کس کا ہے۔ یہیں ایک طرف ہو کر مال کے حصے بخرے کر لو اور اپنی اپنی راہ لو۔ لیکن جھگڑے کی کوئی بات نہ ہو۔

(تینوں اپنی دُھن میں اتنے مگن ہیں کہ بچے کی موجودگی سے بے خبر رہتے ہیں اور درخت کی داہنی طرف کو اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی جیبوں سے چیزیں نکالتے ہیں۔ بچہ اس وقت اکیلے پن سے اوب کر رونے لگتا ہے۔ تینوں گھبرا کر ادھر دیکھتے ہیں۔)

چور:۔ باپ رے! خطرہ تو سامنے موجود ہے یا خدا بچانا۔

ٹھگ: بھگوان کرپا کرے۔ میرے پیارو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ساتھ اس کی ماں کے سوا کوئی نہ ہو۔

گرہ کٹ: لیکن وہ ماں ہے کہاں۔ راستے پر بچے کو ڈال کر وہ کیوں گئی؟

چور:۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔

ٹھگ:۔ یہی شک مجھے ہے۔

گرہ کٹ:۔ ذرا انتظار کر لو۔ دیکھیں وقت کے پردے سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

ٹھگ:۔ میرے دوستو! ماں اپنے بچے کو چھوڑ کر اس طرح نہیں جا سکتی ہے۔ میری مانو تو بچے کو ساتھ لے چلو۔ سمجھو بھگوان نے ہمیں ساتھی دیا ہے۔

چور:۔ خدا مہربان معلوم ہوتا ہے۔ بچہ بڑا پیارا ہے۔ اگر میں پالوں تو بڑا ہو کر میرا بہت اچھا مددگار ثابت ہوگا۔ میں اِسے خوب ٹرینڈ کروں گا۔

گرہ کٹ:۔ تم اس کو خراب ہی کروگے کیا عجب کل ہی پُلس نہیں پکڑلے۔ پھر اس کا کون وارث بنے گا۔

ٹھگ:۔ میرے دوستو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس ننھے ساتھی کو میں پالوں گا اور اپنے فن کا مالک بناؤں گا۔

چور:۔ جناب آپ کے بس کی بات نہیں اس بچے کو میں ہی کچھ بنا سکتا ہوں۔ پالنے میں تکلیف ضرور ہوگی لیکن جیسے ہی ذرا بڑا ہوا میں اُسے لوگوں کے گھروں میں جا کر کام کی باتیں معلوم کرنے پر لگاؤں گا۔

گرہ کٹ: میرے دوست آپ کو اس بچے پر سے اپنی لالچی نگاہ ہٹا لینی چاہیئے۔ اسے میں ہی اپنے ہی کام کے لئے تیار کروں گا۔

ٹھگ: میرے دوستو! ہم میں جھگڑا سر اٹھا رہا ہے یہ اور اس کی وجہ یہ سُندر بچہ ہے۔ مگر اس کے بازو پر کالے تعویز کو بھی نہ بھولو۔ یونہی بچے کو یہاں نہیں ڈال دیا گیا۔ میری مانو تو اس مصیبت کو یہیں رہنے دو ۔۔۔ اور یہاں سے کہیں اور چل کر اپنا مال بانٹو۔ اٹھو۔

(وہ اُٹھ کر اپنی داہنی طرف کو چلنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو ساتھی بچے کو حسرت اور لالچ کی نگاہ سے دیکھتے چل پڑتے ہیں۔ بچہ روتا رہتا ہے۔ اسی وقت بائیں طرف سے ۔۔۔ بوڑھا اور ادھیڑ داخل ہوتے ہیں۔ آتے ہی ان کی نگاہ روتے ہوئے بچے پر پڑتی ہے۔)

بوڑھا: ارے یہ ننھا سا بچہ رو رہا ہے۔ لگتا ہے دیر سے رو رہا ہے۔ گلا بیٹھ گیا ہے۔

ادھیڑ:۔ آپ کی یہی عادت مجھے پسند نہیں۔ بچہ رونا ہے تو رونے دیجئے ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں؟ چلیئے۔

بوڑھا:۔ میرے پیارے اتنی بے دردی اچھی نہیں۔ مجھے تو یہ بچہ پسند ہے

پھر یہ تو جانے کیوں یہاں اکیلا رو رہا ہے ؟

ادھیڑ:۔ آپ تو بے کار اپنا دل دکھا رہے ہیں۔ آخر یہ بچہ اکیلا تو یہاں نہیں پہنچا ہوگا اس کی ماں بھی ہوگی۔

بوڑھا:۔ ٹھیک لیکن وہ ہے کہاں ؟ وہ کیسی ظالم ماں ہے جو بچے کو اس حالت میں ویران جگہ پر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

ادھیڑ: میں سمجھتا ہوں وہ اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ یہیں کہیں گلچھرے اڑا رہی ہوگی۔ ہمیں پرائے پھڈے میں پاؤں ڈالنے سے کیا ملے گا۔ چلیے۔

بوڑھا:۔ میں تو ذرا دم لینا چاہتا ہوں۔ تم چاہو تو آگے بڑھ چلو۔ میں ذرا دیر رُک کر آگے والی پلیا پر آملوں گا۔

ادھیڑ:۔ میں جانتا ہوں آپ کے دم لینے کا راز اس بچے کی کشش ہے۔ چلیے میں بھی رُکتا ہوں ذرا دیر اس بچے سے دل بہلاؤں گا جب تک شاید اس کی ماں بھی لوٹ آئے۔

بوڑھا:۔ تمہاری باتیں میرے دل پر کیا اثر کریں گی۔ چلو۔ چھوڑو۔ دیکھو ! بچہ کھل کر رو بھی نہیں سکتا۔ سسکیاں بھر رہا ہے (بڑھ کر اُسے اُٹھاتے ہوئے) میرے پیارے ... ! میرے پیارے ... ! مت رو ! آؤ مرے لاڈلے۔

(بچے کو سینے سے لگا لیتا ہے اور وہ چپکا ہو کر اُسے دیکھنے لگتا ہے۔)

ادھیڑ: لیجیے مبارک ہو۔ بچہ آپ سے مانوس ہوگیا۔ دیکھیے کس اپنایت سے دیکھ رہا ہے آپ کو !

بوڑھا:۔ یہ تو میرا دوست ہے۔ کیوں رے ! ننھے فرشتے، کیا چاہیے تجھے؟ (اس کے ہونٹوں کو اُنگلی سے چھوتا ہے وہ مُسکرانے لگتا ہے) واہ اتنے ہی میں خوش ہوگئے۔ واہ مرے بادشاہ۔

ادھیڑ:۔ جی بھر کر کھیل لیجیے۔ یہ کھلونا ہے بہت دلکش۔

بوڑھا:۔ تو پھر اس کو گھر کی رونق بناؤ۔

ادھیڑ: واہ کیا کہنے۔ اسی کو کہتے ہیں آ بیل مجھے مار۔ بھلا میں اس مصیبت کو کیوں سر لینے لگا۔

بوڑھا:۔ بھئی تمہیں بچے مصیبت کیوں لگتے ہیں۔

ادھیڑ: آپ کو معلوم ہی ہے میرے کئی بچے ہیں

بوڑھا:۔ ٹھیک ہے لیکن کبھی تم نے روپے جمع کرتے ہوئے بھی سوچا کہ اب زیادہ کی ضرورت نہیں — (بچے سے) میرے پیارے تم واقعی فرشتے ہو۔ جانے وہ کیسے بدنصیب ماں باپ ہیں جنہوں نے تم کو یہاں پھینک دیا۔

ادھیڑ: اب یہ پھینکا ہوا دھن آپ ہی کیوں نہیں سنبھال لیتے ؟

بوڑھا:۔ ایسا ہی لگتا ہے — جانے یہ بے ماں باپ کا بچہ کب سے یہاں پڑا ہے۔ خیر — میں ہی اس کو پالوں گا۔ اور اپنی ویران زندگی کو آباد کروں گا۔

ادھیڑ: لیکن جناب اس کے بازو سے بندھا یہ کالا تعویز بھی دیکھا ؟

بوڑھا:۔ میں ان تعویزوں سے نہیں ڈرتا۔ تمہیں ڈر لگتا ہے تو یہ لو۔

(بچے کے بازو سے تعویز کی پٹی کھول کر آہستہ سے زمین پر ڈال دیتا ہے۔)

ادھیڑ (ڈر سے کھسک کر) پرے ہی رکھیے اور اپنے لاڈلے کو سینے سے لگائیے

بوڑھا:۔ (بچے کو پیار سے چمٹا کر) کیوں نہیں۔ اس کے چھاتی سے لگتے ہی زندگی میرے لئے روشن گلزار بن گئی ہے۔

ادھیڑ:۔ مبارک ہو۔ مگر اس تعویز کا خیال رکھیے۔

بوڑھا:۔ میں حیران ہوں، آخر تم ایک کاغذ کے ٹکڑے سے خوف زدہ کیوں ہو۔ دیکھوں ذرا کیا ہے اس میں۔؟

(تعویز کا کپڑا ناخنوں سے کھولتا ہے اور اس میں سے ایک کاغذ نکلتا ہے جس پر سرکاری مہر چھپی ہے ساتھ ہی ایک رقعہ ہے۔)

ادھیڑ:۔ ارے یہ تو عجیب تعویز ہے — ذرا دکھائیے۔

بوڑھا: لو دیکھو اور پڑھو۔

ادھیڑ (لے کر پڑھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک پیدا ہوتی ہے) خیر ایک بات، تو کھلی کہ یہ تعویز نہیں ہے۔

بوڑھا:۔ تو کیا اس بچے کو پالنے کو تیار ہو۔؟

ادھیڑ: اگر آپ کو کوئی مجبوری ہو تو میں اس ننھے فرشتے کو پال لوں گا۔

بوڑھا:۔ (نگاہوں میں طنز کی چمک پیدا ہوتی ہے) بہت اچھے اتنی جلدی یہ بچہ ننھا فرشتہ کیوں کر ہوگیا ؟ کیا اس تعویز کے کاغذ میں کوئی جادو ہے۔ ذرا دکھاؤ تو مجھے بھی۔

ادھیڑ۔ آپ اس بیکار کاغذ کو کیا کریں گے۔ یوں آپ بچے کو پالنا چاہیں تو رکھ لیجیے۔

بوڑھا: کیا مطلب — اب تم اس سے اُکتا ہی گئے۔ میں ان تبدیلیوں

پر کیا کہوں۔

ادھیڑ: معاف کیجئے اس ننھے بچے سے مجھے کوئی نفرت نہیں ہے۔ آپ کی خاطر ہی اس پر توجہ نہیں کی۔

بوڑھا: اس کے لئے شکریہ۔ لیکن وہ کاغذ تو اٹھایئے۔

ادھیڑ: اس کو آپ کیا کیجئے گا، انگریزی میں ہے۔

بوڑھا: شاید میں پڑھ بھلے ہی نہ سکوں۔ لیکن اس کی صورت تو دیکھ لوں۔

ادھیڑ: اچھا، لیجئے۔

(کاغذ بوڑھے کے حوالے کرتا ہے لیکن گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں ہے۔ بوڑھا کاغذ کھول کر پڑھتا ہے۔)

بوڑھا (کاغذ پلیٹ کر) دیکھو میں نے اس تعویز کا بھید جان لیا۔

ادھیڑ: انگریزی آپ کی سمجھ میں کیوں کر آگئی ۔؟

بوڑھا: پیارے میں ایسا ان پڑھ بھی نہیں ہوں۔ اچھا سنو۔ اس چٹھی میں تو یہ لکھا ہے۔

"جس صاحب کے ہاتھ میرا یہ بچہ لگے اس کو میری طرف سے درخواست ہے کہ اس کو پالے کیونکہ میں اپنے جان لیوا مرض کی وجہ سے عنقریب مرنے والا ہوں۔ اس کی ماں ایک ریل کے حادثے میں مرگئی تھی۔ اب یہ بچہ اسی کا ہے جس کو یہ ملے۔ اس چٹھی کے ساتھ میں اپنا ایک وصیت نامہ نتھی کر رہا ہوں۔ خالی جگہ پر بچے کا پانے والا اپنا نام بھردے اور جائیداد کا مالک بنے۔ میں اس بچے کو مجبوراً سرِراہ صبح صبح چھوڑے جاتا ہوں۔

لڑکے کا دکھی اور مجبور

باپ

بوڑھا: سن لی چٹھی کیا رائے ہے ۔؟

ادھیڑ: میں اس یتیم بچے کو اپنا بیٹا کر کے پالنے کو تیار ہوں۔ لائیے مجھے دیجئے اس ننھے فرشتے کو۔

بوڑھا: ٹھہرو بے صبری نہ دکھاؤ، پہلے میرے سوال کا جواب دو۔

ادھیڑ (بے صبری سے) آپ کی یہی عادت مجھے پسند نہیں۔ بال کی کھال نکالنے کی یہ عادت بہت بری ہے۔

بوڑھا: خیر اس کے لئے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم میرے دوست ہو۔ تمہاری کوئی بری بات بھی مجھے تکلیف نہیں دے گی۔

ادھیڑ: اچھا پوچھئے آپ کیا چاہتے ہیں؟

بوڑھا: میرے پیارے میں صرف اتنا ہی جاننا چاہتا ہوں، کہ تم کو یہ بچہ پسند ہے یا یہ جائداد والا وصیت نامہ۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کالا خطرناک تعویز۔

ادھیڑ: مجھے دونوں ہی پسند ہیں

بوڑھا: اچھی بات ہے، لیکن میری پسند بھی کوئی معنی رکھتی ہے۔ مجھے یہ بچہ پسند ہے۔ یہ کالا کاغذ نہیں۔ تم چاہو تو اس کو لے لو اور جائداد کے وارث ہو جاؤ۔ میری زندگی کے لئے یہ روشن چراغ ہی بہت ہے۔

(یہ کہہ کر بوڑھا تعویز والا کاغذ اس کے آگے آہستگی سے ڈال دیتا ہے اور بچے کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیتا ہے۔ ادھیڑ تھوڑی دیر تک خاموش رہتا ہے۔ پھر وہ کاغذ اٹھا کر اٹھ کر چل دیتا ہے۔ اس کے بعد بوڑھا بچے کو اٹھا کر واپس چلا جاتا ہے۔)

بقیہ عبرت نامہ

پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔ جو اپنی عمر کی صرف ۱۹ بہاریں دکھانے کے بعد ملک و ملت پر فدا ہو گیا۔ کاش زمانہ سراج الدولہ کو ۱۹ کے بجائے ۴۱ سال کی عمر عطا کر دیتا تو ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا وہ اپنے عہد کا سبھاش چندر بوس تھا۔ اس نے اپنی قلیل مدت عمر میں ہی غداروں اور کینہ جو حضرات کے علاوہ انگریزوں اور پرتگیزیوں سے مقابلہ و مجادلہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ نواب سراج الدولہ کو نہ تو انگریزوں نے نقصان پہنچایا، نہ پرتگیزی اس کا کچھ بگاڑ سکے۔ ہاں ملک کے غدار، قوم کے دشمن، مارِ آستین سے وہ نجات نہ حاصل کر سکا۔ یہ غم اس وقت بھی عظیم تھا۔ آج بھی عظیم ہے اور رہتی دنیا تک عظیم رہے گا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خوں بہ غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

صباح الدین عبدالرحمٰن

عرش ملسیانی

(۲)

عام طور سے عرش کی زبان پاکیزہ اور معیاری ہے اور یہ لکھتے وقت جوش ملیح آبادی پھر یاد آرہے ہیں جن کو زبان پر بڑی قدرت ہے، وہ اپنی قادرالکلامی سے الفاظ اور تراکیب کا ایک انبار لگا دیتے ہیں۔ لیکن جہاں وہ پسندیدہ الفاظ و تراکیب سے بڑی اچھی شاعرانہ فضا پیدا کر دیتے ہیں وہاں بعض اوقات ان کے اجنبی محاوروں اور بھونڈی ترکیبوں سے ان کی باکمال شاعری داغدار ہو کر بے کیف ہو جاتی ہے مثلاً۔

ع۔ لہروں کو بنا رہا ہے بینا

ع۔ یوں ہے ایک روشن نمی سی چشمِ سحر انداز میں

ع۔ شب کو اکثر کھو کھلی تاریکیاں میدان میں

ع۔ تاروں کی کشمکش میں جب چاندنی ہو چھٹکی

ع سینۂ خباطِ عالم میں ہے طرحِ رخت نو

ع مضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا

زبان و بیاں کی یہ بے راہ روی اور ناہمواری عرش کے یہاں نہیں ملے گی۔ ان کے یہاں ہر موقع پر زبان و بیان کی سلامت روی اور ہمواری پائی جاتی ہے۔ یہ ان کے والدِ بزرگوار کا فیضان ہے۔

ملا ہے عرش یہ ذوقِ سخن میراث میں مجھ کو
نہ ہو کیوں رشک کے قابل بیاں میرا زباں میری

عرش کی شاعری کے افق پر ان کی غزلوں کی بھی قوسِ قزح دکھائی دیتی ہے۔ غزل کہنا بہت آسان ہے، لیکن غزل کہہ کر اہلِ نظر اور اہلِ ذوق کو مائل کرنا بہت مشکل ہے، کیوں کہ غزل اپنے ابتدائی دور سے اب تک ہر قسم کے جلوؤں اور اداؤں کو سمیٹ چکی ہے۔ رمزیت بھی، اشاریت بھی، موسیقیت بھی، داخلیت بھی، خارجیت بھی، زبان و بیان کی شگفتگی بھی، برجستگی بھی، غمِ جاناں کی برشتگی بھی، غمِ دوراں کی فتادگی بھی، شیریں دیوانگی بھی، پسی ہوئی بجلیاں بھی، بکھری ہوئی تجلیاں بھی۔ طرزِ ادا کی دھوم دھام بھی، سوز و ساز بھی، اندازِ بیان کا کس بل بھی، جوشِ میکدہ بھی، حیات و کائنات کے مسائل بھی، پند و حکمت کے رموز و نکات بھی، تصوف کی گہرائی بھی، فلسفہ کی باریکی بھی۔ محاورہ، روزمرّہ کی چاشنی بھی، تغزل کا بانکپن بھی، تیکھاپن بھی، رسیلاپن بھی، تاثر بھی، تاثیر بھی غم کی جھنکار اور پیار بھی، جل ترنگ بھی لہو ترنگ بھی۔

اسی لیے غزل کہہ کر اربابِ نظر کو اپنی طرف مائل کرنا آسان نہیں بلکہ بہت ہی مشکل ہے۔ لیکن عرش ان غزل گو شاعروں میں ہیں جو غزلیں کہہ کر اپنے سننے والے اور پڑھنے والے دونوں کو مائل کرتے ہیں، مشاعرے میں تو عام طور پر وہی غزل گو سامعین کو اپنی طرف مائل کرتا ہے جو نغمہ و ترنم کا ماہر ہوتا ہے۔ عرش مشاعروں میں اپنی غزلیں اپنے خاص ترنم سے ضرور پڑھتے ہیں اور داد بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کو اصلی داد اس وقت ملتی ہے جب وہ چھپتے ہیں اور چھپنے کے بعد اہلِ نظر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر ان کی غزلیں پڑھتے ہیں۔ تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی رعنائیِ خیال میں کوئی جھوٹی کہانی نہیں، بلکہ روح زندگانی کی سچی کہانی ہے جو اخلاص، توازن، شائستگی اور تھمی ہوئی کیفیات کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اور اس میں روایتی سج دھج کے ساتھ نئے انداز میں جذبات کی نیرنگیوں اور ناقابلِ بیان کیفیتوں کی ترجمانی بھی ہے۔

عرش نے اپنے ابتدائی دور کی ایک غزل کے ایک مقطع میں کہا تھا

میری نیرنگیوں کو عرش تم سمجھو تو کیا سمجھو!
کبھی دیوانۂ دل ہوں کبھی بے گانۂ دل ہوں

یہی نیرنگی ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے، وہ جب بے گانۂ دل ہوئے تو انھوں نے نظمیں کہیں جن میں دل کے بجائے دماغ سے کام لیا۔ اور جب دیوانۂ دل ہوئے تو غزلیں کہیں، ان کے دل سے ان کے شباب کے زمانہ میں یہ صدا اٹھی۔

دل یہ کہتا ہے کہ جذبات کو بیدار کر
عشق کو حسن کے رازوں سے خبردار کر

ان کی شاعری کے تین دور ہیں۔ پہلے اور دوسرے دور میں تو حسن کے رازوں کو جانتے رہے لیکن تیسرے دور میں عشق کو حسن کے رازوں سے دل کی دھڑکنوں اور تخیل کی نزاکتوں کے ساتھ خبردار کرتے رہے غزل کا ہر شاعر یہی کرتا آیا ہے لیکن عرش نے اس پرانی روایت میں زبان اور فن پر پوری قدرت کے ساتھ ایک نئی آن بان دکھا کر جو نئی شان پیدا کی ہے، وہی ان کا امتیازی رنگ ہے۔ اس نئی شان پیدا کرنے میں فیضان تو ان کے والدِ محترم کا ہے لیکن ان کا خود بیان ہے کہ انھوں نے کسی کا تتبع نہیں کیا اور نہ کسی سے تلمذ حاصل کیا۔ لیکن ان کی غزلوں میں غیر شعوری طور پر کبھی مومن، کبھی غالب، کبھی فانی، کبھی اقبال اور کبھی جگر کی آوازِ بازگشت سنائی دیتی ہے اور یہ آواز شاید اس لئے پیدا ہوگئی ہو کہ انھوں نے بعض مصرعوں کو مصرع طرح بنا کر مشاعرے کے لئے غزلیں کہی ہوں۔ لیکن اس صدائے بازگشت کے ذریعہ ان کے اندر غزل کہنے کے جو ماہرانہ امکانات تھے وہ ضرور ابھرے۔

مومن کی پھوٹتی ہوئی آواز سُنئے۔

وہ وفا و مہر کی داستاں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی تو بھی تھا مرا مہرباں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جو ترے لئے مرے دل میں تھا جو مرے لئے ترے دل میں تھا
مجھے یاد ہے وہ غمِ نہاں تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ پوری غزل ۱۹۵۱ء میں تقسیم ہند کے بعد کراچی کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی۔ اس لحاظ سے اس غزل کی کیفیت کی نوعیت اور بھی بدل جاتی ہے عرش کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل اشعار میں غالب کی جانی پہچانی آواز سنائی دیتی ہے۔

وہ چمن میں آئے تو شاخیں گلستاں ہوگئیں
گُل قصیدہ خواں ہوئے کلیاں غزل خواں ہوگئیں
مشکلیں تھیں اُن کے دم سے حوصلے تھے عزم تھے
اُف کہ اب اُن کے کرم سے وہ بھی آساں ہوگئیں

غالب کی ایک مشہور غزل کی ردیف میں ہلکی سی ترمیم کر کے عرش نے جو ایک غزل کہی ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

صبحِ ازل اٹھا تھا کوئی گوشۂ نقاب
اب تک ہے آنکھ دید کا ارماں لئے ہوئے
اک درد بن کے آئی ہے دل میں تمہاری یاد
آجاؤ تم بھی درد کا درماں لئے ہوئے

جگر نے بھی اس قافیہ اور ردیف میں ایک غزل کہی ہے جگر اور عرش کے بعض ہم قافیہ اور ہم معنی اشعار ملاحظہ ہوں۔

جگر — اہلِ سلامتی کی طرف سے اُسے سلام
کشتی جو غرق ہوگئی طوفاں لئے ہوئے
عرش — آتے ہیں ہر قدم پہ وہ جلوے بکھیرتے
ہر اک ادا میں حسن کا طوفاں لئے ہوئے
جگر — ہونا تھا چاک چاک گریباں کو اے جنوں
لیکن کسی کا گوشۂ داماں لئے ہوئے
عرش — موقوف حسنِ گل پہ نہیں رونقِ بہار
بیٹھے ہیں ہم بھی چاک گریباں لئے ہوئے

جگر نے کہا ہے:

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

عرش نے اس کو دوسرے رنگ میں کہا ہے ؎

محبت سوز بھی ہے ساز بھی ہے
خموشی بھی ہے یہ آواز بھی ہے

عرش کی غزلوں میں اقبال کے رنگ کے بھی کچھ اشعار ملیں گے۔ مثلاً

خودی کا رازداں ہو کر خودی کی داستاں ہو جا
جہاں سے کیا غرض تجھ کو تو اب اپنا جہاں ہو جا
زمانے پر بھروسا کر نہ رازِ عشق کا اے دل!
جہاں تک ہو سکے تو آپ اپنا رازداں ہو جا

فانی کی ایک مشہور غزل کا مطلع یہ ہے:

دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

فانی کی پوری غزل میں سوگوارانہ رنگ ہے۔ لیکن عرش نے اسی قافیہ اور ردیف میں ایک غزل کہہ کر رندانہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔

ساقی تری صحبت میں کیا عالمِ مستی ہے
جنت مری نظروں میں اجڑی ہوئی بستی ہے



عرش و جگر

میخانۂ ہستی ہیں یہ جوڑ نہ ٹوٹے گا
مستی ہے تو رندی ہے رندی ہے تو مستی ہے

البتہ اس غزل کے ایک شعر میں فانی کا تھوڑا سا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

پھر فصلِ بہاراں میں آباد ہوئے گلشن
میرے دلِ ویراں پر حسرت ہی برستی ہے

فانی کا ایک شعر ہے:

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

عرش نے اس کو اس طرح پیش کیا ہے،

بےخودی اور اس پہ زعمِ آگہی
زندگی کیا ہے فریبِ ہوش ہے

عرش اور فانی کا موازنہ مقصود نہیں، لیکن عرش نے فانی کی غزل کی زمین میں جو اشعار کہے ہیں، ان کا محض رنگ دکھانا تھا۔

عرش خود لکھتے ہیں کہ تمام اصنافِ سخن میں سے غزل اُن کی محبوب صنف ہے۔

وہ ایسی شاعری کے قائل ہیں جس میں شعریت ہو، رس ہو، لوچ ہو، موسیقی ہو اور مصوری ہو۔ ان ہی خصوصیات کے ساتھ انھوں نے غزل کہنے کی کوشش کی ہے ان کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جن کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ غزل خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اچھے جوہری کے ہاتھ آجائے تو وہ اس میں کندن کی چمک دمک پیدا کر ہی دے گا۔

کہا جاتا ہے کہ غزل، جسم، جذبہ، اور جمال کی شاعری ہے عرش کے یہاں جسم کی تو نہیں لیکن جذبہ اور جمال کی شاعری ضرور ہے۔ انھوں نے جذبۂ محبت کو بڑی پاکیزگی اور لطافت کے ساتھ ابھارا ہے۔ مثلاً

اک تیری محبت کی قسم کھائے ہوئے ہیں
تو غیر سہی ہم تجھے اپنائے ہوئے ہیں

بڑھتا نہیں گو دردِ محبت مرے دل میں
لیکن یہ مصیبت ہے وہ کم بھی نہیں ہوتا

لاکھ خورشیدِ محبت کی ضیا پاشی رہی
مری صبحِ آرزو پر رنگِ شام آ ہی گیا

دلِ آگاہ کو غفلت بھی عطا کی ہوتی
اک مصیبت ہے محبت میں تری یاد مجھے

محبت اگر ہے تو سب کچھ ہے گھر میں
محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

تصویرِ دوست دل میں کچھ ایسی اُتر گئی
جھولی مری مراد کے پھولوں سے بھر گئی

سو سو سزائیں عشق میں اک اک گناہ پر
کچھ تو بتا مجھے تری رحمت کدھر گئی

حسن کا جو مرقع انھوں نے پیش کیا ہے پہلے اس کا مطالعہ کیجیے:

احساسِ حسن بن کے نظر میں سما گئے
گو لاکھ دور تھے وہ مگر پاس آگئے

حسن کی خود نمائیاں توبہ
بے نقابی پہ بے نقاب نہیں
فطرتِ حسن ہے حجاب پسند
حسن فطرت تو بے حجاب نہیں

حسن ہرگز نہیں سرور کا نام
حسن مستی نہیں شباب نہیں
حسن ہے قید و بند سے آزاد
روحِ معنیٰ ہے یہ کتاب نہیں
حسن پر دسترس کی بات نہ کر
یہ ہوس ہے، ہوس کی بات نہ کر

عرش کے یہاں حسن و عشق کی جو کشمکش ہے اس سے بھی محظوظ ہوں

عشق کو محوِ ناز ہونے دے
حسن سے بے نیاز ہونے دے
حسن تو ہے ازل سے عشق طراز
عشق کو حسن ساز ہونے دے
عشق جاں آفریں کا حال سنا
حسنِ عیسیٰ نفس کی بات نہ کر
حسن سے دور رہ کے بھی نزدیک
عشق اک راز ہے بہت باریک
عشق کا ہر بیاں، بیان غلط
حسن جو بھی کہے سراسر ٹھیک
نگاہِ ہوس روک اے عشق اپنی
تجھے حسن کی پاسبانی ملی ہے
حسن پہ گو یقیں نہیں مجھ کو
عشق پر اعتبار کرتا ہوں
مرے عشق ہی کا یہ احسان ہے
تمہیں دیکھئے کیا سے کیا کر دیا

عرش کے یہاں جس طرح عشق کو حسن پر فوقیت حاصل ہے، اسی طرح عشق کو عقل پر بھی برتری حاصل ہے۔

دامن میں لئے پھرتی تھی جسے محتاط خرد کی نادانی
ان مصلحتوں کی دولت کو عشق ایک نظر میں لوٹ گیا

عقل کیوں ہے پناہ کی طالب
وحشت بے پناہ سے پوچھو!

غزل میں متغزلانہ کیفیت عشق کی ناکامی، نامرادی، اور حرماں نصیبی کا اظہار کر کے بھی پیدا کی جاتی ہے۔ ان کے جلوے بھی عرش کی غزلوں میں دکھائی دیتے ہیں مثلاً

دل فسردہ پہ سو بار تازگی آئی
مگر وہ باد کہ جا کر نہ پھر کبھی آئی

ہزار دیدہ پہ پابندیاں تھیں پردے تھے
نگاہِ شوق مگر ان کو دیکھ ہی آئی

ہم ضبط کی منزل کے راہی فریاد کا دامن چھوڑ چکے
یہ اشک سرِ مژگاں لیکن کیوں راہ میں کانٹے بوتا ہے

توازن خوب یہ عشق و سزائے عشق میں دیکھا
طبیعت ایک بار آئی مصیبت بار بار آئی

سہارا موت نے آکر دیا تو کب دیا ہم کو
ہماری زندگی جب دن مصیبت کے گزار آئی

عرش کی غزلوں میں زبان کی بڑی بے ساختگی ہے۔ روزمرہ کی بے تکلفی بھی ہے۔ دلکشی بھی، لطافت بھی، اور اندازِ بیان کی فصاحت اور بلاغت بھی ہے شروع سے اب تک غزل گو شعراء نے زبان کو مانجھ کر اس میں اتنی صفائی اور برجستگی پیدا کر دی ہے کہ اگلے شعراء کی امتیازی شان آج کے شاعروں کے لئے پیش پا افتادہ ہے، پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غزل کے ارتقا میں اس کی زبان کو بے ساختہ، بے تکلف، دلکش، لطیف، فصیح اور بلیغ بنانے میں عرش کا بھی حصہ ہے۔

فانی، اصغر، حسرت اور جگر غزل کی دنیا آباد کر کے جا چکے، فراق گورکھپوری اس کارواں کے آخری حدی خوان باقی رہ گئے ہیں۔ ان اربابِ کمال کے پیچھے غزل گویوں کی جو نسل آرہی ہے۔ اس کی صفِ اولین میں عرش ہر حال میں ایک نمایاں اور ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

عرش نے اردو شاعری پر اپنی قدرت اور مہارت کا ثبوت سرمد کی فارسی رباعیوں کا اردو رباعیوں میں ترجمہ کر کے بھی دیا ہے۔ اور اس مجموعہ کا نام نغمۂ سرمد رکھا ہے۔ اس کے شروع میں ان کی ایک نثری تحریر ہے جس میں کچھ تحقیقی رنگ بھی ہے۔ لیکن اس کی کتابیات میں دیوانِ قطب الدین بختیار کاکی دیکھ کر تعجب ہوا۔ کیوں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے جو دیوان عام طور سے چھپے ہوئے ملتے ہیں وہ اہلِ نظر کے نزدیک جعلی ہیں۔ اس سے قطع نظر عرش نے سرمد کی رباعیوں کا جو اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے، وہ قابلِ قدر ضرور ہے۔

س۔ ش۔ مشہدی

سلومی



لوگ کہتے ہیں جوانی دیوانی ہوتی ہے مگر میں تو کہتی ہوں جوانی بلائے جان ہوتی ہے۔

ہائے، بچپن کے وہ دن کیسے مزے کے تھے، گھنٹہ دو گھنٹہ سبق یاد کیا، مولوی صاحب کی ڈانٹ پھٹکار سنی اور پھر مزے کے مزے۔ ابھی نمکولی کی ہنڈیا پک رہی ہے تو ابھی آم کے درختوں پر جھولے ڈال کر پینگ پر پینگ دی جا رہی ہے

آم کے دن آتے تو گویا عید ہو جاتی۔ ادھر دوپہر میں گھر کے لوگ گرمی کی تپش سے بچنے کے لیے کمروں میں بند ہوتے اور ادھر ہم دبے پاؤں باغ میں۔۔۔ مالی لاکھ منع کرتا کہ بیٹا لو چل رہی ہے واپس جاؤ نہیں تو بڑے سرکار سے کہہ دوں گا۔ مگر سامنے بچے اُسے کاکا، کاکا کہہ کر منا لیتے اور پھر تو وہ دھاچوکڑی مچتی کہ الٰہی توبہ۔ راشد اور خلو درخت پر چڑھ جاتے اور ہم نیچے آم چننے لگتے۔ کچے آم کی ٹکوریاں نمک کے ساتھ ایسی کھٹی کھٹی اچھی لگتیں کہ دوسرے دن حکیم صاحب کی تلخ دوا پیتے وقت سارا مزا کرکرا ہو جاتا ڈانٹ الگ پڑتی کہ کچے آم کھاتی ہو تو نتیجہ بھگتو۔ ادھر بجو الگ خوشامدیں کرتی کہ "اچھی رفو، ذری دو ٹکوری مجھے بھی لا دو" اور میں اترا جاتی کہ بڑی دھوپ ہے بجو"، پھر گڑیا کے جمپر سی دینے کے وعدے پر چھپ چھپا کر بجو کے لیے دو چار ٹکوریاں لا دیتی، جنہیں وہ چھپ کر کمرے میں کھاتیں۔ ایک دن امی نے انہیں ٹکوریاں کھاتے دیکھ لیا، پھر کیا تھا بجو کی شامت ہی تو آ گئی تھی۔

"جوان ہو گئیں مگر بچپن نہ گیا۔ کچر کچر کچے آم کھاتے وقت کبھی تم نے سوچا کہ تمہیں کتنا نقصان کرے گا۔ عورتوں کو کھٹا نہیں کھانا چاہیے بیٹا" اور بجو مارے شرم کے آنچل میں منہ چھپا لیتیں۔ میں سوچتی آخر عورتوں کو کھٹا کیوں نہیں کھانا چاہیے امی سے پوچھتی تو وہ ڈانٹ دیتیں۔

خلو چھوٹی خالہ بی کا لڑکا تھا اور راشد میرا سگا بھائی۔ دونوں ہی مجھ سے بڑے تھے مگر جب بھی راشد اور خلو میں جھگڑا ہوتا میں خلو کا ساتھ دیتی اور راشد جھنجھلا کر کہتا "رفو آج سے تو میری بہن نہیں" میں کہتی میری بلا سے" مگر میں ہمیشہ خلو ہی کی طرفداری کرتی۔ خلو مجھے مانتا بھی تو تھا۔۔۔ آج وہ ڈاکٹر خالد بن کر اتراتے ہیں اور کپڑوں پر شکن نہیں آنے دیتے، ورنہ کل ہی کی تو بات ہے، نہ جانے کتنی بار میں نے انھیں زمین میں گرا کر ان کی قمیض میں دھول بھر دی ہے۔۔۔ مگر وہ بھی تو مجھے کم نہیں ستایا کرتے تھے۔۔۔ اللہ میری چوٹی کے تو وہ دشمن تھے۔ وہ۔۔۔۔ کوئی بات ہوئی اور انھوں نے میری چٹیا کھینچی۔۔۔ الٰہی توبہ! میری تو جان ہی نکل جایا کرتی تھی۔۔۔۔ جی میں آتا کہ اس کم بخت چوٹی کو کاٹ کر ہی پھینک دوں۔ مگر بال گوندھتے وقت جب امی پیار سے میرے گھونگھریالے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے کہتیں "میری رفو کے بال کتنے خوبصورت ہیں" تو مارے فخر کے میرا سینہ پھول جاتا؛ زرد گالوں پر سرخی کی لہر دوڑ جاتی جیسے یہ خوبصورت بال خود میرے ہی اگائے ہوئے ہوں۔۔۔۔

مگر ہائے رے بچپن۔۔۔۔ ابھی جوانی آنے بھی نہ پائی تھی کہ بچپن کی آزادیاں قید و بند میں محصور ہو گئیں۔

میرے خدا آخر جوانی آ رہی تھی تو میرا کیا قصور۔۔۔۔ اگر میں کنواری تھی تو مجھ پر الزام کیوں۔۔۔۔۔ وہ تو خدا بھلا کرے نسابی کا کہ ڈیڑھ دن کی بیماری میں اللہ کو پیاری ہو گئیں ورنہ وہ اور دادی جان مل کر مجھ اکیلی جان کا جینا ہی دوبھر کر دیتیں۔۔۔۔

اگر آنچل سر سے ڈھلک جائے تو میں کیا کروں... آخر سلک کے دوپٹے ہی تو ہیں بالوں پر کیوں کر ٹھہریں۔ اب کام کرتے وقت اگر دوپٹے کو گردن میں لپیٹ لوں یا جلدی میں دوپٹہ کمرے میں ہی چھوٹ جائے تو کون سی آفت آجاتی ہے مگر دادا بی کی آنکھوں میں خون اتر جاتا اور نصیحتیں شروع ہو جاتیں۔

"بہو بیگم سنبھالو اپنی کنواریوں کو شیطان کے کان دور کہیں خاندان کا نام نہ روشن کر دیں۔" اور امی کھسیا کر رہ جاتیں۔ میں سوچتی یہ جوانی نہ جانے کس گناہ کی سزا میں آرہی ہے۔ ذرا زور سے چلو تو الگ امی کی ڈانٹ پڑتی ...

"... ہے ہے رفعت کیسے دھمک دھمک کر چل رہی ہو۔ زمین بد دعا دے گی۔ بیٹا کنواریوں کے یہ چلن نہیں ہوتے..."

ارے خاک میں جائیں کنواریاں اور لونج یہ جوانی۔ میری تو جان ضیق میں ہے ..... اُدھر میں خود ہی موئی جوانی کے ہاتھوں بیزار ... ۔ نہ جانے دل میں کیسے کیسے خیال آتے .... میں اپنے جسم کی تبدیلیوں پر غور کرتی تو مارے شرم کے گردن جھک جاتی اور پپوٹے بھاری ہونے لگتے... طبیعت تھی کہ ہر وقت مضمحل رہتی .... نہ کسی کام میں جی لگتا اور نہ کسی سے باتیں کرنے میں۔ اللہ اللہ کرکے نیند بھی آتی تو توبہ کیسے کیسے خواب آتے۔ جن کے بارے میں سوچ سوچ کر میں مارے شرم کے گڑ جاتی .... اور یہ خالد نہ جانے کہاں سے بھٹکتے ہوئے میرے خوابوں میں چلے آتے ... وہ تو ڈاکٹری پڑھنے شہر چلے گئے تھے اور برسوں سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی مگر میں ایسی دیوانی کہ خوابوں میں ان سے طرح طرح کی نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی ... اُف مجھے یاد بھی تو نہ رہتا تھا کہ خوابوں کی تفصیل دہراؤں ...

وہ تو خدا بھلا کرے بجّو کا وہی میری غمگسار تھیں ... مجھے اُداس یا پریشان دیکھتیں تو گلے سے لگا کر اتنا پیار کرتیں اتنی تسلیاں دیتیں کہ مجھے سکون آجاتا... اکثر رات میں ہم دونوں ساتھ ہی پلنگ پر سوتے تھے۔

بجّو کی عمر پچیس سے زائد ہو چکی تھی .... ناک نقشہ کھرا، بدن گداز اور رنگ تیکھا تھا، مگر بُرا ہو اس گھڑی کا جب دس سال پہلے چیچک نے بجّو کے چاند جیسے چہرے کو گہن لگا دیا ... آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ چڑھ گیا اور نرم و نازک جلد گہرے داغوں سے ایسی داغدار ہوئی کہ بجّو کی شکل ایک حد تک بھیانک ہو گئی ... یہی وجہ تھی کہ سینکڑوں رشتے آئے، امّی اور ابو نے لاکھ کوشش کی مگر بجّو کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکے۔ درگاہوں کی خاک چھانی گئی، مسجدوں کے طاق بھرے گئے۔ تعویذوں اور گنڈوں کی قطار لگ گئی۔ مگر بجّو کے سہرے کے پھول نہ کھل سکے اور بجّو دن بہ دن مرجھاتی رہیں۔

بجّو کی پہاڑ جیسی جوانی دیکھ کر امّی اور ابو کی آنکھوں کی نیند اُڑ گئی تھی اور بجّو کی بے خواب آنکھیں نہ جانے خلاء کی پہنائیوں میں کسے تلاش کرتی رہتیں۔ اکثر رات کی تنہائیوں میں وہ مجھ سے لپٹ جاتیں، ان کی چھاتی زوروں سے دھڑکتی ہوتی اور وہ مجھ سے کہتیں "رفو، تو کاجل کا ٹیکہ لگائے کہیں میری نظر نہ لگ جائے .... تو کتنی خوبصورت ہے رفو ... تیرا دولہا کتنا خوبصورت ہوگا ...." اور یہ کہتے وقت بجّو کی آواز بھرا جاتی، ان کا سارا درد ان کی آنکھوں میں کھنچ آتا اور ان کی سانس اتنی تیزی سے چلنے لگتی کہ میں گھبرا جاتی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ وقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ گذر جاتا ہے ... مگر نہیں وقت کب گذرتا ہے ... یہ تو ہماری زندگی ہے جو گذر جاتی ہے۔ صبح جب بھی آتی تھی اور آنگن میں کھڑے نیم کی پتیوں کو نقرئی لباس دے جاتی تھی۔ شام اور رات بھی تو ویسے ہی آتے تھے .... مگر بجّو کی جوانی ڈھلتی جا رہی تھی۔ امّی اور ابو کے چہرے پر فکر کی جھرّیاں آگئی تھیں ... امی کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔ ابو کی کمر بجّو کی جوانی کا بوجھ نہ برداشت کر سکی تھی اور اب خمیدہ ہوتی جا رہی تھی ... بجّو کی آنکھوں پر چڑھے شیشے اور بھی موٹے ہو گئے تھے .. کان کے پاس کی لٹوں میں چاندی جھلکنے لگی تھی ... دادا کا انتقال ہو گیا تھا اور گھر پر موت کا سناٹا طاری تھا ... اب نہ کوئی میرے آنچل کا خیال کرتا تھا اور نہ کوئی ڈانٹنے والا تھا ... مجھے دادا کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی ... سارا گھر ایک عجیب سے سناٹے کا شکار ہو گیا تھا۔

امّی بجّو کی شادی کا انتظار نہ کر سکیں اور خالد کی ضد اور بے صبری اپنا کام کر گئی ... اللہ مجھے یاد ہیں وہ دن جب گھر میں میری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں ... کتنا خوش تھیں بجّو، مجھے کتنا پیار کرتی تھیں وہ ... مگر بجّو کا درد مجھے معلوم تھا ... بجّو نے اپنی آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے خشک کر لیا تھا ... میں نے کبھی ان کی آنکھوں سے آنسو گرتے نہیں دیکھے تھے ... مہندی لگی، شہنائیاں بجیں اور میں خالد کو پا کر گویا اسی دنیا میں جنت پا گئی ..... مگر بجّو کی زندگی جہنم کی آگ میں جلتی رہی ...

شادی کے فوراً بعد جب میں سہاگ کی خوشبوؤں میں بسی میکے واپس آئی تو بجّو مجھ سے لپٹ کر خوب روئی تھیں اور ایک مدت کے بعد میں نے بجّو کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے تھے۔

امی کی آنکھوں میں ایک عرصہ کے بعد ایک مخصوص چمک دیکھ کر مجھے بھی تعجب ہوا تھا اور تب امی نے بتایا تھا کہ تسنیم صاحب جن کی لڑکی نیلوفر میری سہیلی تھی، شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ... امی نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں بجو کی رضامندی لوں اور میں سوچ رہی تھی کہ تسنیم صاحب اور بجو کا جوڑ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ کہاں جوان بجو کی دوشیزگی اور کہاں تسنیم صاحب کا بڑھاپا جن کی بیوی تپِ دق کا شکار ہو کر تین سال پہلے مر چکی تھیں .. مجھے امی پر بڑا غصہ آیا تھا۔ مگر ابو کی خمیدہ کمر اور امی کے ماتھے پر اُبھری ہوئی شکن کو دیکھ کر میں چپ رہ گئی تھی ... اسی رات جب بجو میرے کمرے میں آئی تو گھنٹوں ہم مسہری پر لیٹے راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے وہ مجھ سے کرید کرید کر خالد کی شرارتوں کا حال پوچھتی رہیں ... اچانک وہ مجھ سے لپٹ گئیں اور پاگلوں کی طرح مجھے پیار کرنے لگیں۔ میں گھبرا سی گئی۔ بجو کے پیار سے آج مجھے عجیب سی کراہت آنے لگی۔ نہ جانے کیا سوچ کر میں خوف زدہ ہو گئی اور میں نے بجو کو پرے دھکیل دیا۔ "یہ کیا بجو — مجھے اچھا نہیں لگتا"

میں نے بجو کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کئے تیز تیز سانسیں لے رہی تھیں چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے نیلے ہوتے جا رہے تھے، یکایک بجو کے لئے میرے دل میں ممتا کا جذبہ اُبھر آیا تھا ... بے چاری بجو ... میں نے ان کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا .. "بجو ... امی تسنیم بھائی سے تمہارا رشتہ کر رہی ہیں ..." اور بجو کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ گھبرا کر انھوں نے آنکھیں کھول دیں .. کیسی وحشت برس رہی تھی ان آنکھوں سے ... میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو بجو کا سارا بدن کانپ اٹھا جیسے رعشہ طاری ہو گیا ہو اور وہ یک بیک اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے لاکھ اُن کو پکارا مگر کمرے کا دروازہ نہ کھل سکا۔ اور میں باہر دروازے سے بجو کی خاموش سسکیوں کا تصور کر کے دل ہی دل میں روتی رہی تھی ...

دوسری صبح سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا ... بجو کی بے خواب زندگی نے خواب آور گولیوں کا سہارا لے کر امی اور ابو کے پہاڑ جیسے بوجھ کو ختم کر دیا تھا ... اب بجو کو نیند نہ آنے کی شکایت باقی نہ رہی تھی ... بے قرار زندگی ابدی خواب میں کھو گئی تھی ... جوان لاش گھر سے کیا نکلی امی اور ابو کے ارمانوں کا جنازہ نکل گیا تھا۔ جانے انھیں سکون آ گیا یا اضطراب بڑھ گیا، مگر میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی جب خالد اور دوسرے لوگ بجو کی لاش کو کندھوں پر اٹھائے گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ اور میں حسرت سے بجو کے خالی پلنگ کی طرف تک رہی تھی جس کے چادر پر پڑی بے شمار شکنیں، بجو کے بے پناہ کرب کی کہانی کہہ رہی تھیں ... صحن سے امی کے بین کی آوازیں آ رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی، کہ کیا بجو کے مرنے کے بعد بھی چادر کی یہ شکنیں ہمیشہ باقی رہیں گی۔

آج بجو کو مرے ہوئے بیس سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ امی اور ابو نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے اور میں دادا ابی کے تخت پر بیٹھی ماضی کے تانے بانے سلجھا رہی ہوں ... آنگن میں کھڑا نیم کا درخت آج بھی ویسے ہی نقرئی لباس پہنے جھوم رہا ہے ... میری دونوں بیٹیاں نصرت اور نزہت، بجو والے کمرے میں نہ جانے کیسی راز و نیاز کی باتیں کر رہی ہیں ... میری بڑی لڑکی نصرت بالکل بجو کی ہم شکل ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی نے نصرت کا حسن بھی چیچک کی نذر کر دیا ہے اور وہ بجو کی طرح موٹی سی عینک بھی لگانے لگی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے بجو کا خیال آ جاتا ہے اور اس انجانے خوف سے کانپ اٹھتی ہوں۔ نزہت کی عمر ابھی صرف تیرہ سال کی ہے اور اس کے گھونگھریالے بالوں میں اپنی جوانی کا عکس ڈھونڈھتی رہتی ہوں

بجو کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ نزہت نصرت کے گلے سے لگے جھول رہی ہے، اس کا دوپٹہ شانے سے سرک کر مسہری پر گر گیا ہے اور وہ عجیب شانِ بے اعتنائی سے نصرت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ یکایک کچھ سوچ کر میں جھنجھلا اٹھتی ہوں اور بجو والے کمرے میں داخل ہو کر نزہت پر برس پڑتی ہوں۔

"نزہت دوپٹہ ٹھیک کرو۔ کنواری لڑکیوں کے یہ ڈھنگ نہیں ہوتے۔ اللہ۔ اک ہمارا زمانہ تھا کہ دوپٹہ ..."

یکایک مجھے دادا ابی یاد آ جاتی ہیں اور میں خاموش ہو جاتی ہوں۔

نزہت گھبرا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور نصرت بھی اس اچانک کی بوچھار سے چونک جاتی ہے۔ غیر ارادی طور پر میری نظر بستر کی چادر پر پڑ جاتی ہے، جس پر پڑی بے شمار سلوٹوں کو دیکھ کر میں کانپ اٹھتی ہوں اور مجھے بجو کا بستر یاد آ جاتا ہے ...

خدایا! کہیں بستر کی یہ سلوٹیں، نصرت کے ماتھے پر نہ اُبھر آئیں۔ اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

ممتاز احمد اویسی

اور

شریمتی سی۔ کے۔ کپور

مُسلمان اور خاندانی منصوبہ بندی

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایشیا میں مذہب کے اثرات کی وجہ سے بڑے پیمانے پر خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کے امکانات کم ہیں۔ مگر اس سلسلے میں جو جائزے لئے گئے ہیں وہ یورپ یا امریکہ میں لئے گئے ہیں اور وہ بھی صرف رومن کیتھولک فرقے تک محدود رہے۔ کیوں کہ خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق اس فرقے کا جو رویہ ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ دیگر مذاہب زیادہ تر ایسے ہیں جن میں خاندانی منصوبہ بندی کی کوئی صریحی ممانعت موجود نہیں ہے۔ یا اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے اور ہے بھی تو وہ غیر واضح یا مبہم ہے۔

اکثر یہ سننے میں آتا ہے کہ مسلمان خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں پر عمل نہیں کرتے حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی یا ضبط تولید کے بارے میں مسلمانوں کے رویے کے متعلق نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس مضمون میں فیملی پلاننگ سے متعلق ان کے رویے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کیوں کہ دُنیا میں لگ بھگ ۵۰ کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیائے کوچک، وسطِ ایشیا، شمالی افریقہ، سنکیانگ، فلپائن، انڈونیشیا اور یورپ کے کچھ حصوں میں آباد ہیں۔ لہٰذا ان کی صلاحیت تولید سے متعلق جانکاری ہمارے لئے دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مفید بھی ہوگی۔

دوسرے ترقی کرتے ہوئے ملکوں یا علاقوں کی طرح مسلمان ملکوں یا علاقوں کے متعلق تمام ضروری اعداد و شمار نہ تو مکمل ہیں اور نہ ہی دستیاب ہیں۔ اسی وجہ سے بعض اعداد و شمار یو۔ این ڈیموگرافک ائیر بک اور یو۔ این پوپولیشن بلیٹن ۱۹۶۵ء سے لئے گئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر مسلم ممالک میں شرح پیدائش ۴۲ سے ۵۰ فی ہزار کے درمیان ہے۔ ترکی اور اردن میں آبادی میں اِضافے کی شرح (گراس) ۹ر۲ اور ۲ر۳ فی صد ترتیب وار ہے۔ ۱۹۶۱ء کے ایک جائزے کے مطابق انڈونیشیا میں شرح پیدائش ۵۱ فی ہزار ہے۔ مگر آبادی میں مجموعی اضافے کی شرح ۸ر۲ فی صد تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس مدت میں جنگ، بیماری اور دوسری وجوہ سے شرحِ اموات زیادہ رہی ہو۔ ملائشیا میں جہاں شرحِ پیدائش تقریباً صحیح ریکارڈ کی گئی ہے، ۴۳ فی ہزار تھی۔

سوئٹ یونین اور یورپ کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کی شرحِ پیدائش مقابلتاً کم ہے جو ۳۲ سے ۴۰ فی ہزار کے درمیان ہے۔ البانیہ اور یوگوسلاویہ کے اضلاع میں آباد مسلمانوں کی شرحِ پیدائش مقابلتاً کم ہے جو ۳۲ سے چالیس فی ہزار کے درمیان ہے۔ البانیہ اور یوگوسلاویہ کے اضلاع میں آباد مسلمانوں کی شرحِ پیدائش بہت ہی کم ہے۔ سوویت یونین کی جمہوریتوں، ترکستان، قزاقستان، ازبکستان، داغستان، کرغز اور تاجکستان وغیرہ میں بھی شرحِ پیدائش کم ہے۔ زنجبار اور کیمرون میں شرحِ موت اور پیدائش تقریباً برابر ہے۔

متحدہ عرب جمہوریہ میں کی گئی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ وہاں کی آبادی میں ٹھہراؤ ہے وہاں عام طور سے آبادی میں کمی یا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ آبادی کی کونسل سے تعلق رکھنے والے مسٹر ڈڈلے کرک کا خیال ہے کہ ترکی، لبنان

اور مصر میں شرحِ پیدائش میں کمی ہونے لگی ہے۔ مصر کی شرحِ پیدائش اسرائیل کے مقابلے میں زیادہ ہے اور لبنان میں آباد مسلمانوں کی شرحِ پیدائش وہاں کے عیسائیوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ملائشیا اور سنگاپور میں آباد چینیوں کی شرحِ پیدائش وہاں کے مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ حالاں کہ چینی مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں۔

فلپائن کے دورے کے وقت ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ وہاں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کی شرحِ پیدائش تقریبًا برابر ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں میں شرحِ پیدائش ۳۰ سے پچاس فی ہزار کے درمیان ہے۔ رومن کیتھولک فرقے میں سب سے کم شرحِ پیدائش ۱۷ فی ہزار بلجیم میں ہے اور سب سے زیادہ پچاس فی ہزار کوسٹاریکا میں ہے پروٹسٹنٹ فرقے اور یہودیوں میں شرحِ پیدائش میں مستقل کمی کا رجحان نظر آتا ہے۔ بودھوں کے یہاں بھی یکسانیت نظر نہیں آتی۔ جاپان میں شرحِ پیدائش ۱۷ فی ہزار ہے جبکہ تھائی لینڈ میں ۴۰ فی ہزار ہے

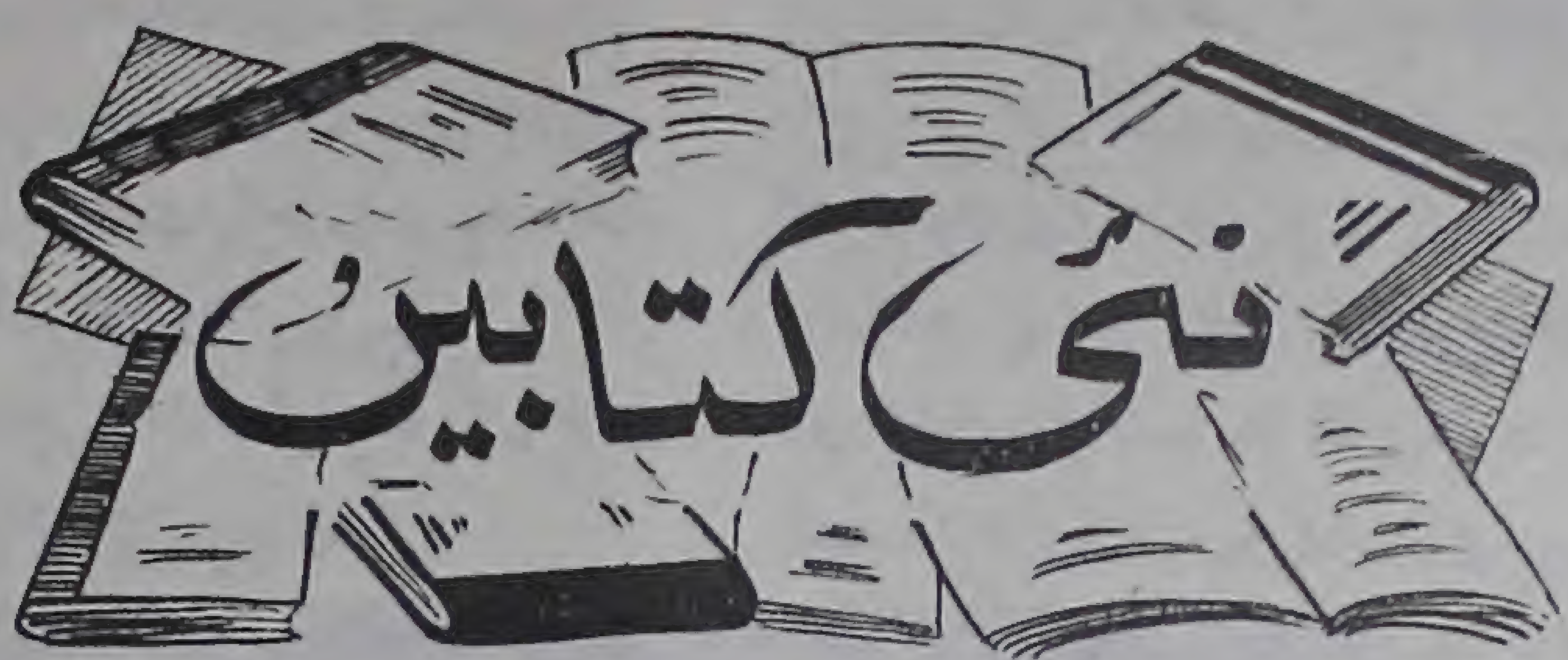
ہندوستان میں ہندوؤں میں شرحِ پیدائش کا وہی تناسب ہے جو یہاں کے مسلمانوں میں ہے۔ پونا کے گوکھلے انسٹی ٹیوٹ آف اکنامکس اینڈ پالٹکس کے تحت ڈانڈیکر اینڈ ڈانڈیکر نے جو مطالعے کئے ہیں، ان سے ہندوستان کے مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے درمیان شرحِ پیدائش میں کسی خاص فرق کا پتہ نہیں چلتا۔

بلند شہر اور متھرا میں مسٹر گوئل نے جو تحقیق کی ہے اس سے بھی ایسے ہی نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اس بات پر یقین کرنے کی بہت سی وجہیں موجود ہیں کہ مسلمانوں میں دوسرے فرقوں کے مقابلے میں صلاحیتِ تولید Fertility نسبتًا کم ہے۔ دہلی میں ڈاکٹر وگ اور ڈاکٹر ادیسی (مضمون نگار) اور مہاراشٹر میں ڈاکٹر رفیق زکریا کی گئی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے دوسرے فرقوں کے بہ نسبت خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کو زیادہ اپنایا ہے۔ بنگال، کیرالا، میسور اور جموں وکشمیر کے بعض حصوں میں جو جائزے لئے گئے ہیں ان سے بھی ایسی رپورٹیں ملی ہیں۔

ایسے شواہد موجود ہیں جن کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام بڑی سرعت کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے اور اس سے بڑے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ مسلمانوں میں اس پروگرام کے خلاف کوئی منظم مخالفت نہیں ہے اور نہ ہی اس پروگرام کے خلاف کسی غم و غصہ کا اظہار پایا جاتا ہے۔ تاہم سماجی اور اقتصادی طور پر پسماندہ اور کم پڑھے طبقے میں اس پروگرام کی مخالفت کا جذبہ ہے اور اس کی غرض و غایت کے متعلق بھی شبہے کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی کئی وجہیں ہیں۔ جیسے اقتصادی اور تعلیمی پسماندگی اور قدامت پسندی وغیرہ

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں چونکہ مرد کو ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت ہے۔ اس لئے ان کی آبادی میں اضافے کی شرح زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں جو جائزے لئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا رواج ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بھی بڑے محدود پیمانے پر ہے۔ سماجی اور اقتصادی طور پر پسماندہ طبقے میں اس کی مثالیں ملتی ہیں مگر دوسرے فرقوں کے ایسے طبقے میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان دنوں دوسری شادی زیادہ تر پہلی بیوی کے بانجھ پن کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اب زیادہ تر ملکوں میں دوسری شادی پر قانونی پابندی بھی لگا دی گئی ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ایک مرد کی اگر چار بیویاں ہوں تو ان سے زیادہ اولاد پیدا ہوگی۔ اس سلسلے میں جو تحقیق کی گئی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر چار عورتوں کی چار مختلف مردوں سے شادی ہو تو ان سے زیادہ بچے ہوں گے بہ نسبت ان چار عورتوں کے جو ایک مرد سے بیاہی جائیں۔

دہلی اور ملک کے دیگر حصوں میں ہم نے جو تحقیق و مطالعہ کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام مسلمان، ان کے رہنما اور مفکر چھوٹے کنبے کے حق میں ہیں کیوں کہ اس سے زچہ و بچہ کی اچھی صحت کے ساتھ ساتھ بہتر خوراک، تعلیم اور معیارِ زندگی یقینی ہو جاتا ہے۔ ہندوستان مصر اور اردن کے علماء اور مفتیوں اور اماموں کے فتوے نے بھی خاندانی منصوبہ بندی کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں مدد دی ہے — کئی مسلم ممالک جیسے مصر، پاکستان، ترکی وغیرہ نے سرکاری طور سے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کو اپنایا ہے۔ ان ملکوں کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان صرف صحت اور طبی وجوہ کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ ذاتی، اقتصادی اور سماجی وجوہ کی بنیاد پر خاندانی منصوبہ بندی میں دلچسپی لے رہے ہیں اور یہی حال ہندوستانی مسلمانوں کا بھی ہے۔



مکتوبات

مرتبہ (مولوی) ضیاء احمد بدایونی۔ قیمت ۲ روپے پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

رسائل میں بعض مشاہیر کے خطوط اور ان کے مجموعے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں ان میں کچھ رسائل کے مکاتیب نمبروں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

ان خطوط کے مطالعہ سے جہاں مکتوب نگاروں کی شخصیت و شعور سے متعلق ہماری معلومات میں بعض دلچسپ اضافے ہوتے ہیں وہاں بہت سے ادبی اور علمی مسائل بھی سامنے آتے ہیں۔ مولینا ضیاء احمد صاحب بدایونی کے مرتب کردہ ان مکتوبات کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔ یہ وہ خطوط ہیں جو ہمارے بہت سے مشاہیر اور بعض اہلِ کمال نے مختلف اوقات میں مولینا کو لکھے ہیں اور جن کا زمانہ اچھا خاصہ طویل ہے۔

ان مکتوبات کے مطالعہ کی صورت میں نہ صرف یہ کہ دنیائے علم و ادب کی بہت سی ممتاز شخصیتوں سے غائبانہ ملاقات کے چند لمحے میسر آتے ہیں بلکہ بعض مسائل کے بارے میں ان کی رائے، ان کے ذوق و جستجو اور ان کے آداب گفتار کا بھی علم ہوتا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل تمام خطوط یکساں طور پر اہم نہیں تاہم ان میں سے تقریباً ہر خط کی اپنی ایک اہمیت ہے اور تحقیق و تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایسی تحریروں کی اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

جذباتِ رضی (واسوخت)

مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ۔

بدایوں کی خاکِ پاک نے دنیائے علم و ادب کی بہت سی تابناک شخصیتوں کو جنم دیا ہے۔ مولوی رضی احمد صاحب بدایونی اسی کہکشانی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

موصوف کے شعور و شعر میں فکر و فن کی اعلیٰ اقدار کے احترام کے ساتھ کلاسیکی اندازِ نظر کی ایک ایسی جھلک ملتی ہے جسکی مثالیں اب کمیاب ہوتی جا رہی ہیں۔

جذباتِ رضی کے عنوان سے شائع ہونے والے آپ کے واسوخت سے اس حقیقت کی واضح نشان دہی ہوتی ہے۔

واسوخت ہماری شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس کا سنجیدہ مطالعہ ابھی نہیں کیا جا سکا اور اس کی ادبی اہمیت کا ابھی پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکا جب کہ واقعہ یہ ہے کہ مومن کا پُرکار اسلوب داغ کا بانکپن اور اس طرح شکوہ و جواب شکوہ کے بعض تیکھے نشتر واسوخت کے اثرات کے مرہونِ منت نظر آتے ہیں۔

آج کے اس دور میں جناب رضی کا یہ واسوخت نہ صرف یہ کہ

ان کے شاعرانہ تجربہ کی صحت اور فن کارانہ جذبہ کے خلوص کا مظہر ہے۔ بلکہ عہدِ موجود میں اس صنف کے تنقیدی مطالعہ اور اس کے ادبی امکانات کے سنجیدہ جائزہ کا مقتضی ہے۔

ابتدا میں فاضل مرتب نے ایک مقدمہ کی صورت میں واسوخت کی تاریخ اور جناب رضی کی شاعرانہ خصوصیات سے متعلق کچھ ضروری امور پر روشنی ڈالی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

—— طباعت و کتابت معقول ہے۔

(تنویر احمد علوی)

نذرِ ذاکر

مرتبہ مالک رام ؛ کتابت و طباعت اعلیٰ آفسیٹ، مجلد، خوشنما گرد پوش، ۵۰۷ صفحات، قیمت چالیس روپے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلّی، نئی دلّی، بمبئی، علی گڑھ۔

یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمت میں ان کی اکہترویں سالگرہ پر پیش کئے گئے تھے۔ کتاب کے دو حصے ہیں: پہلے حصے میں 'تذکرہ' کے عنوان کے تحت چار مضمون ہیں۔ ان کے لکھنے والے ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر رشید احمد صدیقی پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر یوسف حسین خان ہیں۔ ان میں موصوف کی پوری سوانح عمری ہے اور ان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ ہے۔

دوسرا حصہ 'مقالات' پر مشتمل ہے؛ اس میں ۱۸ مضمون ہیں۔ چند عنوان ملاحظہ ہوں۔

ہندوستانی روح کا بحران (ڈاکٹر سید عابد حسین)، دیوان حسن بیگ شاملو گرامی (قاضی عبد الودود) باشاہانِ اودھ کا علمی و ادبی ذوق (پروفیسر مسعود حسن رضوی) ابن عربی کا نظریۂ وحدت الوجود (مولانا محمد عبد السلام خان)، اردو میں سیاسی اصطلاحیں (پروفیسر ہارون خان شروانی)، سبعۂ احرف (مولانا سعید احمد اکبرآبادی) گل رعنا —— غالب کا گمشدہ انتخاب (مالک رام) وغیرہ۔ پروفیسر عبد العلیم اور مولانا امتیاز علی عرشی نے دو عربی رسالوں کے متن پیش کئے ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر مختار الدین احمد نے دو خطاطوں کی کتابت کے نمونے شائع کئے ہیں۔ تمام مضامین کا معیار بلند ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مکمل رسالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم دوست حضرات اور کتاب خانوں کے کام کی چیز ہے۔

(ادارہ)

دیوانِ شاکر ناجی

مرتبہ ڈاکٹر فضل حق، ادارۂ صبح ادب، دہلی، قیمت سات روپے

مقامِ مسرت ہے کہ یکے بعد دیگرے اردو ادب کی تاریخ کی گمشدہ کڑیاں منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ محمد شاکر ناجی کا متقدمین کے دور سے تعلق ہے اور اگرچہ اس کا نام متعدد نئے پرانے تذکروں میں ملتا ہے، آج تک اس کا دیوان نہیں چھپا تھا۔ اب تک دیوان کے دو خطی نسخوں کا پتا چلا ہے —— ایک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتاب خانے میں ہے، دوسرا پٹیالے میں جو کسی زمانے میں کپورتھلہ کے ریاستی کتاب خانے میں تھا۔ ان کے علاوہ ایک انتخاب تقریباً ۵۰ - ۶۰ غزلوں کا شاید کہیں اور بھی ہے۔

ڈاکٹر فضل حق نے پٹیالے کا نسخہ متن کے لئے استعمال کیا ہے اور اختلاف نسخ کلکتے کے نسخے سے دیئے ہیں۔ چونکہ یہی دو نسخے ملے ہیں، اس لئے وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ شروع میں انھوں نے ناجی کے حالات اور مختصراً اس کی زبان کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ در اصل ناجی کی اہمیت اس کی زبان ہی کی وجہ سے ہے، اور اس پر تفصیلی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اب کہ دیوان چھپ گیا ہے، لسانی پہلو سے اس پر پوری بحث ہونا چاہئے۔ افسوس کہ کتابت کی اغلاط نے بہت جگہ متن مسخ کر دیا ہے۔ حسنِ ظاہری پر بھی اس سے زیادہ توجہ کی ضرورت تھی۔ لیکن یہی کیا کم تسکین کا مقام ہے کہ ناجی کا دیوان چھپ تو گیا، جو بجا طور پر ایہام گویوں کا گویا قافلہ سالار تھا۔

(مالک رام)

اردو نمبر کے باب میں

کمار پاشی

زیب غوری

خان غازی کابلی

نئی شاعری کے طرف دار

آج سے تقریباً دس برس پیشتر پاکستان کے بعض اردو رسائل میں جب نئی شاعری کے نمونے شائع ہوئے اور نیا شاعر اس اعلان کے ساتھ ظاہر ہوا :

سنو، میں اب
نئے لوگوں، نئی آبادیوں کے گیت گاتا ہوں

(زاہد ڈار)

تو روایت پرستوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور نئی شاعری اور نئے شاعروں کی مخالفت میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جن کا شعر و ادب سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ چار پانچ برس تک بڑی شدت کے ساتھ نئی شاعری کے خلاف جہاد جاری رہا، جس کے نتیجے میں نئے شاعروں نے شعر و ادب کی تخلیق میں اور زیادہ سنجیدگی اختیار کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے نئے شاعروں کے یکے بعد دیگرے کئی شعری مجموعے شائع ہو گئے۔ نئی شاعری کا طوفان جب تھمنے میں نہ آیا تو رفتہ رفتہ تھک ہار کر بعض شاعروں کی ادبی حیثیت کو ان لوگوں نے بھی تسلیم کر لیا جنہوں نے شروع میں ان شعراء کو "مایوس اور انارکسٹ" کے لقب سے سرفراز کیا تھا[1]

ہندوستان میں نئی شاعری کا چرچا گزشتہ دو برس سے ہو رہا ہے۔ اس سے پیشتر چونکہ اردو میں اچھے رسائل نہیں تھے[2]۔ (اور جو دو چار تھے بھی تو ان کا معیار پاکستانی رسائل کے مقابلے میں نسبتاً پست سمجھا جاتا تھا) اس لئے اکثر ہندوستانی شاعر بھی (مثلاً محمود ایاز، قاضی سلیم، محمد علوی، بل کرشن اشک، بشر نواز عمیق حنفی، عادل منصوری، بلراج کومل وغیرہ) جو بزم شعر میں نئی ہوشمندی کو لے کر وارد ہوئے تھے، پاکستانی رسائل میں چھپنا پسند کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی تخلیقات کی اشاعت سے بھی پاکستان کی نئی نسل کو ہی فائدہ ہوا۔

لیکن ادھر پچھلے دو تین برسوں میں ہندوستان سے چند اچھے رسائل کا اجرا ہوا جنہوں نے ہندوستان میں نئی شاعری کو بڑا فروغ دیا ہے۔ "شب خون"

---

[1] یہ مایوس اور انارکسٹ نوجوان زندگی کی کسی قدر سے پیار نہیں کرتے انہیں شکوہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد کے معاشرتی نظریے ان کے لئے کوئی تسکین مہیا نہیں کر سکے۔ ان کا خیال ہے کہ ماضی کی عظمت، حال کی معنویت اور مستقبل کے متعلق رجائیت پرستی پاگل دماغوں کی پیداوار ہے وہ اپنی انفرادی پریشاں خیالی اور احساسی انارکی میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے ہر وقتی اور گزراں لمحہ ہی اپنے اندر تمام ابدیت سموئے ہوئے ہے۔ اس لئے زندگی کے ابدی آدرشوں اور اخلاقی کلیوں پر ان کا کوئی اعتماد نہیں۔

(ظہیر کاشمیری)

[2] محمود ایاز کے زیر ادارت ایک معیاری رسالہ سوغات ضرور نکلتا تھا مگر ایک تو یہ سہ ماہی تھا، دوسرے اس پر بھی ہندوستانی ادیبوں کی نسبت پاکستان کے ادیبوں کا غلبہ تھا اور جس کی اشاعت پاکستان میں نئی شاعری کے فروغ کا باعث تو ضرور بنی مگر ہندوستان کے ادبی حلقوں میں یہ رسالہ نئی شاعری کے لئے وہ فضا تیار نہ کر سکا جو گزشتہ دو برسوں میں قائم ہوئی ہے (ک پ)

کے صفحات پر احتشام حسین اور عمیق حنفی کے مضامین اور خطوط کی اشاعت سے نئی شاعری کے لئے ایک خوش آیند فضا تیار ہوئی ہے۔ وہاں ماہانہ "کتاب" نے نئی شاعری پر سمپوزیم شائع کر کے جدید عہد اور جدید انسان کا مطالعہ کرنے اور نئے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نئے شعری مجموعوں کی اشاعت نے بھی جدیدیت کے اس رجحان کو بے پناہ تقویت بخشی ہے۔ آج کل کے اُردو نمبر میں بھی نئی شاعری پر دو مضامین شامل ہیں۔ میں نے یہ مضامین بڑی توجہ اور بغیر کسی تعصب کے پڑھے ہیں مگر افسوس کہ دونوں مضمون نگاروں نے نئی شاعری پر لکھتے ہوئے پوری ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا۔ وحید اختر نے مضمون کے شروع میں اپنی جس سچائی کا اعلان مندرجہ ذیل غیر مبہم الفاظ میں جس فخر کے ساتھ کیا ہے۔

"اس مطالعے کی نوعیت خود تنقیدی Self-criticism
سی ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے غیر جانبدارانہ محاکمے کے بغیر جدید شاعری
کے مستقبل اور اس کے امکانات کی قوتیں پوری طرح سے
بروئے کار نہیں آسکتیں۔"

افسوس کہ وہ اس پر پورے نہیں اترے اور نتیجتاً ان کا مضمون ایک "غیر جانبدارانہ محاکمے" کا شکار ہو گیا ہے۔ نئے نام پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں وہ اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اس "انتخاب کو نمائندہ اور جامع بنانے کے لئے شعراء کا انتخاب زیادہ احتیاط اور سختی سے ہونا چاہئے تھا۔ ان میں سے اکثر شعراء ایسے ہیں جن کی آواز اب تک نہیں بنی ۔۔۔ اکثریت ان شاعروں کی ہے جنہوں نے جدیدیت کو فیشن بن جانے کے بعد اختیار کیا ہے اور چند فارمولوں کو ہی جدیدیت سمجھتے ہیں۔"

جس کا مطلب یہ ہوا کہ وحید اختر نئی شاعری کے کسی ایسے انتخاب میں (نئے نام میں شامل ۵۸ شعراء کی طرح نہیں بلکہ) صرف چند نمائندہ شعراء کی شرکت ضروری خیال کرتے ہیں جو "تقلید اور تجربے کے دور" سے آگے بڑھ کر اپنی آواز کو پا چکے ہیں۔ دوسرے معنوں میں جو انفرادی خصوصیات کے ساتھ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ لیکن دوسری طرف وحید اختر کو اس بات کی بھی شکایت ہے کہ اس انتخاب میں مغنی تبسم، منظر سلیم، شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کو شریک کیوں نہیں کیا گیا جب کہ بقول ان کے یہ شاعر اس انتخاب میں جگہ پانے کے بجا طور پر حقدار تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مندرجہ بالا ناموں کی سفارش کے پسِ پردہ کون سا جذبہ کام کر رہا ہے۔ لیکن اتنا کہنے کی ضرور اجازت چاہوں گا کہ آج جدید شاعری کو ایسے طرف داروں کی ضرورت نہیں ہے جو محض شعراء کی فہرست سازی میں یقین رکھتے ہیں اور ہر نئے دن اپنی فہرست میں دو چار ناموں کا اضافہ کر کے اپنے بہی خواہوں کا حلقہ وسیع کرتے رہتے ہیں بلکہ ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو نئے انسان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں اور کسی خاص شاعر یا شعراء کی تعریف و توصیف کی بجائے نئی شاعری کے بہتر نمونوں کی نشاندہی کر سکیں۔

نئی شاعری کو صدیق الرحمان کے کہنے کے مطابق "ترقی پسند تحریک کا مرہونِ منت" کہنا اور وحید اختر کے خیال کے مطابق بعض ترقی پسند شاعروں مثلاً فیض، مخدوم، اور سردار جعفری کی شاعری کو جدید شاعری کے مزاج کے قریب تر سمجھنا سراسر زیادتی ہے۔ جدیدیت کا یہ رجحان حلقۂ اربابِ ذوق والی تحریک سے البتہ وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر نئی شاعری میراجی والے حلقے کی شاعری سے لہجے، اسلوب اور فکر و مسائل کے اعتبار سے بڑی حد تک مختلف ہے پھر ہندوستان کی نئی اُردو شاعری اور پاکستان کی نئی اُردو شاعری میں نمایاں فرق ہے جسے آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی بدولت فاصلے مٹ جانے سے دنیا کی تمام قومیں بین الاقوامی سطح پر ایک دوسری کے قریب آئی ہیں لیکن ان سب کی تہذیب، ان کا کلچر، ان کا سماجی ڈھانچہ آج بھی ایک دوسرے سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا آج سے ایک صدی، دو صدی یا دس صدی پہلے تھا۔ اسی طرح پاکستان کی نئی نسل فکری اعتبار سے ہندوستانی شعراء کی نئی نسل سے بے حد مختلف ہے۔ بعض لوگ نئی شاعری یا نئے ادب کا ذکر کرتے ہوئے جب دونوں ملکوں کے ادباء و شعراء کو ایک ساتھ بریکٹ کرتے ہیں یا پھر دونوں کو ایک جیسے مسائل کا شکار بتاتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔

ہندوستان میں تقسیم کے بعد جاگیردارانہ نظام کے خاتمے، جمہوریت کے فروغ، مشترکہ خاندان کے زوال سے ہمارے سماج میں جو بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں۔ نیز شہری تہذیب نے جس کرپٹ سوسائٹی اور لادین معاشرے کو جنم دیا ہے، اس کے اثرات دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پر بھی مرتسم ہوئے ہیں۔ نیچر سے کٹ کر اور شہری تماشوں میں گھر کر ذہنی و قلبی سکون کا اندوختہ چھن جانے سے آج کا انسان جس اضطراب کا شکار ہے، اس کا بڑا خوبصورت شعری اظہار نئی شاعری میں ہوا ہے۔ پہلے وہ نیچر کا اہم راز تھا اور کائنات میں مختلف خدائی قوتوں کا ہم سفر۔

ہوا ــــ اے ہوا
میں ترا ایک انگ، ایک لہرا تھا

صدیوں ترے ساتھ دشت و دمن، کوہ و صحرا میں
آزاد و سرشار پھرتا رہا ہوں
سمندر کی چھاتی پہ صدیوں ترے ساتھ
بے فکر و بدمست چلتا رہا ہوں۔
انوکھی زمینوں، طلسمی جزیروں کو دریافت کرتا رہا ہوں۔

(شہاب جعفری)

مگر آج وہ زمینیں اور وہ جزیرے نجانے کہاں روپوش ہو گئے ہیں اور وہ سبزہ زار بھی، جس کی طرف قاضی سلیم نے اپنی ایک نظم میں یوں اشارہ کیا ہے:

ایک چرواہا بھیڑوں کا گلہ لے کر آگیا
سبزہ زاروں پہ معصوم بھیڑیں بڑھیں
دیکھتے دیکھتے
پتی پتی کی تحریر
قدرت کے اسرار سب چر گئیں۔

نئے معاشرے کا نیا شاعر ماضی کا نوحہ خواں تو ضرور ہے کہ جس میں اس کے سکون کا اندوختہ دفن ہے مگر اسے آج بھی اس پرانی دنیا کی تلاش ہے جو "خوشیوں کے سیاہ زنداں میں جاکے روپوش ہو گئی ہے" اور جس کے قدموں کی آہٹ وہ آج بھی سن رہا ہے:

وقت کے قدموں کی آہٹ دیتی ہے سنائی ایسے
سناٹے میں بھٹک رہی ہوں بیتی صدیاں جیسے

(مخمور سعیدی)

وہ خود سے یا نئے حالات سے مطمئن تو نہیں مگر مایوس بھی نہیں ہوا کہ اسے آج بھی یقین ہے کہ:

— وہ پہلا شخص
جس نے سب سے پہلا خواب دیکھا تھا
ابھی تک مجھ میں زندہ ہے

(بشر نواز)

وہ لوگ جو نئے شاعروں کو بیمار ذہن اور ظلمت پرست قرار دیتے ہیں اگر ایمانداری اور سنجیدگی کے ساتھ نئی شاعری کا مطالعہ کریں تو انہیں یہ معلوم کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی کہ ایسے جان لیوا حالات میں جب کہ سوسائٹی کرپٹ ہو چکی ہے اور عالمگیر جنگ کی ہیبت نے ساتوں آسمانوں کا احاطہ کر لیا ہے، نیا شاعر حال کے اندھیروں میں ماضی کے اجالوں اور مستقبل کے خوابوں کو لئے ایک نئے سفر پر گامزن ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں پہلے بھی یہ بات لکھی تھی اور آج بھی وہی سوال قارئین سے کرتا ہوں کہ کیا اس عہد میں مذہب ہماری کچھ رہنمائی کر سکتا ہے؟ سکون کا وہ اندوختہ جو ماضی میں ہماری ملکیت تھا کیا آج ہمیں واپس مل سکتا ہے؟ تشکیک کے اس دور میں نئے شاعر کی یہ خواہش کچھ بے جا نہیں ہے:

یہ کرب کی دیوار گرا دے کوئی
اک شمع اندھیروں میں جلا دے کوئی
لا دین نہ تھا جب یہ قبیلہ میرا
اس دور کی تصویر دکھا دے کوئی

(کمار پاشی)

تلافیٔ مافات

مسعود حسین خاں صاحب کا اردو زبان آزادی کے بعد بڑا اہم مضمون ہے اور بطور خاص پسند آیا۔ گیان چند جین صاحب کا "اردو تحقیق" بڑی دقیقہ سنجی سے لکھا گیا ہے۔ ادب کے طالب علموں کے لئے یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ محمد حسن صاحب سے اس سے بہتر مضمون کی توقع تھی۔ انھوں نے خورشید الاسلام پر لاکر تان توڑ دی ہے۔ جیسے انھوں نے قصداً کچھ اور ناموں کے ذکر سے گریز کیا اور یہی حال دیوندر اسر کے مضمون کا ہے۔ خدا جانے ہمارے نقاد نئے گروپ سے اسقدر خائف کیوں ہیں۔ وحید اختر کا مضمون پسند آیا۔ اس مضمون کے ذریعے انھوں نے بہت کچھ "تلافیٔ مافات" کر لی۔ بہتوں کے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔"

(زیب غوری)

انکشاف

جو معلوماتی مقالہ "اردو کی ترقی کے لئے حکومت ہند کے اقدامات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس سے بہت سے "رازہائے درون پردہ" کا انکشاف ہوا ہے یہ مقالہ ایسا ہے جس کی اشاعت کثرت سے ہونی ضروری ہے۔ اس کے مطالعہ سے دنیا پر یہ حیرت انگیز حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ جس حکومت ہند کو اردو دشمنی کا طعنہ دیا جاتا ہے وہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپے اردو کی ترقی کے لئے خرچ کر رہی ہے۔

(خان غازی کابلی)



میرا دُوسرا بچّہ کب ہونا چاہیئے؟

ڈاکٹروں کا کہنا ہے ، بچّے کی نشوونما میں پہلے چار پانچ برس
کا عرصہ بہت اہم ہوتا ہے ۔ ماں کی بہتر
صحت کے لئے بھی ضروری ہے کہ دُوسرا بچّہ
تین چار برس بعد ہو۔
آج کل آپ برتھ کنٹرول کے مُتعدد محفُوظ، مُؤثر اور سادہ
طریقوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اب بچے کا
جنم اتفاق کی بات نہیں ——— یہ آپ کے
اختیار میں ہے۔

مُفت مشورے اور خدمات کے لئے قریبی فیملی پلاننگ
سینٹر میں آج ہی تشریف لائیں۔

اور یاد رکھیں ....



بچّے دو ہی کافی ہیں



davp 68/289

کھُلا گھر

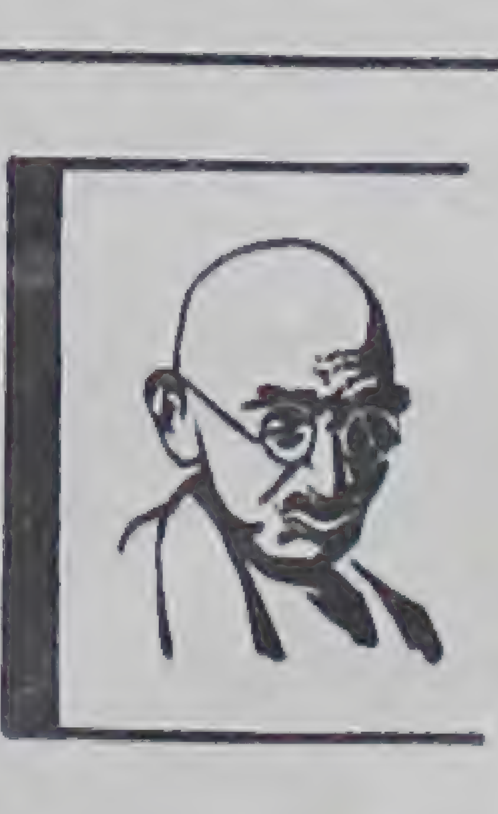
میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے آس پاس، چاروں طرف
یں کھڑی کردی جائیں۔ میرے گھر کی کھڑکیاں بند رہیں۔ میں
ہتا ہوں کہ تمام مُلکوں کی تہذیبوں کی ہوائیں میرے گھر کے
و نواح میں بلا روک ٹوک چلتی رہیں۔ لیکن میں یہ نہیں
ہوں گا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اُڑا لے جائیں۔ میرا
رم قید خانہ کا دھرم نہیں۔ اس میں پرماتما کی ہر
مخلوق کے لئے گنجائش ہے۔ نسلی، مذہبی یا معاشرتی
برتری جیسے بیہودہ جذبات اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔



ینگ انڈیا، جون

مہاتما گاندھی

MAHATMA GANDHI
BIRTH CENTENARY
OCT. 2, 1969 TO
FEB. 22, 1970
महात्मा गांधी
जन्म शताब्दी
अक्तूबर 2, 1969 से
फरवरी 22, 1970





(۳۱ اکتوبر ۱۸۷۵ء – ۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ء)

۳۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لال قلعہ کے تاریخی دیوانِ عام میں عظیم قومی رہنما سردار ولبھ بھائی پٹیل کا ۹۳ واں جنم دن منایا گیا۔ اس موقع پر ملک کے سرکردہ رہنماؤں نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین سردار پٹیل کی تصویر کو پھول مالا پہنا رہے ہیں۔



سورگیہ شری جواہرلال نہرو اپنی سالگرہ پر بچّوں سے بدھائی لیتے ہوئے
شری نہرو کو بچّے ـــــ مستقبل کے معمار ـــــ اتنے عزیز اور پیارے تھے کہ اُن کی سالگرہ
بچّوں کے دن کے طور پر ہر برس ۱۴ نومبر کو منائی جاتی ہے

Vol. 27 No. 4 **AJKAL** (Monthly) November 1968

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N. Delhi-; Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.

Regd. No. D. 509

آج کل

دسمبر ۱۹۶۸ء

اگرہائن پوس سمت ۱۸۹۰



قیمت: ۶۰ پیسے



بھارت میں ایران کے نئے سفیر عزت مآب محمد رضا امیر تیمور راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں
صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنے سفارتی عہدے کے کاغذات پیش کرنے کے
بعد مصافحہ کر رہے ہیں

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

جلد ۲۷ — شمارہ ۵
دسمبر ۱۹۶۸ء
اگرہاین . پوس شک سمنہ ۱۸۹۰

ترتیب

شرح چندہ

	فی پرچہ	ایک سال	دو سال	تین سال
ہندوستان	۶۰ پیسے	سات روپے	۱۲ روپے	۱۷ روپے
پاکستان	۶۰ پیسے (پاک)	سات روپے (پاک)	۱۲ روپے (پاک)	۱۷ روپے (پاک)
دیگر ممالک سے	۱شلنگ یا ۱۵ سینٹ	۱۰شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر	۱۸ شلنگ یا ۲.۷۵ ڈالر	۲۵ شلنگ ۶ پنس یا ۳.۵۰ ڈالر

مضامین کیلئے خط و کتابت کا پتہ:- ایڈیٹر آج کل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مُلاحظات

۱۹۶۸ء حقوقِ انسانی کے بین الاقوامی سال کی حیثیت سے منایا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص ان انسانی حقوق کی اہمیت سے باخبر ہو اور انسانی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے ان حقوق کی حفاظت کرے۔

انسانی تاریخ میں یہ حقوق بڑی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ پہلی بار مذہب، نسل، رنگ، زبان یا جنس کی بنیاد پر کسی قسم کے امتیاز کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی دنیا کے تمام انسانوں کو یہ حقوق حاصل نہیں ہیں خصوصاً نسلی امتیاز کی وجہ سے انسانی آبادی کا ایک بڑا طبقہ ان حقوق سے محروم ہے مگر حالات شاہد ہیں کہ عالمی رائے عامہ کے دباؤ، نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور سائنس اور ٹکنالوجی کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ایسے امتیازات میں کمی آتی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں کافی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اقوام متحدہ کی مختلف تنظیمیں اس کارِ خیر میں مصروف ہیں۔

آج سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ایجادوں نے آن کی آن میں دنیا کو مٹا دینے والے ایسے خطرناک ہتھیار انسانوں کے ہاتھ میں دے دیئے ہیں اور اتنی مختلف اغراض کو برسرِ پیکار کر دیا ہے کہ تمام انسانوں کے بنیادی حقوق کا ایک متحدہ نظام مرتب کیے بغیر نہ تو دنیا میں امن قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ انسانیت کی بقا کی امید کی جا سکتی ہے۔

انسان کی بنیادی ضرورتوں کی فہرست کافی لمبی ہے۔ مگر انھیں موٹے طور پر تین زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ آزادی، مساوات، اور اخوت۔ اگر تمام بنی نوعِ انسان کو یہ حقوق حاصل ہو جائیں تو یقیناً دنیا سے جنگ اور تباہی کا خطرہ بڑی حد تک ٹل سکتا ہے۔

۱۹۶۸ء کا آخری شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس مدت میں ہمارے قارئین نے "آج کل" کی جس طرح پذیرائی کی ہے اور مختلف طریقوں سے ہماری ہمت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم بے حد شکر گذار ہیں۔ کوئی بھی رسالہ اپنے قلمی معاونین اور قارئین کے اشتراک و تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے ہم نے اپنے پڑھنے والوں سے بار بار گذارش کی کہ وہ اپنی بے لاگ رایوں سے نوازیں۔ آپ کے مشورے ہمارے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہیں گے۔

۱۹۶۹ء میں آج کل کے مندرجہ ذیل خصوصی نمبر شائع ہوں گے۔

جنوری میں کشمیر نمبر — فروری میں غالب نمبر — مئی میں نظم نمبر اگست میں فلم نمبر — اکتوبر میں گاندھی نمبر اور نومبر میں گورونانک نمبر۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہر نمبر آپ سے داد پائے۔

نومبر کے شمارے میں ہم نے آپ سے بعض استفسارات کیے ہیں۔ ہمیں ان سوالوں کے تفصیلی جواب دیجیے۔ ہم ان میں سے بعض خطوں کو شائع بھی کریں گے تاکہ دوسرے لوگ بھی اُن کے متعلق اظہارِ خیال کر سکیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ "آج کل" ایک ایسا رسالہ بن جائے جو صحیح معنوں میں آپ کی خواہشوں کا آئینہ دار ہو۔

ایک خوش گوار شام

تو مری ہمدم ہے تو کہتا ہے چرخِ نیلی فام :
خوش گوار و بامعانی بھی تو ہو سکتی ہے شام
تیری نازک اور فنکارانہ انگلی پر پھدک سکتی ہے سورج کی گلابی گیند
خواب گوں پلکوں پہ رُک سکتا ہے دریائے شفق کا سیلِ رنگ
قہقہوں کے ساتھ بن سکتی ہے اندر کی گھٹن گو دھول ؛
ابر کے ٹکڑوں سے چھنتی کرنیں : امیدوں کی تلواریں ؛
اور بادل : خواہشوں کی کشتیوں کے بادباں ؛
زُلف کو چہرے سے سرکاتی ہوئی انگلی کے ناخن سے ترے
چاک ہو سکتا ہے پل بھر میں اُداسی کا غبار آلود خول ۔
تیر سکتے ہیں ہوا میں من لبھانے والے بول ۔
ڈھیلے پڑ سکتے ہیں میرے خشمگیں اعصاب
اونگھتے سورج کے رتھ سے کھلتے گھوڑوں کی سبک باگوں کے ساتھ
پونچھ سکتے ہیں دلِ افسردہ کی آنکھوں کا نم
بڑھ کے کچھ خوابوں کے ہاتھ ۔
رقص کی مانند بن سکتی ہے دلکش گردشِ ایام
خوش گوار و بامعانی بھی تو بن سکتی ہے شام



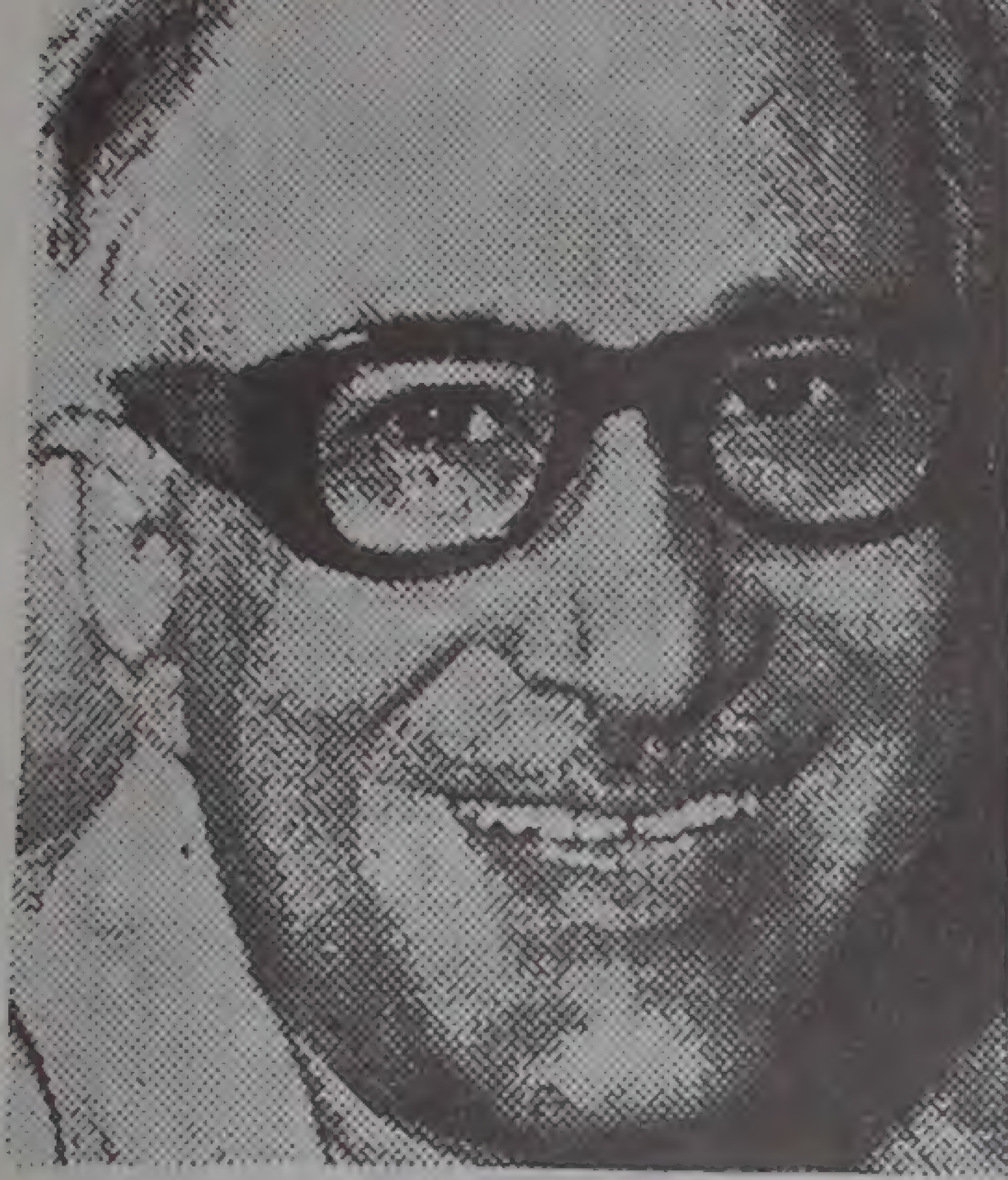
کاش آئے ایسی شام

اے مرے سائے
میں ترا خاکہ اُڑاؤں
اور تو بن جائے میرا کارٹون
تو کوئی جوسی[1] سا گاسپ[2] چھیڑ دے
میں تجھے کچھ چٹ پٹی غیبتیں سناؤں
دونوں مل کر بے سری تانیں لگائیں
قہقہوں سے چھید ڈالیں ہم اُداسی کا بدن
اور لے لیں شام کی پژمردگی سے انتقام
کاش آئے ایسی شام

عمیق حنفی

1. Juicy 2. Gossip

خواجہ احمد عباس



دل ہی تو ہے

آپریشن تھیٹر کی سفید دیواروں میں تین افراد قید تھے۔
ایک آدمی تھا
ایک جج تھا۔
ایک ڈاکٹر تھا۔

ایک آدمی تھا۔ بے سکت، بے ہوش، تقریباً بے جان۔ آدمی آپریشن ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس کے دل میں ایک سوراخ تھا۔ اُس سوراخ میں پستول کی ایک گولی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کے دل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند ہونے والی تھی۔

جج نے کہا اور اس کی دھیمی آواز بھی اس آپریشن تھیٹر میں ایسے گونجی جیسے وہ عدالت میں فیصلہ سنا رہا ہو۔ "ڈاکٹر! اس آدمی کی جان بچانا بہت ضروری ہے۔ یہ مرنے نہ پائے۔"

ڈاکٹر نے کہا: "جج صاحب میں خدا نہیں ہوں لیکن بخدا ہم اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

جج نے کہا: "تمہیں ناممکن کو بھی ممکن بنانا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا: "تب تو ایک ہی صورت ہے اُسے بچانے کی۔ لیکن آپ جانتے ہیں وہ آپریشن کتنا خطرناک ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ قانون کی خاطر، انصاف کی خاطر، تم وہ خطرناک آپریشن کر ڈالو۔"

"اگر ہم کامیاب ہو گئے تو ......" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ سائنس کی بہت شاندار فتح ہوگی۔"

"سائنس کی ہی نہیں" جج نے جواب دیا۔ "یہ قانون کی بھی بہت بڑی جیت ہوگی، تب ہی تو اس بیچارے کی سلامتی میں مجھے اتنی دلچسپی ہے۔"

بے ہوش تو وہ پہلے بھی تھا پھر بھی بے ہوشی کی گیس سنگھائی گئی تو آدمی کا سوتا ہوا لاشعور زندگی اور موت کے درمیان جھولا جھولنے لگا۔ وہ زندہ تھا لیکن اس کے بدن میں زندگی نہیں تھی۔ وہ مر چکا تھا مگر مکمل طور سے نہیں۔ ذرا سی کسر باقی تھی۔

بے ہوشی کی گیس سنگھائی جا رہی تھی۔ رگوں میں سوئی لگا کر خون چڑھایا جا رہا تھا۔ ایک دوسری سوئی کے ذریعے گلوکوس دیا جا رہا تھا تاکہ آپریشن کے دوران اُس کے دل کی حرکت جواب نہ دے جائے۔ ڈاکٹر کی تمام جان، تمام طاقت، تمام قابلیت اُس کی اُن انگلیوں میں آگئی تھی جو نشتر لے کر، آدمی کی پسلیوں کے پنجرے کو توڑ کر، اُس کے سینے کی کھال چیرتی ہوئی اب دل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دل کی حرکت اب اتنی سست ہو گئی تھی کہ لگتا تھا کہ اس میں اب جان ہی نہیں ہے۔ بے ہوشی کے بادلوں میں سے آدمی کا لاشعور دو آوازیں سُن سکتا تھا۔ کہیں دور کتے بھونک رہے تھے اور ایک آواز تحکمانہ لہجے میں کہے جا رہی تھی۔

"...... پھانسی دی جائے یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے۔ اور یہ مر جائے ...."

"..... پھانسی دی جائے۔ پھانسی دی جائے ...."

"۔ ۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے۔ دم نکل جائے۔"
"۔ ۔ ۔ ۔ مرجائے ۔ ۔ ۔ ۔ مرجائے ۔ ۔ ۔ ۔ مرجائے ۔"

سزائے موت کا فیصلہ سناتے ہوئے جج کی آواز میں ٹھہراؤ تھا کوئی جذباتی لغزش نہیں تھی "۔۔۔ پھانسی دی جائے یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے اور یہ مرجائے ۔ ۔ ۔ ۔"

آدمی کو اپنے گلے کے گرد پھانسی کی رسی تنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تو بے خیالی سے اس نے قمیص کے کالر کو کھول لیا۔ اس کی نگاہیں جج کے چہرے پر ہمدردی یا افسوس کے آثار تلاش کر رہی تھیں (آخر وہ ایک انسانی زندگی کو ختم کئے جانے کا حکم دے رہا تھا صرف قلم کی ایک جنبش سے!) مگر وہاں ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔ جج کے چہرے پر مسکراہٹ تو نہیں تھی مگر کوئی غم، کوئی افسوس، کوئی فکر بھی نہیں تھی۔ اگر چہرے پر کوئی جذبہ تھا تو وہ اطمینان اور فراغت کا تھا کہ ہفتوں کی قانونی رسہ کشی کے بعد جو استغاثہ اور صفائی کے وکیلوں اور ان کے گواہوں کے درمیان ہوئی تھی، آخرکار یہ مقدمہ بھی اپنے انجام تک پہنچ گیا تھا۔ ایک مصور کو اپنا شاہکار مکمل کرنے کے بعد شاید ایسا ہی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

آدمی کو دفعتاً محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے آرہے ہیں لیکن اپنی قوتِ ارادی سے وہ اُن کو پی گیا۔ نہیں (اس نے سوچا) میں اس جج کے سامنے اپنی کمزوری کا اظہار ہرگز نہ کروں گا۔ کاش اس جج کی آواز کے اُتار چڑھاؤ میں، اس کی نگاہ میں، اُس کے انداز میں، ذرا سا رحم بھی، تھوڑی سی بھی ہمدردی ہوتی ایک انسان کے لئے، اس کی اُن مجبوریوں کے لئے جو کبھی کبھی اس کے ہاتھوں سے قتل کراتی ہیں! پھر وہ اس کو سزائے موت بھی سُناتا، تو اس کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ وہ سمجھ جاتا کہ جج بھی مجبور ہے، انصاف کے ہاتھوں، قانون کے ہاتھوں، تعزیراتِ ہند کے ہاتھوں۔ پھر وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے دیتا۔ چاہے دیکھنے والے اُسے کتنا ہی بزدل سمجھتے۔ مگر ان آنسوؤں میں اُس کے دل میں جو زہر بھرا ہوا تھا وہ باہر نکل جاتا۔ اس کی روح پاک اور صاف ہو جاتی اور پھر وہ اُسے پھانسی بھی دیدیتے تو اس کو کوئی شکایت نہ ہوتی پھر وہ خوشی سے موت کو گلے لگا لیتا۔

اس وقت ایک ہی خواہش، ایک ہی آرزو، ایک ہی خیال، ایک سلگتا ہوا سوالیہ نشان بن کر آدمی کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ کیا وہ جج انسان نہیں؟ کیا وہ صرف قانون کی ایک مشین ہے۔ جس میں انسانی ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں ہے؟ آدمی کو سزائے موت دینا اس کا قانونی فرض تھا مگر کیا رحم اور ہمدردی کا ایک اشارہ اس کا انسانی فرض نہیں تھا؟ اس کے قلم کی ایک جنبش نے ایک آدمی کو ختم کرنے کا حکم سُنا دیا تھا اور اس کی آواز میں اس کی آنکھوں میں، ذرا سے افسوس کی جھلک نہیں آئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آدمی نے بھی دو انسانوں کو سزائے موت دی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ دو انسان جن سے وہ دُنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ ایک اس کی بیوی تھی اور دوسرا اس کا دوست تھا۔ عدالت کی زبان میں وہ ڈبل خونی تھا، مگر جب اس نے اپنے دوست پر اپنی فوجی سنگین سے وار کیا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے من کے اندھیرے میں بیٹھا ہوا کوئی شیطان اُسے قتل پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اس کی بیوی کا عاشق تھا مگر وہ اس کا دوست تھا اور اس لئے وہ اُسے تکلیف پہنچا کر مارنا نہیں چاہتا تھا۔ پیچھے سے آکر اس نے چپکے سے وار کیا تھا۔ کمر کی تیسری پسلی کے نیچے جہاں دِل ہوتا ہے وہاں سنگین کا بس ایک وار ۔۔ اور اس کا دوست وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس کی دفعتاً موت کا ذمہ دار کون ہے۔ سنگین سے دشمن پر کہاں اور کیسے وار کرنا چاہیے، یہ اُس کو فوج میں سکھایا گیا تھا۔ اُس نے دس کو، اپنے جیسے آدمیوں کو، اسی طرح وار کر کے موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ جس کا ثبوت وہ میڈل تھا جو اس کو انعام میں ملا تھا۔ اس کا دوست گیارھواں تھا۔ وہ دیش دشمن تھے۔ یہ دوست تھا۔ مگر سنگین دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتی۔ سنگین جان لے سکتی ہے مگر خود بے جان ہوتی ہے۔ بے جان، بے روح، بے عقل اور سپاہی جو سنگین چلاتا ہے۔ وہ بھی ٹھنڈے فولاد کی طرح بے روح بے عقل ہو جاتا ہے۔ کیا وہ دس واقعی اس کے دشمن تھے۔؟ اس کو تو اُن کے نام بھی نہیں معلوم تھے۔ اس سے پہلے اس نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کس کے بیٹے تھے، کس کے بھائی تھے، کس کے شوہر تھے، کس کے دوست تھے، اُسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس کو صرف بتایا گیا تھا کہ وہ اس کے دشمن ہیں۔ اس کو حکم دیا گیا تھا کہ اُن کو مارنا اس کا فرض ہے۔ اور سو اس نے اُن کو مار دیا تھا۔ جنگ سے واپس آنے پر اس کو بتایا گیا تھا کہ اس کا دوست دراصل اس کا دشمن ہے۔ اس کے من کے اندھیرے میں جو شیطان بیٹھا ہوا تھا، اس نے حکم دیا تھا کہ اُسے مار دیا جائے۔ اور اس

نے سنگین اُس کی پسلیوں میں اُتار دی تھی۔ شاید دس دشمنوں کے بعد یہ پہلے دوست کا خون نہیں تھا، شاید یہ گیارہویں دوست کا خون تھا جو اس کے ہاتھوں ہوا تھا۔

مگر پھر بھی اس کو اتنی تسلی تھی کہ اُس کا دوست بغیر کوئی تکلیف محسوس کئے اس دنیا سے گذر گیا تھا۔ اس نے جب فوجی سنگین کو اُس کی کمر سے کھینچ کر نکالا تھا، تو بدن ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مگر زخم سے گرم خون کا ایک فوارہ نکلا تھا جس کے چھینٹے اُس کے کوٹ کی آستین پر گرے تھے۔ ثبوت کے طور پر سنگین کے ساتھ یہ کوٹ بھی مقدمے کے دوران پیش کیا گیا تھا اور سرکاری وکیل نے ڈرامائی انداز میں اس کوٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا "مائی لارڈ۔ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔" اور وہ یہ سوچ کر مسکرا دیا تھا کہ وکیل صاحب کو یہ نہیں معلوم کہ اُس کی آستین پر تو دس اور انسانوں کا خون بھی پکار رہا ہے مگر وہ خون نہ وکیل صاحب کو نظر آئے گا نہ کوئی عدالت اُس لہو کی پکار سننے کے لئے تیار ہے۔

اور اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو تھے جب وہ قتل کے ارادے سے اپنی فلیٹ کے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اس کی بیوی سو رہی تھی۔ آدھی رات گذر چکی تھی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں مگر کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے پردوں کو سرسراتی ہوئی ہوا کے ساتھ چاندنی بھی دبے پاؤں اندر آ گئی تھی۔ اُس مدھم روشنی میں وہ اتنی خوبصورت، اتنی معصوم اتنی بھولی بھالی لگ رہی تھی کہ اُس کی ہمت نہ پڑی کہ سنگین کو میان سے باہر نکالے۔ پہلے اس کا ارادہ تھا جس ہتھیار سے اُس کے عاشق کا خون کیا ہے، اُسی سے اپنی بیوی کا گلا کاٹ ڈالے گا مگر اب وہ اس خیال سے ہی کانپ اُٹھا جس سے اس نے محبت کی تھی وہ اس کا خون بہتا نہ دیکھ سکے گا۔ یہ کام اس کو اپنے ہاتھوں سے لینا ہوگا۔ اس کی ٹریننگ بھی اس کو فوج میں دی گئی تھی۔ کمانڈو اسکول میں "کراٹے" انسٹرکٹر نے اُس کو سکھایا تھا کہ گلے کی کون سی رگ کو دبانے سے دشمن کو ہمیشہ کے لئے خاموش کیا جا سکتا ہے۔ وہ سبق اُس کو آج بھی یاد تھا اور اُس کی بیوی نیند سے بیدار ہوئے بغیر ہی مر گئی اور جو مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی وہ برقرار رہی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جن ہاتھوں نے بارہ خون کئے تھے۔ مگر اب اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس کی بیوی کے دامن سے بے وفائی کا داغ ہمیشہ کے لئے دُھل گیا ہے۔ اب وہ پھر معصوم ہے۔ اور اُس کی ہے ہمیشہ کے لئے اُس کی! اُس نے اُس کے ننھے ننھے گورے گورے پاؤں کا بوسہ لیا جو اُس وقت بے جان سنگِ مرمر کے سے لگ رہے تھے! پھر وہ اس کے پلنگ کی پائینتی بیٹھ گیا اور وہ آنسو جو اب تک اُس کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے وہ بہہ نکلے۔ اور اُسے ایسا لگا کہ وہ رو رہا ہے نہ صرف اپنی بیوی کے لئے، نہ صرف اپنے دوست کے لئے بلکہ اُن گمنام، انجان دس آدمیوں کے لئے بھی جو سب اُس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے! وہ اُس وقت سسکیاں لے کر روئے جا رہا تھا جب صبح کے اُجالے میں پولیس نے اُس کو "دو" خون کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جب اُسے فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی تو وہ بڑبڑایا "بس دو خون؟ میں نے تو بارہ خون کئے ہیں" اور پولیس افسر سمجھے خون اُس کے سر پر چڑھ گیا ہے یا وہ خود جان بوجھ کر دیوانوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔

"مجرم"! جج اُس سے مخاطب تھا مگر اُس سے آنکھیں چرا کر دیکھ رہا تھا وکیل صفائی کی طرف۔ "اُس سے پہلے کہ تمہیں سزائے موت دی جائے تمہیں کچھ کہنا ہے۔؟"

اور اُسی لمحے میں آدمی کے دماغ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کیا کہے گا اور کیا کرے گا۔ وہ آہستہ سے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا "جی جناب" اُس نے کہا اور جج کی طرف آنکھیں گڑا کر دیکھتا رہا۔ مگر وہ اب بھی کسی دوسری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"بزدل کہیں کا!" آدمی نے سوچا۔ "جس کو سزائے موت دی ہے، اُس سے نظریں ملاتے ہوئے گھبراتا ہے!"

جج نے مجرم کی طرف دیکھے بغیر اُس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا: "ہاں تو کیا کہنا ہے تمہیں؟ کوئی آخری خواہش؟"

"جناب والا۔ مرنے سے پہلے میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں جہاں میری بیوی کو ——— جہاں میری بیوی کی لاش پائی گئی تھی۔"

"منظور کیا جائے"، جج نے عدالت کے کلرک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر جیل کے قانون اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اور کچھ کہنا ہے؟"

"جی نہیں جناب والا۔ بہت بہت شکریہ، جناب والا"

جج تو کہیں اور دیکھ رہا تھا، سو اُس نے تو نہیں دیکھا مگر عدالت میں جتنے اور لوگ حاضر تھے انھوں نے دیکھا کہ مجرم کو جب لیجایا گیا تو اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ وہ لوگ بھی جو اس سے کچھ نہ کچھ ہمدردی رکھتے تھے اب اُن کو بھی یقین ہو گیا کہ جو آدمی "دو

بھیانک خون کر کے بھی مُسکرا سکتا ہے اُس کو تو واقعی سزائے موت ہی ملنی چاہیئے۔

آدمی کی آخری خواہش اُس کی اُمید سے بھی پہلے ہی پوری ہو گئی۔ جیل کے قوانین کی رو سے وہ ایک بار پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہو گیا تو اس کو صرف ایک بار وہاں سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ آخری بار: اس لئے اگر اُسے آخری بار اپنے گھر جانے کی اجازت مِلی تھی تو عدالت سے سیدھا وہیں لیجانا ہوگا۔

"بس دس منٹ دے سکتے ہیں"، پولیس کے دو سپاہیوں میں سے بڑے والے نے کہا۔ وہ لوگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے فلیٹ پر پہنچے جو تیسری منزل پر تھی۔

آدمی نے بڑی عاجزی سے کہا: "آپ اجازت دیں تو میں اس کمرے میں دس منٹ اکیلا رہنا چاہتا ہوں — مرنے والی کی یادوں کے ساتھ! آپ دروازے پر پہرہ دے سکتے ہیں۔"

بڑے والے کانسٹبل نے کمرے کے اندر جا کر دیکھا۔ باہر جانے کے لئے دوسرا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی سڑک سے پچاس فٹ اونچی۔

"اچھا ٹھیک ہے"! اس نے کہا "مگر کوئی گڑبڑ نہ ہو یہ دیکھ لو۔" اور اُس نے اپنی پیٹی میں لگے ہوئے پستول کی طرف اشارہ کیا۔

آدمی نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا مگر کانسٹیبلوں کو اطمینان ہو گیا جب چٹخنی لگانے کی کوئی آواز نہیں آئی۔

"عجیب آدمی ہے یہ بھی" چھوٹے والے کانسٹبل نے اپنے ساتھی سے کہا "پہلے تو اپنی بیوی کو قتل کیا اور اب اُسی کمرے میں اُس کی یاد کر رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اُس کی بیوی کا بھوت اُس کا ٹینٹوا دبا رہا ہوگا۔"

"بڑے والے کانسٹبل نے اپنا تجربہ بگھارتے ہوئے کہا "تم کیا جانو! یہ سب خونی پاگل تو ہوتے ہی ہیں۔ اُن کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ یہ بے چارہ تو فوج میں تھا۔ سُنا ہے گورنمنٹ نے میڈل بھی دیا ہے۔ دس دشمن مارے تھے اس نے۔ چھاپہ ماروں کے دستے میں تھا یہ۔"

چھاپہ مار! کمانڈوز! لفظ اُس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ اُس کے دماغ میں ایک شبہ بجلی کی طرح کوندا۔ "چھاپہ ماروں کو تو اونچے مقاموں سے کودنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔"

دوسرے لمحے ہی وہ دونوں کمرے کے اندر تھے مگر کمرہ خالی تھا۔ کھڑکی کے پٹ ہوا سے ہل رہے تھے۔ جب انھوں نے نیچے دیکھا تو وہ سڑک کی دوسری طرف پہنچ چکا تھا جتنے وقت میں پیٹی سے پستول ہاتھ میں آیا وہ بھیڑ میں کھو گیا تھا۔

مگر کودنے سے پہلے آدمی اپنے جوتے اُتار کر چھوڑ گیا تھا۔ "فکر نہ کرو" بڑے والے کانسٹبل نے کہا: "میرے کتے اِن جوتوں کی بُو سے اُسے کھوج نکالیں گے۔"

اُس نے سُنا تھا کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے میلوں تک دوڑنے کے بعد جنگل میں رات ہو گئی اور آدمی تھک ہار کر پیڑوں کے جھنڈ تلے سو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر سویا تھا کہ کُتوں کے بھونکنے کی آواز سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ پہلے تو اُس نے اُس آواز کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ جھیل کے کنارے مینڈک ٹرا رہے تھے۔ دلدل میں جھینگر بول رہے تھے، گھاس پر مچھر بھن بھن کر کے اُس کو کاٹ رہے تھے — اور دُور کسی گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے۔ کتے رات کو تو بھونکتے ہی ہیں۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اُس کو محسوس ہوا جیسے کُتوں کی بھونکنے کی آواز تیزی سے قریب ہوتی جا رہی ہے جیسے کتے اُس کی طرف دوڑتے ہوئے آ رہے ہوں۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کو احساس ہوا کہ یہ پولیس کے شکاری کتے ہیں جو اُس کی بُو کا پیچھا کرتے ہوئے اُس کا شکار کرنے دوڑتے ہوئے آ رہے ہیں۔ اَب تو اُن کی آوازیں خطرناک حد تک قریب آ رہی تھیں۔ دفعتاً اُس کی سب حِسیں بیدار ہو گئیں۔ اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاند کم بخت کو بھی آج رات ہی نکلنا تھا۔ شاید گیارہویں رات تھی اور آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اگر وہ پیڑوں کے سائے سے نکل کر بھاگا تو میلوں دُور سے کتے اُسے دیکھ لیں گے۔ اور اگر نہیں بھاگا تو بُو سونگھتے سونگھتے وہیں پہنچ جائیں گے اور منٹوں میں اُس کی تِکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ دونوں حالتیں خطرناک تھیں مگر بھاگنے میں بچاؤ کی ایک صورت ہو سکتی تھی۔ اگر وہ سامنے والی جھیل تک پہنچ گیا اور تیر کر اُس کو پار کر گیا

توشکاری کتّوں سے اُس کا پیچھا چھوٹ سکتا تھا۔

اُس کے تمام احساس، اُس کے گٹھے ہوئے بدن کی تمام طاقت اُس کی تمام قوت ارادی سمٹ کر اس وقت اُس کی بھاگتی ہوئی ٹانگوں میں آگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس وقت کے لئے فوج کے کمانڈو اسکول میں اُس کو چھاپہ ماروں کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اُس نے مڑ کر چاند کی روشنی میں دیکھا کہ شکاری کتّے دو ہیں اور انھوں نے اپنے ساتھ کے پولیس کانسٹبلوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اس وقت وہ چھلانگیں بھرتے ہوئے اُس کی طرف آرہے ہیں۔ ایک کے مقابلے میں دو۔ مگر وہ کتّے تھے اور وہ آدمی تھا! وہ بے عقل جانور تھے اور اُس کے پاس دماغ تھا۔ اور اُس دماغ کو وہ سب چالیں اور گھاتیں یاد تھیں جو ایسے موقع کے لئے اُس کو سکھائی گئی تھیں۔ اور سو اُس نے اُن کو تگنی کا ناچ نچایا۔ سیدھا دوڑنے کی بجائے کبھی ادھر گیا کبھی اُدھر، پیڑوں کے گرد گھوم کر، ٹیلوں پر سے ہو کر، کھیتوں میں سے، کاشتکاروں کے جھونپڑوں کے آنگن سے ہو کر۔ اُس کو معلوم تھا کہ شکاری کتّے ایک آدمی کا پیچھا نہیں کرتے وہ تو ایک خاص بُو کو سونگھتے سونگھتے اپنے شکار تک پہنچ جاتے ہیں اور اس لئے وہ ہر اُس جگہ جانے کے لئے مجبور تھے جہاں آدمی کے بھاگتے ہوئے، چک پھیریاں کھاتے ہوئے قدم ایک پل کے لئے بھی گئے تھے۔

چھاپہ ماروں کو دشمن کی فوج اور پولیس کے شکاری کتّوں سے بھی سابقہ پڑ سکتا ہے۔ اِس لئے کمانڈو سکول میں اُس نے یہ بھی سیکھا تھا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔ بھاگتے بھاگتے اُس نے اُن سب ہدایات کو یاد کیا جو ایسے وقت کے لئے اُن کو دی گئی تھیں۔ پل بھر کے لئے رُکے بغیر اُس نے اپنی قمیص اُتاری اور اُس کا گولا بنا کر دُور ایک طرف پھینکا اور پھر پسینے میں شرابور بنیان کو دوسری طرف کی چٹانوں میں گرا دیا۔ کچھ دیر کے لئے تو شکاری کتّے قمیص اور بنیان کے درمیان گڑبڑا گئے۔ غصّہ انھوں نے کپڑوں پر نکالا۔ سونگھتے سونگھتے ان کو اپنے بھیانک دانتوں اور پنجوں سے تار تار کر ڈالا۔ اب وہ اُن سے کئی سو گز آگے تھا۔ اور سامنے ہی جھیل کا پانی چاندنی میں چمک رہا تھا۔ یہی اُس کی نجات کا ایک راستہ تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ شکاری کتّے پانی میں اپنے شکار کی بُو نہیں سونگھ سکتے۔

نکیلے پتھروں پر سے ننگے پیر بھاگتے ہوئے اُس کے تلوے لہولہان ہو گئے تھے۔ اُس کو اپنے پیروں کے نیچے خون نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی رُک نہیں سکتا تھا۔ کتّوں نے پھر اس کی بُو سونگھ لی تھی اور اب وہ تیزی سے اُس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ اُس وقت اس ہرن کے مانند تھا جس کی ٹانگ میں گولی لگی ہو اور وہ شکاری کتّوں سے بچنے کے لئے لنگڑاتا ہوا بھاگتا جا رہا ہو، بھاگتا جا رہا ہو۔ کیوں کہ رُکنے میں اُس کی موت ہے۔

اور اب جھیل کا پانی اُس سے چند قدم ہی رہ گیا تھا۔ زمین جو یہاں تک پتھریلی تھی۔ اب نرم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے گھاس کی نرمی جو اس کے زخمی پیروں کو ایسے لگی جیسے کسی نے اُس کے تلوؤں کے زخموں پر مرہم کا پھایہ رکھ دیا ہو۔ پھر پھسلواں کیچڑ۔ ہوشیاری سے قدم رکھنا چاہیے۔ ورنہ پھسل کر گر گیا تو اس کا تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ مگر اس کے پیر ایک دلدل میں پھنس گئے تھے جو ہر لحظہ اُس کو دھیرے دھیرے نیچے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ دلدل سے پاؤں باہر نکال ہی نہیں سکتا تھا۔ اب وہ کتّوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کاش اس وقت اس کی سنگین اُس کے پاس ہوتی تو وہ ان کتّے کے بچّوں سے نپٹ لیتا۔ مگر اب تو اُس کی دونوں ٹانگیں بھی بے کار ہو گئی تھیں، گھٹنوں تک دَل دَل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اب تو اُس کے صرف دو ہاتھ تھے، اور دو خونی کتّے تھے جو اپنے خوفناک دانت نکالے اُس پر حملہ کر رہے تھے!

کہتے ہیں بھونکنے والے کتّے کاٹتے نہیں۔ مگر اِن دونوں کتّوں نے شاید یہ مثل نہیں سنی تھی۔ وہ خوفناک آواز میں بھونک بھی رہے تھے اور پنجوں اور دانتوں سے اُس کو کاٹ بھی رہے تھے اور اُس کے پاس اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف دو ہاتھ تھے۔ مگر کمانڈو سکول میں اُس کو یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ دشمن کے شکاری کتّوں کو بغیر گولی چلائے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کی حفاظت کرتے ہوئے اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ سارجنٹ نے ایسے موقع کے لئے کیا بتایا تھا۔

"یاد رکھو کہ شکاری کتّا شیر سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اُس کو اپنے قریب نہ آنے دو، ٹھوکر سے کام لو۔ تمہارے فوجی جوتوں میں اسی لئے نیچے موٹی موٹی کیلیں لگی ہوئی ہیں۔ وقت پڑے تو اِن جوتوں کی مار سے ہتھیار کا کام لو۔" مگر اِس وقت اُن کو ٹھوکر کیسے مارے؟ اُس کے تو ننگے پیر بھی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ اُس کی ٹانگوں کو بھی اپنے اندر کھینچتی جا رہی تھی۔

اُس کے پاس تو اس وقت صرف دو ہاتھ تھے جن سے وہ اپنے چہرے کی حفاظت کر رہا تھا جہاں چھلانگیں لگا لگا کر وہ دونوں شیطان

اُس کی آنکھیں نکالنے پر تُلے ہوئے تھے۔ مگر اِس وقت صرف مدافعت سے کام نہیں چلے گا۔ زہریلے پنجوں اور خونی دانتوں کی مار سے دونوں ہاتھ لہُولہان ہو چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کے ہاتھوں کی کھال اُتر جائے گی اور خون بہنے سے اِن کی ساری طاقت نکل جائے گی۔ اُس سے پہلے ہی اُسے اِن ہاتھوں سے کچھ کام لینا ہے۔ اُس نے ایک کتے پر ساری توجہ مبذول کر دی اور اگلی بار وہ اُس کی طرف اُچھلا تو اُس کے ہاتھوں نے "کراٹے" کے ایک پینترے سے اُس کا گلا پکڑ لیا اور زور سے دبایا۔ دوسرا کُتّا اب اپنے ساتھی کو بچانے کے لئے اُس پر حملہ کر رہا تھا۔ اُس کی ننگی پیٹھ اور اُس کا سینہ لہولہان ہو گیا مگر اُس نے کُتّے کا گلا نہ چھوڑا دبائے ہی چلا گیا جب تک کہ دشمن بے جان نہ ہو گیا۔

اور اب صرف ایک دشمن باقی رہ گیا تھا۔ پہلا کُتّا سامنے پڑا تھا۔

——— اور دلدل اس کی لاش کو بھی اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ کر کُتّے میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ اب اُس کی شکاری حس میں ایک زہر بھری نفرت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

یہ لڑائی ایک آدمی اور ایک جانور کی نہیں تھی، دو جانوروں کا خونی مقابلہ تھا۔ آدمی بھی اس وقت ایک کتا ہی ہو گیا تھا۔ اگر کتا اُسے کاٹ سکتا تھا، تو اُس کے دانت بھی مضبوط اور نکیلے تھے۔ اُس کے ہاتھ کُتّے کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہے تھے، اُس کے دانت کُتّے کی گردن کو کاٹ رہے تھے۔ جیسے وہ کُتّے کا خون پی جائے گا، اگر کُتا خوفناک طریقے سے بھونک رہا تھا تو اُس وقت آدمی بھی چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا، یہاں تک کہ کُتّے کی طرح ہی بھونک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے، اُس کے منہ سے تھوک کے ساتھ خون بہہ رہا تھا۔ اُس کا اپنا خون اور ساتھ میں کُتّے کا خون۔ مگر اِس وقت یا اُس کی جان تھی یا کُتّے کی۔ اور کُتّا اگر حیوان تھا تو وہ بھی حیوان تھا، مگر ساتھ میں وہ انسان بھی تھا اور سو حیوانی طاقت کے ساتھ انسانی دماغ بھی شامل تھا۔ ایک دفعہ چار ٹانگ کے دشمن کی گردن اُس کے ہاتھوں میں آگئی تو اُس کے انگوٹھے نے ٹٹول کر وہ رگ ڈھونڈ نکالی جس کو دبانے سے نرخرہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کُتّا بے جان ہو کر گر پڑا۔ کُتّا "کراٹے" نہیں جانتا تھا!

اب وہ دونوں کُتّے ختم ہو چکے تھے، مگر اُس کی جان اب بھی خطرے میں تھی اور اِس دشمن کے مقابلے میں نہ "کراٹے" کام آسکتی تھی نہ "جیو جِٹسو"۔ یہ دشمن وہ دلدل تھی جس نے اُس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ اُس نے اب تک اس کا خیال نہیں کیا تھا مگر وہ کمر تک دلدل میں دھنس چکا تھا۔ ایک کُتّے کی لاش تو آدھی سے زیادہ دلدل کی قبر میں اُتر چکی تھی۔ دُوسرے کے مُردے کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔ اور (اُس نے ایک جُھرجُھری لے کر سوچا) میری قبر بھی ان دونوں کے ساتھ بنے گی۔

موت کا خوف جو عدالت میں جج کا فیصلہ سُن کر بھی اُس کی آنکھوں میں نہیں جھلکا تھا اس وقت اُس کے سارے شعور پر چھا گیا۔ اُس نے انتہائی مایوسی سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید بچنے کی کوئی صورت دِکھائی دے جائے تو سامنے پولیس کا کانسٹبل کھڑا نظر آیا۔ موٹا، بھدّا، چاند کی روشنی میں چہرے پر نفرت اور غصّہ — پاس آیا تو اُس کا گلا بھی دبا دوں گا۔ آدمی نے سوچا۔ مگر پاس آئے گا کیوں۔ اُس کے ہاتھ میں تو پستول ہے۔

اِسی پستول سے اُس کی طرف نشانہ لگاتے ہوئے وہ دانت بھینچ کر بولا "تو نے میرے پیارے کالُو اور لالُو کو مار ڈالا کم بخت! اُنہیں اپنے بیٹوں کی طرح پالا تھا میں نے۔ ابھی تجھے بھی اُن کے پاس پہنچاتا ہوں ہاتھ اُوپر کر!"

اور جب آدمی نے ہاتھوں کو سر کے اوپر اُٹھایا تو کانسٹبل بولا "یہ ٹھیک ہے گولی سیدھی دل کے پار ہوگی۔" پستول نے اپنی نالی میں سے آگ کا شعلہ اُگلا، ایک تڑاخہ ہوا۔ اور اُس کے بعد آدمی کو نہ کوئی تکلیف محسوس ہوئی، نہ کہیں درد ہوا، صرف ایک میٹھی سی ٹیس کلیجے میں اُٹھی اور اُسے ایسا لگا جیسے وہ نیند کے اندھیرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

خواب میں اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا اور پہچانا کہ یہ نوجوان وہ خود ہے اور ایک چھوٹی سی خوبصورت سی لڑکی ہے جو ہنستی ہوئی بھاگ رہی ہے اور وہ اُس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور اُس کے ہاتھوں میں اس کا اپنا دِل ہے اور اُس دِل کو وہ اُس لڑکی کی نذر کرنا چاہتا ہے۔ "دِل دینا چاہتے ہو" لڑکی نے کہا اور اب اُس نے دیکھا کہ یہ لڑکی اُس کی بیوی ہے جو پھر زندہ ہو گئی ہے "دِل دینا چاہتے ہو تو لاؤ۔" اور اُس نے اپنا دِل اُس لڑکی کو دے دیا۔

"ذرا سنبھال کر۔ میرا دِل بڑا نازک ہے۔" ابھی اُس نے کہا ہی تھا کہ لڑکی نے دِل کو زمین پر دے مارا اور دِل جو کانچ کا بنا ہوا تھا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور کانچ کا ایک ٹکڑا اُڑ کر اُس کو چُبھ گیا عین اُس جگہ جہاں کبھی اُس کا دِل تھا اور سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ مگر یہ تکلیف اصلی تھوڑا

ہی تھی۔ یہ تو خواب کی تکلیف تھی۔

اور پھر بے ہوشی کی صدیاں گذر گئیں اور وہ درد کی لہروں میں ڈولتا رہا، اور اُسے یہ یاد بھی نہ رہا کہ یہ سمندر ہے جس کی تہہ میں وہ ڈوبتا جا رہا ہے یا وہ دلدل ہے جو اُس کی ٹانگ گھسیٹ کر قبر میں اُتارنا چاہتی ہے اور پھر اُس نے دیکھا کہ اُس کی بیوی اُس جوان سے کہہ رہی ہے جو وہ خود تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا دل توڑ دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا اتنا نازک ہے۔ لو میں تمہیں ایک نیا دل دیتی ہوں۔ یہ تمہارے سینے میں فٹ آئے گا، تمہارے بہترین دوست کا دل ہے۔" اور اُس نے وہ دل لے لیا اور اپنے سینے میں جو جگہ خالی تھی وہاں رکھ لیا۔ مگر جگہ تنگ تھی، دل بڑا تھا، بڑی مشکل سے ادھر اُدھر سے دبا کر اُس کو جگہ پر لگایا مگر تکلیف اتنی ہوئی کہ اُس نے سوچا میں مرجاؤں گا۔۔۔۔

بے ہوشی کے سمندر میں بڑی دُور سے تیرتی ہوئی جج کی آواز آئی۔ "شاباش ڈاکٹر۔ تم نے یہ آپریشن نہیں کیا، ایک چمتکار کیا ہے۔"

اور پھر اُس کے بازو میں ایک سوئی چُبھی اور وہ پھر بے ہوشی کے اندھیرے سمندر میں ڈوب گیا۔

جب درد اور بے ہوشی کی صدیاں گذریں اور اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ہر طرف سفیدی ہی سفیدی پھیلی ہوئی ہے۔ سفید دیواریں سفید دروازے، سفید کھڑکیوں میں سفید پردے لگے ہوئے، فرشتوں کی طرح سفید فراک پہنے ہوئی نرسیں۔ اور سفید کپڑے پہنے ہوئے سفید داڑھی والا ڈاکٹر جو اُس وقت خدا نظر آ رہا تھا!

جب ڈاکٹر نے دیکھا کہ آدمی کو ہوش آ گیا ہے تو وہ چلتا ہوا اس کے پلنگ کے پاس آیا اور مسکرا کر کہا "شکریہ، میرے دوست۔ اگر تمہاری قوتِ ارادی زندگی کا دامن چھوڑ دیتی تو آپریشن کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔"

آدمی کمزوری کے مارے زیادہ بول نہیں سکتا تھا پھر بھی وہ ہلکے سے بڑبڑایا "کیا آپریشن کرکے میرے دل میں سے گولیاں نکال دیں آپ نے؟"

ڈاکٹر کے سنجیدہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"نہیں، میرے دوست۔ ہم نے تمہارے گولیوں سے چھلنی دل کو نکال کر اُس کی جگہ ایک نیا دل لگا دیا ہے۔ یہ پہلا ایسا آپریشن ہمارے ملک میں ہوا ہے۔"

ایک اور ہفتہ گذر گیا۔ اب آدمی تکیوں کے سہارے پلنگ پر بیٹھ کر اخبار نویسوں کے سوالوں کے جواب دے سکتا تھا۔

"کیسا محسوس کرتے ہیں آپ؟" ایک نے پوچھا۔

"اچھا ہوں۔" آدمی نے جواب دیا۔ "مگر کمزوری محسوس کرتا ہوں"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں یہ پہلا آپریشن ہے جس میں ایک کا دل دوسرے کے سینے میں کامیابی سے رکھا گیا ہے؟"

"میں جانتا ہوں۔ یہ سوچ کر ہی میرے سر میں چکر آ جاتا ہے۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ حکومت نے آپ کے آپریشن پر لاکھوں روپے خرچ کئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ یہ بھی میں جانتا ہوں اور میں حکومت کا شکر گذار ہوں کہ میری جان بچانے کے لئے انھوں نے اتنا خرچ کیا۔ اُن کے ڈاکٹروں نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

"آپ کو اپنا پرانا دل پسند تھا یا یہ نیا دل پسند ہے؟"

"مجھے یہ نیا دل پسند ہے۔ پرانے دل میں بہت سی بُرائیاں آ گئیں تھیں۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً نفرت، تشدد پسندی، شبہ، وہم، نئے دل کے ساتھ نئی زندگی شروع کر سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے اشارہ کیا کہ کافی وقت ہو گیا ہے اور اخبار نویس اُٹھ کھڑے ہوئے مگر جانے سے پہلے ایک جرنلسٹ نے پوچھا "بس ایک آخری سوال ہسپتال سے نکلنے کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"زندہ رہنا۔ بس یہی میری زندگی کا پروگرام ہے۔ اور اب میں اِس پروگرام کو پورا کر سکتا ہوں۔"

تین مہینے کے بعد آدمی کو ہسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔

"اب تم گھر واپس جا سکتے ہو۔" ڈاکٹر نے کہا "خدا حافظ اور گڈ لک۔"

ایک بڑی آرام دہ، گدّے دار موٹر میں بٹھا کر آدمی کو ایک نئی اور انجانی بلڈنگ میں لایا گیا۔ یہاں بھی ایک ڈاکٹر اُس کا معائنہ کرنے کے لئے انتظار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے آدمی کے دِل کو ٹھوک بجا کر دیکھا۔ بلڈ پریشر کا آلہ لگا کر دیکھا۔ سینے میں "سٹیتھوسکوپ" لگا کر دیکھا، "سانس اندر۔ سانس باہر"، کرایا۔ امتحان کے لئے اُس کی اُنگلی میں پِن چُبھا کر خون نکالا۔ اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پھر اعلان کیا کہ آدمی کا دل اور دماغ دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں۔

"قیدی اپنی سزا بھگتنے کے لئے پوری طرح سے قابل ہے"، اُس نے اُن وارڈروں سے کہا جو آدمی کے ساتھ آئے تھے اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر باہر چلا گیا۔

قیدی! دفعتاً آدمی کو احساس ہوا کہ وہ ابھی تک حکومت کا قیدی ہے۔ اُس کا مانگا ہوا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

قیدی کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ ایک پادری کہیں سے نمودار ہو گیا اور جلوس چل پڑا۔ یہ سب اُس کو کہاں لے جا رہے تھے؟ اور کیوں؟

جیل کے وارڈر

آدمی

وہ دونوں کانسٹبل جن کو دھوکا دے کر وہ بھاگا تھا۔ چھوٹا والا، خاموش اور مغموم تھا۔ بڑا والا مسکرا کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اُسی کی پستول کی گولیوں نے قیدی کے دِل کو چھلنی کیا تھا!

جیلر

ڈاکٹر

اور سب سے پیچھے وہی جج جس نے اُس کو سزائے موت کا حکم سُنایا تھا۔

اور سو یہ سب جلوس کی شکل میں آدمی کو پھانسی کے تختے تک لائے۔

جلّاد اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے آدمی کے سر اور چہرے پر کالا غلاف چڑھا دیا۔ آدمی نے اپنی گردن کے گرد پھانسی کا پھندا تنگ ہوتا محسوس کیا۔ اُس کے دماغ میں موت کا ڈر اتنا نہیں تھا جتنی ایک عجیب بے چینی تھی، ایک مبہم سا سوال تھا —— وہ کیا سوال تھا، اُس کا جواب کیا تھا، اب یہ سوچنے کا وقت نہیں رہ گیا تھا —— شاید اس کی موت کے بعد دوسرے آدمی اُس سوال کو دُنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ شاید کوئی اس کا جواب بھی دے سکے۔ لیکن اُس وقت وہ اِس دُنیا میں نہیں ہوگا......

جیلر نے اشارہ کیا، جلاد نے ایک ہتھہ دبایا، آدمی کے پیروں کے نیچے سے تختہ گر گیا اور آدمی پھانسی پر لٹک گیا۔ چند لمحوں میں اس کی زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا، سٹیتھوسکوپ لگا کر سینے کا معائنہ کیا۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ دِل کی حرکت —— اسی دِل کی حرکت جو ایک مرتے ہوئے آدمی کے سینے میں سے نکال کر دوسرے آدمی کے سینے میں لگایا گیا تھا، ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہے تو اُس نے سرٹیفکٹ پر دستخط کر دیئے۔ "میری موجودگی میں پھانسی دے دی گئی اور وہ پھانسی پر لٹکا رہا جب تک مجرم کے دِل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند نہ ہو گئی"

جج کے چہرے پر ایک گہرے اطمینان اور فتحمندی کے احساس کے آثار تھے۔ آج قانون اور انصاف کی بہت بڑی جیت ہوئی تھی۔

اور اُوپر آسمان میں اُڑتی ہوئی سفید بطخوں کی ڈار ایک سوالیہ نشان کی شکل میں دکھائی دی —— اور اِس سوالیہ نشان کی پرچھائیں جب اُس جیل پر سے اُڑتی ہوئی گذری تو ایسا لگا کہ جیسے پھانسی گھر اور پھانسی کی جھولتی ہوئی رسّی پر ایک لمحہ کے لئے یہ سوالیہ نشان منجمد ہو گیا ہو۔

بقیہ: کتب خانہ دار المصنّفین کے چند اہم مخطوطات

عالمگیر کی ایک مدور مہر بھی ثبت ہے، جو بہت ہی واضح ہے۔

۱۹۔ مصارف روضہ تاج محل

یہ نادر و نایاب مخطوط تاریخِ ہند کے ریسرچ اسکالرس کے لئے معلومات کا بیش بہا خزینہ ہے۔ اِس میں نہ صرف روضۂ تاج محل اور مغل عہد کی دیگر عمارتوں کے مصارف اور سامانوں کی تفصیل مندرج ہے بلکہ ممتاز محل کے سوانح و حالات بھی تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔ مزید برآں شاہانِ مغلیہ کے دور کی عمارتوں کی ہاتھ کی بنی ہوئی متعدد تصویریں بھی جا بہ جا شامل ہیں، جو مغل عہد کے پُرشکوہ فنِ تعمیر کی یاد تازہ کراتی ہیں۔

کتب خانہ دار المصنفین کے مخطوطات کا مذکورہ بالا اجمالی تعارف درحقیقت مشتے از خروارے کی حیثیت رکھتا ہے ورنہ یہ کتب خانہ اسی قسم کے سینکڑوں بیش قیمت لعل و جواہر سے بھرا پڑا ہے۔

نثار احمد فاروقی



تذکرۂ گلِ رعنا

لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی، تلمیذ و تربیت یافتہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، ۲۰ صفر ۱۱۵۸ھ (مطابق ۲۲ فروری ۱۷۴۵ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا تھا۔[1] اُس کے دادا بھوانی داس، لاہور کے ایک کھتری کپور خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور پہلی بار اورنگ زیب [۱۰۶۹ھ تا ۱۱۱۸ھ (مطابق ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء)] کے لشکر میں شامل ہو کر دکن کی سمت گئے تھے آخر وہیں بس گئے۔[2] بھوانی داس کے منجھلے لڑکے لالہ منسا رام تھے، جو آصف جاہ اوّل چین قلیچ خاں کے عہد [۱۱۱۳-۱۱۶۱ھ (مطابق ۱۷۰۱-۱۷۴۸ء)] میں پیش کار[3] تھے اور حیدر صوبے ان کی نگرانی میں تھے۔ یہ وہی لالہ منسا رام ہیں جنہوں نے

---

[1] گلِ رعنا (قلمی) نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم ورق ۵۷۷ ب
و چمنستانِ شعراء (طبع ۱۹۲۸) ص ۴۹۴

[2] بھوانی داس کے ورودِ لاہور کے وقت شفیق کے والد لالہ منسا رام کی عمر دس سال تھی (گل رعنا۔ فصل دوم)

[3] گُلِ رعنا کی تالیف کے وقت لالہ منسا رام کی مدتِ ملازمت چالیس سال ہو چکی تھی۔

کتاب "قانونِ دربارِ آصفی" لکھی تھی۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ منسا رام کی دوسری تصنیف "مآثرِ نظامی" ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

شفیق کا بیان ہے کہ وہ گیارہ سال کی عمر سے شعر کہتا تھا۔ ابتدا میں اُس نے میر عبدالقادر مہربان کا تلمذ اختیار کیا، انھوں نے صاحب تخلص مرحمت کیا تھا۔ اسی زمانے میں دو ہزار بیت کا دیوان تیار ہو گیا تھا، لیکن آگے چل کر شفیق نے اُسے نظری کر دیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں غلام علی آزاد بلگرامی کی خدمت میں رسائی ہوئی، انھوں نے صاحب کی جگہ شفیق تخلص تجویز کیا، کیوں کہ میر محمد مسیح نامی ایک شاعر متقدمین میں گذر چکا ہے۔ اس کا تخلص بھی صاحب تھا۔ شفیق نے نئے تخلص اختیار کرنے کی تاریخ "تخلص نو" سے برآمد کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلص ۱۱۷۶ھ (مطابق ۶۳-۱۷۶۲ء) میں اختیار کیا گیا۔

از حضرت فیض بخش آزاد ؛ گردید مرا تخلص انعام
تاریخ بہ اہلِ بزم گفتم ؛ "امداد شفیق شد مرا نام" (۱۱۷۶ھ)

لیکن عملاً دونوں تخلص استعمال ہوتے رہے۔ فرق یہ ہو گیا کہ شفیق فارسی کے لیے اور صاحب اردو کے لیے مختص کر دیا گیا، فارسی میں بھی اگر کسی بحر میں شفیق نہ سماتا تھا تو صاحب کو بٹھا دیا جاتا تھا۔

شفیق بچاکا شاعری سے بھی لگاؤ رکھتا تھا[۹] کبھی کبھار ہندی میں دوہے، کبت وغیرہ کہہ لیتا تھا۔ فارسی اور عربی میں اس کی لیاقت، ذوقِ سخن فہمی اور ملکۂ سخن سنجی زیادہ تر آزاد بلگرامی ہی کا فیضان ہے۔ اس کا اعتراف وہ خود بھی بار بار کرتا ہے اور جہاں کہیں آزاد کا نام آتا ہے، احترام و عقیدت سے ذکر کرتا ہے۔

ملازمت کی ابتدا نواب نظام علی خاں [۱۱۷۵ - ۱۲۱۸ھ (مطابق ۶۲-۱۷۶۱ء تا ۴-۱۸۰۳ء)] کے دربار سے وابستہ ہو کر کی۔ پھر وہ خود لکھتا ہے کہ نواب صمصام الدولہ (متوفی ۱۱۷۱ھ مطابق ۸-۱۷۵۷ء) کے توسل سے اُسے دولت چند[۱۰] کا خطاب اور منصب عطا ہوا تھا۔ شفیق نے اسی تذکرے میں اپنے برادر اعیانی روپ نرائن ذہین کے لئے بھی لکھا ہے کہ "از درگاہِ امیر الممالک آصف الدولہ مرحوم بہ منصبے سرفرازی دارد و در منصب" دولی چند" نام اوست"

شفیق کے انتقال کا سنہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اگر کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ دیوان سخن اورنگ آبادی کا قطعہ اور مادّہ" وائے شاطرٔ معانی رفت" کسی اور شفیق سے متعلق نہیں ہے تو اس سے ۱۲۲۳ھ (مطابق ۹-۱۸۰۸ء) مستفاد ہوتے ہیں[۳]

(۲)

شفیق نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، جن میں دو دواوین کے علاوہ یہ بھی ہیں:-

۱۔ چمنستانِ شعرا[۴] یہ اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جو ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں لکھا گیا۔ کتاب کے نام سے تاریخِ تالیف برآمد ہوتی ہے۔ اس[۵] ۲۱۸ شاعروں کا حال اور کلام درج ہے۔ اسے مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۲۸ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا تھا۔ یہ میر تقی میرؔ کے تذکرہ نکات الشعرا اور فتح علی حسینی گردیزی کے تذکرۂ ریختہ گویاں پر مبنی ہے۔

---

[۱] گلِ رعنا (قلمی) ورق ۲۲۵ الف (در ذیل ترجمہ میرزا روشن ضمیر)
[۲] گلِ رعنا (قلمی) ورق ۲۷۷ ب [۳] مقدمہ مثنوی تصویر جاناں/۹۰۱۰
[۴] اس کا واحد خطی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ہے، اسی پر مطبوعہ کتاب کا متن مبنی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھ: مقدمہ دستور الفصاحت ۶۲-۶۳/ نیز
T. Grahme Bailey in B.S.O.S Vol. 4 -1930

مگر معتد بہ اضافے بھی ہوئے ہیں۔

۲۔ گلِ رعنا[۵] یہ شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے جس کا تعارف مقصود ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

۳۔ شامِ غریباں[۶] یہ ۱۱۹۷ھ (۸۳-۱۷۸۲ء) میں تالیف ہوا اور ۸۳ھ فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے جو ایرانی الاصل تھے اور ہندستان کی سیاحت کے لئے آئے، یا پھر یہیں رہ پڑے۔ یہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اب تک اس کے کسی نسخے کا سراغ نہیں ملا تھا لیکن اب اس کا ایک مکمل نسخہ قلمی جناب محمد اکبر الدین صدیقی (حیدر آباد) کو دستیاب ہوا ہے ایک ناقص نسخہ کتب خانہ انجمن علی گڑھ میں اور دوسرا اورینٹل کالج لاہور میں بھی دریافت ہو گیا ہے۔ انھوں نے اس کے بارے ایک تعارفی مضمون آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس (دسمبر ۱۹۶۴ء منعقدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد) میں پڑھا تھا۔

۴۔ تنمیق شگرف[۷] تاریخ کی کتاب ہے اور نام بھی تاریخی ہے۔ ۱۲۰۰ھ (مطابق ۶-۱۷۸۵ء) میں لکھی گئی۔ اور حیدر آباد کے ریزیڈنٹ سر رچرڈ جانسن Sir Richard Johnson کے نام سے معنون ہے۔ اس میں سلاطین بہمنی اور سلاطین مغلیہ کا بھی ذکر ہے اور مختلف

---

[۵] خطی نسخوں کے لئے رجوع شود: بانکی پور فہرست جلد ۸/۷۰۱۔ انڈیا آفس لائبریری ۳-۳۶۹۲ (بحوالہ اسٹوری ج ۱/ ۷۱۱) ریوج ۳/۹۷۷ ب۔ آصفیہ ج ۲/۱۶۲ - ریٹسک/۱۶۱ - کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان شمارہ ۳۵۔ ف ۳۰۴، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور - رضا لائبریری رام پور - کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد
Storey (C.A.); Persian Literature Vol 1, Part112(London) 1953
علی رضا نقوی: تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان۔ طبع تہران ۱۹۶۲ء
Journal Royal Asiatic Society Vol.IX
[۶] ریوج ۳ ورق ۱۰۸۵ اب (در ذیل گلِ رعنا) نیز ملاحظہ ہو نقوش (لاہور) شمارہ ۱۰۲ ستمبر ۱۹۶۵ء
[۷] خطی نسخوں کے لئے رجوع کنید: ریوج ۲/۸۵۹ ب۔ ایتھے ۸۰۴۴ھ

صوبوں کے تاریخی و جغرافی حالات ہیں۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔

۵۔ **حقیقت ہائے ہندوستان**[1] اس میں ہندوستان کے قدیم دفتروں کے گوشوارے اور دکن کے صوبوں کے حالات اور ہندوستان کے بادشاہوں کی مختصر تاریخ ہے۔ یہ نام بھی تاریخی ہے۔ جس سے سال تالیف ۱۲۰۴ھ (مطابق ۹۰-۱۷۸۹ء) برآمد ہوتا ہے۔ اسے شفیق نے حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کپتان ولیم پیٹرک /Captain William Petric کے نام معنون کیا ہے۔ یہ کتاب بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔

۶۔ **مآثر آصفی**[2] آصف جاہ اول اور آصف جاہ ثانی کے عہد کی تاریخ جو ۱۲۰۸ھ (مطابق ۹۴-۱۷۹۳ء) میں لکھی گئی۔ ضمناً اس عہد کے امرا کا تذکرہ بھی ہے۔

۷۔ **حالاتِ حیدرآباد**[3]: یہ شہر حیدرآباد کی تاریخ ہے۔ بسال تصنیف ۱۲۱۴ھ (مطابق ۱۷۹۹ء) ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

۸۔ **بساطِ الغنائم**[4] مرہٹوں کی تاریخ جنگ پانی پت تک۔ یہ ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں سرجان مالکم کی فرمائش سے لکھی گئی جو اس وقت حیدرآباد میں تعینات تھے۔ یہ بارہ ابواب پر منقسم ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ جے۔ ڈبلیو۔ واٹسن J.W.Watson نے کیا تھا۔[5] اس کا نام بھی تاریخی ہے جس سے ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) برآمد ہوتے ہیں

۹۔ **سوسن دہ زبان**[6]

۱۰۔ **مثنوی تصویرِ جاناں**[7] میر اثر کی مثنوی خواب و خیال کے انداز پر محبوب کا سراپا نظم کیا ہے۔ اسے خواجہ حمید الدین شاہد نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا تھا۔ (تعداد صفحات ۸۲-۱۹۵۷ء)

۱۱۔ **نخلستان**[8] یہ ۱۲۱۸ھ (۴-۱۸۰۳ء) میں گلستان سعدی کے طرز پر لکھی گئی۔ اس کا ایک خطی نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اور ہماری نظر سے گذرا ہے۔ یہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

۱۲۔ **خلاصۃ الہند**[9] ۱۳۔ مآثر حیدری ۱۴۔ مرآۃ الہند ۱۵۔ **تذکرہ گورونانک** ۱۶۔ جواہر زاہر۔ **پنج ہزار بیت در مناقب میر غلام علی آزاد بلگرامی**[10]

زمانۂ تالیف

"تذکرۂ گلِ رعنا کی تالیف کا آغاز نظر بظاہر ۱۱۸۱ھ (۸-۱۷۶۷ء) میں ہوا، جیسا کہ قطعۂ ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔

نوکِ قلم لآلیِ بحرِ سخن وراں
از قوم مسلمین و فریقِ ہنود سفت
تاریخ ایں صحیفۂ رنگیں سحر گہے
از باغِ طبع سر زدہ : "رعنا گلے شگفت"
۱۱۸۱ھ

---

[1] اس کے خطی نسخوں کے لئے: ریوج ۱/۲۳۸ب، وج ۳/۱۹۱۳۔ ایوانوف/۱۷۹۔ بانکی پور ج ۷/۵۴۳۔ ایتھے/۴۲۶۔ رٹہسک/۱۰۴ (نمبر ۶۰) مدراس (ا) ۵۳۳

[2] خطی نسخوں کے لئے: ایتھے/۴۶۸۔ ایوانوف/۱۹۶۔ ریوج ۳/۱۰۳۹ ایف نیز Madhav Rao (P.seto) Eighteenth Century Deccan (1963)

[3] عبدالحق: مقدمہ چمنستانِ شعرا/۸

[4] خطی نسخوں کے لئے رک: ریوج ۱/۹-۲۲۸۔ آصفیہ ج ۱/۲۲۰۔ ایتھے ج ۲/۳۰۱۸، رٹہسک/۷۳

[5] ایتھے ii/۳۰۱۸

[6] اس کے متعلق ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا مضمون "شفیق کی سوسن دہ زبان" ملاحظہ ہو۔ رسالہ 'آج کل' دہلی اپریل ۱۹۶۱ء

[7] اسے مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات (حیدرآباد دکن) نے چھاپا تھا۔

[8] خطی نسخوں کے لئے: اسٹوری/۱۳۱۰۔ رٹہسک/۲۳۳ شمارہ ۵۶۔ روسو براؤن/۲۵۲۔ یہ کتاب شفیق کے بعض سوانحی حالات کا اچھا ماخذ ہو سکتی ہے۔

[9] ان آخری چار کتابوں کا حوالہ صوفی عبدالجبار خاں ملکاپوری کے تذکرہ 'محبوب الزمن' میں ملتا ہے۔ محمد اکبر الدین صدیقی نے اپنے مضمون "شامِ غریباں کا ایک نادر نسخہ" (نقوش ستمبر ۱۹۶۵ء) میں شفیق کی ان تصانیف کا اور ذکر کیا ہے۔ ۱۷۔ امرت کنڈ ۱۸۔ مثنوی اقسام نسواں ۱۹۔ تحفۂ احباب ۲۰۔ خرقۂ صد پارہ ——— اکبر الدین صاحب کا بیان ہے "عبدالرزاق صاحب عرشی مالک کتب خانہ درگاہِ یوسفین کے کتب خانے میں شفیق کا ایک کشکول یا بیاض تھی جس کو اس نے چمنستان اشعار کا تاریخی نام دیا تھا۔ یہ مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب تھا۔"

[10] دیباچہ شامِ غریباں (قلمی)

"رعنا گلے شگفت" سے ۱۱۸۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اور کتاب کے خاتمے پر یہ قطعۂ تاریخ ملتا ہے، جو اتمامِ تالیف کا زمانہ ۱۱۸۲ھ (۹-۱۷۶۸ء) ظاہر کرتا ہے:

ایں کتاب مناقب شعراء
بچہ اسلوب تازہ شد مرقوم
از پے ختم ایں صحیفۂ شوق
گفت تاریخ: نامۂ مختوم (= ۱۱۸۲ھ)

دیباچۂ کتاب میں بھی زمانۂ آغاز "در سنہ احدی وثمانین ومائۃ والف" لکھا گیا ہے۔ لیکن اس تذکرے میں اضافے اور نظرِ ثانی کا سلسلہ بعد تک جاری رہا ہے، اگرچہ یہ اضافے تعداد میں زیادہ نہیں ہے۔ مثلاً راجا رام نراین موزوں کے حال میں لکھا ہے:

"بعد اتمام گل رعنا، راجا موزوں در عظیم آباد پٹنہ درحالت صوبہ داری انجا کوٹ ثانی (کذا) سنہ سبع وثمانین ومائۃ والف (۱۱۸۷ھ) فوت شد"

دوسرا اضافہ ۱۱۸۵ھ (۲-۱۷۷۱ء) کا ہے جو میر سید محمد شاعر بلگرامی کے ترجمے میں ملتا ہے۔

تذکرے کے منابع

مذکورہ بالا شواہد سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ تذکرے کی پہلی روایت ایک سال میں تمام ہو گئی تھی۔ گلِ رعنا کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ ان میں قدیم ترین اور مستند نسخہ کتب خانہ نواب سالارجنگ (حیدرآباد) کا ہے جس کی کتابت ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۶ھ (مطابق ۱۸ اگست ۱۷۷۲ء) یعنی اتمامِ تالیف سے چار سال بعد ہوئی۔ بعض داخلی قرائن اور ترمیم و اصلاح کے انداز کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ نسخہ خود شفیق کے قلم سے اصلاح پا چکا ہے۔ نسخہ مذکورہ کے آغاز میں کسی دل جلے نے یہ عبارت حاشیے پر لکھ دی ہے:

"میر غلام علی آزاد یگانۂ آفاق و وحید عصر و عالم، خصوصاً چند تذکرہ تصنیف کردہ اند، یکے موسوم بہ خزانۂ عامرہ و دوم سروِ آزاد و سوم گلِ رعنا کہ تعلق بہ مطالعہ و ملاحظہ دارد" لچھمی نراین ہندوے کہ شب و روز در بندگیٔ ایشاں حاضر می بود از راہِ پرورش و بندہ نوازی کہ کارِ آزادان است دیباچۂ گلِ رعنا بنام (او) بنشستند۔ حالانکہ موٗمی الیہ فارسی (خواں) نیست تا بہ تحریر چہ رسد . . . از کرم میر صاحب بنام او نبشتہ شد . . . بنام ہندوے ہیچ مداں مشہور نہ شود۔ فقیر باوجود دانستن بہ عارفان ذی ہوش آگاہ نہ سازم تا پیش رسولِ خدا کہ جدِّ ایشاں است ماخوذ نہ گردم"

یہ عبارت کچھ مغشوش ہے۔ مگر مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے آزاد بلگرامی کی تصنیف بتانا اور لچھمی نراین کو اس کی تالیف سے معذور سمجھنا دھاندلی ہے۔ ہاں آزاد کا فیضان اس تذکرے کے ہر صفحے پر موجود ہے اور اس سے شفیق بھی منکر نہیں ہے۔

شفیق نے تذکرۂ گلِ رعنا کی ترتیب میں جن کتابوں اور تذکروں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اُن کی فہرست یہاں دی جاتی ہے۔ جس کتاب کے سامنے قوسین میں (قلمی) لکھا ہوا ہے، وہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ باقی تذکرے شائع ہو چکے ہیں۔ گو اُن میں بھی بعض کمیاب ہیں۔[1]

۱- **منتخب التواریخ** - ملا عبدالقادر بدایونی۔ عہدِ اکبری کی تاریخ کا مشہور ماخذ ہے۔ انگریزی اور اردو تراجم بھی چھپ گئے ہیں۔

۲- **مجمع النفائس** (قلمی) سراج الدین علی خاں آرزو۔ شعرائے فارسی کا ضخیم تذکرہ ہے۔ قلمی نسخے سالارجنگ اور رضا لائبریری میں ہیں۔

۳- **سروِ آزاد**: غلام علی آزاد بلگرامی - حیدرآباد سے ۱۹۱۳ء میں چھپ چکی ہے۔

۴- **ہمیشہ بہار**:- (قلمی) کشن چند اخلاص۔ قلمی نسخہ دہلی یونی ورسٹی لائبریری میں بھی ہے۔ اسے ڈاکٹر وحید قریشی رسالہ اردو کراچی میں باقساط شائع کر رہے ہیں۔

۵- **مرآۃ الخیال** - شیر خاں لودی۔ چھپ چکی ہے۔ قلمی نسخے بھی ملتے ہیں۔

---

[1] یہ فہرست پورے تذکرے کا مطالعہ کرنے کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ لیکن اس کا احتمال ہے کہ کوئی کتاب جس کا حوالہ گلِ رعنا میں آیا ہو، وہ اس فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئی ہو۔

٦۔ ریاض الشعراء (قلمی) علی قلی والہ داغستانی ـ قلمی نسخے سالار جنگ اور آصفیہ میں ہیں۔

٧۔ سفینۂ خوشگو : بندرابن خوشگو ۔ پٹنہ سے ١٩٥٩ء میں شائع ہوچکا ہے

٨۔ بہارستانِ سخن (قلمی) نواب شاہ نواز خاں شہید ـ قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے۔

٩۔ تذکرۃ الشعراء : مرزا محمد طاہر نصرآبادی ۔ چھپ چکا ہے۔

١٠۔ مرآۃ العالم : (قلمی) قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے۔

١١۔ تزکِ جہانگیری و جہانگیر نامہ : عہدِ جہانگیری کا معتبر ماخذ انگریزی اور اردو تراجم چھپ چکے ہیں۔

١٢۔ مصطلحات شعراء : سیالکوٹی مل وارستہ ۔ شائع ہوچکی ہے۔

١٣۔ چہار مقالہ : عروضی سمرقندی ۔ مشہور کتاب ہے۔ ایران سے اس کا اچھا ایڈیشن مرتبہ قزوینی چھپا ہے۔

١٤۔ صبحِ صادق (قلمی) میرزا صادق اصفہانی ۔ قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے۔

١٥۔ مردم دیدہ : عبدالحکیم حاکم سیالکوٹی ۔ لاہور سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے شائع کردیا ہے۔

١٦۔ یدِ بیضا (قلمی) غلام علی آزاد بلگرامی ۔ قلمی نسخہ سالار جنگ

١٧۔ خزانہ عامرہ : غلام علی آزاد بلگرامی : ١٩٠٠ء میں نولکشور پریس کانپور سے چھپی تھی۔

١٨۔ کلمات الشعراء : محمد افضل سرخوش : لاہور سے شائع ہوچکی ہے۔

١٩۔ حیات الشعراء : (قلمی) محمد علی کشمیری ۔ قلمی نسخہ سالار جنگ میں ہے۔

٢٠۔ تذکرۂ بے نظیر : عبدالوہاب افتخار : شائع ہوچکی ہے۔

٢١۔ منشآت (قلمی) ملا منیر لاہوری

٢٢۔ سفینۂ بے خبر (قلمی) میر عظمت اللہ بے خبر

٢٣۔ تذکرہ شعراء (قلمی) تقی اوحدی

} ان کے قلمی نسخے بھی آصفیہ اور سالار جنگ میں موجود ہیں۔

٢٤۔ طبقاتِ اکبری : شائع ہوچکی ہے۔

٢٥۔ برہان قاطع : محمد حسین : ایران سے اس کا ایڈیشن بہت عمدہ نکل چکا ہے۔

٢٦۔ جوابِ شافی : سیالکوٹی مل وارستہ ۔ شائع ہوچکی ہے

٢٧۔ ہفت اقلیم : رازی : شائع ہوچکی ہے۔

یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ مگر اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ شفیق نے اپنے تذکرے کی تالیف میں کن کتابوں پر اعتماد کیا ہے۔ اس نے تلاش و تحقیق کا ثبوت دیا ہے جو اس دور میں عام تذکرہ نویسوں کی روش نہیں تھی۔ اور اس طرح یہ تذکرہ بہت قابلِ اعتبار ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے ــــ

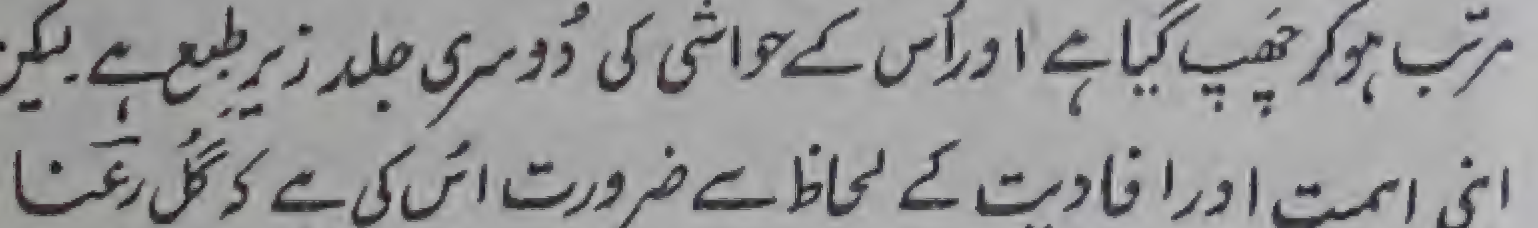
تذکرہ گلِ رعنا دو ابواب میں تقسیم ہوا ہے۔

فصل اوّل : سخن طرازان اسلامیاں

فصل دوم : نکتہ پردازان اصنامیاں

پہلی فصل میں فارسی کے مسلمان شعراء کا تذکرہ ہے اور دوسری ہندو شعراء کے حالات و نمونہ کلام پر مشتمل ہے۔ فصل اوّل میں ١٢٧ شعراء کے تراجم ہیں جب کہ دوسری فصل میں ٤٣ شاعروں کا حال بیان ہوا ہے یہ دوسری فصل حیدرآباد سے کتابی صورت میں عرصہ ہوا شائع ہوچکی تھی لیکن وہ بھی کمیاب ہے۔ مکمل تذکرے کی تلخیص راقم الحروف نے تیار کی ہے جسے مکتبہ برہان دہلی نے "تین تذکرے" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں گلِ رعنا کے علاوہ باقی دو تذکرے طبقات الشعراء مولفہ قدرت اللہ شوق اور تذکرۂ مجمع الانتخاب مولفہ شاہ کمال الدین کمالؔ کی تلخیص بھی شامل ہے۔ تلخیص میں شاعروں کے حالات کا سوانحی حصہ سب سے لیا گیا ہے۔ غیر ضروری عبارت آرائی کو حذف کردیا ہے اور انتخاب کلام مختصر کردیا ہے، یا جن شعراء کے دواوین مل جاتے ہیں اُن کا انتخاب بالکل حذف کردیا ہے۔ یہ تلخیص کل ٣٣٣ صفحات کی ہے جو چار سو صفحوں میں سمائی ہے۔ اس میں تقریباً سو صفحات مقدمہ و فہرست کے بھی شامل ہیں۔

تذکرہ طبقات الشعراء مولفہ قدرت اللہ شوق کا مکمل متن بھی مرتب ہوکر چھپ گیا ہے اور اس کے حواشی کی دوسری جلد زیرِ طبع ہے۔ لیکن اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے ضرورت اس کی ہے کہ گلِ رعنا، اور مجمع الانتخاب کا بھی مکمل متن ایڈٹ کرکے چھاپا جائے۔



بعض اوقات سمندر میں بھی خطرناک زلزلے پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سمندری لہریں ٥ کیلومیٹر بلندی تک فضا میں اُڑتی ہیں اور پانی کے بہاؤ کی رفتار ٨٠٠ کیلومیٹر فی گھنٹہ سے بھی تجاوز کرجاتی ہیں جس کے نتیجے میں راستے میں حائل ہونے والی تمام اشیاء فنا ہوجاتی ہیں۔

صالحہ عابد حسین

بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا



وہ کچھ ایسی حالت میں تھی جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مہینوں کی تھکان، صدموں کا اثر، گرمی کی شدت اور مالی پریشانیوں سے ذہن بے حد متاثر تھا۔ نہیں تو مجال تھی کسی کی کہ یوں آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کو لوٹ کرلے جاتا؟ وہ سیاحت کی بچپن سے شوقین تھی۔ آدھے سے زیادہ ہندوستان گھوم چکی تھی۔ یورپ، ایشیا، اور افریقہ کے کتنے ملکوں کا سفر کر چکی تھی اور ہمیشہ اس کی ساری جمع پونجی اس کے پرس ہی میں ہوتی جو کندھے پر لٹکا رہتا۔ کبھی اس سے پہلے ایسا حادثہ زندگی میں نہ ہوا تھا کہ وہ یوں پردیس میں ایک ایک پیسے کو محتاج کھڑے رہ جائیں۔

اُس کا پہاڑ پر جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ جب دل خوش، جسم تندرست، دماغ صحت مند ہو، تو سیر تفریح بھی اچھی لگتی ہے۔ مگر بھائی، بیٹی، ڈاکٹر، اور شوہر کا اصرار تھا کہ وہ ضرور پہاڑ پر جائے۔ شاید اُن کے اصرار کے سامنے وہ سپر نہ ڈالتی مگر اپنے ساتھی کی گرتی ہوئی صحت کی خاطر اُسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ مگر پیسہ کہاں سے آئے گا؟ سفر میں جب تک کافی پیسے پاس نہ ہوں وہ خوشی سے اس پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ سیاحوں میں جو ولولہ اور "اڈونچر" کا شوق ہوتا ہے وہ اس میں اتنا زیادہ نہ تھا کہ سفر میں ہر دُکھ اور کٹھنائی خوشی سے جھیل لی جائے۔

لیکن تین چار دن پہلے اُن کے پبلشر نے سال بھر کی کتابوں کی سیل کا حساب کر کے اُسے چار سو روپے بھجوا دیئے۔ پیسے روپے کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ چلتے چلتے اُس نے کبھی کبھی کے رکھے ڈھکے تین سو اور روپے بھی بٹوے میں ڈال لیے۔ پردیس میں جانے کیا اُفتاد پڑے؟

رات کچھ سوتے کچھ جاگتے کٹی۔ صبح منہ اندھیرے ٹرین پہاڑ کے دامن میں پہنچ چکی تھی۔ یہاں سے ٹیکسی میں سفر کرنا تھا۔ "آیئے پہلے چائے پی لیں۔" اُسے تھکان اور بے خوابی نے شل کر رکھا تھا۔

"پہلے ٹیکسی میں سب سامان رکھوا دیں۔ پھر اطمینان سے ناشتہ کریں گے۔" میاں نے جواب دیا۔ باہر نکلتے ہی ٹیکسی ڈرائیوروں نے گھیرا۔ دو تین سے پیچھا چھڑایا۔ ایک نوجوان کالی مونچھوں والے ڈرائیور سے بات طے ہو گئی۔ "پچھلی سیٹ کے چالیس روپے ہوں گے۔ آگے دُوسرا مسافر بیٹھے گا۔"

"کیا حرج ہے۔" اُس نے کہا۔ میاں نے سب سامان رکھوایا وہ اندر جا بیٹھی۔ اب پھر اسٹیشن کے اندر جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

"بی بی جی پیسے"۔ قلی نے کہا۔

اُس نے پرس سے دو روپے نکال کر قلی کے ہاتھ میں دیئے اور اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھ گئی۔ سامنے بڑی ٹوکری رکھی جس میں

کھانے کا خالی ڈبہ، تھرماس، گلاس اور لوٹا رکھا تھا۔ پرس کا بوجھ کندھے پر خاصا بار گزر رہا تھا۔ اُسے بھی ٹوکری پر رکھ دیا۔

"میں ابھی آتا ہوں ــ" میاں یہ کہہ کر دوسری طرف چلے گئے۔

اُس نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ یہاں اِدھر اُدھر کئی پولس افسر اور کانسٹبل کھڑے تھے شاید کوئی V.I.P پہاڑ سے اُتر رہا ہے۔ داہنی طرف ڈرائیور کھڑا بیڑی سُلگا رہا تھا اور سامنے کی سیٹ پر ڈھیلے ڈھالے میلے کپڑے پہنے ایک ادھیڑ عمر کا مسافر آ بیٹھا تھا۔

"تیسرا مسافر مل گیا نہیں؟" اُس نے ڈرائیور سے پوچھا

"ہاں ــ کب چلنا ہے ــ" ڈرائیور نے پوچھا

"بس صاحب آجائیں تو ابھی چلتے ہیں۔" وہ جلد سے جلد منزل پر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ایک دم سُورج کی تیز کرنیں اُس کی آنکھوں پر پڑیں! اوہ ــ رنگین عینک تو کالے تھیلے میں ہے ــ "لڑکے" اُس نے باہر کھڑے چھوٹے کلینر لڑکے سے کہا "ذرا ہمارا وہ کالا بیگ تو اُتار دو۔"

لڑکا بیگ نکالنے لگا۔ سامنے بڈھا شریف صورت مسافر بیٹھا تھا۔ داہنی طرف ڈرائیور کھڑا تھا۔ ٹیکسی کا بائیں طرف کا پٹ کھول کر وہ باہر آئی۔ تھیلے کی زپ کھولی اور ہاتھ ڈال کر عینک تلاش کرنے لگی۔

"وہ رکھی ہے بی بی ــ وہ اُدھر" اُس نے چونک کر دیکھا کلینر لڑکا تھیلے میں منہ گھسیڑے دے رہا تھا۔

"تم پرے ہٹو نا" اُس نے جھلّا کر کہا اور تھیلے کی زپ بند کر دی"

"یہ تھیلا اوپر چھت پر رکھ دو۔"

اور پھر ــ جیسے ہی پٹ کھول کر وہ موٹر میں داخل ہوئی۔ اُترنے کے ایک یا ڈیڑھ منٹ بعد ــ اُس کا پرس وہاں نہ تھا۔

"ارے ــ پرس ــ میرا پرس ــ میرا پرس کہاں ہے؟" وہ بالکل حواس باختہ ہو چکی تھی۔ بے خیالی کے ایک لمحے نے اُس کا پرس چوری کرا دیا تھا۔

ڈرائیور، کلینر دونوں موٹر میں پرس اس طرح ڈھونڈھ رہے تھے جیسے کوئی ننھی سی سوئی کھو گئی ہو ــ پرس جس میں تقریباً ایک اٹیچی کیس کا سامان بھرا ہوا تھا۔

"کیا؟ "پرس کھو گیا؟" میاں پریشان نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"کھو نہیں گیا چوری ہو گیا۔"

"چوری ــ کیسی چوری" پیچھے سے ایک آواز آئی۔ ایک لمبا تڑنگا خوش شکل افسر جو ذرا دیر پہلے دوسری طرف کھڑا تھا لپک کر آگے آیا۔ چھوٹا سا چمڑے سے مڑھا ڈنڈا برابر ٹانگ پر مار رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی ــ وہ خاموش تھے۔

"اب تو واپس دلّی بھی نہیں جا سکتے۔" بے لبسی سے اُس نے کہا۔ اُس کے جسم پر کوئی زیور بھی نہ تھا۔ وہ سوگ میں تھی نا؟ بہت سے لوگ اردگرد جمع ہو چکے تھے۔

"کیا ہوا؟ کیسے چوری ہو گیا ــ کیا کیا تھا پرس میں ــ اتنے بہت سے روپے تھے؟ ــ تمہارے ہسبنڈ کہاں چلے گئے تھے؟ ــ کیوں گئے تھے؟ ــ یہاں کون کون کھڑا تھا؟ موٹر سے اُتری ہی کیوں تھیں؟ ــ پرس آخر موٹر میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ ــ اس تھیلے میں تلاش کرو جس سے عینک نکالی تھی ــ" ایک لمبی فردِ جرم اس کے خلاف پولس والے اور ہمدرد لوگ تیار کر چکے تھے۔

موٹر میں کیا کوئی اور بھی بیٹھا تھا؟ مجمع میں سے کسی نے پوچھا

اوہ! یہ تو وہ بھول ہی گئی ــ وہ بڈھا مسافر کہاں ہے جو آگے بیٹھا تھا۔

افسر نے ایک دم پینترا بدلا۔ لال لال آنکھیں نکالیں اور گرج کر کہا۔ "کہاں ہے وہ مسافر"

ڈرائیور نے کچھ سہم کر جواب دیا "وہ ــ وہ تو دوسری گاڑی میں چلا گیا شاید ــ"

"کہاں چلا گیا ــ کیسے چلا گیا ــ دیکھو کسی اور کار میں ہوگا۔ میں ایک ایک کو جیل میں ڈال دوں گا۔ چمڑی ادھیڑ دوں گا۔ چمڑی

تمہاری اور اس کی۔ کیا سمجھا ہے تم نے۔ میرے علاقے میں یوں دیدہ دلیری سے چوری ہو جائے —"

اُسے ذرا اطمینان ہوا — ضرور یہ افسر اس کی چوری برآمد کرالے گا۔ اس میں مشکل بھی کیا ہے۔ سوا اس ڈرائیور اور اس مسافر کے اور کوئی آیا ہی نہیں قریب" اُس نے ہزاروں قصّے اور واقعات سنے تھے پڑھے تھے ان بے ایمانیوں، رشوت ستانیوں اور ناانصافیوں کے جو یہ لوگ چوروں سے مل کر کرتے ہیں — مگر نہیں ایسا بھی کیا اندھیر: چور تو سامنے ہی ہیں۔ اور یہ افسر تو بڑا شریف آدمی لگ رہا ہے! ڈوبتے کو تنکے کا سہارا!

وہ بڈھے مسافر پر گرج رہا تھا جو ابھی کسی جگہ سے لایا گیا تھا "کہاں ہے اِن کا پرس" لال لال آنکھیں نکال کر افسر نے پوچھا۔

"حضور میں کیا جانوں — میں تو موٹر میں بیٹھا تک نہیں۔ آیا تھا۔ پھر چلا گیا"

"یہ غلط کہہ رہے ہیں — میں جب موٹر سے اُتری یہ حضرت آگے بیٹھے تھے — بولو (نا ڈرائیور کیوں۔ بیٹھے تھے نا؟"

"میں خود ہی نہیں تھا — ٹکٹ بنوانے چلا گیا تھا" ڈرائیور نے صاف آنکھوں میں دُھول جھونکی — خوب تو یہ حضرت بھی ملے ہوئے ہیں!

"ہمارے علاقے میں آج تک ایسا نہیں ہوا — ایک ایک کو بندھواؤں گا اور اتنے کوڑے برسیں گے کہ چمڑی اُدھڑ جائے گی۔" وہی روایاتی گیدڑ بھبکیاں۔

"وہ قلی کہاں ہے جو آپ کا سامان لایا تھا۔ اس کا کیا نمبر تھا؟" وہ اُسی کی طرف مڑا۔

قلی بچارے سے کیا مطلب۔ وہ تو مجھ سے پیسے لے کر اُسی وقت چلا گیا تھا۔"

"مگر اس کا نمبر؟"

مجھے نمبر یاد نہیں — میں کبھی قلیوں کے نمبر نہیں دیکھتی۔" اس نے کچھ حیرت کچھ تمسخر سے اُسے دیکھا" بے وقوف عورت معلوم ہوتی ہے" اُس کے چہرے کا انداز کہہ رہا تھا۔

"اے بڈھے ادھر کہاں چلا — چل تھانے میں —" ایک سپاہی نے بڈھے کے کندھے پر ہاتھ رکھا مگر اُس کے چہرے پر کوئی پریشانی تھی نہ غصہ۔

"حضور میں تو چھوٹا موٹا بیوپاری ہوں۔ میری کباڑی کی دکان ہے۔ کیا کوئی چور اُچکا ہوں"

"کانسٹبل اسے اندر تھانے میں لے جاؤ — بیگم صاحب آپ پرس ریل میں تو نہیں بھول آئیں؟"

"نہیں — انھوں نے میرے سامنے قلی کو اس میں سے روپے نکال کر دیئے تھے —" پہلی بار میاں نے زبان کھولی۔

"پرس" میں کہہ رہی ہوں کہ یہاں ٹیکسی میں رکھا تھا اور ایک منٹ کے اندر غائب کیا گیا ہے۔" غصّے میں اس نے جواب دیا۔

"نوٹوں کے نمبر یاد ہیں یا کہیں نوٹ کئے ہیں؟"

"نہیں —" اُس نے جھلا کر کہا۔ کبھی نوٹوں کے نمبر لکھنے کا اُسے دھیان ہی نہ آیا تھا۔ روپیہ ایک ہاتھ سے آنا دوسرے ہاتھ سے چلا جانا۔ نمبر — کیا وہ کوئی سرمایہ دار ہے:

"اور کیا کیا تھا اُس میں؟"

"بتا تو چکی ہوں کہ قلم تھے، چابیاں تھیں، روپے تھے، چھالیہ الائچی پان تھے اور جانے کیا کیا تھا — میرا دماغ کام نہیں کر رہا اس وقت" اس نے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے پاس کئی عورتیں، بچے اور مرد اب بھی کھڑے تھے۔

"ہاں بچاری لٹ گئی"

"بڑی بے پروائی ہے جی — اتنے روپے لے کر چلی اور حفاظت نہ کی" ظاہر ہے قصور اس کا ہی تھا۔

"مرد بڑا شریف دکھتے ہے۔ سب پیسہ عورت ہی کے پاس تھا —" گویا عورت کے غیر شریف ہونے پر مہر لگا دی گئی۔

"ہم تو کبھی ایک جگہ روپے رکھتے ہی نہیں۔ یہ بہت غلطی کی تم نے بہن جی"

ہاں مگر یہ غلطی وہ ہمیشہ سے کرتی آئی تھی اور کبھی ایک روپیہ بھی نہ کھویا تھا — مگر یہ شماتت ہمسایہ نقصانات پر سہارنا ہر ہندوستانی کا حق ہوتا ہے۔ وہ اس سے کیسے محروم رہتی۔ میاں کو پولیس افسر اپنے ساتھ اندر تھانے میں لے گیا اور وہ ڈھائی گھنٹے تک سخت گرمی میں اس چھوٹی سی ٹیکسی میں بیٹھی دھوپ میں تپتی رہی پیٹ میں آگ سی جل رہی تھی، سر بھاری تھا پپوٹے بوجھل۔ میاں کی پریشان حالت کبھی کبھی نظر آجاتی۔ اُن کا بیان دوبارہ بدلوایا جاچکا تھا۔ ڈرائیور اور بڈھا مسافر مزے سے سامنے برآمدے میں بیٹھے بیڑیاں پی کر گپ کر رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر کوئی خاص پریشانی یا فکر نہ تھی۔ شاید اس کی رنگین عینک کی وجہ سے وہ یہ نہیں دیکھ پا رہے تھے کہ وہ اُن کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی ہے۔

"یہ سب حصے دار ہیں ان کی خون پسینے کی کمائی میں" اس نے جھلکتے دل سے سوچا۔

ایک صاحب دتون کرتے ٹیکسی کے پاس آکھڑے ہوئے — اور جھک کر آہستہ سے انگریزی میں کہنے لگے "آپ لوگ جائیے گا نہیں۔ شام تک کل تک، جب تک پرس کا پتہ نہ چل جائے۔ یہیں ٹھہرئیے۔ کیس کی خود تحقیقات ہوشیاری سے کرائیے۔ نہیں تو کچھ بھی پتہ نہیں چلے گا۔" اُن کے لہجے میں ہمدردی بھی اور ذاتی تجربے کی تلخی بھی۔

وہ بے بسی سے انھیں دیکھتی رہی۔

رات سے اس نے چائے نہیں پی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ بس دو چیزوں کے لئے جی بے قرار تھا — گرم گرم چائے اور میٹھی نیند۔

مگر ان دونوں کے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں — پھر اُسے وہ "امام ضامن" یاد آیا جو بیٹی نے چلتے وقت اس کے باندھا تھا۔ بازو پر سے امام ضامن کھولا، ریشمی دھجی اُدھیڑ کر روپیہ نکالا اور کچھ دور ایک چھوٹی سی دوکان پر سے گرم چائے کا ایک گلاس لے کر پھر ٹیکسی میں آن بیٹھی۔ چائے کے دو چار گھونٹوں ہی نے ذہن کی بے حسی کو دور کر دیا۔ اور اُسے اردو لٹریچر میں پڑھے کئی ایسے واقعات یاد آگئے جب ناول کے کسی کردار نے روپیہ کھو کر یا چرا کر یا گھر سے بھاگ کر بھوک کی شدت میں امام ضامن کا روپیہ — جو غریب سید کا حق ہوتا ہے، کھول کر پیٹ کی آگ بجھائی تھی۔ ہنسی آگئی اُسے۔ آج وہ بھی کسی کہانی کا کردار لگ رہی ہے۔

دکان کا لڑکا آکر گلاس لے گیا۔ اس نے سر ٹیکسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ کتنی راتوں کی تھکان اور بے خوابی اس پر ٹوٹ پڑی تھی — مگر — مگر وہ اس وقت سو کیسے سکتی ہے بھلا؟

پھر وہ چونک پڑی — ہائے۔ "وہ کہاں آگئی"۔ آنکھوں کے سامنے کے دھوئیں کا پردا سا دھیرے دھیرے ہٹ رہا تھا۔ وہ کسی اونچی چٹان کی نکیلی چوٹی پر کھڑی تھی۔ کہیں وہ گر نہ جائے — کتنی نیند آرہی ہے اس خطرناک چوٹی پر۔

اس نے آنکھیں پھاڑیں۔ دور تک گھنا دیودار اور چیڑ کا جنگل نظر آرہا تھا۔ ہر پیڑ جیسے باہیں پھیلائے اُسے اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہو — نشیب میں ایک ہری بھری وادی میں آڑو، خوبانی، اخروٹ اور بادام کے پھلوں سے لدے ہوئے درخت اس کے بھوکے پیٹ کو مدعو کر رہے تھے اور پیروں میں رنگ برنگے سُندر پھولوں کا فرش سا بچھا ہوا تھا۔ اور سامنے دور بہت دور — بلندیوں پر پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں اس کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔

مگر نیچے — اس پتھر کی آڑ میں یہ کیا ہے — کون لوگ ہیں یہ — دیکھی دیکھی سی صورتیں! اب وہ ہر حسین شئے، ہر دلکش منظر سے بے نیاز کچھ جھکی ہوئی نیچے کی سمت دیکھ رہی تھی۔

ایک کھڑی اونچی چٹان کے دامن میں بڑے سے گھنے بڑ کی جڑ میں بہت سی چادروں، چیتھڑوں اور ڈبوں ٹوکریوں، رنگ لگے برتنوں اور کوڑے کباڑ کے ڈھیر کے بیچوں بیچ یہ کون مداری بیٹھا ہے؟ ارے یہ تو وہی تیسرا مسافر ہے۔ اور —

اور یہ کون ہے — ٹیکسی ڈرائیور — اُف خدایا اس کی آنکھیں اتنی لال — اس کی مونچھیں اتنی بڑی بڑی کیسے ہوگئیں؟ یہ بندر کی طرح درختوں پر کون بچہ اچھل کود کر رہا ہے۔ وہ کلینر بچہ تو نہیں! ہاں ہاں وہی تو ہے —

"نکالو — جلدی نکالو —" ایک گرج سی سنائی دی۔ اُس نے سہم کر دوسری طرف دیکھا۔ یہ تو وہی "رحم دل" ہے۔ جو اس کی چوری کا پتہ چلانے کی کوشش کر رہا ہے — اور اُس پاس اُسی جیسے مگر کم درجے کے اور کئی آدمی!

بڈھے نے اپنے کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈالا — اور کوئی سیاہ چیز اُچک کر ہوا میں تین چار قلابازیاں کھا کر پھر بڈھے کی گود میں آ پڑی!

"آہ! میرا پرس —" آنکھیں پھٹ گئیں — ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کا خوبصورت آرام دہ پرس — جو اس کی عزیز دوست نے ابھی پچھلے سفر میں اُسے تحفہ میں دیا تھا۔

نیچے گھاٹی میں ہونے والے واقعات اُسے بالکل ایسے معلوم ہو رہے تھے، جیسے پردۂ فلم پر کوئی تصویر دیکھ رہی ہو۔

ایک لمبا تڑنگا شخص بڈھے کے ہاتھ سے پرس اُچک لیتا ہے — اور اس میں ہاتھ ڈال ڈال کر بالکل اس انداز سے چیزیں نکال رہا ہے جیسے جادو کے پٹارے میں سے بازی گر نکالا کرتے ہیں۔

چھالیہ الائچی کا سرخ مخمل کا بٹوہ — وہ اس میں سے ایک پھنکا مار کر زمین پر پھینک دیتا ہے۔ اُس کی بڈھی مہربان بوا نے کس پیار سے اس کے لئے کھوپرا، سونف اور چھالیہ اس میں بھری تھی۔

"یہ کیا ہے — پانوں کی ڈبیا — دلی، لکھنؤ کی عورتوں کو پانوں کا خبط ہوتا ہے —" کوئی کہہ رہا ہے اور اس میں سے نکال کر ایک دم سارے پان منہ میں ڈال لیتا ہے اور پھر تڑپ کر تھوک دیتا ہے۔

آہ! یہ چھوٹی سی نقشین ڈبیا، کشمیر کے بہترین چاندی کا کام کرنے والوں کے آرٹ کا نمونہ — اس کی بھابی جان کا محبت بھرا تحفہ جو آج سے برسوں پہلے انھوں نے کشمیر سے اُسے بھیجا تھا۔ آج اُس کے نقش گھس گئے تھے، رنگ کالا پڑ چکا تھا، مگر اُسے وہ اب بھی اتنی ہی سُندر لگتی — اتنی ہی پیاری — اس کی پیاری بھابی جان کی یاد وابستہ تھی نا اُس سے۔

"پھینکو پرے کیا رکھا ہے اس میں —" مداری ڈبیا کو پرے پھینک دیتا ہے اور ایک اور شخص جھک کر اُٹھا لیتا ہے۔"

"میری استری کو پانوں کا بڑا شوق ہے جی —"

"یہ پن تو دونوں قیمتی ہیں —"

وہ چونک پڑی — آہ! تو یہ قلم بھی ان ظالموں کے ہاتھ لگ گئے۔ یہ پارکر ۵۱ پچھلے ہی مہینے تو بہت اصرار کے بعد اُس نے اپنے شوہر کو خریدوایا تھا — "کیا یہ سستے سستے قلم رکھتے ہیں آپ" کب سے اس کی خواہش تھی کہ اُن کے پاس ایک قیمتی پن ہو — کاش اُس نے رات کو اُن کی جیب سے نکال کر اُسے اپنے پرس میں نہ رکھا ہوتا۔ "آپ کھو دیں گے سفر میں —" کھسیاہٹ کے مارے اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے — اور جب آنکھوں کی دھند چھٹی تو قلم ایک سورما کی جیب میں جا چکا تھا۔ تم سب جاہل ہو — میرا بیٹا بی۔ اے میں پڑھ رہا ہے۔ کب سے پارکر کے لئے کہہ رہا ہے۔ وہ جیسے اپنا دکھ بھول گئی۔ اُف یہ اخلاقی گراوٹ — بی اے میں پڑھنے والے بیٹے کو چوری کا قلم دیا جائے گا۔

"یہ دوسرا قلم مجھے دیدو جی — میری لونڈیا بھی اسکول میں پڑھے ہے۔ یہ تو سستا سا، پرانا سا دکھے ہے۔ اس کا پرانا نیلا شیفر جس کی کیپ کھو گئی تھی اور دوسرے رنگ کی کیپ چڑھی تھی ایک جاہل لٹھ کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا پندرہ برس کا دوست، ساتھی۔ — جانے کیسا جذباتی لگاؤ تھا اُسے اپنے اس پرانے قلم سے کہ دُو دُو نئے قلم ہوتے ہوئے بھی جب وہ کوئی تخلیقی کام کرنے بیٹھتی تو اس قلم کے بغیر ذہن کام ہی نہ کرتا۔ ان گنت مضمون، کہانیاں اور کئی ناول وہ اسی گھسے پٹے قلم سے لکھ چکی تھی اور اب بھی چلتے وقت پرس میں اُس نے یہ قلم اس لئے ڈالا تھا کہ پہاڑ پر جا کر وہ کچھ نئی چیزیں لکھنا چاہ رہی تھی — اُس کے بغیر وہ اپنے کو کچھ ادھورا سا محسوس کیا کرتی — اور اب — اُف — سپاہی کی تلوار ٹوٹ جائے ادیب کا قلم کھو جائے تو؟

کم سن لڑکے نے اس کا قلم اُٹھایا اور پتھر پر لکیریں کھینچنے لگا "ائے ارے۔ کیا کر رہا ہے۔ خراب ہو جائے گا مگر اُس کی آواز کسی نے نہ سُنی۔

"اور یہ ــ یہ کیا ہے اِس چمڑے کے کیس میں؟ کسی نے اُس کا چشمہ ہاتھ میں لے کر کہا "چشمہ ـ عینک ـ اُنہہ بالکل پرانا ـ فریم بھی خراب ہے ـ کہہ رہی تھی کہ مری عینک بھی اِس پرس میں ہے ـ میں تو اندھی ہو جاؤں گی اس کے بغیر ــ" ڈرائیور مذاق اُڑانے کے انداز میں کہہ رہا تھا "یہ پڑھی لکھی استریاں ــ بھگوان اِن سے بچائے" یہ کہہ کر ایک آدمی نے اس کا چشمہ آنکھوں پر لگایا "ارے سچ مچ اندھی ہی لگے ہے ـ کچھ بھی نظر نہ آوے ہے اس سے تو ــ"

اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا ـ وہ اس کے بغیر کیسے کتاب پڑھے گی؟ ــ کیسے کہانی لکھے گی؟ ظالم اُس کی آنکھیں بھی چرالے گئے ـ

"ارے بڑھے روپے نکال روپے" ایک شخص نے غرّا کر کہا پرس اب پھر مداری کے قبضے میں تھا ـ "ابھی اس میں تو یہ بس پندرہ روپے ہیں" اس نے مایوسی سے کہا ـ

"نہیں، نہیں وہ تو رو رہی تھی کہ چھ سات سو روپے ہیں" وہ بولا

"ابھی کہاں روئی ــ ایسی کٹھور عورت ہی ہم نے نہ دیکھی ـ اتنا بڑا نقصان ہوا پر ایک آنسو بھی نہ نکلا ــ"

"موٹی مرغی ہے موئی دو چار سو اس کے لئے کیا چیز ہیں"

مجبور غصے سے وہ کانپ رہی تھی ـ بے درد، بے حس، بد تمیز ـ

"یہ انگوٹھی ــ ادھر دکھائیو" ــ ڈرائیور نے کہا ـ مداری اُسے مٹھی میں چھپا لیا تھا ـ ایک نوجوان نے مداری کی مٹھی کھول کر انگوٹھی نکال لی ـ یہ انگوٹھی میں لوں گا ـ

"صاحب ہیرے کی ہے ہیرے کی" مداری یا کباڑی بولا ـ

ہم نے بھی تو جان جوکھوں میں ڈالی ہے ـ یہ ہیرا ہزار پانسو سے کم کا نہ ہوگا ــ" ڈرائیور نے کہا ـ

"نہیں سو دو سو سے زیادہ کا نہیں ـ بڑے تجربہ کار انداز میں وہ صاحب بولے دم بھر کو انگوٹھی کو چھنگلی میں ڈالا ـ اور پھر کوٹ کے اندر کی جیب میں رکھ لیا ـ

وہ بے اختیار ہنسے جا رہی تھی ـ مہینہ بھر پہلے چار روپے میں اس نے چمکتے سفید رنگ کی یہ انگوٹھی خریدی تھی اور ڈھیلی ہو جانے کی وجہ سے راستے میں پرس میں ڈال لی تھی ـ بیچارا ـ اُسے جھوٹے سچے کی پرکھ ہے ہی کہاں؟

اور پھر ــ سرر ــ سے چھوٹے خانے کا زپ کھولا اور قیمتی چمڑے کا پرانا بٹوہ جو تین طرف اعلیٰ درجہ کی زپ سے بند تھا، مداری کے ہاتھ میں تھا ـ

"آہاہا ــ یہ چیز نکلی ہے ـ اب سب کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی ـ وہ اس کے اندر سو سو اور دس دس کے نوٹ گن رہے تھے ـ اوپر ــ اوپر کھڑی وہ اس منی بیگ کو تکے جا رہی تھی ـ

چار برس پہلے یہ بٹوہ اس نے اپنے پیارے بھائی سے چھین لیا تھا ان دونوں اوپر تلے کے بھائی بہن میں کتنی بے تکلفی، کتنی دوستی، کتنا پیار تھا: جو چیز اُسے پسند آجاتی وہ فوراً اُسے دے دیتے ـ مگر چھیڑ چھیڑ کر ـ ستا ستا کر

"بھیا میری جان ــ یہ پرس مجھے دیدو ـ اوں ـ بھئی تم کیا کروگے میں تو سفر پر جا رہی ہوں ـ پھر یہ اتنا اچھا منی بیگ تمہارے کس کام کا ــ"

وہ انھیں چھیڑنے کو کہہ رہی تھی ــ نہیں تو اس سے زیادہ کون جانتا تھا کہ اچھی چیز کی پرکھ اور ذوق اس کے بھیا سے زیادہ کسی اور کو نہیں ــ خود اُسے تو بالکل ہی نہیں ــ

"دیکھا تم نے یہ ڈاکہ مار لے گئی میرا بیگ" انھوں نے ہنس کر بیوی سے کہا تھا ـ کتنا پیار کتنی اپنائیت تھی اس جملے میں ـ کتنا چاہتے ہیں ــ چاہتے تھے میرے بھیا مجھے ــ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم سیاہ پردہ آگیا ــ" اب یہ محبت کی عظیم دولت وہ کہاں پائے گی؟"

"یہ سو سو روپے کے تین نوٹ ہیں صاحب" ــ "ادھر لاؤ یہ میرے ہیں" اور نوٹ اندر کی جیب میں غائب ہوگئے ـ یہ تین سو روپے کتنی تنگی ترشی کر کے اُس نے وقت بے وقت کے لئے بچائے تھے ــ مگر کس کے وقت بے وقت کے لئے؟

"مگر صاحب ــ؟"

"گھبراتے کیوں ہو ــ" یہ دس دس کے نوٹ کی گڈی بھی تو ہے ـ

گنو کتنے ہیں ؟"

اُنھ گننے کی ضرورت کیا ہے - - چار سو ہیں - ہماری سال بھر کی محنت کا معاوضہ — وہ اسی کے سہارے تو پہاڑ پر آئے ہیں - اپنی اور شوہر کی صحت بحال کرنے — کھوئی انرجی پانے — ذہنی سکون کی تلاش میں - اور اب اسی کے یہ روپے ان سورماؤں میں برابر برابر تقسیم ہو رہے تھے مگر کمسن بچہ پاس کھڑا للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا . . . .

میری ماں بیمار ہے جی — بہن بھائی بھوکے ہیں - مجھے بھی . . . ."

دس کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا گیا۔

" اس بڑے خانہ میں کیا ہے ؟ "

" یہ ایک جالی کا تھیلا ہے — بڑا سندر ہے جی — مجھے دیدو میری ماں خوش ہو جاوے گی " کسی نے کہا۔

کاش یہ تھیلا ہی وہ اپنی لڑکی کو دے دیتی — اس نے مانگا مگر نہیں دیا " پہاڑ سے آکر دیدوں گی ۔ وہاں شاپنگ کے لئے ضرورت ہوگی ۔"

" اور یہ بہت سی تالیاں ہیں —" مداری نے اس کی الماریوں، بکسوں سیف اور کوٹھری کی چابیوں کو نچایا — ایک دردناک سی موسیقی فضا میں بکھر گئی۔

" پھینکو اِن کو —" زور سے اُچھال کر تالیاں کھڈ میں پھینک دی گئیں ۔

" اور یہ ایک پُستک ہے جی —" دیکھوں ؟ — اُردو کی ہے شاید ! — ارے پھینکو پرے کون پڑھے گا اِسے —"

حقارت سے کسی نے کہا - اُس کی برسوں کی محنت، اُس کا پیارا تازہ ناول جس میں اُس نے اپنے دل کا سارا درد، روح کی ساری پیاس کو سمو دیا تھا ۔ حقارت سے سامنے والے کوڑے کے ڈھیر پر پڑا تھا — کتاب کی یہ بے حرمتی ! اس کا دِل بیٹھا جا رہا تھا —

" ارے یہ فوٹو بھی ہے — اِن کے میاں کا تو نا دکھتے — جانے کس کے گلے میں باہیں ڈالے ہے —" اس کا پورا جسم بید کی طرح لرز رہا تھا — پاؤں کے نیچے سے چٹان سرک رہی تھی ۔

آہ ! یہ تو وہ بھول ہی گئی تھی کہ یہ بے بہا دولت بھی اس بدبخت پرس میں تھی ۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت اُس نے جلدی سے الماری کھول کر البم نکالا اور اس میں سے یہ فوٹو نکال کر پرس کی چھوٹی جیب میں رکھ لیا تھا — وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے مسکرا رہے تھے - بھیا کے ہونٹوں پر وہ دلکش معصوم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو اُن کی شخصیت کا ایک حسین جزو تھی ! ایسی مسکراہٹ جو دلی مسرت ہی کے وقت ہونٹوں پر بکھر جاتی ہے — ان دونوں کی اکٹھی یہ آخری تصویر — وہ اس پیارے دلکش محبت بھرے چہرے کو کبھی نہ دیکھ سکے گی - کبھی نہیں ! مگر ان کی ہر تصویر اس کے لیے قرارِ جان ہے — وہ ہاتھ پھیلائے چیختی رہی ۔

" یہ مجھے دے دو — مجھے دے دو — تم سب کچھ لے لو — پر میری یہ تصویر مجھے دیدو —"

اس کی آواز فضا میں بکھر گئی — نیچے کوئی کہہ رہا تھا " تصویر ! یہ خطرناک چیز ہے، پھاڑ کر پھینک دو اِسے !"

قضا و قدر کے بے رحم ہاتھ کی طرح کسی بے درد نے تصویر کو بیچ میں سے دو کر دیا ۔ اُن کو جُدا کر دیا اور پھر . . . . .

ایک ٹکڑا نیچے — نیچے — کسی گہرے کھڈ میں جا گرا — اور دوسرا فضا میں — بلندیوں پر پرواز کر گیا — وہ گردن اُٹھائے ہوا میں اُڑتے اپنے بھائی کی تصویر کے اس پُرزے کو دیکھے جا رہی تھی — دیکھے جا رہی تھی۔

" بی بی — کیا بات ہے — ارے رو رہی ہو تم !" اس کے میاں نے شانہ ہلایا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا اور سارا جسم کانپ رہا تھا ۔"

" کچھ نہیں اُونگھ گئی تھی — شاید کوئی خواب دیکھا تھا "

" کیا اس سے بھی ڈراؤنا جو ہم جاگتے میں دیکھ رہے ہیں " تلخی سے انہوں نے کہا۔

افسر، بڈھا، کباڑی، ڈرائیور اور کئی اور لوگ موٹر کے آس پاس کھڑے تھے۔

" ہم نے ماسٹر صاحب کا بیان لکھ لیا ہے — آپ لوگ اطمینان اور آرام سے پہاڑ پر جائیے ۔"

" اطمینان سے، آرام سے ہنہ ؟"

" جیسے ہی کچھ پتہ چلے گا آپ کے پرس کا ہم آپ کو اطلاع دیں گے ۔ آپ نے نوٹوں کے نمبر نہیں لکھے — یہ بڑی لاپرواہی کی بات تھی — ویسے آپ کی قسمت . . . . "

" جی ہاں — میری قسمت اور دوسروں کی قسمت وہ طنزیہ ہنسی ہنس دی۔ اُسے اپنی چیزوں کی تقدیر معلوم ہو چکی تھی — اور سفر کا انجام



خزاں کی آمد آمد سے موسم ٹھنڈا اور سہانا ہو جاتا ہے، یہی وہ موسم ہے جس میں چنار کے پیڑوں کی رنگت مدھم سرخ اور سنہری ہوتی ہے اور زعفران کے کھیتوں میں ارغوانی پھول لہلہا اٹھتے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے موسم شدت اختیار کرنے لگتا ہے، بعض اوقات دسمبر میں برف پڑنے لگتی ہے سفید بادلوں سے ملفوف فضا میں دھیرے دھیرے سرکتے ہوئے برف کے گالے دن میں چاندنی کا سماں باندھ دیتے ہیں۔ نئے سال کے ساتھ وادی برف کی نقرئی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ ایسے



یں کشمیری عوام تیز تند برفانی ہواؤں او شل کر دینے والے جاڑے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے گھروں میں ہمٹ کے بیٹھ جاتے ہیں ایسے میں ان ن گفتگو کا ایک موضوع یہ بھی ہوتا ہے کہ کونسی لکڑی۔ اخروٹ، بید یا چنار۔۔ زیادہ حرارت بخش ہے۔ اس موسم میں کانگڑی ثیریوں کے دل و دماغ اور جسم کے بے حد قریب ہوتی ہے وسم شدید ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ اُس زمانے میں زندگی اسارا کاروبار منجمد ہو کر رہ جائے بلکہ کشمیری اس سے بڑا ام لیتے ہیں۔ گھر سے نکلنے کے مواقع کم ہونے کی وجہ سے صناع اور ست کار زیادہ توجہ اور تندہی سے کام کرتے ہیں اور صناعی کے مثل نمونے تخلیق کرتے ہیں۔ خواہ وہ اخروٹ کی لکڑی کا کام ہو، پیپر ماشی اور نقاشی کا یا قالین بافی کا کشمیر کے ماہر دستکار موسم سرما میں ی حسین مصنوعات تیار کرتے ہیں۔ سیر و سیاحت کے شوقینوں کے لئے بھی یہ موسم بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔ رف کی دبیز تہہ میں دبی ہر چیز بڑا دلفریب نظارہ پیش کرتی ہے۔ اسی موسم میں برف کے کھیلوں کے شوقین

مختصراً، موسم خواہ کوئی ہو، بہار خزاں یا سرما، کشمیر کی دھرتی ہر موسم میں ایک عجیب حسن اور ایک خاص جاذبیت رکھتی ہے۔





کشیر آتے ہیں۔ بچے، بڑے سبھی برف کے گالوں اور گولوں سے یکساں محظوظ ہوتے ہیں۔ اسکیٹنگ اور اسکینگ کے لیے تو یہ موسم بے مثل ہے۔

قدرت کے برف پوش حسن کے شیدائیوں کے لئے بھی کشیر کا موسم سرما اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ گرم کپڑوں میں ملبوس چاق وچوبند سیلانی قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔





زیب غوری

غزل

میرے وجود کی تنہائی میں کھلے ہیں ترے معطّر ہات
جیسے جھیل پہ رقص کناں ہوں نیل کمل کے متوّر ہات

کیا کیا نازک احساسات کا خوں ہو کے رہ جاتا ہے
یہ کومل سا روپ غزل کا اور یہ فن کے پتھر ہات

خالق کا اپنی تخلیق سے ساتھ نہیں چھٹتا ہے کبھی
جیسے خود پتھر کے صنم میں رہ جاتے ہیں ڈھل کر ہات

بازاروں میں کیسا کیسا مشک چھپائے پھرتا ہوں :
بس جاتے ہیں جب خوشبو میں تری زلف کو چھو کر ہات

یہ بے نور آنکھوں سا کاغذ کب سے ہے ویران پڑا
بند نزولِ شعر و سخن ہے افسردہ ہیں پیمبر ہات

اونچی اونچی سی دیواریں تنکوں سی بہہ جاتی ہیں :
ایک سمندر بن جاتے ہیں جب ہاتوں سے مِل کر ہات

عقدہ کشائی ہے ہستی کی زیبؔ نہ کوئی کارِ جنوں !
اک مدّت سے سمٹے پڑے ہیں اپنے وجود کے اندر ہات

قیصر سرمست





ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانہ
ہست فردِ دفترِ احوال صاحب خانہ

اس شعر کی جامع اور زندہ تفسیر قلعہ گولکنڈہ پیش کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ منہدم اور شکستہ عمارتیں جو مرور زمانہ سے بچ گئی ہیں۔ ان کا ذرہ ذرہ اپنے شباب کی رقت انگیز داستان سناتا ہے۔ یعنی کھنڈر دیکھ کر عمارت کا اور صاحب خانہ کی عظمتِ رفتہ کا خیال آتا ہے قلعہ گولکنڈہ اپنے عہد رفتہ کی جو پُرعظمت کہانی سناتا ہے، اس کا صحیح اندازہ لگانے میں اگر آپ ناکام رہیں تو ایک مغل شہزادے کی اس بات سے اندازہ لگائیے۔ کہ گولکنڈہ اس زمانے میں کیا تھا۔ وہ کہتا ہے۔

"ان محلات میں رہنا تو کجا ان میں چراغ جلانا بھی مشکل ہے۔"

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر جب ناظمِ دکن کی حیثیت سے آیا تو اس نے گولکنڈہ کی نسبت کہا تھا کہ

"یک قطعہ زمین بے مزرعہ نیست"

زرعی لحاظ سے تو گولکنڈہ کا یہ مقام تھا اور معاشی اعتبار سے تو ساری دنیا اسے "ہیروں کی سلطنت" کہتی تھی۔ سلطنت گولکنڈہ سارے ہندوستان میں ایک اور لحاظ سے بھی مشہور تھی اور وہ اسکا ناقابل تسخیر "قلعہ" تھا۔ "قلعہ گولکنڈہ کے کھنڈروں اور آثار میں ایک رفیع المرتبت قوم کی کشمکش حیات اور اس کی قابلِ رشک تہذیب و تمدن کی بے پایاں تاریخ مضمر ہے قطب شاہوں کے زوال اور گولکنڈہ کی تباہی کو آج ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج تک اس کی عظمت کے آثار نمایاں ہیں اور وہ مقناطیسی کشش باقی ہے جس نے دکن کے اس کوہسار کو مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور صاحب کمالوں کا مرکز اور گہوارہ بنا دیا تھا۔ اور اب بھی اس کا روح پرور ماحول اور خوشگوار فضا اہل ذوق کو دور دور سے اس کی زیارت کے لئے کھینچ لاتی ہے"

مآثر عالمگیری اور متعدد تواریخ کے مطالعہ اور نواب نیک نام خاں کی قبر پر نصب کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ میں اُس کو "منگل" کہتے تھے جو غالباً منگلوارم سے بنا ہے۔ اس قلعہ کو ابتداء میں ورنگل کے راجہ دیورائے کے آباؤ اجداد نے مٹی کی دیواروں سے بنایا تھا۔ ۱۳۵۸ء سے ۱۳۷۵ء کے دوران راجہ دیورائے نے ایک عہد نامہ کے تحت سلطان محمد شاہ بہمنی کے حوالے کر دیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے ۱۵۱۸ء تک قلعہ گولکنڈہ بہمنی سلطنت کی تحویل میں رہا۔

سلطان محمد شاہ بہمنی کی موت نے بہمنی سلطنت کی سالمیت کو شدید صدمہ پہنچایا۔ تمام صوبہ داروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے۔ جب بیدر پر "بریدشاہی" سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ ادھر تلنگانہ میں سلطان قلی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے گولکنڈہ کو اپنا دار الحکومت قرار دیا۔ سلطان قلی اگرچہ ۱۴۹۵ء سے صوبہ دار تلنگانہ کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا، قطب شاہی تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں گولکنڈہ کو اپنا مستقر

نہیں بنایا تھا۔ سلطان قلی نے قلعہ اور شہر کی تعمیر سے فارغ ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔ اس بات سے تمام مورخ بالاتفاق متفق ہیں۔ دروازوں کی نسبت زیادہ بڑا ہے آپ بالاحصار دروازے سے گذر چکے ہیں۔ اب آئیے بالاحصار پر چڑھتے ہیں۔ راستے میں جو دوسری عمارتیں مل رہی ہیں۔ انھیں آپ نظر انداز کر دیجئے۔ کیونکہ واپسی میں دیکھ لیں گے۔

بالاحصار بذات خود ایک مستحکم اور عالیشان قلعہ سے کم نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی رفعت و شان اور استحکام سے متاثر ہو کر سلطان قلی قطب شاہ نے اسکو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی بالاحصار کی بعض عمارتیں نہ صرف قابلِ ذکر ہیں بلکہ قابلِ دید بھی ہیں خاص طور پر مشہور و معروف دو منزلہ عمارت جسے عام طور پر "تاناشاہ کی گدی" کہتے ہیں، سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ اس کوہسار کی بلند ترین چوٹی پر قائم ہے اور میلوں سے نظر آتی ہے۔ تاناشاہ کی گدی تک پہنچنے کے لئے آپ کو کئی سو سنگ بستہ سیڑھیوں کو پھلانگنا پڑے گا جنھیں آپ بغیر دم لئے مشکل ہی سے طے کر سکتے ہیں۔ اور اوپر پہنچنے تک آپ کے پیر جواب دے جاتے ہیں۔ مگر اوپر پہنچنے کے بعد جب آپ کی نظر اطراف و اکناف کا جائزہ لیتی ہے تو آپ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی نظر کے سامنے سارا حیدرآباد آجاتا ہے۔ اور تمام نشیب و فراز گڈمڈ ہو کر یکساں ہو جاتے ہیں۔ اور حیدرآباد کی وہ ساری عمارتیں جن کی اونچائی دیکھنے کے لئے آپ کو اپنی گردن کو تکلیف دینی پڑتی ہے، وہ بے حقیقت ہو جاتی ہیں۔ اور اپنی ساری بلندی کے باوجود نظروں سے گر جاتی ہیں۔

میرے لئے گولکنڈہ کی اسی وجہ سے اہمیت نہیں ہے کہ وہ اپنے زمانے کا ناقابلِ تسخیر قلعہ تھا بلکہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قلعہ گولکنڈہ کا چپہ چپہ ہندو مسلم اتحاد و ہم آہنگی کا انمٹ نقش پیش کرتا ہے۔ شاہی محلات اور شاہی نشست گاہ کے قریب مندروں کی موجودگی عجیب سی کیفیت بخشتی ہے۔ گولکنڈہ میں مندروں مسجدوں کی قربت ہمارے لئے یگانگت اور بھائی چارے کا درس دیتی ہے جس کی موجودہ زمانے میں زیادہ ضرورت ہے۔

مندروں، مسجدوں کے بعد ہم کو نگینہ باغ متاثر کرتا ہے۔ جو بالاحصار کے دروازے کے دائیں جانب واقع ہے۔ اس باغ کی اہمیت ہم پر اسی وقت آشکارا ہوتی ہے جب کہ ہم گولکنڈہ کی تاریخ سے واقف ہوں۔ یہی وہ تاریخی باغ ہے جہاں قطب شاہوں کا وفا شعار سپہ سالار عبدالرزاق لاری زخموں سے چور پایا گیا تھا۔

نگینہ باغ کے مقابل محلات شاہی کی بلند و بالا عمارتیں ہیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ان عمارتوں کی طرز تعمیر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نئے آدمی کو مشکل ہی سے نظر آتی ہیں اور نظر آجانے کے بعد آپ ان کی طرف کھنچے چلے

اس کے بعد اس نے اُسے محمد نگر کے نام سے موسوم کیا۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ نے بالکلیہ اپنے قبضہ میں آنے کے بعد گچ اور پتھر سے قلعہ کی فصیل بنوا کر اسے مزید استحکام بخشا۔

قلعہ گولکنڈہ کا ارتفاع چار سو فٹ اور اس کے گرد جو فصیل ہے، اس کی لمبائی چار میل ہے۔ اس فصیل میں جابجا نصف دائرہ کی شکل میں ۸۷ برج ہیں۔ بنظر احتیاط اس کی فصیل میں زیادہ سے زیادہ وزنی اور بڑے پتھر لگائے گئے ہیں۔ آپ کو بعض پتھر ایک ایک ٹن وزنی بھی ملیں گے۔ اس قلعہ میں آٹھ دروازے ہیں جنمیں سے صرف تین یا چار دروازے زیر استعمال ہیں۔ یہ دروازے ان ناموں سے پہچانے جاتے ہیں (۱) فتح دروازہ (۲) مکہ دروازہ (۳) پٹنچیرو دروازہ (۴) بنجارہ دروازہ (۵) جمال دروازہ (۶) موتی دروازہ (۷) بہمنی دروازہ (۸) نیا دروازہ۔ چونکہ فتح دروازے سے مغل فوج قلعہ میں داخل ہوئی تھی، اس لئے اسے خاص مقام اور شہرت حاصل ہے۔ مغل فوج کی فتح سے قبل اس کا کیا نام تھا پتہ نہیں



عظمتِ رفتہ کی علامت: قلعہ گولکنڈہ



قلعۂ گولکنڈہ کا ایک منظر

کیونکہ یہ نام اورنگ زیب کا دیا ہوا ہے۔ اس وقت بھی قلعہ میں داخل ہونے کے لئے فتح دروازے کے اندر سے گزرنا پڑتا ہے۔ فتح دروازے سے گزرتے ہی فوج کی قیام گاہیں، شاہی امرائے کے محلات، مساجد، مادنا کا مندر، بارود کے کوٹھے اور سلاح خانہ وغیرہ اپنی خستہ حالی کے باوجود آپ کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ان میں جامع مسجد، مادنا کا مندر، اور دو منزلہ بارہ دری محفوظ حالت میں ہیں۔ اسی بارہ دری کے ایک گوشہ میں سرنگ ہے۔ جس کے تعلق سے مشہور ہے کہ اس کا اختتام پانچ میل کے فاصلہ پر یعنی گوشہ محل میں ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خاص موقعوں پر شاہی آمد و رفت اسی راستہ سے ہوتی تھی۔ قلعہ میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک تین منزلہ سنگ بستہ عمارت "سلاح خانہ" کی تھی۔ جہاں کسی زمانے میں ہتھیار رکھے جاتے تھے۔ سلاح خانہ کی دائیں جانب آپ کو ان چوکیوں کے کھنڈر نظر آئیں گے جہاں قطب شاہی عہد میں قلعہ کی فوج رہا کرتی تھی

بارہ دری میں متعدد عالیشان حوض بنائے گئے تھے، جو ایک ہی سلسلہ میں دور تک چلے گئے ہیں جنہیں قطب شاہی عہد میں اہل گولکنڈے کی بہترین تفریح گاہ کی حیثیت دی جاتی تھی۔ فتح دروازے سے تھوڑی دور پر دائیں جانب ایک سڑک ہے جو "نو محل" کو جاتی ہے۔ یہ نو محل حقیقت میں نو عمارتیں ہیں جن کے آگے باغوں کا سلسلہ تھا۔ یہ بہت ہی قدیم عمارتیں ہیں ٹیلہ کے اطراف میں ایک بہت ہی اونچی اور مضبوط دیوار ہے جس میں دروازہ ہے۔ جسے "بالاحصار" دروازہ کہتے ہیں۔ یہ دروازہ قلعہ کے دوسرے جاتے ہیں۔ بعض محل اب بھی اچھی حالت میں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گولکنڈہ کے محاصرے کے وقت مغل فوج کا پہلا گولہ ان ہی محلات میں گرا تھا بالاحصار کے اصل دروازے کے قریب دو رویہ عمارتیں نظر آتی ہیں جو حبشی سپاہیوں کی نشست گاہ تھیں جن کے اوپر نقار خانہ تھا۔ نشست گاہ اور نقار خانے کی عمارتیں نقش و نگار کے لحاظ سے نہایت ہی عمدہ اور دیدہ زیب ہیں۔

متذکرہ بالا محلات شاہی کے جھروکے کے نیچے "جلو خانہ عالی"، وسیع و عریض میدان نظر آتا ہے۔ جہاں قطب شاہی دور میں فوجیں سلامی کے لئے جمع ہوا کرتی تھیں۔ جلو خانہ کے وسط میں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جس کا اب صرف نشان ٹوٹی دیواروں کی صورت میں باقی ہے۔ جلو خانہ عالی کی جنوبی جانب قلعہ گولکنڈہ کا وہ مشہور و معروف "کاغذی برج" ہے جس کے انہدام کے لئے مغل فوج کو ناقابلِ بیان مشقت اٹھانی پڑی تھی لیکن قطب شاہی صناعوں نے کمال چابک دستی سے راتوں رات کاغذ کا ایسا برج تیار کر لیا۔ جو اصل کے مماثل تھا۔

قلعہ کی جنوبی جانب شہزادہ محمد اعظم کی فوج کے حملے کے بعد بنظرِ احتیاط ایک برج تعمیر کروا دیا تھا جو "موسیٰ برج" کے نام سے موسوم ہے۔ موسیٰ برج پر جو کتبہ نصب ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ خیرات خاں نے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے امراء میں سے تھے۔ چند ملکیات کنواں اور باغ بنوایا تھا۔ اس برج کی تعمیر کی وجہ کتبہ میں تفصیل سے مندرج ہے۔ یہ برج نیم دائرہ نما اور سہ منزلہ ہے۔ برج کے بڑے پتھروں کو گچ سے مستحکم کیا گیا ہے۔ بعض پتھروں کا وزن ایک ٹن سے زائد ہے۔ اور برج کا ارتفاع تقریباً (۶۵) فٹ ہے۔ اس برج پر ایک کتبہ ہے جس سے ایک اور تاریخی شخصیت موسیٰ خاں محل دار کا حال معلوم ہوتا ہے جو اس جنگ میں بطور وزیر و سپہ سالار مامور تھا۔ ٹولی مسجد اسی موسیٰ خاں کی بنوائی ہوئی ہے۔

موسیٰ برج اور فتح دروازے کے درمیان کسی زمانے میں رفیع الشان عمارتیں رہی ہوں گی مگر اب تو نشان باقی ہیں۔ اس گئی گزری حالت میں بھی "دیوان کا محل" محفوظ اور قابلِ دید ہے جشنوں کی نشست گاہ سے ملحق قلعہ گولکنڈہ کی قدیم ترین مسجد "مسجدِ صفا" ہے۔ اس جامع مسجد کو سلطان قلی قطب الملک نے ۹۲۴ھ میں اس وقت تعمیر کروایا تھا جبکہ وہ صوبہ دار کی حیثیت سے گولکنڈہ میں مقیم تھا۔ اس مسجد کی تعمیر کے ۲۵ سال بعد ولی عہد یار قلی جمشید کے اشارے سے میر محمد ہمدانی قلعدار نے سلطان قلی کو اس وقت قتل کیا جبکہ وہ حالت سجدہ میں تھا۔

مسجدِ صفا اور عاشور خانہ کے عقب سے جو سڑک جاتی ہے اس کے اختتام پر ایک وسیع اور زبردست برج ہے جس کے اوپر "فتح رہبر توپ" رکھی ہوئی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے قطب شاہی گنبدوں اور بالا حصار کے پچھلے حصہ کا نہایت ہی دلکش منظر نظر آتا ہے۔ توپ تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں نہیں ہیں بلکہ ٹیڑھا میڑھا اور جھاڑ جھنکار سے پُر راستہ ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں تھوڑی سی جو مشقت ہوتی ہے۔ وہ اطراف میں نظر آنے والے منظر کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے

بنجارہ دروازے سے پانچ سو گز پرے قطب شاہی گنبدیں ہیں اس کی تفصیل کے لئے علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے) اور جو راستہ آپ کو گنبدوں تک پہنچاتا ہے۔ اسی پر ایک حوض ہے جسے حرفِ عام میں "کٹورا حوض" کہتے ہیں اُسے کٹورا حوض کا نام دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ یہ اپنی وسعت کی وجہ سے چھوٹے موٹے "تالاب" کی ہمسری کرتا ہے۔ سنہ ۱۵۶۰ء میں اسے ابراہیم قطب شاہ نے بنوایا تھا اس حوض میں پانی اس زمانے میں نلوں کے ذریعے ایک چشمہ سے لایا جاتا تھا اور اس سے قدرے فاصلہ پر تھا۔ مرور زمانہ کی وجہ سے نل ٹوٹ چکے ہیں۔ جو حوض لوگوں کی پیاس بجھایا کرتا تھا۔ وہ اب ایک ایک بوند پانی کو ترس رہا ہے۔ اب آپ قلعہ کے اطراف پر سرسری نظر ڈال لیں۔ یہ جو بالا حصار کے نشیب میں جنوب مغرب کی جانب گنبد نظر آرہے ہیں وہ سلطان قطب شاہ کے حرم بھاگ متی اور تارامتی کے ہیں۔ بھاگ متی، پیم متی اور تارامتی قطب شاہی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ بھاگ متی تو وہ ہے جس کی خاطر بھاگ نگر (حیدرآباد) بسایا گیا۔ پیم متی سلطان عبداللہ قطب شاہ کی منکوحہ تھی۔

قلعہ کے چند فرلانگ کے فاصلہ پر "ہتیاں" کا مشہور ترین درخت ہے اس کا تنہ ایک سو سولہ فٹ مدور ہے۔ اسکے تنے کے اندر کھوکھلی جگہ ہے جس میں دس آدمی بہ فراغت بیٹھ سکتے ہیں۔ غرض کہ شہر اور عمارات کی تعمیر میں قطب شاہوں نے جو نفاست دکھائی ہے وہ بذاتِ خود اُن کا بڑا کارنامہ ہے

بقیہ گھاٹ سے بندھی ناؤ

چکنے پر سانپ دیکھ لیا ہو۔ آسمان پر زور سے گڑگڑاہٹ ہوئی اور پھر بجلی کی چمک یہاں سے وہاں تک کوند گئی۔ اُس نے آہستہ آہستہ دکان بڑھانی شروع کی۔ پھر دروازہ بند کیا تالہ لگایا اور ایک طرف کو چل پڑا، موسلادھار بارش شروع ہو چکی تھی۔

دیوالی والے دن سارا قصبہ دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ خوب چہل پہل تھی ــــ حلوائیوں کی دکانوں پر رونق تھی اور سڑکوں پر گہما گہمی ــــ مگر اُس کی دکان بند پڑی تھی۔ اُس کے گاہک آتے، اُس کی دکان کے بند دروازے کو دیکھتے، اور پھر سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے چلے جاتے۔ کوئی نہیں جانتا تھا وہ کہاں چلا گیا ہے۔

اُس کا پڑوسی گھنشیام نانبائی لوگوں کو یہی بتاتا کہ وہ دیوالی کے سیزن کے لئے نئے برتن لینے گیا تھا۔ اُسے آجانا چاہئے تھا ــ مگر نہ جانے کیوں نہیں آیا ــــ"

سریندر پرکاش



گھاٹ سے بندھی ناؤ

کچھ لوگ، کچھ واقعات یا کچھ حادثے ایسے ہوتے ہیں جو بھلائے بھی نہیں بھولتے — وہ بھی ایسا ہی ایک آدمی تھا ہمارے اسکول کی جو گلی بازار سے مڑتی تھی، اسی کے نکڑ پر اس کی دھات کے برتنوں کی دکان تھی۔ دکان جو اس کا گھر بھی تھی۔

جب ہم صبح اسکول جا رہے ہوتے تو وہ اپنی دکان کے چبوترے پر بیٹھا داتن کر رہا ہوتا۔ اور خوب زور زور سے حلق صاف کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا۔ اس کے ناک اور گلے سے عجیب سی طرح کی آوازیں نکلا کرتیں، جو کچھ عرصے کے لئے ہمارے لئے تفریح کا سامان بن جاتیں۔ ہم چاہنے کے باوجود بھی زیادہ دیر وہاں نہ رک سکتے۔ کہ اسکول پہنچنے کی جلدی ہوا کرتی تاکہ لیٹ ہو جانے کی صورت میں اسکول کے دروازے پر بید کی چھڑی لئے کھڑا ہمارا ہیڈ ماسٹر ہمیں "سواگتم" نہ کہے۔ "سواگتم" ہی کہتے تھے ہم اس "کاریہ کرم" کو۔ پہلے پہلے یہ نام کس نے دیا تھا۔ یہ معلوم نہیں۔

جب ہم اسکول سے واپس آ رہے ہوتے تو وہ بڑا چاق چوبند بنا اپنی دکان کی گدّی پر آسن بچھائے بیٹھا ہوتا۔ بچّوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی، وہ ہمیں اشارے سے بلاتا — اور حسبِ معمول ہم سب کے نام اور باپ کا نام پوچھتا۔ ہم ہر روز شرارت سے اپنے نام اور باپوں کے نام بدل بدل کر بتاتے۔ وہ بڑی ادا سے سر ہلاتا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی پُر اسرار سی چمک پیدا ہوتی اور ہونٹوں پر بے ہوئی ہوئی مسکراہٹ رخساروں تک پھیل جاتی۔

ہم اپنی جانب سے اُسے دھوکا دے کر بہت خوش ہوتے لیکن ایک دن اُس نے ہمارا یہ بھرم ختم کیا اور وہ ایسے کہ ہم انتہائی شرمندہ سے ہو گئے۔ وہ کہنے لگا — "ہر روز تم سب کے نام بدل جاتے ہیں۔ اور تمہارے باپوں کے بھی مگر بھولے سے کبھی میرا نام نہیں لیتے تم اپنے باپ کے طور پر — بڑے شیطان ہو!"

وہ ہمیں ہر روز یوں ہدایات دیتا جیسے سچ مچ ہی ہمارا باپ ہو — ارے منوا۔ بھاگ کر گھر جا اور اپنی ماں سے کہہ کہ آج بھنڈی بنا کے رکھے۔ — ابھی آ رہا ہوں میں کھانا کھانے اور دیکھ . . . . اچھا جا دہی میں خود لیتا آؤں گا۔"

ہم میں سے کبھی بھی کسی نے اپنی ماں کو جا کر اس کا پیغام نہ دیا تھا۔ اُس کی ہدایت پر کبھی کسی کے گھر، بھنڈی، کڑھی، کریلے یا بیسن کی روٹی نہیں بنی تھی اور نہ کبھی وہ کسی کے گھر کھانے ہی گیا تھا۔

کبھی، کبھی تو ہم گھر سے کھانا کھا کر کسی کام سے اگر بازار کی طرف آ نکلتے تو اس کی دکان سے تھوڑا فاصلے پر کھڑے ہو کر آواز بھی دے دیتے۔
"بیگن کا بھرتہ بنوایا ہے آؤ کھا لو — اور دوسرا لڑکا کہتا۔ "کٹہل" بنوا کر آیا ہوں تمہارے لئے۔"

وہ اس بات پر چڑ جاتا — وہ اُس سارے معاملوں کو وہیں تک

محدود رکھنا چاہتا تھا، اُس سے آگے نہیں۔ تو کبھی کبھی وہ بھپر کر چلاتا۔ "سالے، حرامی! مذاق اُڑاتا ہے۔ اچھا اپنی ماں سے کہو۔ عمدہ کپڑے پہن کے بیٹھے، ابھی آ رہا ہوں!"

تب ہم قہقہے لگاتے ہوئے بھاگ جاتے کیوں کہ اُس کے ہاتھ میں کوئی باٹ ہوتا کہ مبادا ہماری کھوپڑی کی طرف اُچھال دے۔

اُس کی دُکان کے ساتھ ہی ایک نانبائی کی دکان تھی جس پہ وہ دونوں وقت کھانا کھاتا تھا۔ اُس نانبائی کے ہاں کا بنا ہوا سالن اُسے کبھی پسند نہ آتا، وہ ہمیشہ یہی کہتا۔

"گھنشیام سالن بنانا تمہارے بس کا نہیں ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ لوگ چپ چاپ کیسے تمہارے ہاں کھانا کھا جاتے ہیں۔ اگر تم میری بیوی ہوتے اور ایسا سالن بنا کر تم نے میرے سامنے رکھا ہوتا تو بس برتنوں کی خیر نہ ہوتی"

گھنشیام نانبائی اپنی کھچڑی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے، قدرے ہنس کر کہتا۔

"لالہ اگر میں تمہاری بیوی ہوتا تو بھگوان قسم برتنوں کی پروا ہی نہ کرتا۔۔"

اور وہ اس کی انگیٹھی پر فرائنگ پان میں اپنی پسند کی کوئی چیز جو کہ فوراً تیار ہو سکتی، جیسے کہ تلا ہوا مونگرہ یا پکوڑیاں وغیرہ گھی اور پانی میں اُبالتے ہوئے کہتا۔

"منٹوں میں کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ عورتیں سارا دن رسوئی گھر میں گھسی رہتی ہیں اور جب خاوند گھر پہنچتے ہیں تو یوں منہ بنائے ہوئے ہوتی ہیں جیسے سارا دن پہاڑ کھودتی رہی ہیں۔ مجھے بڑی نفرت ہے اس عورت ذات سے:"

گھنشیام یا اس کی دُکان پر کھانا کھاتا ہوا کوئی گاہک پکار اُٹھتا۔ "لالہ عورت کا منہ بھی دیکھا ہے کبھی؟"

اور وہ اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے کہتا۔ "ہونہہ! عورت کا منہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے — ؟"

ارجن ایک برہمن بیوہ کا انتہائی معصوم لڑکا تھا۔ وہ جب بھی ہمارے ساتھ اُس کی دکان پر سے گذرتا بٹر، بٹر اُسے دیکھتا رہتا اور سب بچوں سے دور کھڑا رہتا۔ اُس نے کبھی اُس پر کوئی آوازہ نہیں کسا تھا اور نہ ہی اُس نے اُس کے گھر کبھی کچھ تیار کرانے کے لیے پیغام بھیجا تھا۔

ایک دن اچانک اُس کی نظر اَرجن پر پڑ گئی — اُس نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر اپنے پاس بلایا۔ جب ارجن قریب آیا تو اُس نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی اَرجن۔!" اس نے آہستہ سے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"پہلے بھی یہی نام بتاتے رہے ہو یا۔ ۔ ۔ ۔"

"جی پہلے آپ نے کبھی نہیں پوچھا:"

"اچھا تو یہ بتاؤ تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟"

"معلوم نہیں، کل ماں سے پوچھ کر آؤں گا!" ارجن نے اپنی مخصوص معصومیت سے جواب دیا اور تمام لڑکے ہنسنے لگے۔

"ابے چپ خرگوشش کی اولاد۔" اُس نے سب بچوں کو ڈانٹا۔ "اچھا تو ارجن بیٹے جب ماں سے باپ کا نام پوچھو گے تو یہ کہہ دینا کہ آج کریلے بنائے گی ہم ابھی آ رہے ہیں دُکان بڑھا کر۔"

کھانے پینے کی چیزوں کی تیاری کے سلسلے میں جو پیغامات وہ لوگوں کے گھروں میں بھجوایا کرتا تھا، نہ کبھی کسی کے گھر وہ پہنچے تھے اور نہ کبھی کہیں اُن کی تعمیل ہوئی تھی۔ لیکن اَرجن نے اپنی ماں سے جا کر کریلے بنانے کے لیے کہہ ہی دیا۔

پہلے اُس کی ماں نے آنا کانی کی۔ مگر بچے نے جب بہت ہی ضد کی تو اُس نے سچ مچ ہی کریلے بنا کر رکھ دیے۔ اور اب ماں اور بیٹا دونوں اپنے مہمان کا انتظار کرنے لگے جب گلیوں میں ایک مکان کا سایہ دوسرے مکان کے قدموں تک پہنچ گیا اور وہ نہ آیا تو اَرجن اُٹھ کر اُس کی دکان پر چلا گیا اس کی ماں بدستور اپنی سلائی مشین پر محلے والوں کے کپڑے سی رہی تھی۔

وہ اپنی دکان کی گدی پر لمبی تانے سو رہا تھا۔ اُس نے ان کے قریب جا کر ایک پاؤں پکڑ کر جھنجھوڑا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"ہونہہ! کیا ہے؟" وہ بوکھلا کر بولا۔

"جی وہ کریلے ماں نے بنا دیئے تھے۔ آپ آئے ہی نہیں!" اَرجن نے بھولے پن سے کہا۔

"آئے نہیں کہاں؟" وہ چونکا۔

"ہمارے گھر جی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ کریلے بنا کے رکھے میری ماں اور ہاں میں اپنے پتا جی کا نام بھی پوچھ آیا ہوں۔ ۔ ۔"

"اوہ — بھئی — دیکھو — ہاں:" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور پھر خاموشی سے ارجن کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر کافی دیر تک دیکھتا ہی رہا۔ — اور آخر اُس کے چہرے پر ساری چمک غائب ہو گئی۔ جیسے بجلی کا بلب گُل ہو جاتا ہے اور اُس نے سر جھکا کر بڑی نقاہت سے کہا۔

"ہمیں نیند آ رہی ہے۔ جاؤ! اور پھر چادر میں منہ ڈھانپ کر سو گیا۔

اَرجن حیرانی سے کافی دیر اُسے دیکھتا رہا۔ اور پھر مونہہ لٹکائے گھر

واپس آگیا۔ وہ بڑی شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا کہ اصرار کر کے اُس نے ماں سے کریلے منوائے مگر اُس کے مہمان نے اُن کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے اُس کے سارے منتشر جذبات مرکوز ہو کر غصے کی شکل میں کھولنے لگے۔ اُس نے کٹوری میں پڑے کریلے اُٹھائے اور واپس اُس کی دُکان پر پہنچا۔ اس کی دُکان برتنوں سے بھری پڑی تھی۔ اُن میں سے اُس نے ایک نئی کٹوری اُٹھائی، کریلے اس میں پلٹے اور کٹوری کو اُس کے سرہانے رکھ کر واپس لوٹ آیا۔

اس دوران میں وہ اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا کر ادھ کھلی آنکھوں سے ارجن کی ساری حرکتیں دیکھتا رہا۔ مگر اُسے جرأت نہ ہوئی کہ اُس پر اپنی بیداری ظاہر کر سکے۔

اُس کے جانے کے بعد وہ اُٹھا اور اُس نے پاس رکھی چمچاتی نئی کٹوری کی طرف دیکھا جس میں جلے ہوئے سیاہ کریلے پڑے تھے۔

"کیا ترکاری بناتی ہیں یہ عورتیں!" وہ بڑبڑایا اور پھر آپ ہی آپ اپنی بدلی ہوئی آواز پر حیران رہ گیا۔ کیسی مُردہ، مُردہ سی آواز تھی وہ۔ اُس نے ایک کریلا اُٹھا کر دیکھا، سونگھا اور پھر دانتوں کے درمیان رکھ کر کاٹا۔ اُس نے اُس کا ذائقہ محسوس کیا اُس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔

ارجن کے گھر سے اُس کے لیے اب باقاعدہ کچھ نہ کچھ بن کر آنے لگا۔ اور وہ بھی اکثر اُس کی دُکان پر بیٹھا ہوا پایا جاتا۔ اب اُس نے راہ جاتے بچّوں کو بُلانا اُن کے باپوں کے نام پوچھنا اور اُن کے گھر میں کوئی سالن ترکاری بنوانے کی فرمائش بھیجنا بند کر دیا تھا۔ ہم سب اُس کی یہ بدلی ہوئی حالت کو دیکھتے تو حیرانی سے اُس کی دُکان کے آگے کھڑے اُس کے چہرے کو گھورتے رہتے اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنا چہرہ ہم سے چھپا رہا ہے۔

شرادھوں کے دن تھے۔ دسہرہ اور دیوالی کی آمد آمد تھی۔ وہ بڑا معروف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی دُکان کے اندر، باہر ہوتا رہتا۔ تختوں پر رکھے برتنوں کا جائزہ لیتا اور جس جس سامان کی کمی تھی اُس کی فہرست مرتب کرتا۔ کہ ہر سال دیوالی پر وہ بہت بڑی دُکان لگایا کرتا تھا۔ اور قصبے کے لوگ اُس کے ہاں سے برتن خریدنے آیا کرتے تھے۔ جب بھی کوئی آدمی اُس سے کچھ بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ رُوکھا سا جواب دیتا "ایسی باتوں کا موقعہ نہیں سیزن کے دن ہیں۔" اور تیزی سے دُکان کے اندر گھس جاتا۔

اُس دن آخری شرادھ تھا۔ ارجن اُس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "ماں نے کہا ہے آج پتاجی کا شرادھ ہے کھانا گھر پر ہی آکر کھائیے!"

"ایسی باتوں کا موقعہ نہیں سیزن کے دن ہیں!" پھر خود ہی رُک کر بولا "نہیں نہیں میں ٹھہر کر آؤں گا۔"

مگر شام تک وہ نہ آیا۔ ارجن اور اُس کی ماں سارا دن انتظار کرتے رہے۔ بے موسم کے بادل سارے آسمان پر چھائے جا رہے تھے۔ کھانا تھال میں پروسا رکھا تھا۔

ارجن اور اُس کی ماں دونوں جب اُس کی دُکان پر پہنچے تو بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ارجن نے دُکان کے چبوترے کے سامنے کھڑے ہو کر گلی کی نکڑ کی طرف اشارہ کیا۔

"ماں بُلا رہی ہے وہاں!"

اُس نے گردن گھما کر اُدھر دیکھا اور پھر دُکان میں گھس گیا۔ ارجن باہر کھڑا اُس کے واپس آنے کا منتظر رہا۔ جب وہ کافی دیر تک نہ آیا تو اُس نے اُسے پُکارا، تب وہ دھیرے، دھیرے قدم اُٹھاتا باہر نکلا۔ چبوترے پر سے کُود کر وہ فٹ پاتھ پر آیا۔

بارش چھم چھم برسنے لگی تھی وہ ارجن کی ماں کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی ساڑھی کے پلّو سے چھوٹا سا گھونگھٹ کاڑھ رکھا تھا۔ سرگوشی کے سے انداز میں وہ بولی "شرادھ تھا آج اُن کا، ارجن کے ہاتھ کہلوا بھی بھیجا تھا۔ مگر آپ آئے نہیں۔ کھانا ابھی تک تھال میں پروسا رکھا ہے۔"

عورت کا اتنا قرب زندگی میں پہلی بار اُسے نصیب ہوا تھا بارش کے قطروں میں اُس کے چہرے پر آئے پسینے کے قطرے مل کر بہہ رہے تھے۔

"جی میں آتا ہوں، ابھی آتا ہوں ابھی کھانا نہیں کھایا میں نے!" اُس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا اور دُکان کی طرف لپکا۔

ارجن اور اُس کی ماں گھر کی طرف بڑھ گئے۔ اُس نے دیکھا وہ دونوں بارش میں پوری طرح بھیگتے جا رہے تھے۔

وہ کافی دیر تک دُکان کے وسط میں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے پُوری دُکان کا جائزہ لیا اور باہر چبوترے پر آکر کھڑا ہو گیا ـــــ وہ انتہائی خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اندھیرے میں کسی نے بجلی

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

غزلیں



اختر علی تلہری

میرا سجدہ قیدیٔ سنگِ درِ جانانہ ہے
توبہ۔ ذوقِ بادہ رہنِ شیشہ و پیمانہ ہے
مسکراتا ہی رہے جو حادثاتِ دہر پر
ایسا دیوانہ حقیقت میں بڑا فرزانہ ہے
پا رہے ہیں اس سے اک تازہ حیات اہلِ چمن
وہ ترے شوریدہ سر کا نغمۂ مستانہ ہے
ہے شہیدانِ وفا کی خاک اور سجدے مرے
کیش اپنا بندگیٔ ہمتِ مردانہ ہے
عقل و دانش کے جنوں کی بدحواسی کچھ نہ پوچھ
ہے کبھی پیشِ نظر کعبہ کبھی بت خانہ ہے
تو نے خود ہی تو خیالِ ماسوا کو دی جگہ
ورنہ تیرا دل تو اس کا خاص خلوت خانہ ہے
کھول ڈالے باتوں ہی باتوں میں اسرارِ حیات
یوں تو کہنے کو یہ مردِ باخدا دیوانہ ہے
دین سے مطلب نہیں دنیا سے میں بیگانہ ہوں
سامنے آنکھوں کے اخترؔ جلوۂ جانانہ ہے

جگر بریلوی

رنگینیاں جگر میں بہت گلستاں کی ہیں
کیا کیا نوازشیں نگہِ مہرباں کی ہیں
دل ہے چمن تو آج چمن گلشنِ نشاط
آئی ہوئی بہاریں نہ جانے کہاں کی ہیں
کیوں جاگتے نہیں ہیں کبھی خفتگانِ خاک
کیسی صدائیں یہ جرسِ کارواں کی ہیں
درپردہ کوئی بانیٔ بیداد اور ہے
بے جا شکایتیں ستمِ آسماں کی ہیں
شمعیں دلوں میں جب سے محبت کی بجھ گئیں
تاریک ساری انجمنیں بھی جہاں کی ہیں
صیاد کی چھری کا ہو یا بجلیوں کا خوف
یکساں ہی صورتیں قفس و آشیاں کی ہیں
دیکھ اے نگاہِ ناز لبوں پر دم آگیا
کیا منزلیں کچھ اور ابھی امتحاں کی ہیں
چاہا انھیں ضرور مگر بے غرض جگر
بے کار ہم سے دشمنیاں آسماں کی ہیں

محمد نعیم ندوی صدیقی



کتب خانہ دارالمصنفین کے چند اہم مخطوطات

مبداء فیاض نے علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا، دارالمصنفین (اعظم گڑھ) اسی شبلی کے حسین خوابوں کی تعبیر اور اُس کی تمناؤں کا فلک رفعت محل ہے۔ یہ صرف شبلی کے حسن اخلاص اور خلوص نیت کا ثمرہ ہے کہ آج دارالمصنفین اپنے علمی و تحقیقی معیار کے لحاظ سے دُنیا کا ایک مستند ترین ادارہ تسلیم کیا جاتا ہے، اور ـــــ بلاشبہ ہندوستان اپنی سرزمین پر اس ادارہ کے وجود پر فخر و ابتہاج سے سربلند کرسکتا ہے۔

دارالمصنفین کے قیام کے وقت اُس کا کتابی سرمایہ کل پانچ چھ الماریوں پر مشتمل تھا، جو بانی ادارہ علامہ شبلی نعمانی کی ملکیت تھیں، ویسے تو مرحوم کے پاس پورا ایک ذاتی کتب خانہ تھا لیکن وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کو وقف کر چکے تھے، اغلبًا اس وقت تک دارالمصنفین کا تخیل اُن کے دماغ میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ بہرحال وہاں سے علیحدگی کے بعد جب یہ بلند و بالا تخیل ذہن میں آیا تو اُس وقت تک سیرت نبوی کی تدوین و تالیف کے سلسلے میں چند سو کتابوں کا ذخیرہ ہو چکا تھا، وہی اس عظیم کتب خانہ کا سنگِ بنیاد بنا، علامہ مرحوم کے بعد اُن کے لائق فخر شاگردوں نے اس اہم ضرورت کی توسیع و تکمیل کی طرف اپنی توجہ منعطف کی اور کتابوں کی سالانہ خریداری کے لئے ایک معقول رقم متعین کی، نیز مولانا سید سلیمان ندوی کے ۱۹۲۱ء کے وفد خلافت والے سفر یورپ سے بھی دارالمصنفین کے کتب خانے کو بہت مدد ملی۔ وہ یورپ کی مطبوعہ عربی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے ساتھ لیتے آئے۔ اس کے علاوہ بعد میں بھی یورپ میں اسلامی علوم کی جو بھی بہترین کتابیں چھپیں اُن کا ایک نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانے میں ضرور آیا اور تا ہنوز اُس کا سلسلہ جاری ہے۔

بہرحال، اس وقت دارالمصنفین کے کتب خانے میں مختلف علوم و فنون کی تقریبًا ... ہزار کتابیں ہیں۔ اس تعداد کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کتب خانے میں مکرر کتب (کتاب کے کئی نسخے) شاید و باید ہی ہیں، نیز تمام کتابیں منتخب اور معیاری ہیں، کیوں کہ دارالمصنفین میں کتابوں کی خریداری کے وقت اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ وہی کتابیں خریدی جائیں جو تصنیفی ضروریات کے لئے کارآمد ہوں۔ اُن میں بھی قدما کی تصنیفات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے، اور ہر فن کی اہم ترین کتابیں جمع کی جاتی ہیں۔ اس حیثیت سے یقینًا دارالمصنفین کے کتب خانے کو ملک کے

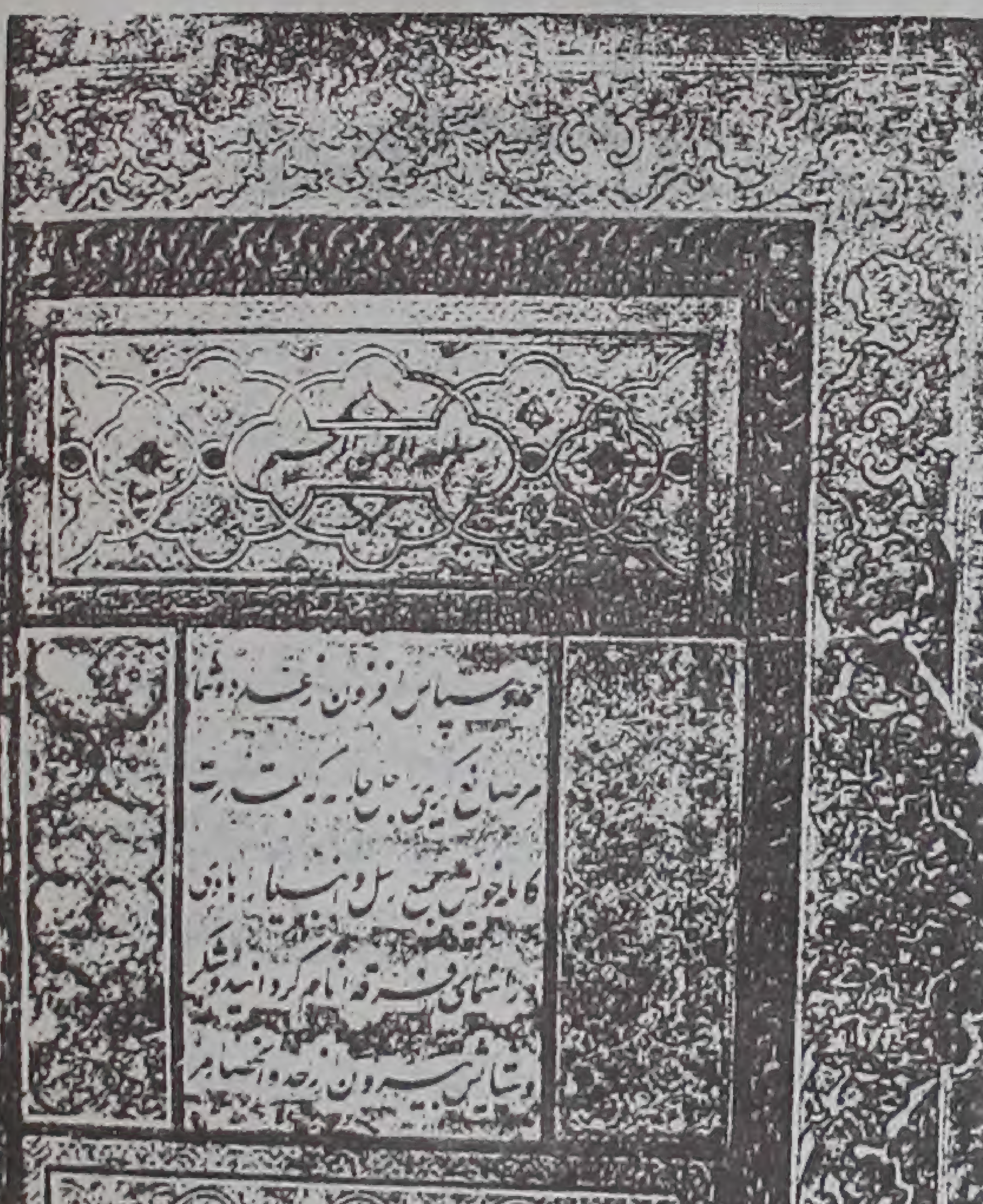
دیگر کتب خانوں پر تفوق اور امتیاز حاصل ہے، اور اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ عربی کتابوں کے ذخیرہ میں تفسیر، حدیث، فقہ، رجال تاریخ، تراجم اور لغت کا اتنا اچھا ذخیرہ دوسرے کتب خانوں میں شاید ہی ملے۔

اسی طرح کتب خانہ دار المصنفین میں قلمی نوادر اور مخطوطات کا بھی ایک قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے اور چھٹی صدی ہجری تک کے قدیم قلمی نسخے اس کتب خانے کی زینت بڑھا رہے ہیں بلاشبہ مخطوطات کے ذخیرے دوسرے کتب خانوں میں بھی اچھے خاصے پائے جاتے ہیں، لیکن دار المصنفین کے کتب خانے میں بعض نوادر ایسے ہیں جن سے ملک کے دیگر کتب خانے خالی ہیں۔ نیز اس کتب خانے کے بعض مخطوطات اس حیثیت سے بھی منفرد ہیں کہ وہ شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکے ہیں اور اُن پر شاہانِ مغلیہ وغیرہ کی مہریں بھی ثبت ہیں۔ اس وقت تمام مخطوطات و نوادر کا استقصا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ذیل میں ہم اس قابلِ قدر کتب خانے کے بعض اہم مخطوطات کا اجمالی تعارف پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس امر کا ہلکا سا اندازہ ہو سکے کہ یہ کتب خانہ کس قدر بیش قیمت، جواہر اور لعل و گہر سے مالا مال ہے اور سرزمین ہند کیسی متاع گراں نمایہ رکھتی ہے تاکہ تحقیق و ریسرچ کے شائقین اِس کتب خانہ کو اپنا مرکزِ توجہ بنا کر اپنی کاوشوں کو علمی غذا بہم پہونچا سکیں،

مونس الارواح مصنفہ جہاں آرا بیگم

یہ کتب خانہ دار المصنفین کی سب سے زیادہ نادر اور قیمتی قلمی کتاب ہے، جو مغل بادشاہ شاہجہاں کی لڑکی جہاں آرا کی تصنیف ہے بشہزادی موصوفہ کو صوفیائے کرام کے ملفوظات سے گہرا شغف تھا، یہ کتاب حضرت معین الدین چشتی اجمیری اور اُن کے نامور جانشینوں کے حالات کے بارے میں ہے، اس میں محض حالات و کرامات ہی درج نہیں بلکہ جابجا رموزِ تصوف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاہزادی نے جس وقت یہ کتاب تصنیف کی تھی اُس کی عمر صرف ۲۶ سال کی تھی، سنہ تصنیف ۱۰۴۹ھ ہے۔

برٹش میوزیم میں اس کتاب کے دو قلمی نسخے موجود ہیں، ایک نسخہ اجمیر میں بھی موجود ہے جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ شاہزادی جہاں آرا کا بھجوایا ہوا ہے، علاوہ ازیں دو ایک نسخوں کا وجود متفرق جگہوں پر اور بھی ملتا ہے۔ لیکن کتب خانہ دار المصنفین کا قلمی نسخہ ان سب پر باایں لحاظ تفوق رکھتا ہے کہ یہ وہ نسخہ ہے جسے خود



مونس الارواح کے پہلے صفحے کا عکس

جہاں آرا بیگم نے دربار کے مشہور خوشنویس عاقل خاں حسینی سے وصلیوں پر لکھوایا تھا اور تمام کتاب کو طلائی نقش و نگار اور زریں افشاں سے مزین کرایا تھا، علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو یہ نسخہ لکھنؤ کے بازار نخاس میں پرانی کتابوں کی ایک دکان سے ۱۹۰۶ء میں محض سَو روپے میں ہاتھ آگیا تھا، اور وہ اُس کو بہت عزیز رکھتے۔

یہ نسخہ پیرس کی نمائش میں بھی ۱۵ ہزار کے بیمہ پر جاچکا ہے۔ اُس کا خط جلی اور نستعلیق ہے، اور اتنا پاکیزہ کہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں، بقول ضیاءالدین برنی "ہم ہندوستانیوں کو اس بات سے خوش ہونا چاہیے کہ علمی موتیوں کی لڑی کا یہ دانہ جو سچی قومی دولت کے مترادف ہے یورپ جانے سے بچ رہا۔" اس کتاب کا سائز ۱۷×۲ ہے، ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں، اور کُل صفحات کی تعداد ۱۴۴ ہے، سنہ کتابت جو عاقل خاں حسینی نے آخر کتاب میں دیا ہے ۱۰۶۱ھ ہے، یعنی تصنیف کے ۱۹ سال بعد۔ سرورق پر علامہ شبلی کے قلم سے یہ عبارت مرقوم ہے۔ "بصد روپیہ خرید کردم، شبلی لکھنؤ ۱۹۰۶ء"

۲۔ انیس الحُجّاج مصنفہ: ملا صفی الدین اردبیلی

ملا صاحب شاہزادی زیب النساء کے درباری علماء میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، بلکہ بعض روایتوں کے مطابق وہ شاہزادی کے اُستاد بھی تھے۔ انیس الحجاج انہی کا سفرنامۂ حج ہے۔ یہ سفرنامہ اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان کا پہلا اور بہت ہی نایاب سفرنامہ ہے۔ ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں اس کا سراغ نہیں ملتا، ہاں برٹش میوزیم کے کیٹلاگ کے مطابق وہاں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ دارالمصنفین کا یہ نسخہ نہایت قدیم، مصور اور خوشخط ہے، قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ مصنف کے قریبی عہد کا ہے۔ اس کا سائز ۲۰×۳۰/۴ ہے، صفحات ۵۵، کاغذ دبیز بادامی، جدول مطلّی اور خط نستعلیق ہے، علاوہ ازیں اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ سفر کے مختلف مقامات و مناظر کی انیس ۱۹ تصویریں بھی درمیان میں شامل ہیں جو سب بالکل تروتازہ اور تیموری دور کی مصوری کا اچھا نمونہ ہیں۔ مرورِ وقت کے باوجود اُن کے رنگ و روغن میں اب تک فرق نہیں آیا ہے۔

۳۔ تذکرہ مخزن الغرائب مصنفہ: مُلّا احمد علی ہاشمی سندیلوی

اس کتاب کا بھی ایک قلمی نسخہ یہاں ہے۔ یہ لمبی تقطیع کے ۱۰۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لکھنؤ کے کسی خاندان سے یہاں منتقل ہوکر آیا ہے، علامہ شبلی مرحوم کا خرید کردہ ہے، سنہ تصنیف ۱۲۱۸ھ ہے، اور یہ نسخہ ۱۲۲۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ گویا مصنف ہی کی زندگی کا ہے۔ اس میں حروف ہجائی ترتیب سے عجم و ہند کے سرمایہ کے فارسی گو شعراء کے سوانح اور انتخابات اشعار بھی درج ہیں۔ گویا یہ بقول علامہ سید سلیمان ندوی " فارسی گو شعراء کے ناموں کی انسائیکلو پیڈیا اور ہندوستان کی تالیف کردہ مجمع الفصحاء ہے" تذکرہ کی زبان فارسی ہے۔

۴۔ اکبرنامہ : مصنفہ: ابوالفضل علامی

اس کا بھی ایک نادر اور مصوّر قلمی نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے، سنہ کتابت درج نہیں۔ تقطیع لمبی ہے، سرورق پر ایک مٹی ہوئی مہر بھی ہے، جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ کسی شاہی کتب خانہ کی زینت رہا ہوگا۔ اگر یہ مہر واضح ہوتی تو اس کتاب کی قیمت بہت بڑھ جاتی۔ اس کے اندر ہاتھ کی بنی ہوئی بہت سی تصویریں بھی ہیں، جو اپنی صفائی، نفاست اور خوبصورتی میں مغل آرٹ کا بیش بہا خزانہ ہیں، فی الواقع دیکھ کر انتہائی حیرت و استعجاب ہوتا ہے کہ ان تصویروں میں کون سے رنگ و روغن استعمال کئے گئے ہیں جن پر کہنگی کا دُور دُور اثر نہیں ملتا۔ ابھی اسی طرح تروتازہ جیسے ابھی کل ہی کی بنائی ہوئی ہوں، ان تصویروں کے متعلق بعض اہل نظر کا خیال ہے، کہ یہ جہانگیر کے عہد کی ہیں۔

۵۔ کلیات کلیم

چھوٹی تقطیع کی یہ کتاب دربار شاہجہانی کے مشہور شاعر

ابو طالب کلیم کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس کی کتابت عہدِ شاہجہانی ہی میں ہوئی۔ آخر میں سنہ کتابت ۱۰۸۰ھ مندرج ہے، خط ایسا پاکیزہ اور صاف ستھرا کہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جائیں۔ پہلے صفحہ پر خوبصورت سنہرا کام بنا ہوا ہے اور پھر ہر صفحہ پر طلائی جدول ہے، جس سے کتاب کا حسن بہت بڑھ گیا ہے۔

۶۔ سرِّ اکبر از داراشکوہ

یہ اپنشد کا فارسی ترجمہ ہے جو شاہزادہ داراشکوہ نے کیا ہے۔ جا بجا اوراق کرم خوردہ ہیں، نیز امتدادِ زمانہ کی وجہ سے کاغذ کی رنگت بھی تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کتاب کو داراشکوہ نے بجائے بسم اللہ کے اوم 3 بنا کر شروع کیا ہے، سنہ کتابت ۱۰۶۷ھ مندرج ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں ایران سے چھپ کر شائع بھی ہو چکی ہے جسے ڈاکٹر تاراچند سابق سفیر حکومت ہند برائے ایران اور وہاں کے ایک اہلِ علم سید محمد رضا جلالی نائینی وکیل پایہ یک دادگستری نے مل کر ایڈٹ کیا ہے۔

۷۔ شرح نہج البلاغۃ

مصنفہ: عزیز الدین بن عبد الحمید مدائنی (م ۶۵۵ھ)

یہ علم کلام کی قلمی کتاب ہے، امتدادِ زمانہ کی بنا پر کاغذ پر کہنگی کے اثرات نمایاں ہیں، لیکن شانِ خط بہت عمدہ ہے، صفحات کی تعداد ۲۰۰ ہے اور ہر صفحہ پر ۲۹ سطریں ہیں۔ اصل تصنیف اور اس کی شرح کو متمائز کرنے کے لئے "الاصل" اور "الشرح" کو سرخی سے لکھا گیا ہے کتاب کا یہ نسخہ بہت سے علم دوست امرا کے کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے۔ سر ورق پر شاہان گولکنڈہ کی مہریں کتاب کی قدر و قیمت میں دو چند اضافہ کر رہی ہیں۔

۸۔ تفسیر مواہب علیہ

مصنفہ ملا حسین واعظ کاشفی (م ۹۱۰ھ)

یہ پورے کلام پاک کی فارسی زبان میں قلمی تفسیر ہے۔ ابتدائی دو صفحے مطلیٰ ہیں، علاوہ ازیں ہر صفحہ پر طلائی جدول ہے، جس کی وجہ سے کتاب کا حسن بڑھ گیا ہے، خط بہت پاکیزہ، صاف اور دیدہ زیب ہے، کتاب کا یہ نسخہ مصنف کی وفات کے کل ۳۶ برس بعد یعنی ۹۴۶ھ کا مکتوبہ ہے۔ شروع اور آخر میں ایک مدور مٹی ہوئی مہر بھی موجود ہے، آخری سطور میں کتابت کی تصریح ہے کہ ۹۴۶ھ میں کتابت ہوئی، کاتب کا نام سلیمان مندرج ہے۔

ہر سورہ کے آغاز میں انتہائی حسین سنہرا کام بنا ہوا ہے جس میں سورہ کا نام نیز دیگر متعلقہ تفصیلات خطِ جلی میں مرقوم ہیں، گو صفحات کی تعداد درج نہیں تاہم بہت ضخیم ہے۔

۹۔ کتاب الجمل مصنفہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن زجاجی (م ۳۳۹ھ)

یہ کتب خانہ دارالمصنفین کے خزانۂ مخطوطات کا سب سے قدیم نسخہ ہے، جو ۱۸۷ھ کا مکتوبہ ہے۔ عربی گرامر کی تصنیف ہے، مرور زمانہ کی وجہ سے اوراق نہایت بوسیدہ ہو گئے ہیں۔ سرورق پر علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریر ہے۔

۱۰۔ دانش نامۂ جہاں مصنفہ حکیم غیاث الدین علی (سنہ ۶۰۰ھ)

چھوٹی تقطیع کا یہ مخطوطہ فلسفہ کے مسائل و تشریحات کے بیان میں ہے، گو امتدادِ وقت سے کاغذ کرم خوردہ اور بوسیدہ ہو گیا ہے، تاہم خط اتنا واضح ہے کہ بخوبی پڑھا جا سکتا ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۲۸ ہے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ مصنف کے قریبی عہد کا مخطوطہ ہے۔

۱۱۔ نظام الغریب مصنفہ علی بن عیسیٰ بن ابراہیم

یہ لغت سے متعلق نہایت قدیم قلمی نسخہ ہے۔ ابتدا میں تین مدور مہریں بھی ثبت ہیں۔ جن پر "الفقیر عبدالقادر" کندہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اس نام کے کسی صاحب کی ملکیت رہ چکا ہے۔ تقطیع خورد اور تعداد صفحات ۱۹۰ ہے، آخر میں تاریخ و سنہ کتابت ۲۷ شعبان ۹۹۸ھ مندرج ہے، کاتب کا نام بھی لکھا ہوا ہے مگر وہ پڑھا نہ جا سکا۔

۱۲۔ التوضیح :۔ مصنف کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

یہ کتاب علم طب میں ہے، بوسیدہ اور جا بہ جا آب رسیدہ ہے، تاہم سوادِ تحریر واضح اور صاف ہے۔ تقطیع کلاں ہے اور صفحات کی تعداد مندرج نہیں۔ اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سرِ ورق پر رفیع الدرجات ۱۱۳۱ھ اور شہنشاہ عالمگیر ۱۰۸۹ھ کی مہریں نیز حکیم علوی خاں کے دستخط ثبت ہیں۔ جس کی بنا پر قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی کتب خانے کی زینت رہا ہوگا۔ اوراق کی بوسیدگی کی بنا پر مضبوط کاغذ کی پیوند کاری کی گئی ہے۔ آخری صفحہ پر بھی تین عدد محو شدہ مہریں ہیں۔

۱۳۔ دلائل الخیرات مصنف، ابو عبداللہ محمد بن سلیمان سملالی حسینی (م ۸۷۰ھ)

یہ درسِ نظامی کی مشہور کتاب کا قلمی نسخہ ہے۔ اس میں مصنف نے رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ التسلیم پر متفرق صلوٰۃ وسلام کو یکجا کر دیا ہے۔ پوری کتاب مطلی ہے اور جا بہ جا پورا صفحہ زرافشاں سے مزین ہے۔ شانِ خط اتنا خوشنما، دیدہ زیب، پاکیزہ ہے کہ دیکھکر آنکھیں روشن اور دل خوش ہوجاتا ہے، تقطیع خورد اور بارھویں صدی ہجری کی مکتوبہ ہے۔

۱۴۔ الیواقیت والجواھر: مصنفہ عبدالوہاب شعرانی (م ۹۷۳ھ)

یہ فنِ کلام کی تصنیف کا بہت قدیم نسخہ ہے، تقطیع کلاں اور ضخامت ۵۶۵ صفحات ہے، گرچہ اوراق کرم خوردہ ہیں تاہم پڑھنے سے مطلب واضح ہوجاتا ہے، پوری کتاب میں طلائی جدول حسن میں اضافہ کررہا ہے، کاتب کا نام آخر میں محمد علی خاموشی بن سلطان حسین مرقوم ہے۔ چونکہ آخری صفحے کا زیریں حصہ کچھ غائب ہے اس لئے سنہ کتابت کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

۱۵۔ شفا قاضی عیاض

یہ مخطوطہ بارہویں صدی ہجری کا ہے۔ تقطیع خورد ہے۔ صفحات درج نہیں، پوری کتاب میں موٹا طلائی جدول ہے۔ زبان عربی اور خط بہت پاکیزہ وواضح ہے۔ کاتب کا نام احمد بن محمد ہے اور آخر کتاب میں کتابت سے فراغت کی تاریخ ۲۹، ذی قعدہ ۱۱۵۷ھ مرقوم ہے۔ سرِ ورق پر پانچ چھ مہریں بھی ثبت ہیں، اغلباً ان لوگوں کی ملکیت میں یہ کتاب رہ چکی ہے۔

۱۶۔ فرہنگِ جہانگیری: مصنفہ جمال الدین حسین انجو

اس کتاب کا بھی ایک قلمی نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ لمبی تقطیع کے چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اوراق آب رسیدہ اور جا بہ جا کرم خوردہ ہیں۔ اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر شاہجہاں کے وزیر لطف اللہ بن سعداللہ کی مہر ۱۰۷۰ھ ثبت ہے، اغلباً اسی عہد یعنی گیارہویں صدی کی مکتوبہ ہے۔

۱۷۔ مثنوی فتوح الحرمین مصنفہ مولانا جامی

چھوٹی تقطیع کا یہ مخطوطہ اس حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے سرِ ورق پر شاہجہاں اور اعتماد الدولہ کی چھ عدد مہریں ثبت ہیں، جو سب کی سب مدور ہیں۔ پوری کتاب طلائی جدول سے مزین ہے۔ جا بجا مقاماتِ مقدسہ کی سنہری تصویریں بھی ہاتھ سے بنی ہوئی ہیں جو امتدادِ زمانہ کی بنا پر دھندلی پڑ گئی ہیں۔ آخری صفحہ پر رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے نعلین مبارک کی شبیہ بھی بنی ہے جس کے اوپر یہ شعر لکھا ہوا ہے،

کرد نعلین مصطفیٰ باشد
شرف تکملہ کلاہ ہمہ :

پوری کتاب کا خط صاف اور پاکیزہ ہے۔

۱۸۔ تحریر اقلیدس : مصنفہ نصیر الدین طوسی

متوسط تقطیع کی اس کتاب کا سنہ کتابت ۱۰۴۹ھ ہے۔ کاتب کا نام آخر میں خواجگی رضوان شیرازی مذکور ہے۔ اس نسخہ میں جا بہ جا اقلیدس کے نقشے بھی شامل ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس پر شہنشاہ

(باقی صفحہ ۱۱ پر)



غزلیں

کیف احمد صدیقی

عارض و زلف کی خوشبو سے معطر یادیں
گلشنِ دل میں کھلیں مثلِ گلِ تر یادیں
پہلے رخسار کے پھولوں کی طرح نازک تھیں
اب ترے دل کی طرح بن گئیں پتھر یادیں
جب مرے سر پہ چمکتا ہے دکھوں کا سورج
تان دیتی ہیں ترے پیار کی چادر یادیں
وہی انداز وہی شکل وہی ناز و ادا!
بن گئیں جیسے مجسم ترا پیکر یادیں
درِ ماضی پہ کسی درد کی دستک سن کر
کھول دیتی ہیں خیالات کا دفتر یادیں
یہ وہی شہرِ طلسمات ہے یا شہرِ جنوں
مجھ کو آخر کہاں لے آئیں فسوں گر یادیں
اپنے ہاتھوں میں تمناؤں کی مالا لے کر
دل کے دربار میں رہتی ہیں سوئمبر یادیں

طلحہ رضوی برق

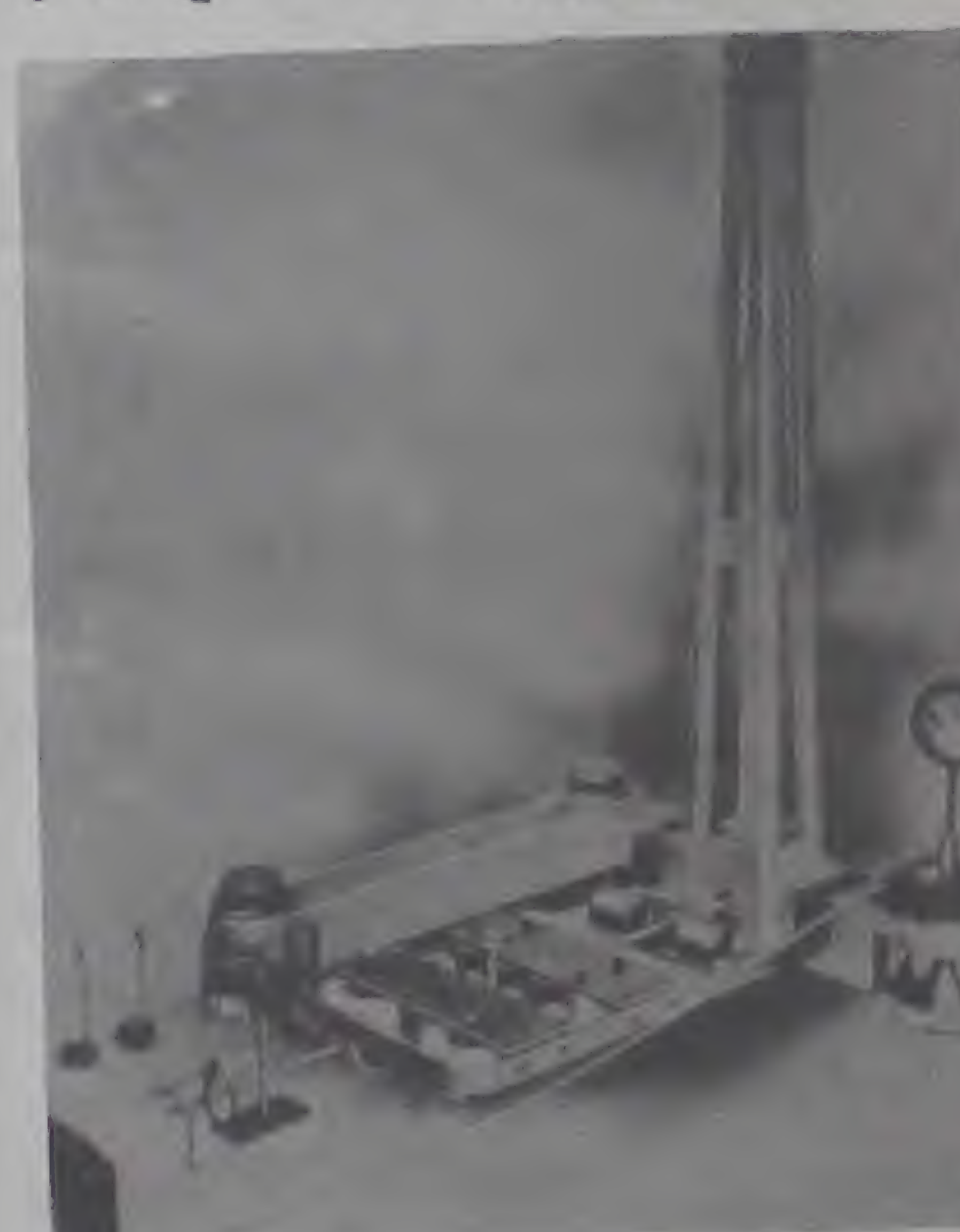
متاعِ جرأتِ دل وقفِ یک نگاہِ کرم
وجودِ بے سروساماں رہینِ ملکِ عدم
خیالِ عارضِ تاباں و قلبِ خوں گشتہ
شعاعِ مہرِ درخشاں کی زد پہ ہے شبنم
مری حکایتِ ہستی مرا یہ قصۂ شوق
ہے ماجرائے جنوں داستانِ حدث و قدم
سنا ہے اہلِ جنوں وقت سے بھی تیز گئے
ہیں ثبت سینۂ ایام پر نقوشِ قدم
چمک رہا ہے نگاہوں میں آج تک خنجر
نہ پوچھئے کسی بسمل کے شوق کا عالم
اخیر رسم بھی شہرِ وفا کی ختم ہوئی
وہاں زخم پہ کوئی نہ رکھ سکا مرہم!
کسی کو یاد نہیں برق انیس کا مصرع
"خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم"

محی الدین ہاشمی



زلزلہ

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے اور سورج کے اطراف سالانہ گردش بھی کرتی ہے۔ زمین کے مختلف قطعات، طبقات بھی کسی نہ کسی قسم کی غیر محسوس حرکت میں مصروف ہیں بعض اوقات ان حرکات و سکنات میں شدت پیدا ہو جاتی ہے جنہیں ہم آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں ان حرکات کو آتش فشاں، ارتعاش زمین اور زلزلے کہتے ہیں اُن کی وجہ سے زمین تہ و بالا ہو جاتی ہے اور شدید جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ ان غیر معمولی حرکات و سکنات میں زلزلہ سب سے اہم ہے



سیسموگراف
(زلزلہ پیما)

محققین کا خیال ہے کہ ہر سال اس کرۂ ارض پر کم و بیش دس لاکھ زلزلے بشمول ارتعاش زمین آتے ہیں۔ ان میں سے بڑی تعداد کو صرف طاقتور زلزلہ پیما ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اندازاً ہر سال ۲۰ زلزلے اس کرۂ زمین پر ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے معمولی سا جانی و مالی نقصان ہو جاتا ہے۔ ہر سال کم از کم ایک زلزلہ ایسا وجود میں آجاتا ہے جس کی وجہ سے کافی جانی و مالی نقصان ہوتا ہے اور دُنیا کے تمام اخبارات میں اس کی خبریں شائع ہوتی ہیں ــــ جس طرح سطح زمین اپنی بناوٹ، رنگ، سختی، زرخیزی وغیرہ کے اعتبار سے ہر مقام پر علیحدٰہ علیحدہ ہے، اسی طرح اندرونی طبقات الارض بھی مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں جس طرح پیاز کے چھلکے ہوتے ہیں۔ اسی طرح زمین کے بھی پرت یا طبقات ہوتے ہیں جس طرح پیاز نشو و نما پا کر وسعت و حجم میں اضافہ کرتی ہے اور پھر سوکھنے پر سکڑ جاتی ہے بعینہٖ زمین بھی اسی طرح سکڑتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ لیکن یہ پھیلاؤ مختلف مقامات پر مختلف انداز کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کے تمام علاقے مساوی طور پر زلزلے سے متاثر نہیں ہوتے۔ زلزلوں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ زلزلے بحر الکاہل میں آتے ہیں۔ زلزلے کے اس خطے میں امریکہ کا مغربی ساحل ایشیا کا مشرقی ساحل، نیوزی لینڈ اور اس کے آس پاس کے جزائر شامل ہیں۔

دوسرے خطے میں جزائر شرق الہند، وسط ایشیا کے پہاڑی علاقے، یونان، اٹلی اور اسپین شامل ہیں۔ تیسرا خطہ زیادہ اہم نہیں ہے اس لئے کہ یہ پورے کا پورا شمالاً جنوباً بحر اوقیانوس میں واقع ہے جہاں ان زلزلوں کے سبب ہر روز کئی ہزار جزیرے وجود میں آتے ہیں۔ اور دیگر کئی ہزار جزیرے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں زلزلوں کو کبھی بھی زمین کی طبعی حرکت نہیں سمجھا گیا بلکہ ہمیشہ اُسے عذابِ خداوندی سے تعبیر کیا گیا۔ نہ صرف ارسطو، پلنی، اور چینی فلاسفروں نے بلکہ ۱۸ ویں صدی کے تمام بڑے بڑے محققین نے بھی زلزلے کو زمین کی اندرونی بھاپ کا خروج بتلایا ہے۔ ان نظریوں کے علاوہ دُنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں بعض نہایت مضحکہ خیز تصورات و اعتقادات زلزلے کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں آج بھی بڑی بوڑھیوں کا خیال ہے کہ یہ دُنیا گائے کے ایک سینگ پر ٹکی ہوئی ہے جب وہ تھک جاتی ہے تو زمین کو اُچھال کر دوسرے سینگ پر لے لیتی ہے جس کی وجہ سے جھٹکا پیدا ہوتا ہے جسے ہم زلزلہ کہتے ہیں۔ اسی طرح کے خیالات جاپان، منگولیا، اٹلی اور امریکہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ فرق صرف جانور کا ہے۔ بعض جگہ یہ ہاتھی ہے۔ بعض جگہ مچھر، بعض جگہ کچھوا اور بعض جگہ غیر معروف یا فرضی جانور ہے۔ یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ میں جب نشاۃ ثانیہ کا عروج تھا اور پروٹسٹنٹ مذہب وجود میں آرہا تھا تو عام طور پر عوام کا یہی عقیدہ تھا کہ یہ عتاب الٰہی ہے۔ شہنشاہ جٹینائن کا خیال تھا کہ جنسی بے راہ روی اور بلاوجہ سر کی قسم کھانے کے باعث زلزلے پیدا ہوتے ہیں۔ چناں چہ ان دونوں جرائم کی سزا پھانسی مقرر کی تھی۔

۱۷ ویں صدی کے محققین کا خیال تھا کہ زمین کے اندرونی طبقات سے قوت، برق اور کیمیاوی اجزاء کے خروج کی وجہ سے زلزلے پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۵۵۰ء میں اطالوی محقق و مینو کیو، بونگوکیو نے زلزلے پر ۱۰ جلدیں لکھیں جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ گیسوں (بخارات) کے دھماکے اور اس کے اخراج کی وجہ سے زلزلے پیدا ہوتے ہیں۔ زلزلوں کی وجوہات کے متعلق ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ گندھک، بٹومن، چونا وغیرہ جیسے کیمیاوی اجزاء میں پانی یا دیگر مائع اجزاء شامل ہو جائیں یا اُن پر بہت دباؤ پڑے تو غیر معمولی تپش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بھاپ سطح زمین کی طرف پرواز کرنے کی کوشش کرتی ہے جب اسے کوئی چھوٹا سا قطعۂ ارض کمزور زمین کا مل جائے تو اُسے پھاڑ کر باہر نکلتی ہے جسے ہم زلزلہ کہتے ہیں۔ یہ خیال سب سے پہلے اٹلی کے سائنسداں لسٹر نے ۱۶۸۳ء میں پیش کیا تھا۔ ۱۷۰۳ء میں لیمیری نے ان مختلف چیزوں کی آمیزش مصنوعی طور زمین کے اندر کی جس کی وجہ سے مختصر سے قطعۂ ارض پر زلزلے جیسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی صدی کے نصف میں گیسنڈی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ زلزلوں سے برقی قوت پیدا ہو گئی تھی بعض بڑے بڑے زلزلوں میں یہ قوت ۲۰۰،۰۰۰ میلین ٹن TNT سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ ایسے زلزلوں میں ۲۰۰ کیلومیٹر تک کا علاقہ کلیتاً تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور زلزلے کی گہرائی ۱۰۰ سے ۷۰۰ کیلومیٹر تک ہوتی ہے۔

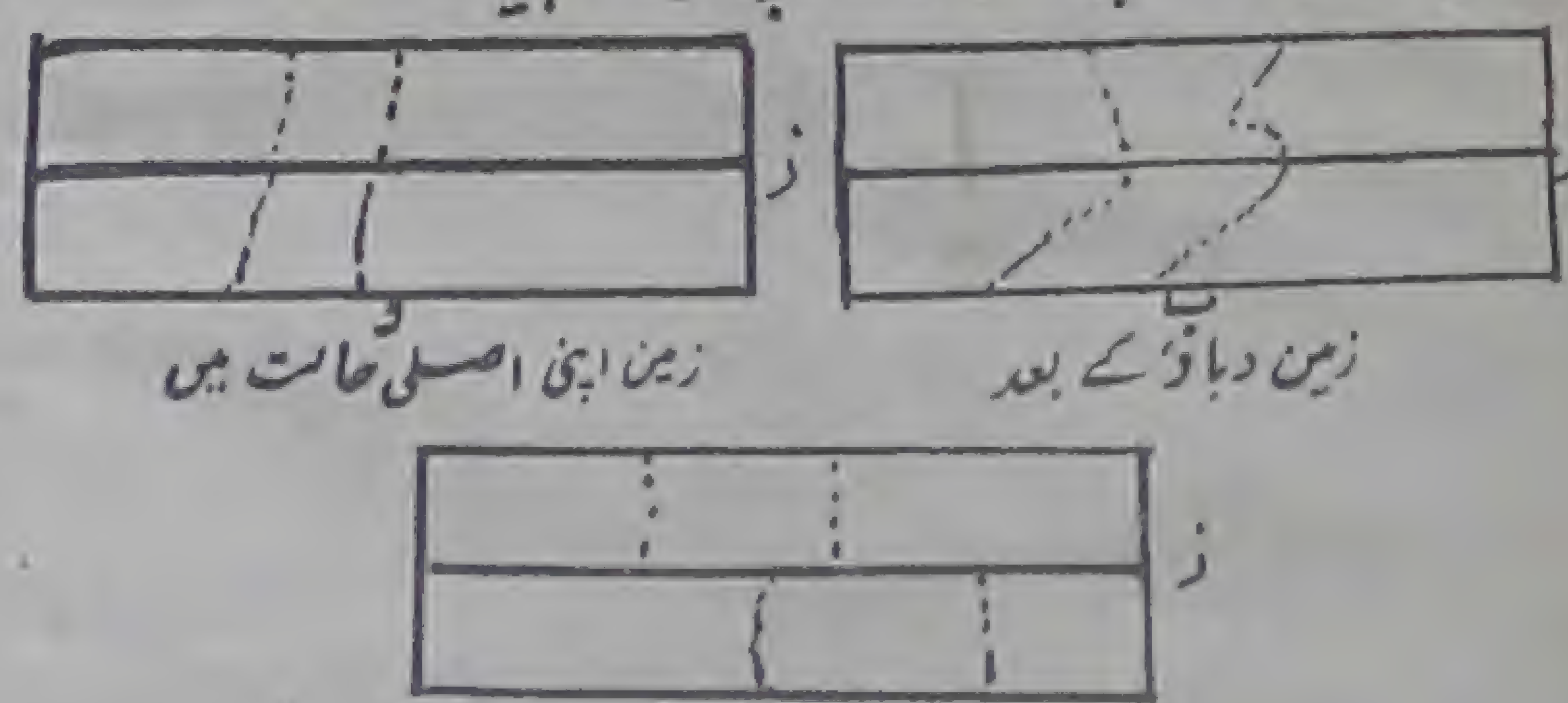
۱۷۶۰ء میں مچل اور راجرس نے ایک قدیم نظریہ کو از سرِ نو ترمیم کے ساتھ پیش کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ چونکہ اکثر و بیشتر زلزلے آتش فشانی خطوں میں آتے ہیں۔ اسی لئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زلزلے بھی آتش فشانی لاوے کے دباؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُسی صدی کے اواخر میں ہمبولٹ نے اس نظریہ میں معمولی سی ترمیم کی۔ اس کے خیال میں زمین کی بالکل ہی اندرونی سطح میں جو کھولتا ہوا مادہ ہے کبھی کبھی وہ قوت سے اوپر کی طرف اٹھتا ہے اور اس کی غیر معمولی تپش کی وجہ سے اندرونِ زمین کا پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے اور زمین پھاڑ کر زلزلے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ زمین کی گہرائی ۶۵۰۰ کیلومیٹر ہے جس میں سے پہلے ۱۰۰ کیلومیٹر سخت سطح ہے۔ اس کے نیچے ۲۸۰۰ کیلومیٹر کی موٹی سطح ہے جو نرم اور گرم اجزا کی بنی ہوئی ہے۔ اور اس کے نیچے ۳۶۰۰ کیلومیٹر کی سطح ہے جو کھولتے ہوئے لاووں لوہے اور سیسہ و نکل پر مشتمل ہے۔

۱۸۵۷ء میں میلٹ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین کے فوری ارتقاء یا زمین کے قطعات کے کھسکنے یا سرکنے کی وجہ سے زیرِ زمین پانی گرم ہو جاتا ہے جب یہ گرم پانی زمین کے ہل جانے کی وجہ سے کھولنے لگتا ہے اور اس کی بھاپ بن جاتی ہے تو یہ "فرقِ زمین" عمل میں آتا ہے۔ ۱۸۹۰ء میں ایم برٹیا نے بھی کچھ اسی قسم کا نظریہ پیش کیا تھا۔

الغرض یہ مختلف النوع نظریات ہیں جو زلزلے سے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ ان نظریوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ کسی بھی نئے نظریے کی وجہ سے پرانے نظریے کی تردید نہیں ہوتی۔ بلکہ نئے نظریے کچھ نئی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعض زلزلے

بعض وجوہ کی بنا پر ہوں جب کہ دیگر زلزلوں کے وجوہ اس سے مختلف ہوں۔

موجودہ نظریہ ایچ۔ ایف ریڈ کا پیش کردہ ہے جو اس نے ۱۹۰۶ء میں سان فرانسیسکو کے زلزلے کے بعد پیش کیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ زلزلہ کسی غیر معمولی ارضی تغیر و تبدل کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کے پہلے ہی بتلایا گیا ہے۔ زمین میں پھیلنے، سکڑنے، کھسکنے اور چٹان و پہاڑ بننے کی حرکات ہوتی رہتی ہیں۔ ان حرکات کی وجہ سے کمزور چٹانیں اور علاقے مسلسل دبے رہتے ہیں لیکن جب دباؤ ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے تو یہ کمزور چٹانیں مختلف حصوں میں منقسم ہوجاتی ہیں اور اپنی جگہ از سرِ نو بنا لیتی ہیں منقسم ہونے کے اس عمل کو ہم زلزلہ کہتے ہیں۔ جس کے باعث زمین کے طبقات اپنی سابقہ حالت پر آجاتے ہیں۔



زمین اپنی اصلی حالت میں (ا)
زمین دباؤ کے بعد (ب)
زمین زلزلہ کے بعد (ج)

اُوپر کی شکل میں ا ب ج ایک ہی قطعۂ ارض کی مختلف اوقات کی شکلیں ہیں۔ نشان زدہ علاقہ کمزور چٹان کا ہے۔ شکل ا میں زمین اور چٹان اپنی اصلی حالت میں، شکل ب میں کمزور چٹان دباؤ کے بعد تبدیل شدہ حالت میں اور شکل ج میں کمزور چٹان زلزلے کے بعد اپنے مقام سے کھسکی ہوئی لیکن دباؤ سے آزاد تبلائی گئی ہے جس حصۂ چٹان پر جس قدر دباؤ ہوگا اسی قدر وہ وہاں سے دب جائے گی۔

زلزلے کے عمل کو اس طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ساکت پانی میں ایک پتھر پھینکیں تو پتھر گرنے کے مرکز سے دائرے کی شکل میں لہریں ابھرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح سے جب زلزلے کی وجہ سے زمین پھٹ جائے تو اس کے مرکز سے دور دور تک اطراف میں زمین میں لہریں پیدا ہوتی ہیں جسے ہم ارتعاشِ زمین کہتے ہیں۔ زلزلہ جس قدر شدید ہوگا۔ اسی قدر دور تک اس کے اثرات مرتب ہوں گے۔ قریبی علاقوں میں ارتعاشِ زمین بہت زیادہ ہوگا۔ جب کہ دور دراز علاقوں میں اُسے مشکل ہی سے محسوس کیا جا سکے گا۔ ۱۹۲۳ء کا جاپان کا زلزلہ جو تاریخ کا سب سے زیادہ المناک اور بڑا زلزلہ تھا

اس کی لہریں ۵ منٹ میں ہانگ کانگ، ۸ منٹ میں کلکتہ اور ۱۲ منٹ میں انگلینڈ اور امریکہ پہنچ گئی تھیں۔ اس زلزلے میں ڈیڑھ لاکھ انسان موت کی آغوش میں پہنچ گئے تھے۔ سوا لاکھ آدمی زخمی ہوئے اور ۶ لاکھ مکانات پوری طرح تباہ ہوگئے۔ اس کے علاوہ سوا لاکھ مکانات کو نقصان پہنچا تھا۔ انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ بڑے زلزلے کا سراغ نہیں ملتا۔ اس زلزلے کے باعث جاپان کا ساحلی علاقہ مختلف مقامات پر ۳ سے ۶ فٹ تک اوپر ہوگیا تھا۔


زلزلے سے زمین میں دراڑیں پڑ گئی ہیں

زلزلے کا مرکز بعض اوقات بہت وسیع و عریض ہوتا ہے۔ ۱۸ اپریل ۱۹۰۶ء میں سان فرانسسکو کے زلزلے نے ۴۳۰ مربع میل کی زمین کو بالکل اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ مینوا و واری (۱۸۹۱ء) اور فارموسا (۱۹۰۶ء) کے زلزلوں کے مراکز علی الترتیب ۱۰۰ مربع کیلومیٹر اور ۵۰ مربع کیلومیٹر تھے۔ زلزلوں سے نہ صرف مالی اور جانی نقصان ہوتا ہے بلکہ پہاڑ یا چٹانیں، سمندر اور دریا بھی متاثر ہوتے ہیں۔ دریا اپنا رُخ بدل لیتے ہیں پہاڑ چٹانیں اپنی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ زمین میں وسیع نشیب و فراز پیدا ہوجاتے ہیں۔

نشیبی علاقوں میں جو پہلے سے کمزور ہوتے ہیں پانی کی کثیر مقدار جمع ہوجاتی ہے اور پانی کے بوجھ سے ان کمزور علاقوں میں دوبارہ زلزلے آنے کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔

موجودہ صدی میں وقوع پذیر چند زلزلوں کے ریکارڈ سے واضح ہوجائے گا کہ زلزلوں سے کتنا جانی نقصان ہوتا ہے



زلزلے سے مکان کی شق دیواریں

موجودہ صدی کے زلزلے

نام مقام	سال	جانیں ضائع ہوئیں
ٹوکیو	۱۹۲۳ء	۱،۵۰،۰۰۰
	برٹینیکا انسائیکلوپیڈیا	۷۴،۰۰۰
نیپلز (اٹلی)	۱۹۳۰ء	۲،۱۰۰
بہار	۱۹۳۴ء	۱۰۰۰
کوئٹہ پاکستان	۱۹۳۵ء	۲۵،۰۰۰
ترکی	۱۹۴۰ء	۳۰،۰۰۰
آسام	۱۹۴۹ء	۲،۰۰۰
ایکویڈور، جنوبی امریکہ	۱۹۴۹ء	۲،۰۰۰
ایران	۱۹۵۳ء	۱،۰۰۰
الجیریا	۱۹۵۳ء	۱،۵۰۰
افغانستان	۱۹۵۶ء	۲،۰۰۰
ایران	۱۹۵۷ء	۳،۰۰۰
اگادیر مراقش	۱۹۶۰ء	۱،۲۰۰
ایران	۱۹۶۰ء	۵۰۰
چلی	۱۹۶۰ء	۲،۰۰۰
ایران	۱۹۶۲ء	۱۱،۰۰۰
یوگوسلاویہ	۱۹۶۳ء	۱۰،۰۰۰
ترکی	۱۹۶۷ء	۲۵۰،۰۰۰
ایران	۱۹۶۸ء	۲۰،۰۰۰

ہندوستان کے زلزلوں کا ریکارڈ

۸۹۴ء	ڈیبل	۱،۵۰،۰۰۰
۲۶ مئی ۱۶۱۸ء	بمبئی	۲۰۰۰
۱۱ مئی ۱۶۶۸ء	سماجی	۳۰،۰۰۰
اکتوبر ۱۷۳۷ء	کلکتہ	۳۰،۰۰۰
۱۶ جون ۱۸۱۹ء	بھج	۲۰۰۰
ستمبر ۱۸۲۷ء	کول تارن (لاہور)	۱۰۰۰
۲۴ جنوری ۱۸۵۲ء	فورٹ خان (اپر سندھ)	۳۵۰
۱۰ جنوری ۱۸۶۹ء	ساچرہ آسام	اعداد دستیاب نہیں
۳۰ مئی ۱۸۸۵ء	کشمیر	۳۰۰۰
۴ اپریل ۱۹۰۵ء	کانگڑہ	۲۰۰۰۰
۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء	بہار	۱۰،۰۰۰
۳۱ مئی ۱۹۳۵ء	کوئٹہ بلوچستان	۲۵،۰۰۰
۱۵ اگست ۱۹۵۰ء	آسام	اعداد دستیاب نہیں
۱۱ دسمبر ۱۹۶۷ء	کوئنا	تقریباً ۲۰۰

زلزلے میں عام طور سے پہلے زمین میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے پھر ایک زوردار جھٹکا لگتا ہے جو اصل زلزلہ ہوتا ہے اور بعد میں پھر ارتعاش پیدا ہوتا ہے بعض اوقات ارتعاش آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن اکثر مرتبہ محسوس نہیں کیا جا سکتا صرف زلزلہ پیما ہی اسکو محسوس کر سکتا ہے۔

زلزلے سے زمین پھٹ نہ جائے تو مرکز زلزلہ معلوم کرنے میں اکثر کافی دشواری ہوتی ہے اس لئے کہ تمام مرتعش علاقے کے افراد بالکل ایسا ہی محسوس کرتے ہیں جیسے ارتعاش ان ہی کے علاقے میں ہوا ہے۔

تقریباً تمام زلزلوں سے پہلے چند مخصوص آوازیں آتی ہیں یہ آوازیں بہت ہی غیر محسوس انداز کی ہوتی ہے کبھی کبھار یہ آوازیں شدت اختیار کر جاتی ہیں اور سجاپ "نکلنے کی، بادل کی گڑگڑاہٹ کی، ریلوں اور گاڑیوں کے ٹکرانے کی مختلف آوازیں آتی ہیں۔ یہ آوازیں صرف مرکز زلزلہ کے قریب ہی سنائی دیتی ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

غزلیں



کوئی رہبر نہ کوئی جادہ ہے
میری منزل مرا ارادہ ہے:
ایک میں ہوں اور ایک بادہ ہے
کتنی میری حیات سادہ ہے
موت کیا ہے جو غور سے دیکھا
زندگی کا حسین وعدہ ہے
دل کے دیپک میں جل رہا ہے لہو
آج کچھ روشنی زیادہ ہے

درد کو زیبِ داستاں نہ کرو
حال اپنا کبھی بیاں نہ کرو
برقِ سوزاں نے یہ کہا کب ہے
پھر سے تعمیرِ آشیاں نہ کرو
یہ کہاں ہے حرم کی پابندی
احترامِ درِ بتاں نہ کرو!
ظرف کا امتحاں ہے اے طوفاںؔ
ذکرِ بے دادِ آسماں نہ کرو

کرشن دت طوفان

موسیٰ مجروح

جن کی نظروں میں سدا رہتی ہے ایوانوں کی شام
آہ وہ کیا جانیں کیا ہوتی ہے غم خانوں کی شام
گر سکونِ دل کی خواہش ہے تو میرے ساتھ چل
دو جہاں کے غم بھلا دیتی ہے میخانوں کی شام
یہ تمناؤں کی یورش، یہ مرادوں کا ہجوم
مانگتی ہے اور بھی کچھ میرے ارمانوں کی شام
صبح تک روتی رہی سب سے گلے مِل مِل کے شمع
لیکے پیغامِ اجل جب آئی پروانوں کی شام
یہ سرِ مژگاں ستارے یہ چراغِ رخ اُداس
رنگ لائی آج آخر میرے افسانوں کی شام

دے سہارا اے اجل، اے نامرادوں کی مراد
آج ہے مجروحؔ پر بھاری شبستانوں کی شام



شاہد ماہلی

یادوں کے بادل گھر آئے، اشکوں کی برسات چلی
سناٹوں کی چیخیں گونجیں جیسے جیسے رات چلی
سکھیوں نے کلکاری ماری، گوری لاج سے بھیگ گئی
پنگھٹ پر جب آج سویرے جانے کس کی بات چلی
زخموں کی شہنائی گونجی، چنتاؤں کی تھال سجی
تنہائی کے آنگن سے جب یادوں کی بارات چلی
اوروں نے امرت پی ڈالا، زہر ہی اپنے ہاتھ لگا
محرومی کے انگاروں پر تنہا اپنی ذات چلی
ایک نظر کے پاپ کے کارن، کیسا کیسا دوش لگا
اک پل کی ننھی بات، نہ جانے کیسی کیسی بات چلی
چاروں اور ہے دُکھ کا ساگر، ناکامی کے طوفاں ہیں
دل کی ٹوٹی کشتی لے کر، جانے کہاں حیات چلی

نئی کتابیں

دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم

مصنف : سریندر پرکاش
شب خون کتاب گھر- ۳۱۳، رانی منڈی- الہ آباد-۲
قیمت : تین روپے پچھتر پیسے۔

سریندر پرکاش کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ایک حساس ذہن اور اچھی تخلیقی صلاحیت کا آئینہ دار ہے۔ کہانیوں میں خوابوں کی دنیا کی طرح ایک پُراسرار فضا قائم کی گئی ہے۔ جہاں اشیاء کے تعلق میں بے ربطیاں اور کچھ عجیب و غریب سے رشتے ملتے ہیں۔ اس فضا میں کہیں تو خوبصورت اور دلکش کہانیاں جنم لیتی ہیں اور کہیں اسرار کا فریب اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سوا الجھاؤ کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اکثر ایسا بھی لگتا ہے کہ وہ کہانی سناتے سناتے جان بوجھ کر بہکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خوابوں میں بہکنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر عالم بیداری کو خواب ثابت کرنے کے لئے کہانی کو مصنوعی تہوں سے بوجھل کر دینا، تکنیک پر مکمل قدرت کی کمی ظاہر کرتا ہے۔ Dream Symbolism کی تکنیک ظاہری بے ربطیوں اور بظاہر بے سروپا باتوں کے پردے میں ایک ایسا گہرا مگر ان دیکھا اور انوکھا ربط چھپا دیتی ہے جو ہر خواب دیکھنے والے کے ادراک و احساس پر اپنے آپ کو عیاں کر دیتا ہے۔ سریندر پرکاش کے یہاں ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ سریندر پرکاش کا افسانہ علامتوں کے گرد گھومتا ہے مگر اُن کی علامتیں ابھی خود ستیال ہیں اور اپنی معنویت کی تلاش میں ہیں۔ ایک ہی علامت متعدد بلکہ بعض اوقات متضاد کیفیات و احساسات کے لئے استعمال کی گئی ہے معنویت اور مفہوم کی یہ افراتفری خود ان علامتوں کی علامتی حیثیت پر ضرب لگاتی ہے۔ سمندر کی علامت دراصل اسی لایعنی وسعت و بے کرانی میں کھو گئی ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے اور چھور کا پتہ ابھی اس کے خالق کو بھی نہیں۔ اور" سانپ تو سمندر سے بھی زیادہ موہوم ہے۔ اس سانپ میں زہر تو نام کو بھی نہیں بلکہ کچھ ایسا لگتا ہے کہ ایک مردہ سانپ کو جیسے محض ڈرانے کے لئے کہیں سے لا کر ڈال دیا گیا ہو۔

اُن کے برعکس وہ علامتیں جو مختلف مذاہب کی دیومالاؤں سے لی گئی ہیں، زیادہ بامعنی ہیں۔ اور سریندر پرکاش انھیں بڑے سلیقے اور خوبی سے کام میں لائے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان علامتوں کے معنی متعین ہیں اور انھیں نئے زاویوں سے دیکھا جائے تو کچھ نئے پہلو بھی اُجاگر ہوتے ہیں۔ سریندر پرکاش یہاں اِن نئے زاویوں کو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہیں۔

اس مجموعے میں " آنگن کا سانپ"، "منادی"، "رونے کی آواز"، پیاسا سمندر، اچھی کہانیاں ہیں۔ خصوصاً "منادی" اور "رونے کی آواز" کی دردمندی اور تڑپ اپنا نقش چھوڑے بغیر نہیں رہتی۔

افسانے کی تکنیک میں نئے تجربات نئی علامتوں کی تلاش پرانی علامتوں میں نئی معنویت پیدا کرنے کی کوشش سے ادب اور فن کی نئی سمتیں روشن ہوتی ہیں۔ یہاں تناسب کی کمی یا مختلف قسم کی افراط و تفریط کوئی حیرت کی بات نہیں۔ سریندر پرکاش نے اگر اس منزل سے گزر کر اپنے فن میں عناصر کے اس نئے تناسب کو دریافت کر لیا جو ہر اچھے فن کار کا آئیڈیل ہوتا ہے تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ اُن کے افسانوں میں تلاش

وتجسس کا اضطراب اچھے امکانات کا حامل نظر آتا ہے۔

(صدیق الرحمٰن قدوائی)

سرورِ سرمدی (مجموعۂ کلام) ناشاد کان پوری

سرورِ سرمدی، ناشاد صاحب کان پوری (نام: سریدھر پرشاد نگم) کی غزلوں، نظموں، رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ ناشاد صاحب خاصے کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کی فنی تربیت حضرت جگر بریلوی کے ہاتھوں ہوئی ہے، چناں چہ زبان وفن کے رموز اور رعایتوں وصنعتوں سے ان کی واقفیت مسلّم ہے۔ عام شعری روایات کے دائرے میں رہنے کے باوجود انھوں نے اپنی فکر کو انفرادی لب ولہجہ دینے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک ہر اس کوشش میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ بالخصوص چھوٹی بحروں میں جو غزلیں ہیں ان میں زبان کی بے تکلفی کے ساتھ خیال کی پاکیزگی اور سادگی بڑی خوبی سے نمایاں ہوئی ہے۔

ناشاد صاحب کے عام موضوعات حسن وعشق کی حکایات تک محدود ہیں البتہ تصوف کی طرف اُن کے فطری میلان نے قد وگیسو کی داستانِ کہن میں جذبے کی صداقت کے باعث نئے گوشے پیدا کئے ہیں۔ گردوپیش کی عام زندگی کی طرف سے بھی وہ غافل نہیں رہے ہیں اور خیر وشر کی کشمکش میں حوصلہ کھوئے بغیر انھوں نے بڑے ہمدردانہ اور متوازن انداز میں اندھیرے پر اجالے کی فتح کے لئے فکری جہاد کیا ہے۔ شخصیت کی تہذیب سے پیدا شدہ شائستہ مزاجی اُن کے پورے کلام پر حاوی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔—

دُنیا ہے آئینہ خانہ ؛ ہم جیسے تھے ویسا دیکھا
نگہِ ناز کہہ گئی سب کچھ ؛ اور کہنے کو کچھ کہا بھی نہیں
پردے ڈالے ہیں ماہ وانجم کے ؛ خود نمائی سی خود نمائی ہے
کون لائے گا تابِ لطف وکرم ؛ دل تو شائستۂ جفا بھی نہیں
ناامیدی بھی ساتھ چھوڑ نہ دے ؛ دل بھی مفلس کا گھر نہ ہو جائے

نظمیں بھی اچھی خاصی ہیں۔ ان میں سے کچھ ہندی بحروں سے قریب ہونے کے باعث موسیقی کی اس لے سے بھی ہم آہنگ ہیں جس کا خمیر خالصتاً ہندوستانی ہے لیکن ناشاد صاحب کے جوہر خاص طور سے غزل ہی میں کھلے ہیں وہ لفظوں کی فضول خرچی کے عادی نہیں اس لئے رباعیات اور قطعات میں بھی بڑے ایجاز کے ساتھ حکیمانہ باتیں نظم کی ہیں۔

مجموعے کے شروع میں متعدد حضرات کی آرا اور تقریظیں شامل ہیں جن میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، افقر موہانی، فراق گورکھپوری، عرش ملسیانی، نیاز فتح پوری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ کتابت اور طباعت معمولی ہے۔ ۲۱۰ صفحات کا یہ مجموعہ چار روپے پچاس پیسے میں جناب ایس۔ پی نگم، پانڈے نگر، کان پور (یو۔ پی) سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(شمیم حنفی)

حسرتیں (مجموعۂ کلام) کنور کرشن بھیانہ خلش دہلوی

قیمت: پانچ روپے۔ صفحات ۱۰۰

ملنے کا پتہ: خلش دہلوی، ایم۔ ۴۲ گریٹر کیلاش، نئی دہلی

خلش صاحب پیشے کے اعتبار سے سول انجینئر ہیں لیکن اظہارِ ذات کی خواہش نے انھیں اپنے تجرباتِ روزگار کو شعری ملبوس عطا کرنے کی طرف متوجہ کیا جس کا نتیجہ اُن کا یہ مجموعہ "حسرتیں" ہے۔

مجموعے میں غزلیں، نظمیں اور قطعات سبھی کچھ شامل ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدرِ جمہوریہ کا دعائیہ، موسیقار ناشاد کا تعارف اور فلمی دنیا بمبئی کے طلعت سوز حیدری صاحب کی "تقریظ" بھی نظر آتی ہے۔ ناشاد صاحب کی خواہش تھی کہ وہ فلموں کے ذریعہ خلش صاحب کی شاعری عوام تک پہونچائیں لیکن خلش صاحب نے یہ ارادہ اپنے مجموعے کی اشاعت تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ یوں عوامی مذاق کی آسودگی کا ہر سامان اُن کی شاعری میں موجود ہے۔ انھوں نے اپنے فنی سفر میں غالباً اپنے تخلیقی جوہر کے علاوہ کسی کو رہنما نہیں بنایا۔ اُن کی فکر کی گرفت میں محبوب کا حسن اس کی جدائی کا احساس اور شراب وساغر کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کلیجہ پہ تم داغ کھا نہ سکو گی ؛ یہ بارِ محبت اٹھا نہ سکو گی
ایسے لمحات غمِ زندگی میں آ نہ سکے ؛ تم مری یاد میں آنسو بھی دو بہا نہ سکے
شاید تری نظر کا خنجر ہے مری ہی جانب ؛ دل بھی کٹا جگر بھی، کچھ بھی بچا نہیں ہے
قریب آکے حیا سے ترا سمٹ جانا ؛ مجھے اندازہ یہ پاگل بنائے جاتا ہے

ہر صفحے پر گہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں۔ مجموعے کی کتابت، طباعت، گٹ اپ شاندار اور مصنف کی تصویر خاصی جاذبِ نظر ہے۔

(شمیم حنفی)





جمہوریہ لائبریا کے نائب صدر ہز ایکسی لینسی ڈاکٹر ولیم آر ٹالبرٹ جونیئر نومبر ۱۹۶۸ء میں ہندوستان کے چھ روزہ سرکاری دورے پر تشریف لائے۔ اپنے دورے کے عرصے میں موصوف نے دیگر ملکی رہنماؤں کے علاوہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے بھی ملاقات کی



سرینگر (عیدگاہ) میں نمازِ عید کا ایک منظر

Vol. 27 No. 5 AJKAL (Monthly) December 1968

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N. Delhi-1
Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd. No. D. 509